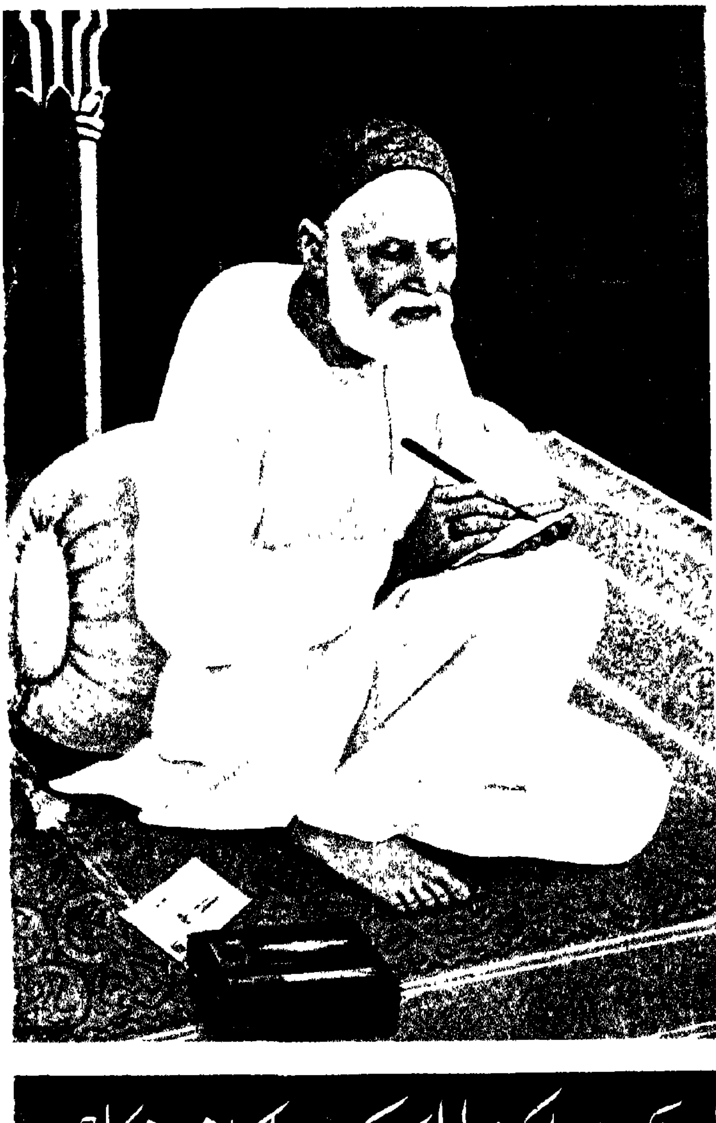
سہ ماہی العلم کراچی



غالب نمبر

مدیر: سید الطاف علی بریلوی

اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

سہ ماہی العلم کراچی

بابتہ

جنوری تا مارچ (و) اپریل تا جون ۱۹۶۹ء

غالب نمبر

بتقریبِ صد سالہ یادگار

قیمت
دس روپے

ایڈیٹر
سیّد الطاف علی بریلوی

اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ
آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
کراچی ۱۸ء

ـس کالج

ڈ کراچی

یشنل کانفرنس (جولائی ۱۹۵۳ء)

زیر نگرانی۔ ۔۔۔۔۔ ـش

آرٹس اور سائنس کے اس ڈگری کالج میں فی الوقت پندرہ سو طالبات زیر تعلیم ہیں۔ معیار تعلیم اور ڈسپلن کے اعتبار سے بہترین شہرت کا مالک ہے۔ فاضل اساتذہ کی مخلصانہ کوشش کی بدولت نتائج امتحان شاندار رہتے ہیں۔ دارالعلوم علی گڑھ کی تمام قابل تعریف روایات کا حامل ہے۔ صحیح معنیٰ میں ایک قومی ادارہ ہے اور کم سے کم فیس لی جاتی ہے۔

چھ ایکڑ زمین پر تقریباً بیس لاکھ روپے کی ذاتی عمارت بن چکی ہے۔ سائنس بلاک اسمبلی ہال، لائبریری، جمنازیم، اور مسجد کے لئے مزید تیس لاکھ روپے کی فوری ضرورت ہے۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ عطیات مرحمت فرمایئے تاکہ نہ صرف ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم نسواں کی درسگاہ کو استحکام حاصل ہو بلکہ مسلمانوں کے محسن اعظم سر سید علیہ الرحمۃ کے شایانِ شان ان کی ایک عمدہ یادگار بھی عروس البلاد کراچی میں قائم ہو جائے۔ جملہ عطیات بنام آنریری سیکرٹری سر سید گرلس کالج کراچی بذریعہ کراسڈ چیک ارسال کر کے شکر گزار فرمایا جائے۔

الداعی الی الخیر

سید الطاف علی بریلوی بی۔ اے (علیگ)

رجسٹرڈ نمبر جی ۔ ۳۲۳

مطبوعہ

ایجوکیشنل پریس کراچی

فہرستِ مضامین

اداریہ	سید الطاف علی بریلوی	

نگاہِ اوّلین

عندلیبِ بہارستانِ سخن۔ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ	سرسید احمد خاں	۱۷
غالبؔ اور میں!	ڈاکٹر امتیاز حسن، صدر کانفرنس	۲۰
غالبؔ کی مورخانہ حیثیت	ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی شیخ الجامعہ، کراچی	۲۶
غالبؔ شناسی	پیر سید حسام الدین راشدی	۲۹
غالبؔ کی آفاقیت	سید ہاشم رضا	۳۲

مرقع غالب

حالات و سوانح

غالب کے آباء و اجداد	نقیب اختر، ایم اے	۳۵
غالب	پروفیسر ممتاز حسین، صدر شعبہ اردو، اردو کالج، کراچی	۶۳
غالب خستہ حال	شیخ وحید احمد مسعود (بدایوں)	۶۹
غالب میری نظر میں	پروفیسر حبیب اللہ خاں غضنفر، عثمانیہ کالج، کراچی	۷۶
کیا غالب ولی تھا؟	مولوی احترام الدین احمد شاغل (جیپور)	۸۳
غالب کا قیام دلی میں	نصیب اختر، ایم اے	۸۸
مثنوی غالب در تائید مسائل اختلافیہ	مولوی حفیظ اللہ پھلواروی	۹۳
غالب اور ۱۸۵۷ء کے مصائب	ابو سلمان شاہجہانپوری	۱۰۳
غالب کا کتب خانہ	الحاج محمد زبیر، سابق اسسٹنٹ لائبریرین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۰۹
چھیڑ غالب سے چلی جائے	فضل احمد صدیقی، ایم اے	۱۱۳
مرزا غالب کے حالات میں پہلا مضمون (وفات کے بعد)	ڈاکٹر فرمان فتحپوری، مدیر اعلیٰ "نگار"	۱۳۱
غالب اخبارات کے آئینے میں	سید مصطفیٰ علی بریلوی بی، کام ایل ایل بی	۱۲۶
غالب کی قدر وفات کے بعد	مولوی محمد عبداللہ قریشی، مدیر "ادبی دنیا" لاہور	۱۳۳
غالب کی آخری آرام گاہ	نادم سیتاپوری	۱۴۱

غالبِ رنگین نوا

(الف) شعر و شاعری

کشّافِ رازِ فطرت	ڈاکٹر سید محمود، ایم اے، پی ایچ ڈی (بھارت)	۱۵۳
داستان فرہاد اور غالب کا تصورِ محبت	مولانا غلام رسول مہر	۱۶۳
غالب اور گوئٹے	مخمور اکبرآبادی	۱۷۷
غالب اور صہبائی	ڈاکٹر پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، صدر شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی	۲۲۴
غالبِ نام آورم	سید علی حسنین زیبا ردولوی	۲۳۴
شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار	پروفیسر طاہر حسین نقوی، گورنمنٹ کالج، نواب شاہ	۲۴۵
کلام غالب میں تصوف کا عنصر	ثناء الحق صدیقی ایم اے	۲۵۱
غالب اور مسائل حیات	لطیف اللہ ایم اے، گورنمنٹ کالج، کراچی	۲۶۹
غالب کی فلسفیانہ شاعری	کلیم زیدی ایم اے	۲۷۵
غالب کی شاعرانہ مقبولیت و عظمت	مولوی سید رفیع الدین بلخی ایڈوکیٹ پٹنہ	۲۸۸
غالب اور اردو شاعری	سید آل حیدر ایم اے	۳۰۹
کلام غالب میں شاعرانہ تعلّی	ناظر انصاری جلگانوی	۳۱۳

(ب) علم و فن

مرزا غالب اور علم نفسیات	پروفیسر سردار احمد خاں اسلامیہ کالج سکھر	۳۲۳
مرزا غالب اور علم نجوم	ابراہیم خلیل ایم اے، گورنمنٹ کالج دادو	۳۳۵

مرزا غالب کا ملی کلام	مولانا سعید انصاری	۳۴۷
کلام غالب کی مقبولیت	شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	۳۵۱
اوراقِ گل	خورشید زہرا، ایم اے، اسلامیہ کالج برائے خواتین، لاہور	۳۶۰
خطوط غالب میں اشعار غالب	سہیل برکاتی	۳۶۳

(ج) زبان و بیان

غالب نے اردو میں خط و کتابت کب سے شروع کی	قاضی عبدالودود، بیرسٹرایٹ لا پٹنہ	۳۷۴
کلام غالب کے وہ الفاظ جو اب متروک ہیں	محمد حبیب اللہ رشدی، ایم اے	۳۸۹
کلام غالب کی لفظی و معنوی صنائع	مولانا ماہر القادری، مدیر فاران	۴۰۵
اردوئے معلی پر ایک نظر	پروفیسر نظیر حسنین زیدی، گورنمنٹ کالج حیدرآباد (پاک)	۴۱۱
کلام غالب اور ضلع و رعایت	محمد قطب الدین (سوڈان)	
کتنے شیریں ہیں تیرے لب....	سید انیس شاہ جیلانی، محمد آباد	

عصر غالب

تلامذہ و احباب وغیرہ

غالب کے عہد کے سندھ کے اردو شعراء	پروفیسر میمن عبدالمجید سندھی، اسلامیہ کالج سکھر	۴۴۱
غالب کے دیکھنے والے جنہیں میں نے دیکھا	ملا واحدی دہلوی	۴۵۱
مرزا تفتہ ... خطوط کے آئینے میں	محمد سجاد ساجد، ایم اے	۴۶۵
حکیم غلام نجف خان	حکیم محمود احمد برکاتی	۴۶۸
منشی بالمکند بے صبر	دیریندر پرشاد سکسینہ بدایونی	۴۸۰
عارف قیصری	مولوی محمد عثمان، رخشان ابدالی	۴۸۴
[illegible] دہلوی	قاضی محمد افضل حق قریشی، لاہور	۴۹۷
مرزا غالب سے معاصرین کی ادبی چھیڑ چھاڑ	محمد ایوب قادری ایم اے اردو کالج کراچی	۵۰۱

پیروانِ بیدل و غالب دکن میں	محمد سخاوت مرزا بی۔اے۔ ایل ایل بی	۵۱۳
غالب کا ایک پرستار۔ عرش بریلوی	سید مصطفیٰ علی بریلوی بی کام۔ ایل ایل بی	۵۲۶

نقوشِ غالب

تحریرات و دواوین

تذکرہ مظہر العجائب اور مرزا غالب	سالم ضیائی، ایم۔اے	۵۳۲
نسخۂ حمیدیہ اور بجنوری	مولانا امتیاز علی عرشی	۵۴۰
دیوانِ غالب کے مختلف اڈیشن	محمد عالم مختار حق، لاہور	۵۴۷
مرزا غالب کی چند معدوم تحریریں	پروفیسر معین الرحمٰن ایف سی کالج لاہور	۵۷۱
کتابیاتِ غالب کانفرنس کے کتب خانے میں	سید مصطفیٰ علی بریلوی بی کام، ایل ایل بی	۵۸۵

منظومات

نعت	غالب	۱۰۸
قدسی کی نعتیہ غزل پر تضمین	غالب	۵۴۶
غزل	قاضی عبدالجمیل جنوں بریلوی	۱۴۰
غزل	غلام بسم اللہ بسمل بریلوی	۲۷۴
غالب مرحوم کی یاد میں	رضا علی وحشت	۴۶۷
غزل	درد کاکوروی	۲۲۳
تنہائی کی وادی میں	حفیظ ہوشیارپوری	۵۳۰
غالب کی صد سالہ یادگار کی تقریب میں	رئیس امروہوی	۱۵۱
قصیدہ بہ بارگاہِ حضرت غالب	تابش دہلوی	۴۳۹
جشن صد سالہ بیادِ غالب	سید ہاشم رضا	۲۶۸
غالب	شاعر لکھنوی	۱۳۲
مرزا غالب	علامہ اقبال	۱۶

رہنے دو ابھی ساغر و مینا....	سیٹھ ایس، ایم، یوسف اعزازی خزانچی کانفرنس	۴۰۴
تضمین بر غزل غالب	ڈاکٹر سید انعام احسن حریف	۳۲۲
غالب	خورشید خاور امروہوی	۸۷

تراشے

غالب کی شاعری	مولانا حسرت موہانی	۱۰۷
غالب کی طنز و ظرافت	پروفیسر رشید احمد صدیقی	۶۲
غالب کی خطوط نگاری	پروفیسر ضیاء احمد بدایونی	۵۱۱
غالب کا تنقیدی شعور	پروفیسر آل احمد سرور	۳۴۶
عرفانیات غالب	شیخ محمد اکرام	۴۳۸
غالب کی شخصیت	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۴۲۵
غالب کا فلسفہ	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	۳۴
غالب اور رقیب	مالک رام	۲۵۰
غالب اور اردو غزل	جلیل قدوائی	۳۱۲
مرزا غالب قید فرنگ میں	ملا واحدی دہلوی	۴۶۴

نقد و نظر	ثناء الحق، مخمور اکبرآبادی محمد ایوب قادری وغیرہ	۵۹۵
بزم کانفرنس	ڈاکٹر سید محمود و مولانا غلام رسول مہر وغیرہ	۶۱۶
مطبوعات کانفرنس	....	

غالب اور کرشن چندر

"مقتدر حضرات نے غالب کی صد سالہ برسی کو اپنے مرغوب نظریات کی تبلیغ کا وسیلہ بنالیا اور اس کی شخصیت اور فن سے واقفیت حاصل کرنا ضروری نہ سمجھا۔ اس کی ابتدا مسز اندرا گاندھی نے بمبئی میں "جشن کرشن چندر" کا افتتاح کرتے ہوئے کی اور کرشن چندر کو اس دور کا غالب کہہ دیا .... اگر یہ صحیح ہے تو سخن فہمی عالم بالا معلوم شد۔"

(تحریک دہلی بحوالہ "صدق جدید" لکھنؤ)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
غالبؔ

سید الطاف علی بریلوی

اداریہ

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

۱۵ فروری ۱۹۶۹ء کو مرزا غالب کے انتقال کو سو سال گذر گئے اور بجا طور پر برِصغیر پاک و ہند کے اس عظیم ترین شاعر و مفکر کی صد سالہ یادگار دھوم دھام سے منائی گئی۔ نہ صرف پاکستان اور ہندوستان میں بلکہ بیرونی ممالک روس، انگلستان اور امریکہ وغیرہ میں بھی شاندار تقریبات ہوئیں۔

ہمارے یہاں یادگار مذکور منائے جانے کی تحریک اس طرح ہوئی کہ ۲ مارچ ۱۹۶۸ء کو جناب قدرت اللہ شہاب صاحب سابق سکریٹری مرکزی وزارت تعلیم کراچی تشریف لائے اور انجمن ترقی اردو کے دفتر میں شہر کی سرکاری امداد یافتہ علمی و تحقیقی جماعتوں کے نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمائش کی کہ صد سالہ یادگارِ غالب کو خاص اہتمام کے ساتھ منایا جائے۔ موصوف نے یہ بھی ایماء فرمایا کہ اس کام کے لئے خصوصی امداد دی جانے گی۔ جناب اختر حسین صاحب سابق گورنر مغربی پاکستان و صدر انجمن ترقی اردو اس تحریک کے سرخیل قرار پائے، لیکن وقت گذرنے پر متوقع موعودہ امداد حاصل نہ ہو سکی۔ تاہم حضرت غالب سے بے لوث عقیدت اور جناب قدرت اللہ شہاب کے پاسِ فرمائش کی بنا پر سب لوگوں نے بطور خود ہی جو کچھ ہو سکا کر ڈالا۔ "بطور خود" کی گنجائش بھی نہایت محدود تھی کیونکہ دس سال کے عرصہ میں ۱۹۵۸-۵۹ء سے علمی و تحقیقی اداروں کی گرانٹ میں نہ صرف تدریجی اضافہ نہ ہوا

بلکہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد سے اس میں بیس ۲۰ فیصدی کی کمی بھی واقع ہوگئی جو "امرجنسی" ختم ہو جانے کے باوجود اب تک قائم ہے۔ مزید برآں ہر چیز اور ہر کام کی ہولناک گرانی اور رفیق کار صاحبان علم و فضل کی بڑھتی ہوئی مالی مشکلات نے ذہن و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ایسے میں تصنیفی و تخلیقی صلاحیت کا زوال پذیر ہونا بھی ناگزیر ہے۔ مالی و اقتصادی بدحالی حساس صاحبانِ قلم کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے ؎

گیا جب کہ اپنا ہی جیوڑا نکل
کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

خیر سے ہم جس فخرِ روزگار ہستی، غالب کی صد سالہ یادگار منا رہے ہیں اور جس کے اہتمام و انصرام میں اس وقت لاکھوں روپیہ صرف ہو رہا ہے وہ بھی زندگی بھر مالی مشکلات کا شکار اور "قرض و فاقہ مستی" کی مصیبت میں گرفتار رہا۔ آج آپ غالب کے "قتل" ہو جانے کے بعد جس قدر چاہیں "جفا سے توبہ" کریں۔ اس کے مقبرہ کو زیادہ سے زیادہ بلند و بالا بنائیں۔ مگر اس نقصانِ عظیم کی تلافی نہ کرسکیں گے جو اس کو بقدرِ ضرورت پیسہ نہ دے کر پہونچا چکے ہیں

تاراجِ کاوشِ غمِ "دوراں" ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

خیال کیجئے کہ اگر غالب کو مالی فراغت بھی حاصل ہوتی تو وہ اور کیا کچھ نہ کرتے۔ افسوس ہے کہ ان کی دماغی و ذہنی توانائیوں کا بڑا حصہ چھوٹی چھوٹی رقوم کے حصول میں صرف ہوگیا،

اپنے محترم دوست جناب مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے مرتب کردہ "مکاتیبِ غالب" کو جب میں دیکھتا ہوں تو مجھے بڑا ہی رنج ہوتا ہے۔ خود بین و خود نما والیان ریاست رام پور نے منتے منتے عطیات کے لئے غالب جیسے عالی ظرف اور خوددار انسان سے کیسی کیسی گھٹیا خوشامد کرائی اور پھر مرغ بسمل کا دنیا کو تماشہ دکھانے کے لئے اس کی عرضداشتوں کو خاص حفاظت سے رکھا گیا اور اس باعث ننگ و عار مجموعۂ عرائض کو زیور طبع سے بھی آراستہ کرا دیا گیا۔

غالبؔ پر ہی کیا موقوف ہے، برصغیر پاک و ہند کے محسن اعظم سر سیّد کا انتقال ہوا تو ان کے ذاتی سامان میں دو مکمل جوڑے کپڑوں کے نہ تھے۔ مولانا حالیؔ حیدرآباد کی سو روپے کی قلیل پنشن پر انتہائی تنگی ترشی سے گذر اوقات کرتے رہے۔ ایسی تنگدستی کہ اگر اچانک کوئی مہمان آجاتا تو وہ اپنا کھانا اس کو کھلا دیتے اور خود فاقہ سے سو جاتے۔ حکیم الامت علامہ اقبالؔ بھی مدت العمر فکر معاش سے نجات نہ پا سکے اور اگر آخری زمانہ حیات میں سر سیّد راس مسعود مرحوم کی سعی سے پانچسو ۵۰۰ روپے ماہوار کا بھوپال سے ان کا وظیفہ نہ ہو جاتا تو خدا معلوم کہاں کے پبلک اسپتال میں ان کا انجام بخیر ہوتا۔

جب سے راقم آثم نے ہوش کی آنکھیں کھولیں برصغیر پاک و ہند کے صدہا شکسپیئر، ملٹن، اور رازی وغیرہ آلی کو بیکسی کی موت مرتے ہوئے دیکھا۔ البتہ جب وہ اللہ کو پیارے ہوگئے تو ہر کسی کو "یہ انکشاف" ہوا کہ اوہ ہو! یہ تو بہت بڑا آدمی تھا۔ "بے وقت" مر گیا خیر کوئی بات نہیں! اب ہم اس کے کام کو اجاگر کریں گے۔ اس کے نام کو زندۂ جاوید بنائیں گے۔ اس کی تخلیقات کو چھاپیں گے۔ اس کی سوانح عمری لکھیں گے۔ اور اس کے بے سہارا متعلقین کی مالی امداد کریں گے۔ ان نیک ارادوں کے اعلان میں فی زمانناہمارے عزیزم و محترم دوست جناب جمیل الدین عالیؔ پیش پیش رہے ہیں۔ اگرچہ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ان کے مستحسن اقدامات کا نتیجہ کیا نکلا۔ چونکہ مذکورہ نتیجہ سے بے خبری ہے اس لئے کم از کم میں نے تو اپنی اولاد کو وصیت کردی ہے اور ان سطور کے ذریعہ اس وصیت کا اعلان عام بھی کرتا ہوں کہ میرے بعد میرے پسماندگان کی امداد کے واسطے ہرگز ہرگز کوئی اپیل نہ کی جائے۔ کچھ ملتا ملاتا تو ہے نہیں مفت کی گداگری ہو جاتی ہے۔

آپ فرمائیں گے کہ ہمارے ملک کے سرمایہ دار ساری دنیا کے صاحب ثروت لوگوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ مخیّر واقع ہوئے ہیں۔ ذرا آزما کر تو دیکھا ہوتا۔ سو عرض ہے کہ کسی ذاتی معاملہ میں نہیں بلکہ صفاتی سلسلہ میں عروس البلاد کراچی کے مشہور صنعت کار جناب خان بہادر حاجی حبیب اللہ صاحب کو جب میں کراچی میونسپل کارپوریشن

کا ممبر تھا مجھ سے بہت محبت تھی۔ ایک دفعہ اُنھوں نے بھری محفل میں وعدہ کیا کہ وہ احاطۂ سرسید گرلس کالج کو عمارتوں سے بھر دیں گے، یا اسی طرح ایک بار جناب سیّد ابونصر صاحب سابق کمشنر حیدرآباد ڈویژن کی مہربانی سے عالی جناب سیٹھ فخر الدین ولی بھائی سے شرف نیاز حاصل ہوا اور میں نے ان سے سرسیّد گرلس کالج کی امداد کے لئے گذارش کی تو موصوف نے فرمایا کہ سندھ انڈسٹریل ایریا آتے جاتے میں روزانہ کالج کو دیکھکر خوش ہوتا ہوں اور دل میں تمہاری تعریف کرتا ہوں۔ ذرا اطمینان ہوجائے تو ایک اچھا ڈونیشن دوں گا۔ ان دونوں معزز حضرات کی دعا گوئی میں برسیں گذر گئیں۔ دیکھئے کب درِ اجابت وا ہوتا ہے اور کب اُمیدِ کرم پوری ہوتی ہے۔ بہر حال! جملۂ معترضہ معاف! جوں جوں اس جہانِ رنگ و بو سے دائمی جدائی کا وقت قریب آتا نظر آ رہا ہے ایک فکر البتہ رہتی ہے کہ مجھ پر جو قرض ہے وہ میری زندگی ہی میں ادا ہوجائے۔ ویسے میرے محسن و مخدوم حضرت علامہ ممتاز حسن صاحب (ستارۂ پاکستان) کا یہ بھی ارشادِ گرامی ہے کہ "مجھے مقروض رہنا ہی چاہیئے!" غالباً اس مخلصانہ اور حکیمانہ قول میں یہ راز پنہاں ہے کہ جب تک ایک قلم کار ؎

شب چو عقدِ نماز بر بندم
چہ خورد بامداد فرزندم

کی چکی میں خوب نہیں اور باریک نہیں پستا صاحبانِ ہوش و بصیرت کی لذّتِ کام و دہن کا سامان مہیا نہیں ہو سکتا ؏

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد

اب "العلم" کے اس "غالب نمبر" کی بھی کچھ بات ہوجائے۔ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۸ء کے پرچہ میں ہم نے اس کا اعلان کیا تھا اور ناظرین باتمکین سے استدعا کی تھی کہ اسکی پانچ روپے قیمت پیشگی ارسال فرمادیں تاکہ اس کی اشاعت میں آسانی ہوجائے۔ صرف بھاولنگر کے مولوی فضل محمد خاں صاحب نے اپنا چندہ بھیجا۔ باقی اللہ اللہ خیر صلّا۔ دوسری طرف رسالہ کی ضخامت زمانۂ قبلِ تہذیب کی زلفِ محبوب کی طرح بڑھتی ہی چلی گئی۔ اور بقول غالب ؎

نقش کو اس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

ختم اپریل ۱۹۶۹ء تک مضامین کی آمد کا سلسلہ جاری رہا اور ہم انھیں برابر سر آنکھوں سے لگا کر ان کی کتابت وطباعت میں بیدریغ روپیہ صرف کرتے رہے۔ تا آنکہ جیب و دامن کی تنگی نے بالآخر بے بس کر دیا اور رسالہ کو سوا چھ سو صفحات پر مجبوراً ختم کرنا پڑا۔ اندازہ سے بہت زیادہ ضخامت بڑھ جانے کے باعث رسالہ کی قیمت بھی پانچ کے بجائے (علاوہ محصول ڈاک) دس روپے مقرر کرنا ناگزیر ہوگیا۔ اگرچہ پانچ یا دس روپے قیمت رکھنا ہے قطعاً بے سود۔ رسالہ کو چھاپ کر بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کی طرح ہم گودام میں بند کر دینے سے رہے۔ تھوڑے سے روک کر باقی تمام پرچے حسب معمول شائقین وناظرین کرام کی خدمتِ فیض درجت میں (جن کی غالب اکثریت بفضلہٖ صاحب استطاعت ہے) ہم مفت روانہ کردیں گے۔ اور یقینِ واثق ہے کہ (مستثنیات سے قطع نظر) اس کی قیمت وصول نہ ہوگی۔ رسید و شکریہ اور تعریف وتوصیف کے خطوط البتہ کافی تعداد میں آئیں گے۔ جن سے نہ صرف محرومیٔ تمنا کا سارا گلہ دور ہو جانے گا بلکہ شاید ہم یہ بھی کہ سکیں گے کہ ؎

آنکھوں کو ہے ہوس کہ رُخِ سادہ دیکھیے
سر میں ہوائے طرّۂ پُر پیچ وخم نہیں (شیفتہ)

بہر حال! مندرجۂ بالا تاثرات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اب یہ سنئے کہ آپ کی دُعا سے "العلم" کا زیرِ نظر "غالب نمبر" خاصے کی چیز بن گیا ہے، جس کا پورا کریڈٹ عزیز القدر پروفیسر محمد ایوب قادری سلمہٗ کو پہنچتا ہے، جنھوں نے حصول مضامین کے لئے بے پناہ جد وجہد کی۔ موصولہ مضامین کی ترتیب وتسوید میں کاوش کی اور بعد کتابت کاپیوں اور پروفوں کی تصحیح وطباعت تک کے صبر آزما کام کی خود ہی نگرانی کی۔ اگر وہ اس اہم کام میں میرے معینِ کار نہ ہوتے تو یہ پُر بہار گلدستۂ غالب ہرگز یوں سجا کر منصۂ شہود پر نہ آتا۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس اور ادارۂ "العلم" کی جانب سے قادری صاحب کا بدلِ سپاس گزار ہوں۔ عزیز موصوف ایک ہونہار صاحبِ قلم ہیں۔

خدا داد ذہانت اور محنت شاقہ کی بدولت علمی دنیا میں ان کا اعتبار و اعتماد تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے بکثرت تصنیفی ادارے اور اہل علم ان سے محبت کرتے ہیں اور اچھے اچھے کاموں میں ان کے تعاون کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اس شمارہ کے لکھنے والے بھی خدا نظر بد سے بچائے مسلّمہ شہرت کے مالک اور بہت بڑے بڑے صاحبانِ علم و فن ہیں۔ ان کی "العلم" نوازی میرے لئے حیرت انگیز بھی ہے اور باعثِ شکر گزاری بھی۔ میرے اور ادارہ کے پاس سیم و زر نہیں جو ان پر نچھاور کیا جائے، دین و دنیا کی سلامتی و خوشحالی کے لئے دعائے خیر میں البتہ کوتاہی نہ ہوگی ؎

چہ کند بے نوا ہمیں دارد

مرزا غالب

(شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال مرحوم)

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے
محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار
زندگی مضمر ہے تیری شوخیٔ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں
نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر
آہ! تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے[1]

---

[1] گوئٹے

سر سیّد احمد خاں

عندلیبِ بہارستانِ سخن — مرزا اسد اللہ خاں غالب

ہمائے اوج مفاخر و معالی جاگزیں سدرۃ المنتہٰی مراتب بلند و مدارج عالی موسس اساس شیوا بیانی، بانی بنائے الفاظ و معانی عندلیب بہارستان سخن گستری طوطی شکرستان معنی پروری اوج سمائے برتری و والا تباری مہر سپہر بلند اختری و گردوں اقتداری شاگرد رحمٰن استاد سحبان المعیٰ زماں لوذعی بیان فرزدق دہر و لبید آوان المعی وصی رسول اللہ جناب مستطاب مرزا اسد اللہ خاں غالب تخلص دیوان حافظ ان کی لسان الغیبی کے عہد میں دلوں سے فراموش، زبان خلاق المعانی ان کے معنی ایجاد کے زمانہ میں خاموش، چراغ الوری انھیں کے شعلۂ فکر سے روشن اور سینۂ آذری انہیں کی آتش حسرت سے گلخن عنصری ان کے رشک انکار سے ایسا جل گیا کہ گویا اس کا پیکر فقط عنصر آتش سے متکون ہوا تھا اور سحبان ان کی حسرت کمال سے ایسا رویا کہ اس کی بینائی چشم فقط عنصر آب سے بنی تھی زلالی ان کے چشمۂ ہنر کا تشنہ لب اور ابو اسحاق ان کے خوان اطعمہ استعداد سے نعمت طلب خاقانی اس خسرو معنی کی کمتر رعیت اور خسرو اس بادشاہ سخن کے آگے سرگرم خدمت ملاحت کلام سعدی ان کے خوان فیض کی نمک خوار اور شیرینی زبان حافظ ان کی نعمت مقال سے روزینہ دار رنگینی معنی سے صفحہ کو گلزار نگ اور طراحی فکر سے کاغذ کو ارژنگ کرنا خاصہ اسی چمن طراز سخنوری اور نقاش صحیفۂ ہنر پروری کا ہے اگر الفاظ ثقیل سے گرانی اٹھانے تو کوہ کاہ کا حکم پیدا کرے اور اگر سخن میں متانت صرف کرے تو ورق بیاض صدمۂ صرصر سے جگہ سے نہ ہلے قلم ان کا معنی روشن کی تراوش سے فوارۂ نور اور عبارت پاکیزہ ان کی لطف کیفیت سے شراب انگور۔

اگر اس سخن طراز کمال کے استعداد کو جو طرف حصر و شمار سے افزوں ہے خامۂ دو زباں بیان کرے اول چاہیئے کہ ملکہ عقلِ فعال سے عاریت مانگے اور زبان قلم تقدیر سے مستعار لے۔ میں ارادہ کرتا ہوں کہ اس حضرت کے اوصاف حمیدہ اور محامد پسندیدہ کو دفتر کتاب میں درج کروں اور عقل فریاد کرتی ہے کہ ہر گاہ میں نے اس تقدس جوہر اور امداد مبداء فیاض کے ساتھ جب اس امر کا قصد کیا کارکنان بارگاہِ جلال سے کمی استعداد کا طعنہ سنا اور سوء ادب کی سرزنش

حاصل کی تو بایں ہمہ نقصانِ عقل و ہوش کس شمار میں ہے فی الحقیقت اگر لنگ لنگان اپنے تئیں جادۂ مقصود میں ڈال دیا تو ہوس حق السعی یعنی شاباش کی متوقع ہوئی اور حال یہ ہے کہ دشوار پسندان بلند فکر بلکہ دقیقہ یابانِ انصاف طبیعت کے آگے حصول صلۂ آفریں تو کیا خجلت نارسائی اور طعنۂ ناعاقبت بینی سے سر اٹھانے کو جگہ نہ رہے گی ظہوری نے سچ کہا ہے۔

"کسے کہ از عہدۂ ثنائے کسے بیروں نیاید چرا دل بعجز اعتراف نہ نماید"

بہتر یہ ہے کہ فکر کو اس اندیشۂ محال سے باز رکھے اور اپنی نارسائی کا پردہ فاش نہ کرے۔

بیت

بامے است بصد بلند و پستی ہاں پائے نہ لغزدت زمستی

نام نامی اسم سامی ان کے والد ماجد کا عبداللہ بیگ خاں تھا آپ اتراک سے ہیں اور سلسلہ آپ کے نسب کا افراسیاب و پشنگ تک پہنچتا ہے آپ کے بزرگ سلجوقیوں کے عہد میں بسبب اس کے کہ ان کے ہمجنس و ہم گہر تھے فرمانروائی رکھتے تھے۔ جب سلجوقیوں کے عہد سلطنت کا دور اتمام ہوا، ان کے آبا و اجداد نے سمرقند میں توطن اختیار کیا۔ اس حضرت کے جد امجد اپنے پدر مشفق سے ایک امر سہل پر قدرے شکر رنج باہم پہونچا کر ہند میں تشریف لائے اور لاہور میں معین الملک کے رفیق ہوئے اور اس کے تباہ ہونے کے بعد وارد دہلی ہو کر سلطانِ عہد کی سرکار میں سررشتہ ملازمت کو ہاتھ میں لا کر سلسلۂ چاکری کو استحکام دیا حضرت ممدوح کے والد ماجد دہلی میں متولد ہوئے اور یہیں نشو و نما حاصل کی پھر کسی سبب سے بود و باش اکبرآباد میں اختیار کی اور حضرت ممدوح کو والدۂ مشفقہ کے کنار شفقت اور آغوش عاطفت میں پانچ برس کا چھوڑ کر جنات نعیم کے گلگشت کی طرف متوجہ ہوئے۔

آپ کے چچا حقیقی نصر اللہ بیگ خاں کہ اس عہد میں مرہٹہ کی طرف سے اکبرآباد کے صوبیدار تھے آپ کی پرورش اور تربیت میں مصروف ہوئے جب ہندوستان میں تصرف حکام انگریزی کا ہوا نصر اللہ خاں لارڈ لیک بہادر کے رفیق ہو کر چار سو سوار کے رسالہ سے اعادی بادپیما کے ساتھ سرگرم جنگ رہے جرنیل لیک صاحب نے اس کارنمایاں کے صلہ میں دو پرگنہ مضافات اکبرآباد سے ان کی حین حیات تک جاگیر میں عطا کئے پھر ان کے سانحۂ ناگزیر کے بعد جو ۱۸۰۶ء میں پیش آیا۔ جاگیر موافق قرارداد کے ضبط ہوئی اور جاگیر کے عوض میں اس حضرت کے واسطے نقدی مقرر ہو گئی

پھر وہاں سے بسبب انس طبیعت اور میل خاطر کے شاہ جہاں آباد میں تشریف لائے اور اس معاش پر قناعت کر کے گوشہ نشینی اختیار کی ہے اور بہترین شغل آپ کا اس عالم تنہائی میں سخن سنجی اور معنی پروری ہے حق یہ ہے کہ جو ان سخن پر منت اور سر معنی پر بار احسان رکھتے ہیں۔ ہر دائرۂ الفاظ دہن شکر اور ہر حرف زبان سپاس ہے ان کی نعمت تربیت کا راقم آثم کو اعتقاد ان کی خدمت میں ہے اس کا بیان نہ قدرت تقریر میں ہے اور نہ احاطۂ تحریر میں

آسکتا ہے اور چونکہ۔ ؎ دلہا را بدلہا راہ باشد۔

آں حضرت کو بھی وہ شفقت راقم کے حال پر ہے کہ شاید اپنے بزرگوں کی طرف سے کوئی مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہوگا، میں اپنے اعتقاد میں ان کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور ان کے ایک گل کو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں اور اگر دیکھا جائے تو حق بھی یہی ہے خوش حال ان لوگوں کا جو آپ کی خدمت بابرکت سے مستفید ہوتے ہیں اور جواہر گرانمایہ کہ آپ سے حاصل کرتے ہیں اس کو مغتنم جان کر مثل جزو جان حافظہ میں محفوظ اور صندوق بیاض میں امانت رکھتے ہیں اس طرح کے مضامین عطائے مستفید کے پاس خروار خروار فراہم آگئے ہیں اور چونکہ مثل مبدء فیاض کے آپ کی طبیعت فیض موہبت نسبت بخل سے مبرا ہے آپ کو ان جواہر بے بہا کے اعطا میں کچھ دریغ نہیں آتا ہے۔

نطقش کہ بدست جان توانا

چوں بادہ خرد فزائے دانا،

آپ کا جواہر خانہ نفائس سخن حد شمار سے افزوں اور طرف حصر سے بیروں ہے۔ ایک دیوان قصائد و غزلیات کا تیس جزو سے زیادہ مرتب اور منطبع ہوا ہے اور اسی طرح سے نثر اور ایک کتاب پنج آہنگ نام نہایت فوائد جلیلہ پر مشتمل قریب چودہ پندرہ جزو کے آپ کے نتائج فکر سے ہے کہ منتہیان معنی رس کے واسطے مغتنمات عظمٰی سے ہے اور ایک مثنوی مشتمل ادبر غزوات حضرت رسالتماب دستگاہی ختمی پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کے اگرچہ ہنوز ناتمام ہے لیکن پھر بھی قریب پندرہ سولہ جزو کے پہونچ چکی ہے انشاءاللہ تعالیٰ جس وقت اتمام کو پہونچے گی گلدستۂ بزم احباب ہوگی۔

(ماخوذ از آثار الصنادید)

ڈاکٹر ممتاز حسن صدر کانفرنس

غالب اور میں[1]

غالب سے میری عقیدت بہت پرانی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو زندگی کے ایک مرحلے پر خود کو جتنا غالب کے قریب محسوس کیا اتنا کسی دوسرے کے قریب محسوس نہیں کیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ غالب مجھ سے بہت قریب رہا ہے۔

میں نے اپنے ابتدائی زمانے میں غالب کے اردو دیوان کا ایک ایک شعر سبقاً سبقاً پڑھا تھا اور اپنے ہاتھ سے نقل کیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ زندگی کے اندر سے مظاہر کا نظارہ کرنا غالب کے یہاں بدرجہ اتم ملتا ہے اسی بنا پر غالب کا ایسا غلبہ ہوا کہ میں مغلوب غالب ہو گیا۔ اب تک غالب کی پوری پوری غزلیں یاد ہیں۔

میری وابستگی صرف اردو کلام کی حد تک نہیں رہی بلکہ میں نے فارسی کلام بھی پڑھا جس کے متعلق وہ خود کہتا ہے ؎

بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ

اس نقش ہائے رنگ رنگ سے بھی میں لطف اندوز ہوا ہوں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ غالب فارسی کا نہ صرف اعلیٰ ذوق رکھتا ہے بلکہ اس کے نشے سے مست ہے۔ یہ میرا وہ زمانہ تھا جب کہ طبیعت میں خود بینی ذرا زیادہ تھی۔

اس کے بعد جب وہ دور آیا کہ معاملات دنیوی اور انتظامی امور کی ذمہ داریاں اور مصروفیات بڑھ گئیں اس وقت غالب کچھ دور ہو گیا اور جب خود بینی سے گزر کر دوسروں کے اوصاف دیکھے اور یہ جذبہ زیادہ نمایاں ہوا تو اس وقت غالب اور بھی دور ہو گیا اور ایسا محسوس ہوا کہ غالب کی شاعری کا رجحان دل سے زیادہ دماغ کی طرف ہے اور غالب میں خود سپردگی نہیں ہے وہ معاشرے کے مسائل سے بے تعلق سا معلوم ہوتا ہے بلکہ بڑی حد تک بے تعلق ہے اگرچہ اس کے ذاتی تعلقات دنیا سے ہیں، اس کے شاگرد ہیں، اس کے احباب دوست ہیں، اس کے دشمن بھی ہیں۔ اس کو اپنے معمولات سے بھی دلچسپی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں غالب کو

---

[1] یہ مقالہ انٹرویو کی صورت میں محمد ایوب قادری صاحب تحریر میں لائے (ایڈیٹر)

اُدھائی کونت، دلی رنگ اور پور از کہ ہوا۔ دلی اس کا شہر تھا۔ اس کے بزرگوں، اعزہ، دوستوں اور رشتہ داروں کا شہر تھا۔ شباب کا زمانہ اور زندگی کے بہترین شب و روز اس نے دلی میں گزارے تھے۔ وہ دلی برباد ہوگئی۔ تیشۂ وکلند نے اس کی بنیادیں ڈھادیں قلعہ معلیٰ "سپرد فرنگ" ہوگیا۔ وہ بساط الٹ گئی۔ غالب کے یہاں اس بربادی کا ماتم ملتا ہے اپنی حد تک،

غالب سے میری ملاقات کم ہوتے ہوتے بہت کم ہوگئی، تقریباً موقوف، فرد اور معاشرے کا جو تعلق ہے، وہ بہت گہرا مستقل اور پائیدار ہے، فرد کی فلاح و بہبود اور ترقی، معاشرے کی فلاح و بہبود اور ترقی کے ساتھ وابستہ ہے غالب کے یہاں ہمیں معاشرے کا واضح تصور نہیں ملتا، یہی وجہ غالب سے میرے بُعد کی ہے۔ اس سارے دور میں مجھے اقبال نے متاثر کیا۔

اب کچھ عرصے سے میں اپنے کو پھر غالب سے قریب ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب کی زندگی اور شاعری کے چند ایسے پہلو میرے سامنے آرہے ہیں جن پر پہلے نظر نہ تھی، اس میں سب سے پہلی بات غالب کی بشر دوستی ہے دنیا میں اس پائے کا بشر دوست اور انسان دوست بہت کم ہوا ہوگا جیسا غالب ہے، غالب نے اپنے اور دوسرے انسانوں کے درمیان مذہب، رنگ، جغرافیہ یا کسی اور نوع کی دیوار حائل نہیں ہونے دی ہے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

غالب کو اپنی نسل اور اپنے خانوادے پر فخر ہے لیکن وہ دوسروں کو ساتھ لیکر چلتا ہے اور یہ بڑی بات ہے غالب انسان دوست اور انسان نواز ہے۔ تعصب اور دل کی تنگی غالب کے یہاں نہیں ہے۔ اگرچہ وہ معاشرے سے ایک حد تک بے تعلق ہے لیکن وہ کسی درد کے انسان کو مصیبت میں دیکھکر تڑپ اٹھتا ہے اور اس کا دل دوسروں کی ہمدردی سے لبریز معلوم ہوتا ہے۔ ایک دوست کو لکھا کہ کم از کم اتنا تو ہو کہ میں جس شہر میں رہوں وہاں کوئی ننگا بھوکا نظر آئے،

زندگی اور کائنات سے غالب اس طرح سرگرم گفتگو ہے کہ پیہم مکالمہ معلوم ہوتا ہے اور ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ گویا ہی دوسرے مسئلے سے غالب کو کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

وہ ایک فرد کی حیثیت سے اس زندگی یعنی نظام موجودات اور بالفاظ خود "بزم امکان" کا تماشائی ہوا اور ایک تماشائی کی حیثیت سے سب جو دیکھتا ہے وہ دوسروں کو عام طور پر دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔

غالب نے اس پہلو پر جس طرح اظہار خیال کیا ہے اس کو سمجھنے کے لئے فرصت، توجہ اور ذہنی خوش بختی۔ یہ چیزیں لازم ہیں، فکر غالب کی رسائی ملاحظہ ہو۔

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

اسی لئے اقبال نے کہا ہے اور کیسا صحیح کہا ہے۔

فکرِ انساں پر تری ہستی سے جو روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رسائی تا کجا

درحقیقت اس دورِ طلائی کی تخلیق میں اس کا حصہ نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت یہاں بھی ایک ایسے تماشائی کی ہے جو دنیا کی بہتری کی اُمید دل میں لئے ہے

اس کی فکر کا پورا احاطہ کرنا ناممکن ہے وہ زندگی اور کائنات کے اسرار سے واقف ہے وہ انسانیت کے مقامِ رفیع سے واقف ہے ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

اگر کائنات کے رموز و اسرار پر غور کیا جائے تو غالب کی فکر کو سمجھا جا سکتا ہے ہم غالب کا ساتھ نہیں دے سکتے جب تک کہ ہم اس کے ساتھ پورے طور سے ہم آہنگ نہ ہوں۔ یہاں پورے انہماک کی ضرورت ہے۔

غالب جو یائے اسرار ہے وہ ایک حکیم کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب اس بات کا کوشاں ہے کہ زندگی کے آثار و ظواہر سے گزر کر ان کا پردہ چاک کردے اور عینِ حقیقت تک پہنچ جائے وہ رسوم و ظواہر کا قائل نہیں ہے۔

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

جب وہ شوقِ طلب میں تھک کر ٹھیرتا ہے تو دیر و حرم کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایک مقام کو دیر کہتا ہے پھر آگے بڑھتا ہے آگے بڑھتا ہے اور پھر تھک کر ٹھیرتا ہے اس کا نام حرم رکھتا ہے۔

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

اس کی نگاہ ان مقامات اور علامات سے بہت دور لامکاں کی گہرائیوں میں پیوست ہے

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

غالب کے لئے دیر و حرم رموز و علامات ہیں وہ اصل شئے پر نظر رکھتا ہے اور آگے بڑھ کر کہتا ہے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

وہ اس بزمِ امکاں کو تخلیق کا پہلا قدم سمجھتا ہے اور دوسرا قدم

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اس فلسفیانہ شعر کا جواب نہ صرف اُردو بلکہ شاید دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی مشکل سے ملے گا۔

غالب حسنِ حقیقی کی تلاش میں مصروف نظر آتا ہے اور اس کا یہ جذبۂ تلاش پیہم مسلسل اور لا متناہی ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کے دل پر اس حسن کا پرتو پڑا ہے جس نے اس کو بے کل اور بے چین کر دیا ہے۔

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا!

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

بزم مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

غالب نے حسن کے انفرادی مظاہر کا بھی نظارہ کیا ہے حتیٰ کہ ابتدائے عمر میں ایک آدھ مرتبہ دل باختگی کی کیفیت بھی وارد ہوئی ہے لیکن بعد میں جب اس کی طبیعت میں توازن اور ٹھہراؤ پیدا ہوا تو وہ حسن کے انفرادی مظاہر سے گزر کر حسن محض کا طالب نظر آتا ہے۔ اور اس کی روح بے چین و مضطرب بلکہ مقید نظر آتی ہے دیکھئے اس نے جلوؤں میں منظر نگاری کا کیا بند و بست کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہرے بٹھا رکھے ہیں۔

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے

یہاں حسن اور اس کے درمیاں اس کی نگاہ حائل ہے پھر کہا ہے

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

اس کے اور آگے بڑھکر جہاں منزل تک رسائی ہوتی ہے وہاں کا عالم ملاحظہ ہو۔

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

وہ حسن کا حصہ بننا چاہتا ہے وہ ہوا اور حسن ہو، غیر کا کوئی علاقہ نہ ہو، یہ وجدانی کیفیت ہے اور بیان سے باہر ہے۔

حسن اور حقیقت، حقیقت اور حسن یہ دو چیزیں ہیں جن کی طرف غالب ہماری رہنمائی کرتا ہے اگر زندگی ان دو چیزوں سے عاری ہو تو زندگی بے کیف و بے رنگ ہے، سچی بات یہ ہے کہ غالب ایک سمندر ہے جس کی تھاہ نہیں، غالب خود بیں اور انفرادیت پسند ہے اور وہ اپنی انفرادیت کو ہر جگہ نمایاں اور برقرار رکھتا ہے اور اپنے لئے ایک نیا راستہ تلاش کرتا ہے اور دوسروں کی تقلید کو باعثِ ننگ و عار سمجھتا ہے۔

از اں کہ پیروئی خلق گمرہی گردد نمی رویم براہے کہ کارواں رفت است

با من میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

غالب، حقیقت و حسن کے سامنے بے اختیار جھک جاتا ہے وہ اس موقع پر پکا غیر مقلد نظر آتا ہے۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی!

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم الٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ غالب کا رجحان دل سے زیادہ دماغ کی طرف ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے یہاں تغزل نہیں ہے اور بہت ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ بیدل کا پیرو تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے منفرد رنگ کا مالک ہے۔ یہی غالب انفرادیت ہے وہ مقلد اور متبع نہیں ہے۔ وہ اظہار بیان میں عامیانہ رنگ اور سادہ انداز اختیار نہیں کرتا ہے بلکہ اگر یہ صورت ہوتی ہے تو وہ تشبیہہ و استعارے سے رنگ آمیزی کرکے اپنے بیان کو حسن صوری بخشتا ہے، بلکہ غالب کو اپنی مشکل پسندی کا خود بھی احساس تھا جیسا کہ اس رباعی سے ظاہر ہے۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

غالب نے رمز و کنایہ میں بھی خوب جلوہ گری کی ہے اور رمز و ایمائیت غزل کی بنیاد ہے اقبال نے کہا ہے

برہنہ حرف نگفتن کمال گویائی است حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

غالب کے یہاں رمز و کنایہ کی کیفیت ملاحظہ ہو۔

موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا زخم کے بڑھنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

غالب کے یہاں تغزل ملاحظہ ہو۔

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی

فارسی کا شعر ہے۔

وداع و وصل جداگانہ لذتی دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

اس شعر کا جواب نہیں ہے جتنی مرتبہ پڑھئے ایک نئی لذت اور کیف حاصل ہوگا۔ غالب ایک حقیقت نگار شاعر ہے۔ اسکی نظر انسان کے دل و ذہن پر رہتی ہے وہ اپنے مشاہدے کو شعر کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ غالب کا فلسفیانہ مشاہدہ ملاحظہ ہو۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

غالب انسانی زندگی کا نباض اور انسانی عظمت کا علم بردار ہے اس نے انسانی زندگی کا بھرپور مشاہدہ کیا ہے۔ غالب کہتا ہے۔

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرینا، گنہگار ہیں ہم

نہ پاس گریباں نہ پروائے داماں
ہجوم تمنا سے ناچار ہیں ہم

غالب کی عظمت کا اعتراف ہر صاحب نظر کو ہے سر شیخ عبدالقادر نے غالب کو اقبال کے رنگ میں جلوہ گر دیکھا چنانچہ وہ لکھتے ہیں :۔

"غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اردو و فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا، اس نے ان کی روح کو عدم میں جاکر چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔ (بانگ درا۔ دیباچہ از سر شیخ عبدالقادر)

غالب کے یہاں حسن حقیقی کی حرارت ہمہ وقت محسوس ہوتی ہے چنانچہ سوز، شعلہ، آتش، شرر، سوزش، سوختن جیسے الفاظ اس کے یہاں بکثرت ملتے ہیں یہ اظہار خیال مشہور مستشرق پروفیسر اینے مری شمل نے کیا۔ اردو کے مشہور ادیب شاعر شان الحق حقی کی تحقیق ہے کہ غالب کے یہاں لفظ آئینہ کا استعمال سب سے زیادہ ہے جس سے اسکی انفرادیت اور خود بینی اور ایک حد تک نرگسیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

جلوہ ازبسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

بر روئے شش جہت در آئینہ باز ہے
یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

غالب کی حسن مطلق سے والہانہ وابستگی ہے غالب کا جس قدر زیادہ مطالعہ کرو اسی قدر احساس ہوتا ہے کہ وہ ذہنی و روحانی ثروت کا گنجینہ ہے غالب ہر دور میں میرے ساتھ رہا اور اب میں اسکو پہلے سے زیادہ اپنا رفیق پاتا ہوں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
شیخ الجامعہ، کراچی

غالب کی مؤرخانہ حیثیت

ملک کے نامور عالم، محقق اور مورخ شیخ الجامعہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ واقعات ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں مرزا غالب کی مشہور تالیف "دستنبو" ایک نوشتہ ہے اور یہ کتاب ایک ہم عصر ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس کتاب سے اس قدر استفادہ نہیں کیا گیا جتنا کرنا چاہیے تھا۔ اس سے استفادہ کرنا آسان بھی نہیں ہے غالب نے پوری کتاب پاکستانی زبان میں لکھی ہے۔ اگرچہ اس میں واقعات وہی بیان کئے گئے ہیں جو عام طور سے مشہور ہیں مگر پھر بھی اس میں بعض مفید اور نادر معلومات مل جاتی ہیں

دستنبو کے مقابلے میں سرسید احمد خاں کی کتاب "رسالہ اسباب بغاوت ہند" کو کافی استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ کتاب اردو زبان میں ہے اور پھر اس ہنگامے میں سرسید احمد خاں خود بھی ایک کردار رہے ہیں علاوہ بریں مورخ کو اسباب و علل سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے اور تفصیلی واقعات سے کم۔ غالب نے دستنبو میں بعض واقعات اشارتاً لکھے ہیں اور بعض واقعات بچا کر لکھے ہیں مثلاً وہ سقوط دہلی سے پہلے ہی کتاب ختم کر دیتے ہیں۔ یہ اس زمانے کے حالات کا تقاضا تھا اور اس میں غالب کچھ زیادہ قابل الزام بھی نہیں ہیں انگریزوں کے جبر و استبداد کے اس دور میں اکثر لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا

میرے گھر کا ایک واقعہ خود اسی قسم کا ہے کہ میرے دادا کے حقیقی بھائی نے جنگ آزادی میں حصہ لیا جس کے نتیجے میں ان کو پھانسی دی گئی وہ بڑے زور آور اور پہلوان آدمی تھے اور ان کے جلادت و بہادری کے قصے دور دور مشہور تھے۔ ان کی وجہ سے خاندان پر مصیبت آنی لازمی تھی۔ میرے دادا قاضی تصدق حسین نے اس علاقے کے سربرآوردہ موثر ہندوؤں سے اس قسم کی تحریرات حاصل کیں کہ وہ (تصدق حسین) اس ہنگامے میں شریک نہ تھے۔ غالب بے چارے نے بھی پنشن کی بحالی اور دوسرے وجوہ کی وجہ سے دستنبو میں واقعات بچا کر ضرور لکھے ہیں مگر اس کی تاریخی اہمیت مسلم ہے اور وہ واقعات

۱۸۵۷ء کے سلسلے میں ایک اہم تاریخی مآخذ ہے

غالب کی دوسری کتاب مہر نیم روز ہے مہر نیم روز کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اسی وہ حیثیت نہیں ہے جو دستنبو کی ہے اسلئے کہ غالب نے اس میں دوسرے تاریخی مآخذ کو سامنے رکھ کر اپنے انداز میں واقعات لکھ دیئے ہیں اور یہ حالات بھی ان کو دوسرے لوگ انتخاب کر کے دیتے تھے اسی لئے مہر نیم روز کی طرف کبھی توجہ نہیں کی گئی۔ مورخ اصل ماخذ کی طرف ثانوی تحریروں کے مقابلے میں فطرتاً زیادہ متوجہ ہوتے ہیں ۔

خطوط غالب پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ان خطوط کی ادبی حیثیت مسلم ہے ۔ صلاست، روانی، ظرافت کا ایک حسین امتزاج اور مکالمہ نگاری ان خطوط کی خصوصیات ہیں ۔ مگر ان باتوں کے علاوہ غالب کے خطوط اس دور کی سماجی و معاشرتی حالت کا ایک جیتا جاگتا مرقع ہیں اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے سلسلہ میں دہلی کی بربادی کی ایک نادر دستاویز ہیں جس میں واقعات بغیر کسی مصلحت کے بیان کئے گئے ہیں عوام وخواص کا مرثیہ لکھا گیا ہے ۔ دہلی کی بربادی پر افسوس کیا ہے ۔ اگر غالب کے یہ خطوط ہمارے سامنے نہ ہوتے تو دہلی کی بربادی کی اتنی مکمل و متاثر تصویر شاید نہ ملتی ۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ مجھے غالب کا اردو کلام بہت پسند ہے اور حقیقت یہ ہے کہ میرے دو پسندیدہ شاعر ہیں۔ خواجہ میر درد، اور غالب ۔

غالب کے کلام میں شوخی اور حسن بیان بدرجہ اتم ہے اور پھر غالب کے کلام میں فلسفیانہ عنصر اور تصوف کی چاشنی میرے لئے بہت جاذبیت رکھتی ہے ۔ غالب اگرچہ خود صوفی نہیں تھے مگر انہوں نے جس انداز سے تصوف کے مسائل اور رموز و نکات اپنے کلام میں پیش کئے ہیں اس سے وہ صاحب قال کی بجائے صاحب حال معلوم ہوتے ہیں

اتفاق کی بات ہے کہ غالب کے واقعات زندگی معلوم و مشہور ہیں ان کی آزاد خیالی ان کی رندمشربی، ان کا شغل ناؤنوش کوئی ڈھکے چھپے واقعات نہیں ہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا اور ان کے واقعات پر زمان و مکان کی دوری یا عدم واقفیت کا پردہ پڑا ہوتا تو وہ ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے روشناس خلق ہوتے ۔

ڈاکٹر صاحب نے جب غالب کے اشعار پڑھنا شروع کئے تو بغیر وقفے کے مسلسل اشعار پڑھتے گئے اور پھر ان پر اظہار خیال بھی فرماتے گئے معلوم ہوتا تھا کہ "دہلی کے نظام حکومت یا تحریک آزادی" پر اظہار خیال نہیں فرما رہے ہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا عنوان ہے "غالب بحیثیت صوفی شاعر"

ڈاکٹر صاحب نے مندرجہ ذیل اشعار ارشاد فرمائے ۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو — اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے
نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو — خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہئے

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے — بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگام بےخودی — رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیئے

یعنی بحسب گردش پیمانۂ صفات — عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیئے

غالب نے ان اشعار کو بڑی خوبصورتی اور بلاغت سے تصوف کے مرکزی نقطے کی طرف اشارے کئے ہیں۔

غالب کے مندرجہ ذیل اشعار کتنے سادہ اور تصوف کے اثر سے پُر ہیں۔

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

مندرجہ ذیل اشعار بھی سنیئے

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے — جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر — یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

غالب وحدت الوجود کے فلسفے کے مشاد ہیں۔ کتنا لطیف شعر ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غالب بلاشبہ ایک عظیم شاعر، ادیب اور فنکار تھے، امید ہے کہ ادارہ "العلم" اس موقع پر جو خاص نمبر نکال رہا ہے وہ اس سلسلے میں ایک یادگار چیز ہوگی۔[1]

---

[1] یہ مضمون بصورت انٹرویو تحریر میں آیا۔ (ق)

پیر سید حسام الدین راشدی

غالب شناسی

غالب کی صدسالہ یادگار کے سلسلے میں نہ صرف پاکستان و ہند میں دھوم مچی ہوئی ہے بلکہ اس کا شہرہ روس، انگلینڈ اور امریکہ تک پہنچ چکا ہے غالب کا یہ اعجاز ہے کہ خالص تحقیقی و تاریخی کام کرنے والے حضرات بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے، ملک کے نامور محقق، مورخ اور مصنف پیر سید حسام الدین راشدی نے بھی اس صد سالہ یادگار کی تقریب کے موقع پر ایک قابل قدر کتاب مرتب فرمائی۔ اس کتاب میں انہوں نے، ناطق مکرانی، خادم بردوانی، طرزی، رسوا، اور باتر پر مقالے لکھے ہیں ان حضرات کے حالات کے ساتھ ان کا انتخاب کلام دیا ہے۔ اور غالب سے تعلقات کا اظہار کیا ہے خیال یہ ہے کہ مرزا غالب کے سلسلے میں یہ ایک خاصے کی چیز ہوگی۔

جب مرزا غالب پر پیر صاحب سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے اس طرح گفتگو فرمائی کہ گویا ہمیشہ سے ان کا خاص موضوع "غالب" رہا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ غالب کا مطالعہ اس طرح نہیں ہوا جس طرح ہونا چاہئے تھا غالب کے حالات کی تدوین و ترتیب کے سلسلے میں سب سے پہلے غالب کی جملہ تصنیفات و کلام پر گہری نظر ہونی چاہئے پھر ان کے تلامذہ احباب اور دوسرے متعلقین کی تصنیفات کو پرکھنا چاہئے پھر اس کے زمانے کا جو لٹریچر اور اخبارات ہیں ان کو دیکھنا چاہیے اس کے ساتھ ساتھ یہ سراغ لگانا چاہئے کہ غالب کے کلام پر کن کن اساتذہ کا رنگ غالب ہے۔ بعض کے نام معلوم ہیں اور بعض کو معلوم کرنا چاہئے۔ اس کے بعد غالب کی کچھ تصویر بنے گی۔ اور اس طریقے سے ابھی تک غالب پر کام نہیں ہوا ہے۔

محققین غالب کے کام پر تبصرہ کرتے ہوئے پیر صاحب نے فرمایا کہ اس سلسلے میں تحقیقی اعتبار سے قابل قدر کام مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے انجام دیا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر غالب شناسی کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں اور مالک رام صاحب کے یہاں زبان کی شیرینی کے ساتھ ساتھ نیازمندی کی جھلک پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ لیکن جتنا

تحقیقی سرمایہ اس وقت موجود ہے وہ یورپین اندازِ تحقیق کے معیار پر نہیں اترتا اس لئے یورپ کے محقق اگر غالب کے سوانح اور کوائفِ زندگی پر لکھنا چاہیں تو یہ سرمایہ ان کے کام میں نہیں آسکتا ہے بلکہ ممکن ہے کہ ان کے ذہنوں کو الجھا دے اگرچہ اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ ہماری حد تک یہ سرمایہ حرفِ آخر کا حکم رکھتا ہے۔ پیر صاحب نے فرمایا کہ بہرحال غالب پر کام کرنے کی ابھی بہت کچھ گنجائش باقی ہے۔ اس صد سالہ یادگار کی تقریب کے سلسلے میں غالب پر جو لٹریچر شائع ہوگا ممکن ہے اس کے بعد کام کے لئے کچھ اور نئی راہیں کھل جائیں۔

انہوں نے ایک چیز کی طرف خاص طور سے اشارہ کیا کہ غالب کے یہاں اس بات کا صاف طور سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ "احساس کمتری" میں مبتلا ہیں وجہ ظاہر ہے کہ دہلی میں جس سوسائٹی اور معاشرے سے ان کا واسطہ ہے وہ دنیوی وجاہت اور مالی اعتبار سے صف اوّل کا معاشرہ ہے۔ نواب لوہارو سے ان کی رشتہ داریاں، مفتی صدرالدین آزردہ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولانا فضل حق خیر آبادی اور دوسرے اکابر دہلی کے مقابلے میں غالب نہیں ٹھہرتے لہذا وہ اس کمی کو دوسرے انداز سے پورا کرتے ہیں اور کبھی "فارسی گویان ہند" پر تبرا کرتے ہیں اور کبھی "ما نہ خاکِ پاکِ تورانیم"

کا راگ الاپتے ہیں اور کبھی اپنی فارسی دانی کا اعلان فخر ومباہات کے انداز میں کرتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ وہ "عبدالصمد" نام کی شخصیت تراشتے ہیں۔ ایران اور ہندوستان کے تذکرے عبدالصمد کے حالات میں یکسر خاموش ہیں اور پھر ایران کے "علمائے زرتشت" فارسی زبان وادب کے ماہر ہونے کی حیثیت سے کوئی امتیاز و اختصاص نہیں رکھتے ہیں۔ اور اس اعتبار سے "یزد" کا کوئی مقام نہیں ہے۔ غالب کو شاید یہ بات معلوم بھی نہیں ہوگی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ غالب ذہین اور اعلیٰ فکر کے مالک تھے۔ انہوں نے فارسی کا مروجہ نصاب پڑھا تھا مگر طبیعت کی درّاکی اور ذہن کی تیزی نے فارسی کا اعلیٰ ذوق بخشا۔ انہوں نے فیضی و ابوالفضل سے استفادہ کیا ہے۔ غالب کے اردو خطوط میں جو مکالمہ کا انداز ہے یہ فیضی و ابوالفضل کا فیض ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کے خطوط میں بھی یہ بات موجود ہے۔ غالب نے پہلے فارسی خطوط میں اس رنگ کو اپنایا اور پھر اردو میں اس کو جاری کیا۔

پیر صاحب نے فرمایا کہ غالب کی فارسی شاعری پر بھی کام نہیں ہوا ہے اس لئے غالب کا ایران میں تعارف نہیں ہوا۔ ان کے فارسی کلام کا کوئی اچھا اور مستند ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ ان کا خیال ہے کہ اگر سال ڈیڑھ سال کی مدت مل جائے تو وہ غالب کے فارسی دیوان کو اس طرح مرتب کریں کہ جو غالب کے شایانِ شان ہو۔ خاص بات یہ ہوگی کہ وہ بتائیں گے کہ کہاں کہاں سے غالب نے استفادہ کیا ہے اور کس کس کے وہ متتبع ہیں۔

صد سالہ یادگار کے موقع پر پاکستان میں جو کام ہو رہا ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پیر صاحب نے فرمایا کہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ محدود ذرائع کے باوجود مختلف علمی ادارے اس عظیم شاعر کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں اور ان ہی کاموں سے زندہ قومیں جانی پہچانی جاتی ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اس سلسلے میں سب سے اہم کام دیوانِ غالب کا

"شیرانی نسخہ" اور حمیدیہ نسخہ کی اشاعت ہے جو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے عمل میں آ رہی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے دوسرے منصوبے مثلاً خطوط غالب (اردو) اور (فارسی) اور اشاریہ غالب بھی قابل قدر ہے۔

انہوں نے فرمایا کہ انجمن ترقی اردو (کراچی) بھی اس موقع پر پانچ چھ کتابیں غالب سے متعلق شائع کر رہی ہے اور "اردو" کا غالب نمبر بھی اسی منصوبے کی کڑی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے "غالب یادگار کمیٹی" کے کام پر اظہار فرمایا اور کہا کہ اس کا سارا سہرا خواجہ ظفر الحسن کے سر ہے کہ جو ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواہ کئے بغیر غالب کی نصف درجن کتابیں شائع کر رہے ہیں۔ اور پھر اس سلسلے میں ایک یادگار جلسہ منعقد کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ "ماہ نو" (کراچی) "نقوش" (لاہور) "صحیفہ" (لاہور) اور "العلم" (کراچی) کے غالب نمبر بھی توقع ہے کہ ایک خاص حیثیت کے مالک ہونگے۔

انہوں نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ ہندوستان غالب کی تقریب میں جو رادر دہش دکھا رہا ہے وہ بہت بڑی علمی خدمت ہے اور دنیا میں جو غالب کے متعلق کام ہو رہا ہے اس میں ہندوستان کے سفارتخانوں کی عملی قوت کا مظاہرہ ہے۔

پیر صاحب نے ایک بات کی طرف اور توجہ دلائی کہ ملک میں مختلف ادارے غالب پر کام کر رہے ہیں اور بعض لوگ انفرادی طور سے کام کر رہے ہیں مگر ان میں کوئی رابطہ اور تعلق نہیں ہے جس سے کام کی حیثیت متاثر ہوتی ہے اگر رابطہ ہوتا تو بات اور بہتر بنتی۔

شاید یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہو کہ کراچی کے ذاتی کتب خانوں میں پیر صاحب کا کتب خانہ نہایت اعلیٰ ہے اور غالب کے اوپر جتنا مواد ان کے کتب خانے میں موجود ہے شاید ہی کسی کے پاس ہو جبکہ انہوں نے کبھی خاص طور سے غالب پر کتابیں جمع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ غالب کے دیوان (اردو) درفش کاویانی، دستنبو، قاطع برہان وغیرہ کے پہلے ایڈیشن ان کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ [1]

[1] یہ مضمون بصورت "انٹرویو" تحریر میں آیا (ق)

سید ہاشم رضا

غالبؔ کی آفاقیت

غالب ایک عظیم شاعر ہے اس کی قدر آج سو سال کے بعد ہو رہی ہے۔ اس کے کلام کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ ہر دور و زمانہ کے لوگ اس کی شرح اپنے حال کے مطابق کرتے ہیں اس اعتبار سے غالب کے کلام کی شرحیں ہر زمانے میں نئی لکھی جائیں گی اس کی شاعری آفاقی اور اس کا پیغام ہمہ گیر ہے۔ یہ الفاظ سید ہاشم رضا صاحب نے غالب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمائے۔ انہوں نے فرمایا کہ غالب نے زندگی سے گریز نہیں کیا ہے بلکہ زندگی کی صعوبتوں پر اس نے اپنے کلام کی بنیاد رکھی ہے اور جب میں اس کا کلام پڑھتا ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہر غزل کے پس منظر میں کوئی بڑا سانحہ پوشیدہ ہے یہ غالب کی بدنصیبی ہے کہ زندگی بھر اس نے مصیبتیں جھیلیں اُردو کی یہ خوش نصیبی ہے کہ مصائب انہوں نے بھگتے اور لطف ہم اٹھا رہے ہیں۔ غالب نے خوشامد پر کیسا بھرپور طنز کیا ہے۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا   وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

لوگ اقتدار کے نشے میں مست و بیخود ہو جاتے ہیں اور اپنے مخاطب کو خاطر میں نہیں لاتے ان کا لب و لہجہ بگڑ جاتا ہے غالب کس تیکھے انداز میں کہتا ہے۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے"   تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

میر انیس نے فرمایا ہے۔

دہان کیسہ زر بند رکھ پرا سے منعم   خدا کے واسطے وا کر جبیں کی چینوں کو

مرزا غالب کی عظمت ملاحظہ ہو کہ اس نے اپنے عیبوں کو چھپایا نہیں ہے۔ ہر چیز کو کھول کھول کر بیان کیا ہے اس کا انداز یہ نہیں ہے کہ بر سر محراب و منبر" کچھ اور کہے اور "خلوت" میں کچھ اور کرے۔ غالب کہتا ہے

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

مہندر سنگھ بیدی نے کیا خوب کہا ہے

شیخ جو کچھ کہے کرو بے شک شیخ جو کچھ کرے کبھی نہ کرو

غالب کا یہ شعر پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے آج کے حالات پر تبصرہ کیا ہے۔

بوئے گل نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

دوسرا شعر بھی اسی انداز کا ہے۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

یکطرفہ فیصلے پر غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

مولانا محمد علی جوہر نے اس باب میں اپنی عزیمت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

ہم کو خود شوقِ شہادت ہے گواہی کیسی فیصلہ کر بھی چکو ملزمِ اقراری کا

غالب نے تسکین قلب کے لئے کیا سہارا لیا ہے۔

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

غالب نے عدم التفات پر اظہار خیال کیا ہے۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

غالب نے ارباب ہنر کی ناقدردانی پر شکوہ کیا ہے۔

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجئے ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے، کیا کہئے

ہندوستان سے جب مہاجرین کا سیل رواں آیا تو ہمیں ان کی آبادکاری کے سلسلے میں براہ راست واسطہ پڑا۔ شاید غالب نے یہ اشعار اسی موقع کے لئے کہے تھے۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو توڑا جو تو نے آئینہ، تمثال دار تھا

اسی مضمون کو میرے بھائی سید آل رضا نے اس طرح ادا کیا ہے۔

اٹھا کے بزمِ محبت سے لے گئے جن کو عجب مزاج کی شمعیں تھیں جل سکیں نہ کہیں

سید آل رضا کے دو شعر اور ملاحظہ ہوں۔

رکے، تو پاؤں پکڑلے نہ پھر زمین کہیں چلے چلو کہ وہ مل جائیں گے کہیں نہ کہیں

ہمارے منہ پہ رضا تذکرے محبت کے ۔۔۔ کہ جیسے ہم نے یہ باتیں کبھی سنیں نہ کہیں

غالب کی جس غزل نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اس کے چند اشعار یہ ہیں

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے ۔۔۔ کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
شرم رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں ۔۔۔ ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی ۔۔۔ اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا ۔۔۔ دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے
گر شبِ ہجر پیامِ چشمِ محو دمِ جاں ۔۔۔ ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

غالب کی مقبولیت کا اندازہ آج اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کی عظمت کا اعتراف صرف پاکستان و ہند ہی میں نہیں ہو رہا ہے بلکہ روس اور انگلینڈ، امریکہ، اٹلی اور جرمنی میں بھی اس پر کام ہو رہا ہے اور وہاں کے ادیب اور دانشور بھی اس سے دلچسپی لے رہے ہیں۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ۔۔۔ ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

ہمیں توقع ہے کہ اس موقع پر "العلم" کا غالب نمبر بھی اس عظیم شاعر کے شایانِ شان ہوگا۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

غالب کا فلسفہ[1]

یہ امر بحث طلب ہے کہ غالب کا کوئی خاص فلسفہ ہے یا نہیں۔ ہر بڑا فلسفی ایک نظامِ فکر مرتب کرتا ہے اور تمام اعیان و حوادث کو استدلال کی ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کرتا ہے ہر جگہ علت اور معلول مقدمات اور نتائج کی کڑیاں ملاتا ہے اور اس کے لیے ساعی ہوتا ہے کہ اس کے افکار میں ایک اساسی توافق ہو تاکہ اس پر تناقض اور تضاد کا الزام عائد نہ ہو لیکن یہ کام شاعر کا نہیں ہے۔ شاعر کے اندر یہ میلان نہیں ہوتا کہ حادث اور قدیم کا تعلق ڈھونڈے یا کثرت میں وحدت کی تلاش کرے اور نہ اس کو یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ فکر تاثر اور عمل میں مدافعت پیدا کرے۔ کسی اتفاق سے مدافعت ہو جائے تو اچھا لیکن اگر نہ ہو تو وہ اس سے بے نیاز ہوتا ہے اس لیے شاعر عملی زندگی میں دوسروں کا رہنما بھی نہیں ہو سکتا۔

---

[1] یہ مضمون بصورت انٹرویو تحریر میں آیا۔ (ق)

نصیب اختر ایم اے

غالبؔ کے آباؤ اجداد

(تاریخ کی روشنی میں)

پوچھتے ہیں وہ ! کہ غالبؔ کون ہے ؟

...... ہم بتلائیں کیا۔ خود غالبؔ کا دعویٰ یہ ہے :

"از دہلی تا اکبر آباد صد ہزار کس دریں جزو زماں موجود اند کہ می دانند"[1] بلکہ "آپ صرف دہلی لکھکر...... نام لکھ یا کیجئے خط کے پہنچنے کا میں ضامن"[2] کلکتہ سے ولایت تک وزراء کے محکمہ میں اور ملکۂ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف (مرزا نوشہ) کو نہ جانتا ہو لیکن "اسد اللہ خاں بہادر غالبؔ" سے ضرور واقف ہوگا[3] غالبؔ کو یہ "نام آوری" بلاشبہ شاعری کی وجہ سے حاصل ہوئی لیکن وہ شاعری ہی کو ذریعۂ عزت نہیں سمجھتے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مرزا کو جتنا اپنی شاعری پر ناز تھا اتنا ہی اپنی عالی نسبی پر فخر تھا۔ ملاحظہ کیجئے، بہادر شاہ ظفر کے قصیدے میں اپنی ہی مدح کا یہ شعر۔

سلجوقیم بہ گوہر و خاقانیم بہ فن
توقیعِ من بہ سنجر و خاقاں برابر است

---

[1] غالبؔ نمبر۔ علی گڑھ میگزین ۴۹ - ۱۹۴۸ء ص ۲۲

[2] "خطوط غالبؔ" مرتبہ غلام رسول مہر جلد اول ص۲۳ کتاب منزل لاہور ۱۹۵۱ء (خط بنام علاء الدین احمد خاں علائی)

[3] ایضاً ص ۱۵۲، ۱۵۵ (خطوط بنام تفتہ)

"اسد اللہ خاں بہادر غالبؔ" کا یہ فرمانا بجا اور درست اور اس بیان کو مان لینے میں کچھ تامل بھی نہیں۔ ان کے سلجوقی ترک نژاد ہونے اور اس نسبت سے خاقان ترکستان اور عظمت و جلالت کیانی میں سلجوقی سلطان سنجرؔ[1] کی ہمسری اور ہم نسبی کے دعوے میں بھی شک وشبہ کی کوئی وجہ نہیں۔ چہرہ مہرہ سے "اخیر عمر میں بھی ...... ایک نووارد تورانی معلوم ہوتے تھے۔[2] اور ایک تورانی کا خود کو سلجوقی بتانا اور یہ کہنا کہ وہ "سلطان برکیارق سلجوقی کی اولاد میں ہے"[3] قرین قیاس ہے۔ لیکن سلجوقی سلطان برکیارق تک سلسلہ نسب کی تمام کڑیاں ملانا خود غالب کے لئے بھی "جوئے شیر" لانے سے کم نہ تھا۔

سلطان برکیارق بن ملک شاہ (اول) نے عین عالم جوانی میں بعمر ۲۵ سال وفات پائی (ربیع الثانی ۴۹۸ھ م دسمبر ۱۱۰۴ء)[4] مرنے سے پہلے اپنے خورد سال بیٹے ملک شاہ (ثانی) کو جو اس وقت ۴ سال ۸ ماہ کا تھا اپنا جانشین نامزد کیا، اور امیر ایاز کو اس کا اتابک۔ لیکن جب برکیارق کے سوتیلے بھائی سلطان محمد بن ملک شاہ کو بھائی کے مرنے کی خبر ہوئی تو اس نے بھتیجے پر فوج کشی کی۔ اُمراء نے بیچ میں پڑ کر صُلح کرا دی۔ سُلطان محمد کو پوری سلطنت مل گئی اور ملک شاہ بن برکیارق کو محض اس کا سایۂ عاطفت۔ یہ واقعہ ماہ جمادی الاولیٰ ۴۹۸ھ م فروری ۱۱۰۵ء کا ہے[5] گویا ملک شاہ بن برکیارق اپنے بچپن میں تقریباً ایک دو ماہ سلطان رہا۔ اس کے بعد برکیارق کی اولاد میں کوئی سلطان نہیں ہوا۔

اگرچہ یہ چند روزہ سُلطان ملک شاہ ثانی، سلجوقیوں کے دورِ انحطاط کی پیداوار تھا۔ تاہم اس نے اپنے چچا سلطان سنجر کی شان وشوکت کا زمانہ دیکھا ہوگا جس میں بقول راوندی "خسرو آفاق عجم اور سلاطین کیانی کی ہیبت وعظمت تھی"[6] جس کے نام کا خطبہ "۴۰ سال تک ممالک اسلامیہ کے منبروں پر پڑھا گیا"[7] جو اولادِ نرینہ سے محروم تھا، "سخی اور نرم دل تھا"[8] اور اپنے بھائیوں، بھتیجوں اور بھانجوں سے بڑی محبت کرتا تھا۔ اس نے سگے اور سوتیلے کی کوئی قید

---

[1] سلجوقی سلطان سنجر (المتوفی ۵۵۲ھ) جس نے خراسان و ماوراءالنہر پر بڑی شان وشوکت سے حکومت کی۔

[2] حالی (جنہوں نے غالب کو بچشم خود دیکھا تھا) "یادگار غالب" ص ۶۲ مطبوعہ لاہور

[3] احوال غالب مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڈھ۔ زیر اہتمام مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۵۳ء (غالب کے خود نوشت حالات کا عکس)

[4] ثناء اللہ "انحطاط سلطنت سلجوقیہ" ص ۱۱۲، مطبوعہ کلکتہ یونیورسٹی ۱۹۳۸ء

[5] تاریخ ابن خلدون جلد ہفتم ص ۱۳۳ (اردو) نفیس اکیڈمی ۱۹۶۱ء

[6] راوندی، "راحۃ الصدور" ص ۱۷۱

[7] تاریخ ابن خلدون جلد ہفتم ص ۲۴۰

[8] تاریخ الکامل ابن اثیر جلد ۱۱ ص ۱۴۷ مطبوعہ لیڈن

تھی بلکہ اسے بقول ابن اثیرؒ اپنے سب بھتیجوں سے محبت تھی۔[1] ممکن ہے کہ یتیم بھتیجے نے بھی سلطان محمد بن ملک شاہ اول کی وفات آخر ذی الحجہ ۵۱۱ھ م اپریل ۱۱۱۸ء) کے بعد اسی چچا کے دامن سے وابستہ ہو کر جوانی کے ایام گزارے ہوں اور ماوراء النہر کو وطن بنا لیا ہو اور شاید اپنے بڑھاپے میں وہ دن بھی دیکھے ہوں جب مشفق چچا سلطان سنجر وحشی ترکان غز کے ہاتھوں میں گرفتار ہوا (۵۴۸ھ م ۵۳ - ۱۱۵۲ء) اور ماوراء النہر سے خراساں تک تمام علاقہ ان کی وحشیانہ تاخت وتاراج کا نشانہ بنا آخرکار سلطان آزاد ہو جانے کے باوجود اس صدمہ سے جانبر نہ ہوسکا اور ربیع الاول ۵۵۲ھ م اپریل ۱۱۵۷ء) میں انتہائی دل شکستہ ہو کر اس دنیا سے چلا اور پھر سلطنت کی شکستہ ریخت بھی کسی طرح نہ رک سکی آخر خوارزمیوں نے سلجوقی سلطنت کا چراغ ہی گل کر دیا۔ ۵۹۰ھ م ۱۱۹۴ء میں آخری سلجوقی سلطان طغرل کا سر خلیفہ بغداد الناصر لدین اللہ کے دربار میں ملاحظہ کے لئے بھیجد یا۔ ب ان بے سہارا سلجوقیوں کے لئے اسی نسل کے ایک فرد کے بقول "بعد سپری شدن روزگار رجاہ مندی ..... ذوق رہزنی غارت گری از جائے بردو طائفہ راکشاورزی پیشہ گشت۔"[2] ممکن ہے کہ تقریباً ستانوے سالہ بوڑھے سلطان ملک شاہ ن برکیارق کو اگر اس نے اتنی طویل عمر پائی در بدر کی خاک بھی چھاننا پڑی ہو ورنہ اس کی اولاد کی قسمت میں یہ دشت نوردی و در لکھی تھی اور وہ ہی نہیں بلکہ نہ معلوم کتنے سلجوقی سلطان زادے خانماں برباد آوارہ وطن پھرے درفش کاویانی کی درج یل عبارت بھی اسی ہنگامہ قیامت خیز کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

"بالجملہ سلجوقیاں بعد زوال دولت و برہم خوردن ہنگامۂ سلطنت در اقلیم
وسیع الفضائے ماوراء النہر پراگندہ شدند از اں جملہ سلطان زادہ ترسم
خاں کہ ما از نژادِ ئیم سمرقند را بہر اقامت گزید۔"[3]

سلطان ملک شاہ بن برکیارق کے یوم ولادت اور اس "روز سیاہ" کے درمیان کچھ زیادہ طویل مدت نہیں اس لئے امکان ہے کہ یہ ترسم خاں سلطان ملک شاہ ثانی ہی کے فرزند ہوں۔ یا بہت سے بہت فرزند کے جگر بند جنہوں نے سمرقند میں قامت اختیار کر لی اور سلطان زادہ کہلائے جاتے رہے لیکن رفتہ رفتہ ان کی اولاد امتداد زمانہ سے مرزبان سمرقند ہو گئی ور پھر مرزبان زادہ سمرقند کو اس پر جتنا ناز تھا سنئے،

فن آبائے ما کشاورزی است مرزباں زادۂ سمرقندیم!

---

[1] تاریخ الکامل ابن اثیر جلد ۱۰ ص ۲۴۲ - ۲۴۱
[2] غالب "کلیات نثر" ص ۱۵۲ (خط بنام سراج الدین احمد) مطبوعہ درمطبع نامی نول کشور (اپریل ۱۸۸۴ء بار سوم)
[3] درفش کاویانی ص۱۲ اکمل المطابع دہلی ۱۸۶۵ء

گویا یہ سلطان زادہ ترسم خاں" مرزبان زادۂ سمرقند مرزا غالب کے جد اعلیٰ تھے غالب کے شاگردوں میں سے خواجہ الطاف حسین حالی بھی یہی فرماتے ہیں کہ "مرزا کے دادا جو شاہ عالم کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان آئے وہ اسی ترسم خاں کی اولاد میں سے تھے" [۱] لیکن بعض حضرات ترسم خاں کو غالب کا دادا اور بعض پردادا کہتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اور خواجہ قمرالدین راقم کے بیان کردہ نسب ناموں سے وہ قطعاً غالب کے دادا معلوم ہوتے ہیں[۲] حالانکہ یوتا اپنے دادا کا نام توقان بیگ خاں" لکھتا ہے[۳]، غلام رسول مہر صاحب نے غالب نمبر (علی گڈھ) کے صفحات پر اس کی پوری طرح تردید کی ہے[۴] لیکن اپنی معرکہ آراتصنیف" غالب" میں پردادا لکھا ہے۔ مگر مہر صاحب نے بڑے محتاط طریقہ پر[۵] اور مالک رام صاحب نے فیصلہ کن انداز اختیار کرتے ہوئے رقم فرمایا ہے کہ "یہی ترسم خاں مرزا غالب کے پردادا ہیں[۶] اس ضمن میں خود غالب کا کوئی وضاحتی بیان نہیں بلکہ محولہ بالا عبارت سے بظاہر ہوتا ہے کہ وہ سلطان زادہ ترسم خاں کی نسل سے تھے جو سلجوقی سلطنت کے دور آخر میں ماوراالنہر میں رہتے تھے اور اس وسیع الفضاء علاقہ کی مسلسل تاراجی وپامالی کی وجہ سے سمرقند میں آکر متوطن ہوگئے اس بات کو غالب کے دادا کے ورود ہند تک (اگر ان کے دادا کا ہند میں آنا ۱۷۵۰ء فرض کرلیا جائے جیسا کہ مالک رام صاحب نے کیا ہے) تقریباً ساڑھے پانچسو سال گزر چکے تھے۔ یعنی آخری سلجوقی سلطان طغرل کے قتل سے ان کے دادا کی ہند میں

---

[۱] حالی" یادگار غالب" ص ۱۵ (مطبوعہ لاہور)

[۲] ملاحظہ کیجئے مضامین فرحت حصہ چہارم اور" احوال غالب" مقالہ بعنوان" مرزا غالب کا نسب نامہ" از خواجہ قمرالدین راقم

[۳] احوال غالب۔ (غالب کے خود نوشت حالات کا عکس)

[۴] غالب نمبر علیگڈھ ۴۹۔۱۹۴۸ء بسلسلۂ" غالب کی خاندانی پنشن" از غلام رسول مہر۔ اس سلسلہ میں غلام یزدانی صاحب کا قول بھی ذہن میں آجاتا ہے۔" یادگار فرحت" کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ فرحت کا خاندان شاہ عالم ثانی کے زمانے میں ترکستان سے ہندوستان آیا۔ ان کا شجرہ نسب مضامین فرحت حصہ چہارم میں ہے لیکن میں ایسے شجروں کو تاریخی اہمیت نہیں دیتا اور غلام رسول مہر ناحق الجھن میں پڑے جب انھوں نے غالب کے بعض بیانات اور فرحت کے دئے ہوئے خاندانی حالات میں فرق پایا۔ دلی کے شرفاء میں شجرے رکھنے اور بنانے کا ایک مجنونانہ شوق پیدا ہوگیا تھا اور عرصہ سے چلا آرہا تھا نادرشاہ کے متعلق آپ لطیفہ سن چکے ہوں گے" ص ۱۳۔۱۲

[۵] " غالب" ص ۹ پر تحریر ہے کہ جب یہ سلطنت زائل ہوگئی تو افراد خاندان دوبارہ غربت اولیٰ کی طرح پریشان ومنتشر ہوگئے ان ہی میں سے ایک کا نام شہزادہ ترسم خاں تھا جو سمرقند میں جا بسا۔ یہ غالباً غالب کا پردادا تھا۔

[۶] ذکر غالب (مطبوعہ جامعہ مکتبہ لمیٹڈ دہلی بار چہارم

آمد تھے۔ حالانکہ ماوراءالنہر کی تاخت و تاراج اس سے پہلے سے شروع ہو چکی تھی۔ اگر ترسم خاں مافوق البشر نہیں تھے اور عمر نوح لیکر نہیں آئے تھے تو وہ یقیناً پَر دادا بھی نہیں تھے۔ اگر "تخمہ او ئیم" سے مراد پَر دادا لیا ہے۔ تو پھر مہر نیمروز کے دیباچہ کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

"نیاگان نامہ نگار از تخمۂ افراسیاب و پشنگ بودہ اند و فرماندہان
یا زوفرہنگ فرمودن چراغ ہستی نور دیدہ تور بہ باد آستین
کینہ کیخسرو دو پشنگیان را روز سیاہ پیش آورد ...... بدست مرد تیغ
زدن، نان خوردندے از نیستان ایوانان کہسار نشیمن سلجوقیان گر
بارہ سر بہ افسر و افسر بگوہر آراستند چرخ گردند چنانکہ خوی اوست
ایں نامداران کاؤس کوس رانیز از پائے افگند...... از وابستگان
ایں قافلہ نیائے من کہ در قلمرو ماوراءالنہر سمرقندی شہر مسقط الراس وی
بود چوں سیل کہ از بالا بہ پستی آید از سمرقند بہ ہند آمد" [1]

(مہر نیمروز کا دیباچہ)

نیاگان غالب جو سمرقند جا کر آباد ہو گئے تھے یا سلاطین آل سلجوق ہی سے حساب لگایا جائے تو افراسیاب و پشنگ تک نہ معلوم کتنی پشتیں گزر چکی تھیں جن کا تعین مشکل ہے کیونکہ ان کے زمانہ کا تعین ہی آج تک نہ ہو سکا لیکن غالب نے لفظ تخمہ ہی استعمال کیا ہے۔ گویا وہ اس کی نسل سے تھے۔

غالب نے اس عبارت میں اپنی نسل و خاندان میں زمان و مکان کے تین انقلابات دکھائے ہیں۔ ایک وہ جب کیخسرو کے زمانے میں رستم نے داد شجاعت دیتے ہوئے افراسیاب اور اس کے بیٹے گرسیوز کو گرفتار کر لیا اور یہ دونوں قتل کر دیئے گئے اس طرح "پشنگیان را روز سیاہ پیش آوردند" اور وہ آوارہ وطن ہو گئے۔ لیکن مسلمان ہونے کے بعد جب مقدر جاگا تو دوبارہ ایک عظیم الشان سلطنت کے بانی ہوئے اور برسوں حکمران رہے لیکن مقدر میں گردش اور پیریں چکر تھا اس لئے پھر گردش میں آئے اور "ایں قافلۂ نیاگان غالب" جس میں ان کے جد اعلیٰ سلطان زادہ ترسم خاں بھی تھے سمرقند پہنچا اور یہ شہر مسقط الراس بن گیا گویا ان کی (ترسم خاں کی) آل و اولاد کا مولد و وطن بلکہ "آرامشگاہ شد" [2] برسہا برس کے بعد پھر یہ قافلہ چلا اور اس طرح کہ "چوں سیل کہ از بالا بہ پستی آید از سمرقند بہ ہند آمد" اور اسی میں ان کے دادا قوقان بیگ خاں تھے۔ اس مرتبہ کوئی ایسی مصیبت نازل نہیں ہوئی جو اُن سے کے......

---

[1] کلیات نثر غالب ص ۲۶۷ (مہر نیمروز کا دیباچہ) بار سوم)، [2] کلیات نثر ص ۱۵۲ (خط بنام سراج الدین احمد)

دادا کو وطن مالوف سے نکلنے پر مجبور کرتی بلکہ وہ خود ہی محض والد سے ناراضگی و رنجیدگی کی بنا پر ہندوستان چلے آئے، جیسا کہ غالب لکھتے ہیں۔

"ازاں میاں نیائے (دادا) من از پدر خود رنجیدہ، آہنگ ہند کرد"[۵۱]

دادا کے یہ "پدر خود" کون تھے؟ اگرچہ غالب نے ان کا نام نہیں لکھا تاہم انھیں ترسم خاں بھی نہیں سمجھا جاسکتا۔

دادا کا ورود ہند

ترسم خاں غالب کے جد اعلیٰ ہی تھے ان ہی کی اولاد میں توقان بیگ خاں اپنے والد سے رنجیدہ ہوکر ہندوستان آئے۔ غالب نے اس کا کوئی سبب بیان نہیں کیا ممکن ہے کچھ خاندانی اور معاشی حالات ہوں تاہم ہندوستان آنے کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں پنجاب کے یکے بعد دیگرے مسلسل کئی گورنر تورانی اور وطناً (اصلاً) سمرقندی ہوئے۔ عبدالصمد خاں (۱۷۱۳ء — ۱۷۲۶ء) جس کی ماں بھی سمرقندی تھی[۵۲] اور باپ بھی سمرقند کا رہنے والا اور احراری تھا۔ اس کے بعد عبدالصمد خاں کا بیٹا زکریا خاں (۱۷۲۶ء — ۱۷۴۵ء) پھر زکریا خاں کا بیٹا یحییٰ خاں (۱۷۴۵ء — ۱۷۴۷ء) یحییٰ خاں کا حقیقی بھائی شاہنواز خاں (۱۷۴۷ء — ۱۷۴۸ء) اور پھر معین الملک عرف منو (۱۷۴۸ء — ۱۷۵۳ء) جس کے زمانے میں غالب کے دادا ہندوستان آئے۔ یحییٰ خاں کا حقیقی پھوپھی زاد بھائی، اپنے باپ وزیر قمرالدین (۱۷۲۴ء — ۱۷۴۸ء) کی طرف سے تورانی النسل ماں کی طرف سے سمرقندی، خود معین الملک کی بیگم مغلانی اصلاً سمرقندی۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ ان گورنروں کے زمانے میں سیکڑوں خاندان ترکستان اور سمرقند سے پنجاب منتقل ہوئے اور لاہور اور ملتان کے صوبے بقول سرکار ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "وراثتاً تورانی سرزمین ہو جائیں گے، وسط ایشیاء سے ترک وطن کرنے والے یہاں آباد ہوئے تو انھوں نے اپنے مکانات، باغات اور مقابر اس طرح تیار کئے جیسے یہ سرزمین بھی بلخ و بخارا کی طرح مغلوں کا وطن تھی"[۵۳] مرزا غالب کے دادا توقان بیگ خاں جو

---

۵۱ کلیات نثر ص ۱۵۴ (خط بنام سراج الدین احمد)

۵۲ "عماد السعادت" ص ۲۱-۲۳ از غلام علی خاں مطبوعہ نول کشور ۱۸۹۷ء (بار دوم)

نیز ملاحظہ فرمائیے مغلانی بیگم کا شجرہ نسب۔ اسلامک کلچر حیدرآباد دکن، جولائی ۱۹۴۲ء مقالہ بعنوان "لاہور کی گورنر مغلانی بیگم" از ہری رام گپتا ص ۳۳۵

۵۳ عماد السعادت، ص ۲۱-۲۲ نیز جادو ناتھ سرکار کا مقالہ بعنوان ہندوستان میں احمد شاہ ابدالی ۱۷۴۸ء ص ۲۰۹۔ اسلامک کلچر، حیدرآباد دکن۔ اپریل ۱۹۳۲ء

۵۴ جادو ناتھ سرکار۔ مقالہ بعنوان "ہندوستان میں احمد شاہ ابدالی ۱۷۴۸ء ص ۲۱۲ (اسلامک کلچر حیدرآباد دکن اپریل ۱۹۳۲ء)

ممکن ہے اس زمانہ میں نوجوان ہوں اور اپنے ہم قوم اور ہم وطن افراد کی پنجاب کی جانب اس بھیڑ چال کو دیکھ رہے ہوں متاثر بھی ہوئے ہوں، نوجوانی کے جوش مہم جوئی کے دلولے اور قسمت آزمائی کے خیال نے بھی اُکسایا ہو' باپ سے ترک سکونت کے متعلق کہا ہو لیکن وہ کسی طرح اپنے آبائی وطن سمرقند کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے ہوں۔ یہی باپ اور بیٹے میں ناراضی اور رنجیدگی کا ایک سبب بن گیا ہو جس کی وجہ سے غالب کے دادا قوقان بیگ "از پدر خود رنجیدہ، آہنگ ہند کرد"

زمانہ ورود اور عہد حکومت

غالب کے دادا کس زمانے میں ہندوستان آئے ؟ اس سلسلہ میں غالب کے بیانات درج ذیل ہیں :۔

۱۔ اس کا دادا قوقان بیگ خاں شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلّی آیا۔ پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے بادشاہ کا نوکر ہوا " (غالب کے خود نوشت حالات[۱])

۲۔ منشی حبیب اللہ ذکا کے نام ایک خط میں رقمطراز ہیں۔

"میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماورا لنہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا سلطنت ضعیف ہو گئی تھی۔ صرف پچاس گھوڑے نقارہ و نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا[۲]

۳۔ درفش کاویانی میں لکھتے ہیں :۔

"تا درعہد سلطنت شاہ عالم نیائے من از سمرقند بہ ہندوستان آمدہ[۳]

۴۔ مہر نیمروز کے دیباچہ میں ہے :۔

"چوں سیل از بالا بپستی آید از سمرقند بہ ہند آمد۔ در دفتر سپہبد شاہ نشان ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں توقیع نوکری شاہ ہش نوشتند و بہ پرگنہ پہاسو براءت روزی وی و سپاہش نوشتند"[۴]

(اس سے بھی مراد شاہ عالم ثانی کا عہد ہے جبکہ وہ دہلی آچکا تھا)

۵۔ ازالہ حیثیت عرفی کی نالش کے عرضی دعوے میں تحریر ہے۔

---

[۱] احوال غالب (خود نوشت حالات کا عکس) صفحات ۲۴ اور ۲۵ کے درمیان

[۲] خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔ جلد دوم ص۱۹۳ (خط بنام حبیب اللہ ذکا)

[۳] درفش کاویانی ص۵ اکمل المطابع دہلی ۱۸۶۵ء

[۴] کلیات نثر ص ۲۶۷ مہر نیمروز کا دیباچہ

"قوم کا ترک ہوں دادا میرا شاہ عالم کے عہد میں ترکستان سے آیا۔ باپ
اور چچا بسبب ضعف سلطنت مرہٹوں کی نوکری کرتے رہے"۔ ؎۱

۶۔ مولوی سراج الدین احمد کے نام ایک خط میں بیان کرتے ہیں :۔

"ازاں جملہ نیائے من ...... آہنگ ہند کرد و بہ لاہور ہمرہی معین الملک
گزید چوں بساط معین الملک درنوشتند، بہ دہلی آمد و باذوالفقار الدولہ
میرزا نجف خاں بہادر پیوست" ؎۲

۷۔ انوار الدولہ شفق کے نام ایک مکتوب میں ہے :۔

"نیائے نامہ نگار ترکی بود ...... از ترکستان بہ ہند روئے آورد۔
در لاہور در دولت معین الملک تکیہ گاہ آرامش جائے ساخت ازاں روکہ
در ودہ و آں خاندان کیست خود را ازلی نانپر وردہ ایں دولت ابد پیوند
میشمارم ...... مجموعہ خیال ایں خوننابہ بہ چکاں مقال پیداست
کہ اخوان و احباب را کہ با من ہم چشم و ہمسر اند آفریں گویم اگر در مدح
ولی نعمت تو یم، بتیغ چند گفتہ باشیم، فدایہ روشناسی و معرض اخلاص
تو اند بود ورنہ دست آویز و مایہ طلبی و گدائی فرد۔

درفن سخن معتقد حسن قبولم
برچشم نویسند برات صلہ ما

بخت ازل آوردہ بلطف تو ابد پیوند باد" ؎۳

مؤخر الذکر دو خطوں کی عبارتوں (۶ اور ۷) سے یہ بالکل واضح ہے کہ ان کے دادا دراصل معین الملک کی لاہور کی گورنری کے زمانہ میں ہندوستان آئے لیکن اول الذکر ہ عبارتوں میں (۱ تا ۵) غالب نے متواتر یہ لکھا ہے کہ دادا میرا شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دہلی آیا (یا ہندوستان آیا) اور یہ بیان مؤخر الذکر بیانات کے پیش نظر تاریخی اعتبار

؎۱ احوال غالب ص ۴۲ نیز "مجموعہ نثر غالب اردو" صفحہ ۳۶۵-۶۶
(مجلس ترقی ادب لاہور طبع اول ۱۹۶۷ء)

؎۲ کلیات نثر ص ۱۵۴ (خط بنام سراج الدین احمد)
؎۳ ایضاً ص ۲۱۵ (خط بنام انوار الدولہ شفق)

سے بعض احباب کو "محل نظر" معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً ایک تاریخ داں کے لئے یہ محل نظر ہے لیکن ایک ادیب وشاعر اس سے ماوراء ہے وہ وقتی جذبات و تاثرات اور موقع و محل کے تحت مختصراً لکھ دیتا ہے۔ غالب خود بھی تاریخ داں نہ تھے نہ انھوں نے تاریخ داں کی حیثیت سے تاریخی ادوار کو ملحوظ رکھکر تاریخ وار اپنے آباء و اجداد کے متعلق کوئی تاریخی بیان دیا ہے تاریخ نگاری سے وہ ہمیشہ گھبراتے رہے حالانکہ بادشاہ کی نوکری ملی تو اسی تاریخ نگاری کے صدقے میں مگر وہ اس سے دل برداشتہ ہی رہے جو کچھ دوسروں نے خلاصہ لکھکر دیدیا اس کو اپنے طرز خاص میں بزبان فارسی (خالص) لکھدیا۔ اپنے متعلق اپنے دوست و احباب کو یا مخالفین و معترضین کی خاطر جو کچھ لکھا اس میں بیشتر اختصار اور ہم چشموں میں اور اکثر چشمک زنی کے دوران ذاتی عز و افتخار کا پہلو بھی سامنے رہا۔ ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی میں دادا کی آمد اور بادشاہ دہلی کی ملازمت یقیناً وجہ افتخار تھی۔ یہی انھوں نے لکھدیا۔ اور ان درمیانی کڑیوں کو کہ "بہ لاہور رسیدہ بہ معین الملک گروید چوں" چنیں اور چناں کو باعث طوالت اور غیر اہم سمجھکر اکثر اوقات نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ وہ ان سے کافی حد تک واقف تھے، ورنہ اور مقامات پر کیوں لکھتے ہاں جہاں کہیں جس ٹکڑے کی ضرورت تھی خوب بنا سنوار کر پیش کیا۔ انورالدولہ نواب سعیدالدین خاں بہادر شفق سے اظہار قربت و قرابت۔ ذریعہ روشناسی اور عرض اخلاص" مقصود تھا اس لئے بالخصوص دادا کی لاہور میں آمد اور معین الملک کے در دولت کے "تکیہ گاہ آرامش" ہونے کا ذکر جس طرح ...... اور جس لئے کیا ہے وہ خط کے متن سے ظاہر ہے۔ دلی کا فکر تو اس میں دور دور تک نہیں۔ دراصل غالب موقع و محل کو مدنظر رکھ کر جتنا مناسب اور ضروری سمجھتے تھے تحریر کرتے تھے۔

ویسے بھی محمد شاہ، احمد شاہ اور عالمگیر ثانی غالب کے عالم وجود میں آنے سے بہت پہلے ہی اس جہان آباد سے چل بسے تھے۔ انھوں نے آنکھ کھولی تو دہلی کے تخت پر شاہ عالم ہی کو جلوہ گر پایا، باپ اور دادا نے بھی بچشم خود شاہ عالم ہی کو دیکھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے دادا شاہ عالم ثانی ہی کے زمانے میں دلی آئے اور سب سے پہلے اگر ہندوستان کے کسی بادشاہ کے دربار سے منسلک ہوئے تو وہ شاہ عالم ہی کا دربار تھا۔ بہرحال درمیان میں سمرقند سے دلی تک پہنچتے پہنچتے ان کے راستہ میں کون کون سی منزلیں آئیں اور کہاں کہاں پڑاؤ ڈالا اگر غالب اس آمد نامہ کی بیک وقت اور ایک ہی سانس میں گردان نہ کریں۔ اور درمیان سے کچھ حصہ باعث طوالت سمجھکر یا موقع و محل دیکھ کر چھوڑ دیں تو کوئی ہرج نہیں۔

غالب کے کسی ایک بیان کو لیکر تاریخ کی روشنی میں جانچنا ہمارے خیال میں بے سود ہے ہاں ان کے تمام بیانات کو مجموعی طور پر سامنے رکھکر تاریخی ادوار کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے خطوط میں وہ خود لکھتے ہیں کہ ان کے دادا قوقان بیگ خاں معین الملک کے زمانے میں لاہور پہنچے، یعنی ان کے دادا کا زمانۂ ورود ہند ۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۳ء ہوا۔ اگرچہ معین الملک کا بحیثیت صوبیدار لاہور تقرر اس کے باپ نواب قمرالدین خاں وزیر کی وفات ۱۱ مارچ ۱۷۴۸ء ہی سے سمجھنا چاہیئے لیکن وہ وسط اپریل ۱۷۴۸ء میں اپنے علاقہ کا انتظام سنبھالنے کے لئے صوبہ کے صدر مقام

لاہور پہنچا۔ اس وقت محمد شاہ کا انتقال اور احمد شاہ کی بادشاہت کا اعلان ہو چکا تھا اس لئے غالب کے دادا کا ہندوستان میں ورود احمد شاہ کے عہد حکومت میں زیادہ قرین قیاس ہے۔ لیکن غلام رسول مہر صاحب اپنی تصنیف "غالب" (طبع اول تا چہارم) میں تحریر فرماتے ہیں کہ "غالب کے دادا غالباً محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے اور سب سے پہلے لاہور میں معین الملک کے پاس ملازم ہوئے[1] استدلال یہ ہے کہ "شاہ عالم کی بادشاہی کا زمانہ ۱۷۵۹ء سے شروع ہوتا ہے اور نواب معین الملک عرف میر منو نے جن کے پاس غالب کے دادا لاہور میں ملازم ہوئے تھے نومبر ۱۷۵۳ء (محرم ۱۱۶۷ھ) میں وفات پائی، لہذا ماننا چاہیئے کہ مرزا قوقان بیگ خاں محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے۔ یہ بیان (غالب کی) خاندانی روایات پر مبنی ہے۔ نواب معین الملک کی وفات اور شاہ عالم کی تخت نشینی کے سنین معلوم نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس کی تصحیح نہ کر سکے"۔[2] مالک رام صاحب بھی اس استدلال کو درست مانتے ہیں اور تحریر فرماتے ہیں کہ "یہ استدلال ٹھیک ہے اور یہ درست ہے کہ اس وقت دہلی پر شاہ عالم نہیں بلکہ محمد شاہ متمکن تھا لیکن میرے خیال میں مرزا کی بھی یہ مراد نہیں کہ یہ شاہ عالم کی بادشاہی کا زمانہ تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے دادا اور لوہارو

---

[1] جب وزیر قمر الدین، احمد شاہ ابدالی کے خلاف جنگ مانپور کے دوران فوت ہوا (۱۱ مارچ ۱۷۴۸ء) تو محمد شاہ نے "منشور بحالی بود کہ صوبیداری لاہور و ملتان بہ معین الملک بخشید" سیر المتاخرین ص ۸۶۴ (فارسی) مطبوعہ نول کشور اگست ۱۸۶۶ء اس وقت معین الملک مانپور ہی میں شہزادہ (احمد) کے ہمراہ تھا۔ اس فرمان تقرری کے ساتھ ساتھ اسے یہ حکم ملا کہ "شکست خوردہ افغانوں کا تعاقب کرے اور پنجاب کو قبضہ میں لائے ..... شہزادہ احمد اور معین الملک لدھیانہ کی طرف بڑھے اور لدھیانہ کے قریب دریائے ستلج پر پہنچکر ۲۲ روز ٹھہرے رہے ..... یہیں ۹ اپریل کو (جب احمد شاہ ابدالی کی واپسی کی خبر مل چکی تھی) بادشاہ کی جانب سے شاہی افواج کی واپسی کا حکم ملا اور شہزادہ احمد ۱۲ اپریل کو روانہ ہوا ..... معین الملک کے پاس اب فوج کم رہ گئی تھی اس لئے اس نے اپنے باپ کے قدیم ملازمین سے صلاح و مشورہ کیا لیکن وہ بھی نہ رکے۔ (آخر) چند روز بعد وہ لاہور پہنچا، جادوناتھ سرکار "فال آف دی مغل ایمپائر" جلد اول صفحہ ۲۵۹-۲۶۰ طبع سوم ۱۹۶۴ء کلکتہ۔ اسی عرصہ میں محمد شاہ کا انتقال ہو گیا۔ (۱۴ اپریل ۱۷۴۸ء) امپیریل گزیٹیر آف انڈیا ص ۴۰۹ ہسٹاریکل جلد دوم۔ نیو ایڈیشن ۱۹۰۹ء آکسفورڈ اس کے بعد احمد شاہ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا۔ گویا جس وقت معین الملک لاہور پہنچا احمد شاہ کی بادشاہت تھی۔ اگر غالب کے دادا معین الملک کے لاہور پہنچتے ہی وارد ہوئے تب بھی احمد شاہ ہی کا دور تھا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس وقت حدود ہند میں داخل ہوئے تو محمد شاہ کا دور تھا اور جب لاہور پہنچے تو احمد شاہ کی بادشاہت تھی۔ حالانکہ مہر صاحب خود فرماتے ہیں کہ "میرا خیال ہے کہ مرزا غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ خاں بھی قاسم جان کے ساتھ ہندوستان آئے" (خطوط غالب جلد ۱ ص ۲ اور قاسم جان بقول مالک رام ۱۷۵۰ء میں لاہور پہنچے اس لئے یہ قطعی طور پر احمد شاہ کا دور تھا۔ [2] "غالب" از غلام رسول مہر طبع چہارم ۱۹۶۵ء لاہور [3] ایضا ص ۱۳

خاندان کے اسلاف .... ۱۷۵۰ء کے لگ بھگ ایک ساتھ ہندوستان آئے تھے یہ وہ زمانہ ہے کہ جب شاہ عالم اپنی شاہزادگی کے ایام میں جبکہ اس کا نام عالی گہر تھا ممالک شرقیہ میں مصروف جنگ وقتال تھا۔ میرزا توقان بیگ خاں بھی میر منو کی وفات کے بعد (شرف الدولہ) قاسم جان کی معیت میں دلی پہنچے اور یہاں سے ممالک شرقیہ میں جاکے شاہزادہ عالی گہر سے مل گئے۔ اسی بات کو مرزا ان کے یہاں شاہ عالم کے زمانے میں آنے سے تعبیر کرتے ہیں مقصود یہ ہے کہ وہ شاہ عالم کے زمانہ شاہزادگی میں ان کے ساتھ ملکر لڑتے رہے۔[1]

مگر تاریخ کے اعتبار سے یہ استدلال ٹھیک ہے اور نہ وہ — غالباً مندرجہ بالا عبارت سے مالک رام صاحب کا مطلب یہ ہے کہ اگر قاسم جان کے (جن کے ساتھ مرزا کے دادا آئے) لاہور پہنچنے کا سن ۱۷۵۰ء مان لیا جائے تو اسی سال میر منو کی وفات ہوئی اور اسی زمانہ میں شہزادہ عالی گہر ممالک شرقیہ میں مصروف جنگ تھا جہاں غالب کے دادا میر منو کی وفات کے بعد قاسم جان کے ہمراہ پہنچ گئے۔ اس طرح غالب کا یہ بیان کہ "دادا میرا ماوراالنہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا" صحیح ثابت ہوجاتا ہے حالانکہ ایسا بھی نہیں۔ نہ یہ زمانہ شاہ عالم کی ولیعہدی اور اسقدر آزادی کا تھا اور نہ وہ اس وقت ممالک شرقیہ میں مصروف جنگ وقتال تھا۔

دراصل معین الملک عرف میر منو نومبر ۱۷۵۰ء میں نہیں بلکہ ۳ نومبر ۱۷۵۳ء کی شب میں فوت[2] ہوا۔ محمد شاہ نے ۱۴ اپریل ۱۷۴۸ء کو وفات پائی اس کے بعد احمد شاہ کا دور شروع ہوگیا جو ۱۷۵۴ء تک رہا۔ اگر بقول مہر صاحب معین الملک کی وفات نومبر ۱۷۵۰ء مان لی جائے تب بھی تقریباً ڈھائی سال کا عرصہ ایسا رہا جس میں معین الملک پنجاب کا صوبہ دار تھا اور احمد شاہ دہلی کا بادشاہ۔ اس لئے مرزا کے دادا توقان بیگ خاں کا احمد شاہ کے دور حکومت میں لاہور آنا زیادہ قرین قیاس ہے نہ کہ محمد شاہ کے دور میں جو معین الملک کی پنجاب کی صوبیداری کے زمانہ میں تقریباً ایک ماہ زندہ رہا۔ اور یہ ایک ماہ کا عرصہ بھی جیساکہ تحریر کیا جاچکا ہے۔ اس کے لاہور پہنچنے میں لگ گیا۔ گویا جب وہ لاہور پہنچا تو محمد شاہ کی وفات ہوچکی تھی اور سلطنت احمد شاہ کو مل چکی تھی علاوہ ازیں مہر صاحب نے مرزا کے دادا کے محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آنے کے متعلق ...... آثار و قرائن اور دلائل و شواہد بھی پیش نہیں کئے۔ مالک رام صاحب نے بھی بغیر تحقیق کے اسی کو نقل کردیا۔ اور درست بھی قرار دیدیا[3]

---

[1] ذکر غالب ص ۱۹-۲۰ کا حاشیہ۔ طبع چہارم ۱۹۶۴ء دہلی

[2] جادو ناتھ سرکار" فال آف دی مغل ایمپائر" جلد اول ص ۲۷۵ (بار سوم) کلکتہ

[3] حالانکہ مہر صاحب نے اسے غلط قرار دیدیا ہے اور "خطوط غالب" جلد دوم ص ۱۹۳ کے حاشیہ پر (جو ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئے) تصحیح کی مستحسن کوشش فرمائی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں کہ" غالب نے کئی جگہ لکھا ہے (باقی صفحہ ۴۶ پر)

مالک رام صاحب نے قاسم جان (شرف الدولہ) کی آمد کا سن (۱۷۵۰ء) بھی بغیر کسی دلیل و قرینہ کے متعین کر لیا تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ قاسم جان اور قوقان بیگ خاں معین الملک کی وفات کے فوراً بعد شہزادہ عالی گہر کے پاس بہار پہنچ گئے حالانکہ ۱۷۵۰ء کے بجائے (جسے مالک رام صاحب نے درست قرار دیا ہے) ۱۷۵۳ء مان لیا جائے (جو واقعی درست ہے) تو بھی یہ زمانہ نہ شہزادہ عالی گہر کی ولیعہدی کا تھا (کیونکہ وہ عالمگیر ثانی کا بیٹا تھا جو ۱۷۵۴ء میں سلطنت دہلی کے تخت پر بیٹھا) اور نہ وہ ممالک شرقیہ میں تھا۔ وہ اپنے باپ عالمگیر ثانی کی تخت نشینی (۱۷۵۴ء) کے بعد منظر عام پر آیا اور ممالک شرقیہ پر قبضہ کے لئے تو اس نے ۱۷۵۸ء کے اواخر میں دریائے کرمناسا عبور کیا تھا[1] اور ۱۸ مارچ ۱۷۵۹ء کو پٹنہ کے قریب پہنچا تھا[2]۔ یہیں منشی عبدالکریم کی بیان کردہ روایت کے بموجب قاسم جان شہزادہ عالی گہر کی خدمت میں حاضر ہوا تھا[3]۔ اس طرح قاسم جان اور قوقان بیگ خاں کی لاہور میں آمد اور ممالک شرقیہ میں شہزادہ عالی گہر کے پاس پہنچنے میں (بقول مالک رام صاحب) ۹ سال کا عرصہ لگا۔ اسوقت تک دو بادشاہتیں بھی بدل چکی تھیں (احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کی) اگر یہ مسافت اتنے عرصہ میں طے ہوئی تو مرزا کے دادا کا سمرقند سے شاہ عالم کے عہد میں دلی پہنچنا بالکل صحیح ثابت ہو سکتا ہے۔ بہرحال قاسم جان کی آمد ۱۷۵۰ء یا ۱۷۵۳ء میں فرض کر کے بھی غالب کے بیان کو تاریخ کے اعتبار سے صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہی کہنا پڑے گا کہ "یہ ترا بیان غالب" ؎

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

لیکن جیسا کہ مہر صاحب[4] اور مالک رام صاحب فرماتے ہیں کہ "قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے دادا اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵ سے آگے) کہ اس کا دادا شاہ عالم کے عہد میں ہندوستان آیا اور لاہور میں معین الملک کے پاس ملازم ہوا۔ معین الملک نے شاہ عالم کی تخت نشینی سے سات آٹھ برس پہلے وفات پائی۔ لہٰذا میرزا کا دادا احمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آیا نہ کہ شاہ عالم کے عہد میں۔ البتہ دہلی میں ملازمت شاہ عالم ہی کے عہد میں ہوئی ہوگی، لیکن معین الملک نے شاہ عالم ثانی کی تخت نشینی سے سات آٹھ برس پہلے نہیں بلکہ ۶ سال ایک ماہ اور کچھ دن پہلے وفات پائی۔ یعنی چھ سات سال پہلے کیونکہ معین الملک کا انتقال ۳ نومبر ۱۷۵۳ء کو ہوا اور شاہ عالم ثانی ۲۲ دسمبر ۱۷۵۹ء کو تخت نشین ہوا۔

[1] فرینکلن "رین آف شاہ عالم" ص ۱۲ مطبوعہ الہ آباد ۱۹۳۴ء لیکن شاہ عالم نامہ میں "۸ مارچ ۱۷۵۹ء" لکھا ہے ص ۱۷

[2] "شاہ عالم ثانی کے عہد کا دہلی دربار" از پولیر مرتبہ نصیب اختر ملاحظہ کیجئے دیباچہ ص ۲۸ مطبوعہ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی ۱۹۶۶ء)

[3] منشی عبدالکریم "تحفۂ احباب تاریخ پنجاب" ص ۶۲ مطبوعہ ۵ رمضان ۱۲۶۵ھ

[4] غلام رسول مہر "خطوط غالب" جلد اول۔ خاندان لوہارو کے حالات کے ضمن میں ص ۲ پر تحریر ہے کہ "میرا خیال ہے کہ مرزا غالب کے دادا قوقان بیگ بھی قاسم جان کے ساتھ ہندوستان آئے اور غالباً قاسم جان کے خاندان کے ساتھ (باقی صفحہ ۴۷ پر)

لوہارو خاندان کے اسلاف (قاسم جان، عالم جان اور عارف جان) ۱۷۵۰ء کے لگ بھگ ایک ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ اور ...... میر منو کی وفات کے بعد قاسم جان کی معیت میں دہلی پہنچے ہوں اور یہاں ممالک شرقیہ میں جا کر شاہزادہ عالی گہر سے مل گئے ...... (اور) اس کے ساتھ مل کر لڑتے رہے۔"[1] بات کچھ درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ دونوں خاندان ہم مرتبہ و ہم پیشہ اور دونوں خاندانوں (قاسم جان اور قوقان بیگ خاں) کا ورود ہند ایک ہی زمانہ میں ہوا۔ دونوں ایک ہی مقام سمرقند سے چلے اور دونوں کی منزل مقصود ایک، ہم قوم اور ہموطن[2] جیسا کہ خود غالب قاسم جان کے خاندان کے ایک فرد نواب احمد بخش خاں کے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ "احمد بخش خاں میرے بزرگ اور ہم قوم تھے"[3]۔ لاہور آ کر دونوں ایک ہی شخص کے ملازم ہوئے اور اس کی وفات تک اسی کے ساتھ رہے۔ دلی میں بھی ایک ہی بادشاہ اور سپہ سالار کے ملازم ہوئے بلکہ غالب کے باپ عبد اللہ بیگ خاں اور قاسم جان دونوں کا لکھنؤ جانا بھی ثابت ہے اور ایک ہی دور میں (نواب آصف الدولہ) بلکہ خیال یہ ہے کہ ایک ساتھ ہی گئے۔ ان آثار و قرائن کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں ایک ہی ساتھ سمرقند سے چلے اور بعد کو بھی اہم مہمات و معاملات میں ایک دوسرے کے شریک و سہیم رہے اس سلسلہ میں ہمیں قاسم جان کے حالات معلوم کرنا ہوں گے اور وہ منشی عبد الکریم نے تحفہ احباب میں بالتفصیل لکھے ہیں۔ ممکن ہے ان کی تصدیق دوسری کتب تاریخ سے ہو سکے۔ تاہم انھوں نے قاسم جان کے حالات جس راوی سے سن کر لکھے ہیں وہ "پسر دومی شان قدرۃ اللہ بیگ خاں مخاطب بشرف الدولہ معین الدین حسین خاں" ہیں۔ ان کے والد قدرت اللہ بیگ شرف الدولہ قاسم جان کے فرزند تھے گویا قاسم جان کے پوتے ہوئے اور صرف ایک ہی پشت درمیان میں ہوئی۔ اس طرح معین الدین حسین خاں کے بیان کردہ حالات اگرچہ خاندانی اور روایتی ہیں تاہم قابل اعتبار ہو سکتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

"شرف الدولہ مرزا قاسم جان بہادر بذاتِ خود از بخارا۔ اول در سمرقند آمدہ رفیق حاکم آنجا شد ...... مدار المہام کل ریاست او گردید مدتی

(حاشیہ صفحہ ۴۶ سے آگے) ان کی قرابت بھی تھی جس کا سلسلہ بعد بھی جاری رہا" نیز ملاحظہ کیجئے "غالب" ص۳۰۴ تا ۳۰۴ کا حاشیہ (بحوالہ ابو الکلام آزاد)

[1] مالک رام" ذکر غالب" طبع چہارم ۱۹۶۴ء حاشیہ ص۱۹ تا ۱۸

[2] تحفہ احباب تاریخ پنجاب" ص۵۶ نیز ملاحظہ فرمائیے علم و عمل (وقائع عبد القادر خانی) مرتبہ محمد ایوب قادری مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۰ء جلد اول ص۳۱۲ پر احمد بخش خاں کے متعلق لکھا ہے کہ:۔
"ان کے بزرگوں (قاسم جان و برادران) کا وطن سمرقند محلہ زرگراں ہے"

[3] "ذکر غالب" ص۲ (طبع چہارم) بحوالہ انڈیا آفس لائبریری لندن مجموعہ ۵۴۴۲۹ جلد ۱۳۴۴ ص ۳۱ تا ۴۵

درراہ بخوشدلی گذرانیدہ...... ناگاہ حاکم بہ شکار اجل گردید
شرف الدولہ ناموافقت پسر حاکم ...... روانہ بطرف ہندوستان شد
چوں بلاہور رسید میر منو صوبیدار آنجا کہ جوانمرد و قدردان اشراف بود.... باکمال شفقت
پیش آمدہ شرف الدولہ را رفیق خود ساخت تا اینکہ واسطہ کتخدائی شان با صبیہ نظر بیگ[۵]
خاں ہزارہ کہ سرداران جلیل القدر آنجا بود، گشت و ملک درسندہ
را در جاگیر شرف الدولہ داد...... بالجملہ شرف الدولہ قریب دہ سال
در لاہور با کمال خوشی و مرفہ حالی بسر کرد و چوں میر منو صوبہ دار لاہور
فوت شد بسبب برہمی امور صوبہ لاہور برخاستہ خاطر شدہ با پانصد سوار
بقصد رفاقت شہزادہ عالی گہر چنانکہ مذکور شد در صوبہ بہار
رفت (مصنف کتاب ہذا نے قاسم جان کے بہار پہنچنے اور وہاں کے
واقعات، شاہ عالم اور نجف خاں کی معیت میں دلی واپسی وغیرہ کے
تمام حالات لکھے ہیں)..... در عہد نواب آصف الدولہ کہ در بلدۂ
لکھنؤ آمدہ بود از یں جہانِ فانی بعالمِ جاودانی شتافت۔ واللہ اعلم
بالصواب "[۶]

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاسم جان ۱۷۵۹ء میں بہار پہنچے اسی زمانے میں شہزادہ کی امداد کی غرض سے

---

۵ اگر یہ نظر بیگ خاں وہی ہیں جن کو سرکار نے بحوالہ مسکین (جو اس دور کے واقعات کے لئے معتبر ہے) حصہ اول حاشیہ ص ۲۶ پر نظر محمد بیگ لکھا ہے اور تحریر کیا ہے کہ معین الملک جس وقت شہزادہ احمد سے جدا ہو کر لاہور کے باہر فدائی خاں کی حویلی میں ٹھیرا اور فوج بھرتی کرنے بیٹھا تو "ان میں دو (تورانی) جمعدار (سردار۔کپتان) تھے" ان میں سے ایک نظر محمد بیگ تھے۔ (اور تین ۸ سالہ ترک لڑکے تھے جن میں سے ایک طہماسپ جس کا قلمی نام مسکین ہے، موجود تھا) یہی نظر محمد بیگ معین الملک کے لاہور پہنچے (وسط اپریل ۱۷۴۸ء) کے بعد سب سے پہلے ملازم ہوئے ظاہر ہے کہ انھیں "جلیل القدر انجا" ہونے میں کچھ عرصہ لگا ہوگا اور جب یہ جلیل القدر امیروں میں شمار ہونے لگے تو قاسم جان لاہور پہنچے۔ تقریباً ۱۷۴۹ء میں (جو قطعاً احمد شاہ کا دور تھا) ـــــ اس کے بعد ہی اس امیر کی لڑکی سے قاسم جان کی شادی ہوئی ہوگی۔

۶ "تحفۂ احباب تاریخ پنجاب } صفحہ ۶۲-۵۴

بہار میں یحییٰ خاں پسر زکریا خاں سابق گورنر پنجاب (۴۵ـ۱۷۲۶ء ـ ۴۷ـ۱۷۴۶ء) کی موجودگی کا بھی پتہ چلتا ہے[1] جو نواب معین الملک کا حقیقی پھوپھی زاد بھائی تھا اور نواب معین الملک سے مرزا کے خاندانی روابط بھی تھے[2]۔ (ملاحظہ کیجیے خط بنام انوارالدولہ شفق نحول عبارت ۴) علاوہ ازیں اسی زمانہ میں اور اسی مقام پر بقول مصنف شاہ عالم نامہ ایک جمعیت بیگ قوم مغل بھی نظر آتی ہے غلام علی خاں لکھتا ہے کہ "جمعیت بیگ قوم مغل ملازم رسالہ حیات علی خاں رخش جلادت تافتہ نشان آں نگوساران از دیوار قلعہ برداشتہ سرنگوں ساخت و بانظار رعاطفت شاہانہ منظور گشت" ممکن[3] ہے کہ یہ جمعیت بیگ وہی ہو جسے قاسم جان لے گیا تھا اور اس میں تو قان بیگ خاں، جیون بیگ معہ دو پسران اللہ داد بیگ اور خداداد بیگ[4]، قاسم جان

---

[1] غلام حسین طباطبائی (رحلت ۱۲۳۰ھ) سیر المتاخرین ص۱۳۶ پر لکھتا ہے "یحییٰ خاں پسر زکریا خاں و دیگر ہمراہیان خود استاد نیز ملاحظہ فرمائے شاہ عالم نامہ ص۹۶،۱۰۹ پر غلام علی خاں لکھتا ہے کہ:۔ "بست و دوم ماہ صدر (۲۲ جنوری ۱۷۵۹ء) میر یحییٰ خاں پسر زکریا خاں بہادر دلیر جنگ کہ پدرش در عہد پیشین صوبہ دار لاہور بود و برادرش عبدالباقی خاں بعتبہ بوس کامیاب گشتہ مشمول رحمت خسروانہ و عواطف شاہانہ شدند...." "شاہ عالمنامہ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۹۱۲ء لیکن یہ دونوں مورخین لکھتے ہیں کہ یحییٰ خاں، اس ناکام مہم سے واپسی میں شاہزادہ سے علیحدہ ہو کر شاہجہان آباد چلا گیا اس کے رسالہ میں بھی پھوٹ پڑ گئی تھی اس لئے امکان یہ ہے کہ قاسم جان وغیرہ شاہزادہ کے ساتھ ہی رہے۔

[2] غلام حسین طباطبائی "سیر المتاخرین" ص۲۰۶ پر لکھتا ہے کہ جب "شجاع الدولہ پسر صفدر جنگ خبر برگشتن محمد قلی خاں، و شاہزادہ بے نیل مقصود شنید بکمال نامردی کار فرما گشتہ ..... فرمان داد کہ باتفاق مقابل محمد قلی خاں رفتہ نگذارند کہ بہ الہ آباد تو اند رفت ...... شاہزادہ برآمدن انان محمد قلی خاں معتنم دانستہ ازراہ مرزا پور خود در راہ ملک بوندیلہ بارادہ اقامت در چھتر پور گرفت .... یحییٰ خاں پسر زکریا خاں از لشکر شاہزادہ جدائی جست و در مرزا پور یافتن بلوند چند روز توقف گزیدہ بشاہجہان آباد رفت" غالباً یحییٰ خاں شجاع الدولہ کے مقابلہ پر نہیں آنا چاہتا تھا اور شاید اسی وجہ سے اس کے مغلیہ گروہ میں ناچاقی ہو گئی۔ بقول مصنف شاہ عالمنامہ واپسی میں "سیزدہم (۱۵ اپریل ۱۷۵۹ء) منزل کرمناسا از نزول اجلال نزہت آگین گشت و در ہمیں اثنا قوم رسالہ یحییٰ خاں بہادر باہم خصومت نمودہ، متفرق گشتند" ص۵۸۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاسم جان اور تو قان بیگ خاں نے شاہزادہ کی رفاقت نہیں چھوڑی اور اس کے ہمرکاب کسی نہ کسی رسالہ میں موجود رہے۔

[3] "شاہ عالمنامہ" ص۶۳

[4] "غالب" از غلام رسول مہر ص۲۵ پر لکھتے ہیں کہ یہ دونوں بیٹے جیون بیگ کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔

معہ دو پسران فیض اللہ بیگ خاں اور قدرۃ اللہ بیگ خاں[۵۱]، چھوٹے سرداروں کی صورت میں شامل ہوں اور اسی لئے یہ جمعیت بیگ کہلاتی ہو، بہرحال قاسم جان اور ان کے ہمراہ مرزا کے دادا کے بہار پہنچنے کے امکانات پائے جاتے ہیں یہ ممکن ہے کہ پھر یہ دونوں شاہ عالم کے ہمرکاب کسی نہ کسی رسالہ میں رہے ہوں لیکن جنوری ۱۷۶۵ء کے بعد جب مرزا نجف خاں الہ آباد آگیا تو اس سے وابستہ ہو گئے ہوں۔ (نجف خاں سے تعلقات اسی وقت سے ہوں جبکہ وہ خود قلعہ عظیم آباد کے مقابل ۱۷۵۹ء میں شاہزادہ کی رفاقت میں تھا) بعدہٗ نجف خاں کے ماتحت انگریزوں کی جانب سے شاہ عالم کے نام پر متعدد جنگوں میں شریک رہے اور پھر نجف خاں کے ماتحت اور شاہ عالم کی معیت ہی میں ۱۷۷۲ء میں دہلی پہنچے جہاں "در دفتر سپہدار شاہ نشان ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں، توقیع نوکری شاہ ہش نوشتند و پرگنہ بیہا سو بابت روزی دی وسپاہش نوشتند" (محولہ عبارت، ص ۵) یعنی یہاں آکر جب میرزا نجف خاں امیر بخشی ہو گیا (شاہی افواج کا سپہ سالار اعلیٰ) تو میرزا کے دادا کا نام شاہی ملازمین میں لکھ دیا گیا اور بیہا سو کا پرگنہ بطور جاگیر دے دیا گیا۔ قاسم جان نے بھی بقول مولوی عبدالقادر صاحب "...... جمعداری حاصل کر لی تھی مگر دانشمندی سے بادشاہ کے دربار میں بھی رسوخ پیدا کیا۔ اکثر شاہی لشکری سردار کی اطاعت، سرتابی اور مستعدی میں ان دونوں [illegible] اور رضا جانی کے مشورہ سے کام کرتے تھے اس وجہ سے ایرانی گروہ کے لوگوں میں ان کا بہت وقار تھا" [۵۲]
بادشاہ کے دربار میں رسوخ (جو کسی نمایاں کارگذاری کی وجہ سے حاصل ہوا) اور یہ کارگذاری[۵۳] وہی ہو جس کا ذکر

---

۵۱ "اخبار رنگین" از سعادت یار خاں رنگین (مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ۱۹۶۱ء) ص ۴۵ پر ایک خبر ہے کہ "شاہجہاں آباد میں نواب قدرۃ اللہ بیگ کی نانی جا کم سو برس کے سن میں ایسی بیمار ہو گئیں کہ ان کے واسطے گور و کفن کی سب تیاری کی مگر وہ ...... اب تک جیتی ہیں" اگر یہ خبر ۱۸۰۳ء کی ہے اور اس وقت ان کی عمر ۱۰۰ برس کی ہو چکی تھی تو ان کی بیٹی قاسم جان کی بیوی کی والدہ کی تاریخ پیدائش ۱۷۰۳ء ہوئی۔ اور جب قاسم جان لاہور آئے تو یہ ۲۰ برس کی ہوں گی حالانکہ اس وقت یہ عمران کی لڑکی یعنی قاسم جان کی بیوی کی ہونی چاہیئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ نہیں تھیں جن کی لڑکی سے قاسم جان نے لاہور میں شادی کی۔ گویا انھوں نے کئی شادیاں کیں ممکن ہے سمرقند میں بھی کی ہو اور وہ غالب کے خاندان ہی کی ہو جس سے یہ دو لڑکے تھے۔ اور اس وقت جوان تھے۔

۵۲ علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) جلد اول ص ۱۳ مرتبہ محمد ایوب قادری ۱۹۶۰ء

۵۳ "تحفہ احباب تاریخ پنجاب" ص ۷۵ "الغرض مرزا قاسم جان بعد رسیدن ...... قصد کرد کہ فردا ملازمت شاہزادہ فائز گردد... شنید کہ رسد و غلہ و چارہ جانوران لشکر میرزہ رسیدہ است..... مرزا قاسم جان بمجرد شنیدن ایں حال دو صد سوار ہمراہ عالم جان برادر خرد خود کردہ برائی انتزاع آوردن رسد فرستاد" اور اس پر قبضہ کر کے علی الصبح بمعہ رسد وغیرہ شہزادہ کے حضور میں پہنچا۔

منشی عبد الکریم کے یہاں ملتا ہے یا جمعیت بیگ قوم مغل کے سلسلہ میں)، لشکریوں پر اتنا اثر کہ ہر معاملہ میں مشیر کار، ایرانیوں میں عز و وقار (اس کا ایک سبب نجف خاں پر وہ احسان بھی ہو جس کا ذکر تحفۂ احباب میں ملتا ہے[۱])، یہ سب باتیں بھی اس امر کا پتہ دیتی ہیں کہ قاسم جان کو بہت عرصہ پہلے سے بادشاہ کے حضور میں (اس کے عالم شاہزادگی سے) شرف باریابی حاصل تھا، لشکریوں میں کافی عرصہ رہے سہے تھے اور نجف خاں اور اس کے ہم قوم ایرانیوں سے بہت پرانے اور گہرے مراسم تھے جو دہلی پہنچنے کے بعد بھی بدستور قائم رہے۔

دہلی میں قیام اور وفات

اس صورت میں مرزا کے دادا قوقان بیگ خاں کا دہلی میں قیام شاہ عالم ثانی کے دہلی پہنچنے کے بعد ۲، ۱۷ء[۲] سے شروع ہوا اور پھر وہ اپنی وفات تک جو بہت سے بہت دس بارہ سال کا عرصہ تصور کیا جا سکتا ہے، دہلی میں مقیم رہے اور شاید قاسم جان کا ساتھ یہاں بھی نہ چھوٹا۔ اس دوران میں وہ یقیناً میرزا نجف خاں کی مہمات میں بھی شریک رہے ہوں گے۔ اس کی آگرہ کی تقریباً دو سالہ گوشہ نشینی (۱۷۷۷ء تا ۱۷۷۹ء) میں بھی ساتھ ہوں اور اسے دہلی میں ۱۹ نومبر ۱۷۷۹ء سے اس کی وفات ۲۶ اپریل ۱۷۸۲ء تک (ڈھائی سال) بحیثیت نائب وزیر اور وکیل المطلق اور اس کے ساتھ ساتھ اسے شاید بادشاہ کی حیثیت میں بھی دیکھا ہو۔ لیکن اس زمانہ میں یا اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ غالب، حبیب اللہ ذکاء کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"دادا میرا ...... شاہ عالم کا نوکر ہوا ایک پرگنہ (پہاسو) سیر حاصل

---

[۱] "تحفۂ احباب" ص ۶۱ پر لکھا ہے کہ بادشاہ نے دہلی پہنچکر قاسم جان کو خلعت بخشی گیری منایت کی مگر اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ "مرزا نجف خاں کہ از خاندان جلیل القدر .... حاضر است، طلبیدہ خلعت ایں خدمت مرحمت شود لائق ایں کار ہمیں شخص است ...... (خود) نزد نجف خاں بہادر رفتہ گفت کہ من ایں مدت از خدمت گزاری جناب ناصر نادم بودم اکنون قابو یافتہ از بادشاہ خدمت بخشی گیری را برای آنصاحب مقرر کنانیدہ ام بسم اللہ برخیزید رہمراہ من شوید ......"
اگرچہ اس بیان میں غلو سے کام لیا گیا ہے کیونکہ مرزا نجف خاں کی شہرت، اور بادشاہ کی نگاہ میں اس کی قدر و منزلت پہلے ہی سے کافی تھی پھر وہ انگریزوں کا فرستادہ تھا تاہم نجف خاں سے میر قاسم کے گہرے مراسم تھے ممکن ہے کہ بخشی گیری کے سلسلہ میں نجف خاں کی کچھ خیر خواہی دکھائی ہو۔

[۲] "شاہ عالم ثانی کے عہد کا دہلی دربار" ص ۳۶ پر پولیر اماخسر دسمبر ۱۷۷۱ء، فرینکلن ص ۲۹ پر ۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء اور سرکار کی تحقیق کے بموجب شاہ عالم "۶ جنوری (۱۷۷۲ء) بروز پیر بوقت ۲/۱ ۸ بجے اپنے دار السلطنت میں داخل ہوا" ص ۲۵۵ جلد دوم
نیز ملاحظہ کیجئے جلد سوم ص ۱

ذات کی تنخواہ اور رسالہ کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو
طوائف ملوک کا ہنگامہ ستھا وہ علاقہ نہ رہا" ؎۱

طوائف ملوک کا یہ ہنگامہ نجف خاں کی وفات ۶ر اپریل ۱۷۸۲ء سے غلام قادر روہیلہ کی گرفتاری یعنی ۱۷۸۸ء کے اواخر تک رہا۔ اور چونکہ ان کے (دادا کے) انتقال کے بعد یہ ہنگامہ شروع ہوا اس لئے ان کی وفات ۸۳-۱۷۸۲ء کے لگ بھگ قیاس کی جاسکتی ہے۔

آل و اولاد

توقان بیگ خاں کے یہاں ۷ بچے ہوئے۔ تین لڑکیاں اور چار لڑکے (ملاحظہ کیجئے خط بنام منشی نبی بخش حقیر ؎۲) ان میں سے دو لڑکوں کی زندگی و موت کا کچھ پتہ نہیں چلتا غالباً کم عمری یا نوجوانی میں فوت ہوگئے دو لڑکوں عبداللہ بیگ خاں اور نصراللہ بیگ خاں کا ذکر ملتا ہے۔ جو دہلی ہی میں پیدا ہوئے تین لڑکیوں میں سے دو کا نام وغیرہ معلوم نہیں صرف ان کے زندہ رہنے کا تھوڑا بہت علم ہے۔ نبی بخش حقیر کے نام خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دونوں ۱۸۵۳ء سے پہلے اور ۱۸۲۵ء ؎۳ کے بعد فوت ہوئیں۔ ایک لڑکی کے متعلق اتنا معلوم ہے کہ وہ جیون بیگ کی دختر امیرالنساء زوجہ خواجہ حاجی کے صاحبزادہ اکبر بیگ کو بیاہی گئیں ؎۴۔ غالباً دہلی میں رہیں اور یہیں ۸ ربیع الاول ۱۲۳۲ھ (م ۳ د ۱۸۱۸ء) کو فوت ہوئیں ؎۵۔ اہلیہ یعنی مرزا کی دادی کا انتقال ۱۸۲۵ء سے قبل ہوا ؎۶

؎۱ "خطوط غالب" مرتبہ غلام رسول مہر جلد دوم ص ۳۹۱

؎۲ "نادرات غالب" مرتبہ آفاق حسین آفاق ص ۵-۹۴ بار اول ۱۹۴۹ء کراچی

؎۳ ۱۸۲۵ء میں نواب احمد بخش خاں نے مرزا غالب سے وعدہ فرمایا کہ "سر چارلس مٹکاف کو آنے دو تمہیں اس کی خدمت میں پیش کر کے ان سے تعارف کرادوں گا اور تمہارے معاملات اور تمہارے چچا کے سرکار انگریزی سے تعلقات سبھی ان کے گوش گذار کروں گا تاکہ حقدار کو اس کا حق مل سکے نہ صرف یہ بلکہ حکومت سے کہکر تم پانچوں (تین پھوپھیاں) اور دو بھائی غالب اور مرزا یوسف) کے نام سند الگ الگ لے دوں گا" ملاحظہ کیجئے "ذکر غالب" طبع چہارم ص ۶۱-۶۲ (مرزا کی کلکتہ والی درخواست کی تمہید) بحوالہ انڈیا آفس لائبریری لندن مجموعہ ۴۳۲۲۹ - جلد ۱۳۲۲۲ - ص ۱۳ تا ۴۵ - اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی تینوں پھوپھیاں اس وقت تک بقید حیات تھیں۔

؎۴ "ذکر غالب" از مالک رام حاشیہ ص ۵۸-۵۹ (طبع چہارم) خواجہ حاجی کا ذکر قطعاً چھوڑ دیا ہے ورنہ اس بحث میں مغالطہ مزید طویل ہوجاتا۔ ؎۵ "نادرات غالب" ص ۵-۹۴

؎۶ حاشیہ ۳ میں مرزا کی کلکتہ والی درخواست کی تمہید کی جو عبارت نقل کی گئی ہے وہ گفتگو ہے جو ۱۸۲۵ء میں مرزا اور نواب احمد بخش خاں کے درمیان ہوئی۔ کیونکہ اس میں سر چارلس مٹکاف کا ذکر ہے جو دوسری بار (باقی صفحہ ۵۳ پر)

مرزا غالب کے والد اور چچا مرزا خود لکھتے ہیں کہ جب ان کے دادا —
" بادو الفقار الدولہ مرزا نجف خاں بہادر پیوست ازاں پس پدرم عبداللہ بیگ خاں بشاہجہاں آباد بوجود آمد"۔ [1] مرزا نجف خاں سے پیوست ہونے اور اس کے بعد دہلی میں پیدا ہونے سے مراد یہ ہے کہ دہلی پہنچنے کے بعد یعنی ۱۷۷۲ء میں پیدا ہوئے [2] اور مرزا کے چچا نصر اللہ بیگ خاں چونکہ عبداللہ بیگ خاں سے عمر میں چھوٹے تھے اس لئے وہ ۱۷۷۴ - ۱۷۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ عبداللہ بیگ جب دس گیارہ برس کے ہوئے تو ان کے باپ توقان بیگ خاں کا سایہ سرسے اٹھ گیا (۱۷۸۲ - ۸۳ء کے قریب) اس لئے پہاسو کا پرگنہ (ضلع بلند شہر متصل ضلع علیگڑھ)۔ جو ان کی ذات اور رسالہ کی تنخواہ میں مقرر تھا کیسے باقی رہ سکتا تھا۔ تاہم اندھیر نگری تھی۔ مرزا کے دادا نجف خاں کے قدیم ملازموں میں تھے اور ۸۴ - ۱۷۸۲ء تک نجف خاں ہی کے آوردہ و پروردہ اور اسی کے نائبین: افراسیاب خاں۔ (جو وسط دوآبہ، علیگڑھ و دریلیسر کے علاقوں میں نجف خاں کا نائب تھا)، مرزا محمد شفیع، نجف قلی خاں اور محمد بیگ ہمدانی کا زور شور رہا۔ اس عرصہ میں افراسیاب خاں اور مرزا محمد شفیع بالترتیب نائبین سلطنت دہلی رہے اور انھیں نجف خاں کی ہمشیرہ خدیجہ سلطان بیگم کی (جو اس زمانہ میں دہلی میں رہتی تھیں) پشت پناہی حاصل رہی۔ اس لئے ممکن ہے کہ اس دوران میں پہاسو کی جاگیر توقان بیگ خاں مرحوم کے دشاء کے تصرف میں رہی ہو، اور ضبطی کے قانون پر عملدرآمد نہ کیا گیا ہو کیونکہ خود مرزا نجف خاں کے مال و املاک کی ضبطی کی خود بادشاہ بھی جرأت نہ کر سکا تھا لیکن جیسا کہ ایچ، جی، کین لکھتا ہے:۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۲ سے آگے) ۱۸۲۵ء سے ۱۸۲۷ء تک دہلی کے ریذیڈنٹ رہے لیکن ان کے آنے کے بعد بھرت پور کا معاملہ پیش آگیا جو ۱۸ر جنوری ۱۸۲۶ء کو فتح ہوا گویا یہ گفتگو ۱۸۲۵ء ہی کی ہے۔ اس لئے غالب کی دادی کا انتقال ۱۸۲۵ء یا اس سے قبل ہوا۔ مالک رام صاحب نے ص ۶۲ (طبع چہارم) کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ " اس سے معلوم ہوا کہ ۲۸ر اپریل ۱۸۲۸ء سے پہلے غالب کی دادی یعنی نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ کا انتقال ہوگیا"۔ مالک رام صاحب نے یہ نتیجہ درخواست پر تحریر کی ہوئی تاریخ سے نکالا ہے حالانکہ جس سن میں یہ گفتگو ہوئی ہے (۱۸۲۵ء) وہ اس سے پہلے ہی فوت ہو چکی تھیں۔

[1] کلیات نثر ص ۱۵۶ (خط بنام سراج الدین احمد)

[2] ۱۷۷۲ء فرض کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی کل ۳۰ سالہ زندگی میں اودھ بھی گئے اور آگرہ میں بھی رہے کئی برس حیدرآباد میں ملازمت کی، پھر آگرہ میں ۵، ۶ سال رہے اور پھر الور گئے یہ تمام باتیں سن شعور کو پہنچنے کے بعد شروع ہوئیں اسلئے ان کی تاریخ پیدائش دہلی پہنچنے کے فوراً بعد فرض کی جائے تو ان تمام امور کی انجام دہی کے امکانات ہو سکتے ہیں۔

"سلطنت مغلیہ کے عروج کے زمانہ میں کسی ٹھکانیدار کی جاگیر کو
اس کی تنخواہ یا وظیفہ کا بدل سمجھا جاتا تھا جو محض حین حیات تک
جاری رہتی تھی اور اس کی موت پر فوراً ضبط کر لی جاتی تھی ......
اس قسم کی جاگیروں کی پڑتال کرنے کا اب سندھیا نے حکم دیا تھا
اس کو یہ اُمید ہے کہ جہاں کہیں سند مشکوک یا ناجائز ہو گی اور معطی
بھی اس قدر کمزور ہوگا کہ سلطنت کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہوگا وہاں تمام
آمدنی ضبط کر کے سلطنت کے کام میں لائی جائے گی۔ یہ کارروائی
بالکل ضابطہ کے موافق تھی اس کے لئے کسی سیاسی توجیہہ
کی ضرورت نہیں تھی"[1]

مادھوجی سندھیا نائب سلطنت دہلی اور بخشی مالک نومبر ۱۷۸۴ء میں ہوا۔ اور متذکرہ بالا کارروائی ۱۷۸۴ء تا ۱۷۸۶ء کے دوران ہوئی۔ کین کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ۱۷۸۶ء میں عمل میں آئی۔ مرزا کے محولہ بیان سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہاسو کی جاگیر مرزا کے دادا کے انتقال کے فوراً بعد ختم نہیں ہوئی بلکہ "طوائف ملوک" کے ہنگامہ میں گئی۔ اور یہ طوائف الملوکی ہی کا دور تھا۔

بہرحال جانے والی چیز تھی ۸۳-۱۷۸۲ء میں نہ سہی ۸۶-۱۷۸۵ء میں گئی۔ توقان بیگ خاں کے انتقال کے بعد بڑے بیٹے کو (عبداللہ بیگ خاں کو جو اس وقت ۱۴، ۱۵ سال کا تھا) تلاش معاش کی فکر لازمی تھی ممکن ہے ایک دو سال اسی غور و خوض اور اس خیال میں گزرے ہوں اور جیسے تیسے گزارا کیا ہو لیکن تا بکے ۱۶، ۱۷ سال کی عمر ہو گئی اور آخر انھیں ملازمت کے لئے نکلنا پڑا۔ اس زمانہ میں "طوائف ملوک" کے ہنگامہ کا آخر دور شروع ہو چکا تھا۔ اسمعیل بیگ ہمدانی اور غلام قادر روہیلہ کا تمام دوآبہ پر اثر و اقتدار تھا۔ اسمٰعیل بیگ اکبرآباد کے قلعہ کا محاصرہ کر رہا تھا اور غلام قادر دہلی اور بادشاہ دہلی پر اپنے تسلط کی فکر میں تھا۔ مادھوجی سندھیا اس وقت جنوب میں اپنے معاملات میں اُلجھا ہوا تھا۔ اور شمالی ہند سے فی الحال اس کا اقتدار ختم ہو چکا تھا (وسط ۱۷۸۷ء سے) بالآخر غلام قادر نے اسمٰعیل بیگ ہمدانی کے تعاون سے دہلی میں وہ اودھم مچایا کہ نادرگردی اور قادرگردی میں کوئی فرق نہ رہا۔ بقول سرکار (۱۸ جولائی سے ۲ اکتوبر ۱۷۸۸ء) ۹ ہفتہ تک دلی میں دیوزادوں کا ناچ ہوتا رہا[2]۔ ان حالات میں عبداللہ بیگ خاں کو ملازمت کے لئے اودھ کو

12062

---

[1] اتیہ بی جی کین "مادھوجی سندھیا" (ترجمہ اُردو) ص ۹۷-۹۶ مطبوعہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۲۳ء کین نے سن نہیں لکھا لیکن ۱۷۸۶ء کے واقعات کے ذیل میں اسے بیان کیا ہے۔ [2] سرکار "فال آف دی مغل امپائر" جلد سوم ص ۳۱۰

منتخب کرتا پڑتا جہاں نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) کی حکومت تھی ممکن ہے اس انتخاب میں قاسم جان کی معاونت بھی شامل ہو بلکہ ہمرہی بھی۔ بہرحال عبداللہ بیگ خاں ۱۷۸۷ء کے اوائل یا ۱۷۸۸ء کے اواخر میں لکھنؤ پہنچے۔ لیکن یہاں سے غالب کے بیانات محل غور ہیں۔ بلکہ پھر یہی کہنا پڑتا ہے کہ "یترا بیان غالب" ایک خط میں لکھتے ہیں کہ :-

> " وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جاکر نواب
> آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدرآباد جاکر نواب نظام علیخاں
> کا نوکر ہوا۔ تین سو سواروں کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں
> رہا وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی والد نے
> گھبرا کر الور کا قصد کیا راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی
> میں مارا گیا۔"[1]

یعنی والد جب دلّی سے نکلے تو دلّی دیکھنی نصیب نہ ہوئی، آگرہ کا تو کوئی سوال ہی نہیں گویا کبھی آگرہ گئے ہی نہیں — ایک دوسرا بیان جو خود نوشت حالات میں ہے ملاحظہ فرمائیے :-

> "باپ اسداللہ خاں مذکور کا عبداللہ بیگ خاں دلّی کی ریاست چھوڑ
> کر اکبرآباد میں جا رہا۔ اسداللہ خاں اکبرآباد میں پیدا ہوا۔ عبداللہ
> بیگ خاں الور میں راجہ راؤ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا اور وہاں ایک لڑائی
> میں بڑی بہادری سے مارا گیا۔"[2]

اس بیان سے واضح ہے کہ غالب کے والد دلّی سے آگرہ گئے اور آخر زمانہ میں الور گئے اور بس۔ لکھنؤ اور حیدرآباد جانے کا کوئی ذکر ہی نہیں۔

حالی لکھتے ہیں :-

> " مرزا کے والد عبداللہ بیگ خاں جیسا کہ مرزا نے خود ایک خط میں
> لکھا ہے۔ اول لکھنؤ میں جاکر نواب آصف الدولہ کے ہاں نوکر ہوئے
> اور چند روز بعد وہاں سے حیدرآباد پہنچے اور سرکار آصفی میں تین سو
> سوار کی جمعیت سے کئی برس تک ملازم رہے مگر وہ نوکری ایک خانہ جنگی

---

[1] "خطوط غالب" مرتبہ غلام رسول مہر جلد دوم ص ۱۹۳
[2] احوال غالب ۔ (خود نوشت حالات کا عکس)

کے بکھیڑے میں جاتی رہی اور وہ واپس آگرے میں چلے آئے
یہاں آکر انھوں نے الور کا قصد کیا"[1]

حالی نے غالب کے جس خط کا حوالہ دیا ہے اس میں یہ کہیں نہیں ہے کہ "وہ واپس آگرے میں چلے آئے اور یہاں آکر انھوں نے الور کا قصد کیا"۔ یا تو یہ اضافہ ان کی ذاتی معلومات پر مبنی ہے یا پھر یہ سوچکر کہ مرزا اسد اللہ خاں اور مرزا یوسف خاں جب آگرہ میں یکے بعد دیگرے دو سال کے وقفہ سے پیدا ہوئے تو ان کے والد کا اس زمانہ میں آگرہ میں ہونا لازمی ہے یعنی ۱۷۹۶ء سے۔ اور یہ درست بھی ہے اور شاید حالی کو بھی اس کی خبر ہو کہ ۱۷۹۵ء میں حیدرآباد کی ریاست میں خانہ جنگی کا دو دبکھیڑا ہوا تھا جس کی طرف خود غالب نے اشارہ کیا ہے[2]۔ اس لئے اس کے بعد ہی وہ آگرہ آئے۔ گویا ۱۷۹۵ء اور اس سے پہلے سے وہ حیدرآباد میں تھے۔ اس سے پہلے وہ لکھنؤ رہے جہاں وہ چند روز یا چند ماہ رہے اور اس سے پیشتر دلی میں۔ تو پھر عبداللہ بیگ خاں کی شادی، خواجہ غلام حسین خاں کمیدان، رئیس آگرہ کی لڑکی سے کب ہوئی ۱۷۹۶ء میں؟ اور کہاں ہوئی؟ جب وہ حیدرآباد سے واپس آگرہ آئے۔ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے تو پھر چھوٹی خانم کب پیدا ہوئیں؟ کیونکہ حیدرآباد سے واپس آنے کے بعد قیام آگرہ کے دوران مسلسل دو بچے دو سال کے وقفہ سے پیدا ہوئے (۱۲۱۲ھ م ۱۷۹۷ء اور ۱۲۱۴ھ م ۱۸۰۰ - ۱۷۹۹ء میں) اس کے بعد ۲ - ۱۸۰۱ء میں الور چلے گئے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرزا یوسف خاں کی پیدائش اور الور جانے کے درمیانی وقفہ میں ہوئی تو پھر دو سال کی مدت میں ان کی شادی کا بھی کوئی سوال نہیں، جب شادی نہیں ہوئی تو پھر سرکار انگریزی کی جانب سے جو پنشن چچا کی جاگیر کے عوض مقرر ہوئی تھی اس میں غالب کی ہمشیرہ کا بھی حصہ ہونا چاہئے تھا۔ وہ کہاں ہے؟ اسی وجہ سے مالک رام صاحب نے یہ فیصلہ کیا "کیونکہ پنشن کے حصہ داروں میں چھوٹی خانم کا کوئی ذکر نہیں اس لئے میرا خیال ہے کہ اس وقت ان کی شادی ہو چکی تھی۔ اگر وہ مرزا غالب سے دو برس بھی بڑی ہوں، جو بعید از قیاس نہیں تو ۱۸۰۶ء میں ان کی عمر گیارہ برس کی ہوگی اور اس عمر میں شادی ہو جانا غیر ممکن نہیں۔ خود جب مرزا غالب کی شادی ہوئی ہے تو ان کی بیوی کی عمر صرف گیارہ برس تھی اور ان کی اپنی تیرہ برس کی"[3]

مالک رام صاحب کا مطلب یہ ہے کہ چھوٹی خانم تقریباً ۱۷۹۵ء میں پیدا ہوئیں۔ یعنی ۱۷۹۵ء میں عبداللہ بیگ خاں آگرہ میں موجود تھے۔ حالانکہ یہ قطعی طور پر وہ زمانہ ہے جب عبداللہ بیگ خاں حیدرآباد میں تھے۔ اور خانہ جنگی کا شکار

---

[1] "یادگار غالب" ص ۱۷ - ۱۶
[2] یہ خانہ جنگی آئندہ صفحات پر ملاحظہ فرمائیے۔
[3] "ذکر غالب" از مالک رام حاشیہ ص ۲۳ (بار دوم) ۱۹۵۰ء

تھے۔ بلکہ ایک بغاوت میں شریک تھے۔ اور اس کے بعد ہی وہ آگرہ واپس آئے ہیں۔ (جیسا کہ حالی نے لکھا ہے)

مہر صاحب اس ذیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ "غالب کے والد پہلے لکھنؤ میں آصف الدولہ کے ہاں نوکر ہوئے، پھر حیدرآباد چلے گئے اور نظام علی خاں کے پاس تین سو سواروں کی جمعیت کے ساتھ ملازم رہے۔ یہ ملازمت جاتی رہی تو آگرہ چلے آئے جہاں ان کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی صاحبزادی سے ہو چکی تھی" [۱]

مہر صاحب نے یہ کہہ کر کہ "جہاں ان کی شادی ..... ہو چکی تھی" اس تمام جھگڑے سے دامن بچا لیا بلکہ اس مسئلہ کے حل کی ایک ممکنہ صورت بھی پیدا کر دی۔ لیکن عبداللہ بیگ خاں کی شادی کب ہوئی؟ اس مسئلہ میں مہر صاحب نے کچھ نہیں فرمایا۔ آگرہ جانے کے متعلق لکھا ہے کہ "بہرحال ۱۷۸۲ء ..... ۱۷۸۵ء (اور) ..... اگر وہ غلام قادر خاں روہیلے کے اقتدار شاہ عالم کی بے بسی کے زمانے میں وہاں گئے تو دو تین برس بعد کا واقعہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خواجہ غلام حسین خاں کی صاحبزادی سے شادی ہونے کے باعث وہ دہلی چھوڑ کر آگرہ چلے گئے ہوں" [۲] اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پہلے آگرہ گئے جہاں ان کی شادی ہوئی اور اس کے بعد وہ قسمت آزمائی کے لئے لکھنؤ اور حیدرآباد گئے۔ لیکن خود غالب کا بیان یہ ہے کہ جب پہاسو کا علاقہ نہ رہا تو "باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا" ظاہر ہے کہ پہلے فکر معاش ہوگی جبکہ بسر اوقات کا ان کے والد کے انتقال کے بعد صرف ایک ذریعہ تھا یعنی پہاسو کی جاگیر وہ بھی نہ رہی اگر آگرہ جانا بغرض ملازمت فرض کیا جائے تو اس وقت ان کی عمر ہی کیا تھی۔ خود مہر صاحب نے لکھا ہے کہ "..... مرزا نجف خاں مختار کل بن گئے تو غالب کے دادا کو ایک اچھی ملازمت مل گئی اور پہاسو کا پرگنہ ذات اور رسالہ کی تنخواہ کے لئے مقرر ہو گیا اس وقت سے انھوں نے دہلی میں سکونت اختیار کر لی اور غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں دہلی میں پیدا ہوئے" [۳] اس سے دہلی میں سکونت اختیار کرنے کا زمانہ ۱۷۷۲ء سے شروع ہوا اور اس کے بعد مرزا عبداللہ بیگ خاں پیدا ہوئے۔ گویا ۱۷۷۲ء کے اواخر میں اس لحاظ سے ۱۷۸۲ء یا ۱۷۸۵ء میں عبداللہ بیگ خاں کی عمر ۱۰ سال اور ۱۳ سال ہوئی۔ اگرچہ اس عمر میں ملازمت کا قیاس مشکل ہی ہے تاہم ممکن ہے کہ دہلی میں مرہٹوں کی ملازمت کر لی ہو۔ لیکن ۸۸-۱۷۸۷ء میں غلام قادر کی ہنگامہ آرائی کے زمانہ میں دہلی سے نکل کر آگرہ پہنچنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ آگرہ کا محاصرہ غلام قادر کے ایک اتحادی اسمٰعیل بیگ نے کر رکھا تھا

---

[۱] "غالب" ص۱۵-۱۶ (بار چہارم)

[۲] "غالب" ص۱۶ کا حاشیہ (طبع چہارم) از غلام رسول مہر

[۳] ایضاً ص۱۶

اور وہ اسمٰعیل بیگ کی ملازمت میں کبھی نہیں رہے ہاں مرہٹوں کی ملازمت کا ذکر تو غالب نے خود کیا ہے۔ تحریر کرتے ہیں کہ "باپ اور چچا بسبب ضعف سلطنت مرہٹوں کی نوکری کرتے رہے"۔[۱] لیکن اس وقت شمالی ہند سے مرہٹوں کا اقتدار تقریباً ختم ہو چکا تھا۔

اس لئے اغلب ہے کہ وہ تلاش معاش کے سلسلے میں قاسم جان کے ساتھ جو دہلی ہی میں تھے۔ پہلے لکھنؤ گئے، (۱۷۸۷ء کے اواخر یا ۱۷۸۸ء کے اوائل میں) لیکن وہاں حسب دلخواہ کوئی اچھی ملازمت نہ مل سکی (معقول ملازمت ملتی بھی کیا، تجربہ کاری اور نو عمری کا زمانہ تھا) اس لئے "بعد چند روز" حیدرآباد نہیں بلکہ آگرہ چلے گئے جہاں جون ۱۷۸۸ء میں مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اور بقول گرانٹ ڈف مصنف تاریخ مرہٹہ، مادھوجی سندھیا کی "سیاسی تجویزوں اور فتوحات میں اضافہ کے سلسلہ میں ہمیں ان تبدیلیوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے جو اس نے اپنے فوجی نظام میں کیں، ان معمولی تبدیلیوں اور جدت طرازیوں میں راجپوتوں اور مسلمانوں کی کافی تعداد میں بھرتی، اپنے سواروں کی وردی میں تبدیلی ......"[۲] وغیرہ شمار کی جا سکتی ہیں۔ انھیں تبدیلیوں کے پیش نظر عبداللہ بیگ خاں نے لکھنؤ سے آگرہ پہنچکر مرہٹوں کی ملازمت کرنے میں اپنا مفاد دیکھا۔ (اس وقت تک سندھیا کا قبضہ دہلی پر نہیں ہوا تھا دہلی پر قبضہ اکتوبر ۱۷۸۸ء میں ہوا) ممکن ہے کہ مرہٹوں کے یہاں آگرہ میں کوئی معقول ملازمت مل گئی ہو اس لئے ان کی شادی آگرہ کے ایک رئیس خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی لڑکی عزت النساء بیگم سے ہو گئی۔ غالباً یہ ۱۷۸۹ء یا ۱۷۹۰ء کا واقعہ ہے یہیں ۹۲-۱۷۹۱ء میں چھوٹی خانم پیدا ہوئیں۔ اسی زمانہ میں ممکن ہے عبداللہ بیگ خاں نے اپنی والدہ بھائی اور متعلقین کو دہلی سے آگرہ بلا لیا۔ اور شاید بھائی نصراللہ بیگ خاں کو بھی مرہٹوں کی ملازمت دلا دی۔ اس سے فارغ ہو کر وہ پھر قسمت آزمائی کے لئے نکلے اور حیدرآباد پہنچے جہاں مسند ریاست پر نواب نظام علی خاں (نظام الملک ثانی ۱۱۷۵ھ / ۱۷۶۲ء تا ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء)[۳] متمکن تھے۔ عبداللہ بیگ خاں "تین سو سواروں کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا،

۱؎ "احوال غالب" صفحہ ۱۲۲ "روداد مقدمہ مرزا غالب" از ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔

۲؎ "ہسٹری آف دی مرہٹاز" از گرانٹ ڈف صفحہ ۲۱۲ حصہ دوم مطبوعہ بمبئی ۱۸۷۸ء طبع چہارم جیمس گرانٹ ڈف نے اسے ۱۷۸۹ء کے تحت لکھا ہے۔ کین، "مادھوجی سندھیا" صفحہ ۱۲۰ پر لکھتا ہے کہ "نئی فوج ...... تابڑ توڑ محنت و سرگرمی کے ذریعہ سے ...... ۱۷۹۰ء میں اس درجہ پر پہنچ گئی کہ اس کو اچھی خاصی تیار کہا جا سکتا تھا"۔ "مرہٹہ سردار سندھیا" ۴ جولائی ۱۷۸۸ء کو گوالیار سے شمالی ہند کی طرف دوبارہ آیا ہے" سرکار۔ جلد سوم صفحہ ۲۸ اس لئے یہ تیاریاں اس کے بعد ہی تقریباً اگست ۱۷۸۸ء کے بعد شروع ہوئیں۔

۳؎ "دربار آصف" کل دوم صفحہ ۸۹ مطبوعہ حیدرآباد دکن نیز ملاحظہ کیجئے "احکم التاریخ" مصنفہ منشی محمد حسین مطبع نامی حیدرآباد دکن ۱۳۱۲ھ

(تقریباً ۳،۴ سال) وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔

نظام علی خاں کے دور حکومت میں یہ خانہ جنگی ذی الحجہ ۱۲۰۹ھ (م ۱۷۹۵ء) اس وقت شروع ہوئی جب "راجہ شیام راج نے ...... رگھوتم راؤ کے کہنے سننے سے فوج میں تخفیف کردی اور انگریزی فوج جو دارالسلطنت میں رہا کرتی تھی وہ بھی بہ مشورہ میر عالم بہادر روانہ کردی گئی۔ تخفیف شدہ فوج نے میدان خالی پاکر مُرشد زادہ عالیجاہ بہادر کو بغاوت پر برانگیختہ کرکے ان کی ملازمت اختیار کرلی۔ چنانچہ ۹ ذی الحجہ ۱۲۰۹ھ (م ۱۷۹۵ء) میں مد غالب جنگ و سیف جنگ وغیرہ قلعہ محمد آباد بیدر پر جاکر قابض ہوگئے" خود[1] میر عالم "حدیقۃ العالم" مقالہ ثانی ص ۴۱۰-۴۱۱ پر لکھتے ہیں کہ "راجہ شام راج کہ در غیبت غلام سید خاں تمشیت امور ملکی ومالی نیابۃً می نمودند برتنبیہ رگھوتم راؤ کفایت سرکار مطمح نظر داشتہ مرضی حضور بتخفیف سپاہ مائل ساختہ ...... در سلک ملازمان حضور لصواب دید ایں مولف بود پیغام تخفیف جمعیت مذکور از حضور رسانیدند ایں مولف از راہ مآل اندیشی و دولت خواہی خداوند نعمت ایں معنی را خلاف انگاشتہ ...... الحاصل چوں تقدیر رنگ دیگر ریختہ جمعیت آں بہادراں کہ ملازم سرکار فیض آثار بود ..... بخفیہ بمرشد زادہ عالیجاہ بہادر درساختہ وعقد مرافقت و کمر ہمت بمیاں بستہ آں مرشد زادہ را بر سر خیال باطل آوردند"[2] غالباً مرزا کے والد عبداللہ بیگ خاں جو ڈھائی تین سال پیشتر ہی وہاں پہنچے تھے اور نئے ملازمین میں تھے اس تخفیف کی زد میں آگئے اور شاید دوسروں کے ساتھ بادل نخواستہ اس بغاوت میں شریک ہوگئے لیکن "چاروں طرف سے لشکر نظام نے ایسا گھیرا کہ سب منتشر و متفرق ہوگئے ...... اور مُرشد زادہ عالیجاہ بہادر اورنگ آباد کی طرف چلے گئے وہاں سے واپس لائے جارہے تھے کہ ..... کہٹیر کی منزل میں سخت بخار آگیا آخر اس عارضہ سے قضا کرگئے ..... نواب میر نظام علیخاں کو سخت رنج و غم ہوا ..... دوسرے سال ..... لقوہ و فالج عائد حال ہوگیا .... آخر کار ۱۲۱۲ھ میں مزاج اصلاح پذیر ہوگیا"[3]

منتشر و متفرق ہونے والوں میں عبداللہ بیگ خاں بھی ہوں گے جو یہاں سے ۱۲۱۰-۱۱ھ (م ۹۶-۱۷۹۵ء) میں فرار ہوکر ۱۲۱۱ھ م اواخر ۱۷۹۶ء میں آگرہ پہنچ گئے یہاں ۸ رجب ۱۲۱۲ھ م ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو مرزا اسد اللہ خاں پیدا ہوگئے اور ۱۲۱۴ھ م ۱۸۰۰-۱۷۹۹ء میں مرزا یوسف خاں کی ولادت ہوئی۔ ۱۸۰۱ کے آخر یا ۱۸۰۲ء کی ابتداء میں الور روانہ ہوئے۔ غالباً ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء میں الور پہنچے اور وہیں راجگڈھ کے ایک معرکہ میں مارے گئے۔ اس کا ثبوت

---

[1] "احکم التاریخ" ص ۱۳۱۴

[2] "حدیقۃ العالم" از میر عالم - مقالہ ثانی ص ۴۱۰-۴۱۱ مطبوعہ در مطبع سیدی، حیدرآباد دکن ۱۳۱۰ھ

[3] "احکم التاریخ" ص ۱۳-۱۴ نیز ملاحظہ کیجئے "حدیقۃ العالم" مقالہ ثانی ص ۴۱۱

راجہ شیودھان سنگھ والئی الور کے قصیدہ کے اشعار سے بھی ملتا ہے۔

در پنج سالگی[1] شدہ ام چپ کہ حفظ او　　رنگیں سخن طرازم و دیریں وظیفہ خوار
دارم بگوش حلقۂ زینجاہ و ہشت سال　　اکنوں کہ عمر شصت و سہ سال است در شمار

کافی بود مشاہدہ بشاہد ضرور نیست
در خاک راجگڑھ پدرم را بود مزار

اس عرصہ میں چچا نصر اللہ بیگ خاں ترقی کی منازل طے کر کے مرہٹوں کی جانب سے جنرل پیرون کے ماتحت اکبر آباد کے حاکم ہو گئے اپنے چچا کے متعلق خود غالب نے تفصیلی حالات لکھے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"نصر اللہ بیگ خاں میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے (جنرل پیرون کے ماتحت) اکبر آباد کا صوبہ دار تھا۔ اس نے مجھے پالا[2]

"۱۸۰۳ء میں جنرل لیک صاحب اکبر آباد آئے تو نصر اللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کر دیا[3]۔ اور اطاعت کی۔ جرنیل صاحب نے چار سو سوار کا بریگیڈیر کیا اور ایک ہزار سات سو تنخواہ مقرر کی۔ پھر جب اس نے اپنے زور بازو سے سونک سونی کے پرگنے بھرت پور کے قریب ہلکر کے سواروں سے چھین لئے۔ جرنیل صاحب نے وہ دونوں پرگنے بہادر موصوف کو بطریق استمرار عطا فرمائے۔ مگر خان موصوف

---

[1] در پنج سالگی سے مراد ۱۲۱۷ھ ہے اور یہ مطابق ۰۳-۱۸۰۲ء ہے۔ لیکن یہ طے شدہ ہے کہ ۱۸۰۲ء میں مرزا کے والد راجگڑھ کے معرکہ میں کام آئے۔ اس لئے ۱۸۰۲ء میں الور پہنچنا اور اسی سن میں مارا جانا ثابت ہوتا ہے۔ حالی کے بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں الور میں زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ راج گڑھ کا معرکہ پیش آگیا اور وہ اس میں مارے گئے

[2] "خطوط غالب"، مرتبہ غلام رسول مہر جلد دوم ص۴۹۱

[3] "ہسٹری آف دی مرہٹاز" از جیمس گرانٹ ڈف حصہ دوم ص۲۰۱ "۱۸ اکتوبر ۱۸۰۳ء"
نیز "مارکوئس ویلزلی" از ڈبلو۔ ایچ۔ ہٹن (اردو ترجمہ) ص۶۸
"۱۸ اکتوبر کو آگرہ نے اطاعت قبول کرلی"
(مطبوعہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۲۲ء)

جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے بعد بہ مرگ ناگاہ ہاتھی پر سے گر کر مرگیا[1]
جاگیر سرکار میں باز یافت ہوئی۔[2]
"اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکا حقیقی کے
واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں کا مرحوم دس ہزار روپیے
سال مقرر ہوئے۔ اُنھوں نے نہ دیئے مگر تین ہزار روپیہ سال"[3]

جس میں سے ڈیڑھ ہزار ان دونوں بھائیوں کے تھے (مرزا اسد اللہ خاں اور مرزا یوسف خاں) اس لئے اسداللہ خاں غالب کا حصہ کل ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ ہوا۔ یعنی ساڑھے باسٹھ روپیہ ماہانہ۔ یہی ایک پنشن یا وظیفہ سمجھیے یا آباؤ اجداد کا ورثہ جس سے وہ زندگی بھر فیضیاب ہوتے رہے۔

نصر اللہ بیگ خاں کی شادی عارف جان (برادر قاسم جان) کی لڑکی اور نواب احمد بخش خاں فخر الدولہ دلاور الملک رستم جنگ والی لوہارو کی ہمشیرہ سے ہوئی تھی۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی اور یہ ان کی زندگی ہی میں فوت ہوگئیں۔ یہ شادی ۱۸۰۳ء سے قبل ہوئی جبکہ نصر اللہ بیگ خاں مرہٹوں کی جانب سے جنرل پیرون کے ماتحت اکبرآباد کے حاکم تھے۔ جب جنرل لیک نے اکبرآباد پر قبضہ کیا۔ (۱۸۰۳ء) تو اس رشتہ کی بنا پر نواب احمد بخش خاں نے سفارش کی۔ اور وہ چار سو سواروں کے رسالدار ہوگئے۔ سونک اور سونسا کے پرگنے رسالہ دار بننے کے بعد جب جنرل لیک کے ماتحت جنگوں میں شریک ہوئے تو ہلکر سے چھینے تھے[4] اور یہی ۱۸۰۵ء میں ان کی بہادری اور کارگزاری کے صلے

---

[1] "ذکر غالب" از مالک رام ص۱۳ پر لکھتے ہیں "۱۸۰۶ء میں ایک دن سیر کرتے ہوئے اچانک ہاتھی سے گر گئے ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور چوٹیں بھی آئیں ایسی حالت میں چند دن بعد ان کا انتقال ہوگیا" بحوالہ احوال غالب ص۲۸ تفصیل انڈیا آفس لائبریری لندن مجموعہ ۵۳۴۲۹ جلد ۱۳۴۴ ص ۲۰۔ غلام رسول مہر صاحب نے "غالب" حاشیہ ص۱۸ پر وفات کی تاریخ ۴ مارچ ۱۸۰۶ء اور ۴ مئی ۱۸۰۶ء کے درمیان طے کی ہے جو درست معلوم ہوتی ہے۔

[2] "احوال غالب" (غالب کے خود نوشت حالات کا عکس)

[3] "خطوط غالب" مرتبہ غلام رسول مہر جلد دوم ص ۲۲۶-۲۲۰ (خط بنام چودھری عبد الغفور سرور)

[4] "مارکوئس ویلزلی" از ڈبلو۔ ایچ۔ ہٹن (اردو ترجمہ) ص۶۵

۱۵ نومبر ۱۸۰۴ء سے یکم اپریل ۱۸۰۵ء تک جنرل لیک اور اس کی افواج ڈیگ اور بھرت پور کے علاقہ میں ہلکر کے مقابل رہیں۔ ڈیگ ۲۴ دسمبر کو فتح ہوا اس کے بعد بھرت پور کا محاصرہ شروع ہوا۔ یکم اپریل کو بھرت پور کے راجہ نے صلح کر لی (۱۸۰۵ء)۔ غالباً ۲۴ دسمبر سے یکم اپریل تک سونک اور سونسا کے پرگنے نصر اللہ خاں بیگ (باقی صفحہ ۶۲ پر)

میں اُنھیں دیدیئے گئے تھے۔ لیکن ان سے زیادہ عرصہ متمتع ہونا ان کی قسمت میں نہ تھا ۳ مارچ ۱۸۰۶ء سے ۴ مئی ۱۸۰۶ء کے درمیان کسی تاریخ کو ناگاہ ہاتھی سے گرے اور زخمی ہو گئے چند روز بعد زخموں کی تاب نہ لاکر فوت ہو گئے۔

غالب گویا دوسری بار یتیم ہو گئے۔ آباؤ اجداد میں سے کوئی بھی ان کا غمخوار نہ رہا۔ بلکہ ان میں سے کوئی "سمرقند یا دشت قبچوق" میں زندہ بھی ہو تو اس کی صورت دیکھنے کی بھی اُمید نہ رہی۔ ؎

رسم اُمید ہما ناز جہاں برخیزد

"ہاں اقربائے سببی تھے" سو پانچ برس" یا زیادہ سے زیادہ آٹھ، نو برس کی عمر سے" ان کے دام میں اسیر رہے[۱] اور پینسٹھ[۶۵] برس ستم اُٹھاتے[۲]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۱ سے آگے) نے مُلکر سے چھینے اور یہی کچھ دن بعد نصراللہ بیگ خاں کو بطریق استمرار عطا کر دیئے گئے۔

۱۔ خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول مہر۔ جلد دوم ص ۹ (خط بنام انوارالدولہ شفق) ۲۔ تقریباً ۶۵ سال قمری

غالب کی طنز و ظرافت

● پروفیسر رشید احمد صدیقی

اُردو شعر و ادب ہی نہیں طنز و ظرافت کی محفل میں بھی غالب اس طرح داخل ہوئے ہیں جیسے فلمی گانوں کے درمیان پکے گانے کا کوئی اُستاد وارد ہو جائے۔ تقریباً ہر صدی میں دو ایک بار ایسا اتفاق ہوتا ہے۔ غالب انہیں دلچسپ لیکن ناگزیر اتفاقات میں سے ہیں ان کو کسی خاص دور میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خود ایک دور ایک عہد یا ایک مزاج ہیں، اسی طرح جیسے ان سے پہلے سودا اور ان کے بعد اکبر کی حیثیت دیکھا و سمجھ لیں تو اُردو طنزیات و مضحکات کا پورا سواد تار تار ہو کر ہمارے پیش نظر ہو جائے گا اور ہمیں وہ تمام مثبت اور منفی قدریں مل جائیں گی جن کو مختلف صورتوں میں ایک دوسرے سے ربط دے کر تمام دوسرے طنز نگاروں اور مزاح نگاروں کا خمیر تیار کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کے فن اور کارنامے دونوں کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ عہد و زمانہ کے لحاظ سے بھی غالب، سودا اور اکبر کے درمیان آتے ہیں اس طرح ان کی حیثیت "برزخ" کی سی ہو گی جس میں ایک طرف سودا اور ان کی روایات اور دوسری طرف اکبر اور ان کے لواحقین ہیں، گویا اس عمل یا سفر میں غالب کی حیثیت اپنے کو اس طرح ڈھالتی بنواتی ہے کہ اکبر تک پہنچتے پہنچتے جنت و جہنم (برعایت برزخ) کی تفریق مٹتی نظر آتی ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ جنت اور جہنم بھی بس "اک انداز بیاں" ہے۔

پروفیسر ممتاز حسین
صدر شعبہ اردو اردو کالج، کراچی

غالب

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اگر ہم پچھلی گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی تہذیبی زندگی کا جائزہ لیں تو یہ محسوس کریں گے کہ ہم ایک ایسے طویل انقلاب کے دور سے گزر رہے ہیں جس کی مختلف سمتیں ہیں۔ کہیں وہ انقلاب ہماری پرانی معاشرتی زندگی کو تبدیل کر رہا ہے تو کہیں ہمارے افکار اور اقدار کی دنیا کو بدلے چلا جاتا ہے۔ یہ انقلاب ہمارے درمیان ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید اور حالی کے زمانے میں نہیں بلکہ اس سے بیس بائیس برس پہلے اس وقت آیا جبکہ حکومت انگلشیہ نے اگر ایک طرف ہمیں مغرب کی ایجادات مثلاً دخانی کشتیاں، ریل گاڑی، ٹیلیگراف، گیس کی روشنی اور اسی طرح کی متعدد چیزوں سے روشناس کرایا تو دوسری طرف مغربی طرز کے سکول اور کالج کھول کر ہمیں جدید طبیعاتی علوم، جدید علم تاریخ اور تنقید اور اپنے ملک کے افادی عقلی فلسفے سے متعارف کرایا جو اس زمانے میں ایک انقلابی قوت کا حامل تھا۔ چنانچہ اسی زمانے سے ہمارے یہاں ایک کشمکش ایک تصادم، پرانی اور نئی اقدار، تقلیدی اور غیر تقلیدی فکر کے درمیان پیدا ہو گئی۔

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

غالب کے یہاں یہ کشمکش اسی تاریخی حقیقت کی غماز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غالب انگریزی تعلیم سے بے بہرہ تھے اور ان کے فکر کی اساس مشرق ہی کا فلسفہ ہے۔ لیکن اس موقع پر ہمیں نہ بھولنا چاہیئے کہ غالب اوّل تو جی نئیس تھے جو فراز کوہ سے نکلتے ہوئے سورج کی روشنی دیکھ رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ بہت ہی وسیع اور گوناگوں تجربات کے مالک تھے جن میں ان کے کلکتے کے سفر اور انگریزوں کے ساتھ ربط و ضبط نے کافی اہم رول انجام دیا۔ انہوں نے کلکتے کا سفر ایسے زمانے میں کیا جب کہ وہ انگریزی تعلیمات کے زیر اثر متعدد اصلاحی تحریکوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ غالب جیسے حساس، ذکی اور غیر معمولی ذہانت رکھنے والے شخص کا جو منطق اور فلسفے کا مذاق ابدی اور سرمدی لایا تھا۔ ان بدلتے ہوئے حالات سے متاثر نہ ہونا بعید از قیاس تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے آئین اکبری کی تقریظ میں جہاں ایک طرف مغربی ایجادات اور انگریزوں کی آئینی حکومت کو سراہا ہے۔ وہاں ماضی پرستی کی سخت مذمت کی ہے اسے مردہ پروری کا نام دیا ہے۔ دورِ حاضر کے جدید

ذہن کو غالب کے ساتھ جو اس قدر شیفتگی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ وہ ہمارے درمیان پہلا شخص ہے جس نے نہ صرف اس تاریکی تصادم کی فضا کو اپنے کلام میں سمویا بلکہ ایک شک کی نگاہ ہر اس نئے پر ڈالی جو ان کے خیال میں بے جان اور مردہ تھی اور نقد و نظر کی محتاج تھی۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیا ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

مگر غالب اپنی سحر بیانی اور لطف کلام کو ذرا دیر میں پہنچے کیونکہ ان کی راہ میں ایک ضخیم نذر بیدل بھی تھا جسکے افسون نقش میں وہ تا دیر اسیر رہے اس میں شبہ نہیں کہ طرزِ بیدل میں بھی انہوں نے معنی آفرینی کے بڑے جوہر دکھلائے ہیں۔ لیکن چونکہ اس طرز کی زبان بہت زیادہ فارسی آمیز اور انداز فکر دقیق نیندی ابہام اور اختصار کا تھا جس کے معنے بہ آسانی بر آمد نہیں ہوتے تھے اس لئے ان کے اس دور کے کلام پر بڑی کڑی تنقیدیں ہوئیں۔ تنقید کیا بلکہ یوں کہئے تنقیص ہوئی کوئی کہتا ہے کہ مرزا غالب ریختہ فارسی کے محاورے میں کہتے ہیں تو کوئی ان کو مہمل گو ٹھہراتا اور ایک موقع پر تو حکیم آغا جان عیش نے یہ قطعہ غالب کے روبرو مشاعرے میں پڑھ دیا

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے — مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے — مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

غالب پر اس تنقید کا بڑا صحتمند اثر ہوا کیونکہ ان کی طبیعت سلیم اور ماخذ صحیح تھا۔ انہوں نے طرزِ بیدل کو خیر باد کہا اور اپنی طبع سلیم کو رہنما بنا کر جہاں فارسی میں نظیری کے اسلوب کو اپنایا وہاں اردو میں میر کے کلام سے اپنی موانست بڑھائی۔ غالب ایک صاحبِ طرز شاعر تھے۔ ان کے لئے کسی کی تقلید ممکن نہ تھی پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کہیں کہیں میر کے طرز میں آجاتے ہیں۔

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے

لیکن ایسے مقامات بہت کم ہیں۔ وہ بھی چھوٹی بحروں میں ورنہ وہ اپنے منفرد اسلوب پر قائم رہتے ہیں جس میں ان کی ذکاوتِ تخیل اور جذبے کی ایک ایسی لطیف اور کامل آمیزش ہے کہ وہ اسلوب ان کی ذات سے مختص ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کی تقلید کی کوشش بہت شعراء نے کی لیکن وہ سب کے سب بے مزہ ہو کر رہ گئے۔ اتنا منفرد اسلوب مشکل ہی سے کسی کا ہوگا۔ غالب کا کلام بڑا منتخب کلام ہے۔ اس کی ہر غزل دامنِ دل کو کھینچتی ہے۔ بس یہی کرشمہ سخن ہے۔

ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور — کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
یا رب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات — دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھکو زباں اور

بے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا — ہوتے جو کئی دیدۂ خونبانہ فشاں اور
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے — رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
ہرچند سبک دست ہوئے بت شکنی میں — ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

غالب کے اس منفرد اسلوب کو سمجھنے کے لیے ان کی ذہنی افتاد اور شخصیت کو سمجھنا ضروری ہے۔

غالب شاعری کو معنی آفرینی کا نام دیتے ہیں اور اس کی وضاحت آئینہ حقیقت کے دکھانے سے کرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ان کی شاعری خیال بندی اور قافیہ پیمائی کی نہیں بلکہ حقیقت نگاری کی ہے۔ لیکن غالب کی یہ حقیقت نگاری مطابق حقیقت نگاری نہیں ہے۔ ان کا ہر شعر ان کے اپنے جذبے سے ہی نمو پاتا ہے۔ لیکن وہ اپنی غذا ان کے تخیل اور فکر سے حاصل کرتا ہے اور جب کوئی خیال معرضِ وجود میں آتا ہے تو اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتا جب تک وہ جذبے میں تبدیل نہ ہو جائے۔ دونوں صورتوں میں ان کے یہاں جذبے سے فکر کا جدا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ان کے اس امتیازِ فن کا راز بھی تو اس بات میں ہے کہ وہ جذبے کو بالعموم اس کی کشمکش کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ اور اس کی عنصری کیفیت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ اس بات میں کہ وہ تعلیم یافتہ مجرد خیال سے گریز کر کے عوام کو خصوص یا منفرد محسوس میں ڈھونڈتے ہیں۔ ان کے اس انداز فکر میں تعمیم ہمیشہ موجود ہوتی ہے۔ لیکن وہ تعمیم محسوس ہوتی ہے نہ کہ مجرد۔ اس باب میں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے۔

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا — ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے
یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات — عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیئے

مگر غالب کو صرف ان کے اس منہاج فکر سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کے لیے ان کی شخصیت کے خد و خال کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔ غالب کی شخصیت یک رنگی نہیں ہے کہ اس کی نشاندہی فوراً کر دی جائے۔ بقول میر صاحب۔ رنگ مری موج ہے میں طبع رواں ہوں۔ دراصل حقیقت یہ بھی ہے کہ ہر بڑے شاعر کی طبیعت ایسی ہی ہوتی ہے وہ آزاد و بے پایاں طبیعت کا حامل ہوتا ہے۔ مختلف سمتوں میں جھکتا ہے کائنات کی ہر شے کے ساتھ متاثر ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے کلام میں بلندی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے کو ان سے سمیٹ کر کے ایک معروضی نقطۂ نگاہ بھی پیدا کر سکے۔ چنانچہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ غالب ایک پہلو دار مختلف الصفات شخصیت ... یہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت کا غالب رجحان بت شکنی کا ہے۔ تقلید ان کی فطرت کا خاصہ نہیں۔ وہ اپنی فارسی کے ایک شعر میں کہتے ہیں۔

بامن میاویز اے پدر فرزند آزر را نگر — ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

اس سلسلے میں ان کے چند اشعار اردو کی ایک غزل کے بھی ملاحظہ ہوں۔

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں — پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے
کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی — پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے   آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

غالب اپنی آزادہ روی کے باعث جناب شیخ کے حضور بدنام بھی بہت تھے۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں۔

ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے   شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

لیکن وہ یہ کہہ کر بھی اپنی تسلی کر لیا کرتے تھے۔

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے   ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

جس طرح یورپ میں یونانی علوم و فنون کی نشاۃ ثانیہ کی روشن خیالی نے لوتھر کی مذہبی اصلاحی تحریک کے لیئے راہ ہموار کی اسی طرح ہمارے یہاں غالب کی روشن خیالی نے سرسید کی مذہبی اصلاحی تحریک کے لیئے راہ ہموار کی۔ یورپ میں جو کام صدیوں میں ہوا وہ ہمارے یہاں نسبتاً بہت کم زمانے میں ہوا کیونکہ بسا اوقات تاریخ اپنے قرض کو چشم زدن میں چکا دیتی ہے۔ ویسے تو ہمارے یہاں بھی یونانی علوم کا احیاء غالب کے زمانے سے صدیوں پہلے ہوا تھا۔ لیکن چونکہ درمیانی صدیوں میں اسے ہمارے یہاں نہ تیغ کر دیا گیا تھا اس لیئے تاریخ کا عمل رک گیا تھا۔ اس عمل کو تیز کرنے کے لیئے جہاں بہت سے عوامل کام کر رہے تھے ان میں غالب کی روشن خیالی نے بھی ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ غالب نے شمع یونان کی لو از سر نو زندہ کی اور اس کی روشنی میں جہاں انسان کو مرکز کائنات ٹھیرایا وہاں اس کے اوہام باطلہ کی تنقید بھی کی اور یہ خدمت غالب نے ایک ایسے زمانے میں انجام دی جبکہ ہمارے سامنے نہ تو کوئی رہبر اور نہ رہرو تھا غالب کا یہ شعر اسی بیب [?] سناٹے کی نشاندہی کرتا ہے۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب   اک آبلہ پا وادیِ پرخار میں آوے

اور جب اس کی یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی تو اس آبلہ پائی کی خدمت اس نے خود ہی انجام دی اور اس شان سے سرگرم سفر ہوا کہ دشتِ امکاں کو ایک قدم جانا۔

غالب کی شخصیت کا یہ ایک پہلو ہے اس کا ایک دوسرا پہلو ان کی انسان دوستی یا ان کے ایثار و کرم کے دامن سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ایثار و کرم کے جو دواعی خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں۔ بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں اور اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو کوئی ننگا بھوکا نہ ہو غالب کے یہاں یہ بات صرف اظہار خیال تک محدود نہ تھی وہ اس پر حتی الوسع عمل بھی کرتے تھے جس زمانے میں کہ دلی میں غدر ہوا اور غالب پر رزق کے سارے دروازے بند ہو گئے اس وقت ان کے گھر میں تین نفر ملازم تھے لیکن انھوں نے اس بے سرو سامانی [?] کے عالم میں بھی ان میں سے کسی کو بھی ملازمت سے برطرف نہیں کیا اور ان کی داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ جو خلعت اور جواہر انہیں انگریزوں کے دربار سے ملتے انہیں وہ بیچ کر ملازمین کے درمیان بطور انعام و اکرام تقسیم کر دیتے۔ غالب کے اس رویے [?] نے جہاں انہیں اس فکر سے آشنا کیا ہے

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم   ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

وہاں اس نے جنتِ ارضی کی اس آرزو سے بھی انہیں ہمکنار کیا۔

یارب بجہانیان دلِ خرم دہ — در دعویٔ جنت آشتی با ہم دہ
شداد پسر نداشت باغش ز تست — آں مسکنِ آدم بہ بنی آدم دہ

غالب کی شخصیت کا ایک اہم پہلو جسے حالی نے خاص طور سے ابھارا ہے وہ یہ ہے کہ ان میں شوخی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی چنانچہ اسی بنا پر حالی نے انہیں حیوانِ ظریف کا لقب دیا ہے۔ ہمیں حالی کی اس رائے سے پورا اتفاق ہے کہ غالب ایک حیوانِ ظریف تھے۔ لیکن یہ تو انسان کی ایک نوعی صفت ہے کہ وہ ہنستا اور ہنساتا بھی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی ذکاوت نے اس میں چار چاند لگا دیئے۔ تو اصل مسئلہ ان کی ذکاوت یا وٹ (wit) کے سمجھنے کا ہے نہ کہ ان کے لطیفوں کی داستان بیان کرنے کا۔ اس میں شبہ نہیں کہ زمانے کے ہاتھوں وہ اپنے کمالِ فن کی ناقدری کی سے دل آزردہ ہو کر اس طرح کے شعر کہنے لگے تھے جو تمام تر دل لگی کے ہوتے تھے۔

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ — کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

لیکن جب ان کی یہ دل لگی آستانۂ یار یا اربابِ معشوق یا دانشوران یا پھر اپنی ذات سے تجاوز کرکے بارگاہِ خداوندی کی طرف رجوع کرتی ہے۔ تو نہیں کہا جا سکتا ہے کہ خاکم بدہن وہ اس وقت بھی ٹھٹھول ہی کرتے ہیں۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

اس شعر میں مزاحِ محض سے زیادہ وہ وٹ ہے جو ایک افسانۂ بعد الموت کو معرضِ تنقید میں لائے ہوئے ہے۔ یہاں غالب کی طبیعت کی شوخی سے زیادہ ان کا فلسفۂ حیات الجھا ہوا ہے۔ غالب کے ساتھ دقت یہ ہے کہ وہ جس قدر سادہ نظر آتے ہیں اتنے ہی پرکار ہیں۔ جو کچھ کہ انہوں نے اس شعر میں اپنے معشوق کے بارے میں کہا اس کا اطلاق خود انکی ذات پر ہوتا ہے۔

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات — عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

اور ان کی یہ پرکاری اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ وہ معشوق فریبی سے بھی کام لیتے۔ عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام۔

یہی وہ باتیں ہیں جن سے ان کے اسلوب میں وہ ندرت پیدا ہوئی جو نہ صرف ہمارے حواس اور تخیل کو بلکہ ہمارے ذہن کو سامانِ حظ مہیا کرتی ہے۔ غالب کا یہ دعویٰ نہیں کہ اس کے علاوہ اور کوئی سخنور نہیں۔ یا یہ کہ ان سے بڑا کوئی شاعر نہیں۔ بلکہ یہ کہ ان کا اندازِ بیان دوسرے سے مختلف تراشا ہوا ہے۔ غالب کے تاریخی دور کی اہمیت کسی زمانے میں مدھم پڑ سکتی ہے۔ لیکن ان کے کلام کا جادو ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کیونکہ انہوں نے بہت سے اشعار میں کسی ایک لمحہ میں ابدیت کو بھی اسیر کر لیا ہے۔ انسانی فطرت کے پاتال کو چھو لیا ہے اور مستقبل پر کچھ ایسی نگاہ ڈالی ہے کہ وقتِ گزراں ایک دائمی ہنوز میں سمٹ آیا ہے۔ غالب اپنے کلام میں اس گہرائی اور گیرائی کو اس لئے پہنچے کہ ان کا نقطۂ نظر معروضی تھا۔ وہ نہ صرف اپنی ذات کو اپنا غیر تصور کرکے اس پر معروضی نگاہ ڈالتے ہیں جس سے ان کے کلام میں فلسفیانہ تعمیم پیدا ہوئی۔ بلکہ وہ اس پوری

کائنات کو کسی ایسی جگہ سے دیکھنے کی آرزو رکھتے ہیں جو کائنات کے اس سے پرے ہوتی وہ منظر بھلا انہیں کیونکر نصیب ہوتا کہ ہم کائنات سے باہر ہو ہی نہیں سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کثرتِ الم نے انہیں اپنا غیر یقیناً بنا دیا تھا۔ ہر چند کہ اس میں ایک آزار طلبی بھی ہے۔

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

غالب متعدد غموں میں مبتلا رہے۔ غمِ عشق کا تو ذکر بیکار ہے کہ اس سے انہوں نے زیست کا مزا پایا۔ ان کو تو تاریکیٔ زندگی کا بہت غم تھا۔ وہ بارِ شعور سے بھاگتے لیکن ذوالنفس ان کے لیے زنجیرِ پا بنے ہوئے تھے۔ اس پر اضافہ یہ کیا کہ سات اولادوں میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچی۔ اس غم کو دور کرنے کے لیے ان کی بیوی نے اپنے بھانجے زین العابدین عارف کو متبنیٰ کر لیا تھا لیکن افسوس اس کا بھی انتقال عین عالمِ جوانی میں ہوا۔ انہوں نے دو بچے چھوڑے۔ غالب ان ہی سے اپنا دل بہلاتے لیکن وہ دل کیا بہلے جو طرح طرح کے تیرِ حوادث کا ہدف بنا ہوا تھا۔ غالب نے جب برہانِ قاطع کی غلطیوں کو ایک رسالے کی صورت میں بعنوان قاطعِ برہان شائع کیا تو ان کے خلاف بہت سے لوگوں نے ان پر اعتراضات کیے بلکہ ایسے مضامین شائع کیے جن میں فحش کلمات سے کام لیا گیا اور یہ سلسلہ بہت دنوں تک قائم رہا۔ ان ساری باتوں سے غالب کا دل بہت زیادہ دکھا رہا اور یہی وجہ ہے کہ حزن و یاس اور غم و اندوہ حتیٰ کہ مرگ طلبی سے بھی ان کا کلام مملو ہے۔ لیکن ان سب چیزوں کے باوجود ان کی روح شکست خوردگی سے دوچار نہ ہوئی۔ وہ زندگی کا نشاط الم کے بالمقابل دیکھتے رہے اور ایک ایسا رویہ اختیار کیا جو زندگی کے نمود حسن اور رعنائی کا دلدادہ تھا۔ وہ بنیادی حیثیت سے حصولِ زندگی اور ولولۂ حیات کے شاعر ہیں۔ ہر چند کہ ان کا آبگینۂ دل حوادثِ روزگار سے چور چور رہا۔ ان کے اظہارِ غم میں ایک ایسی رعنائیِ خیال ہے کہ گزرگاہِ حیات ارم ارم نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو یہ غزل۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے — جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو — عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم — برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے
باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب — نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے
اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے
غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے — بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

وحید احمد مسعود (بدایوں)

خستہ حال غالب

جو حضرات مرزا غالب کے حالات و واقعات سے واقفیت رکھتے ہیں وہ دیانتدارانہ فلسفہ کے مطابق بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ مرزا کے بھاگ برے تھے اور بھوگ اچھے تھے۔ زندگی بھر قسمت سے لڑتے رہے۔ زندگی کی سنگین محرومی و حسرت کے باوجود ذلتیں ان کا کچھ بگاڑ نہ سکیں اور ان کی توقیر بڑھتی ہی رہی۔ پانچ سال کے تھے کہ داغ یتیمی سہنا پڑا۔ چچا نے سرپرستی کی تو وہ بھی چار برس بعد چل بسے۔ ظاہر ہے کہ ان کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام نہ ہو سکا۔ تیرہ برس کی عمر میں لوہارو کے خاندان میں شادی ہو گئی۔ اس شادی ہی کی وجہ سے آگرہ کو ترک کر کے دہلی کی سکونت اختیار کی۔ حضرت مجوب کا ارشاد ہے کہ صحبت کا اثر ہوا کرتا ہے۔ نواب شیفتہ اور مولانا فضل حق خیر آبادی کی صحبت سے انہیں مذاق سخن ملا اور وسیع معلومات حاصل ہوئیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ عیش سے گذرے گی مگر تنگدستی بلائے جان ہو گئی۔ ان کی ساس کو ریاست سے جو دس ہزار روپے لارڈ لیک کا ورثہ ملا تھا اس کی بجائے احمد بخش خاں نے صرف تین ہزار سالانہ قرار دیا۔ چنانچہ اس پنشن کے تصفیہ کے سلسلے میں لاٹ صاحب سے رجوع کرنے کے لئے کلکتہ کا سفر کیا کئی برس برابر مقدمات میں مصروف رہے۔ اس عرصہ میں نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہو گیا۔ ان کے جانشین نواب شمس الدین خاں ہوئے۔ انہوں نے مرزا کے خلاف لارڈ ولیم بینٹنگ کے کان بھر دیئے۔ لہٰذا کامیابی نہ ہونا تھی اور نہ ہوئی۔ مقصد سفر میں ناکامی سے سابقہ پڑا تو دہلی واپس آنا پڑا۔ قیام کلکتہ میں قتیل کے شاگردوں اور حباب نے ان کی شاعری اور فارسی دانی پر اعتراضات کئے بڑی بحثیں رہیں۔ کلکتہ کے سفر کے سلسلے میں بنارس اور لکھنؤ میں بھی کچھ قیام کیا تھا۔ امیدوں نے وہاں بھی منہ موڑ لیا۔ دہلی آکر فاقوں پر نوبت آگئی۔ مخلص احباب نے اگرچہ دستگیری کی مگر اس سے کیا ہوتا تھا۔ قمار بازی کا شوق ہوا تو عدالت نے مع جرمانے کے چند ماہ کی قید کی سزا دی۔ بڑی سعی و سفارش کے بعد احباب نے تین ماہ میں قید سے نجات دلوائی آخر کار حضرت کالے شاہ صاحب کی وساطت سے دربار شاہی میں رسائی ہوئی اور کچھ وظیفہ مقرر ہو گیا جب ولی عہد نے شاگردی اختیار کی تو مشاہرہ میں اضافہ ہوا۔ رہی ان کی شاعری تو اس کا خوب مضحکہ اڑایا گیا۔ ایک مصیبت ہو تو بیان کی جائے یہاں تو مصیبتوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ سات بچے پیدا ہوئے مگر زندہ ایک بھی نہ رہا۔ مگر واہ رے غالب ہر بلا کو خندہ پیشانی سے جھیلا۔ خود لکھا ہے کہ ع

مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

اسی عادت کی وجہ سے ان کے اخلاق وسیع ہوئے۔ ان کی طبیعت میں شوخی و ظرافت پیدا ہوئی اور ان کی اسی جامعیت نے انہیں بے بدل شاعر بنا دیا۔ مصائب کے جا بہ تسلیم کے احساسات کے بعد مختلف قسم کے نتائج نکالے مثلاً

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

اور

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

حتی کہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس مقام سے آگے بڑھ کر دو راہ ملتا ہے۔ ایک راستہ گمراہی کا ہے اور دوسرا راستہ تسلیم کا۔ غالب نے راہ تسلیم اختیار کی اور برملا اپنے احساس کا اظہار بھی کر دیا۔

قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

عالی ظرفی کا یہ بہترین ثبوت ہے۔ ان کے سوانح نگاروں اور شیدائیوں نے ان کے اسی وصف کی طرح طرح تشریح کی ہے۔ مگر ان کا مندرجہ بالا اشعار تمام وضاحتوں پر حاوی ہے اور یہی نفس الٰہی ہے۔

غالب کا شمار علماء و فضلاء میں نہیں کیا جا سکتا۔ والدہ ان کی قابل و لائق تھیں۔ خانگی طور پر انہوں نے ہی کچھ سدھ بدھ تعلیم دی تھی۔ پھر مولوی معظم سے قدرے تعلیم حاصل کی اور بقول قطب الدین باطن نظیر اکبرآبادی سے استفادہ کیا۔ ایرانی سیاح ہرمزد جس کا اسلامی نام ملا عبدالصمد تھا آگرہ پہنچا۔ مرزا صاحب نے اسے اپنے یہاں دو سال مہمان رکھا اور اس سے فارسی ادب و زبان کی تحصیل کی۔ اس کے بعد مشہور فارسی شاعروں کے دیوان خود مطالعہ کئے اور فارسی اشعار لکھے۔ گیارہ برس کی عمر میں اردو غزل سے شاعری شروع کی تھی۔ اب فارسی میں مشق سخن کرنے لگے۔ دہلی کے مشاعروں میں جب اپنی غزلیں سنائیں تو ان کا تماشا بنا لیا گیا۔ ہر طرف سے اعتراضوں اور پھبتیوں کی بوچھار پڑنے لگی کیونکہ ان کی زبان و شعر ادق تھی اور اشعار ناقابل فہم تھے۔ سب سے پہلے مولوی عبدالقادر رامپوری نے مضحکہ کے طور پر یہ شعر پڑھا

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہو کل بھینس کے انڈے سے نکال

اس کے بعد طنز و تشنیع کے طور پر عام فضا میں شہرت ہو گئی کہ

ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے۔

ان فقرہ بازیوں پر غالب کی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ چارہ ہی کیا تھا۔ ٹھنڈے دل سے سب مخالفتوں کو پی گئے۔ ایک رباعی میں حقیقت حال بیان کی کہ گویم مشکل وگر نگویم مشکل۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی جتا دیا کہ

طرز بیدل میں ریختہ کہنا۔ اسداللہ خان قیامت ہے

آخر کار زچ ہو کر صحیح مقام پر پہنچ گئے اور عرض کیا

یارب وہ نہ سمجھے ہیں۔ نہ سمجھیں گے مری بات

دے اور دل ان کو۔ جو نہ دے مجھ کو زبان اور

ان کی التجا مسموع ہوئی۔ جملہ قلوب میں انقلاب واقع ہو گیا اور انہیں بھی صاف و ستھری زبان عطا کر دی گئی۔ مشکل پسندی سے ترک انہوں نے سادگی اختیار کی تو ہر شعر سہل ممتنع بن گیا۔ ہر طرف سے واہ واہ ہونے لگی اور مضحکہ اڑانے والے تکتے کے تکتے رہ گئے۔

اب فلک ناہنجار نے اپنی ستم ظریفی سے نیا گل کھلایا۔ شہزادہ جواں بخت کا سہرا مرزا نے دل سے لکھا تھا۔ اور مقطع میں فخریہ لکھ دیا۔

دیکھیں اس سہرے سے لکھ دے کوئی بہتر سہرا

یہ تعلّی بادشاہ کو ناگوار ہوئی۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ سمجھے کہ ان کے استاد ذوق پر چوٹ کی ہے۔ اس کے علاوہ ظفر کو غالب سے پرخاش بھی تھی۔ کیونکہ ان کی ولی عہدی کے وقت غالب نے ان کے حریف شہزادہ فتح الملک کی ہمنوائی کی تھی۔ بہرحال شاہی اشارے سے ذوق نے سہرا لکھا اور مقطع میں جواب دیا کہ

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنا دے اس کو

دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اب مرزا صاحب کے لیئے ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ معذرت کریں۔ لہٰذا بادشاہ کی خدمت میں منظوم گذارش احوال پیش کی جو اس سہرے کی فصاحت و بلاغت سے بھی زیادہ بجائے خود لطافت و ظرافت رکھتی ہے۔

استاد شاہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال

یہ تاب۔ یہ مجال۔ یہ طاقت نہیں ہے مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ

سودا نہیں۔ جنوں نہیں۔ وحشت نہیں مجھے

اور آخر میں یقین دلایا ہے۔

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

روسیاہ والے شعر میں مرزا نے استاد ذوق کا رنگ سیاہ ہونے پر بڑی خوبی سے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ ذوق کے انتقال کے بعد بادشاہ خود مرزا سے اصلاح لینے لگے۔ یہ مقبولیت کی انتہا تھی۔ لیکن گردش روزگار نے پھر بہت دن دکھائے۔ اب مولانا فضل حق خیرآبادی نے ان کا والی رام پور نواب یوسف علی خان ناظم سے تعارف کرایا۔ کچھ اشک شوئی ہوئی مگر عیش کی گھڑیاں مختصر ہوتی ہیں۔ ناظم کے جانشین نواب کلب علی نے ان کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ آخر عمر میں بیماریوں نے آگھیرا بینائی اور سماعت میں فرق آگیا۔ مگر ان کے نصیب اچھے تھے کہ انتقال کے بعد انہیں درگاہ حضرت نظام الدین میں جگہ ملی۔ ان کا مزار جب شکستگی کی منزل میں پہنچا تو ابھی حال میں غالب سوسائٹی نے اس کی از سر نو تعمیر کرادی اور پرستاران غالب اب وہاں پھول چڑھایا کرتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں قبولیت دوام۔

بہادر شاہ ظفر کا عہد اپنی رنگا رنگی کے لحاظ سے یادگار ہے۔ اس میں خزاں و بہار کے نقشے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف انحطاط و ابتذال کی آندھیاں چل رہی ہیں۔ دوسری طرف اردو زبان کی مشاطگی کی جا رہی ہے۔ اور شاہ اسمٰعیل کا جہاد حضرت سید احمد رائے بریلوی کی قیادت میں جاری ہے۔ جہاد کے سیلاب میں کنارے پر شعرا خاموش بیٹھے دیکھتے رہے۔ کسی نے مدح کی اور کسی نے مذمت کی ٹھانی۔ مومن خان سید صاحب کے معتقد تھے۔ انہوں نے از راہ عقیدت مندی اور ارادت نظمیں لکھیں۔ شاہ عبدالعزیز کے دوست تھے انہوں نے اپنے قصیدے میں اپنے دل کا بخار نکالا جبکہ جہاد کی ناکامی کی خبر دلی میں آئی۔ لکھتے ہیں۔

کلام اللہ کی صورت ہوا دل ان کا سی پارہ
نہ یاد آئی حدیث ان کو نہ کوئی نص قرآنی
ہرن کی طرح میدان وغا میں جبکہ راہی ہو
اگرچہ تھے دم حملہ وہ شیر نیستانی

ان کے اس طرز تخاطب پر بعض لوگوں نے ان پر حملہ کیا۔ اگر مرزا خانی دلی کے کوتوال آڑے نہ آتے تو اسی وقت نہ معلوم کیا کیفیت ہوتی۔ انہوں نے خود اعتراف کیا ہے۔

نصیر الدین بچارہ تو رستہ طوس کا لیتا
نہ ہوتے شحنۂ دہلی اگر یاں میرزا خانی

شاہ اسمٰعیل نے جب تقویۃ الایمان کتاب لکھی تو امکان نظیر کی بحث چھیڑ دی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی نے مقابلہ کیا کہ سوائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی دوسرا خاتم النبین نہیں ہو سکتا۔ اس بحث میں مرزا نے بھی حصہ لیا اور اپنے عقیدے کا بڑی آب و تاب سے اظہار کیا۔ ملا عبدالصمد ایرانی کے اثرات کی وجہ سے اپنے خاندان کے خلاف مرزا شیعیت کی طرف مائل تھے

مذہبی مسائل طریقت کے اصول اور وحدت الوجود کے دقائق مولانا فضل حق خیرآبادی سے حاصل کیے تھے جن سے ان کا دیوان بھرا ہوا ہے۔ بہرحال مرزا غالب نے بھی امکان نظیر کی مخالفت جدت آمیز فارسی مثنوی کے ذریعہ کی۔ اور حقیقت یہی ہے کہ عجیب و غریب نکتہ بیان کرکے نہایت صائب فیصلہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

یک جہاں تا ہست یک عالم بس است　　قدرت حق را نہ یک عالم بس است
خواہد ہر ذرہ آرد عالمے　　ہم بود ہر عالمے را خاتمے
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود　　رحمۃ اللعالمینے ہم بود
کثرت ابداع عالم خوب تر ؟　　یا بہ یک عالم دو خاتم خوب تر ؟
در یکے عالم دو خاتم را مجو　　صد ہزاراں عالم و خاتم بگو
غالب ایں اندیشہ نپذیرم ہمی　　خردہ ہم برخویش می گیرم ہمی
ای کہ ختم المرسلینش خواندہ　　دانم از روئے یقینش خواندہ
ایں الف لامے کہ استغراق راست　　حکم ناطق معنیٔ اطلاق راست
منشاء ایجاد ہر عالم یکے است　　گر دو صد عالم بود خاتم یکے است
منفرد اندر کمال ذاتی است　　لاجرم مثلش محال ذاتی است

زیں عقیدت برنگردم والسلام　　اجزاک اللہ
نامہ را دری نوردم والسلام

مرزا کے ان تمام کمالات کے ساتھ ان کی وسیع الاخلاقی حق شناسی اور رواداری کا بھی اعتراف کرنا ضروری ہے۔ ذوق کے اس شعر پر

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

سر دھنتے تھے اور وجد کرتے تھے۔ مومن کے اس شعر پر

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

صاف کہہ دیا کہ یہ شعر مجھے دے دیں اور میرا کل دیوان لے لیں۔

زندہ دلی ان کی زندگی کا جزو اعظم تھی۔ اٹھتے بیٹھتے ان کی کوئی بات ظرافت سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے مولانا حالی نے ان کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کا خطاب دیا تھا۔ امثال امر کیلئے عرض کیا جاتا ہے:-

ان کے خسر نواب الٰہی بخش خاں نے اپنا شجرہ نقل کرنے کو دیا۔ تعمیل اس طرح کی کہ درمیان کی ایک ایک کڑی حذف کر دی۔ اور

فرمایا ایک ایک سیڑھی پھلانگ کر بام تک جلد رسائی ہوگی اور سلسلہ میں حرج واقع نہ ہوگا۔ اس حرکت سے مدعا یہ تھا کہ آئندہ بیگار نہ کرنی پڑے

ایک مرتبہ دروازے میں جوتیاں اتار کر صحن کو طے کر کے بیگم صاحبہ کے کمرہ میں پہنچے۔ ننگے پیر آنے کی وجہ دریافت کی گئی تو نہایت متانت سے بتایا کہ آپ نے اپنا ہمہ وقت کی عبادت سے گھر کو مسجد بنا دیا ہے لہٰذا جوتیوں سمیت یہاں آنا بے ادبی میں شمار ہوتا۔ اس طرح بیگم صاحبہ کے شوق عبادت کو خفت اٹھانا پڑی۔

کسی شخص نے "برہانِ قاطع" کی مخالفت پر مرزا صاحب کو خط میں ماں بہن کی گالیاں لکھ کر بھیج دیں۔ خط دیکھ کر مسکرائے کہ اس بیوقوف کو گالی دینے کا بھی تمیز نہیں۔ بڈھے کو بجائے ماں بہن کے بیٹی کی گالی دی جایا کرتی ہے۔

بادشاہ کے ساتھ شاہی باغ میں پہنچے۔ درخت کے آموں کو ہاتھ میں لے کر معائنہ کرنا شروع کر دیا۔ وجہ پوچھی تو عرض کیا کہ جس کی قسمت میں جو شے ہوتی ہے اس کا نام اس پر لکھا ہوا ہوتا ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرا نام بھی کسی آم پر لکھا ہے یا نہیں۔ بادشاہ اس حسن طلب پر محظوظ ہوئے اور بہنگیاں بھروا کے انہیں آم بھجوا دیئے۔

غالب کی غزلیں، نظمیں اور بیشتر ضرب المثل کا درجہ حاصل کر گئے ہیں۔ مگر ان کی نثر بھی اپنی البیلی چال سے دامنِ دل کو کھینچتی ہے کہ جا اینجاست۔ ان کی نثر بلاشرکت غیرے خاص ان ہی کی ایجاد ہے۔ ان کے مراسلوں میں مکالمے کا لطف آجاتا ہے۔ نثر کے اتباع کرنے والوں کو امکا ظرف حاصل نہ ہو سکا۔ جب کوئی نثر میں ان کی نقل کرنا چاہتا ہے تو تارے نظر آجاتے ہیں۔ بہرحال مرزا غالب، حق مغفرت نصیب کرے، عجب آزاد مرد تھا۔ وہ تقلید کے قائل نہیں معلوم ہوتے۔ لہٰذا ان کی تقلید بھی مشکل ہے۔

فطرت اپنے آپ کو یا اپنے کارناموں کو دہراتی رہتی ہے۔ غالب پر گذشتہ عہد میں جو گذری تھی وہ پچاس ساٹھ برس بعد اس دور میں بھی گذری۔ نئی تعلیم و تہذیب نے جب مسلمانوں کو یہاں پر حکومت کا شوق دلایا تو ڈاکٹر عبد اللطیف نے اپنی قابلیت سے مرزا غالب کو مہمل ثابت کیا۔ جواب میں ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری نے اعلان کیا کہ دیوان غالب وید کی طرح ہندوستان کی الہامی کتاب ہے۔ اس کے بعد سر راس مسعود نے غالب کے کلام کی اشاعت کی راہیں نکالیں۔ پھر ڈاکٹر سید محمود (پٹنہ) نے ان کے کلام سے انھیں سیاسی رہنما ثابت کر دکھایا۔ اسی زمانے ۱۹۲۲ء میں رسالہ الناظر لکھنؤ میں انعامی مضمون کا اعلان ہوا کہ بہترین اردو غزل گو کون تھا۔ یہ انعام جناب قاضی غلام امیر صاحب بدایونی کو ملا۔ انھوں نے ذوق کو سراہا تھا اور معاصرین پر ترجیح دی تھی۔ قاضی صاحب سنجیدگی کے ساتھ نازک مزاج بھی تھے۔ بچپن کے ساتھی اور ہم عمر ہونے کی وجہ سے وہ صرف میر محفوظ علی صاحب مرحوم سے مذاق کیا کرتے تھے۔ قاضی صاحب نے اپنے مضمون میں غالب کے چند اشعار ایسے لکھے تھے جن سے اوباشی اور بے غیرتی ثابت ہوتی تھی۔ ان میں سے ایک شعر یہ تھا

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ان گرانقدر ادیبوں اور اہل قلم حضرات کے ذکر کے ساتھ اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے۔ مگر مجھے لکھنا پڑتا ہے کہ اسی زمانے کے اخبار ذوالقرنین بدایوں کی کسی اشاعت میں بڑی جرأت کر کے میں نے بھی غالب کے متعلق ایک مضمون شائع کرایا تھا۔ ڈاکٹر سید

محمود کی دیکھا دیکھی بجائے سیاست داں نے میں نے غالب کو صوفی ثابت کیا تھا اور یہ ثابت کرنا ان کے کلام سے نہایت آسان تھا۔ اس مضمون میں نہایت ادب سے جرأت کر کے قاضی غلام امیر صاحب کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ مندرجہ بالا شعر مجازی طور پر واقعی صوفیانہ ہے لیکن یہ شعر معرفت کا ہے۔ اس میں خطاب باری تعالیٰ سے کیا گیا ہے۔ اس لیے بہترین ہونے کا مستحق ہے۔ خلاف امید ایک صبح کو میرے غریب خانہ پر قاضی صاحب تشریف لائے۔ میں ڈر گیا کہ سرزنش کریں گے۔ مگر انھوں نے اس شعر کے متعلق میری تشریح کی داد دی اور ارشاد کیا کہ دیوان فارسی سے غالب کی لغویات جمع کر رہا تھا اب توبہ کرتا ہوں اور غالب کا معترف ہوں۔ بہرحال غالب کو نئے سرے سے مقبولیت حاصل ہے۔ ان کا کلام بچے بچے کی زبان پر ہے۔ اب ان کے متعلق جلسے کیے جا رہے ہیں اور "غالب ڈے" منائے جا رہے ہیں ان کے کلام میں رنگینی و تنوع ہے اور ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ غالب نے نہایت وثوق کے ساتھ پیشن گوئی کی تھی وہ ٹھیک ثابت ہو رہی ہے کہ

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن
این مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

لیکن یہ سمجھ کر کہ زمانے کی بد مذاقی ایسی رہی تو یہ بھی لکھ دیا ہے۔

من چہ می‌گویم، اگر این است وضع روزگار
دفتر اشعار باب سوختن خواہد شدن

موجودہ فدائی اور قدردان یقین رکھتے ہیں کہ پیشن گوئی صحیح نکلی اور انہیں مقبولیت عام حاصل ہے۔ مگر اس میں مغالطہ ہے یہ قبولیت محض اردو کلام تک محدود ہے۔ پیشن گوئی کا صحیح ہونا ابھی باقی ہے کیونکہ انھوں نے بے رنگ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ

فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

غالب کی صحیح قدر اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ ان کا فارسی کلام دیکھا جائے اس کی شرح لکھی جائے اور اس کی اشاعت کی جائے ان کے قصائد خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

پروفیسر حبیب اللہ خاں غضنفر
سابق صدر شعبہ اُردو کالج کراچی

غالب میری نظر میں

ایسا بھی کوئی ہوگا کہ غالب کو نہ جانے شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

مرزا غالب کی شاعری پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس میں اضافے کی گنجائش نہیں ہے "پہ بدنام بہت ہے" پر یہ مسلسل بحث نہیں ہوئی ہے۔ صرف اشارات پر اکتفا کیا گیا ہے اور ساتھ ہی مدافعت کی بھی کوشش کی گئی ہے بلکہ معاصرین کو الزام تک دیا گیا ہے۔ ہم نے اسی پہلو پر لکھنے کی جسارت کی ہے۔ آخر یہ بھی تو زندگی کا ایک رخ ہے۔

نومبر ۱۹۲۶ء کا ذکر ہے کہ میں علی گڑھ سے اپنے دوستوں کے ہمراہ دہلی گیا تا کہ ہم وہاں کی تاریخی عمارات کو دیکھیں اور حضرت دہلی کی سیر کریں کہ جو مسلمانوں کی ہفت صد سالہ عظمت کا نشان ہے۔ قیام ایک ہوٹل میں کیا۔ ہوٹل کا مالک نہایت وجیہہ اور شریف آدمی تھا۔ خوش وضع، خوش لباس، ہنس مکھ چہرہ، عمر ستر سے متجاوز مگر صحت بہت اچھی تھی۔ آدمی تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا بلکہ کسی قدر علمی ذوق کا مالک۔ افسوس کہ اس سے پورا تعارف حاصل نہ کیا اور کچھ ایسا کرید کر نہ پوچھا۔ غالب کے دیکھنے والوں میں تو وہ نہ تھا۔

اس نے مجھے نوجوان طالب علم سمجھتے ہوئے اپنے کمرے میں بلایا اور پوچھا کہ کیا یہ پہلا سفر ہے یا اس سے پہلے بھی دہلی دیکھنے کا اتفاق ہو چکا ہے۔ میں نے کہا پہلی مرتبہ تاریخی مقامات دیکھنے کی غرض سے آیا ہوں۔ یہ سن کر اس نے مجھے ایک خاص انداز میں نصیحت کی اور محتاط رہنے کا مشورہ دیا کیونکہ جہاں دلی کے بہت سے گماشتے "نو واردانِ شہر" کو اپنے دامِ فریب میں گرفتار کر کے نہ صرف "امراض مزمنہ" کا تحفہ بخشتے ہیں بلکہ ان کو رسوا بھی کرتے ہیں اور یہی نہیں کہ اس کا شکار صرف "نو وارد" ہی ہوتے ہیں بلکہ خود اہل دہلی بھی گرفتار بلا ہو جاتے ہیں ـــ پھر خود ہی وہ گویا ہوا کہ ایک مرتبہ مرزا غالب کو بھی یہ حادثہ پیش آیا تھا۔ اس کے بعد تو میری دلچسپی بہت بڑھی اور میں نے بے اختیار پوچھ ہی لیا کہ وہ کیسے؟ بولا۔ اس کی روداد یہ ہے کہ مرزا غالب کے یہاں کچھ نودولتیے اور جوہری بچے جمع ہو کر دل بہلاتے تھے یا بالفاظ دیگر قمار بازی کا شغل کرتے تھے۔ مرزا کا اس میں حصہ مقرر تھا۔ اتفاق سے ان میں دو جوان ایسے تھے کہ جو معززانہ

کچھ نہ کچھ رقم ہار ہی جاتے تھے۔ انہوں نے مرزا سے انتقام لینے کا منصوبہ بنایا۔ ایک دن" اختتام بزم" پران دونوں نے انداز خاص سے ایک" حویلی" کی نشاندہی کی اور چل دیئے۔ مرزا نے ان" رموز و کنایات" کی عملی تعبیر چاہی اور" بہ تبدیلی حلیہ و لباس" اس انداز سے چلے۔ مرزا فرماتے ہیں:۔

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

مجوزہ منصوبہ کے تحت اس حویلی میں مرزا صاحب کے استقبال کی تیاریاں تھیں، مالکہ نے خط لکھوانے کے بہانے مرزا صاحب کو قدم رنجہ فرمانے کی زحمت دی اور شہ نشین میں بٹھا کر ایک دردناک خط اپنے شوہر کو لکھوایا جس میں اپنے مصائب کی داستان اس طرح بیان کی تھی کہ مرزا صاحب کا جذبۂ ہمدردی بیدار ہو گیا۔ اس اثنا میں چند زہرہ جبیں ماہ وشیں پری پیکر چہلیں کرتی ہوئی ادھر سے ادھر گزر گئیں۔ اس" محو گلستاں نگاہ کے سامان" نے مرزا کے ہوش و حواس کی دنیا زیر و زبر کر دی اور ڈرامہ کا سین مکمل ہو گیا۔

اس دوران میں" دو قوی ہیکل اور توانا نوجوان" ایک دالان سے برآمد ہوئے اور انہوں نے مرزا صاحب کی شان میں گستاخی کی" ضرب یضرب" کی گردان کے بعد" تحفہ برہنگی" مرحمت فرمایا جس کا مرزا کو خود اعتراف ہے۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

اس سرگزشت کو سننے کے بعد حضرت غالب کی عظمت کا جو پیکر میرے ذہن میں تھا وہ" شکست و ریخت" کی زد میں آ گیا مگر اول میں نے خیال کیا کہ شاید یہ" ہوٹل والے" کی داستان سرائی ہو مگر جب کلام غالب کا مطالعہ کیا اور بعض خارجی شواہد بھی نظر سے گزرے تو میں اس کی صداقت کی طرف مائل ہوا۔

مرزا غالب کے دیوان میں ان کے ایک محبوب کا مرثیہ بھی موجود ہے۔

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

اپنی حسن پرستی کا اظہار اس قطعہ میں بھی کیا ہے جو کلکتہ کے بارے میں کہا ہے۔

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب وہ نازنین بتان خود آرا کہ ہائے ہائے

اس سے بڑھ کر یہ کہ حاتم علی کو تعزیتی خط میں لکھتے ہیں؎

" مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں مغفرت کرے "

؎ خطوط غالب حصہ اول، مرتبہ مولانا غلام رسول مہر، لاہور ص ۲۴۷

دوسری جگہ یہ بھی لکھا ہے۔

"یعنی صرف بوالہوس رہو۔ عشق نہ کرد۔"

بہرحال رنگ رلیاں کہ کیتک منائیں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ مرزا کے معاصر حکیم مومن خاں کی توبہ کا قصہ تاریخ میں مذکور ہے مگر مرزا صاحب کا نہیں۔ مرزا صاحب خود فرماتے ہیں۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ　　　شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اس سلسلے میں مرزا غالب کے ہم عصر شمس العلمار مولوی ذکاء اللہ دہلوی کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے۔[1]

"مرزا غالب، کا حال یہ ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے کوئی خوبی اس میں نہ تھی۔ حسد اس قدر تھا کہ کسی کی عزت کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ سنگ دل ایسا تھا کہ سارے بھائی بندوں کی حق تلفی کرنے میں اس کو افسوس نہ تھا جس دن ذوق مر گیا تو خوش ہو ہو کر کہتا تھا کہ آج بھٹیاروں کی بولی بولنے والا مر گیا۔ رند مشرب ایسا تھا کہ کہا کرتا تھا کہ صہبائی شعر کہنا کیا جانے۔ نہ اس نے شراب پی نہ اس نے قمار بازی کی نہ معشوقوں کے ہاتھ سے جوتیاں کھائیں نہ جیل خانے میں پڑا۔ طامع ایسا تھا کہ ایک ایک قصیدہ دس دس جگہ بھیجتا تھا۔ اس لئے قصائد میں یہ نہیں لکھا کہ کس کی تعریف میں ہے بلکہ ان پر نمبر لگائے ہیں"

مرزا صاحب کی قید اور قمار بازی کا معاملہ بھی سنئے۔ جوا کھیلنا خود کوئی جرم نہ تھا۔ بلکہ "کمیشن" لینا جرم تھا اور مرزا صاحب اس جرم کے مرتکب ہوئے تھے۔ اگر صرف برائے نام بازی بد کر شطرنج کھیلنے کا مسئلہ ہوتا تو ان کے حریف کو بھی سزا ہوتی مگر ظاہر ہے کہ کوئی دوسرا شخص نہ ماخوذ نہ گرفتار نہ قید۔ دراصل مرزا صاحب کی آمدنی کا یہ ایک ذریعہ تھا اور اس ذریعے سے کس قدر آمدنی ہوتی تھی اس کا کوئی اندازہ نہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد خواجہ الطاف حسین حالی پر اظہار رائے کرتے ہوئے فرماتے ہیں[2]

"خواجہ صاحب نے اس معاملے کو اس رنگ میں ظاہر کیا ہے کہ کوئی بات نہ تھی۔ محض شطرنج اور چوسر کا شوق تھا اس شوق کی تکمیل کے لئے برائے نام کچھ بازی بھی بد لیا کرتے

---

[1] ملاحظہ ہو مکتوب مولوی ذکاء اللہ خاں۔ آزاد کی حمایت، از ڈاکٹر محمد صادق صحیفہ لاہور نمبر ۳۔ بحوالہ محمد حسین آزاد حصہ دوم از ڈاکٹر اسلم فرخی کراچی ۱۹۶۵ء ص ۳۰۳

[2] نقش آزاد مرتبہ مولانا غلام رسول مہر لاہور ۱۹۵۹ء ص ۲۸۰

تھے کوتوال چونکہ دشمن تھا اس لئے قمار بازی کا مقدمہ بنا دیا حالانکہ اصلیت بالکل اس کے
خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ پورا قمار بازی کا معاملہ تھا اور نواب امیر الدین مرحوم کے لفظوں
میں مرزا صاحب نے اپنے مکان کو جوا بازی کا اڈا بنا رکھا تھا۔"

اس سلسلے میں جو تفصیلات سر امیر الدین مرحوم نواب لوہارو نے مولانا ابوالکلام آزاد کو بتائیں وہ ملاحظہ فرمائیے ۱؎

"غدر سے پہلے مرزا کی آمدنی کا وسیلہ صرف سرکاری وظیفہ اور قلعے کے پچاس روپے تھے چونکہ
زندگی رئیسانہ بسر کرنی چاہتے تھے اس لئے ہمیشہ مقروض و پریشاں حال رہتے تھے۔ اس
زمانے میں دہلی کے بے فکر رئیس زادوں اور چاندنی چوک کے بعض جوہری بچوں نے
گزران وقت کے جو مشغلے اختیار کر رکھے تھے ان میں ایک قمار بازی کا شغل بھی تھا۔
گنجفہ عام طور پر کھیلا جاتا تھا اور شہر کے کئی دیوان خانوں کی مجلسیں اس بات میں
شہرت رکھتی تھیں۔ مرزا صاحب بھی اس کے شائق تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے یہاں چاندنی چوک
کے جوہری بچے آنے لگے اور باقاعدہ "جوا بازی" شروع ہو گئی۔ قمار کا عام قاعدہ ہے
کہ صاحب مجلس (یا یوں کہا جائے کہ مہتمم قمار خانہ) کا ایک خاص حصہ بازی میں ہوا کرتا ہے
جو بھی جیتے فیصدی اتنا صاحب مجلس کا ہوگا۔ مرزا صاحب کے دیوان خانے میں مجلسیں
جمنے لگیں تو وہ صاحب مجلس ہو گئے اور ایک اچھی خاصی رقم بے محنت و مشقت
وصول ہونے لگی۔ وہ خود بھی کھیلتے تھے اور چونکہ اچھے کھلاڑی تھے اس لئے اس میں بھی
کچھ نہ کچھ مار ہی لیتے تھے۔"

بہادر شاہ ظفر نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں شیخ محمد ابراہیم ذوق کی شاگردی اختیار کر لی تھی مگر اتفاق ایسا ہوا کہ اکبر شاہ ثانی ایک موقع پر بہادر شاہ سے ناراض ہو گئے اور انہوں نے چاہا کہ شہزادہ سلیم کو جہانگیر کا خطاب دیکر اپنا ولی عہد مقرر کریں۔ یہ ۱۲۵۰ھ کا واقعہ ہے۔ مرزا صاحب کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر شہزادہ سلیم ولی عہد ہو جائے اور مرزا کو اس کی مداحی کا فخر حاصل ہو تو وہ ملک الشعرا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک زوردار قصیدہ اکبر شاہ ثانی اور شہزادہ سلیم کی مدح میں لکھ دیا۔ ۲؎

دریں زمانہ کہ کلک زصد نگار حکیم ہزار و دو صد و پنجاہ راند در تقویم

۱؎ نقش آزاد مرتبہ مولانا غلام رسول مہر (لاہور ۱۹۵۹ء) ص ۲۸۰

۲؎ کلیات غالب (نظم) مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۲۵ء ص ۲۰۰ - ۲۰۳ (قصیدہ سیزدہم)

ستائش شہ و شہزادہ می کنم آہنگ بساز حسن ادب در مقامِ ذوقِ سلیم
ز شاہزادہ نخست آورم سخن کہ بباغ شگوفہ را بہ ثمر بود در نمو تقدیم

زہے مناسبت طبع شاہزادہ سلیم بفیضِ تربیت پادشاہِ ہفت اقلیم
نہ مہر و ماہ ولیکن چو مہر و ماہ منیر نہ ابر و بحر ولیکن چو ابر و بحر کریم
ہمش بہارگہ ناز زہرہ خنیاگر ہمش در انجمن راز تیر چرخ ندیم
ستودہ ست بہ نازش بپادشاہ انیس ستارہ ست بتابش بآفتاب سہیم

عطیہ بخشی دہر و عطا پذیری ماہ بقائے پادشہ و عیشِ شاہزادہ سلیم

بہادر شاہ کو اس کا علم ہوا اور مرزا کی طرف ان کی کوئی توجہ نہ ہوئی مگر جب حکیم احسن اللہ خاں کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے صفائی کی کوشش کی اور تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیا۔ چھ سال میں مہر نیم روز کا جو کام انہوں نے انجام دیا ہے وہ کوئی خاص اہمیت کا حامل نہیں۔ اتنی بڑی کتاب ایک دو مہینے میں لکھی جا سکتی ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں انگریزوں کے وفادار معتمد تھے اور مرزا غالب بھی فکری طور پر ان سے ہم آہنگ تھے۔ مرزا غالب نے اپنے مربی حکیم احسن اللہ خاں کے مفید مطلب کس قدر خدمات انجام دیں یہ بات تحقیق طلب ہے۔ یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ جب سرسید احمد خاں نے آئین اکبری شائع کی اور مرزا صاحب سے تقریظ کی فرمائش کی تو انہوں نے تقریظ تو لکھ دی مگر انگریزوں کی اس قدر تعریف کی کہ سرسید احمد خاں جیسے انگریز دوست بھی اس حقیقت پسندی کو برداشت نہ کر سکا اور انہوں نے وہ تقریظ اپنی کتاب میں شامل نہیں کی۔

مرزا غالب کی انگریز وفاداری کا اندازہ اس قصیدے سے کیجیے جو انہوں نے پنجاب کے لفٹنٹ گورنر میکلوڈ کی تعریف میں لکھا ہے۔ اس کا آخری شعر پڑھیے اور غالب کی دعا پر ماتم کیجیے [1]

ہے یہ دعا کہ زیر نگیں آپ کے رہے اقلیم ہند و سندھ سے تا ملکِ روم و شام

مرزا غالب برصغیر کے لوگوں کی فارسی کو درجہ استناد نہیں دیتے تھے مگر یہ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ عرفی شیراز سے آتا ہے۔ مستند ہے۔ جمال الدین حسین انجو ایران سے آتا ہے وہ غیر مستند۔ ظہوری ایران سے آکر دکن میں اقامت اختیار کرتا ہے مستند، محمد حسین تبریزی سے آکر دکن میں آباد ہوتا ہے غیر مستند۔ صاحب قاموس فیروزآبادی نے سیکڑوں جگہ دوسرے لغت نویس جوہری کے متعلق وہم جوہری لکھا ہے اس کے خلاف کسی نے کچھ نہیں کہا کیونکہ انہوں نے جوہری کے خلاف بدزبانی سے کام نہیں لیا تھا مگر مرزا صاحب نے جگہ

---

[1] دیوان غالب آئینہ ادب لاہور ۱۹۶۹ء ص ۱۴۲-۱۴۳

سب وشتم سے کام لیا ہے۔ یہ بات اہلِ علم کے شایانِ شان نہیں ہے۔

اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور نے ایک عبارت بغرض اصلاح مرزا صاحب کی خدمت میں ارسال کی۔ مرزا صاحب کی اصلاح شدہ عبارت جب رامپور پہنچی تو اس میں بعض اصلاحوں کے متعلق استصواب کیا گیا۔ بس پھر کیا تھا لگے مرزا صاحب ہندی فارسی نویسوں کو سب وشتم کرنے۔ مرزا صاحب یوں تو محمد حسین دکنی، قتیل، واقف، کے ساتھ ہر جگہ غیاث الدین رامپوری کو ضرور گھسیٹتے تھے مگر یہاں نام نظرانداز کر گئے مگر اپنے استاد کی بالواسطہ توہین کو نواب صاحب سمجھ گئے اور نواب کلب علی خاں مرحوم نے پھر مرزا صاحب کو زحمت نہ دی مگر اپنی فیاضی سے وہ رقم جو فردوس مکانی مقرر کر گئے تھے تاحیات بھیجتے رہے۔[۵۱]

مرزا غالب زمانہ سازی کے فن سے خوب واقف تھے۔ انہوں نے ایک موقع پر نواب کلب علی خاں کو مشورہ دیا کہ ملکہ وکٹوریہ سے مخلص الدولہ شمس الملک بہرام جنگ کا خطاب مانگیں[۵۲] کبھی طبیعت کی ناسازی کے موقع پر گنے نسخہ تجویز کرنے[۵۳] ظاہر ہے کہ یہ باتیں اور مشورے نواب کلب علی خاں کو کس طرح پسند آسکتے تھے۔ ان باتوں سے مرزا صاحب ان کی نظر میں سبک ہی ہوتے ہوں گے۔

مرزا کی زندگی کا سب سے اہم قضیہ پنشن کا ہے۔ مرزا صاحب کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ مرزا کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے بعد وہ جاگیر حکومت نے واپس لے لی جو ان کو حینِ حیات عطا کی گئی تھی اور سواروں کا دستہ بھی توڑ دیا۔ نواب احمد بخش خاں جو بارسوخ تھے ان کو فیروزپور جھرکا کی جاگیر عطا ہوئی تھی۔ اس جاگیر کا نذرانہ ان کو پچیس ہزار روپیہ سالانہ دینا پڑتا تھا۔ انہوں نے اپنے رسوخ سے کام لیکر یہ رقم معاف کرالی اور اس کے عوض پچاس سواروں کا دستہ رکھنے کی اجازت ہوئی اور اس میں سے کچھ رقم وارثانِ نصر اللہ بیگ خاں کے لئے طے ہوئی۔ مرزا غالب اس رقم کو دس ہزار لکھتے ہیں مگر پہلے پروانے کے اجرا کے کچھ ہی دن بعد دوسرے پروانے میں یہ رقم پانچ ہزار کر دی گئی۔ مرزا صاحب اس پروانے کو جعلی قرار دیتے ہیں

اس سلسلے میں دوسرا مرحلہ یہ تھا اس رقم میں سے دو ہزار کی رقم خواجہ حاجی کو دی جاتی تھی۔ مرزا غالب ان کو خانہ زاد کہتے ہیں۔ اور ان کو اپنا قرابت دار تسلیم نہیں کرتے۔ سوال یہ ہے کہ نواب احمد بخش کو ان سے اتنی ہمدردی کیوں تھی۔ نصر اللہ بیگ خاں نے ان کو سواروں کے ایک دستے کا افسر مقرر کیا تھا۔ حکام بالا نے اس کو نصر اللہ بیگ خاں کا وارث قرار دیا۔ اس صورت میں مرزا صاحب کے بیان کو صحیح ماننے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ مرزا صاحب کا تو یہ بھی دعویٰ تھا کہ نواب احمد بخش نے ایک سوار بھی ملازم نہیں رکھا اور حکومت کو دھوکا دیتے رہے مگر تعجب ہے کہ اس زمانے کے اسباب اقتدار جن کے ہاتھوں میں عنانِ حکومت تھی مرزا صاحب کے اس الزام کو درخورِ اعتنا

---

[۵۱] مکاتیب غالب (مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی) رامپور ۱۹۴۹ء ص ۶۰-۶۲

[۵۲] " " " " " " " " " ص ۳۸

[۵۳] " " " " " " " " " ۴۵-۴۶

نہیں سمجھتے۔ حکومت نے اپنے طور سے تحقیقات کرائی ہوگی مگر اس الزام کا ثبوت نہ ملا ہوگا۔ البتہ مرزا صاحب کی ناسپاس گزاری ظاہر ہے کہ اپنے محسن کے خلاف الزام تراشیاں کیں۔

اس احسان فراموشی اور ناسپاس گزاری کی انتہا اس وقت ہوئی جب نواب شمس الدین خاں اپنے باپ کے جانشین ہوئے اور کرنل فیریزر اپنی بے راہ روی کی وجہ سے قتل ہوا۔ اس زمانے میں عام خیال یہ تھا کہ اس قتل کی نشاندہی مرزا غالب نے کی اور نواب شمس الدین خاں کو پھانسی ہوگئی۔ مرزا غالب پر اس الزام کو صحیح سمجھنے کے کئی وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ پنشن کے معاملے میں ذاتی طور سے رنجش تھی۔ دوسرے یہ کہ مرزا صاحب کی دوستی نواب شمس الدین خاں کے سوتیلے بھائیوں سے تھی اور ان میں آپس میں ناچاقی تھی۔ تیسرے اس زمانے میں مجسٹریٹ کے ہاں مرزا صاحب کی آمد و رفت معمول سے کچھ زیادہ ہوگئی تھی۔ بہر حال ان پر کہاں تک ذمہ داری ہے اس کا صحیح علم خدا کو ہے[1]

مرزا صاحب حضرت حسین خدا کی شان میں گستاخی کرنے میں بھی نہایت بے باک تھے۔ ان کا یہ فقرہ[2]

"مشرک وہ ہیں جو نومسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں"

سوا داعظم کو مشرک قرار دیتا ہے حالانکہ قرآن شریف میں بے شمار آیات ہیں جن میں سابقون الاولون کی، راہ خدا میں ہجرت کرنے اور جہاد کرنے والوں کی بے انتہا تعریف کی گئی ہے شیخین رض کی مذمت نومسلم کہہ کر کی جا رہی ہے۔ ایک نامور فاضل کو جب میں نے اس فقرے کی نشاندہی کی تو وہ کہنے لگے کہ ہم تو ان کو ہمسر نہیں افضل مانتے ہیں۔ میں نے کہا کہ بقول غالب ہمسر ماننا جب شرک ہے۔ افضل ماننا تو اس سے بھی بڑا شرک ہوگا۔

بہر حال حیات غالب کی طرف یہ اشارے کئے گئے ہیں۔ انسان کی زندگی کے دو رخ ہوتے ہیں۔ غالب کی زندگی کا ایک رخ یہ بھی ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو کلیات نثر غالب۔ مکتوب بنام ناسخ ص ۱۶۱-۱۶۲ (مطبوعہ مطبع نولکشور لاہور)

[2] خطوط غالب جلد اول (مرتبہ مولانا غلام رسول مہر) (مطبوعہ لاہور) خط بنام علاء الدین علائی ص ۵۰

مولوی احترام الدین احمد شاغل عثمانی (جے پور)

کیا غالب ولی تھا؟

اگرچہ کسی شاعر کی نسبت اُس کے کلام کی بنا پر یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا ذہن و مذہب کیا ہے۔ اور اس کے معتقدات مذہبی کیا ہیں۔ اور نہ کسی ایک نظریہ کا اس کے تخیل کو پابند سمجھا جا سکتا ہے۔ ایسی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ ایک ہی شاعر بالکل متضاد نظریئے پیش کرتا ہے۔ مثلاً امیر مینائی ایک ہی غزل میں کہتے ہیں۔

پوچھا نہ جائے گا جو وطن سے نکل گیا بیکار ہے جو دانت دہن سے نکل گیا
خنجر کھینچا جو میاں سے چمکا میانِ صف جوہر کھلے جو مرد وطن سے نکل گیا

البتہ شاعر کی زندگی جس ماحول میں گذرتی ہے، اور جن لوگوں سے اُس کے جس قسم کے تعلقات ہوتے ہیں اور جن مشاغل سے اس کو دلچسپی ہوتی ہے اور جن امور کا ثبوت اس کے کردار سے ملتا ہے اور جس بات کو وہ بار بار نئے نئے انداز سے دُہراتا رہتا ہے اس سے ایک معمولی سا غیر مُتَیقّن اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ اس کے قول و فعل میں کہاں تک مطابقت ہے۔ اور اس کے نظریہ میں کس حد تک صداقت و اصلیت۔

غالب ایک رند مشرب شاعر، آزاد خیال انسان۔ مذہبی قیود سے دور۔ اور دینداری سے سخت نفور رکھتے وہ بلاشک حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اعلیٰ درجے کے معتقد اور بدرجہ غایت محب تھے۔ حتیٰ کہ اپنی نسبت لفظِ نصیری سن کر ان کو مسرت ہوتی تھی۔ مگر نہ شیعہ غالی تھے نہ مذہبی۔ نہ امر و نواہی کے پابند۔ مرے تو شیعوں نے اپنے طریق پر نماز جنازہ پڑھی اور سنیوں نے جداگانہ اپنے طور پر۔ سب جانتے ہیں کہ وہ شراب پیتے تھے اور مرتے دم تک پیتے رہے۔ اور علانیہ پیتے تھے حالانکہ یہ بھی جانتے تھے کہ

دانی کہ چنگ و عود چہ تقریر می کنند پنہاں خورید بادہ کہ تکفیر می کنند

یہ بھی ظاہر ہے کہ انہوں نے مسلماتِ اسلام کا جا بجا مذاق بھی اڑایا ہے۔ اور شاعرانہ انداز میں مخالفانہ انداز بھی اختیار کیا ہے مثلاً

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن		دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

یا		پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق		آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

یا		واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو		کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

ایک مقام پر تو اس قدر حد سے بڑھ گئے ہیں کہ ان کا خود کو کھلا کافر کہنا بالکل صحیح ہو جاتا ہے۔ جس طرح خیام نے اپنی رباعی میں گستاخی کی تھی ذرا سی شراب پر بھی شرابی۔ اپنی اپنی ترنگ میں جو چاہا کہہ بیٹھے۔ دونوں کی رباعیاں ذیل میں درج ہیں۔

خیام		ابریقِ مے مرا شکستی ربی		بر من درِ عیش را ببستی ربی
		برخاک بریختی مے لعلِ مرا		خاکم بدہن مگر تو مستی ربی

غالب		یارب تو کجائی کہ بجا زر ندہی		آشفتہ چرائی کہ بیا زر ندہی
		لنئے آنہ غائبی و بے رحمی		بے مایہ چہ مانی کہ بیا زر ندہی

اگرچہ مومن نے بھی یہ رباعی کہی ہے۔

یارب دلت از دردِ دلم بے خبر است		در آرزوئے مرگ زیستن سخت بلاست
حسنِ صنم بلطفِ صنم ز من بپرس		دیدن دگر است و آفریدن دگر است

مگر خیام و غالب کی سی خیال نا قابلِ درگزر ہیں۔ اگرچہ ایک عربی مقولہ کے مطابق یَجُوْزُ لِلشَّاعِرِ مَا لَا یَجُوْزُ لِغَیْرِہٖ۔ (ترجمہ) شاعر کو وہ بات جائز ہے جو اس کے غیر کو نہیں) مگر اس بے باکی سے غیبت کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔

اسی طرح غالب کے کسی محسن[1] نے حج کا ارادہ کیا تو انہوں نے یہ مقطع کہا۔

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں		حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

گویا اشتیاق بھی ظاہر کیا اور ثواب حج کی یہ قدر کی کہ اپنے پاس رکھنے کو بھی تیار نہ ہوئے۔ اگرچہ یہ شاعرانہ اندازِ بیان ہے تاہم خیال کا کچھ نہ کچھ پتہ چل رہا ہے۔

ان تمام حالات کی موجودگی میں غالب کو اپنے ولی ہونے کا بھی دعویٰ ہے اور کھلم کھلا دعویٰ ہے۔

دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی		ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

یہاں کافر بفتح فا۔ بالاتفاق بمعنی کافر بکسر فا ہے۔ اور یہی مفہوم ہے۔ اس کے علاوہ بالوجہ ربالدلیل بھی وہ خود کو ولی منوانا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب		تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب نے یہ غزل جب بادشاہ دہلی کے روبرو پڑھی تو بادشاہ نے فرمایا "بھئی ہم تو جب بھی تمہیں ولی نہ سمجھتے تو غالب

---

[1] اغلباً نواب شیفتہ یا شاید بادشاہ دہلی۔

نے عرض کیا۔ "حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں (یعنی ولی) مگر یہ اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں"۔ بیشک یہ ان کی حاضر جوابی کا کرشمہ ہے کہ ایسا جواب دیا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ غالب نے اپنے کلام کی جا بجا تعریف بھی کی ہے اور اس کی ناقدری کی شکایت بھی مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے ——— جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

نظم طباطبائی نے اس کی شرح خوب لکھی ہے یہ کہ۔

"گنجینہ اس سبب سے ہے کہ معانی اس میں کثیر ہیں اور طلسم اس سبب سے ہے کہ پہلو بھی اس میں کئی نکلتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ طلسم مشکل سے کھلتا ہے۔ اور حیرت انگیز ہوتا ہے اسی طرح میرا کلام مشکل سے حل ہوتا ہے اور معانی سے اس کے حیرت پیدا ہوتی ہے غرض لفظ کی تشبیہ طلسم سے نہایت بدیع ہے۔

اپنے کلام کی ناقدری کی بابت کہتے ہیں۔

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ ——— کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اُن کے مشکل شعروں کو لوگ مہمل کہتے اور مذاق اڑاتے تھے۔ مگر اس شعر پر بھی ایک اعتراض ہے یہ کہ کھلا کا فاعل محذوف ہے۔ جو جائز نہیں کیونکہ محاورہ تو یہ ہے کہ "یہ حال کھلا" بولتے ہیں۔ کبھی لفظِ حال کو حذف نہیں کرتے غرض کہ شعر مندرجہ بالا یعنی

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب ——— تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

میں غالب نے دو باتوں کو اپنی ولایت کی دلیل قرار دیا ہے (۱) مسائلِ تصوف اور (۲) حسنِ بیان۔ ان کو جدا جدا بھی سمجھا جا سکتا ہے یعنی مسائلِ تصوف تو بیان کرتا ہی ہوں میرا عام بیان بھی بے نظیر ہوتا ہے۔ اور اس میں شک بھی نہیں۔ کہ مضمون آفرینی، جدت طرازی اور ندرتِ بیان ہی کے باعث دنیائے ادب میں غالب غالب کا شور ہے اور یہ بھی معنی ہیں کہ مسائلِ تصوف کو حسنِ بیان کے ذریعہ سمجھاتا ہوں۔ بہر صورت نہ حسنِ بیان سے انکار ہو سکتا ہے نہ مسائلِ تصوف کے اظہار سے بیشتر اشعار رنگِ تصوف میں ہیں اور بہت خوب ہیں۔ اسی غزل کا آخری شعر کیا کم ہے

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا ——— جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

اسی طرح حسبِ ذیل اشعار کس قدر بلند ہیں۔

آتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بُعد ہے ——— جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ——— یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ——— ہرچند کہیں کہ ہے نہیں ہے
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ——— ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے
ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

مولوی سید علی حیدر نظم طباطبائی شارحِ دیوانِ غالب کا قول ہے کہ "اس شعر کی تعریف کے لئے الفاظ نہیں ملتے حق یہ ہے کہ مشائخ طریقت جن کا کلام ترجمانِ حقیقت ہوا کرتا ہے ان کے دیوان بھی آج اس شعر کی نظیر سے خالی ہیں"

تعلقاتِ دنیا کی مذمت یوں کی ہے۔

بہ نالہ حاصلِ دلبستگی فراہم کر متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

غالب جیسے مشرب کے سخنور کے یہاں ایسے اشعار ہونا فی الواقع حیرت انگیز امر ہے۔ اغلباً اسی سے مغلوب ہو کر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے دیوانِ غالب کو الہامی کتاب کہہ دیا۔ نعوذ باللہ منہا۔ اس لئے کہ یہ تو ال ہی محال ہے محال سے اس کا کوئی سروکار نہیں۔ وہ کیسا صحیفہ الہامی جس کا عامل اس پر عامل نہ ہو۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ انہی مسائل کی وجہ سے تو بجنوری جیسے بہت سے پرجوش معتقد غالب کا کلمہ پڑھنے لگے۔ حالانکہ غالب کے ہر شعر کو اغلاط سے پاک سمجھنا بذاتِ خود غلطی ہے حد تو یہ ہے کہ بعض عقیدت مندانِ غالب پرستی نے دیوانِ غالب کو "دیوانِ حافظ کا جواب" اس معنی میں بھی تسلیم کیا ہے کہ وہ دیوانِ غالب سے بھی فال کھولتے ہیں۔ مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ "شاعرِ نبات" کا مرتبہ کس کو عطا کیا ہے۔

دوسری قسم کے معتقدین جن پر رنگِ سیاست غالب ہے۔ غالب کو "قومی شاعر" بنائے ڈالتے ہیں۔ حالانکہ غالب کے زمانے میں قومیت کا تصور تک نہ تھا۔ وہ شخصی فرمانروائی کا زمانہ تھا ظلِ الٰہی عہد تھا۔ قصیدہ گوئی کا وقت تھا

اگر شہ روز را گوید شب است این بباید گفت اینک ماہ و پرویں

بلاشک غالب بہت بڑا فلسفی شاعر تھا۔ اپنے معاصرین میں بلند مقام کا مالک تھا۔ اردو اور فارسی کا زبردست نثار بھی تھا۔ فارسی میں بہت بلند پایہ رکھتا تھا۔ مگر قومی شاعری سے کیا علاقہ۔ بلاشک اس کے بعض شعر ایسے بھی ہیں کہ کھینچ تان کر کے ہی ان کو معنی کا جامہ پہنایا جا سکتا ہے اور یہ کوئی اس زمانے کی بات نہیں ہے۔ اب کہ ادبِ فارسی تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اور اردو ادب کی کساد بازاری ہے۔ بلکہ غالب کے عہد میں بھی اس کے فاضل اجل معاصر اس کے کلام کے اشکال کے قائل تھے۔ اسی وجہ سے دیوان کا انتخاب ہوا۔ اور اسی بنا پر غالب صاف اور آسان شعر کہنے پر مجبور رہے اور اسی مشکل پسندی کے باعث دیوانِ غالب کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شرح پر شرح لکھی گئی مگر پھر

کبھی شارحین متفق الرائے نہ ہوسکے مثلاً

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یا

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

حاصلِ کلام غالب نہ حاملِ صحیفۂ الہامی تھا۔ نہ ولیٔ ولایت۔ البتہ والیٔ ولایتِ سخن ضرور تھا اس کے اس اعزاز سے کوئی اہلِ ذوق مردِ مومن بھی انکار نہیں کرسکتا۔ وہ بادہ خوار ہو یا زنار شاہد باز مگر بیشک سچ ہے کہ؎

گنجینۂ معنیٰ کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

خورشید خاور امروہوی

غالب

(در صنعتِ توشیح)

غالب کی خیال آفرینی
ایہام و اثر کی جستجو ہے
لاہوتِ کمال کا پیمبر
بیشک وہ غزل کی آبرو ہے

قطعہ

ہمیشہ مطلعِ اردو زباں پر
مثالِ مہر رخشندہ رہے گا
نہ بھولے گی کبھی غالب کو دنیا
فنا ہو کر بھی وہ زندہ رہے گا

نصیب احترایم اے

غالب کا دہلی میں قیام؟

غالب کے دہلی میں قیام کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ کسی نے دہلی میں مستقل قیام تقریباً ۵۰ سال یعنی ۱۸۱۹ء سے (حالی ص۲۳)، کسی نے ۱۸۱۲ء (غلام رسول مہر ص۴۸) اور کسی نے ۱۸۱۲ء سے (مالک رام ص۲۶) لکھا ہے۔

یہ تمام سنین غالب کے خطوط پر مبنی داخلی شہادتوں کے تحت متعیّن کئے گئے ہیں۔ فی الحال اس کے علاوہ کوئی صورت بھی نہیں، تاہم غالب کے تمام اردو اور فارسی کلام میں (جس میں اردو ادب فارسی مکاتیب وغیرہ شامل ہیں) صرف دو ایسے خط نظر سے گزرے ہیں جن میں غالب نے قطعیت اور بڑے اعتماد کے ساتھ دہلی میں اپنے قیام کے متعلق لکھا ہے۔ وہ دونوں خطوط علاء الدین احمد خاں علائی کے نام ہیں۔ جن میں سے ایک خط کی بنیاد پر جس میں یہ تحریر ہے کہ :

"اے میری جان یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے....
...... وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا
ہوں۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں...

یکم شنبہ ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء　　　　عافیت کا طالب غالب

مولانا غلام رسول مہر صاحب نے غالب کی دہلی میں آمد کا سن ۱۸۱۱ء اخذ کیا ہے اور اسے رد کرکے ۱۸۱۲ء متعین کیا۔ حالانکہ جو خطوط (بنام میر اعظم علی صاحب مدرس مدرسہ اکبرآباد اور منشی شیو نرائن) اپنے زاویۂ نظر کے دلائل میں پیش کئے ہیں ان میں نہ وہ قطعیت اور خود اعتمادی ہے جو ان خطوط میں نظر آتی ہے نہ دہلی میں مستقل قیام کا ذکر ہے اور یہ تسلیم شدہ ہے کہ مرزا دہلی میں مستقلاً آنے سے پہلے بھی آگرہ جاتے رہے کیونکہ آگرہ میں ان کی والدہ حیات تھیں۔ والدہ زندہ تھیں بہرحال دہلی میں قیام کے بعد بھی ان کا آگرہ آنا جانا ثابت ہے اور یہ خط بنام علائی سے بھی ظاہر ہوتا ہے (اردوئے معلیٰ ص۳۴۳ اکمل المطابع دہلی ۱۸۶۹ء)

مالک رام صاحب نے اسی خط کو اساس بنایا۔ اور ذکر غالب طبع اول تا سوم اس کا سن تحریر ۱۸۶۳ء لکھا جو غلط تھا۔ یہ غلطی دراصل اردوئے معلیٰ کے اس نسخہ میں تھی جسے مالک رام صاحب نے سامنے رکھا تھا (اردوئے معلیٰ۔ مطبع کریمی لاہور، بار اول ۱۹۲۲ء) اور یہ غلطی صرف اسی میں نہیں بلکہ حال میں طبع شدہ ایک نسخہ کو چھوڑ کر لاہور کے مطبوعہ اردوئے معلیٰ کے تقریباً تمام نسخوں میں ہے۔ اکمل المطابع، مطبع مجتبائی دہلی اور مطبع مجیدی کانپور کے تمام قدیم مطبوعہ نسخوں میں ۱۸۶۲ء درج ہے جو صحیح ہے جس کی تصدیق مہیش پرشاد اور غلام رسول مہر صاحب کے مرتبہ "خطوط غالب" سے ہوتی ہے علاوہ ازیں بہ اعتبار موضوع و متن یہ خط ۱۸۶۲ء کے سلسلہ خط و کتابت ہی کی ایک کڑی ہے جو اس سن کے دوسرے خطوط (بنام علائی) دیکھ کر صاف طور پر شناخت کی جا سکتی ہے۔ تعجب ہے کہ مالک رام صاحب نے ایسا اہم فیصلہ کرتے وقت اردوئے معلیٰ کے قدیم ترین نسخوں میں سے کسی کو سامنے نہیں رکھا۔ بہرحال اس کی تصحیح و تلافی ذکر غالب طبع چہارم (۱۹۶۴ء) میں کر دی گئی ہے۔

لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی اور وہ یہ کہ اگر حساب سن عیسوی سے لگایا ہے تو ۱۸۶۳ء میں سے (جو ذکر غالب طبع اول تا سوم تحریر ہے) اور ۱۸۶۲ء میں سے (جو طبع چہارم میں بعد تصحیح درج ہے) اکیاون (۵۱) گھٹانے پر ہر بار ۱۸۱۲ء ہی آتا ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی پہلی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اس مرتبہ شروع اور آخر کے دونوں سال جوڑ کر ۱۸۱۲ کا عدد پورا کر دیا گیا جو عام طریقہ کے مطابق نہیں ہے۔ بلکہ اس صورت میں یہ لکھا جاتا کہ اکیاون واں سال ہے یہی غالب بھی لکھتے اور انہوں نے اس طرح لکھا بھی ہے۔ نظیر ملاحظہ فرمائیے۔ بہ اعظم علی مدرس اکبرآباد، تحریر فرماتے ہیں:

"اکنوں ششمیں سال است کہ خانماں بباد دادہ و دل بہ مرگ ناگاہ
نہادہ بہ کنجے نشستہ ام......" (پنج آہنگ ص ۲۲۷ مطبع دارالسلام دہلی ۱۸۵۳ء)

گویا یہ چھٹا سال ہے۔ ابراہیم علیخاں وفا کو لکھتے ہیں" رجب کی آٹھویں تاریخ سے تہترواں برس شروع ہو گیا ہے" (خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر ج ۲ ص ۱۳۳۔ نیز ملاحظہ کیجئے صفحات نمبر ۱۹۰، ۱۲۲ و ۲۴)

دوم اس خط کے ساتھ مالک رام صاحب نے ایک دوسرا خط "بنام نواب خلد آشیاں مورخہ یکم ستمبر ۱۸۶۶ء جس کا مضمون یہ ہے کہ" برسات ایسی ہوئی کہ باون (۵۲) ترپن (۵۳) برس سے یہاں رہتا ہوں" پہلے خط کی تصدیق و توثیق میں پیش کیا ہے (طبع چہارم ص ۴۰ کا حاشیہ) لیکن اس سے کسی صورت سے ۱۸۱۲ء اخذ نہیں ہوتا۔ باون (۵۲) نہیں بلکہ ترپن (۵۳) گھٹائے جائیں تو بھی ۱۸۱۳ء آتا ہے۔ اور اگر مالک رام صاحب کے طریقہ سے اگلے اور پچھلے دونوں سال جوڑ دیئے جائیں تو ۱۸۱۴ء آتا ہے۔

اول الذکر خط میں ۱۸ر فروری ۱۸۶۲ء مطابق ۱۲۷۸ھ درج ہے۔ اس میں سے ۵۱ نفی کرنے پر حاصل تفریق ۱۲۲۷ھ آتا ہے جو تقریباً پورا پورا مطابق ہے ۱۸۱۲ء کے۔ لیکن مالک رام صاحب نے یہ طریقہ استعمال نہیں کیا ہے ورنہ

دوسرا خط جس پر یکم ستمبر ۱۸۶۶ء تحریر ہے اس سلسلہ میں بطور ثبوت پیش نہ کرتے کیونکہ یکم ستمبر ۱۸۶۶ء مطابق ۱۲۸۳ھ ہے اور اس میں سے ترپن ۵۳ گھٹانے پر ۱۲۳۰ھ آتا ہے جو تقریباً پورا پورا ۱۸۱۵ء کے مطابق ہے۔ اس طرح بہت زیادہ فرق ہو جاتا ہے۔ اور یہ جانتے ہوئے وہ کس طرح اپنے پہلے خط کی توثیق میں اسے پیش نہ کرتے۔ لیکن ۱۸۱۲ء مالک رام صاحب پہلے طے کر چکے تھے اور اپنے دیگر مضامین میں (ملاحظہ کیجئے "مرزا غالب"، غالب نمبر علیگڈھ ۴۹-۱۹۴۸ء اور یہی مضمون احوال غالب میں) ۱۸۱۲ء تحریر کر چکے تھے اس لئے اس کو باقی رکھنے کی کوشش فرمائی ہے۔

لیکن تعجب یہ ہے کہ حیاتِ غالب کے ان لائق محققین کی نظر علائی کے نام مرزا کے دوسرے خط پر اس لحاظ سے نہیں پڑی اگرچہ ان حضرات کے یہاں اکثر مقامات پر اس کے حوالے ملتے ہیں مگر دیگر امور کے ذیل میں — اس خط میں بھی قطعیت اور انتہائی خود اعتمادی پائی جاتی ہے انداز ملاحظہ فرمائیے۔

> "سنو صاحب ۔ حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے وہ امرد کو دو چار
> برس گھٹا کر دیکھتے ہیں ۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے لیکن بچہ سمجھتے ہیں ۔ یہ حال
> تمہاری قوم کا ہے قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اس کی
> عزت و نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور محقق ہے اور صاحب تم
> بھی جانتے ہو مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو اور اس مسخرے کو
> گمنام و ذلیل نہ سمجھو تم کو چین نہ آنے گا ۔ پچاسش برس سے دلی میں رہتا
> ہوں ہزار ہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں ...... آپ صرف دہلی
> لکھکر میرا نام لکھدیا کیجئے خط کے پہنچنے کا میں ضامن
> پنجشنبہ ۱۴ ماہ اپریل (۱۸۶۱ء)[۱] غالب

۱۴ اپریل ۱۸۶۱ء مطابق ۱۲۷۷ھ ۔ ۱۲۷۷ھ میں سے ۵۰ گھٹانے پر ۱۲۲۷ھ آتا ہے جو تقریباً پورا پورا مطابق ہے ۱۸۱۲ء کے ۔

مالک رام صاحب کے طریقے سے بھی غالب کے اور عام طریقے سے ہٹ کر بھی ۱۸۱۲ء ہی آتا ہے ، اور اس طرح موصوف کے نظریہ کو مزید تقویت پہنچ سکتی تھی۔ پہلے خط کی تصدیق و توثیق ہو جاتی ۔ لیکن انھوں نے ایک دوسرے خط کا

---

[۱] اردوئے معلی کے قدیم ترین نسخوں میں اس خط پر سن نہیں ہے لیکن "پنجشنبہ ۱۴ ماہ اپریل" اور دیگر آثار و قرائن اور تقویم دیکھکر سن کا پتہ چلایا جا سکتا تھا ۔ بہرحال مہیش پرشاد صاحب اور غلام رسول مہر صاحب نے اپنے مرتبہ خطوط غالب میں اس پر سن ڈالدیا ہے جو درست ہے۔

حوالہ دیا جس سے ۱۸۱۳ء بلکہ ان کے طریقہ پر ۱۸۱۴ء اخذ ہوتا ہے اور جو ۱۸۱۲ء کے قریب ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے سن عیسوی سے حساب لگایا ہے[1]

لیکن غالب نے جہاں کہیں بھی اپنی تاریخ پیدائش، شادی کی تاریخ یا اپنی عمر کا حساب لگایا ہے اس میں اکثر ہجری سنین ہی استعمال کئے ہیں۔ ان کے یہاں عموماً ایسا ہی ملتا ہے اور یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ اس ضمن میں سن ہجری سے حساب لگاتے تھے حالانکہ اکثر وبیشتر خطوط پر سن عیسوی ڈالتے تھے۔ پروفیسر خواجہ محمد حامد صاحب بھی اس سے متفق ہیں (ملاحظہ فرمایئے مقالہ بعنوان "میر اعظم کے نام خط پر تبصرہ" سب رس حیدرآباد دکن نومبر، دسمبر ۱۹۵۰ء) خطوط غالب سے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اور اس زمانہ میں طریقہ بھی یہی تھا۔

بہرحال اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل یہی دو خطوط (بنام علائی) ہیں جن میں قطعیت اور خود اعتمادی کے علاوہ تین اور باتیں بھی خاص ہیں۔

(۱) ایک ایسے شخص کو لکھے گئے ہیں جو غالب سے رشتۂ مودت و قرابت رکھتا تھا، بچپن سے جب وہ (علائی) شعبان بیگ کی حویلی میں پڑھنے جاتا تھا اور اپنے بزرگوں کی زبانی بھی غالب سے بخوبی واقف تھا۔ ان کا شاگرد اور خلیفہ ثانی تھا۔ آخر وقت تک بڑے اچھے روابط، آنا جانا اور سلسلہ خط و کتابت رہا۔ اس صورت میں دہلی میں مدت قیام میں کمی و بیشی اور غلط بیانی کا احتمال بہت کم ہے۔

(۲) دہلی میں آنا جانا اور مستقل قیام دو الگ الگ باتیں ہیں، غالب نے یہ خود محسوس کرتے ہوئے اپنے ۱۸۶۲ء کے خط (بنام علائی) میں واضح طور پر لکھا ہے کہ "وہ دلی نہیں ہے جس میں ۷ برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں"[2]

---

[1] اگر عیسوی عام طریقہ کے بموجب حساب لگایا جائے تو ۱۸۱۱ء آتا ہے۔

[2] اردوئے معلیٰ ص ۱۳۴ مطبوعہ اکمل المطابع دہلی ۶ مارچ ۱۸۶۹ء (بار اول) لیکن "خطوط غالب" مرتبہ غلام رسول مہر کتاب منزل لاہور ۱۹۵۱ء جلد اول صفحہ ۳۵ پر (خط بنام علائی) یہ جملہ "وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں" کتابت و طباعت سے رہ گیا ہے۔

(۳) اگر ان دونوں خطوط کو سلسلہ وار دیکھا جائے تو ایک میں جو ۱۸۶۱ء (۱۲۷۷ھ) میں لکھا گیا ۵۰ برس مدت قیام درج ہے جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۵۰ کا پورا پورا عدد اور ایک طویل مدت محض اتفاقاً ڈالنے کے لئے اندازاً لکھدی گئی ہے لیکن دوسرے خط میں جو اس کے بعد ۱۸۶۲ء (۱۲۷۸ھ) کا محررہ ہے ۵۱ برس تحریر ہے اس سے پہلے خیال کی نفی ہو جاتی ہے اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں مدت قیام اندازاً نہیں بلکہ حساب لگا کر (جو باسانی ممکن ہے) بڑی سنجیدگی اور صحت کے ساتھ لکھا ہے۔

اس ضمن میں ایک اور خط بنام منشی نبی بخش حقیر (نادرات غالب ص ۲۵-۲۴) بھی پیش کیا جا سکتا ہے جس میں غالب نے مومن کی وفات کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ اس سے دہلی میں آمد کی متعدد سنین بھی اخذ کی جا سکتی ہیں تاہم "پندرہ پندرہ برس کی عمر" سے (چونکہ غالب، مومن سے بلحاظ عمر بڑے تھے) ۱۲۲۰ھ (۱۸۱۲ء) بھی نکلتا ہے اور مالک رام صاحب کے متذکرہ دوسرے خط کے مقابلہ میں تصدیق و توثیق کا حامل ہے لیکن وہ بات نہیں جو ان دونوں خطوط میں ہے۔ اس لئے اسے دلیل و سند نہیں بنایا جا سکتا۔ ممکن ہے مومن سے دوستانہ تعلقات اس وقت ہو گئے ہوں جب غالب کا دہلی میں محض آنا جانا تھا۔

غرض کہ بحساب سن ہجری (جو غالب کا طریقہ تھا) ان دونوں خطوط سے ۱۸۱۲ء نکلتا ہے گویا مرزا کا دہلی میں مستقل قیام ۱۸۱۲ء سے شروع ہوا۔ جو دوسرے آثار و قرائن سے بھی درست معلوم ہوتا ہے[۵] اور غلام رسول مہر صاحب بھی اس سن سے قریب قریب متفق نظر آتے ہیں۔ دیگر مطبوعات مثلاً "خطوط غالب" مرتبہ غلام رسول مہر مطبوعہ لاہور ۱۹۵۱ء ص ۳ اور "کلیات غالب فارسی" مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء کے احوال میں ص ۲ پر ایسا ہی نظر آتا ہے کہ "پندرہ سولہ برس کی عمر میں مرزا خود آگرہ کی سکونت چھوڑ کر دہلی منتقل ہو گئے" یعنی ۱۳-۱۸۱۲ء

---

[۵] ملا عبد الصمد کی شخصیت اصلی ہو یا فرضی اس سے بحث نہیں غالب کے اس بیان سے کہ جب وہ چودھویں سال میں تھے تو "بطریق سیاحت بہ ہند آمدہ ..... دو سال بکلبۂ احزان من (بہ اکبر آباد) آسودہ" (درفش کاویانی ص ۱۳ سنہ ۱۸۶۵ء اکمل المطابع دہلی) اور ان کی آمد کے سن ۱۲۲۶ھ سے جو غالب ہی کا بیان کردہ ہے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۲۲۶ھ اور ۱۲۲۷ھ میں وہ ان کے پاس اکبر آباد میں رہے اور اسی سن کے آخر میں غالب کے ساتھ دہلی آ گئے بقول حالی "دہلی میں مقیم" رہے (یادگار غالب ص ۱۸ لاہور) اور ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) میں رخصت ہوئے اس طرح اخذ کردہ مندرجہ بالا سن صحیح معلوم ہوتا ہے اور غالب کا بیان بھی بجا و درست

مولوی محمد حفیظ اللہ پھلواروی

مثنویٔ غالب در تائیدِ مسائلِ اختلافیہ

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندان نے اسلام اور ملت اسلامیہ کی بڑی شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ اس خاندان کے فاضل ارکان نے قرآن وحدیث کو عام کیا۔ مراسم وبدعات کا رد کیا۔ یہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے سیاسی جمود کو بھی توڑا اور ان کو فکر وعمل کی دعوت دی۔

مسلمانوں کے سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ ان میں مذہبی اضمحلال اور بے راہ روی بھی پیدا ہو گئی اور اس میں مختلف معاشرتوں اور تہذیبوں نے بھی رنگ آمیزی کر دی۔ کہیں عجمی تصورات کی رنگ آمیزی تو کہیں ہندی مراسم وعقائد کی آمیزش تھی۔ بعض حالتوں میں ان عقائد ومراسم کو کسی نہ کسی طرح جواز کی سند عطا کر کے گوارا کر لیا گیا تھا پھر ان کا تواتر اور ان سے وابستگی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ بعض طبقوں کے لئے یہ مراسم وبدعات اچھا خاصا آمدنی کا ذریعہ تھیں عرس، قوالی، میلاد، مراسم محرم، تیجا، دسواں، بیسواں، چالیسواں، موئے مبارک، قدم شریف، رداوجبہ شریف کی زیارات وغیرہ اسی قبیل کی چیزیں ہیں۔ خوش عقیدہ مسلم عوام ان چیزوں کو عین اسلام سمجھتے تھے۔ مجاور، واعظ اور خوش عقیدہ مولوی ان چیزوں کے مبلغ ومناد اور پھر ان مسائل کی تائید وتردید میں ایک اچھا خاصا علم کلام پیدا ہو گیا۔ رسالے لکھے گئے۔ کتابیں تصنیف ہوئیں بلکہ مناظرے تک ہوئے، حالانکہ یہ انیسویں صدی کا آغاز ہی تھا۔ دہلی کی حکومت مسلمانوں سے چھن چکی ہے۔ دہلی کا شہنشاہ انگریزوں کا پنشن خوار ہے۔ سارا ملک انگریزوں کے قبضے میں جا چکا ہے۔ پنجاب پر سکھ مسلط ہیں۔ تجارت وصنعت میں تو مسلمان یوں ہی کورے تھے۔ حکمرانی کی وجہ سے ملازمت زمینداری مقبول ومعزز ذریعہ معاش تھے۔ صنعت وحرفت کو صرف تیسرے درجے کی چیز سمجھا جاتا تھا بلکہ حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ دراصل یہ مسلم معاشرے کی بنیادی کمزوری تھی۔

مسلمانوں کی سیاسی کمزوری کے ساتھ ان کی معاشی و اقتصادی حالت بھی اچھی نہ تھی۔ پھر ظاہری نمود و نمائش اور مراسم پرستی نے ان کی رہی سہی حالت کو اور بھی بگاڑ دیا تھا۔ اس وقت شاہ اسماعیل شہید دہلوی نے سید احمد شہید کی قیادت میں مسلم عوام و خواص کی اصلاح و ترقی کا ایک پروگرام بنایا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کا سیاسی زوال مکمل طور سے ہو چکا ہے۔ پنجاب و کشمیر میں سکھوں کی چیرہ دستیاں انتہا کو پہنچ چکی ہیں۔ مسلمانوں پر انتہائی ظلم ہو رہے ہیں۔ نماز و اذان تک کی آزادی نہیں ہے۔ داڑھیوں پر ٹیکس لگ چکا ہے۔ اور سارے ملک کو انگریز ہڑپ کر رہا ہے۔ لہذا انہوں نے مسلمانوں کی مذہبی معاشرتی اور سیاسی اصلاح کا منصوبہ بنایا۔ ان کو توحید خالص کی دعوت دی۔ مراسم و بدعات کا رد کیا اور دینی و فکری انقلاب کے لئے ایک کتاب "تقویۃ الایمان" لکھی۔ یہ کتاب بہت مؤثر بلکہ انقلاب آفریں ثابت ہوئی۔ لیکن یہ کتاب استعمار پسندوں، شاہ پرستوں، انگریز نوازوں، درباریوں، پیروں، مجاوروں، واعظوں اور خوش عقیدہ مولویوں کو پسند نہ آئی اور انہوں نے اس کتاب کو رد کیا۔ اور اس وقت دو گروہ بن گئے جس میں پہلے گروہ کے قائد مولانا شاہ اسماعیل شہید تھے اور دوسرے کے قافلہ سالار مولانا فضل حق خیر آبادی تھے[1] مولانا خیر آبادی نے اس کتاب کی بعض عبارتوں پر گرفت کی اور پھر ان کے ہم خیال علماء نے اس کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا جس کی صدائے بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔

مولانا فضل حق خیر آبادی اور مرزا اسد اللہ خاں غالب میں بہت اچھے تعلقات تھے دونوں ہم عمر اور ہم فکر بھی تھے۔ مرزا غالب کے دیوان کے انتخاب میں مولانا فضل حق خیر آبادی کی فکر و رائے کو خاصا دخل رہا ہے[2]۔ مولانا فضل حق کے مقدمے اور حبسِ دوام لعبور دریائے شور کی سزا سے مرزا غالب کو جو تکلیف پہنچی ہے اس کی ٹیس آج بھی ان کے خطوط میں محسوس ہوتی ہے۔

مولانا شاہ اسماعیل شہید نے جب "تقویۃ الایمان" کے مباحث کو موضوع تبلیغ بنایا تو مولانا فضل حق خیر آبادی اور ان کے ہم خیال علماء نے ان کا رد کیا یہاں تک کہ مولانا خیر آبادی نے اس بحث میں مرزا غالب کو بھی گھسیٹ لیا اور انہوں نے ان مسائل کی تائید میں مرزا غالب سے باصرار ایک مثنوی لکھوائی[3] جس کا عنوان ہے

---

[1] مولانا فضل حق خیر آبادی پیدائش ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء اپنے والد فضل امام اور شاہ عبد القادر کے شاگرد تھے، علوم معقول کے امام تھے۔ جھجر، الور، ٹونک اور رام پور میں ملازم رہے کمشنر دہلی کے دفتر میں پیشکار رہے۔ جہاں شاہ جہان گڑھی میں مولوی امیر الدین علی کے خلاف فتویٰ دیا (تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۲۲۲) ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں حصہ لیا حبس دوام لعبور دریائے شور کی سزا ہوئی ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں جزائر انڈمان میں انتقال ہوا۔ ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ص ۳۸۲ - ۳۸۴ —: [2] یادگار غالب از خواجہ الطاف حسین حالی (مطبوعہ لاہور ۱۹۳۲ء) ص ۱۰۲ — [3] ایضاً ص ۱۰۲ مگر مولوی عبد الشاہد خاں شروانی نے

بیان ممتاز داری شان نبوت و ولایت کہ درحقیقت پرتو نور الانوار الوہیت است" ہے اور اس میں ۱۲۸ سو اٹھائیس اشعار ہیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ مولانا فضل حق علم و فضل میں شہرہ آفاق تھے اور شعر و سخن کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے عربی میں ان کے قصائد موجود ہیں۔ فارسی میں بھی فکر سخن کرتے تھے اور فرقتی تخلص تھا انہوں نے خود اپنے مسائل کی تائید میں فارسی مثنوی کیوں نہ لکھی ؟ مرزا غالب سے یہ مثنوی کیوں لکھوائی ؟ شاید یہ خیال ہو کہ مرزا غالب شاعر کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں اور ان کی مثنوی زیادہ شہرت پذیر ہوگی اور ان افکار کی زیادہ اشاعت ہوگی

اس مثنوی میں مرزا غالب نے توحید وجودی اور نور محمدی سے آغاز کرتے ہوئے اختلافی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اور ان کی تائید کی ہے وہ مسائل یہ ہیں ۔

استمداد ، ندائے غیر اللہ ، شفاعت و حاجت روائی ، مولود نبوی ، موئے مبارک ، قدم شریف کی زیارات ، رواداری کی نمائش ، عرس بزرگان ، چراغ و شمع بر قبور افروختن ، عود سوختن ، بہ نرخ آیت خواندن و نان تقسیم کردن ، امکان نظیر و امتناع نظیر۔

امکان نظیر و امتناع نظیر ایک کلامی مسئلہ ہے۔ اس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ شاہ اسماعیل شہید نے اپنی کتاب تقویۃ الایمان کی " فصل الثالث فی ذکر رد الاشراک فی التصرف " میں شفاعت کی بحث کرتے ہوئے کہیں یہ لکھ دیا ہے[1]

" اس شہنشاہ کی تو یہ شان ہے . . . . کی برابر پیدا کر ڈالے "

اس عبارت پر مولانا فضل حق خیرآبادی نے گرفت کی اور اس کا رد لکھا۔ ان کی تائید میں مفتی صدرالدین آزردہ اور مولوی فضل رسول بدایونی نے بھی رد لکھا پھر تو برصغیر کی فضا اس مسئلے سے ایسی گونجی کہ اس کی صدائے بازگشت تقریباً پون صدی تک سنائی دیتی رہی ۔ اور دوسرے علماء مثلاً مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا عبدالحئی فرنگی محلی، اور مولانا حافظ بخش بدایونی وغیرہ نے اس موضوع پر تائید و تردید میں بہت سے رسالے لکھے[2]

لکھ دیا ہے کہ (غالب نے ، علامہ (فضل حق) کا رجحان دیکھ کر اس موضوع پر ایک مثنوی لکھ ڈالی ۔ (باغی ہندوستان) از عبدالشاہد خاں شروانی بجنور ۱۹۴۷ء ص ۱۸۴ —

[1] ملاحظہ ہو تقویۃ الایمان مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ص ۲۲

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے " مولانا محمد احسن نانوتوی " از محمد ایوب قادری (کراچی ۱۹۶۶ء) ص ۸۴ - ۹۴

مرزا غالب نے مخالف گروہ کو اعمیٰ، ابلہ، بدگہر، تن پرست، بدگو، بدبین، اور منکر آیاتِ حق وغیرہ الفاظ سے یاد کیا ہے۔ مرزا غالب نے بطور تائید مولانا شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے نام لکھے ہیں۔ لیکن انہوں نے ان علمار کی کسی کتاب کا حوالہ یا کسی تحریر کا اقتباس نقل نہیں کیا ہے اسی طرح دوسرے دو بزرگ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی اور شاہ فخرالدین دہلوی کا بھی حوالہ دیا ہے مگر ان بزرگوں کی بھی کسی کتاب یا تحریر کو نقل نہیں کیا ہے۔

مرزا نے ندائے غیراللہ میں سب سے اول "یا علی" سے آغاز کیا ہے اور ان کو مشکل کشا لکھا ہے۔ اب مثنوی کا متن مع حواشی ملاحظہ ہو[1]

مثنوی

بعد حمدِ ایزد و نعتِ رسول ۔۔۔ می نگارم نکتۂ چند از اصول
تا سوادش بخشد اندر رسم و راہ ۔۔۔ دیدہ ور را سرمۂ اعمیٰ را نگاہ
حق بود حق کامد از نورش پدید ۔۔۔ آسمانہا و زمینہا را کلید
نور محض و اصلِ ہستی ذات اوست ۔۔۔ ہرچہ جز حق بینی از آیات اوست
تا بخلوت گاہ غیب الغیب بود ۔۔۔ حسن را اندیشہ سر در جیب بود
صورت نگرانیکہ باری چون کند ۔۔۔ تاز جیبِ غیب سر بیرون کند
جلوہ کرد از خویش ہم بر خویشتن ۔۔۔ داد خلوت را فروغ انجمن
جلوۂ اول کہ حق بر خویش کرد ۔۔۔ مشعل از نورِ محمد پیش کرد
شد عیاں زاں نور در بزم ظہور ۔۔۔ ہرچہ پنہاں بود از نزدیک و دور
ہم چوں آں ذرات کاندر تاب مہر ۔۔۔ از نقاب غیب بنمایند چہر
مہر بر ذرات پرتو افگنست ۔۔۔ عالم از تابِ یک اختر روشنست

---

[1] اس مضمون کی تیاری میں ہمیں پروفیسر محمد ایوب صاحب قادری کے کتب خانے سے بہت مدد ملی جس کے لئے ہم ان کے شکر گذار ہیں (حفیظ اللہ پھلواروی)

نورِ حق ست احمد و لمعانِ نور　　از نبی در اولیاء دارد ظہور
ہر ولی پرتو پذیر ست از نبی　　چون مہ از خور مستنیر ست از نبی
جلوۂ حسنِ ازل مستور نیست　　لیک اعمیٰ را نصیب از نور نیست
از نبی و از ولی خواہی مدد　　تا نہ پنداری کہ ناجائز بود
بر نشاید کار بے فرمانِ شاہ　　لیک آئینہاست با خاصانِ شاہ
ہر کہ او را نورِ حق نیرو فزاست　　ہر چہ از وے خواستی ہم از خداست
بر لبِ دریا گر آبے خوردہ　　آب از موجے بجام آوردۂ
آب از موج آید اندر جامِ تو　　لیکن از دریا بود آشامِ تو
وقتِ حاجت ہر کہ گوید یا علی[1]　　با حقیقتش کار ست دلورزش با علی
"یا محمدؐ" جان فزاید گفتنش　　"یا علی" "مشکل کشا" ید گفتنش
چون اعانت خواہی از یزدانِ پاک　　"یا معین الدین"[2] اگر گوئی چہ باک
جاہلان را زانکہ دانش نارساست　　گفتگو با ہر سرِ حرفِ نداست
مولوی معنوی عبد العزیز[3]　　وان رفیع الدین[4] دانشمند نیز

---

[1] مرزا غالب نے آغاز سخن "یا علی" سے کیا ہے اور دوسرے شعر میں ان کو "مشکل کشا" کہا ہے

[2] خواجہ معین الدین چشتی اجمیری وفات ۶ رجب ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء

[3] شاہ عبد العزیز محدث دہلوی ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں پیدا ہوئے تمام علوم کی تحصیل اپنے والد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے کی۔ علوم عقلیہ و نقلیہ میں کامل اور کمالات ظاہری و باطنی کے جامع تھے وہ مرجع علماء و مشائخ تھے تمام عمر درس و تدریس، افتاء، فصل خصومات، وعظ و پند اور تلامذہ کی تربیت و تکمیل میں صرف کر دی۔ نجف خان کے زمانے میں اس کی سخت گیر پالیسی کی وجہ سے شاہ صاحب کو سخت تکلیف پہنچی۔ یہاں تک کہ شہر سے نکالا گیا جائداد ضبط ہوئی مگر اصلاح و تبلیغ کے کام کو جاری رکھا تحفۂ اثنا عشریہ ان کی مشہور کتاب ہے ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء میں انتقال ہوا ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند (رحمان علی) مرتبہ و مترجمہ محمد ایوب قادری (کراچی ۱۹۶۱ء) ص ۳۰۴، ۳۰۳

[4] شاہ رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ ۱۱۶۳ھ/۱۷۴۹ء میں پیدا ہوئے، اپنے عہد کے نامور عالم و فاضل تھے۔ دمغ الباطل اور اسرار المحبت ان کی مشہور کتابیں ہیں ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء میں انتقال ہوا۔ ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ص ۱۹۶

شاہ عبدالقادر[1] دانش سگال　　کاین دو تن را بود در گوہر ہمال
بردن نام نبی دار لیسار　　خورد را گفتند با حسرت ندا
وان دگر شہزادۂ قدسی سرشت　　رہنمائے مسلک پیران چشت
آنکہ شیخ وقت خضر راہ بود　　نام والایش کلیم اللہ بود[2]
گفت استمداد از پیران رواست　　ہر چہ پیر راہ گوید آں رواست
کے غلط گوید چنیں روشن ضمیر　　خردہ بر قول کلیم اللہ مگیر
ہم چنیں شیخ المشائخ فخر دین　　آفتاب عالم علم و یقین[3]
ہم بریں ہنجار دائیں بودہ است　　شیخ ما حق گوی دین حق بین بودہ است
تا نہ پنداری ز پیران خواستیم　　حاجت خود را نیز زان خواستیم
لیک در پوزش بدرگاہ رفیع　　ما ہمی آریم پیران را شفیع
این چنین پوزش روا نبود چرا　　کشف با عارف خدا نبود چرا
وز سخن در محفل پیغمبر است　　بزمگاہ دلکش رحمان پرور است

---

[1] شاہ عبدالقادر بن شاہ ولی اللہ دہلوی ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن کریم کا بامحاورہ ترجمہ ہے۔ بڑے عالم و فاضل اور متقی و پرہیزگار تھے۔ ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۴ء میں فوت ہوئے۔ ملاحظہ ہو۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ص ۳۱۵ - ۳۱۶ -

[2] شیخ کلیم اللہ بن شیخ نور اللہ ۱۲ جمادی الثانی ۱۰۶۰ھ / ۱۶۵۰ء کو پیدا ہوئے نامور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی حدیث کی سند مدینہ منورہ جاکر حاصل کی۔ تمام عمر درس و تدریس میں گزاری۔ دور دور سے طلبہ تحصیل علم کے لئے آتے تھے۔ شیخ کلیم اللہ جہان آبادی صاحب تصانیف بھی تھے۔ ۱۱۴۲ھ / ۱۷۲۹ء میں انتقال ہوا۔ ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ص ۳۹۲ - ۳۹۵

[3] شاہ فخر الدین بن شیخ نظام الدین اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ علوم مروجہ کی تحصیل کی کچھ مدت سپاہ گری میں گزاری۔ پھر سیاحت کی۔ دہلی میں سکونت اختیار کرلی تھی وہیں تدریس و تذکیر کا سلسلہ شروع کیا۔ زمانہ شہزادگی میں اکبر شاہ ثانی و بہادر شاہ ثانی حلقۂ ارادت میں منسلک تھے۔ عماد الملک بھی ان کا مرید تھا۔ شاہ صاحب تفضیلی بزرگ تھے وہ شیعہ حضرات کو بھی بیعت کر لیتے تھے۔ امام باڑے جاتے، نذر حسین دیتے پانی کی سبیل لگاتے تھے ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۴ء میں انتقال ہوا۔ ملاحظہ ہو ملفوظات شاہ عبدالعزیز (اردو ترجمہ) کراچی ۱۹۶۰ء ص ۱۲۱ و فضائل صحابہ و اہل بیت از شاہ عبدالعزیز دہلوی (پاک اکیڈمی۔ ۱۲۴/۱ وحید آباد کراچی ۱۳۸۱ھ) ص ۷۵

خود حدیث از سرورِ دیں می رود — می رود زانکہ تا ایں می رود
سعیِ ما مشکور و نقدِ ما روا — چیست آں کاں را شماری ناروا
نکہتِ موئے مبارک جانفزا است — بارگِ جانش ہمی پیوند است
برتنِ نیکوتر از جاں رستہ است — لاجرم از آبِ حیواں رستہ است
دل نشینِ ما بود زاں روئے موی — وہ کہ گردانند کے زاں موئے روی
ہر کرا دل ہست و ایماں نیز ہم — چوں نو رزد عشق با نقشِ قدم[1]
در رہِ دیں تا قدم بنہادہ اند — عشق بازاں را نشانہا دادہ اند
برد از خویشم دو صد فرسنگ ننگ — می برم زیں نقشِ پا بر سنگ رنگ
نقشِ پائی کاینچنیں افتادہ است — اہلِ دل را دل نشیں افتادہ است
کے نشیند در دل آں بد گہر — کش دلے از سنگ باشد سخت تر
بوئے پیراہن ز مصر آرد صبا — دیدۂ یعقوب زد یابد جلا
بہر دادِ پیرہن کز مصطفیٰ است[2] — جاں نیفشاندن ز زانت کے روا است
در عرب بودست منعم زادۂ — قیس نامی دل بہ لیلےٰ دادۂ
بر سگے کز کوچۂ لیلیٰ ستے — قیس از خویشش فزوں تر خواستے
می توانی گفت ہاں اے تن پرست — پیرِ کنعاں بوئے پیراہن پرست
یا تواں گفتن کہ خود چوں بودہ است — سگ پرستی کیشِ مجنوں بودہ است
حاش للہ کاینچنیں باشد نبرد — رفتہ از حد سوءِ ظن کافر بکرد
عشق گر با پیرہن در بابد است — نیست بہرِ جامہ از بہرِ خدا است
حق فرستادست بہرِ ما رسول — کردہ ایم از بہرِ حق دینش قبول

---

[1] دہلی میں قدم شریف کی مشہور درگاہ ہے مجاوروں نے یہاں ایک فرضی زیارت گاہ قائم کر رکھی تھی اس کے فرضی ہونے کے متعلق ملاحظہ ہو۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت از محمد ایوب قادری (ادارہ تحقیق و تصنیف۔ کراچی ۱۹۶۳ء) ص ۲۱۰ - ۲۲۱

[2] برصغیر پاکستان و ہند کی بہت سی درگاہوں میں مجاور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب جُبّہ وغیرہ اور دوسرے بزرگوں سے منسوب ملبوسات وغیرہ کی زیارت کراتے ہیں۔

گر بسوی خواجه رو آریم ما   دوست از بہرِ حقش داریم ما
چون نگردد طالبِ دیدارِ دوست   شاد از نظّارهٔ آثارِ دوست
ای کہ بردی بہره از خوانِ نبی   بردهٔ از یادِ احسانِ نبی
آمد و آوردهٔ پیغام از خدا   لوحشَ اللہُ مرحبا نامِ خدا
جادهٔ راہی نمایان کرده رفت   راه رفتن بر تو آسان کرده رفت
چون تو کی از ناسپاسانیم ما   پیرو ایزدشناسانیم ما
حق پرستان جملہ این ره رفتہ اند   زان کہ بارِ لطفہاے آگر رفتہ اند
اصلِ ایمان نیست طرزِ خاص ما   خالصاً للہ بود اخلاص ما
عرس و این شمع و چراغ افروختن   عود در مجمر بر آتش سوختن
جمع گشتن در یکی ایوان ہمی   پنج آیت خواندن از قرآن ہمی
نان بنان خواہندگان دادن دگر   مرده را رحمت فرستادن دگر
گر پئے ترویجِ روحِ اولیاست   در حقیقت آن ہم از بہرِ خداست
اولیا را گر گرامی داشتیم   نز پئے رومی و شامی داشتیم
از برائے آنکہ این آزادگان   از رهِ ہمت جان بجانان دادگان
از شعورِ حق طرازی داشتند   با خدائے خویش رازی داشتند
نورِ چشمِ آفرینش بوده اند   شمعِ روشن سازِ بینش بوده اند
حق پرستان را بباطل کار نیست   محوِ لیلیٰ را بہ محمل کار نیست
گر نہ از لیلیٰ بود دیدار جو   کے بہ محمل آورد دیوانہ رو
گرچہ با لیلیست حرف از جان زدن   لیک بر محمل لگد نتوان زدن
آن ولی دریائے حق مستغرق ست   عینِ حق گر نیست خود محوِ حق ست
حق بود پیدا نہان دیگر چہ ماند   چون ولی رفت از میان دیگر چہ ماند
تمیز تا حدِ ادب داری نگاه   بے ادب را بر دمِ تیغست راه
با ولی آویختی دیوانهٔ   یا بر آتش ریختی پروانهٔ
نیستی حلوف کہ گویم خود مباش   بد مبین و بد مگوی و بد مباش
بد شمردی رہبرانِ پیش را   رہبرِ بیباک گفتی خویش را

گر سفر اینست منزل گہ کجاست   لا اگر گفتی الا اللہ کجاست
ہست رسم خاص در ہر مرز و بوم   خود چہ می خواہی ز نفی این رسوم
نفی رسم کفر ما ہم می کنیم   داد با دانش فراہم می کنیم
نفی کفر آئین ارباب صفاست   نفی نفی اے تیرہ دل رسم کجاست
نفی رسم درہ ہوا را می کشد   نفی نفیست اینکہ ما را می کشد
اے گرفتار ہم و پیچ خیال   نفی بے اثبات نبود جز ضلال
ور تو گوئی می کنم اثبات حق   از چہ روی منکر آیات حق
ور کنم انکار انکار آوری   ہیچ در زلف گفتار آوری
منکر اثبات گویے نیستم   من حریف این دو روئی نیستم
اولیا خاصان شاہی نیستند   یعنی آیات الہی نیستند
معجزات انبیا آیات کیست   دین صفتہا را ظہور از ذات کیست
دین و آن را ہرزہ انکاری ہمی   تا چہ از حق در نظر داری ہمی
چون ترا انکار تا این غایتست   آنچہ باید رفتنی کدامی آیتست
من نہ بد گفتم وگر گفتم مرنج   تو گرا بد گفتہ در دل بسنج
خواجہ دنیا رو دین را منکری   زمرہ اہل یقین را منکری
با دل رنجیدہ از کینہ پاک   منکرے را گر بوم منکر چہ باک
درد دل در نظم گفتن نیست بحث   منکر رندم شیوہ من نیست بحث
من سبکرو جر گران جان نیستم   عہد فشان پیداست پنہان نیستم
دین کرمی گوئی توانا کردگار   چون محمد دیگرے آرد بہ کار
با خداوند جہان گیتی آفرین   منع نبود ظہورے این چنین
نغز گفتی نغز تر باید شنفت   آنکہ پنداری کہ ہست اندر نہفت
گرچہ فرزند دودہ آدم بود   ہم بقدر خاتمیت کم بود
صورت آرائش عالم نگر   یک مہ و یک مہر و یک خاتم نگر
اینکہ می گویم جواب بیش نیست   مہر و مہ زان جلوہ تا بے بیش نیست
آنکہ مہر و ماہ و اختر آفرید   می تواند مہر دیگر آفرید

حق دو مہر از سوئے خاور آورد کور باد آں کو نہ باور آورد
قدرت حق بیش ازیں ہم بودہ است ہرچہ اندیشی کم از کم بودہ است
لیک در یک عالم از روئے یقیں خود نمی گنجد دو ختم المرسلیں
یک جہاں تا ہست یک خاتم بس ست قدرت حق را نہ یک عالم بس ست
خواہد از ہر ذرّہ آرد عالمے ہم بود ہر عالمے را خاتمے
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود رحمۃ للعالمینے ہم بود
کثرت ابداع عالم خوب تر یا بیک عالم دو خاتم خوب تر
در یکے عالم دو تا خاتم مجو صد ہزاراں عالم و خاتم بگو
غالب ایں اندیشہ نپذیرم ہمی خردہ ہم بر خویشتن گیرم ہمی
اے کہ ختم المرسلینش خواندۂ دانم از روئے یقینش خواندۂ
ایں الف لامے کہ استغراق راست حکم ناطق معنیٔ اطلاق راست
منشاء ایجاد ہر عالم یکیست گر دو صد عالم بود خاتم یکیست
خود ہمی گوئی کہ نور رش اوست از ہمہ عالم ظہور رش اوست
اوّلیت را بود شانے تمام کے بہر فرد وے پذیرد انقسام
جز بکل بر نتابد تشنیہ در محمد رہ نیابد تشنیہ
تا تو رزی اندر امکان ربو درنگ حیز امکاں بود بر مثل تنگ
نیم امکاں اندر احمد منزویست چوں ز امکاں بگذری دانی کہ چیست
صانع عالم چنیں کرد اختیار کش بعالم مثل نبود زینہار
ایں نہ عجز ست اختیار ست اے فقیہ خواجہ بے ہمتا بود لاریب فیہ
ہر کرا با سایہ نپسند د خدا ہم چو اوئے نقش کے بندد خدا
ہم کہ سر مہر منیرش چوں بود سایہ چوں نبود نظیرش چوں بود
منفرد اندر کمال ذاتیست لاجرم مثلش محال ذاتیست
زیں عقیدت برنگردم والسلام نامہ را در می نوردم والسلام

ابو سلمان شاہجہانپوری

غالب اور ۱۸۵۷ء کے مصائب

غالب سیاستداں نہیں تھے۔ وہ ایک شاعر تھے، اس لیے ان کا تعلق عملی دنیا کے مقابلے میں تخیلات، جذبات و احساسات کی دنیا سے زیادہ تھا۔ عملی دنیا سے ان کا تعلق تو صرف اتنا کہ تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے پر مامور تھے، جس کا انہیں پچاس روپیہ مشاہرہ ملتا تھا۔ بہادر شاہ ظفر نے انہیں نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ کے خطابات سے نوازا تھا۔ لیکن دوسری طرف وہ انگریزوں سے بھی مستفید تھے۔ ان سے انہیں پنشن ملتی تھی۔ انگریزوں نے اگرچہ انہیں کوئی خطاب نہیں دیا تھا لیکن خطوط و مراسلات میں انہیں "خان صاحب بسیار مہربان دوستان" لکھا جاتا تھا اور حکام اور افسران ان سے عزیزوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ اور جب کبھی دلی میں ... یا لفٹیننٹ گورنر کا دربار ہوتا تھا تو ان کو بھی منشی و دیگر رؤسا اور عمائد شہر کے بلایا جاتا تھا اور سات پارچے خلعت ... و مالا مروارید ... ان کو کوئی شاعر ... تھے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جو تحریک چلی اور اس کے نتیجے میں برصغیر ... کے باشندوں پر جو ... اور دلی پر جو مصیبت آئی اس سے غالب بھی متاثر ہوئے تھے۔ مولانا غلام رسول مہر صاحب نے لکھا ہے۔

> "یوں تو غالب کے ایام حیات کا کوئی ورق بھی ایسا نہیں جس کی سیاہی مصیبتوں اور دل شکستگیوں پر آہ و زاریوں کے دھوئیں سے تیار نہ ہوئی ہو یا جس کے بین السطور کی آرائش میں دل و جگر کا خون بے دریغ صرف نہ کیا گیا ہو، لیکن اس جلیل القدر انسان کے اندوہ و ماتم کا سب سے بڑا دردناک باب سلطنت تیموریہ کے زوال کا وہ خونچکاں واقعہ ہے جو عام طور پر غدر ۱۸۵۷ء کے نام سے معروف ہے۔"

غدر میں مرزا غالب گھر سے باہر نہیں نکلے۔ آخر تک بلیماراں میں حکیموں کی گلی میں بند رہے۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ قدم دروازے سے باہر نہیں نکالا۔ چودھری عبدالغفور خاں سرور مارہروی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "میں مع زن و فرزند اسی شہر میں قلزم خوں کا شناور رہا ہوں۔ دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا، نہ قید ہوا، نہ مارا گیا۔"

پٹیالہ کے مہاراجہ نریندر سنگھ کے انگریزوں سے تعلقات تھے ۔ انھوں نے انگریزوں کی مدد کی تھی ۔ انھیں اس امر کا شروع ہی سے یقین تھا کہ اس جنگ میں فتح انگریزوں ہی کی ہو گی اس لیے انھوں نے انگریزوں سے پہلے لیا تھا کہ ان کے وابستگان دامن سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا ۔ چنانچہ ہنگامہ شروع ہوا تو مہاراجہ پٹیالہ نے حکیموں والی گلی میں جہاں حکیم شریف خاں مرحوم کا خاندان رہتا تھا اپنے محافظ مقرر کر دیئے ۔ مہاراجہ کے اس خاندان سے خاص تعلقات تھے اور غالب ان کے پڑوسی تھے ان کی وجہ سے غالب بھی بڑی مصیبت اور دار و گیر سے بچ گئے ۔ دستنبو میں لکھتے ہیں :

" مہاراجہ نریندر سنگھ والی پٹیالہ اس جنگ میں انگریزوں کے ساتھ تھے اور ان کی فوج شروع ہی سے انگریزوں کی مدد کر رہی تھی ۔ حکیم محمود خاں ، حکیم مرتضیٰ خاں اور حکیم غلام اللہ خاں جو حکیم شریف خان کی اولاد میں سے ہیں ان میں سے دو آخر الذکر مہاراجہ کے خاص ملازم تھے اور انھیں شہر کے باعزت لوگوں میں سے سمجھا جاتا تھا ۔ ان میں سے حکیم محمود خاں متعلقین اور اہل خانہ کے ساتھ اپنے بزرگوں کی طرح باعزت زندگی بسر کرتے ہیں ۔ میں دس سال سے ان کا پڑوسی ہوں ۔ چونکہ مہاراجہ کو اس امر کا شروع ہی سے یقین تھا کہ انگریز دوبارہ دہلی پر قبضہ کر لیں گے ۔ چنانچہ انھوں نے انگریزوں سے طے کر لیا تھا کہ جب دہلی فتح ہو گی تو حکیموں کی گلی کے دروازے پر پٹیالہ کے محافظ مقرر کر دیئے جائیں تاکہ اس میں رہنے والوں کو کسی قسم کا کوئی گزند نہ پہنچے ۔"

لیکن غدر کی تباہی ایسی ہمہ گیر تھی کہ یہ ممکن نہ تھا کہ پورا ملک اور بالخصوص دہلی اس کی لپیٹ میں آ جائے اور حکیموں کی گلی اس سے محفوظ رہے ۔ اس ابتلا کا نقشہ بھی غالب نے کھینچا ہے ۔ گلی کے دروازے میں پتھر چن کر رستہ بند کر دیا گیا اور گھروں میں بیٹھ رہے ۔ باہر کی لوٹ مار سے محفوظ ہو گئے لیکن غلے اور پانی کا اتنا ذخیرہ کس گھر میں تھا جو مہینوں چل سکتا اور ختم نہ ہوتا جس قدر سامان گھروں میں تھا تھوڑے دنوں میں ختم ہو گیا اب نہ آٹے کی چکی رہی نہ پینے کے لیے پانی تھا ۔ غالب لکھتے ہیں ۔

" گھروں میں کھانے پینے کا جس قدر سامان تھا رفتہ رفتہ ختم ہو گیا ۔ پانی اگرچہ احتیاط سے پیا گیا لیکن پانی کی بھی ایک بوند نہ رہی ۔ عورتوں اور مردوں کی زبان پر پیاس کی شدت سے آبلے پڑ گئے ۔ سامان خورد و نوش کہاں سے آتا ۔ دو شبانہ روز بھوکے پیاسے رہے ۔ ذلت ، محتاجی ، بے کسی و بے چارگی اور پریشان حالی پر جس قدر افسوس کیا جائے سو کم ہے ۔"

انھیں دنوں میں غالب نے اپنے روزنامچہ دستنبو میں لکھا کہ ۔

آج کل ہم لوگ اپنے آپ کو قیدی سمجھ رہے ہیں ۔ ... نہ کوئی آ سکتا ہے کہ بات سننے کو ملے نہ خود باہر جا سکتے ہیں کہ سارے واقعات دیکھیں ۔

غالب کا گھر اور اس کا اثاثہ انگریزوں کی عام لوٹ سے محفوظ رہا لیکن اس کے باوجود ان کا گھر صاف ہو گیا ۔ ہنگامہ شروع ہوتے ہی ان کی بیوی نے اپنا سامان زیور گھر کے قریب ایک ویران مکان میں دفن کر دیا تھا ۔ سوچا تھا کہ ویران مکان میں کون جائے گا لٹیروں اور فوجیوں کی توجہ آباد اور بھرے گھروں کی طرف ہو گی لیکن وائے کم نصیبی کہ آباد گھر لٹنے سے محفوظ رہا اور ویران گھر سے مال غالب

ہوگیا۔ نہ معلوم کس کے ہاتھ لگا۔ لیکن ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ان کی بیوی کے پاس چاندی کا چھلا تک نہ رہا۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ مئی میں شروع ہوا تھا۔ آخر سال تک نفسی نفسی کا عالم رہا۔ لوگوں نے کیسے گذر کی ہوگی اس کا اندازہ کچھ مشکل نہیں۔ غالب کے خطوط میں اور ان کی کتاب دستنبو میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ تاریخ کی کتابیں ان روح فرسا واقعات اور انگریزوں کے ظلم و ستم کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔

اکتوبر میں ایک روز چند انگریز مرزا صاحب کے مکان میں بھی گھس آئے۔ مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں نے ہر چند انھیں روکا لیکن بات ان کے قابو سے باہر تھی۔ غالب کو، ان کے بچوں کو، ملازموں کو اور چند پڑوسیوں کو پکڑ کر لے گئے اور کرنل براؤن کے سامنے پیش کیا۔ مرزا صاحب کی زندگی میں کوئی خوشی باقی نہ رہی تھی لیکن زندہ تھے اور جینے کا ڈھنگ سیکھ لیا تھا۔ کرنل براؤن کچھ ان کے بڑھاپے سے، کچھ ان کی حالت زار سے اور کچھ ان کے انداز گفتگو کی ظرافت سے متاثر ہوا۔ رحم کھا کر انھیں اور ان سب کو جنھیں ان کے ساتھ پکڑا گیا تھا چھوڑ دیا۔ مرزا غالب لکھتے ہیں۔

"کرنل براؤن مجھ سے نہایت شرافت سے پیش آیا، مہذب طریقے سے بات چیت کی۔ مجھ سے نام اور پیشہ دریافت کیا اور اطمینانؔ سے گھر جانے کی اجازت دی۔ خدا کا شکر ادا کیا اور بہ سلامت لوٹ آیا۔"

۱۸۵۷ء میں غالب پر مصیبتوں کا سلسلہ بہت دراز رہا۔ ایک مصیبت سے نجات نہ ملی تھی کہ دوسری ابتلا میں پڑ جاتے تھے۔ جس دن انھیں انگریزوں نے پکڑا اور زندہ بچ کر لوٹے تھے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ لیکن آلام و مصائب نے ان کا گھر دیکھ لیا تھا۔

۹۔ اکتوبر کو مرزا غالب پر غم کا ایک پہاڑ ٹوٹا۔ ان کے بھائی مرزا یوسف کا ملازم آیا اور خبر دی کہ وہ پانچ روز تیز بخار میں مبتلا رہ کر راہیٔ ملک عدم ہوئے۔ پانی، کفن، اشنان، گورکن، اینٹ، چونے، گارے وغیرہ کا انتظام سخت مشکل تھا۔ لیکن پڑوسیوں کو غالب کی بے کسی اور تنہائی پر رحم آیا اور اس کے باوجود کہ گھر سے قدم نکالنا اپنے آپ کو سخت خطرے میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ چند آدمیوں نے ہمت کی پٹیالہ کے محافظوں میں سے ایک سپاہی کو آگے کیا۔ نوکروں اور پڑوسیوں نے میت کو غسل دیا۔ گھر سے دو سفید چادریں ساتھ لے گئے تھے۔ ان میں پیٹا۔ قبرستان تک جانا ممکن نہ تھا۔ قریب کی مسجد میں دفن کیا۔ اہل ملک اور دہلی والوں پر جو بیت رہی تھی اس کا غم بھی غالب کا اپنا غم تھا۔ تفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔"

کیا حاصل کہ غالب کی اس داستان الم کو دراز کیا جائے۔ ان کے خطوط میں یہ داستان پوری شرح و بسط کے ساتھ موجود ہے۔ ہاں کسی ایک جگہ نہیں، ٹکڑوں میں ہے۔ کہیں کسی کے نام کوئی اشارہ ہے کہیں کسی کے نام کچھ تفصیل ہے۔ حالات و واقعات کا کوئی پہلو نہیں جو نہ آگیا ہو انھوں نے اس تباہی پر کوئی مرثیہ نہیں لکھا لیکن متفرق طور پر ان کے کلام میں بھی یہ داستان الم کی جو تفاصیل اور اشارات ملتے ہیں وہ کسی پُر درد مرثیے سے کم بھی نہیں اور یہ اشارات اتنے واضح اور تفاصیل اتنی کافی ہیں کہ ہم مرثیے کے عدم وجود کا شکوہ نہیں کر سکتے۔ یوسف مرزا کے نام ایک

خط میں لکھتے ہیں ۔

”میرا حال سوائے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا ۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں عقل جاتی رہتی ہے اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے ۔ پوچھو کہ غم کیا ہے غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت، غمِ مرگ میں قلعۂ نامبارک سے قطعِ نظر کر کے اہلِ شہر کو گنتا ہوں ۔
مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ، میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد مرزا انیس برس کا بچہ مصطفیٰ خان ابن اعظم الدولہ اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ، کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا۔ اے لو بھول گیا حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین میکش، اللہ اللہ ! ان لوگوں کو کہاں سے لاؤں ؟“
مصائبِ غدر اور مرزا غالب کے عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے لکھا ہے ۔
” غدر کی تمام بربادیاں اور اس قلعۂ دہلی کی تمام خونریزیاں ایک ایک کر کے ان کی آنکھوں کے سامنے گزر گئیں ۔ ہندوستان میں ششصد سالہ حکومتِ اسلامی کا آخری نقشِ قدم تھا کہ بہادر شاہ خود کچھ نہ تھا لیکن اس کی بقا سے عظمت و جبروتِ اسلامی کی ایک بڑی روح زندہ تھی ۔ اس کے مٹنے سے اکبر و شاہجہاں کا گھر بے چراغ ہو گیا ۔ اس کا تخت در حقیقت [illegible] تیمور و آلِ بابر کا تخت تھا ۔

مرزا غالب نے عمر بھر بہادر شاہ کی لاحاصل مداحی کی تھی ۔ اور وہ قصیدے جو عرفی و نظیری کے قصائد سے مقابلے کا دم رکھتے تھے ایک ایسے مخاطب کے سامنے ضائع کئے تھے جس کے سر پر جہانگیر و شاہجہاں کا تاج تو ضرور رکھا، پر نہ تو عرفی و نظیری کی قدر شناسی کا مادہ تھا اور نہ کلیم کو زرِ خالص سے تلوا کر بخشش کرنے والا خزانہ ۔ ۔ ۔ چنانچہ ان کے اکثر قصائدِ مدحیہ کی تشبیبوں میں علی الخصوص اس قصیدہ کی تشبیب میں جو [illegible] کے دیباچے میں حضرت بہادر شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہے ۔ اس سوز و دردی اور اس آتشِ پنہانی کی گرمی صاف محسوس ہوتی ہے جس کا شعلہ کاروانِ عظمت کے اس آخری مسافر کو دیکھ کر بے اختیار ان کے دل میں بھڑک اٹھتا تھا ۔ اور جس کو وقت کی رائلٹی اور انگریزی حکومت کے ذریعے وظیفہ حاصل کرنے کے تعلق نیز ایک حد تک طبیعت کی شاعرانہ طماعی و ہوسناکی نے غالب اکثر بظاہر پوشیدہ و افسردہ کر دیا تھا ۔

فتحِ دہلی کے بعد جو عالمگیر اور عدیم النظیر مصیبت اشراف و اعیانِ شہر پر نازل ہوئی اور جس طرح شاہجہاں آباد کی ان سڑکوں پر جہاں کبھی صاحبقرانِ اعظم کی سواری کے لئے جمنا کے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا مسلمانوں کے خون کے فوارے چھٹے مرزا غالب نے دہلی میں رہ کر اس کے تمام مناظرِ خونیں اپنی آنکھوں سے دیکھے اور ان چیخوں کو اپنے کانوں سے سنا جو عرصے تک دار الخلافہ کی گلیوں اور گھروں سے بلند ہوتی رہی تھیں ۔ ۔ ۔

علی الخصوص قلعۂ معلیٰ کی بربادیاں جن کے لئے اگر تمام حیواناتِ ارضی کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں ، اور جن کے غم میں اگر آسمان سے پانی کی جگہ خون برستا ، جب بھی ان کے ماتم کا حق ادا نہ ہوتا ۔ وہ اجاڑ خرابہ و ربیعہ جو تیمور و بابر کی یادگار اور اکبر اعظم صاحبقراں

ثانی کے خون عظمت وجبروت کے حامل تھے جنھوں نے چھ صدیوں سے متصل شہنشاہی اور فرمانروائی کی گود میں پرورش پائی تھی۔ جنھیں حکم و سلطنت کے عیش و اجلال کے سوا کسی مصیبت کا کبھی تصور بھی نہ ہوا تھا اور جو ہمیشہ ان کروڑوں انسانوں کو جن کی آبادیاں کابل سے کوہستان سے لے کر آسام کے جنگلوں تک پھیلی ہوئی تھیں اپنے سامنے سربسجود پاتے تھے۔ کون تھا جو سنگ و آہن کا دل و جگر پیدا کر کے بھی یہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح گلیوں میں مارے جائیں اور ان کی لاشیں اس عظمت رفتہ کا افسانۂ ماتم سنائیں جو چند روز پیشتر تک دنیا میں صرف انھی کے لیے تھی۔۔۔

لیکن یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کے لیے مرزا غالب دہلی میں زندہ تھے اور دیکھتے رہے تھے۔ یہ حوادث ہیں جن پر غیروں کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آتے ہیں۔ ممکن نہ تھا کہ مرزا غالب جیسے غم دوست شاعر نے یہ سب کچھ دیکھا ہو اور اس کے دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو گئے ہوں۔

گو ضرورت و احتیاج نے انھیں انگریز حکام اور گورنروں کی چوکھٹوں پر گرا دیا تھا اور مدحیہ قصائد لکھوائے تھے۔ تاہم مرزا صاحب "مشفق و مہربان" کے خطاب اور ساٹھ ستر روپیہ کا خلعت اس زخم کاری کا مرہم تو نہیں ہو سکتا تھا جو حوادث غدر سے ان کے دل پر لگا ہوگا۔ ایک ضعیف الارادہ انسان وقت اور احتیاج سے مجبور ہو کر صدہا باتیں اوپرے دل سے کر بیٹھتا ہے مگر کچھ اس سے دل کے اصلی محسوسات و جذبات ٹل نہیں سکتے۔ علی الخصوص ایسے حادثۂ کبریٰ اور مصیبت عظمیٰ کے موقع پر جس کو دیکھ کر بڑے بڑے غدار وملت فروش دلوں سے بھی آہیں نکل گئی ہوں گی۔"

مولانا حسرت موہانی

غالب کی شاعری

مرزا کا کلام شاعری کے عام محاسن کے اعتبار سے ہی ممتاز نظر آتا ہے۔

استعاروں کی ندرت تشبیہوں کی تازگی اور اشاروں کی نزاکت و لطافت کی مثالوں سے مرزا کا دیوان بھرا پڑا ہے۔

عامیانہ مذاق اور مبتذل بازاری الفاظ بندش اور تعقید سے مرزا کا کلام بالکل پاک ہے مرزا کی شاعری عاشقانہ ضرور ہے لیکن انھوں نے عشق کے معنی داغ دہلوی یا امیر مینائی کی مانند بوالہوسی کے نہیں لیے ہیں اور اس لیے ان کے خیالات میں دنائت اور پستی کے بجائے متانت اور شائستگی کی ایسی شان پائی جاتی ہے جس کی مثال شعرائے لکھنؤ کے کلام میں ناپید ہے اور متاخرین شعرائے دہلی کے کلام میں کمیاب ہے۔

غالب

نعت

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ ست
آری کلامِ حق بزبانِ محمدؐ ست

آئینہ دارِ پرتوِ مہر ست ماہتاب
شانِ حق آشکار زشانِ محمدؐ ست

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق ست
اما کشاد آں ز کمانِ محمدؐ ست

دانی اگر بمعنیِ لولاک وا رسی
خود ہر چہ از حق ست از آنِ محمدؐ ست

ہر کس قسم بدانچہ عزیز ست می خورد
سوگندِ کردگار بجانِ محمدؐ ست

واعظ حدیث سایۂ طوبیٰ فرو گذار
کاینجا سخن ز سروِ روانِ محمدؐ ست

بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را
کاں نیمہ جنبشی ز بنانِ محمدؐ ست

در خود ز نقشِ مُہرِ نبوت سخن رود
آں نیز نامور ز نشانِ محمدؐ ست

غالب ثنائے خواجہ بیزداں گذاشتم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ ست

الحاج محمد زبیر
لائبریرین، نیشنل کالج کراچی
سابق اسسٹنٹ لائبریرین مسلم یونیورسٹی لائبریری علیگڈھ

غالبؔ کا کتب خانہ

ممکن ہے کہ اِس کتب خانہ کا نام سُنکر حیرت واستعجاب کے ساتھ کہا جائے کہ یہ کیسا عجیب کتب خانہ ہے جس کا ذکر تو کبھی نہیں سُنا اور اب غالبؔ کی وفات کے سو برس بعد یہ" العلم" کے صفحات پر نظر آ رہا ہے۔ یہ ذکر موجب حیرت تو بن سکتا ہے مگر اس مرحوم کتبخانہ کے وجود کو بعید از قیاس سمجھ لینا مناسب نہیں معلوم ہوتا بہت سی چیزیں دائرۂ علم سے باہر رہتی ہیں پھر بھی ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ غالبؔ جیسے زبردست شاعر انشاء پرداز اور مصنّف کے پاس کتب خانہ موجود نہ ہو، وہ غالبؔ جس کی ذہانت اور جدت پسندی نے شاعری کو آفاقیت اور نُدرت بخشی، جس کی ظرافت اور بذلہ سنجی نے زبان و بیان کو شوخ و شگفتہ بنایا جس نے اُردو نثر کو خطوط نویسی کے تو وہ انوکھے انداز سکھائے جن سے وہ پہلے بالکل ناآشنا تھی۔

غالبؔ کے خطوط میں جا بجا ایسے اندراجات ملتے ہیں جس سے یہ خیال یقین تک پہونچ جاتا ہے کہ غالبؔ کے پاس کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا مثلاً انھوں نے (ہرگوپال تفتہ) کو ایک خط میں لکھا ہے کہ" چھت چھلنی ہو گئی قلمدان کتابیں اُٹھا کر توشہ خانہ کی کوٹھری میں رکھدئے" یہی بات انھوں نے میر مہدی مجروح کو بھی لکھی ہے۔ غرض خطوطِ غالبؔ میں کتابوں کے یہ ذکر غالب کے پاس کتب خانہ ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ یہاں یہ خیال رکھئے کہ اس زمانہ میں لفظِ کتب خانہ بالعموم استعمال نہیں ہوتا تھا عام طور پر کتابوں سے مراد کتب خانہ ہی ہوا کرتی تھی قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں بھی بقول اسکارٹ کتب خانوں کی یہی کیفیت تھی کہ جہاں کچھ کتابیں جمع کر کے رکھدیں وہی کتب خانے کہلائے جانے لگے اور بعض صورتوں میں تو صرف اٹھارہ کتابوں کے ذخیرہ کو بھی ایک کتب خانہ کہا گیا ہے ایسی صورت میں غالبؔ کے ذخیرۂ کتب کو کتب خانہ کہنا بے جا نہ ہوگا بلکہ نہ کہنا سراسر بے انصافی ہوگی۔

غالب جیسے علم دوست اور تاریخ ساز شخصیت کے پاس کتب خانے کا ہونا اس لئے اور بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں کتابیں جمع کرنے کا شوق ایسا پھیلا ہوا تھا کہ مسلمانوں کے ہر گھر میں کم از کم حدیث و وظائف شعر و شاعری اور قصے کہانیوں کی کتابیں تو ہوا ہی کرتی تھیں اور اس وقت دہلی کا حال یہ تھا کہ ہر طرف مدارس اور کتب خانے موجود تھے یہیں غالب کے شاگرد عزیز رخشاں (نواب ضیاء الدین خاں رئیس لوہارو) کا کتب خانہ اتنا نفیس تھا کہ مورخ الیٹ (ELLIOTT) نے اپنی کتاب ہسٹری آف انڈیا لکھنے میں اس سے استفادہ کیا تھا۔

دراصل نیر کا کتبخانہ ہی غالب کا کتب خانہ سمجھنا چاہیئے۔ غالب کا اپنا مکان نہ تھا کرایہ کے مکان میں رہتے تھے جس کی چھتیں برسات میں چھلنی کی طرح ٹپکتی تھیں ایسے بوسیدہ مکان میں کتابیں رکھنے سے ان کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا اسی لئے انھیں غالب نے اپنے شاگرد اور قریبی عزیز نیر کے کتب خانہ کے ساتھ رکھوا دیا تھا استاد اور شاگرد کے یہ دونوں ذخیرہ کتب ایک قالب میں دو جان کی طرح ایسے وابستہ ہو گئے کہ استاد کے ذخیرہ کی جداگانہ حیثیت باقی نہ رہی اس سلسلہ میں غالب کا یہ خط پڑھئے اس خط میں حضرت صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں۔

میرا ایک نسبتی بھائی ہے نواب ضیاء الدین خاں سلمہ اللہ تعالیٰ وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا تھا چنانچہ مجمع نثرین اور کلیات نظم فارسی اور کلیات نظم اردو سب نسخے اس کے کتب خانے میں تھے وہ کتب خانہ کہ میں کرو عرض کرتا ہوں بیس ہزار مالیت کا ہوگا لٹ گیا ایک ورق نہ رہا" مرزا حاتم علی مہر کو بھی یہی لکھا ہے کہ میرا کلام میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا ضیاء الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے جو میں نے کہا انہوں نے لکھ لیا ان دونوں کے گھر لٹ گئے ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہو گئے نیر کے کتب خانہ کی تباہی کا ذکر اپنے کئی خطوط میں کیا ہے منشی شیو نرائن آرام کو بھی لکھا ہے کہ کتبخانہ خوان یغما ہو گیا ہر چند میں نے آدمی دوڑائے کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب ملتی نہ آئی۔

اس زمانہ میں کتبخانوں کی لوٹ مار کی وجہ سے لوگ اپنے ذخیرہ کتب کو سینوں سے لگا کر رکھتے تھے اور کوئی کتاب مستعار بھی دینے کو راضی نہ ہوتے تھے اس کیفیت کا اندازہ اس خط سے بھی ہوتا ہے جو غالب نے تفضل حسین کو لکھا ہے۔

"کیوں صاحب یہ چھپا چھپایا ہونا اور شاگردی و استادی سب پر پانی پھیر دیا گیا اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے میرا کلام خریدا آٹھ دس روپیہ کی سودہ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھکو دے ڈالو تم کو مبارک رہے مجھکو مستعار دو میں اس کو دیکھ لوں جو میرے پاس نہیں ہے اس کی نقل کر لوں پھر تم کو واپس بھیجدوں، وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دیدو واللہ میں ان میں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کر کے تمکو بھیجدوں گا اگر تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت اور اگر تم میری قسم نہ مانو اور کتاب حامل رقعہ کو نہ دو تو تم کو آفرین"

اس زمانے میں ہندوستان کے باہر بھی یہ حال تھا کہ بالعموم کتاب مستعار جا کر واپس نہیں آتی تھی عہد غالب کے ایک عربی شاعر الرباط (ساکن حلب) نے اپنے اشعار میں یہ کہا ہے۔

"کسی کو کتاب نہ دو بلکہ عذر کر لیا کرو اگر تم میرے کہنے پر توجہ نہ کرو گے تو یقیناً تم اپنی کتابیں گم کر دو گے۔"

غالب کو مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ ابتدائی عمر سے لیکر آخری عمر تک تقریباً ۶۰ برس کتب بینی کرتے رہے۔ زندگی کا بالکل آخری دور ہے بیماری نے ضعیف و ناتوان کر دیا ہے بینائی کمزور ہو گئی ہے پھر بھی مطالعہ میں مصروف ہیں۔ ان کے شوق کی کیفیت خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کی زبانی سنئے جب وہ غالب سے ملنے گئے تو انہوں نے یہ دیکھا کہ ایک کمرہ میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی اس پر ایک نحیف الجثہ آدمی، گندمی رنگ، اسی بیاسی سال کا ضعیف العمر لیٹا ہوا ایک مجلد کتاب سینے پر رکھے آنکھیں گڑوئے ہوئے پڑھ رہے تھے۔ یہ مرزا غالب دہلوی ہیں جو بگمان غالب "دیوان قاآنی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔"

غالب اقبال کی طرح کردار کے غازی نہ بن سکے لیکن اردو ادب میں ان کے کارناموں نے انہیں امر کر دیا۔ اردو مکتوب نگاری کی تو ابتدا ہی ان سے ہوئی انھوں نے زبان و قلم کو وہ اعجاز و شعور بخشا کہ خطوط کے توسل سے مجسم معانی کھنچ کے سامنے آنے لگے بقول غالب "مراسلے کو مکالمہ بنا دیا" اور بیٹھے ہوئے زبان قلم باتیں کیا کیجئے۔"

یہ واقعہ ہے کہ مطالعۂ کتب کے معاملے میں غالب فنا فی الکتب تھے نیز کا کتب خانہ تو ان کا اپنا ہی کتب خانہ کہیئے اس کے علاوہ کرایہ پر منگا کر پڑھتے، مستعار لیکر پڑھتے جب اپنے پسند کی کتابیں مل جاتیں تو شاداں و فرحاں ہو جاتے میر مہدی مجروح کو اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں۔

"غالب ان دنوں بہت خوش ہیں پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی آگئی ہے سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشہ خانہ میں موجود ہیں دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں رات کو شراب پیا کرتے ہیں"

سچ تو یہ ہے کہ غالب کے سامنے پیمانۂ صہبا رکھ دیجئے اور پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار۔

ان قصے کہانیوں اور شعر و ادب کی کتابوں کے علاوہ مذہب اور حکمت و نجوم کی کتابیں بھی پڑھا کرتے تھے فارسی شعراء میں نظیری، عرفی، بیدل کا کلام بہت پسند تھا اور تصوف سے تو ایسا گہرا لگاؤ رکھتے تھے کہ خود اپنے آپ کو مخاطب کرکے یہ کہدیا

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب   تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب کی ذہانت اور شوق کتب بینی کا یہ حال تھا کہ بارہ برس کی عمر میں فارسی شعر کہنے لگے اتنی کم عمری میں ظہوری اور دوسرے مستند شعراء کی کتابیں پڑھا کرتے تھے خود غالب کہتے ہیں "بارہ برس کی عمر سے کاغذ نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں" مطالعہ کتب کے اس شیدائی کے پاس اچھی اچھی کتابوں کا جمع ہونا کوئی ظنی و خیالی بات نہیں اور اسے ایک قاعدۂ کلیہ کے طور پر پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ جب کسی شائق کتب شاعر یا مصنف کا کتب خانہ کہیں نظر نہ آئے اور تاریخ بھی اس باب میں خاموش ہو تو بھی ان کی علمی و تصنیفی سرگرمیوں کے پیش نظر ان کے پاس کتب خانے کا ہونا لازمی سمجھ لینا مبالغہ نہ ہوگا اس لئے کہ ان کاموں کی جان کتاب ہے اور ان سے اس وقت

استفادہ کیا جاسکتا ہے جب انہیں کتب خانوں کی شکل میں رکھا جائے اب اسے کوئی مانے یا نہ مانے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان اصولوں کی روشنی میں غالب کو کتب خانہ سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا اور اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ غالب ہمہ تن ایک دبستان تھے ایک چلتا پھرتا کتب خانہ

ان جیسے صاحبِ علم کو یہ بھی معلوم تھا کہ اسی دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاء، ہمایوں، شاہجہاں اور عالمگیر وغیرہ کے کیسے کیسے نادر روزگار کتب خانے برباد ہوگئے غلام قادر روہیلہ نے تو یہ ظلم ڈھایا کہ شاہ عالم کی آنکھیں نکالنے کے وقت شاہی کتبخانہ کی کتابیں بھی لوٹ کرلے گیا تھا۔ اور ۱۸۵۷ء کا زمانہ غالب کے لئے روزِ سیاہ سے کم نہ تھا وہ خود کہتے ہیں

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

اس تاریک دور میں جان ومال اور عزت وآبرو سب خطرے میں پڑے ہوئے تھے کتب خانے بھی جان کنی کے عالم میں تھے ان کی لوٹ کھسوٹ ہوتی رہتی تھی جو کتابیں بربادی سے بچ جاتیں انھیں انگلستان منتقل کردیا جاتا غالب نے دہلی کے مفتی صدرالدین (متوفی ۱۸۶۸ء) کے کتب خانہ کا افسوسناک حشر دیکھا تھا غدر کے فتوے پر دستخط کرنے کے اتہام میں ان پر مقدمہ چلایا گیا وہ تو بری ہوگئے مگر ان کے کتبخانہ کو رہائی نہ ملی اسے ضبط کرلیا گیا۔ دہلی کالج کے کتب خانہ کی غارت گری کا منظر بھی بڑا المناک تھا اسے لوٹا گیا کتابوں کے اچھے اچھے پٹھے جلدسازوں کے ہاتھ بیچ دئے گئے اور باقی کو پھاڑ کر پھینک دیا گیا اور یہ بات رنج وملال کے ساتھ سننے کی ہے کہ اس بربادی میں خود دہلی والے بھی شریک ہوگئے تھے ان ہی کے ہاتھوں بہادر شاہ ظفر کے پیر ومرشد حضرت شاہ فخرالدین کی اولاد کے کتب خانے پر جو بیتی وہ بھی ایک المیہ ہے یہ اس زمانہ کے بہترین کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا اس کی کتابیں لوگ چوری کرکے لیجاتے اور حضرت کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھاکر یہ خود ان ہی کے ہاتھوں بیچ جایا کرتے تھے۔

ضیاءالدین خاں نیّر کے کتب خانہ کا انجام بھی غالب کے الفاظ میں سامنے آچکا ہے کہ لٹ گیا اور ایک ورق نہ رہا اسی بدنصیب کتبخانہ کے ساتھ غالب کا ذخیرۂ کتب بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا یہاں یہ بات بھی سن لیجئے کہ جب خود غالب اس تاریک دور میں اپنے رہنے کے لئے بے در و دیوار کا ایک گھر[1] بنانا چاہتے تھے جہاں ہم زبان و ہم سایہ تک کا گزر نہ ہوسکے اور مرنے کے بعد بھی غرقِ دریا[2] ہوکر بے نام ونشان رہ جانا پسند کرتے تھے پھر وہ اپنی محبوب کتابوں کا اجاگر اور نمایاں کرکے رکھنا کیسے گوارا کرلیتے۔ انھوں نے اسے اپنے شاگرد کے کتب خانہ میں ضم کرکے گوشۂ گمنامی میں محصور کردیا تھا۔

۱؎ غالب نے اپنی ان دونوں خواہشوں کا اظہار اپنے ان اشعار میں کردیا ہے

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

۲؎ ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

فضل احمد صدیقی ایم اے

ع چھیڑ غالب سے چلی جائے

نام اسد اللہ خاں ولد مرزا عبداللہ بیگ خاں، تخلص اسدؔ ثم غالبؔ قوم ترک، ساکن دلی کے تھے۔ آگرہ میں ننھیال لوہارو میں سسرال تھی اور وہیں دادھیال، رنگ چنپئی، قد انگشت نما، داڑھی رکھتے مسّی لگاتے تھے، پھر دونوں کو چھوڑ بیٹھے اور کہتے ہیں کہ جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا۔ اتفاق دیکھئے کہ اسی دن ہنگامۂ غدر کے اولے پڑے اور نمک حراموں نے حویلیوں کی نیو ڈالی۔

مرزا غدر سے برسوں پہلے پیدا ہوئے تھے، غدر کے برسوں بعد مرے۔ ایام غدر میں ایک سن ستاون بچا تھا۔ مرزا جیتے تھے لیکن ہارے ہوئے پہلوان کی طرح دلِ بیدست و پا افتادہ، ہو بہو برخوردار بستر بنے پڑے تھے۔ اس حالت میں چیکے چپکے آم اور حقہ چوستے اور بیسنی روٹی تناول فرماتے تھے۔ غلّہ کی راشن بندی ہو جانے کے باعث شاید جوار باجرہ بھی مہینوں نہ ہر مار کیا۔ آخر میں غلہ کی بجائے کپڑے ہی کھانے لگے تھے۔ پھر بھی پوری نہ پڑی تو چیخیں مار مار کر کہنے یہ مانا کہ دلی میں رہیں پر کھائیں گے کیا، الاپتے ہوئے بیابانوں میں نکل گئے۔ جانے کے بعد خود ان کے در و دیوار پر سبزی ترکاریاں اُگ آئی تھیں۔ لیکن واہ رے مرزا پلٹ کر بھی نہ دیکھا

مرزا غالبؔ کا آبائی پیشہ سپہ گری تھا لیکن گورے سپاہیوں سے دہشت کھا کر رہ گئے۔ خیر سے عام لام بندی کے ساتھ عام لوٹ کھسوٹ کا زمانہ تھا۔ اس لئے بھی اور کچھ اس لئے بھی کہ خود اپنی جوانی کو ننگ پیری سمجھتے تھے۔ زنگری ڈن چھوڑ شاعری پر اُتر آئے تھے جسے کبھی ذریعہ عزت نہ جانا۔ تقدیر سے مرزا نے مزاج بھی پایا تھا تو ملتمی جیسے گرمی ہی راس تھی۔ اس لئے پانی کم، شراب زیادہ پیتے تھے۔ نقد کم اُدھار زیادہ کھاتے تھے۔ یعنی آج اُدھار کل نقد کے قائل تھے۔ مستغنی المزاج اتنے تھے کہ تادم مرگ قرضخواہوں کو اُلجھائے رکھا۔ ظاہر ہے کہ کبھی نہ آمدنی رکی نہ قرض روکا۔ نہ سود کی تکرار

ٹھہری، نہ ہاتھ رُکا۔ ہاتھ سے زیادہ زبان کے جوہر دکھائے گئے ہیں۔

مرزا کی زبان کے جوہروں کا حال یہ ہے کہ وہ کبھی دشنہ دخنجر کے بغیر نہ رہتے تھے اور اکثر ایسا ہوا کہ جس سے اُنھوں نے بات کی اس نے شکایت ضرور کی۔ تاہم ان کا دُرِ مقصود سرحدِ ادراک سے پرے ہوتا تھا۔ اس لئے سُننے سمجھنے والے زیادہ سرحدی پٹھان ہی تھے باقی سرحد کے پار شنیدن کے جال بچھائے کھڑے رہ جاتے تھے۔ ازیادہ سُخن فہم لوگ ان کا بیشتر کلام ادق بمنزلۂ مہمل کے بتاتے ہیں۔ اس صورت حال سے گھبرا کر مرزا نے اپنے شعروں کا انتخاب خود کرنا چاہا تو اور زیادہ رسوائی بڑھی ناچار خجل ہو کر کہہ ہی اُٹھے کہ ؏

بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است　　"بے رنگ"

ان کے اُردو مجموعۂ اشعار کا ابتدائی نام سا معلوم ہوتا ہے۔ ایہام تحقیق طلب ہے۔ بایں ہمہ مرزا کسی دوسرے کے اعتراض کی تاب نہ لاتے تھے کہ صلہ وستائش کی تمنا ہی کب تھی؟ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ برسرِ مشاعرہ کسی عیش پسند حکیم نے کسی ہدہد کی چونچ میں کچھ گُل حکمت کر کے رکھ دیا تاکہ مرزا سے دو دو چونچیں ہو جائیں۔ مرزا بہت پھڑپھڑائے لیکن بات کچھ ایسی ہی تھی کہ دم بخود بیٹھے رہے۔ ان کا قابل اعتراض یا بقول شخصے "مردود" کلام شاید ڈیفنس آف نیشنل لینگوئج ایکٹ کی زد میں آتا ہے۔ اسی لئے بڑے آگاہی خاص وعام بھوجتال کی سرکار عالیہ مدظلہا کی جانب سے مشتہر کرا دیا گیا ہے دیسی ریاستوں میں اور یہ غالب فہمی، حد درجہ فال نیک ہے۔

مرزا مجذوب صفت انسان تھے بچپن ہی سے پتھر پھینکنے لگے تھے لیکن اپنے سر کو بھی یاد ضرور رکھتے تھے۔

؏ دیوانہ بکار خویش ہشیار

حضرت میر تقی میر رحمۃ اللہ علیہ سے جو بڑے جلالی قسم کے درویش ابن درویش تھے، بیعت چاہت فرمائی تو ان سے اس قدر غلو کیا کہ ڈنکے کی چوٹ کہتے پھرے۔ ؏ "آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں"، لیکن ستم ظریفیٔ روزگار کو کیا کہئے کہ آگے چل کر غالب باوجود میر سے عقیدت رکھنے کے خود بہرے بیتر ہو گئے تھے۔ یہاں تک کوئی بات مکرر کہے بغیر سن ہی نہ پاتے تھے یہی نہیں، مرزا غالب اپنے مُرشد میر تقی میر کی روح پر فتوح کی خوشنودی کی خاطر مرزا سودا مرحوم کی روح سے آویزش کرنے کئی بار عالم ارواح تک جوں توں جا پہنچے۔ وہاں اور ہی ماجرا گذرا، مرزا کی نگاہ کسی حور جنت پر پڑی اور یہ وہیں بدنگاہی میں دھر لئے گئے۔ فرشتوں نے پہلے ہی تمام واقعہ ٹانک رکھا تھا۔ ایک دفعہ تو مرزا چکر کھا گئے لیکن جلد ہی سنبھلے اور پھر جو جرح فرمائی کہ "اماں" کوئی ہمارا آدمی بھی دم تحریر موجود تھا یا فرشتوں ہی کے لکھے پر ناحق پکڑا لیا جاتا ہے۔ تو عاملان قضا و قدر لاجواب ہو گئے۔ مرزا بادۂ دوشینہ کے بھپکے اڑاتے، نوک دم دبا، پھر دلّی آ گئے۔ اس رویائے صحیحہ کے بعد سے مرزا اپنے آپ کو "میری" اور مخالفین کو سودائی کہنے لگے تھے۔ جلے پھپھولے بھی پھوڑتے کسی طرح!

آخری تاجدار مغلیہ نے تو اُستاد ذوق کا جلد وصال نہ ہو سکنے کے باعث یا بربنائے رفع شر، یا بطور ردِّ بلاد

حفاظت خود اختیاری مرزا غالب کو اپنا استاد بنانے سے صاف انکار کر ہی دیا تھا لیکن مرزا تو ع تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی پر عامل ٹھہرے۔ جھٹ مستیاں مرزا ہرگوپال، بہیش داس، شیو نرائن آرام، حالی، سالک اور میر مہدی جیسے پہلوانانِ سخن کے مسلم الثبوت استاد بن بیٹھے اور آخر تک جگت استادی کا سہرا ان ہی کے سر رہا۔ چنانچہ غالب کے اکھاڑے میں ہندو اور مسلمان سب زور کرتے تھے۔ اور ہندو مسلم سوال کو ہمیشہ دبائے رکھتے تھے۔ ایک دن میر مہدی لڑنت کرنے جو آئے تو اس انداز سے کہ ہاتھ پاؤں اور ناخنوں پر فرید آباد کی مہندی اور داڑھی پر راولپنڈی والا وسمہ لگا ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بُری طرح چوٹ کھا گئے۔ استاد نے ان کا تخلص "مجروح" رکھ دیا۔ میر صاحب سید تھے پانی پت محلہ انصاریان میں لنگڑاتے ہوئے جا پہنچے لیکن تخلص کے ساتھ استاد کا جو کچھ اثاث البیت تھا وہ بھی باندھ کر لے گئے۔ مرزا کو اس خالص سرقۂ شاعرانہ پر بڑا رنج ہوا اور انھوں نے خطوں کے ذریعہ بہتیرا واویلا اس لوٹ پر مچایا، لیکن دلی کی پولس پنجاب پولس سے ملی ہوئی تھی خاک نتیجہ نہ نکلا۔

غالب بڑے با مذاق آدمی تھے چلتے آدمی سے مذاق کرتے تھے۔ ایک روز طبیعت جو گدگدائی تو کسی سراپا ناز سے واقعی پیش دستی ہی کر بیٹھے اور دھول دھپّا تک نوبت پہنچی۔ خیر معاملہ رفع دفع ہوا تو خاندان والوں نے بہ صلاح و صوابدید مرزا کی شادی کر دی۔ تمام شہر براتیوں میں شامل اور برات شاخ آہو پر۔ سسرال والیاں انھیں مرزا نوشہ کہنے لگیں۔ مرزا سسرال کے تھے بھی عاشق زار۔ پھر سارے شہر میں مرزا نوشہ، مرزا نوشہ ہی مشہور ہو کر رہے۔ ان کی شادی کا نقشہ خواجہ الطاف حسین نے جو اس وقت مثل شہ بالے کے تھے بڑی بالغ نگاہی سے بشکل مرثیہ کھینچا ہے۔ ع

خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

(یہاں خواجہ سے مراد مرزا ہے ورنہ خواجہ تو خود الطاف حسین حالی تھے)

مرزا نے اپنے سارے ہی ارمان نکالے لیکن کبھی نیت نہ بھری یہی کہتے رہے کہ میرے ارمان بہت نکلے لیکن پھر بھی کم نکلے۔ مرزا حقیقتاً بڑے رنگین مزاج واقع ہوئے تھے اور نگاہ حُسن شناس سے متصف اسی لئے ان کا ذوق جمالیاتی انہیں بے چین رکھتا تھا۔ اگر کوئی اچھی صورت دیکھے ہوئے ذرا بھی دیر ہو جاتی تھی تو دیوانہ وار گنگناتے پھرا کرتے تھے کہ ہائے

کوئی صورت نظر نہیں آتی

لوگ ان کی ان ہی باتوں پر دم دیتے تھے۔ اور حق یہ ہے کہ اگر وہ بادہ خوار نہ ہوتے تو دلی والے انھیں ولی سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ جوں ہی مرزا کا انتقال ہوا۔ یعنی ان کے مرتے ہی مرگئی دلی۔ چاروں طرف لوگ سمندر کی طرح تڑپ تڑپ کر جان دینے لگے۔ ادھر نگاہ ناز سرمہ سے خفا ہو گئی تو ادھر صفاہاں میں سرمہ بنانے والوں نے کمیونسٹوں کے اشارہ سے ہڑتال کر دی۔ سینکڑوں ناخن محتاج حنا گئے۔ شعرائے عشق ماتم میں سیہ پوش ہو گیا۔ اور بجز چند اہل جفا کے سبھی بے چین و بے آرام ہو گئے حتیٰ کہ خود مرنے والے نے گھبرا کر اپنے پاؤں کفن سے باہر نکال لئے۔ غرض بڑا اختلال برپا ہوا۔ جب اس طرح دلی

پرانی اور قدیم دلی، مرکر نیست و نابود ہوگئی تو صاحبانِ والا شان نے اپنے دمِ عیسوی سے ابن مریم بن کر روحِ غالب کے دکھوں کا مداوا کیا۔ پرانی دلی کو اُجڑتا دیکھ، غالب کو وہیں دفنایا۔ اور صرف بائیس قدم ہٹ کر ایک اور دلی بسا دی۔ آج کی نئی دلی اسی کل کی دلی کا نقشِ کہن ہی تو ہے جو بطرزِ نو مرصع ہے۔

اوروں کے سو تکلف، غالب کی سیدھی بات برابر ہوتی تھی۔ بدیں وجہ ان کے تعلقات ہر کہ و مہ سے برابر کے تھے۔ انھیں ایران و توران تک سے نسبت قریبی تھی۔ بقول مولانا حالی عرفی ان پر فخر کرتے تو طالب رشک کرتے یعنی کلستے تھے۔ ایران کے عالی جناب مسیح زماں حکیم سنائی کا مطب ہمارے مرزا ہی کی وجہ سے زیادہ چمک گیا تھا۔ سینکڑوں روپے کی دوائیں دل اور جگر کے لئے منگاتے تھے مسہل اور تبریدوں کا سلسلہ علیحدہ۔ ظاہر ہے کہ مرزا کے مرتے ہی حکیم سنائی کی بھی رہی سہی بات بگڑ گئی۔ حضرت خاقانی پر بھی اس کا اثر پڑا۔ حالی اس واقعہ سے متاثر ہو کر فرماتے ہیں:۔

بات بگڑی رہی سہی افسوس آج خاقانی و سنائی کی

شاید مولانا حالی، خاقانی و سنائی کی بات بدستور بنی رکھنا چاہتے تھے ورنہ اس کے بگڑنے پر اتنا افسوس ظاہر کرنے کے کیا معنی؟

مرزا غالب بحیثیت مجموعی ایک بہت بڑے آدمی ہوگذرے ہیں۔ انکی طبعی بڑائی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے دنیا کو بازیچۂ اطفال سے زیادہ نہ سمجھا ان کے بیان کے مطابق کعبہ ان کے پیچھے کلیسا ان کے آگے چلتا تھا۔ واللہ اعلم۔ ان کے نزدیک اعجازِ مسیحا ایک بات اور تختِ سلیمان ایک کھیل تھا اسی کھلنڈرے پن کے باعث طبیعت میں بلا کا لڑکپن آ گیا تھا۔ چوسر کے کھیل کو ان دنوں آج کی گھوڑ دوڑ کی سی مقبولیت کہاں نصیب تھی۔ چنانچہ یہ ذرا خلافِ قانون سا تھا۔ لیکن مرزا کے پو بارے اسی کھیل کی بدولت رہتے تھے، انھوں نے واقعہ یہ ہے کہ اپنے جی میں ٹھانی ہی اور تھی۔ وہ بھلا محتسب اور قانون و قواعد کو کیا خاطر میں لاتے؟ چوسر کھیلے اور کھلے بندوں کھیلے۔ ہر چند حریفوں نے خفیہ والوں کو پتہ دیا اور برابر ادھر اُدھر سے اشارے ہوا کئے لیکن محفل کچھ ایسی بنی تھی یہ پاسِ حیا سے جمے بیٹھے رہے چنانچہ دھر لئے گئے۔ مقدمہ قائم ہوتے ہی بازارِ فوجداری گرم ہوا۔ دونوں جانب سے گواہ شاہد چھوٹے۔ خوب خوب بالیاں رہیں۔ سنتے ہیں جبر حکام متعلقہ رشوت طلب کرتے تھے۔ مرزا لٹھ ان سے بھی لیکر نہ چھوڑتے۔ برسرِ عدالت صاف کہہ دیا کہ جناب والا سے

درم و دام اپنے پاس کہاں چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟

مرزا کا یہ کہنا غضب ہو گیا۔ شامتِ اعمال، حاکمِ عدالت نکلا خالص بناسپتی کھانے والا، ماس (گوشت) اور چیلوں کا نام سنکر کباب ہو گیا۔ مقدمہ مرزا کے خلاف کر دیا۔ ہر چند بادشاہِ وقت نے سفارش کی اور آخر میں کرۂ عدالت پر فوج کشی تک کرانے کی دھمکی دی، حاکم ٹس سے مس نہ ہوا۔ قانونی انصاف کا اس زمانہ میں یہی بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔ مرزا کی ایک پیش نہ گئی قیدِ حیات اور بندِ غم والا شعر مرزا نے قید خانہ ہی میں موزوں کیا تھا۔ وہ ماحول ہی ایسا تھا

غدر کے زمانہ میں، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے، وہ ہنگامہ برپا تھا کہ باید و شاید۔ جہاں اور سب کچھ لٹا، وہاں ڈاک بھی لٹی۔ مرزا خطوط نویسی کے امتحان میں اوّل آئے تھے اس لئے اس کے مرد میدان تھے۔ عالم یہ تھا کہ صبح ہوئی اور رکھ کر کان پر اپنے قلم نکلے۔ اب جو وہاں ڈاک پر ڈاکہ پڑا تو اکثر مرزا ہی کے مرسلہ خطوط اعزّا ان کے نام کے فرستادہ مع اُردو تھے۔ جو غائب رہو د ہوئے۔ بارے اب کچھ عرصہ پہلے نواب قاسم پور صاحب بالقابہ اور علامہ قریشی صاحب مدظلہٗ کی مساعی سے سی، آئی، ڈی اور ڈائرکٹر جنرل پتہ خانہ جات بہادر نے تلاش شروع کرادی ہے۔ محکمہ آثار الصناد ید کے کچھ نیم کانفرنسی کلرکوں پر بھی شبہ بتایا جاتا ہے تاہم یہ امر مقام مسرت ہے کہ بہت سے گمشدہ خطوط تو مل گئے ہیں اور ان کی نقلیں باقاعدہ چھپوا کر قیمتاً تقسیم بھی کرادی گئی ہیں۔ (بجنسہ ان کے جواد ب نواز پوسٹ مینوں کے تھیلوں سے غائب ہو گئیں) اور باقی کے لئے لاوارث خطوط کے دفتر میں چھان بین ہو رہی ہے۔ بڑی خرابی یہ ہو گئی کہ دفتر مذکور میں اُردوں داں تو سب ہیں اُردو خواں نہیں پائے جاتے۔ خدا جانے کیا کایا پلٹ ہوئی کہ رسم الخط ہی بھول گئے۔ اب پتہ خانہ والوں نے از راہِ تلطف غالب کے خطوط کو دیونا گری رسم الخط میں لکھوانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ سُنا ہے کہ یہ رسم الخط سنسر کے ذریعہ نہایت آسانی سے پڑھ لیا جاتا ہے لیکن اب بیشتر صورت میں غالب کے مکتوب الیہان کا پتہ نہیں مرکھپ گئے بیچارے، کہاں تک جدید انتظامات کا انتظار کرتے؟

مرزا نے اپنی ایک تصنیف ملکہ وکٹوریہ کی خدمت عالیہ میں رومن رسم الخط میں لکھوا کر یا دلیسے ہی، ٹھیک معلوم نہیں۔ غالباً فورٹ ولیم کالج کے اساتذہ کی معرفت، تعطیلات یوم کلاں میں بطور تحفہ لندن بھیجی تھی۔ ہوا مخالف ہونے کے باعث وہ وہاں تک نہ پہنچی اور کم بخت نازیوں کے ہاتھ لگ گئی۔ اب ادھر اُدھر کے نشریات سے معلوم ہوا ہے کہ اسے نازیوں نے بجلی اور بھاپ کے ذریعہ دیوان کی شکل میں منتقل کر لیا ہے اور چربہ اُٹھا کر چھاپ دیا ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اس دیوان میں ہر شعر کے مقابل ورق پر مضمون شعر کا خاکہ اُڑایا گیا ہے۔ اور ہمارے شاعر کو بڑی بڑی ڈراؤنی اور عمر رسیدہ صورتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ کہیں ملاح بنا کر مرزا کا بیڑہ غرق ہوتا دکھایا گیا ہے۔ کہیں اُنھیں شرابی بنا کر ساغر و مینا کی چارپائی کے نیچے کو سرکا دیا ہے۔ ایک دو سین تو قطعاً ارباب نشاط کے مجرے کے سے ہیں جس سے مرزا کے نجی کردار پر خواہ مخواہ روشنی پڑتی ہے اور لطف یہ کہ ایک تصویر بھی مرزا کی شبیہ سے نہیں ملتی۔ ہر جگہ بیچارے دق کے مارے، اُم الصبیانی سے معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ دق اور اُم الصبیان کے جراثیم مرزا کے زمانہ میں اس ملک میں یونہی وارد ہوئے تھے غضب کا پروپیگنڈا کیا گیا ہے اور ستم یہ کہ یہ جملہ کارروائی مذبوحی اپنے ہی ملک کے ایک ہوشمند بھائی کے مُو قلم کا نتیجہ بتایا جاتا ہے۔ اللّٰہم حفظنا۔

بھاگ ان بردہ فروشوں سے، کہاں کے بھائی،
ہم پوچھتے ہیں کہ آخر پانچویں کالم والوں کے کیا سینگ ہوتے ہیں!

یہ جرمنی دیوان جو بزعم خود ان بزرگوار نے اپنے ہی نام نامی پر مرقع کے نام سے "چالو" کر دیا ہے، بڑی جنگی تقطیع کا ہے۔ لازم ہے کہ محکمہ اے آر پی اس پر ہمہ وقت نگاہ رکھے۔ اس باعث غیر جنگجو اقوام اپنے اطمینان کے لئے یہ معلوم کرنا چاہتی ہیں کہ اس میں ہے کیا مسالہ بھرا ہوا؟ اس سے غلط فہمیاں بڑھ رہی ہیں اور دوررس سیاسی نتائج کم، خدشات زیادہ پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ مرحوم ڈاکٹر بجنوری صاحب کہیں یہ فرما گئے کہ مقدس وید اور دیوان غالب ہندوستان کی "دو الہامی کتابیں" ہیں اسی ایک بنا پر کئی ضروری بلوے ہوتے ہوتے رد گئے چنانچہ بنظر امن اور شانتی اس تحفۂ دیوان کا ہندی اتھوا ہندوستانی میں ترجمہ کرنے کی خدمت خود مہاتما جی نے اپنے سر لے لی .... ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ اسے ڈاکٹر کو مت کر حسین امیر جادۂ دلیہ کے استمزاج سے تحت کمپنی اپنے نہایت ہی عکسی انداز میں جرمنی کے مقابلہ میں اپنے ہی اس ملک میں ازسرنو شائع کرنے کا سودا کر رہی ہے۔ افسران بالا کی منظوری کا بیچینی سے انتظار ہو رہا ہے۔ بسر دست ایک خفیہ ایڈیشن، ظاہرا ایڈیشن کے نام سے گشت کر رہا ہے وہ بھی بڑی طیب و طاہر کتاب ہے۔

مرزا غالب اور مرزا دبیر میں مماثلت مرزئی کے باعث رشتۂ قرابت کا شبہ پایا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا غالب مرزا دبیر کا تو منہ کر گئے اور عمر بھر میر انیس کے مراثی کا جواب لکھنے پر تلے رہے۔ آپ ادھورا مرثیہ لکھ سکے تھے۔ وہی یادگار غالب ہے دوسرا جو قطعاً مکمل تھا اسے کم نظر ناقدین عام مراثی میں شمار نہیں کرتے۔ اس کا ایک مصرعہ تو نہایت ہی ہلاکت آفرین تھا۔ وہو ہذا۔

کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مرزا غالب کے مذہبی عقائد پر بڑی لے دے ہو رہی ہے۔ بنائے نزاع وہی "ہم اسد اللّٰہم وہم اسد اللّٰہیم" والا مصرعہ۔ اسی پر سب طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ متعدد مشاعرے بھی اسی مصرع کو طرح دے کر منعقد ہو چکے ہیں، لیکن خود مشاعرہ متنازعہ فیہ ہو گیا۔ بہر کیف نتیجہ کے لئے ہنوز خطبۂ صدارت، گلدستہ اور روداد مشاعرہ کی صحیح صحیح اشاعت کا انتظار ہے۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ اس باب میں تحقیقات کی گنجائش ابھی کافی ہے کیا عجب ہے کہ مرزا غالب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، خالص مرزائی ہوں اور مرزا ئے بادبان سے خود اپنی زندگی میں یا مرزائے موصوف کی زندگی میں کسی نہ کسی وقت بیعت کر چکے ہوں۔ قیاس کہتا ہے کہ ہمارے مرزا سنسکرت اور ہندی راشٹر بھاشا کے بھی جید عالم تھے ورنہ عود ہندی جیسی مشہور کتاب کیونکر تصنیف فرماتے۔ دوسری کتاب "دستنبو" ہے جو غالباً پنجابی زبان میں ہے اس لئے کہ پنجاب احاطہ میں بجید مقبول ہوئی۔ افسوس ہے کہ اب اس کے نسخے نہیں ملتے بجز چند کے جو حکیم اجمل خاں صاحب کے بیاض خاص میں محفوظ بتلائے جاتے ہیں اور جن سے انگریزی دواخانۂ یونانی والے ہر منٹ ہزاروں روپیہ کما رہے ہیں۔ اب کشتہ، کا ذکر مرزا کے دیوان میں بھی کہیں

کہیں نظر آتا ہے۔ جس کے استعمال سے آپ میں اس قدر حرارت غریزی بڑھ سکتی ہے کہ آپ جس کو چاہیں قتل تک کر ڈالیں۔ اور جس قدر چاہیں مشق ناز فرمائیں۔ خون دو عالم کی گردن پر ہوگا ...... علاوہ ازیں مرزا نے ایک ڈکشنری بھی تصنیف یا تالیف فرمائی تھی۔ جس کے نام میں جدید زبان جاننے والوں کی آسانی کے لئے صنعت طباق رکھ گئے تھے۔ یعنی اسے قاطع برہان کہئے یا بُرہان قاطع، کم سوادوں کے لئے دونوں طرح صحیح ہے یا خیر غلط بھی سہی، تاہم ایک صنعت ضرور ہے۔ اس ڈکشنری کے حاشیہ میں مرزا نے تمام ہندوستانی لکھنے والوں پر زوردار حاشیہ چڑھا دیا ہے۔ یہ ڈکشنری قاموس، غیاث اللغات، لغات کشوری بلکہ آکسفورڈ ڈکشنری تک سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ مرزا کو چین جاپان کی زبانوں پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔ ورنہ ان کی تصانیف میں سبد چین کا نام کیوں پایا جاتا؟ اقوام عالم بجا طور پر متشکر ہوں اگر آئندہ یوم چین کے مبارک موقع پر بذریعہ لاسلکی سبد چین کے اقتباسات بھی نشر ہوں۔ ناظم نشریات ذرا توجہ فرمائیں۔ اس لئے کہ ہندوستانی شہادت سے اب یہ امر بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔ کہ جنرل چیانگ کائی شیک کے متعلقین اس کتاب کو ہر روز سامنے رکھ کر آپس ہی میں لڑتے ہیں۔ رہی مہر نیم روز سو وہ یقیناً پارسیوں کے مطلب کی چیز ہوگی۔ مگر کراچی کے مغل ہوٹلوں والے اسے اپنے بزرگان سے منسوب کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہوں تو عجب نہیں۔

مرزا غالب کی جملہ ادبی کاوشوں کا جواب جناب آسی صیفر آبادی اور ڈاکٹر عبد النفیس برسوں سے دے رہے ہیں لیکن ہنوز دے نہیں چکے ہیں۔ عدم تکمیل کا جواز ان کا اپنا استقلال ہے اور قائم مزاجی۔ دوسرے سبد چین کی موثر تنقید کے لئے چینی زبان کے کلی بھید نے سمجھنا بھی ناگزیر ہوگیا ہے۔ ورنہ تنقید فی الواقع میدان جاپان ہوکر رہ جائے۔ چین تک جانے کے لئے ہوائی جہاز کے کرایہ پر بھی دونوں صاحبان میں کچھ معاصرانہ نوک جھونک ہوگئی ہے خدا کرے برما روڈ سے جاپان کی اجازت مل جائے۔

عبارات معترضہ اور اشارات مفروضہ سے قطع نظر آمدم برسر مطلب زیر نظر دیوان غالب جو ہنوز نظر نہیں آتا۔ اور جس پر تبصرۂ خیالی پیش کرنے کو جی لوٹتا ہے، بالکل تازہ ترین تصنیف غالب کہی جا سکتی ہے۔ ناشر ہونہ ہو کوئی چینلی سنگھ اینڈ سنز ہی ہوں گے۔ لیکن چھونارکی لو۔ اس کے کسی گوشہ سے نہیں آتی۔ مقیدہ بکڈپو سے ملے گا۔ جس کے واحد مالک یقیناً حضرت بدر السخن معلوم ہوتے ہیں یا کوئی اور صاحب بھی ہوسکتے ہیں جو بقید حیات بھی ہوں اور آزاد پیشہ بھی۔ بسائز اعشاریہ ضرب اشاریہ، ڈیمی سلیم شاہی، کاغذ فرنچ ہے جو خالص طور پر ملک فرانس سے غالباً جنرل تبغال کی معرفت بذریعہ پیراشوٹ براہ مورچۂ الامان آیا ہے۔ اس کاغذ سے مہ وشان پیرس کے پیرہن بھی بنوائے جاتے ہیں۔ جن کی چٹکار کا عکس اس میں موجود ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ، رشک ماہ پروین طرز تحریر اچھا، اسلوب بیان اچھوتا، روشنائی

الف خانی ہونے کے باعث الف لیلی کی سی ہمنائیت بین السطور میں آ گئی ہے۔ البتہ جلد اچھی بندھی۔ جلد ساز نے جلد بازی سے کام لیکر یا تو ابری سفائی سے نہیں چپکائی یا شکنجہ میں رکھ کر دبایا ٹھیک نہیں۔ احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ اسے مینہ بوندے سے بچایا جائے اس لئے کہ جلد کا رنگ بھی کچا ہی معلوم ہوتا ہے۔ پختہ رنگ اب آتے ہی نہیں۔ بجز ایک جنگ کے رنگ کے سو وہ بھی اب تو خوب کھلتا جائے ہے۔ جوں جوں کہ اڑتا جائے ہے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ اس تصنیف کو دھوپ چھاؤں میں بیٹھ کر پڑھا جائے۔

کتاب ہاذا درسے بہت خوشنما معلوم ہوتی ہے۔ پاس سے بھی کچھ بری نہیں لگتی۔ طاق میں رکھی ہوئی ضرور بھلی معلوم ہوگی۔ پڑھنے میں کیسی نکلتی ہے یہ پڑھنے والے جانیں یا خود مرزا غالب کہ تصنیف را مصنف نیکو کند بیان۔ تبصرہ نویس تو بس حُسن و قبح کا نہ ذمہ دار نہ اس سے واقفیت کا جوابدہ۔ قیمت صرف ایک روپیہ موازی دس آنے۔ مہنگائی سمیت دو روپے ممکن تو تھا کہ کچھ تخفیف بھی ہو جاتی لیکن ارباب حل و عقد اس نازک دور میں جب کہ لوہا اشرفی ہو رہا ہے کسی قسم کا چہ جائیکہ تخفیف تک کا کلہاڑا چلانا حد درجہ خطرناک تصور فرماتے ہیں نیز اس اقدام سے ملکی مساعی جنگ پر اثر پڑنے کا اندیشہ بھی رہتا ہے۔ پس چاہیئے کہ منہ مانگے دام دیں۔ اُدھار سے معاف رکھیں۔ قرض مقراض محبت ہے اور اس میں دہی فولاد کا صرفہ! کتب خانوں کے لئے خاص رعایت ہوگی۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ وما علینا الا البلاغ۔

آخر میں بیجا نہ ہوگا اگر ہم ان تمام اشخاص کا شکریہ ادا کریں جنہوں نے اس دیوان غالب کو خود تصنیف یا تالیف کیا، کتابت کی، طباعت کی اور تبصرے لکھوانے کے لئے اس کی جلدیں جہاں تہاں بندگان بیچیدان کے پاس بھیجیں اور از راہ عطا واپس بھی نہ منگوائیں۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ڈاکٹر فرمان فتح پوری مدیر نگار

غالب کے حالات میں پہلا مضمون

(وفات کے بعد)

غالب کی زندگی میں غالب کے کلام کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ہم نے ایک الگ مقالے میں "غالب کے اولین تعارف نگار" کے عنوان سے اس امر کی وضاحت بھی کر دی ہے کہ کن لوگوں نے ان کے متعلق سب سے پہلے لکھا ہے[1]۔ ان میں سرِ فہرست علی الترتیب خوب چند ذکا، نواب اعظم الدولہ سرور، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، نواب ضیاء الدین خاں نیّر درخشاں، قطب الدین باطن، احمد حسین سحر اور سر سید احمد خاں وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ لیکن غالب کی وفات کے بعد ان کے حالات و کلام کے بارے میں سب سے پہلے کس نے یا کن لوگوں نے لکھا ہے؟ اس سوال کا شافی جواب ابھی تک سامنے نہیں آیا۔

مسعود حسن رضوی ادیب کا ایک مضمون البتہ بہ عنوان "غالب کے حالات میں پہلا مضمون" نظر سے گزرا ہے[2]۔ ہر چند کہ اس عنوان سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ مقالہ نگار کی مراد اس عنوان سے وفات غالب کے بعد کے مضامین سے ہے یا حیاتِ غالب کے مضامین سے۔ لیکن مضمون کے مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ادیب صاحب نے غالب کی وفات کے بعد لکھے جانے والے اولین مضمون کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے۔ موصوف نے اس سلسلے میں پہلا مضمون اسے قرار دیا ہے جو "ذخیرۂ بال گوبند" نامی ماہوار رسالے میں شائع ہوا تھا۔ تاریخ صحافت میں "ذخیرۂ بال گوبند" کے بارے میں لکھا ہے کہ:-

---

[1] ملاحظہ ہو اردو، غالب نمبر، بابت جنوری، فروری، مارچ ۱۹۶۹ء۔

[2] احوال غالب ص ۱۹ مرتبہ مختار الدین احمد آرزو مطبوعہ انجمن ترقی اردو علیگڑھ ۱۹۵۳ء۔

"یکم مارچ ۱۸۶۱ء کو یہ ماہانہ رسالہ محلہ پیپل منڈی آگرہ سے شائع ہوا ۲۴ صفحات تھے۔ سالانہ چندہ چھ روپے بارہ آنے تھا۔ مالک بال گوبند ماتھر گلزار دھلوی مولف تقویم بال گوبند مطبع آگرہ سے چھپتا تھا۔ اس رسالے میں تمام علوم و فنون، ہر قسم کی تحقیقات، جدید معلومات، دلچسپ حالات اور عجائبات روزگار پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ اور متعلقہ مطالب کی پسندیدہ تصویریں بھی چھپتی تھیں[1]"

ادیب صاحب کے مذکورہ بالا مضمون میں محلّہ کا نام "پیپل منڈی کی بجائے" پیپل منڈوی" چھپ گیا ہے۔ ادیب صاحب " ذخیرۂ بال گوبند" پر مختصر تبصرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ :-

" اس رسالے کے مارچ ۱۸۶۹ء کے پرچے میں مرزا غالب کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے۔" مرزا اسد اللہ خاں متوفی المتخلص بہ غالب و نوشہ " غالب کی وفات ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو واقع ہوئی۔ اس سانحے کے صرف چند روز بعد یہ مضمون لکھا گیا۔ اور غالبا مرزا کے حالات میں یہ پہلا مضمون تھا جو کسی رسالے میں شائع ہوا۔ اس مضمون سے غالب کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ بھی ہوتا ہے اس لئے اب کچھ اوپر بیاسی برس بعد یہ پھر شائع کیا جارہا ہے[2]"

اس کے بعد اصل مضمون ہے جو کساڑھے تین صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اسی نوعیت کا ایک اور مضمون ہماری نظر سے گذرا ہے۔ یہ مضمون بھی غالب کی وفات کے فوراً بعد ۱۷ مارچ ۱۸۶۹ء کے اودھ اخبار لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ اودھ اخبار ہماری رسائی سے باہر ہے لیکن گارساں دتاسی نے تاریخ ادب ہندوستانی میں اس کو بالاختصار نقل کردیا ہے۔ چونکہ یہ مضمون غالبیات کے سلسلے کی ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے اور غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کی نظر سے عموماً پوشیدہ ہے اس لئے ہم اسے ذیل میں نقل کر رہے ہیں۔

" دھلی کے عہد خوشحالی کے وہ تمام شعراء جو اپنے ہم وطنوں میں مشہور تھے ایک ایک کرکے اٹھ گئے تھے۔ صرف ایک رہ گیا تھا وہ بھی ہم سے چھین لیا گیا تھا۔ اور مشہور و ممتاز شاعروں کا خاتمہ ہوگیا۔ میرا مطلب شکرستان سخن کے اسد اور چمن فارسی کے اس بلبل نغمہ سنج سے ہے جو اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ خاں کے نام سے مشہور

---

[1] تاریخ صحافت جلد دوم صـ ۲۹۲ مولفہ امداد صابری مطبوعہ جدید پرنٹنگ پریس دہلی طبع اوّل۔
[2] احوال غالب صـ ۱۹ مرتبہ مختار الدین احمد آرزو مطبوعہ انجمن ترقی اردو علیگڑھ ۱۹۵۳ء۔

ہیں اگرچہ وہ اس عارضی دنیا کو چھوڑ کر ابدآباد کو سدھارے ہیں لیکن ان کا نام اس دنیا میں ہمیشہ زندہ و یادگار رہے گا۔

ہندوستان میں کوئی ایسا تعلیم یافتہ آدمی نہیں ہے جو ان کی استادی اور ان کے کلام کی عظمت کا قائل نہ ہو۔ ظاہر ہے ایسے شخص کے حالات زندگی ہمارے لئے افادیت سے خالی نہ ہوں گے اس لئے اس جگہ غالب کی ایک فارسی کتاب سے خود نوشت کا ایک خلاصہ دیا جارہا ہے۔

"میرا حسب و نسب ترکستان کے قدیم بادشاہ افراسیاب سے ملتا ہے۔ جب خوش بخت کاویانی کے ہاتھوں افراسیاب کی شمع حکومت گل ہوئی تو شاہی خاندان کے افراد ادھر ادھر کوہ و بیاباں میں منتشر ہو گئے لیکن ان کی عسکری فطانت اور تیغ زنی نے پھر جوہر دکھائے اور انھوں نے اپنے جینے کیلئے نئی راہیں نکالیں۔ کئی سو برس بعد ان کا ستارہ پھر چمکا اور ان کی تلوار نے ان کے سر پر دوبارہ تاج شاہی رکھا۔ اس طرح انھوں نے سلجوقی خاندان کی بنیاد ڈالی لیکن کچھ دنوں بعد ستارہ پھر گردش میں آگیا اور میرے خاندان نے دستر تُرنار کے ساتھ سمرقند میں سکونت اختیار کرلی۔ اب سے کوئی ۱۲۵ سال پہلے میرے پردادا ہندوستان آئے اور اپنی ذاتی خاندانی صلاحیتوں کے صلہ میں انھیں حکومت کی طرف سے پرگنہ پہنو کا علاقہ مل گیا۔ میرے والد میدان جنگ میں کام آئے اور مجھے کمسنی میں چھوڑ کر چلے گئے۔"

غالب ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم ان کے چچا کی نگرانی میں ہوئی جو کہ پرگنہ بنگش کا نظم و نسق دیکھتے تھے۔ لیکن چچا کا بہت جلد انتقال ہوگیا اور ان کی جاگیر حکومت نے واپس لے لی۔ غالب کے دادا نے اگرچہ آگرہ میں لاکھوں

روپئے کی جائداد چھوڑی تھی لیکن کسی ستم ظریفی سے وہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے سخت مصائب و آلام اٹھانے کے بعد امیر کی حیثیت سے انھیں ساٹھ روپے ماہوار پنشن حکومت کی جانب سے مقرر ہوئی۔ یہ سلطنت مغلیہ کا دور تھا۔ وہ بچپن ہی سے بڑے ذہین اور ہونہار تھے۔ لیکن ان کی باقاعدہ تعلیم نہ ہو سکی۔ اور جو کچھ لکھتے پڑھتے تھے، چونکہ انکی طبیعت شاعرانہ اور ان کا مذاق شستہ واقع ہوا تھا اس لئے وہ فارسی کی طرف رجوع ہوئے اور ان کے اسلوب کی سطح کمال فن کی بلندی کو پہنچ گئی۔ بالخصوص ان کا تغزل، تازگی و ظرافت سے مملو ہے۔

بلا شک و اختلاف ہمارے ملک کی عام زبان اردو ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ آج کل فارسی کا استعمال متروک ہو گیا ہے۔ غالب نے فارسی کو اپنائے رکھا اس کے باوجود حکومت نے علم و فضل کا لحاظ رکھ کر تاحیات پنشن مقرر کی اور انھیں اعزاز و اکرام سے نوازا۔ مختلف راجگان اور نوابین بھی اس مشہور شاعر کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔

ان کی تصانیف کی تعداد کثیر ہے جن میں سے مندرجہ ذیل سات خصوصیت رکھتی ہیں۔

۱:۔ ایک فارسی دیوان جس میں تقریباً دس ہزار اشعار ہیں۔

۲:۔ مہر نیمروز۔ یہ فارسی نثر میں تیمور یہ خاندان کی تاریخ ہے۔ جس میں آغاز سے لیکر ہمایوں تک کے زمانے کے حالات درج ہیں۔ یہ آئین اکبری کے طرز کی کتاب ہے اگرچہ مختصر ہے پھر بھی تخلیقی عنصر سے خالی نہیں ہے۔

۳:۔ دستنبو۔ یہ غالب کی خود نوشت ہے جس میں انھوں نے اپنی زندگی کے ۷۵ سال کی سرگذشت بیان کی ہے۔ اس کتاب میں دساتیر کے طرز پر انھوں نے عربی الفاظ کے استعمال سے گریز کیا ہے۔

۴:۔ پنج آہنگ۔ یہ نثر خطوط، دیباچوں اور تقریظوں کا مجموعہ ہے اس میں بعض الفاظ کے اصطلاحی اور عام مفہوم کی وضاحت کے ساتھ فارسی کے چند اصول و قواعد سے بحث کی گئی ہے۔

۵:۔ قاطع برہان۔ یہ مشہور فارسی لغت "برہان قاطع" کا الٹ ہے اس میں کچھ تبدیلیاں کرکے غالب نے درفش کاویانی کا نام دیا بعض لوگ تنگ نظری سے

اس کتاب کو پسند نہیں کرتے ۔

۱۶ ۔ ایک ریختہ دیوان ۔ یہ بہت ضخیم نہیں ہے ۔ بلکہ عربی مقولے کے مطابق ، مختصر ، بلیغ اور جامع ہے ۔

۱۷ ۔ اردوے معلّیٰ ۔ یہ ان کے رقعات کا مجموعہ ہے ۔ جن کو اکمل المطابع کے ناظمین نے اردوے معلّیٰ کے نام سے شائع کر دیا ہے ۔ لیکن یہ ابھی منظرِ عام پر نہیں آیا ۔

غالب نے متعدد مثنویاں اور چھوٹے چھوٹے رسالے بھی لکھے ہیں ۔ جن کا یہاں نقل کرنا باعث طوالت ہوگا ۔ آخری وقت تک انھوں نے جو کچھ کہا اس میں بھی زندگی کی حرارت ، تازگی اور طبیعت کی شگفتگی اور خوش مذاقی کا اثر نمایاں ہے ۔ ان کے لطیفے روزمرہ کی زندگی میں کھانے میں نمک کا کام دیتے ہیں ۔

وہ ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا ۔ اس طرح انھوں نے ۷۳ سال کی عمر پائی ۔ اور آخر دم تک ان کے ہوش بجا رہے ۔ صرف سننے کم تھے اور جب کسی کو کچھ کہنا ہوتا تھا تو لکھ دیا کرتے تھے ۔"

گارساں دتاسی کا بیان یہ ہے کہ یہ اصل مضمون کی تلخیص ہے ۔ اصل مضمون کتنا طویل تھا اور گارساں دتاسی نے اس میں سے کیا چھوڑا اور کیا شائع کیا ہے اس کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اودھ اخبار کی فائلیں ہمارے سامنے موجود ہوں ۔ کیا اچھا ہو اگر کوئی صاحب اصل مضمون کا سراغ لگا کر شائع کر دیں ۔ ممکن ہے کہ غالب کے متعلق کوئی نئی بات سامنے آئے ۔ ؛

سیّد مصطفےٰ علی بریلوی
بی کام۔ ایل ایل۔ بی

مرزا غالب

اخبارات[۱] کے آئینے میں

اخبار عالم میرٹھ مورخہ ۲ اگست ۱۸۶۵ء

۲ اگست ۱۸۶۵ء کے اخبار عالم میں ساطع برہان پر حسب ذیل تبصرہ شائع ہوا تھا:

ساطع برہان:- اس عرصہ میں کئی کتابیں جواب برہانِ قاطع کے جو نواب نجم الدولہ اسداللہ خاں بہادر عرف مرزا نوشہ صاحب برہانِ قاطع کے رد میں لکھا ہے تالیف ہوئیں اور ہوتی ہیں لیکن ایک رسالہ ساطع برہان جو مرزا رحیم بیگ صاحب نے تالیف کیا ہے چھپ کر ہمارے ہاں آیا پہلے رسالے سبھی تین چار خواص مناظرہ میں تالیف ہوئے حرف بحرف دیکھے۔ ان میں فقط حرف اور نقطہ پیرائی تھی۔ تحقیق اور مناظرہ سے مناسبت نہیں رکھتی تھیں۔ الحق اس رسالے یعنی ساطع برہان میں مؤلف نے مادۂ تحقیق اور حق مناظرہ ادا کیا۔ یہ کتاب واسطے طالبین کے ایک جُدا رسالہ تحقیق لغت قواعد اور اصول میں سمجھنا چاہیئے اور ہمارے اس تھوڑے لکھنے کی صداقت اس کتاب کے ملاحظہ پر منحصر ہے۔ باوصف ان تمام خوبیوں کے قیمت اس کتاب کی نہایت مناسب مقرر ہوئی ہے یعنی ساڑھے گیارہ جز کی کتاب ہے اور قیمت آٹھ آنے جس صاحب کو ضرورت ہو مطبع دارالعلوم میں قیمت بھیجکر مہتمم

---

[۱] اقتباسات "تاریخ صحافت اردو" جلد دوم مؤلفہ مولانا امداد صابری سے ماخوذ ہیں۔

"اخبار عالم" سے طلب فرمائیں۔

اکمل الاخبار دہلی ۱۸۶۶ء یہ اخبار جس وقت جاری ہوا ہے۔ موجودہ زمانے کی اصطلاح کے مطابق اس اخبار کے سب سے پہلے منیجر یا ایجنٹ اور پروپیگنڈہ کرنے والے کون تھے اور لوگوں کو خریدار بنانے کے لئے اشتہار کس نے بھیجے وہ مرزا غالب تھے۔ پہلا جو سرکلر اپنے دوست مولوی سیف الحق سیّاح کے نام جاری کیا وہ یہ تھا:-

اقبال نشان سیف الحق کو دعا پہنچے۔ پانچ اشتہار اخبار کی خریداری کے اور تین اشتہار کتاب کی خریداری کے آپ کے پاس پہنچے ہیں۔ چھوٹے صاحب کو ملاحظہ کروائیے اور اطراف وجوانب وہ روز دیکھ بھیجئے جو صاحب کتاب اور اخبار دونوں کے خریدار ہوں وہ دونوں کی خریداری کی اطلاع کا خط میر فخر الدین مہتمم اکمل المطابع کے نام لکھیں ...... غالب ۲۲ مارچ ۱۸۶۶ء

اخبار میں مرزا غالب کے بھی مضامین چھپتے تھے چنانچہ اکمل الاخبار میں مرزا غالب نے اپنا مفصل حال چھپوایا تھا، برہان قاطع کے تصفیہ میں جو اعتراضات وجوابات کا سلسلہ چلا اس میں اکمل الاخبار مرزا غالب کا حامی تھا وہ مرزا غالب یا مرزا غالب کے حامیوں کے جوابات اور اعتراض شائع کرتا تھا۔ چنانچہ مرزا غالب نے اس کا ذکر مولوی سیف الحق کے خط میں کیا ہے۔

"بھائی تمہارا خط کل پہنچا آج جواب لکھتا ہوں۔ پہلے یہ پوچھتا ہوں کہ میری طرف سے جو اعتراض چھپا ہے وہ تمہاری نظر سے گزرا ہے یا نہیں نہ گزرا ہو تو اکمل الاخبار ماہ شوال کے چار دن ہفتہ کے دو ورق دیکھ لو ایک ہفتہ میں نکل آئے گا۔ واقعی اعتراض کے جواب ایک مولوی نے لکھے ہیں اس ہفتہ کے اکمل الاخبار میں دیکھ لو جو تم سے کلام کرے اسی انداز سے تم بھی کلام کرو۔ نجات کا طالب غالب ۱۹ اپریل ۱۸۶۷ء

برہان قاطع کا قضیہ مرزا غالب برہان قاطع کے تصفیہ کے زمانہ میں بہت کبیدہ خاطر رہا کرتے تھے اس لئے کہ مخالفین مرزا صاحب کے نام گمنام سب دشتم سے بھری ہوئی چٹھیاں بھیجا کرتے تھے جس میں شراب نوشی، لادینی وغیرہ پر لعن وطعن ہوتی تھی چنانچہ مرزا غالب مرحوم نے دو گمنام خطوط کا حسب ذیل جواب اپنے انتقال سے ساڑھے چار مہینے قبل اکمل الاخبار اکتوبر ۱۸۶۸ء میں شائع کرایا تھا۔

اسداللہ بے گناہ جس کا تخلص غالب اور خود اہل ہند کا مغلوب مہتمان اخبار بلادِ ہند سے عموماً عرض کرتا ہے کہ اس فقیر کا استغاثہ از روئے اکمل الاخبار اپنے صحائف میں درج فرما کر ممنون فرمائیں:۔

استغاثہ غالب

کئی ہفتہ پہلے ایک خط لکھنؤ سے بسبیل ڈاک انگریزی بصیغہ بیرنگ میرے نام آیا۔ راقم عبداللہ رئیس دمعافی دار کہاں کا، بہرحال محصول دے کر میں نے خط لیا اور پڑھا تو اس میں لکھا تھا تو نماز کیوں نہیں پڑھا کرتا خبردار نماز پڑھا کر اور نماز نہ پڑھے گا تو بعد مرنے کے بھوت بن جائے گا۔ کل پنجشنبہ کے دن ایک اور خط بیرنگ آیا۔ سرنامہ پر یہ عبارت مرقوم انشاء اللہ تعالیٰ نہ بدر شہر دہلی رسیدہ بملاحظہ اقدس جناب مستطاب نواب اسداللہ غالب مرسد باد۔ مُرسلہ مظہر علی از مارہرہ ضلع ایٹہ بیرنگ تاریخ ۲ رجب ۱۲۸۵ھ روانہ شدہ، مضمون بعینہ یہی ہے کہ نماز پڑھا کرو ورنہ بعد مرنے کے بھُوت ہو جاؤ گے والسلام علیک نام ندارد فقط مُرسلہ مظہر علی از مارہرہ ضلع ایٹہ بسرکار خورر ہمام ہوا، اب فقیر مکتوب الیہ ایسا کہتا ہے کہ پہلے خط میں، میں نے عبداللہ کو اسم فرضی سمجھ لیا تھا مگر اب دوسرے خط میں اس توضیح سے کاتب کا اسم ومقام لکھا ہوا ہے تو کیونکر شک وشبہ باقی رہے۔ بس اب میں قہر درویش برجان درویش پر عمل کر کے چپ ہو رہتا ہوں مگر حافظ کا یہ شعر جواب میں لکھتا ہوں۔

من اگر نیکم وگر بد تو برو خود را باش — ہر کسے آں درود عاقبت کار کشت

یہ دوسرے شخص صاحب بے نام ومقام ہیں۔ اخبار دیکھ کر سمجھ لیں گے شاید وہ پہلے صاحب بھی کسی اخبار میں مشاہدہ فرمائیں۔

ہفت روزہ چراغ دہلی

۲۰ اکتوبر ۱۸۶۶ء کے شمارہ میں قاطع القاطع کتاب کا اشتہار شائع ہوا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس پر مرزا غالب نے اس کے مصنف پر ہتک عزت کا دعویٰ کیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ چراغ دہلی کا مہتمم مرزا غالب کے مخالفوں میں سے ہے چنانچہ اشتہار کا مضمون بھی یہی بتاتا ہے کہ مہتمم صاحب مولوی امین الدین کے حامیوں میں سے تھے۔

> ایک کتاب مسمی بہ قاطع القاطع من تصنیف مولوی امین الدین بجواب قاطع برہان مصنفہ مرزا اسداللہ خاں غالب کہ جناب ممدوح نے بزرگ لغات برہان قاطع تحریر فرما کر اس مردۂ دو صد سالہ کو بدشنام دہی یاد فرمایا تھا۔ مولوی صاحب نے جملہ اقوال جناب مرزا صاحب کے تردید کر کے اور سند اور نظائر اس کے کلمات اساتذہ قدیم سے بہم پہنچا کر اقوال برہان کو بخوبی تمام پایۂ ثبوت تک پہنچایا۔ چھاپہ خانہ مصطفائی میں واقع کوچہ رامائن میں ہے۔ اچھی ہے اور قیمت اس کتاب کی ۲ روپے

فی جلد ہے۔ جن صاحب کو یہ کتاب خریدنی منظور ہو چھاپہ خانہ مذکور سے طلب فرمائیں۔

رسالہ دہلی سوسائٹی

دہلی سوسائٹی ایک علمی وادبی انجمن تھی جو ۱۸۶۵ء میں دہلی میں قائم ہوئی۔ یہ انجمن ماسٹر پیارے لال آشوب کی بیحد ممنون تھی۔ اس سوسائٹی کے جلسوں میں مرزا غالب بھی حصہ لیتے تھے، دہلی کے مقتدر اور اہل علم حضرات اس میں حصے لیتے تھے جن میں کے چند نام حسب ذیل ہیں۔

مرزا غالب مرحوم، منشی ذکاء اللہ، ماسٹر رام چندر، مولانا الطاف حسین حالی، حکیم غلام رضا خاں دہلوی، مولوی سیف الحق ادیب دہلوی، مولوی اُلفت حسین صاحب مدرس عربی، ماسٹر لچھمن داس، ماسٹر رام جی داس، مدرس مشن اسکول، میر نصرت علی ایڈیٹر الاخبار دہلی، میر قاسم علی آنریری مجسٹریٹ، ماسٹر پیارے لال، منشی سدا سکھ پادری کروفٹ، کرنل ینگ کمشنر دہلی وغیرہ

خواجہ سید فخر الدین سخن مرزا غالب کے شاگرد اور عزیز

خواجہ سید فخر الدین سہ ماہی علمی رسالہ نہر الفوائد کے ایڈیٹر تھے۔ یہ رسالہ آرہ ضلع شاہ آباد (بہار) سے نکلتا تھا مولانا امداد صابری نے لکھا ہے کہ خواجہ صاحب کا اصل وطن سندھ تھا کیونکہ ان کے سلسلہ نسب میں خواجہ حسن مودودی لکھاری چشتی تھے۔ لکھاری صوبہ سندھ کا ایک قصبہ ہے۔ خواجہ صاحب کے دادا نظام الدین احمد رضوان المعروف بہ خواجہ قیصر چشتی مودودی اور والد خواجہ جلال الدین حسین عرف "حضرت صاحب" تھے۔ خواجہ سخن کی پیدائش ۱۲۵۰ھ کے قریب دہلی میں ہوئی۔ فارسی مرزا غالب سے پڑھی۔ استاد کی صحبت کی وجہ سے شاعری کا شوق پیدا ہوا مرزا غالب کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور اصلاح لینی شروع کی۔

مرزا غالب سے خواجہ سخن رشتہ داری نیاز رکھتے تھے اور اپنا نانا کہا کرتے تھے۔ صاحب سخن شعراء نے لکھا ہے کہ ان کو سید فرزند صغیر بلگرامی اپنا شاگرد بتاتے ہیں۔ فسانہ عجائب میں مرزا رجب علی بیگ سرور دہلی کی زبان پہ کچھ معترض ہوئے تھے اُنھوں نے سروش سخن ایک افسانہ اُن کے جواب میں لکھا اور حب وطن ہونے کا ثبوت دیا اور مرزا غالب کی جنگ کے زمانہ میں بھی پیچھے نہیں رہے جب قاطع برہان کا معرکہ شروع ہوا اور غالب پہ چاروں طرف سے لے دے شروع ہوئی تو یہ مرد میدان بنے۔ ان کے بھی تین قطعے ہنگامۂ دل آشوب میں شامل ہیں۔ اُنھوں نے اپنے صاحبزادے سید محی الدین حسین کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک کتاب تہذیب الغوس لکھی تھی اُردو کا دیوان مطبع نول کشور نے ۱۸۸۶ء میں چھاپا تھا۔ جس پر مرزا غالب نے تقریظ لکھی تھی۔

مرزا غالب کی وفات

مرزا غالب جیسی معرکۃ الآراء شخصیت کی وفات پر پورے ہندوستان میں ماتم ہونا ایک لازمی امر تھا۔ چنانچہ اُس دور کے اخبارات اور رسائل میں برابر مضامین

تاریخ ہائے وفات شائع ہوتے رہتے تھے۔ ذیل میں چند اخبارات کے تراشے پیش کیے جاتے ہیں۔

اخبار الاخیار مظفر پور (بہار)

یکم جون ۱۸۶۹ء

تاریخ وفات مرزا غالب از شاہ محمد یحییٰ ابوالعلائی

مرزا نوشہ جناب غالب — درفن سخنوری یگانہ
از اہل سخن ربود ولہا — درشعر بطرز جاودانہ
کیفیت نثر او چہ گویم — دارد اندازِ دلبرانہ
باخمد الکلام او عجب لطف — معشوقانہ و عاشقانہ
در وجد آرد قلوبِ پاکان — گویش ورق لب ترانہ
ایں اشعار مدحت او — نبود گفتار شاعرانہ
ہرآنچہ کہ گفتہ ایم یاراں — باشد قولِ محققانہ
بگذاشتہ خاکِ پاکِ دہلی — در شوقِ بہشت جاودانہ
سال آں بے نظیر یحییٰ — گو بود نظیرِ زمانہ

۱۲۸۵ھ

اکمل الاخبار دہلی
۱۷ فروری ۱۸۶۹ء

اس اخبار میں پورے ایک صفحہ پر سیاہ حاشیہ کے ساتھ مرزا صاحب کی وفات کی خبر شائع ہوئی تھی جس کے اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

"فغان اس زمانۂ غدار سے آہ روزگار ناہنجار سے ہر روز نیا رنگ دکھاتا ہے۔ ہر دم دام غم و الم میں پھنساتا ہے۔ اس محیطِ آفت کی موج بلا خیز ہے۔ اس وادئ ہولناک کی ہوا فتنہ انگیز ہے اس کا آب سراب، اس کی راحت جو د براحت، اس کی رافت سرمایۂ صداقت، اس کی شکر زہر آلود۔ اس کی امید آرزو فرسود، ہر روز محل حیات کو صرصر ممات سے گراتا ہے۔ ہر دم محفل سرمد سے صدائے ماتم اٹھاتا ہے..... پھول ادھر کھلا، ادھر گر پڑا۔ لالہ لباس رنگین میں بھی داغِ دل پر رکھتا ہے، غنچہ خونِ جگر

سے پرورش پاتا ہے، بلبل نوحہ گرِ چمن ہے اور مرغِ سحر خواں اسیر
محن سے

درین زمانہ بہار و خزاں ہم آغوش است
زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است

کیا عجب اگر آسمان درپئے آزار ہے بھلا اس سے کیا توقع آسودگی
جس کا خود گردش پر مدار ہے۔ دیکھو بیٹھے بٹھائے کیا آفت اٹھائی
ہے۔ کسی منتخب روزگار کی جدائی دکھائی ہے۔ نخل برومند معانی
کو بادِ خزاں سے گرایا۔ مہر سپہر سخندانی کو خاک میں ملایا جو خسرو
کے بعد ملکِ سخن کا خسرو مالک رقاب تھا۔ اس کا نام عمر سے
ہوا جو میدان سخنوری کا شہسوار بیلا رکاب تھا۔ اس کا رخش زندگی
طے ہوا۔ ان حضرت کی کن کن خوبیوں کا ذکر کیا جائے۔ دریا کو کوزہ
میں کیوں کر سمائے حُسن خلق میں اخلاق کی کتاب تمیم الاشفاقی
میں لاجواب۔ خوبیٔ تحریر میں بے نظیر مانیٔ ضمیر، جادو تقریر فارسی
زبان میں لاثانی، اردوئے معلیٰ کے بانی افسوس جس کا شہباز خیال
طائرہ سدرہ شکار ہو وہ پنجہ گرگ اجل میں گرفتار ہو۔۔۔ اس
غم سے سب کی حالت تباہ ہے۔ روز بھی اسی مصیبت میں سیاہ
ہے۔ اب توضیح اجمال و تفصیل محال ہے، واضح ہو کہ جناب مرحوم دو
تین مہینے صاحب فراش رہے۔ ضعف و نقاہت کے صدمے سہے
آٹھ دن انتقال سے پہلے کھانا پینا ترک فرمایا۔ اس دنیائے
فانی سے بالکل دل اٹھایا۔ آنکہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲ر
ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ روز دوشنبہ کو دوپہر ڈھلے اس خورشید اوجِ فضل
و کمال کو زوال ہوا۔

شاعر لکھنوی

غالب

تمام حسن و لطافت، تمام جذب و جنوں
تری ادائے تکلم، ترا مزاج فسوں

نشاطِ نغمہ دلے تیرا جذبۂ بے باک
تری نوا سے ہُوا تیرے شعر کا ادراک

ترا مذاقِ تصادم، غمِ جہاں کی شکست
ترے خیال کی مٹھی میں زندگی کی گرفت

ترے شعور کا سکّہ وہاں بھی جاری ہے
سکوں کا نام جہاں موجِ بیقراری ہے

نکھار تیری شبِ غم کا صبح تو سے بلند
تری نگاہ ستاروں پہ پھینکتی ہے کمند

ترے بیان نے دبستانِ رنگ و بو کھولے
ہزار طرح کے عنوانِ گفتگو کھولے

شعاعِ رنگ تری صبح کا جمال بنی
حیات خود ترا پیرایۂ خیال بنی

گدازِ فن میں تری لے نے قفل توڑ دیا
ترے جہانِ معانی کا رمز کھول دیا

ہر ایک لفظ میں پنہاں کسی نگار کا رنگ
دیارِ شعر میں سب سے جدا ترا آہنگ

ادب کی جان بہ ہر دل پسند ہُوا
کہ تجھ سے شاہدِ معنیٰ کا سر بلند ہُوا

قبولِ عام ہوئی اس ادا سے بات تری
کہ لمحہ لمحہ نکھرتی گئی حیات تری

ہر اک مزاج پہ غالب رہا مزاج ترا
ادا خود ایک صدی نے کیا خراج ترا

ہنوز فکر و نظر پر یہ فرض باقی ہے
ادا ہوا لاکھ مگر تیرا قرض باقی ہے

مولوی محمد عبداللہ قریشی
مدیر ادبی دنیا - لاہور

غالب کی قدر وفات کے بعد

دلی کئی دفعہ بسی اور کئی دفعہ اُجڑی۔ اس اتھل پتھل میں کئی قابلِ قدر یادگاریں تباہ و برباد ہو گئیں۔ آج کوئی ان کا کھوج بھی نہیں لگا سکتا۔ نشان تک نہیں بتا سکتا۔ ہر عہد میں لوگوں نے پرانی روایات اور تاریخی یادگاریں برقرار رکھنے کی سعی کی مگر انقلاب کا عمل برابر جاری رہا اور ہر بار اپنا اثر دکھاتا رہا ع

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

زندگی میں استادِ شاہ شیخ ابراہیم ذوق کا طوطی بولتا تھا۔ اب سنا ہے کہ ان کی آخری آرام گاہ بے بسیِ یارانِ وطن کا نوحہ پڑھتی ہوئی عبرت کا نشان بن گئی ہے اور قبر کی جگہ ٹٹیاں تعمیر کر دی گئی ہیں۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کے انتقال کو بھی سو برس ہو گئے ہیں وہ ۱۷۹۷ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے، عنفوانِ شباب میں دہلی آئے یہیں ۱۸۶۹ء میں وفات پائی اور درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے قریب اپنے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف (نواب لوہارو) کے خاندانی قبرستان کی مغربی دیوار کے پاس دفن کئے گئے۔ ان کے مزار کے سرہانے میر مہدی مجروح کا قطعۂ تاریخ نصب کیا گیا جس پر کندہ تھا

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد اسد اللہ خان غالب مرد

کل میں غم و اندوہ میں باخاطرِ محزوں
تھا تربتِ استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کے مجروح
ہاتف نے کہا "گنجِ معانی ہے تہِ خاک"
۱۲۸۵ھ

اس کے بعد غالب کو گنجِ معانی کہنے والا بھی تہِ خاک چلا گیا اور علامہ اقبال نے فرمایا۔

عظمتِ غالب ہے اک مدت سے پیوندِ زمیں
مہدیٔ مجروح ہے شہرِ خموشاں کا مکیں

اپنی حینِ حیات میں تو غالب کی قدر جیسی کچھ تھی، تھی ہی، اچھی چیزوں میں کیڑے ڈالنے والے اور اُس کے کلام کو مہمل کہنے والے اُس وقت بھی موجود تھے۔ اس ناسازگار ماحول میں غالب خود گھٹن محسوس کرتا اور جل بھن کر کہہ اٹھتا تھا:-

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

یا

گر خامشی میں فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

یا

گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

ایسے میں اگر اس کے چند عقیدت مند شاگرد اور سرپرست بھی اس کا خیال نہ رکھتے تو وہ بیچارہ فاقوں ہی مرجاتا۔ زندہ درگور ہو جاتا، مگر یہ دنیا مردہ پرست ہے وفات کے بعد اس کے کلام کی شہرت جیسے جیسے پھیلی، لوگ اس کے مزار کا رُخ کرنے لگے۔ اوّل تو مزار ہی ایسے مقام پر واقع تھا کہ چند واقف حال لوگوں کے سوا وہاں کوئی پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر پوچھ گچھ کے بعد اگر کوئی پہنچ بھی جاتا تھا تو اسے غالب کی قبر اور اس قبرستان کی حالت ویرانی اور شکستگی کے باعث بہت عبرتناک معلوم ہوتی تھی۔ بعض شاعر اور غیر ملکی سیاح تو طعنے دیتے تھے کہ ہندوستانی اتنے بڑے شاعر کی قبر بھی اچھی حالت میں نہیں رکھ سکے علامہ اقبال نے کتنی حسرت سے کہا ہے:-

آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

شعر و سخن کے متوالے یہ باتیں سنتے، پیچ و تاب کھاتے اور مرقدِ غالب کے منظر کی اصلاح و درستی کے لئے

لے المانوی شاعر گوئٹے۔

پر توں کر رہ جاتے۔

۱۹۱۰ء میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے پہلی مرتبہ اس مزار کی توسیع و مرمت کے لئے آواز اٹھائی۔ کچھ لوگ متوجہ ہوئے تھوڑا بہت چندہ بھی جمع ہوا، مگر وہ خود سیاسی ہنگاموں میں الجھ کر رہ گئے اور یہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔ البتہ اتنا ہوا کہ نواب نصراللہ خاں صدر محاسب سرکار عالی نے اپنے بزرگوں کے مزارات کے ساتھ ہمسائگی کا حق ادا کرتے ہوئے غالب کے مزار کی مرمت کرادی مگر منظر جیسا تھا ویسا ہی رہا۔

۱۹۳۵ء میں ایک دفعہ پھر یہ تحریک اٹھی۔ دہلی کے ہندو مسلمان اہل علم جناب سری رام صاحب مصنف "خمخانۂ جاوید" (متوفی ۲۵ مارچ ۱۹۳۰ء) کے مکان پر جمع ہوئے اور انہوں نے ایک انجمن قائم کی جس کا نام "غالب سوسائٹی" رکھا گیا۔ اس سوسائٹی کے صدر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اور نائب صدر (۱) پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی (۲) خواجہ حسن نظامی دہلوی (۳) لالہ دیش بندھو گپتا ڈائرکٹر اخبار تیج دہلی بنے۔ سکریٹری پیر محمد حسین صاحب مالک فرم زنگی قلم دہلی، آغا محمد اشرف مرحوم نبیرہ مولانا محمد حسین آزاد اور جناب عشر رحمانی صاحب مقرر ہوئے۔ موخر الذکر اس زمانے میں رسالہ نیرنگ دہلی کے ایڈیٹر تھے اور آج کل ریڈیو پاکستان کے محکمے سے سبکدوش ہونے کے بعد لاہور میں مقیم ہیں۔ ملا واحدی صاحب ایڈیٹر رسالہ نظام المشائخ اور پروفیسر اکبر حیدری وغیرہ اصحاب مجلس انتظامیہ کے رکن اور حکیم حاجی عبدالحمید صاحب مالک دواخانہ ہمدرد دہلی خزانچی تھے۔

مرقدِ غالب کے مشرق میں ایک بڑا قطعہ اراضی واقع تھا۔ اس کو حکیم حاجی عبدالحمید صاحب موصوف نے معقول قیمت اپنے پاس سے دے کر خرید لیا اور غالب سوسائٹی کے حوالے کر دیا۔ مزار غالب کے مغرب میں ایک اور قطعہ زمین حکیم واصل خاں مرحوم (برادر بزرگ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں مرحوم) کی مرحومہ بیگم صاحبہ نے اپنے داماد مسیح الملک ثانی حکیم محمد احمد خاں صاحب کی سفارش سے عطا فرمایا۔ آج ان قطعوں کی قیمت ایک لاکھ سے کم نہ ہوگی مگر یہ دونوں قطعے قیام پاکستان (سنہ ۱۹۴۷ء) تک خالی پڑے رہے کیونکہ مزار کی جگہ کو بڑھانے اور مجوزہ "غالب ہال" بنانے کے لئے اس وقت کے تخمینے کے مطابق دس ہزار روپئے کی ضرورت تھی مگر اس سوسائٹی کے پاس تعمیر کے لئے اتنا سرمایہ نہیں تھا۔

۱۹۳۵ء میں غالب سوسائٹی ہی نے پہلی بار غالب کے یوم وفات کو جو ۱۵ فروری تھا "غالب ڈے" مقرر کیا۔ اراکین مجلس کے مشورے سے خواجہ حسن نظامی نے مقامی ہندو مسلمانوں کو خطوط لکھے اور ہندوستان کے علمی سرپرستوں اور ہندو مسلمان والیان ریاست کو "غالب ڈے" کی امداد کے لئے تار بھیجے جن کے جواب میں نواب صاحب رامپور نے بہت حوصلہ افزا الفاظ ارشاد فرمائے اور امداد کا وعدہ بھی کیا۔

لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند کے پرائیویٹ سکریٹری مسٹر میوئل نے وعدہ کیا کہ وہ ہز ایکسی لنسی سے غالب کی نسبت پیغام دینے کے لئے عرض کریں گے۔ ہز ایکسی لنسی نوروز زادہ سفیر ایران اور ہز ایکسی لنسی صلاح الدین سلجوقی سفیر افغانستان نے بھی اس تحریک سے خاص گرویدگی ظاہر کر کے ثابت کر دیا کہ غالب ایشیا کا مقبول ترین شاعر ہے۔

۱۵ فروری ۱۹۳۶ء کو پہلا "یوم غالب" بڑے وسیع پیمانے پر منایا گیا۔ جلسہ اجمیری دروازہ کے باہر عربک کالج ہال میں ہوا۔ سر گرجا شنکر باجپائی سیکریٹری محکمہ تعلیم حکومت ہند نے جلسہ کی صدارت فرمائی جناب ذاکر صاحب پرنسپل عربک کالج نے جلسہ کے لئے مکان اور سامان عطا کیا۔ پنڈت امرناتھ ساحر نے، جو دہلی کی شاعری کا آخری سہارا تھے اور جن کے ہاں ہمیشہ مشاعرے ہوتے رہتے تھے، اس جلسہ کے مشاعرے کو کامیاب بنایا۔ دہلی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن نے غالب ڈے کی سرگرمیوں میں خاصا تعاون کیا اور اس کے افسروں میں سے مسٹر فیلڈن، مسٹر سیٹھنا، مسٹر بخاری اور آغا اشرف نے غالب ڈے کی نشر و تبلیغ کا خاص اہتمام کیا۔

مشاہیر کے پیغامات اور مسز سروجنی نائیڈو کی تقریر اس جلسہ کے خاص فیچر تھے۔ تقریر انگریزی میں ہوئی جو بہت پرزور تھی۔ موصوفہ نے غالب کے موضوع سے باہر کوئی بات نہ کی۔ جو کچھ کہا سونے کی ترازو میں موتیوں سے تول تول کر کہا۔ مجمع سن رہا تھا اور سن ہو گیا تھا۔ نواب حمید اللہ خاں والئے بھوپال، نواب حاجی سر احمد سعید خاں سابق گورنر یوپی، نواب صدیق الزماں فرمانروائے ریاست مانگرول کاٹھیاوار، سر جے اعجاز رسول تعلقدار رئیس جہانگیر آباد (اودھ)، نواب سر عبدالقیوم خاں وزیر صوبہ سرحد، نواب لطف اللہ خاں صدر محاسب سرکار حیدر آباد، ہز ہائی نس سر آغا خاں، سر صاحب جی مہاراج دیال باغ، شہزادہ والاشان پرنس معظم جاہ فرزند اعلیٰ حضور نظام، علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال اور میاں سر فضل حسین نے غالب ڈے کی تحریک سے ہمدردی ظاہر فرمائی، پیغامات بھیجے اور بہت سے اصحاب نے مالی امداد بھی دی۔[۱]

اقبال علیہ الرحمۃ غالب کے بہت بڑے مداح تھے۔ وہ اس تقریب سے بہت پہلے ستمبر ۱۹۰۱ء کے "مخزن" میں غالب کی بارگاہ میں اپنی عقیدت کا شاعرانہ خراج ادا کر چکے تھے۔ ان کی یہ نظم بانگ درا میں بھی شامل ہو چکی ہے۔ ایک ایک مصرعے میں غالب کے فردوس تخیل اور شوخی تحریر کی وہ تعریف کی گئی ہے کہ دوسرا کوئی شاعر شاید ہی کر سکے۔ مندرجہ ذیل دو بندوں سے اقبال کی غالب شناسی اور غالب پسندی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱؎ روزنامچہ خواجہ حسن نظامی مطبوعہ منادی ۲۱-۲۸ فروری ۱۹۳۶ء

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر
آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے
لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستان کی سرزمیں
آہ! اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں
گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے — شمع یہ سودائی دلسوزیِ پروانہ ہے

اس نظم کے پورے پانچ برس بعد ۱۹۰۵ء میں علامہ اقبال نے ولایت جاتے ہوئے راستے میں غالب کے مزار پر حاضر ہو کر اپنے دلی تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا[1]

آپ سے رخصت ہو کر اسلامی شان و شوکت کے اس قبرستان میں پہنچا جسے دہلی کہتے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر خواجہ حسن نظامی اور شیخ نذر محمد صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس موجود تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے شیخ صاحب موصوف کے مکان پر قیام کیا۔ ازاں بعد حضرت محبوب الٰہی کے مزار پر حاضر ہوا اور تمام دن وہیں بسر کیا۔

اللہ اللہ! حضرت محبوب الٰہی کا مزار بھی عجیب جگہ ہے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ دہلی کی پرانی سوسائٹی حضرت کے قدموں میں مدفون ہے۔ خواجہ حسن نظامی کیسے خوش قسمت ہیں کہ ایسی خاموش اور عبرت انگیز جگہ میں قیام رکھتے ہیں۔

شام کے قریب ہم اس قبرستان سے رخصت ہونے کو تھے کہ میر غلام بھیک نیرنگ نے خواجہ صاحب سے کہا کہ ذرا غالب مرحوم کے مزار کی زیارت بھی ہو جائے کہ شاعروں کا حج یہی ہے

---

[1] مکتوب اقبال مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء از عدن بنام مولوی محمد انشاء اللہ خاں مطبوعہ ہفتہ وار وطن لاہور نمبر ۳۹، جلد ۵ – ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء۔

ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستان کی سرزمین

خواجہ صاحب موصوف ہم کو قبرستان کے ایک ویران گوشے میں لے گئے جہاں وہ گنجِ معانی مدفون ہے جس پر دہلی کی خاک ہمیشہ ناز کرے گی۔

حسنِ اتفاق سے اس وقت ہمارے ساتھ ایک نہایت خوش آواز لڑکا ولایت نام کا تھا۔ اس ظالم نے مزار کے قریب بیٹھ کر ع

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی

کچھ ایسی خوش الحانی سے گائی کہ سب کی طبیعتیں متاثر ہو گئیں بالخصوص اس نے جب یہ شعر پڑھا ؎

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ آنکھیں پرنم ہو گئیں اور بے اختیار لوحِ مزار کو بوسہ دے کر اس حسرت کدہ سے رخصت ہوا۔ یہ سماں اب تک ذہن میں ہے اور جب کبھی یاد آتا ہے تو دل کو تڑپا جاتا ہے۔

اگرچہ دہلی کے کھنڈر مسافر کے دامنِ دل کو کھینچتے ہیں، مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ہر مقام کی سیر سے عبرت اندوز ہوتا۔ شہنشاہ ہمایوں کے مقبرہ میں فاتحہ پڑھی۔ دارا شکوہ کے مزار کی خاموشی میں دل کے کانوں سے "ہو الموجود" کی آواز سنی اور دہلی کی عبرتناک سرزمین سے ایک ایسا اخلاقی اثر لے کر رخصت ہوا جو صفحۂ دل سے کبھی نہ مٹے گا۔"

۱۹۳۶ء کے پہلے "یومِ غالب" کے موقع پر علامہ اقبال بیمار تھے۔ اس لئے خود بنفسِ نفیس تقریبات میں شریک نہ ہو سکے مگر انہوں نے جو پیغام خواجہ حسن نظامی کے نام بھیجا اسے کسی طرح رسمی قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ وہ الہام کا درجہ رکھتا ہے۔ انہوں نے اس کے لئے مراقبہ کیا اور جو کچھ انہیں القا ہوا وہ دو شعروں کی صورت اختیار کر گیا۔ یہ شعر علامہ اقبال کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ انہوں نے خواجہ حسن نظامی کو لکھا۔

"جناب خواجہ صاحب! دو سال سے علیل ہوں ؎

سخن اے ہم نشیں از من چہ خواہی
کہ با من خویش دارم گفتگوئے[1]

---

[1] (ترجمہ) اے میرے ساتھیو! مجھ سے پیغام کی کیا توقع رکھتے ہو۔ میں تو اپنے آپ ہی سے باتیں کرنے میں محو ہوں۔

پیغام کے لئے مراقبہ کیا تو مرزا ہرگوپال تفتہ مرحوم کی روح سامنے آئی اور دلی والوں کے لئے یہ دو شعر نازل کر کے غائب ہو گئی ؎

دریں محفل کہ افسونِ فرنگ از خود برد ادرا
نگاہے پردہ سوزے آفریند دانائے راز آور
مئے ایں ساقیانِ لالہ رو ذوقے نمی بخشد
ز فیضِ حضرتِ غالب ہماں پیمانہ باز آور[1]

زیادہ کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ دعاؤں کا محتاج ہوں۔ ہاں دلی کے پنڈتوں سے سلام کہہ دیجئے۔[2]

محمد اقبال

اس تقریب کے انیس برس بعد مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم[3] کی معارف پروری اور ڈاکٹر ثنائی مردوپ[4] بھٹناگر نبیرۂ مرزا ہرگوپال تفتہ کی توجہ اور غیر سرکاری چندوں سے حیدرآباد دکن کے مایہ ناز ماہر فن تعمیر نواب زین یار جنگ بہادر کے تجویز کردہ نقشے کے مطابق ۵ ار فروری ۱۹۵۵ء کو غالب کے مزار پر سنگ مرمر کی ایک خوبصورت چھ کھنڈی لگا دی گئی اور مزار کے سامنے ایک کشادہ صحن بھی تیار کر دیا گیا جس میں جمع ہو کر لوگ غالب کو دعائے خیر سے یاد کرنے لگے۔ غالب کے نام پر ایک یادگار ہال تعمیر کرنے کا منصوبہ اس وقت بھی تشنۂ تکمیل ہی رہا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق

اب سننے میں آیا ہے کہ حکیم عبدالحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ دہلی نے اپنے عزم و ہمت اور خلوص کا تازہ ثبوت دیتے ہوئے غالب اکیڈمی قائم کر دی ہے اور غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ان

---

[1] (ترجمہ) اس محفل میں جہاں فرنگیوں کا جادو چل چکا ہے اور ہم اس کے اسیر ہیں، ایک ایسی نگاہ کی ضرورت ہے جو حقیقت پر پڑے ہوئے پردوں کو جلا دے مگر یہ کوئی دانائے راز ہی کر سکتا ہے۔ لالہ رو ساقی جو شراب پلا رہے ہیں اس سے ذوق و سرور پیدا نہیں ہوتا۔ حضرت غالب کے فیض سے وہی پیالہ بھر لا کہ جس سے کیف و مستی پیدا ہو اور حقیقت ہم پر منکشف ہو جائے۔

[2] ۔ منادی دہلی ۲۱۔ ۲۸ فروری ۱۹۳۶ء ۔ [3] وفات ۱۹۵۸ء

[4] ۔ افسوس کہ انہیں اپنی مساعی کو پوری طرح بار ور دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ یکم جنوری ۱۹۵۵ء کو اچانک ان کا انتقال ہو گیا۔

دو قطعات اراضی میں سے، جو سنہ ۱۹۳۶ء میں غالب کے مزار کے ساتھ وقف کر دیئے گئے تھے اور جن کی قیمت اب ایک لاکھ سے کم نہ ہوگی) ایک قطعہ پر غالب اکیڈمی کی عمارت کا افتتاح ۱۲ فروری ۱۹۶۹ء کو کرنے والے ہیں۔ اس عمارت کی تعمیر پر دو لاکھ روپئے صرف ہوں گے اس میں تین منزلیں اور ایک تہ خانہ ہوگا جس میں غالب لائبریری غالب عجائب گھر اور ایک ہال ہوگا۔ غالب اکیڈمی کو چلانے کے لئے اڑتیس ہزار روپئے سالانہ کے خرچ کا اندازہ کیا گیا ہے۔ جس میں سے چوبیس ہزار سالانہ اکیڈمی کے برابر ایک دوسری عمارت کے کرائے سے ملنے کی توقع ہے اور باقی چودہ ہزار اکیڈمی کی مطبوعات سے۔ دونوں عمارتوں کی تعمیر اور ساز و سامان پر پانچ لاکھ اسی ہزار کے خرچ کا اندازہ ہے[1] امید ہے کہ اردو کے ہمدرد اور علم و ادب کے سرپرست غالب اکیڈمی کے قیام کا پرجوش خیر مقدم کریں گے۔

قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی

غزل

نہ گیا پر نہ گیا سر سے یہ سودا نہ گیا — ہاتھ سے سلسلۂ زلف چلیپا نہ گیا
نالہ کرنے سے دلِ سوختہ کیا خاک ملا — تیری ان باتوں سے وہ پاس مرے آ نہ گیا
رات بیتابی سے اس کوچے میں جا نکلا تھا — تیرے دیوانے کو یاروں سے سنبھالا نہ گیا
کچھ گئے گزرے نہ تھے ایسے مگر کیا کیجئے — ہم سے پیمانِ وفا باندھ کے توڑا نہ گیا
آپ حیران تھے مجبوری دل پر از بس — آئینہ دیکھ کے پھر ہوش میں آیا نہ گیا
گو پہنچ منہ پر اس کے گلے تھے دل میں — سامنے اس ستم ایجاد کے بولا نہ گیا
میرے نقصان نہ پوچھ عشق میں کیا کیا ظالم — دل گیا جان گئی کیا کہوں کیا کیا نہ گیا
جان بیماریٔ فرقت میں لبوں تک آئی — نہ گیا پر مرے بالیں پہ مسیحا نہ گیا
چل دیے اٹھ کے لب طاہر وہ مرے بالیں سے — ان سے حالِ دلِ بیتاب جو دیکھا نہ گیا

چل بسا گلشنِ ہستی سے جنون مرحوم
غمِ ہجرت بے درد اٹھایا نہ گیا

---

[1] ہماری زبان علی گڑھ ۸ دسمبر ۱۹۶۸ء

نادم سیتاپوری

"غالب کی آخری آرام گاہ"

(ایک تاریخی جائزہ)

غالب کے اکثر و بیشتر اعزہ اگرچہ فرقۂ اہلسنت سے تعلق رکھتے تھے لیکن خود غالب با اعلان "شیعہ اثنا عشری" تھے اور اس زمانے میں شیعہ سنی قرابتوں کا عام رواج تھا بھی۔ کہیں کہیں تو ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ سگے بھائی بہن اس عظیم خونی رشتے کے باوجود علیحدہ علیحدہ مسلکوں پر رہے، ایک سنی دوسرا شیعہ۔ غالب کے حقیقی بھانجوں میں مرزا عباس بیگ اپنے ماموں کے مسلک پر تھے بقیہ دو بھائی مرزا عاشور بیگ اور مرزا مغل سنی تھے۔

غالب کے عقیدے اور مسلک کی بحث ایک زمانے میں اس موڑ پر پہنچ چکی تھی کہ انکے بعض شاگردوں نے انھیں لامذہب ہی قرار دیدیا چنانچہ ذکی مارہروی تلمیذ غالب (۱۸۳۷ء – ۱۹۳۰ء) سے ایک روایت مائل سندیلوی نے نقل کی ہے

۱۔ مرزا عباس بیگ غالب کی حقیقی بہن چھوٹی خانم (زوجہ مرزا اکبر بیگ بدخشی) کے منجھلے بیٹے تھے غدر سن ۵۷ء سے پہلے ہی یہ اودھ کی طرف چلے آئے تھے اور مستقلاً سیتاپور (یو۔پی) میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ غدر میں جب ان کے بڑے بھائی مرزا عاشور بیگ "کالے مکان" کے مقابلے میں کام آگئے تو انکی اولاد اور مرزا عباس بیگ کے چھوٹے بھائی مرزا جواد بیگ عرف مغل دلی سے بھاگ کر الور پہنچے اور وہاں سے سیتاپور آگئے۔ مرزا عباس بیگ نے اپنے بھائی اور بھتیجوں کو اپنے پاس رکھا مرزا مغل بیگ کو سیتاپور میں افسر اسلحہ مقرر کرا دیا اور بھتیجوں کی تعلیم و تربیت اپنی اولاد کی طرح کی۔ سرور جنگ آغا مرزا بیگ (وفات ۱۹۳۲ء) استاد آصف جاہ نظام دکن، انہی مرزا مغل کے صاحبزادے تھے۔

غدر کے بعد مرزا عباس بیگ کو ضلع سیتاپور میں انگریزوں نے "بڑا گاؤں" تعلقہ عطا کیا اور ان کا نام تعلقداران اودھ کی فہرست میں شامل کر لیا گیا۔ مرزا عباس بیگ کی کوٹھی قیصر باغ میں اس جگہ پر تھی جہاں پر اب کوتوالی قیصر باغ "

لکھتے ہیں۔

"حضرت مرزا صاحب کے متعلق جو یہ مشہور ہے کہ شراب نے انکی شاعری کو پر پرواز لگا دئے تھے بالکل غلط ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ خراب نے انھیں کہیں کا بھی نہ رکھا تھا۔ مرزا صاحب نہایت وجیہہ تھے خدا نے دل و دماغ بیش دیا تھا مگر اس کم بخت شغل نے نہ صرف انکی جسمانی صحت ہی کو تباہ کیا بلکہ دماغ پر بھی بہت خراب اثر ڈالا۔ جو جب کہہ دیتا تھا اس پر عمل کرنے لگتے تھے۔ مذہب کے معاملے میں بھی یہی حال تھا اور آخر میں فرامیسن (FRAMESON) ہو گئے تھے۔"

(صفحہ ۹۔ ماہنامہ زمانہ کانپور جنوری ۱۹۴۹ء جلد ۹۲ شمارہ نمبر ایک)

مذہب کے بارے میں "اقرار باللسان" کے باوجود غلط فہمیوں کی فضا قائم کرنے میں مرزا کی مذہبی بے عملی کو زیادہ دخل رہا ہے۔ تمام عمر کسی نے انکو نہ روزہ رکھتے دیکھا نہ نماز پڑھتے۔ پھر جام شراب کا دور دورہ۔ یہ مذہب اور عقیدے کی بنیاد قائم کی جاتی تو کیونکر۔ یہی وجہ تھی کہ جب انکی آنکھ بند ہوئی تو نہ ان کے "اقرار باللسان" کو کوئی اہمیت دی گئی نہ اس وصیت کو تسلیم کیا گیا جو انھوں نے نواب سید نواب مرزا دہلوی سے کی تھی۔ نواب سید حسن مرزا دہلوی (پرنسپل گورنمنٹ کالج کیمبل پور) کا بیان ہے۔

"دوسرے واقعے کا تعلق مرزا اسداللہ خان غالب کی تجہیز و تکفین سے ہے۔ غالب نے میرے جد امجد اور نواب

قائم کی گئی ہے۔ کوتوالی قیصر باغ کے حدود کے اندر دکھن طرف ان کا تعمیر کردہ امام باڑہ آج بھی موجود ہے جس میں ماہ محرم میں عزاداری ہوتی ہے۔ اسی امام باڑہ میں مرزا عباس اور انکی بیوی کی قبریں بنی ہوئی ہیں۔

غالب کے "باقیات الصالحات" میں سوائے انکی بہن، چھوٹی خانم اور بھتیجی عزیز النساء کی اولاد کے اور کوئی نہیں ہے اور اس خاندان کے افراد سیتاپور، لکھنؤ اور حیدرآباد دکن میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مرزا عباس بیگ نے ۱۲۹۹ھ میں وفات پائی۔

سلہ۔ نواب سید محسن مرزا (خلف سید اکبر مرزا مرحوم) کے جد امجد نواب سید حسین مرزا ناظر محلات شاہی، بار زالدولہ ممتاز الملک مرزا حسام الدین حیدر خان حسام جنگ کے صاحبزادے تھے۔ اور غالب کے خاص دوست ۔ نواب حسین مرزا (جن کا اصلی نام ذوالفقار الدین حیدر۔ نواب معین الدولہ، صفدر الملک، ذوالفقار جنگ تمام دلی میں ناظر حسین مرزا" کے نام سے مشہور تھے جناب مالک رام نے لکھا ہے "غالب کے نہایت گہرے دوست تھے بلکہ فارسی میں ان کے شاگرد بھی تھے، اگرچہ شعر نہیں کہتے تھے لیکن بلا کے سخن فہم اور سخن سنج تھے۔ غالب کا اردو کلام انہی کے پاس جمع ہو رہا تھا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں تاراج ہو گیا۔

(۱۴۵۔ تلامذہ غالب)

حسن اتفاق کہ حسین مرزا کے یہاں سے ہی دیوان غالب کا ایک قلمی نسخہ غالب کا دستخطی اور مہر شدہ نکل آیا جسے ۱۹۳۶ء میں

یہ نواب صاحب بیرزہ نواب عطاء اللہ خاں مصنف "چہل مجلس" سے بتاکید کہا تھا کہ میرے انتقال کی خبر سنتے ہی تم دونوں آجانا اور میری تجہیز و تکفین کرنا۔ چنانچہ جب مرزا صاحب کا انتقال ہوا تو یہ دونوں نواب ضیاء الدین خاں مرحوم کی خدمت میں، جو غالب کے قریبی عزیز تھے فوراً آگئے اور ان سے مرزا صاحب کی وصیت کا ذکر کیا۔ نواب صاحب (ضیاء الدین احمد خاں) نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔ بھئی مرزا صاحب کی وصیت کا کیا کہنا! تجہیز و تکفین کے بارے میں مجھے ایک دفعہ کی وہ عجیب بات یاد ہے۔ پھر حسب ذیل واقعہ سنایا۔

مرزا صاحب ایک روز میرے بالا خانے پر تشریف فرما تھے۔ میں پاس بیٹھا ہوا تھا کہ نیچے بازار میں کچھ ہندو ایک بوڑھے کی میت کو گاتے بجاتے لئے جاتے ہوئے نظر آئے مرزا صاحب نے کہا۔ دیکھو کیا اچھی طرح لے جا رہے ہیں؟ جب میں مر جاؤں تو میرا جنازہ بھی اسی طرح اٹھائیے۔؟

میرے جد امجد اور نواب سید نواب مرزا نے کہا کہ ہم نے اپنے فرائض ادا کر دیئے اب آپ کو اختیار ہے! مرزا صاحب کی تجہیز و تکفین نواب ضیاء الدین خاں نے کرائی۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں بجائے شیعوں کے قبرستان کے جو درگاہ شاہ مردان (نئی دہلی) میں ہے، درگاہ نظام الدین سلطان جی کے قریب دفن کیا گیا۔"

(ہفت روزہ "سرفراز" لکھنؤ - ۹ جنوری ۱۹۲۷ء جلد ۳ شمارہ ۲۴)

نواب محسن مرزا کے اس قول کی تائید جناب مالک رام کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔

"جنازے کی نماز دلی دروازے کے باہر ہوئی۔ بعض شیعہ حضرات نے کہا کہ مرحوم (غالب) شیعہ تھے اس لئے ہمیں اپنے مسلک کے مطابق ان کی تجہیز و تکفین کی اجازت دی جائے۔ لیکن نواب ضیاء الدین احمد خاں اور حکیم محمود خاں نہیں مانے، دونوں صاحبوں کا دلی میں بہت اثر و رسوخ تھا۔ خصوصاً حکیم محمود خاں کا۔!

اگرچہ مرزا (غالب) کی شیعیت اور اثنا عشریت کسی سے مخفی نہ تھی لیکن کوئی ان دونوں کے سامنے دم نہ مار سکا۔ اور تمام رسوم اہلسنت ہی کے طریقے پر ادا ہوئیں۔ سلطان جی (نظام الدین) میں "چونسٹھ کھمبا" کے متصل خاندان لوہارو کے قبرستان میں دفن ہوئے یہاں اس خاندان کے اور افراد بھی محو خواب ہیں۔

مرزا حیرت نے لکھا ہے (اس احاطے کی پختہ چار دیواری مرزا غالب کے کسی ہندو شاگرد نے بنوائی تھی (صفحہ ۲۱ چراغ دہلی) میں اس بیان کی تصدیق کہیں سے نہ کر سکا۔ نہ مجھے ان ہندو شاگرد کا نام ہی معلوم ہوا۔"

(صفحہ ۱۲۶ - ۱۲۷ ذکر غالب تیسرا ایڈیشن)

آغا طاہر دہلوی مرحوم (بیرزہ آزاد دہلوی) نے دیوان غالب حسن طباعت کے ساتھ شائع کیا ... غالب مرحوم کے حقیقی نواسے تھے مرحوم دہلی کے آخری دور میں شیعوں کے جس عظیم خاندان کو دربار شاہی سے قرب خاص حاصل تھا وہ یہی خاندان تھا جس کی یادگار حویلی حسام الدین اب بھی "بلی ماران" دہلی میں موجود ہے۔ (ناظم سیتاپوری)

کوئی تیس برس ہوئے جب پہلی بار میں، غالب کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے گیا تو نہایت ہی شکستہ اور بے مرمت حالت نظر آئی ایسی حسرت اور ویرانی برس رہی تھی کہ بیان نہیں کرسکتا۔ چہار دیواری بھی کہیں کہیں سے ٹوٹی ہوئی تھی اور ریختہ قبر تو گویا اینٹوں کا ایک ڈھیر بنکر رہ گئی تھی۔ پھر "نے چراغ نے گلے" کا منظر! اس سے بھی زیادہ حسرت آگیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہفتوں سے جھاڑو بھی نہیں دی گئی۔ فاتحہ خوانی کے بعد جب خواجہ حسن نظامی مرحوم سے ملنے گیا تو میں نے اس کا بھی ذکر کیا۔ خواجہ صاحب اہل علم وادب کی اس تغافل شعاری سے خود دل برداشتہ تھے۔ کہنے لگے — بھئی تھوڑا بہت جو میں کرسکتا ہوں کرتا رہتا ہوں۔ برسوں سے کوشش کر رہا ہوں کہ مرزا کا مقبرہ انکی شایانِ شان بن جائے۔ مگر میری ہر تحریک ناکام ہی رہی اور بھی یہ کیا موقوف دلی میں کون ایسا ہے جو یہ نہ چاہتا ہو کہ مرزا کی یادگار رہتی دنیا تک قائم و دائم رہے! لیکن میدان عمل میں کوئی بھی نظر نہیں آتا حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی نے کیا کچھ کوشش نہیں کی۔ نتیجہ سامنے ہے؟

پھر ۱۹۴۵ء میں جب مستقلاً جامعہ نگر (دہلی) میں قیام کا موقع ملا تو "بستی نظام الدین" راستے ہی میں پڑتی تھی اکثر فاتحہ خوانی کے لئے جاتا رہا۔ لیکن یہ زمانہ اس "شام قیامت" کی سحر تھا جب دلی انقلاب ۱۹۴۷ء کا شکار ہو کر کے کشمکش سے دوچار تھی زندوں کو خود اپنا ہوش نہ تھا مردوں کو کون پوچھتا۔؟

جسطرح غالب کو ناقدری فن کے ایک طویل صبر آزما دور سے دوچار ہونا پڑا۔ اسی طرح انکی "خاک لحد" بھی بہت دنوں تک "یک صحرا" کی طرح مختلف تعمیری تحریکوں کے گرد چکر کاٹتی رہی۔ اس صدی کے آغاز میں جب غالب کی "عظمت فن" نے حیات ثانیہ پائی تو لوگوں کو اس کی بھی فکر ہوئی کہ انکے شکستہ مزار کی بھی مرمت کرا دی جائے۔ یوں تو اس زمانے میں مشاہیر دہلی کی قبور و مزارات کے تحفظ کی ایک خاص تحریک چل رہی تھی اور مولانا محمد علی کے "ہمدرد" کا ابتدائی دور اس تحریک کا سب سے بڑا ترجمان کہا جاتا تھا لیکن "مزار غالب" کی حسرتناک شکستہ حالی کی طرف سب سے پہلے جس نے توجہ دلائی وہ ایک "انگریز ڈاکٹر" تھا۔ اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں مشاہیر اردو کی یادگاروں کے تحفظ کی جو تحریک ۱۹۱۲ء و ۱۳-۱۹۱۲ء میں شروع کی گئی تھی اس کا ابتدائی تصور ڈاکٹر جے۔ مورٹن (DR. J. MORTAN) کا ہی مراسلہ تھا جو "ڈیلی پانیئر" (DAILY PONIOR) الہ آباد میں چھپا تھا۔

ڈاکٹر جے۔ مورٹن کون تھے۔؟ اس کا جواب میری "کم آگاہی" نہیں دے سکی۔ اور نہ "پانیئر" کے پرانے فائل کہیں دستیاب ہوئے جو اس سلسلہ مراسلت کی تکمیل کی جاتی! مجھے ڈاکٹر جے مورٹن کے صرف ایک خط کا اردو ترجمہ ماہنامہ "معیار" لکھنؤ مئی ۱۹۱۱ء (جلد ۵ شمارہ-۵) میں دستیاب ہوا ہے جس پر ایڈیٹر "معیار" کا ایک ادارتی نوٹ بھی ہے۔

"ذیل کے دونوں مضمون قبر حضرت غالب علیہ الرحمتہ پر فی الحال "پائنیر" (الہ آباد) میں یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔ ازبسکہ ان مضامین سے خاص تعلق تھا لہذا مضامین مذکور کا سلسلہ وار ترجمہ ہدیہ ناظرین اس غرض سے کیا جاتا ہے کہ دیکھنے کی بات ہے۔ پہلا مضمون ایک "یوروپین" نے لکھا ہے اور کیا لکھا ہے؟

ماہنامہ "معیار" لکھنؤ جس نے انگریزی اخبار (ڈیلی پانیر الہ آباد) سے ترجمہ کر کے اس مراسلے کو شائع کیا تھا۔ اسی "معیار پارٹی" کا ترجمان تھا جس کی بنیاد گذشتہ صدی کی آخری دہائی میں لسان القوم صفی لکھنوی نے "دائرہ ادبیہ" کے نام سے رکھی تھی۔ اس ادارہ کا نصب العین اردو زبان ہی کی اصلاح نہیں تھا بلکہ قدیم "طرز فکر" میں بھی ایسی اصلاح کرنی تھی جو اردو شعر و ادب کے مستقبل کو سنوارنے میں معین کار ہو سکے؟

مولانا صفی لکھنوی کی اس عظیم تحریک نے ایک طرف تو جدید طرز فکر و سخن کی نئی راہوں کو راستہ دیا۔ دوسری طرف دلی اور لکھنؤ کے درمیان جو لسانی و محاوراتی ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی اس محاذ کو بھی قریب قریب ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا چنانچہ ماہنامہ "معیار" کے ایڈیٹر حکیم سید علی محسن خاں ابر (عرف ننھے آغا صاحب) اپنے نام کے ساتھ فخریہ "مقلد میرزا غالب" لکھا کرتے تھے اور "معیار" کے ہر سرورق پر غالب کا ایک چھوٹا سا عکسی فوٹو بھی چسپاں کر دیا کرتے۔

غالب کے فن کا اعتراف تو لکھنؤ پہلے ہی کر چکا تھا۔ لیکن اس کی تصدیق "معیار" ہی نے کی۔ یہاں تک کہ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی نے قدیم رنگ کو ترک کر کے غالب کے رنگ میں کہنا شروع کیا اور ان کی پیروی انکے دوسرے معاصرین نے بھی کی۔ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی نے تو اس تحریک کو اتنا جاندار بنا دیا کہ ڈاکٹر اقبال نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انھیں لکھا

"میں آپکے کلام کو بہ نظر "استفادہ" دیکھتا ہوں۔"

حکیم سید علی محسن خاں ابر لکھنوی کی ادارت میں ماہنامہ "معیار" ۱۹۰۷ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا اور غالباً ۔ ۔ تک نکلتا رہا۔ منشی سجاد حسین مرحوم (ایڈیٹر اودھ پنچ) کے شاہی اودھ پنچ پریس لکھنؤ میں چھپتا تھا۔ قسم اول کا سالانہ ۔ ۔ قسم دوم کا ۔ ۔ روپیہ تھا۔ یہ ماہنامہ دراصل ایک گلدستہ تھا جس میں "معیار پارٹی" کے شاعروں کی غزلیں ۔ ۔ ۔ کی پابندی کے ساتھ شائع ہوا کرتی تھیں۔ نثری حصہ برائے نام ہی ہوتا تھا اور بطور ضمیمہ ایک ایسے مشاعرہ کا اعلان بھی ۔ ۔ ۔ ۱۹۱۱ء کے شمارہ میں ملتا ہے جو غالب کی زمینوں میں منعقد ہونے والا تھا۔ لیکن ایسا کوئی ضمیمہ ابھی تک میری نظر سے نہیں گزرا۔

مرزا غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر جے۔ مورڈن کا یہ مراسلہ ۲۰ جون ۱۹۱۱ء (دوشنبہ) کے "پانیر الہ آباد" میں شائع ہوا تھا۔ ان دونوں خطوط پر "جون ۱۹۱۱ء" کی تاریخوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہنامہ "معیار" کا شمارہ ماہ مئی کافی تاخیر سے نکلا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ جون ۱۹۱۱ء کے آخری ہفتے میں اس کے بعد بھی شائع ہوا ہو۔ ؟ اور اس زمانے میں ادبی رسائل کی اشاعت میں اس قسم کی تاخیر کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔!

ڈاکٹر جے مورڈن اور حامد علی خاں بیرسٹر کے دونوں مراسلے ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں۔

پانیر دوشنبہ ۔ ۲۰ جون ۱۹۱۱ء

"ایک بھولی ہوئی تیرہ"

بخدمت جناب ایڈیٹر صاحب ۔ جناب من ۔ برائے مہربانی مجھے اس امر کی اجازت دیجیے کہ غالب

شاعری کے شیدائیوں کی توجہ میں۔ ان کی بھولی ہوئی قبر کی طرف متوجہ کروں۔ یہ قبر "نظام الدین اولیا" دہلی میں واقع ہے۔ چونکہ احاطے کے باہر ہے اس لئے اس کے وجود سے ان واردین کو بھی اطلاع نہیں ہے جو دہلی میں آتے ہیں۔ پہلی مرتبہ جو میں گیا تو میرے ساتھ ایک نہایت ہوشیار اور سمجھدار خادم تھا جو اس قبر کو تلاش کر کے مجھے وہاں لے گیا۔ قبر ایک ٹوٹے پھوٹے احاطے میں واقع ہے جس کی دیوار منہدم ہو گئی ہے اور پتھر کا فرش ٹوٹے ہوئے ریزوں میں پوشیدہ ہو گیا ہے۔ سرہانے کا لوح سنگ مرمر کا ہے اور اس پر ایک نظم کندہ ہے۔ مگر اس کے بھی زیر زمین ہو جانے کا خوف ہے۔ ایک ہی دو سال کی بارش میں اندیشہ ہے کہ اس کا پتہ بھی باقی نہ رہ جائے اور اس کے ساتھ ہی اردو کی ایک بڑی عظمت نشانی غائب ہو جائے گی۔ میں ہندوستان میں شاعری کے دلدادہ اور غالب کے دم بھرنے والے حضرات سے اس کی التجا کر سکتا ہوں کہ وہ اس یادگار کو بچا رکھیں۔ ہم شاعر، مورخ اور مصنف جو مشہور ہو چلے ہیں قوم کے لئے بہت کچھ مایۂ ناز ہوتے ہیں۔ ان کی آرام گاہوں کو ایک محبت آمیز طریقے سے محفوظ اور شاداب رکھنا چاہئے۔ ان کی قبریں بے بہا یادگاریں ہیں جن سے غفلت کرنے کو آئندہ نسل آسانی سے معاف نہیں کریگی اس لئے۔ اور خود اپنی قدردانی ظاہر کرنے کو میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ ایک روپیہ کے چندہ کی ابتدا کی جائے اور شایان شان دیرپا یادگار غالب کی قبر پر قائم کی جائے۔ چونکہ غالب مسلمان تھے اس لئے غالباً "مسلم ریویو لکھنؤ" کے ایڈیٹر اس فنڈ کے سکریٹری کا کام خوشی سے انجام دیں۔ میرے خیال میں کل تین چار ہزار روپیہ کی اس فنڈ کے لئے ضرورت ہوگی۔ اسکول کے طالب علم نہایت ہی آسانی سے آپس میں چندہ کر سکتے ہیں اور آنریری سکریٹری صاحب کی خدمت میں پیش کر سکتے ہیں جو صاحب کہ اس خدمت کو اپنے ہاتھوں میں لیں گے وہ ایک باعزت خدمت کو انجام دیں گے اور عمدہ ادب کے شائقین کی منت پذیری حاصل کریں گے۔"

"جے۔ مورٹن۔ مسوری" (صفحہ ۱۴۔ ۱۵۔ ماہنامہ معیار لکھنؤ۔ مئی ۱۹۱۱ء)

کچھ نہ معلوم ہو نیکے باوجود ڈاکٹر مورٹن کی اس تحریر سے اتنا تو پتہ چلتا ہی ہے کہ اردو شعر و ادب سے اسے خاص لگاؤ تھا اور غالب کے فن پر اس کی گہری نظر بھی تھی۔ ڈاکٹر مورٹن کی یہ اپیل "صدا بصحرا" ثابت نہیں ہوئی اس سلسلے کا ایک مراسلہ "معیار" کے اوراق میں محفوظ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "مورٹن" کی آواز پر صدائے لبیک بلند کرنیوالوں میں حامد علی خاں بیرسٹر غالباً پہلے شخص تھے جنہوں نے اس تحریک میں عمل کی روح ڈالنے کی کوشش کی۔

حامد علی خاں بیرسٹر مرحوم گذشتہ صدی کے لکھنؤ میں ایک سراپا انجمن شخصیت کے مالک تھے اس دور کی تمام ادبی اور مجلسی تحریکوں میں انکا خاص ہاتھ رہا تھا۔ فدائے سخن میر تقی میر کی گمشدہ قبر کی تلاش و جستجو میں انہوں نے ایک خاص رول ادا کیا تھا "معیار پارٹی" کے ایک خاص رکن تھے اور اپنے عہد کے تمام مشاہیر سے انکا مساویانہ ربط و ضبط تھا۔ سخن فہم بھی تھے اور

سخن سنج بھی۔ قدیم گلدستوں میں کہیں کہیں ان کی ایک آدھ غزل اب بھی نظر آجاتی ہے۔ ماہنامہ معیار کے دوسرے دور کی تزئین و آرائش انہیں کی رہین منت ہے۔

روزنامہ پائنیر الہ آباد میں ڈاکٹر مورٹن کا مراسلہ دیکھنے کے بعد انھوں نے جو مراسلہ لکھا تھا اس کا ترجمہ بھی "معیار" کے اسی شمارے میں پیش کیا گیا ہے جو درج ذیل ہے

" قبر غالب

بخدمت جناب ایڈیٹر صاحب

جناب من۔ ڈاکٹر جے مورٹن نے آپکے اخبار کے ذریعہ سے قبر غالب کی تباہ حالت کی طرف توجہ دلا کے غالب کی شاعری کے عاشقوں کو بہت کچھ ممنون کیا ہے!

بہ لحاظ غالب کے فارسی اور اردو شاعر ہونیکے، نثر نگار اور بذلہ سنج ہونیکے۔ میں انکا مداح ہوں میری محبت وشیدائیت کا اندازہ قدرے اس امر سے ہو سکتا ہے کہ میں انکے ملازم مد کلو سے جبکہ وہ انکے خطوط میں کرتے ہیں ملنے کے لئے گیا۔ میں نے غالب کو کبھی نہیں دیکھا جب انکا انتقال ہوا میں بہت کم عمر تھا چند سال ہوئے کہ میں نے ان کی قبر کی زیارت کی تھی دو پتھروں پہ تاریخ کندہ ہے۔ ایک خود غالب کی تصنیف ہے دوسری انکے مشہور شاگرد مجروح کی جس کا چوتھا مصرع یہ ہے۔

ہائف نے کہا گنج معانی ہے تہ خاک

مجھے ڈاکٹر مورٹن کے خط سے یہ معلوم کر کے صدمہ ہوا کہ اگلی یا دوسری برسات تک غالب کی قبر بالکل نیست و نابود ہو جائے گی۔ میں امید کرتا ہوں کہ قبل اس کے کہ آئندہ برسات کا موسم ختم ہو دلدادگان غالب انکی قبر پر ایک شایان شان اور قیام پذیر یادگار قائم کر دیں گے اس کے کہنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ مجھ سے جو خدمت ہو سکے گی میں بہت خوش ہوں گا۔ "

حامد علی خاں

لکھنؤ۔ ۷۔ جون ۱۹۱۱ (ماہنامہ معیار لکھنؤ۔ مئی ۱۱ ۱۹ء)

یہ تحریک کس طرح پر آگے بڑھی۔؟ اس سلسلے کی درمیانی کڑیاں، میں فراہم نہیں کر سکا۔ لیکن قدیم اخبارات و رسائل سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ مزار غالب کی تعمیری تحریک کئی سال تک سبک خرامی کے ساتھ چلتی رہی! اور نصف صدی ادھر اس تحریک میں اتنی جان پڑ چکی تھی کہ بعض ادبی رسائل نے اس تحریک کو اپنے رسائل کی توسیع اشاعت کا ذریعہ بنالیا تھا۔ چنانچہ ماہنامہ "نظارہ" میرٹھ بابتہ ماہ نومبر دسمبر ۱۹۱۶ء (جلد ۳ شمارہ ۵-۶) میں پورے ایک صفحہ کا اعلان چھپا تھا اور اس اعلان کے ذریعہ "نظارہ" کے خریداروں کو یہ پیش کش کی گئی تھی کہ انکے سالانہ چندہ سے ایک روپیہ مزار غالب کے

"تعمیری خدمت" ماہنامہ "نظارہ" میرٹھ براہ راست نہ سہی - بالواسطہ اسی عظیم تحریک کا نمائندہ تھا جسے گذشتہ صدی کے آخر میں نسخہ دیوان غالب مجد دالسنہ مشرقیہ مولانا احمد حسن شوکت میرٹھی لیکر اٹھے تھے۔ شوکت میرٹھی اپنے عہد کے ان وقت شناس لوگوں میں جنہوں نے وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے میں کبھی غفلت نہیں برتی۔ اب سے کم وبیش پچہتر سال قبل انھوں نے غالب اس مقبولیت کا اندازہ کرلیا تھا جو آج انھیں حاصل ہوئی ہے۔ لیکن اپنی "آمنی بازار" قائم رکھنے کے لئے انھیں جو راستہ اختیار کرنا پڑا وہ مستحسن نہ سہی پھر بھی انکے افتاد مزاج کے مطابق ضرور تھا۔ "حل کلیات اردو مرزا غالب دہلوی" کے نام سے ۱۸۹۹ء انھوں نے غالب کی جو شرح لکھی تھی وہ کلام غالب میں تحریف و تصرف کا ایک ایسا المیہ ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

یقینی طور پر تو کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن میرا قیاس یہی ہے کہ ماہنامہ نظارہ میرٹھ کی اس "تعمیری تحریک" کو شوکت میرٹھی کی ضرور رہنمائی حاصل ہوئی ہوگی کیونکہ اس کے "کاروباری پہلو" اسی افتاد مزاج کی عکاسی کرتے ہیں جو شوکت میرٹھی کا خاصہ مزاج تھا۔

ماہنامہ نظارہ میرٹھ میں یہ اعلان "اشتہارات" کے ضمن میں کیا گیا ہے جو درج ذیل ہے۔

"مزار غالب"

"حضرت غالب دہلوی رحمتہ اللہ علیہ وہ بزرگ عالی مقام ہیں جن کے نام کو زندگی ہی میں حیات جاودانی حاصل ہوچکی ہے اور وہ اپنے علمی کارناموں کے باعث آج تک زندہ ہیں۔ لیکن یہ قاعدہ ہے کہ جب ایسے بزرگ دنیا کو چھوڑ دیتے ہیں اور عالم اجسام کو خیرباد کہہ کر عالم ارواح میں اپنی مبارک ہستی کو منتقل کر دیتے ہیں تو دنیا والے ایک ان کی یادگار بنا لیتے ہیں اور اسی کو "مزار" کہا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دہلی کی خاک پاک انگیز ... نے اپنے صحف افزار ... کو اس طرح برباد کیا ہے کہ ان کا نشان بھی نہیں ملتا مگر لصیرت کی نظروں ... تک ان کی ... نہیں اور نہ ... ہونے والے ہیں۔

دنیا کے لئے ضرورت تھی کہ غالب جیسے زبردست شاعر کا سایہ کبھی اس کے سر سے نہ اٹھتا مگر جب حوادث نے اسکے خلاف عملدرآمد کیا ہے اور یہ صورت پیش آئی ہے تو آپ ہی فرمائیے "غالب کے مزار" کی کس قدر ضرورت ہے جس معجز بیان نے "ادب اردو" کے قالب میں تازہ روح پھونکی جس عیسیٰ نفس نے ایشیائی شاعری کو از سر نو زندہ کیا ہم اس کا مزار بنانے پر بھی قادر نہیں ہیں حیف

ہزار افسوس ہم پر اور ہماری بدنصیبی پر

ہم اسلاف کے خلف تو ضرور کہلاتے ہیں۔ مگر انکے ... ایسے بھولے ہوئے ہیں کہ گویا نہ وہ ہمارے تھے اور نہ ہم ان کے ہیں ——

اس امر کی تحریک عرصہ سے ہو رہی ہے مگر اب تک عملی کارروائی کچھ بھی نہیں۔ ہماری زندہ دلی تو اس وقت پایۂ ثبوت کو پہونچ سکتی ہے کہ ہم "غالب" کی مکانی یادگار "قائم کرلیں اور آج ہی سے اس کی بنیاد ڈال دیں۔

ہم بذات خود کسی قابل نہیں تاہم ہرامکانی امداد کے لئے ہمہ تن موجود ہیں۔ اپنی جیب سے' پانچ روپیہ' دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہمارے معزز امراء اس قلیل رقم کو بڑھا دینگے اور ہماری تحریک کی لاج رکھ لیں گے۔

بعض اصحاب کے اصرار سے ہم مکرر اعلان کرتے ہیں کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۲ء تک "نظارے" کے رجسٹر میں جس قدر خریداروں کا اضافہ ہوگا ہر خریدار کے سالانہ چندہ (-/۳ روپے) میں سے ایک روپیہ' اس کار خیر کے لئے وقف کیا جائیگا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت غالب کے معتقد اور انکے نام کے زندہ رکھنے والے کیا کرتے ہیں۔؟ "نظارہ" ہی اپنی خوبیوں کے اعتبار سے تین روپیہ سالانہ چندہ میں مفت برابر ہے لیکن اب ہم خرما و ہم ثواب' کا حساب (بوسیدہ) علم دوست حضرات اپنی دریا دلی کو کام میں نہ لائیں تو سخت افسوس ہے۔

مینجر "نظارہ" میرٹھ

(ماہنامہ نظارہ بابتہ نومبر و دسمبر ۱۹۱۲ء جلد ۳ شمارہ ۵)

مگر۔ ان تاریخی شواہد کے باوجود مزار غالب کی تحریک کے صحیح خد و خال سامنے نہیں آسکے۔ اور میں اس جستجو میں ناکام رہا کہ آیا اس تحریک کو کسی مرکزی قیادت کی رہنمائی حاصل تھی یا مختلف تحریکیں منتشر حالت میں کام کر رہی تھیں۔ البتہ حامد علی خاں بیرسٹر کے ایک مراسلے سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ اس قسم کی ایک تحریک دلی میں سرگرم کار تھی۔ حامد علی خاں بیرسٹر نے اپنے ۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء کے ایک مکتوب میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرت غالب کے مزار کی مرمت کی نسبت پھر تحریک شروع ہوئی ہے ایک کمیٹی با اثر دہلی میں قائم ہوئی ہے مخدومی مکرمی جناب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب حاذق الملک نے میرے اصرار سے خدمت "خزانچی" قبول فرمائی ہے تخمیناً کل دو ہزار روپیہ کی ضرورت ہے یہ رقم کوئی بڑی رقم نہیں ہے ہزار ہا دلدادہ و قدر دان کلام غالب کے ہندوستان میں موجود ہیں۔ ذرا سی توجہ فرمائیں اور جو رقم انکے امکان میں ہو وہ براہ راست جناب حکیم صاحب موصوف کی خدمت میں بھیج دیں۔ پتہ یہ ہے۔ "محلہ بلی ماران دہلی"، میں نے پچاس روپیہ جناب حکیم صاحب ممدوح کی خدمت میں بھیج دیئے ہیں اور اس امر کا اظہار محض اس وجہ سے کرتا ہوں کہ مجھ کو بعد بھیجنے اپنی رقم کے یہ استحقاق میری رائے میں حاصل ہوا ہے کہ میں ان صاحبوں کی خدمت میں جن کو "مرمت" مزار غالب" میں دلچسپی ہو یہ عرض کروں گا کہ اپنا چندہ براہ راست جناب حکیم صاحب ممدوح کی خدمت میں بھیج دیں"۔

حامد علی خاں

محلہ سدو۔ امروہہ۔ ضلع مراد آباد

(صفحہ ۲۔ ماہنامہ معیار لکھنؤ۔ جنوری ۱۹۱۷ء۔ جلد ۱ شمارہ ۱)

حامد علی خاں کے اس مراسلے پر ماہنامہ "معیار" کے ایڈیٹر مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی نے ایک تائیدی نوٹ بھی لکھا

ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

"آپ (حامد علی خاں بیرسٹر) نے مرمت " مزار غالب کے متعلق پھر تحریک کی ہے کیا ہمارے لئے یہ بات افسوسناک نہیں کہ ایک مدت سے اخبارات و جرائد میں یہ مسئلہ پیش ہے مضمون نگار لکھتے لکھتے عاجز ہو گئے۔ اخبارات اپنے فرائض ادا کر چکے مگر ہنوز روز اوّل ــ سمجھنے والے سمجھے ہونگے کہ خاک کے ڈھیر کا سنوارنا ہی کیا ؟ لیکن انکو نہیں معلوم! اگر اس قطعہ زمین کی تشریح کوئی عرش پیما دماغ کرے تو اسکو کیا نظر آئیگا ؟ امید ہے کہ ارباب ادب اس کی طرف توجہ فرمائینگے۔ ہماری قوم میں ایسے افراد ہیں جو تنہا اس فرض کو ادا کر سکتے ہیں۔ کیوں غالب کی روح کو جنیدہ شرمندہ کریں۔

بھرا رکش دنیا سے تم اپنے مکانوں کو
مٹانے جاؤ لیکن یوں بزرگوں کے نشانوں کو

نگاہ عبرت انزا غیر قوموں کے مقابر پر
پھرا شک خوں بہانا چاہئے اپنے اکابر پر

زمیں میں دفن کر کے جنکو پھر کروٹ نہ لی تم نے
خدا معلوم کیونکر دی انھیں مٹی بھی تم نے

نہیں کیا امتیاز اے قوم کوئی تیرے ناموں میں
ہزاروں انسو کیا جنسے کی ضرورت ایسے کاموں میں

بہت سے نام ہیں ایسے سرفہرست عزت میں
جو اہر صرف کر دیں جو تن تنہا عمارت میں

مگر جب انکی دل سوزی کا پہلو کم نکلتا ہے
بجائے شمع ان باتوں سے دل محفل میں جلتا ہے

(عزیز لکھنوی)

لیکن ـ یہ تحریک سرسبز نہیں ہو سکی اور مرزا غالب کا مدفن مدتوں حوادث زمانہ کا شکار رہا۔ چنانچہ انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد پھر یہ تحریک اُبھری۔ اور ۱۹۵۵ء میں اس کام کی بہت کچھ تکمیل ہو گئی جو برسہا برس سے تشنۂ تکمیل تھا۔ جناب مالک رام صاحب نے " ذکر غالب " (چوتھا ایڈیشن) میں لکھا ہے۔

"مرور زمانہ سے قبر بلکہ قبرستان ہی کی حالت بہت خستہ ہو گئی تھی۔ کئی مرتبہ ملک میں تحریک ہوئی کہ اس مایۂ ناز شاعر کا مقبرہ تعمیر کیا جائے جو خود اس کی شان کے بھی شایان ہو اور اسکے مداحوں اور رتبہ شناسوں کے لئے بھی باعث فخر! دو تین مرتبہ کچھ روپیہ بھی اکٹھا ہوا لیکن عملی کام زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھا۔ آخر کار بعض اصحاب علم و ذوق نے " غالب سوسائٹی " کی تشکیل کی۔ چندہ جمع کیا اور موجودہ سنگ مرمر کی چوکھنڈی " تعمیر کرادی۔ اس کا افتتاح ۱۵ فروری ۱۹۵۵ء کو ہوا تھا جو مرزا کا یوم وفات ہے"

(صفحہ ۱۹۷ ـ ذکر غالب)

یہ صحیح ہے کہ غالب کا مزار اہل علم و ادب کی قدر شناسیوں کی بدولت اب کسمپرسی کے بھنور سے باہر نکل چکا ہے۔ اور اس کے گرد سنگ مرمر کی جالی تعمیر کی جا چکی ہے ـ لیکن یہ سوال اب بھی باقی ہے کہ غالب کی یہ یادگار ان تقاضوں کو پورا بھی کرتی ہے یا نہیں ؟ جو غالب جیسی عظیم شخصیت کی شایانِ شان ہونا چاہئیں۔

رئیس امروہوی

غالب کی صد سالہ یادگاری تقریبیں

سُنتے ہیں کہ اردو کے معلّیٰ کے سخن ور!
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اور خود بھی ہے اُس مردِ قلندر کا یہ دعویٰ — حق نے مجھے بخشا ہے سخن اور زباں اور
غالب کا ہر "اندازِ بیاں" [illegible] ہزار — غالب میں ہے اک ندرتِ پیدا و نہاں اور
وہ تازگیٔ فکر وہ ایجادِ معانی — یہ لطف کہ ہر لفظ میں معنی کا نشاں اور
غالب کو جو پڑھتے ہیں تو ہوتا ہے یہ محسوس — جس طرح کہ اردو ہے کوئی ایک زباں اور
ویرانۂ ابیات و خراباتِ غزل میں — اِس شخص نے آباد کیا اپنا جہاں اور

آزاد رہے از بسکہ نبرد دو جہاں سے!!!
حضرت نے بنائے ہیں زماں اور مکاں اور

غالب کا مکاں وسعتِ دنیائے تخیّل — زندانِ شب و روز میں غالب کا زماں اور
کہتا ہے کہ اشکالِ مطالب کے سبب سے — "رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور"
کہتا ہے کہ گو بت شکنی میں ہیں سبک دست — "ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور"
"یارب! نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات" — لب پر ہے دمِ بذلہ طرازی یہ فغاں اور
اور بذلہ طرازی میں ہے یہ عرض بھی شامل — "دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور"
کہتا ہے کہ تم شہر میں ہو پھر ہمیں کیا غم — "لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور"

واوین میں تمام مصرعے غالب کی مشہور غزل سے ہیں [illegible] اُن کے [illegible] کے نمبر [illegible]

لیکن یہ دل و جاں کی تجارت ہے نقطۂ رمز
بازار ہے غالب کا جدا اور دکاں اور

کس جوش سے کہتا ہے کہ دل کھول کے روتا　　"ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور"
سرتا بہ قدم دیدۂ خونابہ فشاں تھا　　خونابہ فشانی سے تھی رنگینیِ جاں اور
مرتا تھا اِس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے　　"جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور"
سچ یہ ہے کہ فیضانِ حیات ابدی سے　　ہر لحظہ میسر تھا اُسے جلوۂ جاں اور
کچھ اور بھی یلغارِ خزاں میں تھا شگفتہ　　بڑھتا تھا بہ رسالی تو ہوتا تھا جواں اور

کہتا ہے کہ لوگوں کو ہے خورشید کا دھوکہ
"ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور"

غالب کے وہی داغِ نہاں صورتِ خورشید　　ہیں تازہ و درخشندہ گہر جلوہ فشاں اور
ہر چند زباں اور بیاں ایک ہے سب کا　　غالب کی زباں اور ہے غالب کا بیاں اور
سچ یہ ہے کہ ایسے نہیں انداز سخن کے　　ہے تیرِ تفکر تو اس کی ہے کماں اور
ورنہ [illegible] کمالِ [illegible]　　ہر ایک نشانے کے لیے جس کا نشاں اور
بیدل کے تخیل کا ہے کچھ اور ہی [illegible]　　غالب کی ہے سرمستیِ افکارِ جواں اور
فیضی و نظیری کے مضامین ہیں بے مثل　　غالب کی ہے رعنائیِ طبعِ ہمہ داں اور
[illegible] ہیں صائب و عرفی کے سخن سے　　غالب کی ادا اور ہے غالب کی فغاں اور
الفاظ کے پردے میں معانی کی ہیں تہیں　　ہے باغِ بیاں اور ہے براقِ نہاں اور
جاتا ہے بہ تحقیق ہر اک طرزِ سخن کو　　[illegible] ہے ہر پیشہ کہاں اور
شایانِ [illegible] بھی اپنی نظیر [illegible]　　[illegible] قبیلۂ معنی نگہاں اور
[illegible]　　[illegible] دیدۂ دوراں اور
[illegible]　　ایسا تو نہ ہوگا ہمہ گیر و ہمہ داں اور

[illegible] مسند [illegible]
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

جناب ڈاکٹر سید محمود پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا
سابق وزیر تعلیم بہار (بھارت)

کشّافِ رازِ فطرت
مرزا اسداللہ خان غالب

دیوان غالب اکتوبر ۱۹۱۹ء کو آب و تاب کیساتھ شائع کرنے کا خیال سب سے پہلے میرے معزز دوست سید راس مسعود صاحب بی اے (آکسن) کو ہوا۔ ادبیات سے جو شوق ان کو ہے غالباً وہی اس بات کا محرک ہوا کہ اردو علم و ادب کے خدائے سخن کو اس کس مپرسی کی حالت میں نہ رہنا چاہیے کہ جس میں وہ اب تک ہماری غفلتوں اور لاپرواہیوں سے پڑا ہوا ہے۔ غیر ملکوں کے لٹریچر کے مطالعے نے ان پر ثابت کیا ہوگا کہ قومی یا ملکی ترقی کیلئے اعلیٰ علم ادب کس درجہ ضروری اور لازم ہے اور بغیر اس کے کوئی قوم مدارج ترقی کے پہلے زینہ پر بھی قدم رکھنے کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ چنانچہ انکی تحریک پر مولانا نظامی بدایونی نے دیوان غالب کا پہلا ایڈیشن نفیس کاغذ اور صاف ستھری چھپائی کے ساتھ ملک میں پہلی بار شائع کیا۔ دوسرا ایڈیشن اور زیادہ عمدگی اور صحت کے ساتھ نکلا تعلیم یافتہ گروہ نے اسکی قدر کی جس سے پتہ چلا کہ اہل ملک غالب کی عظمت کو پہچانے اور اس ترجمان حقیقت کے فلسفیانہ خیالات کو سمجھنے لگے ہیں ان دونوں اشاعتوں کے بعد اس ہیچمرز نے نظامی صاحب کے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے تحریک کی کہ اب تیسرا ایڈیشن پاکٹ ایڈیشن کی صورت میں شائع ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی اور تجاویز پیش کیں مولانا نظامی نے میری تجاویز کو منظور کرلیا لیکن اس قصور کے بدلے ساتھ ہی میری سزا بھی تجویز کردی اور مجھ سے یہ فرمائش کی کہ تیسرے ایڈیشن کیلئے مقدمہ تم لکھو اور اس پر اصرار اور سخت اصرار ہوا کہ میں نے اپنی حماقت سے کچھ تو "الامر فوق الادب" کا لحاظ کرکے اور کچھ سزا کی اہمیت کو نہ سمجھ کر وعدہ کرلیا اگرچہ وہ میرے بس کا کام نہیں تھا حسن اتفاق سے آجکل دلی آیا ہوں اور یہ چند اوراق پریشان اسی پاک سرزمین پر لکھے گئے ہیں جہاں وہ کشادہ رازِ فطرت مرزا اسداللہ خان غالب بقائے دوام کا جام نوش کرکے پڑا سو رہا ہے۔

---

[1] مقدمہ دیوانِ غالب طبع سوم نظامی پریس بدایوں۔

[2] استاد مولوی رشید احمد صاحب انصاری پروفیسر مدرستہ العلوم علیگڈھ سے چند مفید مشورے ملے ان کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ مسٹر ممتاز حسن اور مسٹر رؤف علی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میری تصانیف میں لوگوں کو تیری ہی تصویریں نظر آتی ہیں

وہ آتی ہیں اور مجھ سے پوچھتی ہیں "وہ کون ہے" مجھے نہیں معلوم انھیں کیا جواب دوں؟ تیرے فسانے اپنے غیر فانی نغموں میں سنایا کرتا ہوں مانند لب اختیاریاں ہو جاتا ہے۔ وہ آتے ہیں اور مجھ سے پوچھتے ہیں "بتا ان سے تیرا کیا مطلب ہے" میں نہیں جانتا ان کو کیا جواب دوں۔ میں کہتا ہوں "آہ کون جانتا ہے ان کا کیا مطلب ہے"

(ٹیگور)

شاعری کیا ہے اس کا جواب کچھ آسان نہیں سینٹ آگسٹن نے اس کا جواب ایک دلفریب پیرایہ میں دیا ہے وہ کہتا ہے کہ "اگر مجھ سے نہ پوچھو تو مجھے معلوم ہے اور اگر پوچھو تو مجھے معلوم نہیں" گو ہم سے ہر شخص کو اس کا جبلی احساس ہے کہ شاعری کسے کہتے ہیں لیکن اس احساس کا صحیح الفاظ میں اظہار اگر غیر ممکن نہیں تو دقت طلب ضرور ہے۔ شاعری اس فن کا نام ہے جو قوت متخیلہ کے توسل سے انبساط اور حقیقت کو ملا دیتا ہے اور اس کا نتیجہ ایجاد ہوتا ہے۔ کارلائل کہتا ہے کہ شاعری ایک موسیقانہ خیال ہے شیلے اس کی تعریف یوں کرتا ہے کہ شاعری قوت متخیلہ کا انکشاف ہے۔ دراصل یہ وہ فن ہے کہ جس کے ذریعہ سے لفظوں کا استعمال کر کے پردہ تصویر پر خیالی نقش و نگار ثبت کئے جاتے ہیں۔ جو کام مصور رنگوں کے استعمال سے لیتا ہے وہی کام شاعر الفاظ کے ذریعہ سے نکالتا ہے۔ شاعری جذبات اور خیالات کی بولتی ہوئی تصویر اور حسن و حقیقت کی تشریح ہے۔ یہ انسانی قلب کے کیفیات کو شیریں زبان کے ذریعہ سے معرض بیان میں لاتی ہے۔

لٹریچر انسانی زندگی کی ایک تفسیر ہے۔ شاعری انسانی قلب کیلئے ان امور میں تسکین دہ ثابت ہوتی ہے جن کا فطرت نے کوئی انسداد نہیں کیا۔ شاعری کے اصلی مفہوم کیلئے ضروری ہے کہ خواہ شاعر فلسفی ہو یا نہ ہو لیکن اس کی شاعری کی عمارت ایسی مستحکم بنیاد پر قائم ہو جس میں تنزل نہ آسکے

ہر ایک شاعر کیلئے یہ امر ضروری ہے کہ جب تک اس کی غرض عالم حسن سے محض ذوق سرور حاصل کرنا ہے اس کی قوت متخیلہ کی پرواز کے لئے کافی وسعت ملنی چاہئے۔ لیکن جب وہ مصلح بنتا ہے تو ہم اس امر کے طلبگار ہوتے ہیں کہ اس کی تعلیم و تلقین وہم و ادراک کے واسطے اطمینان بخش ثابت ہو اور تیز تخیل کیلئے دلکش اور قلب کیلئے موثر ہو۔ حقیقی شاعری ہماری نگاہوں میں وہ تخیل پیدا کرتی ہے جس سے ہم حسن کی جلوہ افروزیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ نیز روحانی معنی کے دروازے ہماری آنکھوں کے سامنے کھل جاتے ہیں۔ غالباً ہم میں ایسے اشخاص کم ہونگے جو شاعرانہ بصیرت اور ادراک سے محروم ہوں۔ اور جن کے حصہ میں یہ حسین تخیل اور خداداد جوہر نہ آیا ہو۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ تھوڑی بہت شاعرانہ استعداد جو خداوند عالم نے ہم میں ودیعت کی ہے مادی تاثرات کے عمل سے ایک عرصہ بعد بالکل مفقود اور کالعدم ہو جاتی ہے۔

فطری شاعری وہ ہے جس میں مجازی حسن کے مشاہدے اور حقیقی معنی کے ادراک کی قوت ہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس میں فطرت کی طرف سے ایسی قوت ودیعت کی گئی ہو جس سے وہ اپنے مشاہدات اور محسوسات کو ایسے رنگ میں بیان کرے کہ ہماری آنکھوں

میں کامیاب ہو جائے اور ہمارے جذبات مشتعل ہو جائیں۔ وہ ہمارے قلوب کو اپنی طرف کھینچے اور اپنے الفاظ کی کشش اور بیان کی رنگینی سے ہمارے سامنے وہی تصویر کھینچ دے جس کو وہ خود دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ شاعری ہمارے تخیل کو اشتعال اور ہماری ہمدردی کو مستحکم کرتی ہے اور ہماری شاعرانہ ترجمانی کی قوت کو رفتہ رفتہ بڑھاتی ہے۔ لیکن اگر تخیل اور احساسات کے ذریعہ سے اسرارِ حیات کی ترجمانی کا نام شاعری ہو تو اس کو سب سے بڑی اہمیت اس قوت سے حاصل ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ زندگی کے اہم ترین معاملات ہماری نظر کے سامنے پیش کرتی ہے۔ دنیا کے بڑے اور نامور شعراء ہمیشہ مانتے آئے ہیں کہ زندگی ہی شاعری کی بنیاد ہے زندگی سے ہی اس کا تعلق ہے اور زندگی سے ہی اس کا وجود ہے۔

اس بنیادی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے شعراء نے کارنمایاں کئے ہیں اور زندگی کو خوبی سمجھنے اور صحیح ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے اور در اصل یہی ان کی عظمت کا ثبوت ہے کلام میں خاص خاص خیالات کی محض موجودگی یا غیر موجودگی سے کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ بلکہ جو چیز کسی شاعر کے کلام کو زیادہ مؤثر بناتی ہے وہ در اصل اس کا وہ پیرایۂ بیان ہے جس میں خیالات کا اظہار کیا ہو کسی نظم کے مطالعہ کے وقت شاعر کی وسعت نظر اور اس کی ذہنیت کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیے اور پھر اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے جو شاعر کو انفرادی حیثیت سے متمیز کرتا ہے۔ غالب کی شاعری پر تنقیدی نظر حقیقتاً کچھ آسان کام نہیں ہے اس کی بلند پروازی اور شوکتِ خیالات اس کا تعمق اس کا فہم رسا اور عظمتِ تخیل اس کا عجیب اور انوکھا طریقۂ بیان اور اس کی صناعی وہ چیزیں ہیں جن کو بخوبی سمجھنا اور الفاظ کے ذریعہ سے بیان کرنا میری استعداد سے بالاتر ہے۔

مولانا حالی جیسا نکتہ رس، اور صاحبِ ذوقِ سلیم اس کام کو سرانجام دینے کی قابلیت رکھتا ہے۔ مولانا حالی کی کتاب یادگارِ غالب بیشک ایک قابلِ قدر تصنیف ہے۔ لیکن یہ محققانہ و عالمانہ تصنیف بھی شیدائیانِ غالب کی پیاس نہ بجھا سکی وہ غالب کی حقیقی عظمت کا بہت تھوڑا حصہ ظاہر کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ مولانا مرحوم نے زمانہ کی قدر ناشناسی اور ابنائے زمانہ کی منشائے استعداد قابلیت کا خیال کر کے کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدرِ عُقُولِهِم کے دانشمندانہ مقولے پر عمل فرمایا ہو۔ اور ان دقائق کا اظہار مناسب نہ سمجھا ہو جن کو صرف انہی کی چشمِ بصیرت کلامِ غالب میں دیکھ سکتی تھی۔ لیکن اس نئے دور میں مغربی تعلیم نے ہندوستان میں ایک ایسا نوجوان پیدا کیا تھا جس نے مرزا غالب کی عظمت حقیقی معنوں میں پہچان لی تھی اور جو غالب کے کلام کو اپنے حسنِ معانی کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کرنے والا تھا جس سے فلسفی اور صوفی شاعر اور سائنس داں سب ہی متحیر رہ جاتے ہیں۔ آہ عبدالرحمٰن عمر نے تیرے ساتھ وفا نہ کی اور تو ملک اور قوم کی یہ عظیم الشان خدمت انجام نہ دے سکا۔ غالب نے ایسے ہی موقع کے لئے اور شاید تیرے ہی واسطے کہا ہو۔

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی رحمٰن
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

یہ نوجوان فلسفی جو شاعرانہ تخیل سے بھی بہرہ ور تھا۔ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں مقدس

دیباور دیوانِ غالب کون شخص ہے جو دیوانِ غالب کے مطالعہ کے وقت یہ محسوس نہیں کرتا کہ اس کا لکھنے والا حقیقی ماہرِ فن ہے اور شاعری خدا کی طرف سے اس کو ودیعت کی گئی ہے اور اس کی شاعری کسبی نہیں ہے اس کی شیریں بیانی اور مذاق سلیم اس کی بلاغت و فصاحت اس کی عظمت اور بلندیٔ خیال اس کے مدیح و خوشی اس قدر دقیق اس قدر لطیف اور اس قدر نازک ہیں کہ ضبط تحریر میں لانے کی گنجائش نہیں۔

غالب کی ہستی ان چیدہ اور بزرگ ترخاصان خدا کے گروہ سے ہے جن کا وجود ابدی ہے۔ غالب کی نکاوت و بزرگی اس کی مستحق تھی کہ اس کی شہرت چار دانگ عالم میں ہوتی وہ ایک غیر معمولی طور پر ذکی پیشین گو فلسفی اور ایک بلند پایہ شاعر ہے جس کے قصائد انوری و خاقانی کے قصائد سے کم نہیں۔ جس کی غزلیات عرفی و طالب کی غزلیات پر فوقیت رکھتی ہیں جس کی رباعیات فارسی میں عمر خیام کی رباعیات سے کم وقیع نہیں اور جس کی نثر ابوالفضل اور ظہوری کی نثر سے کہیں زیادہ شاندار ہے وہ حسنِ حقیقت کا پرستار ہے اور زندگی کے مختلف ترانوں کا مغنی اگر وہ ایک طرف آتشِ سیال اور شہر میں گلاب کی تعریف میں نغمہ سرا ہوتا ہے تو دوسری طرف فلسفہ کے دقیق اور اہم ترین مسائل کا انکشاف کرتا ہے اس کی فارسی و اردو دونوں دیوان مسلم دادب کے بیش بہا جواہر ہیں ان میں لعل و یاقوت گوہر زمرد سب ایک جا جمع ہیں۔

غالب ایسے وقت بزم شعرا میں رونق افروز ہوا جب کہ اسلامی سروج کا آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ ملک میں ہر طرف ایک عالم پریشانی طاری تھا اور مشرقی اور مغربی تہذیب کا تصادم ہو رہا تھا پرانی وضع اور پرانا تمدن رفتہ رفتہ نیست و نابود ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت ہر صاحب نظر لسان العصر حضرت اکبر آبادی کے زبان سے یہ ضرور کہہ رہا ہوگا۔

نئے انداز کی خوشیاں نئے اسباب غم ہونگے

پچھلے صفحہ کا حاشیہ

نشلہ اصل شعر میں رحمٰن کے بجائے لفظ عارف ہے یہاں رحمٰن سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری بی اے، ایل ایل بی پی ایچ ڈی کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ بھوپال کے سرکاری کتب خانہ میں مرزا غالب کے قدیم دیوان اردو کا ایک نسخہ دستیاب ہوا تھا جس میں وہ تمام نظمیں اور غزلیں موجود ہیں جن کو مروجہ دیوان کی ترتیب کے وقت مرزا نے خارج کر دیا تھا۔ یہ دیوان آگرہ میں نواب افتخار الملک جناب صاحبزادہ محمد حمید اللہ خان صاحب بہادر بھوپال کے حکم سے طبع ہوا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب سیکریٹری انجمن ترقی اردو نے رسالہ اردو حصہ اول میں اس تبصرہ کو جو مرحوم ڈاکٹر نے کلام غالب پر لکھا تھا "محاسن کلام غالب" کے عنوان سے شائع کر دیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ نادر تصنیف ضائع نہ ہوئی اور اس جواں مرگ فلسفی کی محنت رائیگاں نہ گئی۔

اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہم غالب کے کلام میں افسردگی اور تسلیم و رضا کی نمایاں علامات پاتے ہیں۔ انسانی رنج و خوشی کا احساس اور اس سے ہمدردی اور اس احساس ہمدردی کا عجیب پرمعنی پیرایہ اور دلکش الفاظ میں اظہار کچھ غالب ہی کا حصہ تھا وہ دوسرے شعراء کی طرح انسانی کمزوریوں پر قہقہہ نہیں لگاتا۔ بلکہ وہ خود ان کمزوریوں سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ روتا ہے۔ گناہ گار کا وہ سچا ہمدرد تھا اور اس ناچیز کی رائے میں یہی مصورِ فطرت کا یہ فرض اولین ہے۔ حضرت غالب کی دقیقہ سنجی ان کے ہمعصر اشخاص کی سمجھ سے بالاتر تھی اس لئے غالب کے کلام کی قدر و قیمت ان کے زمانے میں نہیں کی گئی۔ لیکن ہر ملک میں تقریباً تمام صاحبانِ فن و کمال کے ساتھ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ غالب کی ذات اس سے کیوں مستثنیٰ ہو سکتی تھی۔ یہ مبالغہ آمیز خودنمائی نہ تھی بلکہ اپنی خداداد مہارت اور بے نظیر کمال کا پورا یقین تھا جس نے اس خدائے سخن سے یہ اشعار کہلوائے۔

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن   این مے از قحط خریدار کہن خواہد شدن

ابھی پورے پچاس برس نہیں ہوئے کہ وہ کشاف حقیقت اپنے کلام جاودانی کی نغمہ سرائی چھوڑ کر عالم بقا کو سدھارا اور عاشق صادق اپنے معشوق حقیقی سے جا کر مل گیا۔ اور اس کے لئے پھر من و تو کا امتیاز باقی نہ رہا جیسا کہ اس نے خود کہا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

اتنے ہی تھوڑے سے عرصہ میں اس کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ اس کے دیوان کے متعدد ایڈیشن بار بار چھپ چکے ہیں اور ہر طرف سے مانگ ہے۔ بہت سے نئی تہذیب کے دلدادہ جو مغربی مادیت سے تنگ آ کر حقیقی خوشی کی تلاش میں سرگرداں ہیں انکو غالب کے کلام میں ایک کیفیت وجدانی و سرور روحانی کا وجد ملتا ہے جس سے ان کی طبع سلیم کو ایک گونہ تشفی و تسکین ہوتی ہے شعر کا کام نغمہ سرائی کر کے صرف بے چین دلوں کو مسرت بخشنا ہی نہیں بلکہ ملکی و قومی ترقی میں نمایاں حصہ لینا بھی ان کا فرض ہے شیکسپیر کا کلام انگلستان میں اور گوئٹے کا کلام جرمنی میں کچھ ملکی و قومی ترقی کا باعث ہوا اب آئندہ غالب کا کلام کہاں تک اور کس حد تک اس بدنصیب ملک ہند کی ترقی میں ممد و معاون ہو گا؟ اس کا جواب صرف آنے والی نسلیں دے سکتی ہیں

تعمق خیال خوبصورت اور قرینہ عجیب طرز ادا وسعت نظر عالمگیر ہمدردی و غمخواری انسان اور اس کے خصائل سے گہری واقفیت اور جوہر با تاثیر یہ تمام خوبیاں غالب کی نظم و نثر دونوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ غالب کے کلام میں شاعرانہ تخیل کی عظیم الشان بلندیاں پرسکون فلسفۂ زندگی انسانی زندگی کے رنج و خوشیاں زندگی کے مکروہات سے صاحبانِ دل کی کشمکش اور رنجیدہ دلوں کو تسکین و راحت دینے کی قوت سب کچھ موجود ہے صرف مطالعہ کرنے والے اہل دل و صاحب ذوق ہونا چاہئیں وہ ہم کو خودی کے تاریک غار سے نکال کر ایک غیر متناہی بلندی پر لے جاتا ہے۔ جہاں سے ہم وہ چیزیں دیکھنے لگتے ہیں۔ جنکے بیان سے ہماری زبان قاصر ہے۔

غالب کا مطالعہ کرتے وقت ہر ایک کو یہ احساس ہوتا ہے کہ گویا شاعر اسی کے جذبات دلی کی ترجمانی کر رہا ہے

اور یہی شاعری کا کمال ہے۔ تمام صنعتوں کا مقصد انسان کیلئے خوشی بہم پہنچانا ہے۔ انسان کس طریقہ سے خوش کیا جائے اس سے زیادہ، ہم سوال دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ سچی صنعت صرف وہی ہو سکتی ہے جو انتہا درجہ کی خوشی و لذت بخشے۔ نظم چاہے کتنی ہی دردانگیز کیوں نہ ہو پڑھنے والے کو اس سے بھی لطف و خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ غالب کی شاعری میں یہ خاص بات ہے کہ جتنا زیادہ درد و سوز مضمون ہوگا اتنا ہی زیادہ پڑھنے والا کو لطف حاصل ہوگا۔ بہرحال اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مرزا غالب کا کلام توحید، تصوف، حکمت، فلسفہ، عبرت، بے ثباتی دنیا، خودداری، جذبات حب الوطنی، ارتقاد، تشنگی، وحدت الوجود وغیرہ وغیرہ مسائل اور دوسرے راز فطرت کے بہت سے انکشافات سے پُر ہے۔ تقریباً تمام اردو شعرا کی غزل گوئی یہ ہے کہ پرانے پامال مضامین جو مدت العمر سے عربی پھر فارسی اور اس کے بعد اردو غزلوں میں بندھتے چلے آتے ہیں وہی مضامین بہ ہیر پھیر الفاظ معمولی طور پر چاشنی و رنگ رندی میں ادا کئے جاتے ہیں۔ بقول مولانا حالی میر، ذوق تک جتنے مشہور غزل گو اردو زبان میں گزرے ہیں ان کی غزلوں میں ایسے مضامین بہت کم نکلیں گے جن کی [illegible] ان کے لئے [illegible] یہ کہا جاتا ہے کہ جو مضامین پہلے بندھ چکے ہیں ان کو نئے اسلوب میں [illegible] کوئی نئی بندش [illegible] مرزا کی غزل میں ایسی نازک خیالی [illegible] جن [illegible] بالکل چھوا تک نہیں۔

مرزا غالب شارع عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے اور عامیانہ خیالات اور محاورات سے حتی المقدور اجتناب کیا کرتے تھے بلکہ عام محاورات کا استعمال وہ اپنے لئے معیوب سمجھتے تھے۔ عام فہم اشعار کہنے سے انہیں زیادہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے کہ ان کے طرز خیال اور طرز بیان میں ایک جدت اور نرالا پن پایا جاتا ہے اور یہ کہنا کسی طرح غلط نہیں ہے کہ مرزا اردو شاعری میں اپنے طرز کے موجد تھے۔ اوائل میں وہ بیدل کے کلام سے بہت کچھ متاثر ہوئے تھے موجودہ دیوان کی اکثر غزلوں میں بھی جا بجا اس کی شہادت ملتی ہے۔ اس دیوان میں اول سے آخر تک بے شمار ترکیبیں ایسی ملتی ہیں جو اردو شعرا کی عام شاہراہ سے بالکل الگ ہیں اور جن میں بیدل کا رنگ صاف طور پر نمایاں ہے مثلاً دام شنیدن، یک بیاباں ماندگی، ماتم یک شہر آرزو، دستگیر اندازہ، مجنوں [illegible]، [illegible] رنگ، شاداب رنگ، عرض ناز، شوخی دنداں، یک جہاں زانو تامل، رنگ تماشا باختن اس قسم کی بندشوں کے علاوہ جو کثرت سے ملتی ہیں بعض پوری غزلیں ایسی ہیں جن کو پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ قصداً بیدل کے رنگ میں لکھی گئی ہیں مثلاً

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب
دے بط مے کو دل و دست شنا موج شراب

پوچھ مت وجہ سیہ مستی ارباب چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موج شراب

جس قدر روح بناتی ہے جگر تشنۂ ناز

دے ہے تسکین بدم آب بقا موج شراب		یا مثلاً یہ غزل

یا مثلاً یہ غزل

عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں برائے خندہ ہے

دعوئے جمعیت احباب جائے خندہ ہے

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل

یک جہاں زانو تامّل در قفائے خندہ ہے

قصائد میں بھی تقریباً یہی حال ہے چنانچہ قصیدہ اوّل و دوئم اور خاص کر ان کی تشبیب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ بیدل کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں مگر وہ مقتضائے طبیعت کے خلاف تو کچھ اس راہ کے دشوار گذار ہونے کی وجہ سے اور کچھ معترضوں کی نکتہ چینیوں سے تنگ آکر رفتہ رفتہ اس روش کو چھوڑتے گئے اور اس کشمکش میں ایک ایسی متوازن طرز کی بنیاد پڑ گئی جس کو خاص مرزا کی روش کہنا چاہیئے۔

ان کے زمانے ایک طبقہ گروہ ان کی مشکل پسندی کے باعث ان کی شاعری کا قائل نہ تھا چنانچہ لوگوں کی مخالفت اور تنقید بازیوں سے تنگ آکر مرزا نے بارہا مختلف پیرایوں میں اس کا اظہار کیا ہے ایک جگہ فرماتے ہیں

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات

دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اس شعر میں اپنے مخالفین کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور ایک نہایت عمدہ پیرائے میں ان کی نافہمی پر چوٹ کی ہے۔ مندرجہ ذیل رباعی سے بھی اسی قسم کا مضمون مفہوم ہوتا ہے۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل

سن سن کے اسے سخنورانِ کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اب ملک میں زبان فارسی کا رواج اتنا کم ہوتا جاتا ہے کہ باوجود اس درجہ مقبولیت کے بھی غالب کے فارسی کلام سے بھی بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ان کے فارسی دیوان میں بھی وہ نایاب جواہر پوشیدہ ہیں جن کو منظرِ عام میں لایا جائے تو اُمور ثابت ہونگے مرزا کو اپنے فارسی کلام پر فخر تھا اور اس کا ذکر انہوں نے متعدد مقامات پر کیا ہے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجھکو ناز ہے کوئی ان کا لطف نہیں اٹھاتا"

اس زمانے کے خیال کے مطابق مرزا غالب اردو شاعری کو داخلِ کمالات نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اس میں اپنی کسرِ شان جانتے

تھے۔ چنانچہ ایک فارسی قطعہ میں جس کی نسبت مشہور ہے کہ اس میں ذوق کی طرف خطاب ہے۔ کہتے ہیں

فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ   بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

راست می‌گویم من و از راست سر نتواں کشید   ہرچہ در گفتار فخرِ تست آں ننگِ من است

ان شعروں میں اپنے فارسی گوئی کے جوش کمال میں مجموعۂ اردو کو اپنے لئے موجب ننگ بتایا ہے ورنہ حقیقت میں ان کا دیوان ریختہ کم از کلش کشمیر نہیں کی نفیس اور پاکیزہ تشبیہ سے کہیں بڑھ ہوا ہے غالب کے کلام و اشعار کی نسبت ایک عام خیال یہ ہے کہ ان میں سادگی و صفائی و سلاست جیسا کہ چاہیئے نہیں پائی جاتی۔ الفاظ کا انتخاب ان کی ترتیب اور جملوں کی ترکیب عموماً ایسی ہوتی ہے کہ سامع کا ذہن آسانی اور سرعت کے ساتھ معنی مقصود تک نہیں پہنچتا۔ بلکہ انتشار اور اشتباہ میں مبتلا ہو کر معنی مراد سے بھٹک جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غالب کے دیوان اردو میں بکثرت ایسے اشعار پائے جاتے ہیں کہ جن کے معنی مطلوب تک پہنچنے کے لئے فکر و ذہن پر حد معمول سے زیادہ بار ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سادگی و صفائی کی ضرورت ہوتی ہے سادگی و صفائی بیان جس طرح پامال اور پیش پا افتادہ مضامین اور روزمرہ کے سادہ واقعات کیلئے حسن کلام ہے۔ اسی طرح دقیق و غامض اور بلند و پیچیدہ خیالات کے لئے بھی حسن کمال ہے۔ لیکن دونوں قسم کے مضامین اور تخیلات کیلئے سادگی کلام اور صفائی بیان کا معیار ایک نہیں ہو سکتا در حقیقت کسی کلام کی سادگی یا غیر سادگی کا فیصلہ کرنے میں محض الفاظ کے مانوس کثیر الاستعمال اور عام فہم اور ترکیب کے عامیانہ اور بے ربط ہونے یا نہ ہونے کو پیش نظر رکھنا کافی نہیں ہے بلکہ نفس مضمون کی نوعیت اور مقتضائے حال کا لحاظ رکھنا شرط ہے۔ [illegible] کلام غیر مانوس و متروک الاستعمال [illegible] الفاظ و کلمات سے پاک اور تعقید لفظی و معنوی سے محفوظ ہو۔ بلاغت کے مفہوم میں فصاحت کے علاوہ الفاظ اور ترکیب مقتضائے حال موافق ہونا داخل ہے۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کو اصطلاح فن میں فصاحت و بلاغت کہتے ہیں اسی کو عام فہم الفاظ میں سادگی و صفائی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

غالب کے کلام کو اس معیار سے جانچو تو صاف نظر آئے گا کہ اس کا اشکال سادگی و صفائی کی کمی یا بہ الفاظ دیگر فصاحت و بلاغت کے نقصان سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا باعث نفس مضامین کا دقیق اور فہم عوام سے بالاتر ہونا ہے۔ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ مرزا غالب کی کوشش ابتداء یہی رہی کہ وہ مرزا عبدالقادر بیدل کے رنگ کو اردو میں منتقل کریں۔ قطع نظر ان حصوں کے جو انہوں نے دوستوں کے اصرار سے اپنے دیوان سے خارج کر ڈالے۔ موجودہ دیوان میں بھی جا بجا اس کی صریح شہادتیں پائی جاتی ہیں جن کی طرف سے ہم ناظرین کو توجہ دلا چکے ہیں۔ غالباً اہل نظر واقف ہونگے۔ کہ بیدل کی خیال بندی کو سادگی اور سلاست سے کس قدر بعد ہے۔ لیکن ہم جرأت کے ساتھ کہتے ہیں کہ مرزا غالب کے کلام میں باوجود خیال بندی اور معنی آفرینی اور متانت و جزالت اور باوجود تشبیہوں کے جدت اور استعاروں کی طرفگی کے سادگی اور سلاست کا عنصر بھی ایک کافی حد تک موجود رہے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ دیوان کا ایک معتدبہ حصہ سادگی اور صفائی کا بہترین نمونہ ہے۔ ناظرین کی دلچسپی کیلئے اس قسم کے کچھ اشعار متفرق غزلوں میں سے ہم نقل کرتے ہیں۔

کوئی امید بر نہیں آتی　　　کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے　　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں　　　کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں　　　غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے　　　نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں　　　ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے　　　نالہ پابند نے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے　　　پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریب ہستی　　　ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب　　　آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

ابن مریم ہوا کرے کوئی　　　میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی　　　ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے　　　وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
نہ سنو گر برا کہے کوئی　　　نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی　　　بخش دو گر خطا کرے کوئی
جب توقع ہی اٹھ گئی غالب　　　کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

مندرجہ بالا اشعار جن غزلوں سے ہم نے لئے ہیں ان کا عام رنگ یہی ہے اور ایسی غزلوں کی کافی تعداد دیوان میں موجود ہے یہاں ہم شاعری کے ایک اہم نکتہ کی طرف ناظرین کی توجہ معطوف کرنا چاہتے ہیں جس سے مرزا کے مذاق سلیم اور اعلیٰ سلیقۂ شاعری

کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ دو یہ ہے کہ سادگی اور صفائی کی جو بحریں انہوں نے اختیار کی ہیں وہ بہت چھوٹی اور اس مقصد کیلئے نہایت ہی موزوں ہیں۔ دوسری بات قابل توجہ یہ ہے کہ مرزا کے کلام نے اس حصہ میں باوجود انتہائی سادگی اور سلاست کے اور باوجودیکہ اس کے بعض اشعار فارسی اضافات سے بھی عاری ہیں۔ غالب کا رنگ صاف طور پر عیاں ہے ملاحظہ ہو۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں — شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر — ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
سن اے غارت گرِ جنسِ وفا سن — شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا — دل جگر تشنۂ فریاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی — کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال — دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

ہے تجلی تری سامانِ وجود — ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں
کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ — ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

مرزا کے اچھوتے خیال۔ ان کی بلند پردازی اور تعمق مضامین کی مثال میں یہاں ہم چند اشعار نقل کرتے ہیں۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

کیا نفیس اور نرالا خیال ہے زندگی کا لطف اسی لئے ہے کہ لوگوں کو مرنے کا یقین ہے ورنہ دنیا کا کوئی کام بھی انسان کی سستی اور کاہلی کے باعث نہ ہوتا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اگر انسان کا وجود نہ ہوتا تو وہ خدا ہوتا پہلے مصرعہ میں کہہ چکے ہیں کہ کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

کیا شوخی ہے در پردہ خدا سے شکایت کرتا ہے گو بظاہر درخواست ہے کہ میرے بے شمار گناہوں کا حساب مجھ سے نہ طلب کر

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت[1] کو

علو خیال قابل ملاحظہ ہے دوزخ و بہشت کا خیال عشق حقیقی میں خارج ہوتا ہے اور ایسی طاعت اور ایسا سجدہ نیاز لا حاصل ہے جس میں دوزخ کا خوف ہو اور بہشت کی حرص و ہوس ہو۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود　　ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
[2]اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

جو لوگ تصوف کا مذاق رکھتے اور مصطلحات تصوف سے بھی واقف ہیں کچھ وہی لوگ اس شعر کا لطف اٹھا سکتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود　　قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

کیا بلند مرتبہ ہے اور کتنی منزلیں طے کر چکے ہیں جس جگہ اوروں کا مذہب انتہا کو پہونچتا ہے۔ وہاں سے حضرت غالب کا مذہب شروع ہوتا ہے۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام　　مہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گزارِ بادیاں

نئی نئی اور عجیب و غریب تشبیہیں اختراع کرنا کچھ انہیں کا کام تھا۔

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ　　دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

استعارات و کنایات میں بھی جو شاعری کے لطف کو دوبالا کر دیتے ہیں حضرت کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ قطرہ اپنی اصل یعنی بحر سے جدا ہوا ہے اور قبل اس کے وہ پھر بحر میں مل جائے۔ معلوم نہیں کیا کیا منازل اس کو طے کرنے ہیں اسے مسئلہ تناسخ سمجھو یا [illegible] صوفیا

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

---

[1] حضرت آسی فرماتے ہیں۔ ترے کوچہ میں جیسے ہو بسر یا حور و قصور　　کس جہنم میں اسے حرص و ہوا نے بھیجا

[2] حضرت آسی غازی پوری نے بھی اس مضمون کو نہایت عمدہ پیرایہ میں ادا کیا ہے

نظر و ناظر و منظور نہ جب ایک ہوئے　　کیا ملا روزِ قیامت ہیں ندامت کے سوا

کیا سادگی ہے اور رازِ حقیقت کا کیا ہی انوکھا انکشاف ہے۔

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

انسانی ہستی کا جزوِ اعظم محبت و عشق ہے اور انسان کے لئے محبت کا ہونا لازمی ہے۔ خواہ وہ محبت ملکی ہو یا قومی حقیقی ہو یا مجازی اس مطلب کو کس خوبی کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

ذوق کو یہ شعر نہایت پسند تھا اور اکثر کہا کرتے تھے کہ مرزا کو اپنے اچھے اشعار کی خود خبر نہیں ہوتی۔

بڑے بڑے فلسفی اپنے دقیق مسائل کا جواب اس الہامی کتاب دیوان غالبؔ سے تلاش کر سکتے ہیں۔ فلسفہ کا غالباً سب سے اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ وجہ آفرینشِ دنیا کیا ہے۔ ہر فلسفی نے اس کا جواب اپنی بساط کے موافق دیا ہے مرزا غالبؔ اس کا جواب یوں دیتے ہیں

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں

کس خوبی کے ساتھ دو مصرعوں میں مرزا نے اس مسئلہ کا حل کیا ہے مدار عالم حسن ہے اور حسن کا اظہار متقاضی ہے اس لئے دنیا عدم سے وجود میں آئی۔[1] صد شراب خانۂ خلدی میں حضرت کا ایک شعر حقیقت میں ایک دفتر معنی ہے اور جتنا اسے پڑھئے لطف اتنا ہی دوبالا ہوتا ہے۔ یورپ کے نامور شعراء کے کلام راقم الحروف کی نظر سے گزرے ہیں۔ لیکن اس موضوع پر اس پایہ کا ایک شعر بھی نہیں ملا۔ اسے صوفیاء کرام کے مسلک کی تشریح کہئے یا جو چاہے سمجھ لیجئے کیونکہ اس کی کیفیت الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتی

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

---

[1] اس مضمون کو حضرت آسی غازی پوری نے بھی نہایت خوبی سے ادا کیا ہے

حسن پھر کس کام کا جب چاہنے والا نہ ہو　　　سچ ہے تجھ سے دلربا کو لطف تنہائی نہ تھا

[2] غالبؔ کے سمجھنے میں مجھے جو مدد ایک عرصہ سے اپنے عزیز دوست مسٹر عبدالمجید ایم اے (کینٹ) بیرسٹر ایٹ لاء سے (جو خود بھی شاعر ہیں) ملتی رہی ہے اس کا اظہار اس جگہ شاید بے موقع نہ ہو اگر غالبؔ کی عظمت کو ایک ذرہ برابر بھی صحیح طور پر اس حقیر نے سمجھا ہے تو یہ انہیں کے فیض صحبت کا اثر ہے میں اپنے دوست کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ ان کی بدولت اس ناچیز چشم کور نے روشنی کی شعاعیں دیکھیں۔ محمود

اہل تصوف اگر اس جام جہاں نما یعنی دیوان غالب میں اپنا عکس دیکھنا چاہیں تو ان کو معلوم ہوگا کہ ان کے تمام دقیق مسائل کا حل کس خوبی کے ساتھ اس شیخ نے حل کیا ہے۔ کیا شعر ہیں اور کن رموز فطرت کا اظہار کیا ہے

ایک ذرّہ زمین نہیں بیکار باغ کا — یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز — پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

غالب کا مذہب قیود اور پابندیوں سے پاک ہے۔ وہ اس منزل پر ہیں کہ جہاں ہندو مسلمان کی تمیز باقی نہیں رہتی۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

مغربی تہذیب کے دلدادہ و شیدا اکثر فرماتے ہیں کہ غالب میں سوائے گل و بلبل کے افسانوں کے اور کیا رکھا ہے۔ ان کے دل حسن حقیقت سے ناآشنا ان کے دماغ جذباتی کیفیات سے بے بہرہ بھلا وہ ان رموز کو کیا سمجھیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے مرزا غالب نے لکھا ہے

مطلب ہے ناز و غمزہ دلے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

کاش غالب کو بھی کوئی فٹز جیرالڈ[1] مل جاتا جو اس کے کلام کے رموز و نکات کو کسی مغربی زبان میں اہل مغرب کے سامنے پیش کرتا اس بار عظیم کا بیڑا اگر سرورحبنی نامنہ و جو خود بھی معرفت الٰہی کی مطربۂ نغمہ سرا ہے اٹھائے تو کیا عجب ہے کہ اسے کچھ کامیابی ہو جائے۔

غالب کے کلام کی یہ عظمت اس کے تخیل و ادراک کا وہ عالم مگر افسوس غالب کا مزار دلی میں جس حالت میں پڑا ہوا ہے اسے دیکھ کر ایک فلسفی کا قول یاد آتا ہے۔ جس نے کہا تھا کہ "اگر تم کو کسی قوم کی حالت کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے مزارات پر چلے جاؤ" غالب کے مزار پر جا کر جو کیفیت مجھ پر طاری ہوئی وہ احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ مجھے ویمر میں گوئٹے[2] کے مزار کو دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے۔ ایک وہاں کی قدر دانی ہے اور ایک یہاں کی کس مپرسی دونوں کا فرق دیکھ کر اقبال کا مشہور

---

[1] یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے عمر خیام کا ترجمہ انگریزی میں کیا اور خوبیٔ ترجمہ کے باعث عمر خیام کا نام آج یورپ میں روشن ہے۔

[2] گوئٹے جرمنی کا سب سے زیادہ مشہور شاعر گزرا ہے جس کا زمانہ ۱۷۴۹ء سے ۱۸۳۲ء تک رہا اس کا معرکۃ الآرا ڈرامہ فاسٹ ہے وہ ویمر میں رہتا تھا اور وہیں مدفون ہے۔

شعر جو غالباً اس نے ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہو کر لکھا ہو گا بے اختیار میری زبان پر جاری ہو گیا۔

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے

گلشن ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

ہندوستانیوں کی زندگی کا خاتمہ بہ حیثیت ایک قوم کے ۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامہ سے پہلے ہو چکا تھا اور اس وقت کے مشہور شعراء اور صاحبانِ سیاست دونوں نے اسے محسوس کیا۔

اہلِ سیاست کے احساس کا نتیجہ ہنگامہ ہوا اور شعراء نے مختلف طریقوں سے اس پر نوحہ کیا۔ مرزا غالب کا احساس گہرا تھا اور انہوں نے نہایت پُر درد پیرایہ میں اس کا اظہار کیا ہے۔

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل　　انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لئے　　لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

پھر کہتے ہیں ؎　　ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے

یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد دلی اور نواحِ دلی پر آفتیں ٹوٹیں انہوں نے ہزارہا بندگانِ خدا کو بے خانماں کر دیا۔ شہزادے اور شہزادیاں جنگلوں میں مارے مارے پھرتے تھے۔ دلی اجڑ گئی اور شرفاء کے مکان ویران اور برباد کر دیئے گئے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا۔ ان واقعات کو مرزا نے بچشم خود دیکھا تھا۔ غالباً اسی کے متعلق فرماتے ہیں۔

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم

دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

اپنے ملک اور شہر کے لوگوں پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں ان پر مرزا خون کے آنسو بہاتے ہیں ایک خط میں لکھتے ہیں "یہاں اغنیاء اور امراء کی ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھرتے ہیں اور میں دیکھوں اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے" (اردوئے معلی صفحہ ۲۸۷) ملک کے تباہ ہونے دلی کے اجڑ جانے اور قومی ہستی مٹ جانے کا جو درد و غم مرزا کو ہے وہ ان کے خطوط سے جو اردوئے معلی میں موجود ہیں صاف عیاں ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں "لُون[1] لوٹی کوئی چیز ہے وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور اپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں حویلیاں ڈھائی جاویں گی دارالبقا فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا (اردوئے معلی صفحہ ۲۶) خاص مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے وہ ناقابل بیان ہیں۔ مرزا لکھتے ہیں "کہ مسلمان آدمی شہر میں سڑک پر بن ٹکٹ پھر نہیں سکتا"

---

[1] لُون ڈیوٹی سے مراد ہے

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں ‌ ‌ ‌ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
دل نہیں تجھکو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار ‌ ‌ ‌ اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

جو مصائب اہلِ ہند پر ۱۸۵۷ء کے کچھ پہلے اور پھر اسکے بعد نازل ہوئے وہ بجائے خود آئندہ کے لئے ایک سبق تھے جس کو مرزا نے کس خوبی سے ادا کیا ہے اور ان کی خواہش ہے کہ ان کے ہم وطن اس سے سبق حاصل کریں۔ اور آئندہ کیلئے متنبہ ہوں

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

دلی فتح ہونے کے بعد نہ صرف اہل دلی بلکہ تقریباً تمام ملک نے انگریزی سرکار کی اطاعت قبول کرلی اور طرح طرح سے اپنی وفاداری کا اظہار کرنے لگے۔ لیکن حکام انگریزی کا جوشِ انتقام کم نہیں ہوا ہنگامے کے حالات ان کو فراموش نہیں ہوئے لوگوں کو سزائیں دی گئیں امراء کی جاگیریں ضبط ہوئیں۔ غرباء کے مکانات مسمار کردیئے گئے۔ مرزا ان حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "نہ کوئی قانون ہے نہ قاعدہ ہے نہ نظیر کام آئے نہ تقریر پیش جائے اور پھر اس کا ذکر شکایت کے پیرایہ میں یوں کرتے ہیں۔

وائے محرومیٔ تسلیم و بداحالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

ایک اور جگہ رقم فرماتے ہیں "بھائی بری آبنی ہے" انجام اچھا نظر نہیں آتا۔" قصہ مختصر یہ کہ قصہ تمام ہوا۔ اور پھر جو سزائیں دی گئیں اس کی سختی کی گویا یوں شکایت کرتے ہیں۔

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کیواسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد فاتح کے جوشِ انتقام نے مفتوح کے ملک و دولت ہی پر قناعت نہ کی بلکہ ان کے سرمایۂ ناز کارنامے اور فنی و کمال یہاں تک کے ان کی تہذیب کو مٹانے اور برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ مرزا جیسے باکمال شاعر اور صاحب دل پر اس کا اثر نہ ہوتا۔ چنانچہ جس پوشیدہ مگر دردناک پیرایہ میں انہوں نے اس کا مرثیہ لکھا ہے حقیقتاً دل ہلا دینے والا ہے اور ہندوستان کی مٹی ہوئی عظمت کو یاد دلا کر خون کے آنسو رلاتا ہے۔ اس کے چند اشعار نقل کئے بغیر دل نہیں مانتا۔

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل

زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

ایک دوست کو لکھتے ہیں "بھائی ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہوگیا۔ لاکھوں مرگئے جو زندہ ہیں ان میں سینکڑوں گرفتار بند بلا ہیں۔ ایک دوسری جگہ شاہی خاندان کی تباہی کا ذکر یوں کرتے ہیں" معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں" حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں بہت کم فاتحین نے اپنے مغلوب حریف کے اہل و عیال و نسل کے ساتھ وہ غیر شریفانہ اور وحشیانہ برتاؤ کیا ہوگا جو کہ انگریزوں نے بہادر شاہ کے خاندان کے ساتھ روا رکھا ان تمام خیالات کے ہجوم سے مرزا اس قدر متاثر ہیں کہ جس کا اندازہ مشکل سے کیا جا سکتا ہے۔ اپنے درد دل کا اظہار مندرجہ ذیل اشعار میں کس خوبی سے اور پر درد الفاظ میں کرتے ہیں

گلشن میں بند و بست بہ رنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج
اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

غالب کے دیوان میں جگہ جگہ ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے ان کی حب وطن کا اظہار ہوتا ہے اور وہ بار بار اپنے ملک کی بد نصیبی پر روتے ہیں اور ایک جگہ فرماتے ہیں۔

ہندوستان جب کہ پایۂ تخت تھا
جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ
ہر داغِ تازہ یک دلِ داغِ انتظار ہے

عرض فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ

ایک خط میں لکھتے ہیں "خداوند نعمت کیا تم دلّی کو آباد اور قلعہ کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو؟ بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں (اردوئے معلی، ۲۰۳)

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں "ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری۔ اموال کیا ہوئے اشخاص کہاں گئے خاندانِ شجاع الدولہ کے زن و مرد کا کیا انجام ہوا۔ (اردوئے معلی ۲۰۹) ان تمام واقعات دلخراش پر روتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

یونہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

کس قدر معنی خیز اور درد ناک شعر ہے اگر مرزا غالب کے دیوان کو بغور پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کو اپنے ملک سے کس درجہ محبت ہے اپنے ضائع شدہ قومی وقار کا کس درجہ رنج ہے اور اپنی کھوئی ہوئی ملکی آزادی پر ان کے آنسو کبھی نہیں تھمتے فرماتے ہیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

اس وقت ملک کی جو حالت تھی اسے یاد کر کے کہتے ہیں۔

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

اور پھر اپنی ناچاری و مجبوری دیکھ کر صبر و شکر کی ہدایت کرتے ہیں

تاب لاتے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

اپنی ملکی آزادی کے جانے کے بعد ہر چند صبر کرنا چاہتے ہیں لیکن ضبط نہیں ہوتا۔ اور بے اختیار چیخ اٹھتے ہیں۔

بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

اسی غزل میں ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ حکومت ہی اصل میں قوموں کی زندگی کا باعث ہوتی ہے۔ اور جب کسی قوم کو حکومت حاصل ہو گئی تو گویا سب کچھ مل گیا اور اس قوم میں زندگی آ گئی

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا　　سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

جام کا اشارہ صاف سلطنت کی طرف ہے ایک موقع پر اپنے اہلِ ملک کو مخاطب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تم میں حب وطن کا سچا جوش ہے اور آزادی کی خواہش حقیقی ہے تو کوئی وجہ نہیں وہ اپنا اثر نہ کرے۔ حکومت و سلطنت کسی خاص شخص یا قوم کی ملکیت نہیں ہوا کرتی جیسا کہ جمشید کا خاتم اس کی ملکیت تھی۔

عشق تاثیر سے نومید نہیں جاں سپاری شجر بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے جام مئے خاتم جمشید نہیں

حب الوطنی آسانی سے نہیں اترتا اور جب کسی قوم میں اس کا احساس ہو گیا تو اس جنون کا دور کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اس مضمون کو مرزا غالب نے کس خوبی سے ادا کیا ہے

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا اور سلطنت کے مالک بن بیٹھے اس وقت سے برابر ان کا یہی دعویٰ رہا کہ وہ ہندوستان میں صرف ہندوستانیوں کے مفاد کی غرض سے حکومت کر رہے ہیں اور یہ کہا گیا کہ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کو رفتہ رفتہ دیدی جائیگی۔ یہاں تک کی ایسا وقت آئے گا جب حکومت کی ساری ذمہ داری اہل ہند کے سپرد کردی جائیگی۔ مرزا غالب کہتے ہیں اور حسرت و مایوسی کے ساتھ کہتے ہیں

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

اپنے درد کا اظہار نہ کرنا اور اپنے مصائب پر خاموش رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ قوم میں زندگی باقی نہیں ہے۔ اور قوم مردہ ہو چکی ہے بلکہ ایسی خاموشی قوم کے مرگ کا باعث ہوتی ہے اس خیال کو کس عمدگی اور خوبصورت تشبیہ کے ساتھ مرزا نے ادا کیا ہے

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع

اس زمانے میں جو حالات تھے اس کے اعتبار سے صاف صاف الفاظ میں ان خیالات کا اظہار نہایت گہرے اور پوشیدہ معنوں میں ہی کر سکتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ " ملک کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں اور پھر کہتے ہیں کہ۔

آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آئے

ایک اور جگہ جتایا ہے:۔

گر چہ خاموشی میں فائدۂ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

مرزا غالب کے اشعار میں عموماً کئی کئی معنی نکالے جا سکتے ہیں جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

علاوہ حسن معنی کے ان کے اشعار ایک وجدانی کیفیت پیدا کرتے ہیں جس کا لطف کچھ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو اہل دل اور صاحب ذوق ہیں۔ شاعر کے لئے کچھ یہ ضروری نہیں ہے کہ شعر کہتے وقت اس کے ذہن میں وہ تمام معنی و مضامین موجود ہوں جو اس کے خیال کی پرواز الفاظ کی بندش وغیرہ ہم کے باعث متاخرین پیدا کر سکیں۔ غالب کے دیوان کو اٹھا لو اور دیکھو کہ اس کے اشعار ہر زمانہ ہر آب و ہوا اور ہر طبیعت کی مطابقت کرتے ہیں یا نہیں۔

اکثر صاحبان نے یہ اعتراض کیا ہے کہ غالب سیاسی خیالات سے بے بہرہ تھے اور ان کو ملکی و قومی تباہی کا بالکل احساس نہ تھا۔ میرے عزیز دوست سید راس مسعود صاحب جو اس وقت اردو علم ادب کی بہت کچھ خدمت انجام دے رہے ہیں اور جن کی ادبی دلچسپیوں کے باعث انکے اعتراض کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ غالب کی اکثر تحریرات میرے پاس موجود ہیں جن میں انہوں نے انگریزوں کی اور انگریزی طرز حکومت کی بہت سی تعریفیں کی ہیں"۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے۔ لیکن کسی غیر ملکی حکومت یا طرز حکومت کی تعریف و توصیف کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ شاعر ملکی و قومی جذبہ سے بے بہرہ ہے اسی لئے میں نے اس تحریر میں جا بجا خود مرزا کی عبارتیں ان کے مطبوعہ خطوط سے نقل کر دی ہیں تاکہ تاریخی حیثیت سے بھی پتہ چل جائے کہ وہ ان حالات سے کس درجہ متاثر تھے اور ان کو اپنے ملک کی مٹی ہوئی عظمت کا کتنا گہرا احساس تھا۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے شعرا کا طرز بیان شعرا یورپ کے طرز بیان سے بالکل جداگانہ ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تصوف کے بیان سے ہماری شاعری پُر ہے لیکن تصوف کے بڑے مسائل بھی "بادہ و ساغر" اور "گل و بلبل" ہی کے الفاظ میں حل کئے گئے ہیں۔ غالب نے کچھ تو اس زمانے کے حالات کے اعتبار سے اور کچھ اردو شاعری کے خاص طرز بیان کیوجہ سے اگر ملکی و قومی جذبات کو الفاظ میں چھپایا ہے تو پھر تعجب کا کیا مقام ہے۔ آج بھی جب کہ اردو شاعری کا طرزِ بیان بہت کچھ بدل چکا ہے اقبال جیسا شہرۂ آفاق شاعر اپنے جذبات کو بہت کچھ الفاظ میں چھپا جاتا ہے۔ غالب کے فارسی دیوان میں بھی جا بجا ان جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں اس کا ذکر کرنا طول ہوگا اور اس کے علاوہ اس موقع پر فارسی کلام پر بحث کرنا خارج موضوع بھی ہے۔ صرف ایک تمثیل کافی ہو گی۔

۱۸۵۸ء کے ہنگامے کے ختم ہونے پر عام معافی کا اعلان ہوگیا تو مرزا غالب نے ایک زبردست فارسی قصیدہ لکھا تھا جو فنِ شاعری اور قادر الکلامی کا ایک گراں بہا اور نادر الوجود نمونہ ہے جسکے بعض حصے مولانا حالی نے بھی یادگارِ غالب میں نقل کئے ہیں اس قصیدہ کو اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس سے ہمارے گزشتہ بیان کی پوری طرح تائید ہوتی ہے ناظرین کی صرف ادبی دلچسپی کی غرض سے چند شعر اس عجیب و غریب قصیدے کے نقل کرتا ہوں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ہر شعر میں ذم کا پہلو نمایاں ہے

در روزگار ما نتواند شمار یافت   خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت
پرکارِ تیز گردِ فلک درمیاں مبیں   حق داد دادِ حق کہ بمرکز قرار یافت
آمد اگر بفرض ز بالا بلا فرود   بر روئے خاک پیچ و خمِ زلفِ یار یافت
در خاک دیا دد آتش و آب آتشی فزود   ایں پرورش کہ خلق ز پروردگار یافت
ناچار جز بداد گرائش نمی کنند   در دہر ہر چہ صورت انیں بہا یافت
گر خواجہ بندہ را خطِ آزادگی نبشت   ہم بر وی سرائے خودش بندہ وار یافت
در بندہ خود خوشم خطِ بندگی در رسید   توقیع خوشدلی ز خداوندگار یافت
رہزن متاعِ خویش براہ ابن السبیل ریخت   کودک رضائے لہو ز آموزگار یافت

ہندو مسلمانوں کے اتفاق کا جو غلغلہ آج کل مچا ہوا ہے اور ایک دوسرے کو اپنا ہمدرد بنانے پر تلا ہوا ہے اور سارے اختلافات مٹانے کی کوشش کی جا رہی ہیں یہانتک کہ مسلمانوں کے خاص مذہبی معاملات میں بھی ہندوؤں نے عملی ہمدردی کا اظہار شروع کر دیا ہے مرزا غالب نے اس ضرورت کو بہت پہلے محسوس کیا۔ اور مسلمانوں سے گویا وہ یوں کہتے ہیں۔

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال   رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

غالب بے شک انسانی ہستی کا اعلیٰ مظہر ہے اور اس کا کلام ہر زمانہ میں انسان کے دلی جذبات و خیالات کی تعبیر کر کے لوگوں کو خوش کرتا رہے گا۔ اس ہچپیرز کی رائے میں غالب شیلی کی پرواز کیٹس کی فصاحت گوئٹے کی عمیق النظری خسرو کی بلند خیالی فرانسس ٹامس کے تخیل مومن کے درد سودا کی ظرافت اور میر کی سادگی کا مجموعہ ہے

"میرا طلب آرزو منصب ہے کہ تیرے نغموں کا ہم نوا ہو جائے لیکن ایک آواز کیلئے بیکار تڑپ رہا ہے میں بولتا ہوں لیکن بول نغمہ نہیں بنتے لاچار عاجز ہو کر چیخ اٹھتا ہوں (ٹیگور)

خلاصہ یہ کہ مرزا کی شاعری میں ہزار ہا نکتے ایسے پائے جاتے ہیں جو ناقابلِ بیان ہیں ان کے اشعار کو پڑھ کر جو حالتیں یا کیفیتیں طاری ہوتی ہیں۔ ان کو الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر کرنا ناممکن ہے۔ بقول خواجہ حافظ شیرازی۔

لطیفہ ایست نہانی کہ عشق ازو خیزد   کہ نام آں نہ لب لعل و خطِ زنگاریست

مولانا غلام رسول مہر

داستانِ فرہاد اور غالب کا تصورِ محبت

درتہ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانۂ
تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن

فارسی اور اردو کے عام شاعروں کی طرح مرزا غالب کے کلام میں بھی جابجا مجنوں اور فرہاد کا ذکر ہے۔ میں دوسرے شاعروں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن مرزا نے فرہاد یا کوہکن اور مجنوں یا قیس کا نام جہاں کہیں لیا ہے اپنے تصورِ عشق و محبت کا کوئی نہ کوئی پہلو نمایاں کرنے کی غرض سے لیا ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں فرہاد کے متعلق مرزا کے چند فارسی اور اردو اشعار پیش کر کے میں اپنا نقطۂ نگاہ واضح کروں گا اور مجنوں کو پھر کبھی معرضِ بحث میں لاؤں گا۔

فرہاد اور مجنوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا جاتا ہے اس میں شاعرانہ رنگ آمیزی اس پیمانے پر ہو چکی ہے کہ اب اس داستان سرائی میں سچائی اور واقعیت کا دریافت کرنا ممکن نہیں رہا۔ فرہاد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اچانک خسرو پرویز ساسانی کی ملکہ شیریں کو دیکھ کر عاشق ہو گیا۔ پردے کے شیریں نے غالباً رسوائی سے محفوظ رہنے کے لیے فرہاد کے ذمے ایک ایسا کام لگا دیا جس کا سرانجام بظاہر غیر ممکن تھا یعنی "بیستون" پہاڑ کاٹ کر شیریں کے باغ کے لیے دودھ کی نہر لانا۔ لیکن جواں ہمت فرہاد نے یہ ناممکن کام بہت جلد پورا کر دیا۔ پھر اسے مروانے کے لیے ایک بڑھیا کو یہ پیغام دے کر بھیجا گیا کہ شیریں اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ فرہاد نے یہ سنتے ہی تیشہ سر پہ مارا اور مر کر اپنی نکالی ہوئی نہر میں گر گیا۔

میں نے بیان کردہ واقعات کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دیا اور اس سلسلے میں فردوسی کے شاہنامے یا نظامی کی مثنوی خسرو شیریں سے تفصیلات پیش کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

تاریخی حقائق

ایران کے مشہور مغربی شہر کرمانشاہ (جسے پہلے کرمان شاہان کہتے تھے) سے جو سڑک ہمدان کی طرف آتی ہے اس پر "بیستون" یا "بہستون"

اب بھی موجود ہے۔ اور اس کا فاصلہ مہران و کرمان شاہ سے تقریباً یکساں ہے۔ یہاں سیاہ پتھروں کے ایک پہاڑ کے دامن میں کیانی اور ساسانی دور کے آثار موجود ہیں۔ اس مقام کو آج کل "طاقِ بستان" کہتے ہیں۔ سیاہ پہاڑ کا نام اصطخری اور ابن حوقل نے "بہستون یا بیستون" بتایا۔ ساسانی دور کے آثار میں سے ایک مقام پر خسرو پرویز کو اپنے مشہور گھوڑے شبدیز پر سوار دکھایا گیا ہے اور شیریں اس سے بالاتر کھڑی ہے یہ تماثیل پتھر تراش کر بنائی گئی ہیں۔ اغلب ہے کہ یہاں کسی زمانے میں خسرو پرویز نے اپنے لیے نہایت عمدہ باغ اور عشرت گاہ تعمیر کرائی ہو جس کے ارد گرد رفتہ رفتہ داستان بافیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ایک عجیب و غریب رومان وجود میں آگیا

غیرت و حمیّت

مرزا کے نزدیک عشق و محبت میں نہایت اہم حیثیت غیرت و حمیّت کو حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں :

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

حقیقت حال کی توضیح کے لیے عرض کر دینا چاہیے کہ فرہاد نے جب "بیستون" کو کاٹ کر شیریں کے باغ کے لیے نہر لانے کے لیے ذمہ اٹھایا تھا تو اس کے پیش نظر خسرو پرویز کی عشرت گاہ کی رونق یا اس کے باغ کی آبیاری نہ تھی وہ صرف محبوب کے فرمان کی پیروی واجب ولازم سمجھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب عاشق منزل رضا و تفویض میں پہنچ جائے تو وہ صرف احکام محبوب کے امتثال کا پیکر بن جاتا ہے اور متعلقات پر نظر نہیں ڈالتا۔ لیکن مرزا غالب نے پورے واقعے کا معروضی مطالعہ کیا تو ان کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی۔ انھوں نے معاملہ فرمانِ شیریں کے امتثال تک محدود نہ رکھا اور یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اس طرح رقیب کی عشرت گاہ کے لیے رونق و شادابی فراہم کی گئی۔ اگرچہ بلاواسطہ نہ سہی بالواسطہ ہی سہی۔ چنانچہ ان کے نزدیک یہ معاملہ فرہاد کی نیک نامی میں خلل کا باعث بن گیا۔ یہ خیال مرزا کے کلام میں ایک سے زیادہ مقامات پر ظاہر کیا گیا ہے۔ مثلاً

کوہکن گرسنہ مزدورِ طربگاہِ رقیب
بے ستوں آئنۂ خوابِ گرانِ شیریں

نیز

از جوئے شیر و عشرتِ خسرو نشاں نماند
غیرت ہنوز طعنہ بہ فرہاد می زند

مرزا فطرۃً بھی غیور طبیعت کے تھے ایک مقام پر کہتے ہیں:

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر بہ موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

یعنی اگر میں پیاس بجھانے کے لیے دریا پر جاؤں اور اس کی موجیں دیکھ کر دل میں خیال گزرے کہ دریا کی سطح پر لہریں نہیں اس کی پیشانی

پر شکن ہے کہ کیوں یہ شخص میرے پانی سے استفادے کے لئے آگیا تو پیاسا مر جاؤں گا لیکن پانی سے لب تر نہ کروں گا۔

پیشوں کا اعزاز و اکرام

پہاڑ کاٹنے کے لئے فرہاد کو مزدوری کرنی پڑی اور کم از کم مرزا کے عہد کا معاشرہ مزدوری اور محنت کشی کو کوئی معزز مشغلہ نہیں سمجھتا تھا مگر مرزا اپنے عہد کی اس کم نگہی اور حقیقت ناشناسی کو درخورِ قبول نہیں سمجھتے چنانچہ فرماتے ہیں:

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

یعنی اگر فرہاد نے مزدوری کی محنت و مشقت کی زحمت اٹھائی تو اس میں عیب کی کونسی بات ہے؟ دنیا کے دوسرے پیشوں کی طرح یہ بھی ایک پیشہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اسے حقیر و کم رتبہ سمجھا جائے۔ اس حقیقت پر نظر رہنی چاہیئے کہ اس نے خارا شگافی کا کارِ دشوار مردانہ وار اپنے ذمے لے لیا اور اسے پورا کر دیا۔ وہ ہم ہی آشفتہ سروں میں سے تھا جو سچے عاشق ہیں۔ افسوس کہ اس نے جوانی ہی کے عالم میں جان دے دی۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب اردو زبان کے شاعروں میں پہلے فردِ جلیل و عظیم تھے جنہوں نے مزدوروں کے پیشے کی عزت و حرمت کا ڈنکا پورے زور سے بجایا اور اس طرح تمام پیشوں کی یکساں عزت و حرمت کے لئے آواز بلند کی۔

رسموں اور ریتوں سے نفرت

مرزا فطرۃً آزادہ رو تھے پرانی رسموں اور ریتوں سے انہیں ہمیشہ نفرت رہی۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں

"تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما تھا۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے تو اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام ربساطی، نیچا بند، دھوبی، سقا، بھٹیارا، کنجڑا، منہ پر داڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن سے سر منڈوایا۔"

گویا انہیں عمومی احوال میں بھی رسم عام کی پیروی منظور نہ تھی پھر وہ فرہاد کے سلسلے میں رسوم و قیود کی پابندی کو کیونکر پسند یدہ سمجھ سکتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎ تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد　　سر گشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا۔

یعنی تیشے یا کوئی اور چیز سر پر مار کر جان دے دینا ایک پرانی دقیانوسی رسم تھی۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ فرہاد سرگشتگیِ خمارِ رسوم و قیود سے بالاتر نہ ہو سکا۔ گویا مرزا غالب کو عشق و محبت کی جاں بازیوں میں بھی رسم عام کی پیروی ناگوار تھی۔

سادگی۔

عشق و محبت کا ایک وصف "سادگی" بھی ہے جو مرزا کو بہت پسند ہے۔ فرماتے ہیں:

دی سادگی سے جان، پڑوں کوہکن کے پانو
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

پرکار و عیار بڑھیا نے بے تکلف فرہاد کو یہ جھوٹی خبر سنا دی کہ شیریں مر گئی۔ بدنصیب عاشق نے یہ سنتے ہی تیشہ سر پر مارا اور مر گیا اس لیے کہ محبوب کے مرجانے کے بعد محب و عاشق کے لیے جینا باعثِ ننگ تھا مگر وہ سادگی کا پیکر نہ ہوتا تو اصل واقعہ کی چھان بین کرتا۔ پوچھتا کیا صورت پیش آگئی؟ آیا شیریں بیمار ہوئی؟ بیمار ہوئی تو اسے کیا آزار تھا؟ علاج کس سے کرایا گیا؟ یا کم از کم یہی سوچ لیتا کہ ایک بے سروپا بڑھیا کی بات کیوں صحیح سمجھ لے۔ اور کس وجہ سے حقیقتِ حال کی ٹوہ نہ لگائی جائے۔

غرض مرزا کے نزدیک عاشق مدبّروں، سیاست دانوں اور دانش مندوں کی طرح ہر شنید کا کھوج لگانے کا عادی نہیں ہوتے ہر امر کی تحقیق کے درپے نہیں رہتے۔ عشق اتنے تحمل اور غور و فکر کا متحمل کب ہوتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

فرہاد کو یہ کام سونپا گیا تھا کہ پہاڑ کاٹ کر نہر لے آئے۔ یہ اس کے زورِ بازو اور نیروئے تن کی آزمائش تھی جس میں وہ پورا اترا۔ مگر حوصلہ آزمائی کا مرحلہ پیش آیا تو پہلے ہی قدم میں ناکام رہا۔ اور نامراد دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مرزا فرماتے ہیں۔

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

سید محمد محمود رضوی، مخمور اکبرآبادی، ایم اے

غالب اور گوئٹے

جناب مخمور اکبرآبادی نے غالب کے موضوع پر ایک کتاب مرتب کی ہے جس کا نام ہے

" غالب کی فطنت اور صناعت کا مطالعہ "

اس کتاب میں غالب کی فکر کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ جون ۶۶ء سے پہلے ہی مکمل ہو چکی ہے ضخیم تصنیف بائیس ابواب پر مشتمل ہے مگر اس کے شائع ہونے کی ہنوز نوبت نہیں آئی۔

اس تصنیف کے علاوہ، اُن کا ایک مقالہ جس کا عنوان ہے " غالب کے فن کے چند غیر معروف پہلو" دوسری جگہ شائع ہو رہا ہے۔ اس مقالے میں، مذکورہ بالا موضوع یعنی" غالب اور گوئٹے "کا بھی مختصر حوالہ موجود ہے۔

العلم کے لئے مخمور صاحب نے، اسی موضوع پر زیادہ وضاحت سے یہ مقالہ مرتب کیا ہے، جس کے لئے ہم ان کے شکر گذار ہیں۔

مُعلّیٰ دماغ

انیسویں صدی کے اوائل کا ذکر خیر ہے کہ دلّی کے مرحوم معاشرے میں، ایک مُعلّیٰ دماغ نمودار ہوا، جو اکبر اعظم کے شہر نے اس کے پوتے شاہجہاں کے دیار کو بخش دیا تھا۔ وہ مُعلّیٰ دماغ نہ کسی ماحول کی خلّاقی تھا، نہ کوئی ماحول اس نے خلق کیا۔ دیر تا مست حباب کی طرح، دریا کی سطح پر، وہ خود بخود ہی نمودار ہوا، اور خود بخود ہی غائب بھی ہو گیا۔ دمدار ستارے کہاں سے آتے ہیں اور کہاں چلے جاتے ہیں، اب تک کوئی تحقیق نہیں کر سکا۔ وہ معلّیٰ دماغ، شعر کی زبان میں گفتگو کرتا تھا۔ اس کے قلم

کی آواز، غیب کی آواز تھی۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں　　غالب صریرِ خامہ، نوائے سروش ہے

لیکن ماحول پھر ماحول ہے، حق یہ ہے کہ ٹھوس حقیقت ہے۔ اُس کی فطنت کی نمود، ماحول کے اثر سے کتنی ہی بے نیاز سہی اور خود ماحول اُس کے اثر سے کتنا ہی غیر متاثر سہی لیکن ماحول سے اس کی شخصیت کا یہ لگاؤ ضرور ہے کہ موقت فضا کے بہت سے نقوش اس کی گفتار میں زندۂ جاوید ہو کر رہ گئے۔ اس کی شعلہ فشانی نے ماضی کے چراغ گل کر دیئے۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشکِ فارسی　　گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

موقت معاشرے میں، وہ اگرچہ مہر درخشاں کی طرح چمکتا رہا لیکن کالے کالے بادلوں سے گھرا بھی رہا، کیونکہ نگاہیں اس کی تابانی کے مراحم و نعائم سے محروم رہیں، مستقبل ہنوز پردۂ خفا میں ہے لیکن قیاس کا واجب الاذعان فرمان یہی ہے کہ اس معلیٰ دماغ کا علوئے اعلیٰ آئندہ زمانوں کی فضاؤں پر بھی چھایا رہے گا۔

اس نے جو موضوع چھوا وہ فرسودہ ہی کیوں نہ ہوا ابد تک کے لئے اپنا کر لیا۔ جو بیان وضع کیا اس پر ندرت و دوام کی مہر ثبت کر دی۔ جو نغمہ چھیڑا رگِ جاں کا جزو اعظم بنا دیا۔ اُس کے بربط کے بے شمار تاروں سے لوح بہ لوح موسیقی اُبل رہی ہے اس سماوی موسیقی نے عہدِ رواں کے کانوں میں اس کی چند بوندیں ٹپکا دی ہیں مگر اس کی لعلگی نے ہمارے سویدائے قلب میں ابھی تھرتھری پیدا نہیں کی، اس کی بے خوف و ہراس حریتِ فکر عہدِ رواں کی تاریک راہوں میں شمع بھی جلائے ہوئے ہے، مگر منافقت، ایسے عادی عدمِ مساوات، فرعونیت کے خلاف ہم نے اب تک جہاد شروع نہیں کیا۔ اس معلیٰ دماغ کے کلام سے ہم بزم آرائی کا کام خوب خوب لے رہے ہیں مگر ہم نے اس کی گہرائی کا جم کر مطالعہ نہیں کیا۔

اس مختصر سے مقالے میں قصیدہ طرازی مدنظر نہیں۔ ہاں کچھ بیّن حقائق بروئے کار لانے مقصود ہیں جو بصیرت افروز بھی ہیں اور فرحت آمیز بھی۔ دنیا آج ایک بین الاقوامی شہر بن چکی ہے۔ اس لئے وہ باتیں جو کل تک مستور رہیں آج آشکارا ہو جانی ضروری ہیں۔

المانی شاعر

المانی شاعر گوئٹے کی وفات کے وقت جو ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی سے پانچ سال بیشتر ۱۸۳۲ء میں ہوئی غالب کی عمر پینتیس سال کی تھی۔ میاں نظیر اکبر آبادی بھی دو سال قبل (۱۸۳۰ء میں) رحلت کر چکے تھے۔ اور جس وقت گوئٹے اپنی تصنیف فاؤسٹ کا دوسرا حصہ لکھ رہا تھا، اس وقت غالب کی فکر و شاعری کی نوجوانی تھی۔ یعنی یہ کہ بوڑھے گوئٹے اور جوان سال غالب نے چوتھائی صدی سے قدرے زیادہ ایک ہی کائنات کی فضا میں ساتھ ساتھ سانس لیا۔

علامہ اقبال نے گوئٹے اور غالب دونوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنی ایک مختصر نظم میں غالب کے لئے فرمایا۔

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا　　ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

آہ تو اجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے — گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

حقیقت یہ ہے کہ حضرتِ علاّمہ اگر اس طرف توجہ نہ دلاتے تو ہم اردو والوں کی محدود نظر گوئٹے اور غالب کی مماثلتِ تام کی طرف متوجہ بھی نہ ہوتی۔ لیکن صرف اس اشارے سے تسکین نہیں ہوتی۔ جی چاہتا ہے کہ مماثلت اور ہم رنگی کا اس سے زیادہ داخلی ثبوت بہم ہو۔ اقبال کی نشان دادہ ہم نوائی ایک مستقل تصنیف کا مطالبہ کرتی ہے جو کسی دن دنیا کی نگاہوں سے گذر کر رہے گی۔

اپنے مشہور قطعے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

میں غالب نے وقت اور مسرت کی بے وفائی اور ناآشنائی سے متنبہ کیا ہے۔ فاؤسٹ کے ڈیڈیکیشن (تمہید) کا موضوع بھی یہی ہے۔ ان دونوں شہ پاروں کا نہ صرف مغز ایک سا ہے، ان کے اندازِ بیان میں بھی مطابقت ہے۔ مختصر یہ ہے کہ قطعے میں غالب کی فکر، غالب کا سوز، غالب کی نوا، فاؤسٹ کے ڈیڈیکیشن کے ان اجزا کی بہت کچھ ہم رنگ و ہم آہنگ ہے۔ ان اجزا سے قطع نظر گوئٹے اور غالب کے کلام میں وسیع نظرت، بلند تشبیہوں کی تازگی، خیال کی پرواز، حیرت کے جوشِ تخلیق کی گہرائی اور جلال و جمال کے شعور کی بھی یکسانیت ہے۔

کائنات کے جلال سے گوئٹے بھی متأثر رہے اور غالب بھی۔ فاؤسٹ میں فرشتوں کی تقریریں جلال پرستانہ اور حیرت بھی نمایاں ہے۔ مثنوی "ابرِ گہربار" کی مناجات میں جلال و حیرت کی یہی فراوانی ہے۔ فاؤسٹ (ڈرامہ) کی ظاہری و فنی ترتیب جیسی نادر و دلکش ہے مذکورہ مثنوی کی بھی دلپذیر ہے۔ اس میں پہلے "سپاسنامہ" ہے پھر "مناجات" پھر "حکایت" پھر "نعت" پھر "بیانِ معراج" پھر "منقبت" پھر "مغنی نامہ" پھر "ساقی نامہ"۔ اس فراوانی پر بھی یہ مثنوی ناتمام ہے، کسی دوسرے بڑے سے بڑے شاعر کے یہاں بھی یہ اہتمام و التزام میسر نہیں آتا۔ غالب یہ مثنوی تمام کر جاتا تو عدیم المثال شہ پارہ وجود میں آجاتا۔

گوئٹے اور غالب، دونوں استادِ صاحبانِ یقینت ہیں مگر دونوں آفرینش کی غایت سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ دونوں کا کلام کائنات کے جلال، توانائی کے رموز، اور حیات کے تسلسل کا آئینہ دار ہے۔ دونوں ہی یہ محسوس کرتے ہیں کہ حقیقت کے اسرار ہمیں پکار رہے ہیں اور ہم ان کے کھول سکنے پر ایک نہ ایک وقت قادر ہو سکیں گے مگر دونوں اس ملاغبت سے حیرت میں پڑ کر رہ جاتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ تصوف کی گتھیوں میں اُلجھ جاتے ہیں۔

دونوں کا فلسفۂ نجات بھی ہم رنگ ہے۔ انجامِ کار گوئٹے بھی نجات کا جلوہ دکھاتا ہے اور غالب بھی "حکایت" (مثنوی ابرِ گہربار) کے آخر میں فرماتا ہے۔

بہ بندہ امید استواری فرست — بہ غالب خطِ رستگاری فرست

توجہ طلب یہ ہے کہ امید سے محروم نہیں اور نجات کو امید سے وابستہ کرتا ہے یہ تصورِ عینِ حیات ہے اور عہدِ رواں میں دنیا کو متاثر کرنے کا خاص پہلو

گوئٹے اور غالب دونوں اپنی اپنی جگہ صناعِ اعظم ہیں۔ یہ استادی ہر محل پر توازن کی صورت میں رونما ہے۔ اپنی اپنی زبان میں مصرعوں کا باہمی توازن دونوں کے شعری فن کا لازمہ ہے۔ فاؤسٹ کے مطالعے میں ایسے مقامات آتے ہیں جن سے ذیل کے اشعار کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو لذت عذاب میں

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

دور چشمِ بد، تری بزمِ طرب سے واہ وا
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جنسِ بازارِ معاصی، اسد اللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز بہ رہِ تو روئے نیست
در طلبت توان گرفت، بادیہ را بہ رہبری

یہ نہ خیال کر لینا چاہئے کہ مشابہت و ہم رنگی ——— صرف اِن ہی شہپاروں تک محدود ہے یہ اشتراکِ ذوق و فکر فارسی غزلوں، مثنویوں، قصیدوں میں بھی بدرجۂ اولیٰ موجود ہے۔

کلاسیکی شاعری ہو، یا کسی مغربی قوم کی جاندار شاعری، مشرقی شاعری کی امیجری یعنی تخیل کی سحرکاری و طلسم بندی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس خصوص میں غالب کی شاعری نقطۂ عروج پر فائز ہے۔ اس کا فارسی کلام بڑے سے بڑے ایرانی شاعر کے کلام کا ہم مرتبہ ہے۔

گوئٹے جرمنی کے کلاسیکل عہد یعنی اُس دورِ ادب کا شاعر ہے جب قدیم اغریقی و لاطینی زبانوں کی عظمت کا اثر وہاں اربابِ علم کے قلوب پر چھایا ہوا تھا اور ان زبانوں کی شاعری اور دوسرے علوم کی فضیلت و منزلت کا یونیورسٹیوں میں عام چرچا تھا چنانچہ شرف و کمال بھی یونانی موضوعات ہی سے متعلق سمجھے جانے تھے۔ اس لئے گوئٹے نے ان موضوعات سے خوب خوب استفادہ کیا۔ تخیل کے اعتبار سے اُس کی حُریتِ نفس اور بیان کے اعتبار سے اس کی جرأت دونوں پہلو اس کی نمایاں خصوصیتیں سمجھی جاتی ہیں۔ اس دلیو نشاد جرمن مفکر و شاعر کی طرح غالب بھی اپنے ماحول اور ماورائے ماحول کا دیونژاد سامنت ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے کلاسیکی علوم میں وہ یدطولیٰ رکھتا ہے اور حُریتِ نفس و جرأت۔ بیباک ہیں اگر اس کو کسی مغربی

مُتقدّم سے تشبیہ دینا ممکن ہے تو وہ صرف گوئٹے ہی کی ذات ہے اور بس۔ منافقت اور سطحیت، ترلیسیّت اور ظاہر پرستی کی اس نے بالکل اسی طرح مخالفت کی ہے جس طرح جرمن ساونن نے ان معائبِ نفس سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔

گوئٹے اور غالب دونوں تشکیک پسند ہیں اور نفسِ شاعری کی نوعیت کے اعتبار سے سرتا پا تغزل میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کمال آگہی اور تمامیت پسندی کی خو، دونوں میں اس حد تک سرایت کئے ہوئے ہے کہ دوسرے ذہنوں میں اِن عناصرِ حسنہ کا وجود حدودِ امکان سے خارج نظر آتا ہے۔ گوئٹے آج دنیا کے بلند ترین ذہنوں میں شمار کیا جاتا ہے اور اب وہ وقت دور نہیں کہ غالب کو بھی اسی صف میں جگہ دی جائے۔

گوئٹے کو ہر معمولی جرمن بھی جانتا اور پڑھتا ہے۔ یہ تھیٹر اور ڈرامے کا فیضان ہے۔ یہ دونوں اسالیب نمود و بیان بزمِ مشاعرہ اور مشاعرے سے زیادہ مفید و موثر وسائل ترتیب ثابت ہو چکے ہیں۔ مگر غالب کا کلام عامۃ النّاس کی پہنچ سے بالاتر رہا سبب یہ ہے کہ جس وقت جرمنی کے عظام گوئٹے اور شلر وغیرہ اپنے کمالات کے دریا بہا رہے تھے تو وہاں کے معاشرے میں تعلیم کی وساطت سے ان کا فن و پیام سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن غالب اس سعادت سے محروم رہا۔ اس کی زندگی میں اس کے لئے سر بزم یہ کہا جاتا تھا۔

مگر اپنا کہا تم خود ہی سمجھیں یا خدا سمجھے

اور موت کے بعد مشرقی مذاق کے پڑھے لکھوں کی کمی ہوتی چلی گئی اور نئی تعلیم کے فرزند عموماً مغربی ادب کے سطحی محاسن کی طرف متوجہ ہو گئے حق یہ ہے کہ غالب کا عرفان اُن ہی کو میسّر آسکتا ہے جو مشرقی و مغربی دونوں انواعِ فکر سے متاثر و بہرہ اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مختصر کہانی

غالب اور گوئٹے کا اشتراکِ ذوق و فکر سمجھنے اور گلے اتارنے کے لئے جسے علّامہ اقبال نے ہمنوائی سے تعبیر کیا ہے گوئٹے کے شاہکار "فاؤسٹ" کے متعلق کم سے کم سرسری علم ضروری ہے "فاؤسٹ" اُس کے مشہورِ عالم ڈرامے کا نام ہے جو یورپ کے ادب میں زندہ جاوید قرار دیا جا چکا ہے۔ اس کی نہایت مختصر سی کہانی یہ ہے۔

"فاؤسٹ ایک عالم ہے، جو حیاتِ آگہی کا بھوکا ہے وہ یہ بھی خوب جانتا ہے کہ آگہی محض نظریوں سے حاصل نہیں ہوتی، تجربوں سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ شیطان کی رہنمائی سے جس کا نام المیہ میں میفسٹو فیلیز ہے وہ بھڑکتے دھڑکتے تجربوں کی دنیا میں در آتا ہے۔ آخرالذکر وجود یا کردار روحِ نفی کی تلبیس ہے۔ فاؤسٹ پہلے عامیانہ قسم کی خوش باش زندگی اختیار کرتا ہے پھر شہوانی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد قوت کے مظاہروں میں معروف رہتا ہے۔ لیکن کوئی تجربہ اس کی آسودگی کا وسیلہ نہیں بنتا۔ اس کی تشنگی ہنوز باقی رہتی ہے۔

انجام کار فاوسٹ کو بنی نوعِ انسان کی خدمت سے تسکین ہوتی ہے۔ لیکن اب اُس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ شغلہ بھی اس مجاہدے کا ایک نشانِ جادہ ہے منزلِ مقصود نہیں ہے۔

اس عرفان کے بعد اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ منزلِ مقصود خود "جادۂ رہ" کا ہی نام ہے اور بس مستقل سفر یا پیہم جد و جہد ہی زندگی کا منتہا ہے تکملہ انسان کے حدود امکان سے پرے ہے انسان نہیں جانتا کہ تکملہ کس چیز کا نام ہے ذہن میں اس کی اگر کوئی صورت بنتی ہے تو وہ یہ ہے کہ "جمود یا موت کا مترادف ہے۔ اس لئے حیات کا مقصدِ اعلیٰ یہ ہے کہ جد و جہد جاری رہے اور زندگی ان تھک قسم کے خلاقانہ اعمال و افعال میں بسر ہو۔

اس فیصلے پر پہنچ جانے سے فاوسٹ کی جیت ہوتی ہے اور شیطان شکست کھا جاتا ہے۔

سعیٔ پیہم کے موضوع پر اب غالب کا تصور ملاحظہ ہو۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

غالب کی فکر سے صاف عیاں ہے کہ زمانہ ازلی و ابدی ہے اور اس کے ساتھ زندگی کی جہد مسلسل بھی ازلی و ابدی ہے اس کے ٹھہراؤ یا اختتام کا کوئی امکان نہیں۔ یہ الفاظ یعنی "ازلی" و "ابدی" محض اس مجبوری سے استعمال ہوتے ہیں کہ ان کے بغیر اظہارِ خیال محال ہے۔ اس لئے جو گزرتی ہے، گزر جانے دو، اس سے گھبرا کر یا ڈر کر مقصد سے منہ موڑ لینا کمزوری ہے۔ اس غزل کی ردیف "کیا" ہے، جو سوالیہ ہے، غالب نے نفی کا مفہوم پیدا کیا ہے۔ یعنی یہ کہ کچھ ہی پیش آ جائے ہم اپنے نصب العین کو خیرباد نہیں کہیں گے۔

غالب کے پاس ڈرامے کا پیکر (فورم) نہیں ہے، جس کی حرکت کی وساطت سے کردار اپنے ماحول میں پھیلا کر بہ وضاحت و صراحت پیش کیا جا سکے اور جس میں کردار کا ارتقا سامنے آ جائے۔ اس کے پاس صرف غزل کے ایک شعر کا وسیلہ ہے۔ پھر بھی اس کے بیان کی قوت، وانفرادیت، ڈرامے کے کرداروں کی جھلک بار بار دکھاتی ہے۔ یعنی انسان کا نفس بار بار بے نقاب کر دیتی ہے۔ مزید برآں، ہمیں اس کے تخیل کی بنیاد اور اُس کے زاویۂ نظر سے آگاہ کر دیتی ہے۔

علامہ اقبال کے اشارے پر گوئٹے اور غالب کی ہمنوائی کا مطالعہ کرنے کے لئے مجھے ضروری معلوم ہوا کہ پہلے فاوسٹ (ڈراما) کا انگریزی ترجمہ پڑھوں، پھر ڈاکٹر عابد حسین کے اردو ترجمے سے استفادہ کروں اور پھر غالب کے کلام پر گہری نظر ڈالوں۔ یہ طریقۂ عمل میرے لئے مفید ثابت ہوا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف جرمن زبان کے فاضل ہیں اور جرمنی میں قیام کے باعث اس زبان کے محاورے پر عبور رکھتے ہیں۔ "فاوسٹ" کا ترجمہ انہوں نے گوئٹے ہی کی زبان یعنی جرمن سے کیا ہے ان کا ترجمہ چونکہ انگریزی ترجمے کا ترجمہ نہیں ہے، اس لئے اس میں مطالب و مفاہیم کی صحت و سلامت، لوک پلک کے

ساتھ موجود ہے۔ اس کے دوش بدوش، اردو ترجمے میں محاورے کی لطافت، شگفتگی اور بیان کی ادبی قوت واصابت بھی موجود ہے لطف بالائے لطف یہ ہے کہ موصوف فلسفے کے جلیل القدر عالم ہیں۔ اس لئے انہوں نے فاؤسٹ کے فلسفیانہ رموز و حقائق پر بھی کتاب کے مقدمے میں بصیرت افروز نظر ڈالی ہے۔ ان وجوہ سے وہ گوئٹے کے مفاہیم کی روح اردو میں منتقل کرسکنے میں بدرجۂ اولیٰ کامیاب ہوئے ہیں۔

غالب اور گوئٹے کے تقابل کے لئے ایسے ہی مستند ترجمے سے استمداد کرنا ضروری تھا اس لئے اسی متن پر حصر کیا گیا ہے

مقدمے کا اقتباس

اب اس مقالے کی مزید وضاحت کے لئے موصوف کے مقدمے کی کچھ سطریں نقل کی جاتی ہیں۔ لکھتے ہیں۔

" گوئٹے کا مقصد یہی ہے کہ اپنی زندگی کی کہانی اس طرح کہے کہ وہ اس کے عہد کی عام زندگی کی کہانی بن جائے۔ وہ اپنی ذات کو جدید یورپی انسان کی روحانی روح کی مثال بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس روح میں دو متضاد قوتیں ہیں۔ ایک قوت کا رجحان یہ ہے کہ نظام ہستی کا منشا معلوم کرے۔ روح کائنات کی حقیقت کو سمجھے اور اُس سے اتحاد پیدا کرے۔ دوسری قوت یہ چاہتی ہے کہ زندگی کے نشیب و فراز کا عملی تجربہ حاصل کرے اور مادی لذتوں کا لطف اٹھائے۔ پہلی قوت انسان کے دل میں بلند اور برتر آرزوئیں پیدا کرتی ہیں، مگر راہِ عمل نہیں دکھاتی۔ دوسری اُسے ذوقِ عمل سے آشنا کرتی ہے مگر اُس کے ساتھ خودی اور لذت پرستی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ پہلی کا نمائندہ فاؤسٹ ہے اور دوسری کا شیطان انسانی زندگی کی تکمیل کے لئے ان دونوں کا ملنا ضروری ہے مگر اس طرح کہ فاؤسٹ، غالب رہے اور شیطان مغلوب۔ ان دونوں کی باہمی کشمکش میں، ایک تیسری قوت مداخلت کرتی ہے یعنی جوہر انوثیت یہ محبت اور عقیدت اور تسلیم و رضا کا ابدی جوہر ہے۔ جو کل کائنات میں جاری اور ساری ہے لیکن اس کا اصلی مظہر عورت ہے۔ یہی جوہر انوثیت گوئٹے کے نزدیک وہ چیز ہے جس کی جھلک ہر عاشق کو اپنی معشوقہ کی صورت اور سیرت میں نظر آتی ہے۔ عشق کا راز یہ ہے کہ روحِ انسانی میں طلبِ حقیقت کی جو آگ بھڑکتی ہے وہ علم و عمل کے چھینٹوں سے نہیں بجھتی، بلکہ اُس التہاب کو تسکین دینے کے لئے، کسی ایسی قوت کی ضرورت ہے جو خلیل اللہ کی طرح اُس آگ کو گلزار بنا دے۔ یہ قوت، ذوقِ بیخودی، لذتِ تسلیم، کیفِ محبت ہے۔ جو آسمان کے ستاروں میں سمندر کی لہروں میں، پہاڑوں کی چوٹیوں میں جنگل کے درختوں میں غرض ساری فطرت خاموشی میں پائی جاتی ہے۔ مگر اس کا زندہ مجسمہ عورت ہے جو روح کائنات سے اتحاد کامل رکھتی ہے۔ جوہر انوثیت کا نمائندہ، گوئٹے نے "گریٹشن" کو بنایا ہے۔ فاؤسٹ اگر شیطان پر غالب آسکتا ہے تو صرف "گریٹشن" کی مدد سے ان تینوں کے باہمی تعلق کو دکھانا، اصل میں عہد جدید کے یورپی انسان

کی روحانی کشمکش کی تفسیر ہے۔

سپردگی

مذکورہ صدر سطور میں فاضل مصنف نے "جوہر انوثیت" کے پہلوؤں کا تجزیہ کیا ہے۔ ان میں "محبت" اور "عقیدت" کے علاوہ عورت کی خوئے "تسلیم و رضا" کو شامل کیا گیا ہے۔ لیکن "تسلیم و رضا" پر کچھ مستزاد بھی ہے۔ فاؤسٹ نے کوشش کی کہ مجرم و معتوب "گریٹشن" کو زندان سے نکال لے جائے۔ لیکن اس کے اصرار اور پیہم اصرار کے بعد بھی رضامند نہ ہوئی۔ یعنی یہ کہ اپنی سزا اس نے بہ طیب خاطر قبول کی۔ یہاں گوئٹے نے "تسلیم و رضا" کے مقام سے بلند ہو کر سپردگی کا جلوہ دکھایا ہے۔ سپردگی، تسلیم و رضا کا لطیف ترین پہلو ہے۔

غالب نے فرمایا ہے۔

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر　　　ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

میری نظر میں یہ شعر محض "جزو کُل" کے مسئلے کا حامل نہیں ہے۔ اس کا اصل مفہوم دوسرے مصرعے میں ادا کیا گیا ہے اور مصرعے کا پورا زور:

"ہم اُس کے ہیں"

پر صرف ہوا ہے اور سپردگی عین اسی مفہوم کا نام ہے۔

یہ پوری غزل "سپردگی" کے مفہوم کی طرح طرح سے وضاحت کرتی ہے۔ لیکن یہ دو شعر:

محابا کیا ہے میں ضامن اِدھر دیکھ　　　شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

سُن اے غارتگرِ جنسِ وفا سُن　　　شکستِ شیشۂ دل کی صدا کیا

خصوصیت سے اس مفہوم سے سرشار ہیں اور "گریٹشن" کا دلدوز مرقع نگاہوں کے سامنے لے آتے ہیں۔

خیر و شر

کی آویزش کا قدیم مسئلہ "فاؤسٹ" کا بھی موضوع ہے۔ اس ڈرامے کی ابتدا میں گوئٹے نے اللہ میاں اور شیطان کی باہمی شرط کا منظر پیش کیا ہے۔ فاؤسٹ پر تبصرہ لکھنے والوں نے بتایا ہے کہ اس شرط کا ماخذ ایک پرانی روایت ہے جو مدت سے یورپ میں رائج تھی۔ روایت یہ ہے کہ ایک ساحر نے اپنا نفس، ابلیس کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ اس معاوضے پر کہ چند روز کے لئے اُسے غیر معمولی قوت حاصل ہو جائے۔

مشرق میں یہ روایت طلوعِ تمدن کے وقت سے موجود ہے۔ قدیم مصری عقائد میں، اس تصور کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ کتب سماوی کی تفسیروں میں بہت سی اساطیر اس موضوع سے متعلق ملتی ہیں۔ سنسکرت ادب میں بھی اس نوعیت کی کہانیاں مشترک ہیں۔ یہ موضوع مغرب سے بہت پہلے مشرق میں رونما ہوا اور افریقی و لاطینی ادب کی وساطت

ہے ۔مغربی زبانوں میں پہنچا۔ مارلو کے مشہور ڈرامے "فوسٹس" کا موضوع یہی ہے ۔ ملٹن نے اپنے مشہور و معروف فاسک رنظم) کومس کی بنیاد خیر و شر ہی کی آویزش پر رکھی ہے۔ اسٹیونسن کی شہرۂ آفاق کہانی "مارخائم" کی اساس اسی مسئلے پر قائم ہے گوئٹے نے بھی اپنے زندۂ جاوید ڈرامے فاؤسٹ میں اپنا فلسفۂ حیات اسی موضوع کی وساطت سے پیش کیا ہے ۔مختصر یہ ہے کہ ان مغربی مصنفوں کے صناعت پاروں کا ماخذ عبرانی تورات و اناجیل کی تفسیریں ہیں جو مغربی کلاسکس میں منتقل ہوکر رفتہ رفتہ دوسری مغربی زبانوں میں منتقل ہوئیں ۔

گوئٹے نے کالیداس کی شکنتلا کا بھی مطالعہ کیا تھا اور وہ حافظ کے کلام کا بھی شیدائی تھا ان وجوہ سے اس کے کلام میں مشرقی ادب کا کیف واثر ،خصوصیت سے ایرانی تغزل کا رنگ و جمال جھلکتا نظر آتا ہے ۔ روحِ مشرق ،اس نے خود بے حجاب دیکھی ہے اور اپنی شاعری میں دنیا کو براگندہ نقاب دکھائی ہے ۔"ڈاکٹر عابد حسین نے مذکورۂ صدر عبارت میں تین تراکیب یعنی "ذوقِ بیخودی" "لذتِ تسلیم" اور "کیفِ محبت" استعمال کی ہیں۔ ان تراکیب کے مفاہیم گویا اس قوت کے کرشمے ہیں جو بہ قولِ موصوف گوئٹے کے نزدیک عاشق کے قلب میں موجود ہوتی ہے ۔میرا التماس اب یہ ہے کہ اس قوت کا راز گوئٹے پر حافظ کے کلام کے مطالعے سے منکشف ہوا۔

غالب پر حافظ کا بڑا اثر ہے۔ اُس نے اپنی منزلت کی تاسیس کے لئے لسان الغیب کے ایک قطعے سے بلیغ استفادہ کرکے اپنا مقطع خلق کیا ہے۔

غالب بہ قولِ حضرتِ حافظ ز فیضِ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ان پہلوؤں سے گوئٹے اور غالب کے ذوق کے مشترک اجزاء اور ان کے سرچشموں کا سراغ ملتا ہے ۔

علم تشنگی

فاؤسٹ کے کردار کا ایک رخ علم تشنگی و قوت طلبی کی آرزو سے مرکب ہے ۔ یہ داخلی ہیجانِ شوق اور شدید شوق سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ۔ غالب کی شاعری میں جذبۂ شوق کی فراوانی کا ذکر موجود ہے ۔ اس کے تغزل میں شوق کا وہی مفہوم مرکز ہے جو گوئٹے نے فاؤسٹ کے قلب میں خلق کیا ہے ۔ ذیل کا شعر گویا فاؤسٹ کے ہیجانِ قلب کی ہو بہو تصویر ہے ۔

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

فاؤسٹ کی علم تشنگی یا دوسرے لفظوں میں فراوانیٔ شوق کا اندازہ اس ذہنی کیفیت سے ہوتا ہے جس میں وہ پہلی مرتبہ مبتلا نظر آتا ہے اور اپنے کمرے میں خود بخود اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے ۔ غالب کے "شوق" کے اشعار سے فاؤسٹ کی ذہنی کشمکش اور ہیجانِ قلب کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔ چند یہ ہیں ۔

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

فاؤسٹ کا ذوقِ علم اور شوقِ حصولِ قوت بے حد و پایاں ہے ۔ چنانچہ ذیل کے مطلعے سے اس کا اضطرابِ شوق

[redacted]

تمام و کمال عیاں ہے۔

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا گہر میں محو ہوا، اضطراب دریا کا

چند اور اشعار یہ ہیں۔

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز ذرّہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

فاؤسٹ کو بھی اپنی کم علمی اور محدودیت سے وہی شکایت ہے جو غالب نے ذیل کے شعر میں ظاہر کی ہے۔

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

شعر کا دوسرا مصرعہ سوالیہ تبسم کے لطیف طنز کا بھی حکم رکھتا ہے۔

ذیل کا شعر بھی "فاؤسٹ" کے محدودات و موانع کی روداد ہے

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں

یہاں "شوق" کے موضوع کے سارے اشعار کا جائزہ نہیں لیا جا سکا۔ مگر وسیع نظر سے سب کا مفہوم فاؤسٹ کے اضطراب کا مترادف و ہم کیف ہے۔

فاؤسٹ کا کردار ایک تمثیلی وجود ہے۔ اس وجود میں جرمنی کے مستقبل کی روحِ عصر جھلکتی نظر آتی ہے۔ فاؤسٹ کے قلب کا ہیجان اصل میں جرمن قوم کے قلب کا ہیجان و اضطراب ہے۔ یعنی اس ترقی و پیش روی کی بشارت ہے جو علوم سائنس کے باب میں اٹھارویں اور انیسویں صدیوں میں اس قوم نے حاصل کی۔ کسب و حصول کا یہی وہ اضطراب ہے جو اس ملک کی فوجی و سیاسی قوت و اقتدار کی بنیاد بن کر رونما ہوا۔ یہ تاریخ کا ایک ناقابلِ ابطال واقعہ ہے کہ جرمنی کے چند مفکروں کے جہد و عمل کے فلسفے نے جن میں گوئٹے کو نمایاں مقام حاصل ہے اس ملک کو دنیا کی قوموں اور ملتوں کے حلقے میں ممتاز ترین مقام پر بٹھا دیا۔

غالب کے عہد اور قوم نے اس کی فکر و فلسفے کے مفاہیم بھی نہ سمجھے۔ اس سے یہی مستنبط ہوتا ہے کہ جرمن قوم میں قوّت و حیات کے جراثیم پرورش پا رہے تھے مگر مستور تھے اور غالب کی قوم، قوّت و حیات کے علامات و شوائب سے بھی محروم و عُنری ہو چکی تھی۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد غالب کا فکری شرف بڑھ جاتا ہے وہ مردہ قوم میں رونما ہو کر قوّت و حیات کے احیاء کا درس دے سکا۔ لیکن پہلو بہ پہلو یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ کوئی قوم مردہ ہو کر اپنے فرسودہ مسلّمہ نظریات (آئیڈیولوجی) کے سہارے زندہ نہیں ہو سکتی۔ نشاۃ الثانیہ فطرت کا مطالبہ ہے۔ لیکن اس کی بنیاد بھی ہمیشہ ندرت و نو آئینی پر قائم کی جاتی ہے۔ پرانا فلسفہ مر جاتا ہے اور قوم کی خاکستر باقی رہ جاتی ہے مگر نئی امنگ جو خود وجود کی ناقابلِ تعرض و مزاحمت قوّتِ تخیر کے نہری عمل سے پیدا ہوتی اس خاکستر کو حیاتِ نو بخش دیتی ہے۔ اسی کا نام غالب نے "جذبۂ بے اختیارِ شوق" رکھا ہے جس کا

صدر میں حوالہ دیا گیا۔

گوئٹے اور غالب کا کلام بہت سے مشاہیر کے برخلاف فوراً سمجھ میں نہیں آتا۔ چنانچہ ان دونوں استادوں پر اغلاق و ابہام کا الزام لگایا گیا ہے۔ یہی نام نہاد اغلاق و ابہام ان کا فن بھی ہے۔

ایجاز و ایمائیت

اِس اندازِ پیش کش کا سچا نام ایجاز و ایمائیت ہے۔ صنّاعی و رمز آفرینی کی طرح اِس خصوص میں بھی ان دونوں کا فن ہم رنگ و ہم زبان ہے۔ یہی جدت ان کے کلام کی بلاغت اور معنی خیزی کا سرچشمہ ہے۔ تدبیر یہ ہے کہ الفاظ کم اور معنی بیش از بیش ہونے چاہئیں۔ دونوں دریا کوزے میں بند کر دینے کے شائق ہیں اور اس فن میں کامل مہارت بھی رکھتے ہیں۔ مبصروں کا خیال ہے کہ ایمائیت ہی وہ اصولِ فن یا صنعت گری ہے جو کلام کو شہپارہ بنا دیتی ہے۔ گوئٹے اور غالب دونوں نے اِس حسنِ بیان کی وساطت سے بار بار اپنے مخالفین و معترضین کی سطحیت اور اُتھلے پن کا جواب بھی دیا ہے۔ غالب فرماتے ہے

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

"جادوگرنی کا باورچی خانہ" نام کے سین میں شیطان اور وہاں کی خبیث روحوں کی جو باہمی گفت و شنید ہے وہ بھی فی نفسہ معترضین ہی کے حسد اور اوچھے پن پر طنز ہے۔ گوئٹے نے اُن کو لنگوروں اور بندروں کے روپ میں پیش کیا ہے۔

"فاؤسٹ" ڈرامے میں منایت مختصر و ضروری "سین" خلق کئے گئے ہیں۔ درمیانی واقعات و حوادث کو ایما و اشارت سے نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ اعلیٰ صنّاعی ہے اور صرف منفرد صنّاع سے ممکن ہے۔ گوئٹے نے لمبی کہانی جو سرتاپا عمل ہی عمل سے مربوط و منضبط ہے جس حسن و خوبی سے پیش کی۔ غالب نے بھی وسیع موضوعات اور ژولیدہ مسائل اسی حسن و خوبی سے دو مصرعوں کے پیکروں میں سمو دئے ہیں مثلاً

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

کیا کیا خضر نے سکندر سے اب کسے رہنما کرے کوئی

مروجہ علم معنی و بیان کی نظر سے اِن اشعار میں تلمیحات ہیں، لیکن اعلیٰ صنّاعی کی نظر سے ان میں تلمیحات سے بہت کچھ زیادہ ہے۔ ہر شعر میں کسی نہ کسی دقیق علمی و الٰہیاتی مسئلے پر نظر ڈالی گئی ہے۔ سورج روز نکلتا ہے اور مختلف اوقات میں روشنی کے مختلف اثرات و کوائف نمایاں کرتا ہے۔ ہر شخص سورج سے واقف ہے لیکن اِن اثرات و کوائف سے انگلستانی نقاش ٹرنر کی طرح صرف اہلِ ذوق و نظر ہی متاثر ہو سکتے ہیں۔

ڈرامے کو کتاب میں پڑھنے والے اور اسٹیج پر اس کا عمل دیکھنے والے، دونوں کا فریضہ ہے کہ ہمہ تن توجہ بن کر بات

کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ علمی مباحث فوراً کے فوراً ذہن نشین نہیں ہو جاتے۔ یہ کوشش ایک طرف خلوص نیت کا ثبوت ہوگی، دوسری طرف فہم کی معین ثابت ہوگی۔ عظیم آرٹ پیچیدگی یا افتادگی کا نام نہیں ہے۔ ایجاز و ایمائیت اختصار و اشاریت کا نام ہے۔ استاد کامل عموماً ان ہی اسباب و لوازم سے کام لے کر اپنے کمال پارے کو شہپارہ بناتا ہے۔

اِن وجوہ سے گوئٹے اور غالب کی مشابہت و ہمنوائی ہر جگہ پیش پا افتادہ نہیں ہے۔ انہام و تفہیم کے لئے شرط یہ ہے کہ ہر ایک کا الگ الگ عرفان پیدا کیا جائے اور پھر دونوں کی مشابہت سے استفادہ کیا جائے۔ جگہ جگہ گہرائی میں ڈوبنا اور غور کرنا پڑے گا، یعنی یہ کہ ایجاز و ایمائیت کو اطناب و توضیح سے بدلنا پڑے گا۔ بات پھیلا کر وسیع کر کے دیکھنی ہوگی جب اس کوشش میں کامیابی ہو جائے گی، تو نام نہاد، اغلاق و ابہام فن و کمال نظر آنے لگ جائیں گے۔

فاؤسٹ کے تمثیلی و ایمائی اجزا کا ماخذ گوئٹے کا رجالیا مسیحی عقیدہ ہے اس کی ایمائیت کی ضمیر، مذکورہ عقیدے کے اجزائے خصوصی پشیمانی، عفو، حلم، انکسار، امید کی طرف راجع ہوتی ہے۔

سینٹ جون کے صحیفے کا یہ بیان کہ

"پہلے کلام تھا"، جس کا حوالہ گوئٹے نے ایک جگہ فاؤسٹ کی زبان سے دیا ہے، دنیا کے تحریری ادب میں قدیم مصر سے آیا ہے۔

"فاؤسٹ" ڈرامے کی بنیاد "عفو" کے عقیدے پر رکھی گئی ہے اور گوئٹے کی قدرت و کمال کے باوجود مسیحیت کا تبلیغی پہلو ڈرامے میں جگہ جگہ نمایاں ہے۔ عفو کے تصور کو ڈرامے میں اگر اس قدرت کاملہ کے ساتھ مربوط و منسلک نہ کیا گیا ہوتا تو ہم مجبوراً یہ کہہ گزرتے کہ یہ تصنیف مسیحیت کا ڈھنڈورا ہے مگر اب تو از روئے حق و دیانت یہ کہنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ اس کمالِ خلاقی کے سامنے سر نہ جھکانا سوئے دیانت ہے۔ سر جھکا دینا اور اس کی صناعانہ قدر و قیمت کو کارنامہ باور کرنا عین انصاف ہے۔

امید و رجاء

مغربی ادب میں امید و رجاء کے تصورات کو مسیحیت کے پشیمانی و عفو کے تصورات سے منسلک کیا گیا ہے۔ چنانچہ گوئٹے کا کلام بھی امید و رجاء نوید و بشارت سے سرشار ہے۔ یہی سرشاری غالب کے کلام کا خصوصی عنصر ہے۔

یہ سرشاری، اس ہجوم یاس و حرمان سے بہت بالاتر ہے جو تغزل کی فضا میں آرٹسٹری یعنی صنعت کاری کا لازمہ سمجھی جاتی ہے۔ یاس و حرماں کا ذکر، کرب ہجر، چوما چاٹی اور شوق وصل کے ذکر کی طرح عاشقانہ زندگی کا ایک چوچلا بن کر رہ گیا ہے۔ لیکن وسیع زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، غالب کی سرشاری اپنی نوعیت میں بالکل الگ تھلگ کیفیت ہے اور نشۂ حیات کا دوسرا نام ہے۔ نوید و بشارت کا عالم نومیدی و قنوطیت کی فضا سے بہت بلند ہے وہ روح کی مسرت و شادمانی کا اثری عالم ہے، جو ذہن کو قدوسیت و قیومیت کا جلوہ دکھاتا ہے۔

غالب کی سرشاری یہ ہے کہ اس کو "سعیِ بے حاصل" میں مزہ آتا ہے -

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی   یہ جو اک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

اس لئے کہ "بے حاصل" نئی جد وجہد کا محرک ہے، تازہ جوش و ولولہ پیدا کرتا ہے اور دل زندہ کو زندہ ہی رکھتا ہے -

گوئٹے کے دل میں سچے عقیدت مند ضمیر کی پرجوش وخلوص و جائیت ہے اور یہی غالب کے قلب میں رچی بسی ہے اس پر "نوآئینی" مستزاد ہے، ؎

خلد بہ غالب سپارزانکہ بدآن روضہ در   نیک بود عندلیب خاصہ نوآئین نوا

دوسرے مصرعے کے جزو "نوآئین نوا" سے میری دلیل کی تائید ہوتی ہے - اس جزو کے استعمال سے غالب نے زندگی کو نئے زاویوں سے دیکھنے اور نئے محرکات کی نوید پر لبیک کہنے کی نوید دی ہے -

مجاہدۂ حیات

نہایت مختصر الفاظ میں کہا جائے تو یوں کہیں گے کہ "مجاہدۂ حیات" "گوئٹے" کے فاؤسٹ کا خاص موضوع ہے یا موضوع کی روح و رواں ہے - یعنی یہ کہ زندگی کی سنگلاخ دشوار یوں میں در آنے اور ایک ایک کا جم کر مقابلہ کرنے کی تشویق ہے -

غالب نے اس موضوع پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے - مجاہدۂ حیات کے نوع بہ نوع پہلوؤں کی جھلک دکھانے میں اس نے بڑی صناعی اور بڑے کمال فن سے کام لیا ہے فرماتا ہے -

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق   ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

یہ پہلے بتایا ہے کہ "مئے عشق" "مردافگن" ہے - پھر اس کے پینے کی دعوت دی ہے - ساتھ ہی ساتھ انانیت کا پہلو بھی نمایاں کیا ہے - یعنی یہ کہ "مئے عشق" پی لینا اور اس کو جھیل جانا، ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے - اس کے لئے مخصوص ظرف درکار ہے -

ذیل کے شعر میں بتایا ہے کہ "نکلنے" کی منزل میں در آنے سے قبل بے شمار آلام ومصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہتا ہے ؎

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ   دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ذیل کے شعر میں بتایا ہے کہ مہم جوئیوں کی بے خطر کام میں مزہ نہیں آتا - زندگی کا مزہ، زندگی کے خطروں کے مزے کا دوسرا نام ہے - اس لئے

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے   دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

ذیل کا شعر مجاہدے ہی کا ایک رُخ ہے -

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

یہاں "کاش" کی موجودگی بتاتی ہے کہ یہ تصور ہیبت ناک نہیں بلکہ مطلوب و مرغوب ہے اور کوئی تمنا پوری ہونے کی نوید ہے۔

ذیل کا مطلع ملاحظہ ہو

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تپش کاہے کی ہے۔ سامنے کا جواب یہ ہے کہ حصولِ مدعا کی شدید خواہش نا آسودہ آرزو کی تپش ہے جس نے کھانا پینا، سونا جاگنا حرام کر دیا ہے۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "آرزو" کاہے کی ہے۔ اس کے جواب کا خود اپنے ظرف، اپنی توفیق، اپنے حوصلے سے تعلق ہے۔ اسی لئے اس مطلع کو ہم کائناتی شاعری کہتے ہیں۔ اسی غزل میں یہ شعر بھی وارد ہے۔

بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

مذکورۂ بالا قسم کا سوال، اضطراب کے باب میں بھی پوچھا جا سکتا ہے۔ یہ اضطراب، وہ اضطراب ہے، جو پاک نہاد و سرگرم فطرت میں، غیر حاصل شدہ "آئیڈیل" کی خلش سے برابر قائم رہتا ہے۔

زندگی کے جہاد میں مزہ لینے اور لیتے رہنے کی ایک تدبیر بھی غالب نے بتائی ہے۔ وہ یہ ہے۔

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

لیکن اب ان دونوں استادوں کی فکری و تخیلی ہم زنگی و ہم نوائی کی مزید وضاحت کے لئے کلام کی داخلی شہادت بھی، پیشِ نظر ہونی ضروری ہے، اس مختصر مقالے میں، مفصل کا محل نہیں اس لئے جستہ جستہ نمونوں پر اکتفا کی گئی ہے۔

تہدیہ اور قطعہ

فاؤسٹ کے المیہ میں اُس کا پلاٹ اس کے مکالمے اس کی ترتیب اس کا عروج اس کا انجام، غرض سارے ہی اجزاء کا تصور کیسر نرالا اور انوکھا ہے۔ یہ نیا انوکھا پن ہی وہ اچھوتا پہلو ہے جس کی بدامت نے گوئٹے کو کوہِ عظمت و شہرت کی چوٹی پر لا کھڑا کیا اور جو مغرب کی شیکسپیئر پرستی پر بھی غالب آ کر رہا۔ یہاں اچھوتے پن کا تصور ذہن میں آتے ہی معاً یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ "اچھوتا پن" ہی تو وہ واحد پہلو ہے جو پہلی نظر میں ہمیں غالب کے فکر و تصور اس کے لہجہ و بیان اس کے زاویۂ نگاہ اس کے اندازِ پیش کش کی طرف خود بخود کھینچ لے جاتا ہے۔ مختصر سی مگر نہایت صاف اور سادہ بات یہ ہے کہ غالب کا سا "اچھوتا پن" اردو میں عنقا اور فارسی میں کمیاب ہے۔ اچھوتے پن کی پہلی جھلک گوئٹے نے فاؤسٹ کے ڈیڈیکیشن (تہدیے) اور غالب نے اپنے مشہور قطعے ع

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل

میں دکھائی ہے۔

"تہدیے" اور "قطعے" دونوں کی نمایاں خصوصیت خطاب اور خطاب کا اچھوتا انداز ہے "تہدیے" میں مرحوم دوستوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور خطاب کا مغز "یادِ ایام" ہے۔ قطعے میں "تازہ واردان" کو مخاطب کیا گیا ہے اور خطاب کا موضوع "عبرت" ہے۔ یہاں توجہ طلب یہ ہے کہ "یادِ ایام" اور "عبرت" دونوں نہایت قریب قریب کے ذہنی تجربے ہیں اور ایک ہی قسم کی فکر کی خلاقی ہیں۔ "تہدیہ" ماضی کی بزم آرائی کی یاد ہے اور ماضی ہی کے اشارے کنایوں کی زبان میں بیان ہوا ہے۔ قطعہ بھی من وعن یہی ہے۔ اُس کا موضوع ماضی کی بزم آرائی کا نوحہ ہے اور اس کی لفظی نقاشی وہ معجزہ ہے جو فی نفسہ خرقِ عادت ہے اور جب کبھی ظہور پذیر ہوتا ہے تو صرف شعری صناعی کی دنیا ہی میں ہوتا ہے اور بس "یادِ ایام" دونوں استادوں کے تخیل کی بنیاد ہے مگر "اے تازہ واردان" کہہ کر غالب اس عبرت کا معاد دنیا کے ہر زمانے کی نئی پود تک پہنچانا چاہتا ہے اور یہ انسان دوستی ہے، گہری انسان دوستی ہے، انسان دوستی کی معراج ہے۔

"تہدیے" میں جو رموز و بصائر اشاروں کنایوں میں، مگر پھیلا کر بیان ہوئے ہیں وہی غالب نے اختصار سے بیان کئے ہیں۔ مگر دونوں فن پاروں کی اہمیت و اشارگی نہ صرف غائر نظر سے ایک ہے، بلکہ سرسری نظر سے بھی یکساں ہے۔ "تہدیے" اور "قطعے" دونوں میں دریا کوزے میں بند کیا گیا ہے۔ گوئٹے کا ذہن "تہدیے" کی ابتداء ہی میں روحوں کی طرف منتقل ہو گیا ہے اور غالب نے آخر میں "نوائے سروش" کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ بہرحال مسلم ہے کہ دونوں کائنات کی غیر مرئی قوتوں پر اعتماد و یقین رکھتے ہیں۔ میرا انفعالی تاثر، بہرحال یہ ہے کہ ان دونوں کمال پاروں کا لب و لہجہ ایک ہے، فنی نوع و لوا ایک ہے، عالم و فضا ایک ہے، فکر و تخیل ایک ہے، نفسیاتی کیف و مزاج ایک ہے، روحانی جوہر ایک ہے۔

رات کا وقت فاؤسٹ کے مطالعے کا کمرہ

غالب کی شاعری خصوصیت سے غزل اور قصیدے کی شاعری ہے۔ ان اصنافِ سخن کے پیکروں میں اس نے نوع بہ نوع موضوعات و مہمات کی جلوہ نمائی کی ہے۔ لیکن جگہ جگہ، اس نے سماں بندی اور فضا آفرینی کی قدرت بھی دکھائی ہے۔ اس نوعِ صناعی کے نمونے اردو اور اردو فارسی قصائد کی تشبیبوں اور مثنوی "ابرِ گہربار" کے مختلف مقامات میں میسر آتے ہیں۔ ان اجزاء میں علمی و ادبی قدروں کی نمائش ہے۔ آخر الذکر میں نہ افلاک کی فضا کا وہی رنگ ڈھنگ ہے جو علوم ہیئت و فلکیات کے علما نے تحقیق سے خلق کیا ہے۔

لیکن گوئٹے نے فاؤسٹ کے کمرے میں طلسمی فضا پیدا کی ہے۔ یہ فضا مشرقی ساحروں خصوصاً بنگالہ اور کامروپ کے جادوگروں کے ویرانوں، گپھاؤں، غاروں کی فضا سے بہت مشابہ ہے، جہاں بیٹھ کر وہ اپنے اپنے جادو جگا تے تھے۔ جادو جگانا بھی عناصر پر فتح یابی اور حصولِ قوت کی سعی کا دوسرا نام ہے۔ جن حضرات نے طلسمِ ہوش رُبا کی جلدیں پڑھی

ہیں۔ انہیں فاؤسٹ کے دارالمطالعے اور معمل کی فضا سے طلسم باطن، کائناتی اور عظیم المرتبت ساحروں کی اقامت گاہیں، حجرائے ہفت بلا اور ظلمات کی زہرہ گداز فضائیں یاد آجاتی ہیں جو طلسم ہوش ربا کے مصنفوں نے بڑی صناعانہ قدرت سے خلق کی ہیں۔ "پوڈل" کتّے کی آمد اور موجودگی سے جو فضا سامنے آتی ہے وہ تمام و کمال طلسم ہوش رُبا کی فضا ہے اس داخلی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ گوئٹے مشرق کے ان علوم سے جن میں ایرانی سحر و طلسم ہندی اور قدیم ہندوستانی تنتر منتر شامل ہیں، کسی نہ کسی عنوان ضرور واقف تھا۔ جرمن علماء نے مشرقی علوم و فنون کی کتابیں سنسکرت، عربی، فارسی سے اپنی زبان میں منتقل کرلی ہیں۔ صدر میں ذکر کیا گیا ہے کہ گوئٹے نے کالی داس کی شکنتلا اور حافظ کی غزلوں کا مطالعہ کیا تھا۔ پھر یہ کہ اس کو کلاسیکی مذاق کا جرمن شاعر بتایا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ اسے اغریقی و لاطینی زبانوں اور اُن کے علوم و فنون سے بھی بہ غایت شغف تھا۔ بہت ممکن ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے سحر و طلسم کا علم اُسے عربی کتب کے تراجم اور مشرقی ہندوستانی یعنی بنگال آسام کے تنتر منتر کا علم سنسکرت تصنیفات کے ترجموں کے ذریعے سے ہوا ہو۔ جن کی اس کے ملک میں کمی نہ تھی۔ بہرنوع، فاؤسٹ کا علامتوں سے متاثر ہونا طلسم ہوش رُبا کے سحری نیرنگوں اور جادو کے کرشموں کی فضا کا سماں پیدا کردیتا ہے۔

اب یہاں سے بات ذرا غور طلب ہو جاتی ہے، فاؤسٹ اپنے کمرے میں بیٹھا ہے اور اپنے کو آپ ہی مخاطب کرکے کہتا ہے۔

> افسوس، اے فاؤسٹ، تو نے فلسفہ قانون اور طب کی خاک چھانی اور ستم تو یہ ہے کہ دینیات میں بھی سر کھپایا، مگر کمبخت سادہ لوح تو جہاں تھا وہیں ہے، ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا۔ تو فاضل کہلاتا ہے بلکہ علاّمہ اور دس سال سے اپنے شاگردوں کو انگلیوں پر نچاتا ہے حالانکہ تو جانتا ہے کہ علم انسان کی پہنچ سے باہر ہے۔ ہائے یہ خیال مجھے سوہان روح ہو گیا ہے۔

نقادوں کی نظر میں، فاؤسٹ کی اس تقریر کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سے گوئٹے کا نظریۂ علم اور نظریۂ حیات اخذ کیا گیا ہے ڈرامائی ادب میں یہ سلیکی (خود گفتاری) نگارش کے شہپاروں میں شمار ہوتی ہے۔

اب غالب کا شعر پڑھیئے اور اس کے مغز پر غور کیجئے۔

> ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں　　　کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

جسم کا رونگٹا رونگٹا آنکھ بن چکا ہے اور آنکھ بھی کیسی کہ چشمِ بینا۔ مگر اب تک حقیقت کے عرفان سے محروم ہوں، دوسرا اس سے بلیغ تر شعر دیکھئے۔

> وا کردیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن　　　غیر از نگاہ، اب کوئی حائل نہیں رہا

فرماتا ہے کہ میری نظر کی رسائی اتنے بلند مقام تک ہے کہ میں نے حسن کے نقاب کے بند بھی کھول لئے ہیں مگر حجاب محض

کا نظارہ اب بھی ممکن نہیں، کیوں۔ اس لئے کہ نظر درمیان میں حائل ہے۔ خیال کی یہ نزاکت اور فکر کی یہ رسائی غالباً انسان کے ذہن کی آخری حد ہے۔ صاف لفظوں میں مفہوم یہ ہے کہ انسان علم کے مبادی سے ضرور واقف ہے مگر کنہ حقیقت تک اس کی رسائی نہیں ہوئی۔ یہ شعر گوئٹے کے مقابل پیش کیا گیا ہے مگر دوش بدوش، شہرۂ آفاق جرمن فلسفی کانٹ (۱۷۲۴ - ۱۸۰۴) کے نظریات بھی یاد دلاتا ہے۔

یہ تو پہلے مصرعے کا علمی پہلو ہوا۔ اب دوسرے مصرعے کی ادبی بناوٹ کا جائزہ لیجئے۔ کہنے کے انداز سے یہ ظاہر ہے کہ کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔ "حائل نہیں رہا" سے بہ ظاہر یہی معنی نکلتے ہیں کہ موانع دور ہوگئے۔ لیکن معناً اور حقیقتاً یہ کہا ہے کہ اس منزل میں پہنچ جانے کے بعد بھی رکاوٹ باقی ہے۔ انسان کی نظر میں یہ قوت نہیں ہے کہ جمالِ محض کو دیکھ سکے۔ یہ اندازِ بیانِ غالب کے فن کی خصوصیات میں سے ہے۔ یعنی یہ کہ کہتا کچھ ہے اور فن کاری کی مدد سے معنی کچھ اور نکالتا ہے۔ اس کا نام لفظی صناعی ہے اس صناعی و فنکاری کا نام مستقل تصنیف (غالب کی فطنت اور صناعت کا مطالعہ) میں "حجابِ اَظلم" رکھا گیا ہے۔ فن کاری کا یہ نیا لوہلا نادر و بدیع اہتمام، اردو کے کسی بڑے سے بڑے شاعر کے کلام میں کبھی میسر نہیں آتا۔

اب میں اس موضوع سے متعلق پہلے شعر کے پہلے لفظ "ہنوز" کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ یہ لفظ کشادہ و شگفتہ ذہن کی بشارت اپنے قلب میں لئے ہوئے ہے اور ہمارے قلب میں منتقل کرتا ہے۔ اس میں صرف آج تک کا ذکر ہے مستقبل کا سدّ باب نہیں کیا گیا، یہ اشارہ غالب کی پیش بینی و رجائیت کی خبر دیتا ہے۔

منقبت کے ایک قصیدے کی تشبیب میں فرماتا ہے۔

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم   دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

فاؤسٹ نے اپنی سلیلکی میں علوم دنیا و دیں کو شامل کیا ہے اور غالب کے شعر میں بھی دنیا و دین دونوں ہی کا ذکر ہے۔

فاؤسٹ نے اسی مقام پر اپنی مفلسی اور وجاہت محرومی کی شکایت کی ہے۔ غالب نے فرمایا ہے۔

بہ تلاشے کہ ہست نیرد نزیم   بہ معاشے کہ نیست خرسندیم

آگے چل کر فاؤسٹ کہتا ہے،

مانا کہ میں، ان مدعیان فضلیت سے، ان عالموں، فاضلوں، مصنفوں اور ملاؤں سے زیادہ سمجھ دار ہوں، ان کے شکوک اور اوہام سے آزاد ہوں، جہنم اور شیطان سے نہیں ڈرتا۔ لیکن اس روشنیٔ طبع نے میری مسرتوں پہ پانی پھیر دیا ہے۔

یہ الفاظ فاؤسٹ کے ہیجانِ قلب کی روئداد ہیں۔ غالب کے قلب کی روئداد، ذیل کے مطلع میں مرکوز ہے۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی   میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اِس نوع کے سلسلۂ افکار کے ساتھ، طبیعت پر جو تخیل کبھی طاری ہوتی ہے۔ یہ فاؤسٹ پر بھی طاری ہوئی اور غالب پر بھی۔ غالب فرماتا ہے۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

فاؤسٹ جب کتاب کھول کر، کائناتِ اکبر کا نقش دیکھتا ہے تو کہتا ہے۔

"اب میں سمجھا حکیموں کا وہ قول۔ "عالم ارواح" میں کوئی حجاب نہیں۔ خود تیری آنکھیں بند ہیں اور تیرا دل مردہ"

غالب نے فرمایا ہے:۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ اس سے مدت قبل، یہ مطلع جناب ڈاکٹر عابد حسین نے بھی منطبق کیا ہے۔

روحِ ارض کا نقش دیکھ کر فاؤسٹ کہتا ہے۔

"میرے دل میں یہ ہمت پیدا ہوگئی ہے کہ دنیا کی جوکھم اپنے سر لے لوں اور زندگی کے رنج و راحت کا بوجھ اٹھالوں۔ طوفان کا مقابلہ کروں اور کشتی کے ڈوبنے کی آواز سے نہ ڈروں۔

غالب نے اپنے صحیفۂ محبت و جرأت میں، عزم بالجزم کا فلسفہ، دو مصرعوں میں اس طرح مرکوز کیا ہے۔

موجِ خون سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

سفلی عمل سے فاؤسٹ، روح (شیطان) کو بلا لیتا ہے اور روح یہ کہہ کر غائب ہو جاتی کہ تو مجھ سے مشابہ نہیں، اس گفتار سے رنجور ہو کر، فاؤسٹ گر پڑتا ہے اور کہتا ہے۔

تجھ سے نہیں، میں شبیہ ذاتِ ایزدی، کچھ سے مشابہ نہیں

فاؤسٹ کے سے تاسف و ملال کا دورہ غالب پر بھی پڑ چکا ہے۔ وہ صاف صاف پوچھتا ہے:۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخیٔ فرشتہ، ہماری جناب میں

فاؤسٹ، اپنے مددگار شاگرد واگنر سے کہتا ہے۔

"اگر تمہارے دل میں درد نہیں۔ اگر تمہارے الفاظ دل سے نکل کر سننے والوں کے دلوں کو تسخیر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، تو تمہیں ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔

غالب نے بالکل اسی موضوع پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار مگر آشفتہ بیانی میری

فاؤسٹ واگنر سے کہتا ہے۔

"اگر انسان سمجھ دار ہے اور مذاقِ سلیم رکھتا ہے، تو بغیر خطابت کی باریکیوں کے اُس کی تقریر خود بخود اچھی ہوتی ہے۔ اگر کوئی بات تمہارے دل سے لگی ہے اور تم اُسے کہنا چاہتے ہو تو الفاظ کی تلاش میں سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے۔"

غالب نے، مذکورۂ صدر گفتگو کے مغز کو، تغزل کی زبان میں مگر نہایت اختصار سے بیان کیا ہے۔ گویا دریا کوزے میں بند کیا ہے۔ فرماتا ہے:۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے　　　نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

فاؤسٹ نے راست گوئی اور اعلامِ کلمۃ الحق کے باب میں، اپنا خیال، اس طرح ظاہر کیا ہے۔

"جن معدودے چند لوگوں کو حقیقت کا کچھ علم حاصل ہوا وہ اپنی حماقت سے راز کو چھپا نہ سکے انہوں نے عوام پر اپنے جذبات و مشاہدات ظاہر کر دیئے اور لوگوں نے انہیں سولی پر چڑھا دیا، یا آگ میں جلا دیا۔"

ان سطور میں "حماقت" کا لفظ، توجہ طلب ہے۔ غالب نے صاحبِ عرفات کی کم ظرفی پر اس طرح طنز کیا ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن　　　ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

فاؤسٹ کہتا ہے۔ اس کا انداز سوالیہ ہے۔

کیا اس کہنۂ خاکدان، اس دیمک کی دنیا میں میرے درد کی دوا ملے گی، غالب نے بھی سوالیہ لہجے میں فرمایا ہے۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔

فاؤسٹ اپنے ہی نفس کو مخاطب کر کے کہتا ہے:۔

"میری روح میں جو طوفان برپا تھا۔ رفتہ رفتہ فرو ہو رہا ہے۔ میں بحرِ بیکراں میں بہا چلا جاتا ہوں، سمندر کی سطح میرے قدموں کے نیچے چمک رہی ہے۔ نیا دن مجھے نئے ساحل دکھا کر للچا رہا ہے۔"

اس گفتار میں غیر مرئی جذب و کشش کا ذکر ہے۔ اس مفہوم کو غالب نے، اس طرح ادا کیا ہے:۔

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں　　　میری آواز گر نہیں آتی

طوفان کا فرو ہونا، غالب کے یہاں "یاد کرنے" کا مترادف ہے اور یہ مسرت چونکہ فی نفسہ ایک نوعِ اضطراب ہے، اس لئے اس کا ردِ عمل یہی ہونا چاہئے کہ لبیک کے طور پر چیخ نکل جائے۔ "بحر بیکراں" میں بہنے اور نئے دن کے "للچانے" کا پورا مفہوم، پہلے مصرعے میں موجود ہے۔ "للچانے" میں بے صوتی اور اشارت کا مفہوم مرکوز ہے اور یہ پہلو غالب نے دوسرے مصرعے کے مفہوم سے نمایاں کیا ہے۔

"آتشیں بگھی" کو ہوا میں نمودار دیکھ کر، فاؤسٹ، جوشِ فخر سے کہتا ہے:-

"میں تیار ہوں کہ نئی شاہراہ پر سفر کروں اور چرخِ اثیر سے گزر کر، ان نامعلوم کروں میں پہونچوں جہاں حرکتِ محض کا دور دورہ ہے۔ اللہ اللہ، یہ بلند و برتر زندگی، یہ ملکوتی مسرّت۔ اے زمین کے کیڑے، تو اور یہ مراتب۔"

اس تقریر میں جرمن شاعر (گوئٹے) نے فاؤسٹ کی زبان سے، انسان کی خلقی عظمت کا اظہار کیا ہے۔ اس پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے کہ بالقوّت، انسان سے، وہ سب کچھ ممکن ہے جو بہ ظاہر ناممکن سمجھا جاتا ہے۔ بالکل اسی انداز دلنوا میں، غالب نے انسان کے شرف کا اظہار کیا ہے۔ مقام مباہات میں فرماتا ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا، مرے ہوتے گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

گوئٹے کی حیات میں، علوم سائنس کی ترقی کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ جرمن قوم نے فطرت کے رموز وحقائق کے انکشافات کی ابتدا کر دی تھی مگر غالب کا معاشرہ، اِن اسرار وحکم سے یک قلم بے خبر و ناآشنا تھا۔ اس نظر سے، غالب کے ذہن کی رسائی وپیش بینی کا شرف غالبًا گوئٹے سے بلند تر ہے۔

فاؤسٹ نے خود اپنے وجود کو مخاطب کرکے کہا ہے:-

"یہی وقت ہے کہ تو اپنے عمل سے انسان کو دیوتاؤں کا ہمسر ثابت کر دے۔ اُن نیرہ وتار بلندیوں سے نہ ڈرے، جہاں تخیّل کے پر جلتے ہیں اور اُس گزرگاہ کی طرف پرواز کرے جس کے تنگ دروازے پر، جہنم کے شعلے بھڑکتے ہیں۔ اُس مہم کے لئے ہنستا کھیلتا کمربستہ ہوجا۔ چاہے اُس میں قعرِ عدم میں گر جانے کا خطرہ ہو۔"

اِن ہی مفاہیم سے براہ راست متعلق، اب غالب کے تصوّرات ملاحظہ ہوں۔

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
افسردگی نہیں طرب انشائے التفات ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی
ہر سنگ وخشت ہے صدفِ گوہرِ شکست نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی
ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد، یاس خیز یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی
حسنِ فروغِ شمعِ سخن، دور ہے اسدؔ پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

خطاب کی ہم نوائی وہم آہنگی، یعنی پیش کش کا نادر و رندانہ انداز، فاؤسٹ کی تقریر اور غالب کے اشعار کی پہلی وجہِ مشترک ہے۔ اس کے بعد مفاہیم کی پُرجوشی و پُرحیاتی کا پہلو متاثر کرتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر اور اِن سارے محاسن سے بالاتر غالب کا منفردِ تغزّل مستزاد ہے۔

شعری خصوصیات سے قطع نظر جب مغز و مفاد پر نظر ڈالی جاتی ہے تو غالب کے تصورات بالکل گوئٹے ہی کی طرح بصیرت افروز اور راہ نما ہیں۔

فاؤسٹ، شراب کے بلوریں ظرف کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

" تیرے جوف میں ایک زعفرانی عرق ہے جو چشم زدن میں مست کر دیتا ہے۔ یہ میری کشید ہے اور میری پسند"

غالب نے فرمایا ہے:-

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا　　　سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

لطف یہ ہے کہ غالب نے بھی شراب کو زعفرانی بتایا ہے۔

رقص، خس بر شعلہ، انسان سرخوش دار دکہ من　　　دائم اندر بادہ، ساقی زعفران انداختہ

گوئٹے نے ایسٹر کے تہوار کا جشن مناتے ہوئے، فرشتوں کی زبان سے کہا ہے۔

" مسیح پھر جی اٹھا، مژدہ ہو فانی انسانوں کو، جو مہلک گناہوں میں موروثی شب ردخطاؤں میں ہر طرف سے گھرے ہوئے ہیں۔

یہاں "پھر جی اٹھا" پر توجہ دلانی ہے۔ ظاہر ہے کہ آدمی مر کر زندہ نہیں ہوا کرتا۔ اس لئے جناب مسیح کا یہ واقعہ خرقِ عادت ہے، نئی بات ہے۔ اس سے گوئٹے کا مفہوم یہ ہے کہ اس نئے عمل نے حیاتِ انسان کا رُخ بدل کر، خود انسان کو حیاتِ نو کی بشارت دیدی ہے۔

غالب نے فرمایا ہے۔

خیز و بے راہ روی را سر راہے دریاب　　　شورشِ افزا نگہے، حوصلہ گاہے دریاب

اس مطلع میں "بے راہ روی" پر زور دیا ہے۔ ان دونوں مقامات میں، دونوں شاعروں کا تصور تمام و کمال ایک ہے۔ یعنی یہ کہ جناب مسیح کا (بہ قول مسیحیت) احیائے ثانیہ اور رفع اسمار غالب کی بے راہ کا مترادف ہے۔ اس لئے کہ وہ بے راہ روی کی اعانت و وساطت سے "سر راہے دریاب" کا لازم خلق کرتا ہے۔

فاؤسٹ کہتا ہے۔

" اے دھیمے اور راتریں ڈوبے ہوئے آسمانی نغمے تو مجھ خاک بہ سر سے کیا توقع رکھتا ہے۔ وہاں جا، جہاں نرم دل والے لوگ جمع ہوں۔ میں تیرے پیغام کو تو سنتا ہوں مگر کیا کروں، میرا دل عقیدے سے خالی ہے، معجزہ، عقیدت کی گود کا پالا ہے۔

اس عبارت کا آخری فقرہ توجہ طلب کرتا ہے۔ عقیدت و یقین کے موضوع پر، غالب کا یہ مطلع اتنا ہی، غالباً اس سے زیادہ بصیرت افروز ہے۔

دیدہ در آن کہ تا نہد دل بہ شمارِ دلبری　　　　در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آزری

ایسٹر کے جشن کے سلسلے میں لوگ خوشیاں مناتے نکلتے ہیں۔ ایک سپاہی بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گاتا نکلتا ہے۔ اُس کے گیت کا ایک جزو یہ ہے۔

ہماری تُرہی بجتی ہے
خوشی ہو یا تباہی ہو
اس کا نام حملہ ہے
اس کو زندگی کہتے ہیں

گوئٹے نے یہ فلسفیانہ بات سپاہی کی زبان سے کہی ہے۔ اس لئے بظاہر ہلکی پھلکی سی ہو کر رہ گئی ہے اور بادی النظر میں اس کی اہمیت محسوس نہیں ہوتی۔ اس موضوع پر غالب کا شعر یہ ہے۔

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق　　　　نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

فاؤسٹ اور واگنر

اس "سین" میں گوئٹے نے بہار کی تبریک میں، ذیل کے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

"بہار کی دلکش اور جانفزا نظر نے، برف میں جکڑے ندی نالوں کو آزاد کر دیا۔ وادیوں میں امید و مسرت کا سبزہ لہلہا رہا ہے...... وہ (سورج) ہر جگہ سعی و نمو کو ابھارنا اور ہر چیز میں شوخ رنگوں سے جان ڈالنا چاہتا ہے۔"

غالب نے بہار کی تبریک اس طرح کی ہے۔

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے　　　　طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہئے

لیکن یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ بہار کے موضوع پر صرف یہی ایک شعر، غالب کے کلام میں میسر آتا ہے۔ یہاں فارسی اور اردو کے قصائد کا جائزہ نہیں لیا گیا۔ لیکن غزل کے چند اور اشعار بھی جلبِ توجہ کرتے ہیں۔

ہے رنگِ لالہ و گل و نسرین جدا جدا　　　　ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

چند اشعار مع مطلع یہ ہیں۔

پھر اس انداز سے بہار آئی　　　　کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک　　　　اس کو کہتے ہیں، عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے، سر تا سر　　　　روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی　　　　بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے　　چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر　　بادہ نوشی ہے بادپیمائی

دورانِ گفتگو میں، فاؤسٹ اپنے شاگرد واگنر کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

"خوش قسمت ہے وہ شخص، جس کے دل میں ان غلطیوں کے بھنور سے نکلنے کی امید باقی ہے۔ انسان کو اسی کی ضرورت ہے جو وہ نہیں جانتا۔ اور جو کچھ وہ جانتا ہے کسی کام نہیں آتا۔

غالب نے ذیل کے اشعار میں ملتے جلتے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب　　لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

مطالعے کا کمرہ

گوئٹے فاؤسٹ کی زبان سے کہتا ہے۔

"انسانوں کی عادت ہے کہ جس چیز کو نہیں سمجھتے، اس پر ہنستے ہیں اور حسن و خیر کے جلوے کی تاب نہیں لاسکتے، تو غراتے ہیں۔ کیا کتے کا بھی یہی دستور ہے۔

گوئٹے کا بیان سیدھا سادہ اور واقعاتی ہے۔ آدمی کی فطرت بے نقاب کرتا ہے۔ غالب نے یہی بات، تغزل کے رنگ اور زبان میں کہی ہے۔

مسکین خبر از لذتِ آزار ندارد　　خارم کنم و در رہگذر چارہ گرم ریز

لذتِ آزار کے معنی، غالب نے یہاں "درد محبت" "صحتِ ذوق" اور "درکِ جمال" رکھے ہیں۔ یہ بھی کہا ہے کہ جو لوگ آزارِ عشق کی ہنسی اڑاتے ہیں، میں اُن سے نفرت نہیں کرتا، اُن پر رحم کھاتا ہوں۔ لفظِ "مسکین" اس رفاحت کا ثبوت ہے۔ "انہیں لذتِ آزار" سے متعارف و آگاہ کر دینا چاہتا ہوں۔ آگاہ کر دینے کی جو تدبیر، غالب نے خلق کی ہے، وہ تغزل کی روح ہے اور خود اُس کی آشفتہ نوائی کا معجزہ۔

فاؤسٹ کی تقریر میں "کتے" کے ذکر کا محل ہے۔ اس لئے بات کی بات ہے اور طنز کا طنز۔ یہی طنز غالب نے "مسکین" سے پیدا کیا ہے۔

فاؤسٹ کہتا ہے:۔

"مگر افسوس اب میرے سکونِ قلب کا خاتمہ ہے۔ میں لاکھ چاہتا ہوں مگر میرے سینے سے جمعیتِ خاطر کا چشمہ نہیں ابلتا"۔

بے سکونی و اضطراب کے اس عالم کی تصویر، غالب نے اس طرح کھینچی ہے:۔

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے　　مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے

فاؤسٹ، بہت سی ذہنی کشمکش کے بعد، اس نتیجے پر پہونچا۔

جب کچھ نہ تھا، تو فعلِ خلاق تھا۔

غالب نے فرمایا ہے ؎

نہ تھا کچھ تو، خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

گوئٹے کا مفہوم مطلع کے پہلے مصرعے سے تمام و کمال ادا ہو جاتا ہے۔ دوسرا مصرعہ غالب کی فکر کا نادر پہلو ہے۔

فاؤسٹ، عناصر کی پوشیدہ قوت سے آگاہ ہے۔ اس رمز آگہی کو حیات آشنائی باور کرتا ہے اور حصولِ قوت کا وسیلہ و سرچشمہ گردانتا ہے۔ اپنے مطالعے کے کمرے میں، پوڈل، کتے کو دیکھ کر وہ چار روحوں والا منتر پڑھتا ہے، پھر یہ کہتا ہے۔

جو شخص عناصر کے خواص اور اُن کی قوت سے واقف نہیں وہ روحوں پر حکومت نہیں کرسکتا۔

"عناصر" کا لفظ غالب کے ایک مقطعے میں وارد ہے۔

ہو گئے مضمحل قویٰ غالب وہ عناصر میں اعتدال کہاں

اس لفظ کے استعمال پر میں نہ کوئی حصر کرتا ہوں، نہ اس پہلو سے کوئی اہم ادبی، یا فنی، یا علمی مماثلت و ہم آہنگی اخذ کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے کوئی شعری نازک خیالی یا لطیف جذباتی قدر بھی مستنبط نہیں ہوتی۔ مگر ایک نفسیاتی مفاد ضرور حاصل ہوتا ہے۔ جس سے خیال کی راہیں اور روابط متعین کرنے میں سہولت ہوتی ہے جس سے علمائے نفسیات نتائج اخذ کرنے میں مدد لیتے ہیں۔ وہ مفاد یہ ہے کہ عناصر کی قوت کا رمز، اگر گوئٹے کے ذہن میں گزرا۔ تو عناصر میں اعتدال کا راز، غالب کے ذہن میں بھی پیدا ہوا۔ عناصر کا اعتدال ہی اپنی جگہ حیات کی عظیم الشان قوت کا وسیلہ ہے۔ مقصد یہ بروئے کار لانا ہے کہ گوئٹے اور غالب دونوں، یونانی فلسفی امفی ذوقلیس کے فلسفے سے واقف تھے۔ اس نکتۂ خاص کے باب میں بھی، گوئٹے اور غالب کا تصور ہم رنگ ہے۔ تصور کا اشتراک فکر و نظر کے اشتراک کی قوی شہادت ہے۔

شیطان نے فاؤسٹ سے کہا۔

آپ کی نظر تو ظاہری پردوں کو ہٹا کر، حقیقتِ ذات کو دیکھتی ہے۔

غالب نے فرمایا ہے۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں۔

پہلے مصرعے میں پرستش کا فلسفہ بہت بلند مقام سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن دوسرے مصرعے کے مفاہیم، گوئٹے (بہ زبان شیطان) کے مفاہیم کے ہم رنگ ہیں۔ یعنی یہ کہ "قبلہ" حقیقتِ ذات ہے اور "قبلہ نما" ظاہری پردے۔

شیطان کہتا ہے۔

" جتنی چیزیں وجود میں آتی ہیں، سب اس قابل ہیں کہ معدوم ہو جائیں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ کوئی چیز وجود میں نہ آئے۔"

ان سطور میں گوئٹے نے شیطان کی زبان سے وجود کا نقص بیان کیا ہے

غالب نے فرمایا ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اس مطلع میں، غالب نے وجود کے مصرف پر طنز کر کے اور ماسوا اللہ کو غیر ضروری قرار دے کر، گویا مادّے کے وجود کا ابطال کیا ہے۔

گوئٹے نے شیطان کی زبان سے روحِ انسانی کو "منکبر نور" سے موسوم کیا ہے، لیکن غالب نے "نور" سے اشرف المخلوق و اشرف الدنیا کی خلقت کا اعلان کیا ہے۔ ذیل کا مطلع جو نعت میں ہے ملاحظہ ہو۔

منظور تھی یہ شکل تجلّی کو نور کی قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

یہاں "تجلّی" کے معنی خالق ہیں اور "نور" کے معنی جناب سرورِ کائنات صلعم جو اسلام کی نظر میں کائنات کی خلقت کا سبب ہیں۔

تسلسلِ حیات کا اثبات، گوئٹے کا خاص موضوع ہے۔ چنانچہ شیطان کی زبان سے کہتا ہے۔

" نہ جانے کتنوں کو دفن کر چکا مگر جب دیکھئے، ایک نئی نسل موجود ہے، جس کی رگوں میں تازہ خون دوڑ رہا ہے۔ یہ سلسلہ یونہی چلا جا رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ سر پھوڑ لوں۔"

تسلسلِ حیات کے باب میں، غالب کا فلسفہ یہ ہے۔

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک بے اختیار دوڑے ہے گل، در قفائے گل

اس شعر میں "آج تک" اور "بے اختیار" معنی سے سرشار ہیں۔ "آج تک" کے کھلے ہوئے معنی یہ ہیں کہ اس نظمِ حیات کی کبھی تردید نہیں ہوئی اور "بے اختیار" کے معنی یہ ہیں کہ یہ نظام قیومی جوش و خروش کے ساتھ قائم ہے۔ اربابِ فکر ذیل کے اشعار کو بھی، تسلسلِ حیات کا اثبات بتاتے ہیں۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے، اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

پہلے شعر میں "ہنوز" دار دہے، اور مصرعے کا آخری لفظ ہے۔ دوسرے مصرعے میں "دائم" وارد ہے۔ یہ دو لفظ قیومیت کے مفاہیم سے سرشار ہیں اور فلسفۂ تسلسل کی جان ہیں۔ ان کی وسعت و گیرائی غور و فکر کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہاں یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ "ہنوز" ایک شعر کے پہلے مصرعے کا پہلا لفظ ہے، جو اس سے قبل کی ایک بحث میں درج کیا

جا چکا ہے۔ اور برسبیل احتیاط یہاں پھر دہرایا جاتا ہے ۔

ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں　　کرے ہے ہر بنِ مو کام چشمِ بینا کا

شیطان کہتا ہے ۔

" یہ پر واز رو حیں جو گیت سناتی ہیں اور جو خوشنما تصویریں دکھاتی ہیں، وہ خالی خولی سیما کی سی نمود نہیں "

اس گفتار میں " سیما کی سی نمود " تعبیر ے کی تشبیب کا ایک شعر یاد دلاتی ہے ۔

وہ بھی تھی اِک سیمیا کی سی نمود　　صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

معنوی مشابہت کے پہلو بہ پہلو، لفظی مشابہت بھی دامن پکڑتی ہے۔ یہ اگرچہ ترجمے سے پیدا ہے مگر ترجمہ تو اصل ہی کا ترجمہ ہے۔ یعنی، ایسی اصل جو، دوسری زبان میں منتقل ہو کر، اس زبان کے سادہ سے بیان بن جاتی ہے۔ کیا اس الہامی صحت و اصابت کے جوش سے، دو ساونتوں کی صحتِ فکر اور صدقِ مقال کی ہم رنگی کا ثبوت نہیں ملتا، کسی نے کیا خوب کہا ہے ۔

سو سیانے اور ایک مت

مطالعے کا کمرہ

فاؤسٹ، شیطان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

" جب میں رات گئے ڈرتے ڈرتے بستر پر لیٹتا ہوں، تو چین نہیں آتا اور پریشان خواب ستایا کرتے ہیں "

غالب فرماتا ہے :-

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے　　مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے

اسی سلسلے میں فاؤسٹ کہتا ہے ۔

" مجھے زندگی اجیرن ہے، میں موت کا طالب ہوں اور زیست سے بیزار "

غالب فرماتا ہے :-

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے　　قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہئے

دوسرے شعر میں، غالب کی فکر کا ایک پہلو، فاؤسٹ کی آرزو سے قدرے الگ ہے ۔

فاؤسٹ شیطان کی موجودگی میں کہتا ہے۔

" لعنت ہو، ان بلند خیالات پر جن سے ہمارا ذہن اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔ لعنت ہو مظاہر کی نظر بندی پر، جو ہمارے حواس پر قبضہ کر لیتی ہے، لعنت ہو شہرت اور بقائے دوام کے فریب پر جو

ہمیں خواب میں آ کر بہلاتا ہے۔ لعنت ہو بیوی بچے، کھیت کھلیان پر، جو ہمیں خوشامد کی لوری دیتے ہیں۔ لعنت ہو مال و حشم پر جو ہمیں منچلے پن کے کاموں پر اکساتا ہے یا عیش و عشرت میں مدہوش کر دیتا ہے لعنت ہو انگور کی آبِ حیات پر۔ لعنت ہو محبت کے راز و نیاز پر لعنت ہو امید پر، لعنت ہو عقیدے پر اور سب سے بڑھ کر لعنت ہو صبر پر۔

فاؤسٹ کی، مذکورہ صدر تقریر کا نفسِ مفہوم، غالب کے قصیدہ منقبت کی تشبیب کا ہم آہنگ و ہمنوا ہے جس کے چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین نے بھی اس طرف توجہ دلائی ہے

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق	بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم	لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکین
نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت	سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسین
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم	دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں
مثلِ مضمونِ وفا باد بہ دستِ تسلیم	صورتِ نقشِ قدم خاک بہ فرقِ تمکین
عشق، بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس	وصل زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقین

یہاں یہ انتباہ ضروری ہے کہ یہ علمی اور فلسفیانہ نکات ہیں۔ بادی النظر میں، ان کے سمجھ میں آنے کا امکان اور فوراً کے فوراً ان سے لطف اندوز ہونے کی توقع، دونوں لایعنی ہیں۔ یہ مباحث غور کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان کو ٹھنڈے دل سے سوچنا سمجھنا چاہیے۔

فاؤسٹ نے اپنی تقریر میں "امید" پر بھی لعنت بھیجی ہے۔ "امید" کے موضوع پر، غالب فرماتا ہے۔

کوئی اُمید بر نہیں آتی　　کوئی صورت نظر نہیں آتی

لیکن غالب کی یہ اُمید نا و نوش یا وصل کی امید نہیں ہے۔ حقائق کے سمجھنے اور رموز کی گتھیاں سلجھانے کی امید ہے۔ ارتفاعِ نفس اور اسرارِ کائنات کے کشایش کی اُمید ہے۔ وہی کشمکش ہے جو فاؤسٹ کے ذہن پر طاری ہے۔

فاؤسٹ کی ذہنی کشمکش، غالب کا یہ شعر بھی یاد دلاتی ہے۔

دل ہوا کشمکشِ چارۂ وحشت میں تمام　　مٹ گیا گھسنے میں، اِس عُقدے کا وا ہو جانا

شیطان، فاؤسٹ سے اصرار کرتا ہے کہ باہمی معاہدہ لکھ لیا جائے اور فاؤسٹ اس پر اپنے خون سے دستخط کر دے۔ فاؤسٹ کو یہ منظور ہے۔ اس موقع پر، فاؤسٹ کی تقریر کا ایک جزو یہ ہے۔

روحِ اکبر نے مجھے رد کر دیا۔ فطرت مجھ سے کھلتی نہیں۔ خیال کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ علم سے میں بیزار ہو گیا ہوں۔ آ۔ اب ہم اپنے اضطرابِ قلب کو محسوس لذتوں کی چھینٹوں سے تسکین دیں۔ غالب نے اضطراب بیزاری کے موضوع پر یہ غزل

کہی ہے۔

یارب ز جنون طرح غمے در نظرم ریز — صد بادیہ در قالب دیوار و درم ریز
از دہر جہان تاب امید نظرم نیست — این لشت پُر از آتش سوزان بہ سرم ریز
دل را ز غم گر بیتر بے رنگ بہ جوشش آر — اجزائے جگر حل کن و در چشم ترم ریز
ہر برق کہ نظارہ گداز ست نہاد ستش — بجز از وبہ پیمانہ ذوقِ نظرم ریز
ہر خون کہ عبث گرم شود در دلم انگن — ہر برق کہ بے صرفہ جہد بر اثرم ریز

دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ "روحِ اکبر" کے مترادف ہے۔ گوئٹے کی مطابقت کے لئے صرف پہلا مصرعہ کافی ہے۔ دوسرے میں غالب کی شاعرانہ قوت اور فقدانِ امید کا مظاہرہ ہے۔ فاؤسٹ کے یہاں رد کر دیئے جانے کا ملال، غالب کے دوسرے مصرعے سے عیاں ہے۔ یہ پانچوں شعر، گہری فکر کی پیداوار ہیں اور پڑھنے والے سے اسی نوع کی فکر کا مطالبہ کرتے ہیں۔

فاؤسٹ کی تقریروں میں "عالمِ اکبر" اور "عالمِ اصغر" استعمال ہوئے ہیں۔ یہاں توجہ دلانا ضروری ہے کہ یہ الفاظ اور روحِ اکبر، مشرقی الٰہیات اور فلسفے کی اصطلاحیں ہیں۔ "عالمِ اکبر" کائنات ہے اور "عالمِ اصغر" خود انسان۔

فاؤسٹ کہتا ہے۔

"اگر میرے لئے، انسانیت کا تاج، جس کی مجھے دل و جان سے آرزو ہے سر پر رکھنا ناممکن ہے تو پھر میں کیا ہوں"

غالب نے انسانیت کی تعریف اس طرح کی ہے۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

بات ایک ہی ہے مگر بیان کے پہلو مختلف ہیں۔ گوئٹے کا بیان سوالیہ ہے اور غالب کا اظہاریہ اور قطعی۔

شیطان (یعنی گوئٹے شیطان کی زبان سے) کہتا ہے۔

"سچ تو یہ ہے، تو وہی ہے جو تو ہے، چاہے تو کتنی ہی بڑی کلاہ سر پر رکھ لے اور کتنے ہی بڑے موزے پیر میں پہن لے، تو ہمیشہ وہی رہے گا جو تو ہے"

ان الفاظ میں جبر کا فلسفہ، بہت صاف اور سیدھے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ غالب نے، اس موضوع کی وضاحت و صراحت کے لئے، ایسے بیان اور ایسی معنی آفرینی سے کام لیا جو اپنی جگہ نادر ہیں اور مجموعی طور پر دنیا کی اعلیٰ ترین شاعری کا حکم رکھتے ہیں۔

ہر چہ فلک نخواستست، ہیچ کس از فلک نخواست — ظرفِ فقیہ می نہ جست بادہ ما گزک نخواست

غرقہ بہ موجِ تاب خورد، تشنہ زدجلہ آب خورد | زحمتِ ہیچ یک نہ داد، راحتِ ہیچ یک نخواست
جاہ زعلم بے خبر، علم زجاہ بے نیاز | ہم محکِ تو زر نہ دید، ہم زرِ ما محک نخواست
شحنۂ دہر برملا ہرچہ گرفت پس نداد | کاتبِ بخت در خفا ہرچہ نوشت حک نخواست
زاہد دل لا ز رشکِ بجود آہ ز دعوئ وجود | تا نزدا ہر منی رہش بدرقۂ ملک نخواست

غزل کے مذکورۂ صدر پانچ شعر پڑھ کر، شیطان کا یہ اعلان پھر پڑھیے کہ :-

"تو ہمیشہ وہی رہے گا جو تو ہے"

اور فیصلہ کیجیے کہ ان الفاظ کا مفہوم غالب نے کس کس حسن، کس کس دلیل اور کس کس قدرت سے ادا کیا ہے - پڑھیے اور زورِ بیان اور حسنِ معنی پر لوٹ لوٹ جائیے۔ یہ پوری غزل، اسی ایک موضوع پر ہے اور اُس استادِ اعظم کے کارناموں میں سے ہے۔

فاؤسٹ کہتا ہے۔

"میں بلندی میں بال بھر نہیں بڑھا۔ حقیقتِ نامحدود سے اتنا ہی دور ہوں، جتنا پہلے تھا۔"

فاؤسٹ نے حقیقتِ نامحدود کہا ہے۔ غالب "اپنی حقیقت" کے متعلق کہتا ہے -

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے | جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

لیکن یہ ناقابلِ تردید نکتہ ہے کہ "اپنی حقیقت" "حقیقتِ نامحدود" کا جزو ہے اور جزو کل کے فلسفے کی رو سے خود "حقیقتِ نامحدود" ہے۔ اس کے علاوہ غالب کے دوسرے مصرعے نے، بیان کی بلاغت کو اور بڑھا دیا ہے -

شیطان، فاؤسٹ کے بھیس میں، طالب علم کو ہدایت کرتا ہے -

"وقت سے کام لو، یہ گزر جانے والی چیز ہے۔"

وقت کے موضوع پر غالب فرماتا ہے :-

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے | نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر | برق کو پابہ حنا باندھتے ہیں
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام | دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر | فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

شیطان کہتا ہے۔

"مگر یاد رکھو اس کا ہجے حرف بہ حرف نقل کرو۔ گویا روح القدس بول رہا ہے اور تم لکھ رہے ہو۔"

غالب نے بھی "روح القدس" ایک شعر میں باندھا ہے۔

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے سخن کی میں روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

یہاں محض ایک لفظ " روح القدس " کے اشتراک کی خاطر توجہ دلائی گئی ہے۔

گوئٹے نے شیطان کی زبان سے قانون پر طنز کیا ہے۔

" قوانین بھی دائمی بیماری کی طرح موروثی ہیں۔ اور ایک ملک سے، دوسرے ملک میں، ایک نسل سے دوسری نسل میں پہونچتے ہیں۔ معقول بات مہمل ہو جاتی ہے۔

غالب نے یہی بات وسیع کر کے کہی ہے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

غالب کا مفہوم یہ ہے کہ " رسوم " مٹی ہوئی ملتوں کے قوانین کے باقیات ہیں اور ان پر عمل پیرا رہنا گویا وقت کو پیچھے ڈھکیل دینا ہے۔ شیطان کے تبصرے کے آخری نقرے سے یہ بات تمام و کمال مطابقت کرتی ہے۔

رُسوم و قیود کے موضوع پر غالب کے یہ دو اشعار بہت بصیرت افروز ہیں۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ سرگشتۂ خمارِ رُسوم و قیود تھا

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

ان میں طنز سے زیادہ تغزّل کا مزہ ہے۔

گوئٹے نے شیطان کی زبان سے دینیات پر بھی طنز کیا ہے۔

" اِس علم میں لغزش کا بڑا اندیشہ ہے۔ اس کے اندر زہر اور تریاق ملا ہوا ہے اور دونوں میں فرق کرنا مشکل ہے۔

غالب کے مذکورہ صدر شعر سے عقائد کی سمّیت و مضرت کا پہلو بھی اخذ ہوتا ہے۔ عقیدے کی نمائشی رسمیں اجزائے شرک و الحاد ہیں اور وحدانیت کے مشرب کے منافی۔ یہ شعر فریسیت اور ظاہر پرستی کے خلاف کھلا احتجاج ہے۔ اور گوئٹے کا نقطۂ نظر کا تمام و کمال حامی ہے۔

فریسیّت پر، غالب کا یہ طنز بعید بہ لُطف ہے۔

زُنّار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

گوئٹے نے الفاظ کی مضرت پر شیطان کی زبان سے نہایت بلیغ طنز کیا ہے۔

" جہاں معنی کی جگہ خالی ہوتی ہے۔ وہاں چپکے سے کوئی لفظ آن بیٹھتا ہے۔ الفاظ سے معرکے کے مناظرے ہو سکتے ہیں۔ الفاظ سے پورا نظام بن سکتا ہے۔ الفاظ پر ایمان لانا بھی سہل ہے معنی میں خلل پیدا ہو سکتا ہے مگر لفظ خلل سے پاک ہے۔

غالب نے بھی الفاظ پر طنز کیا ہے مگر اس طنز میں معنویت زیادہ ہے۔ فرماتا ہے۔

مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنۂ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

یہ طنز مختصر اور جامع ہے۔ استعارہ و ایمائیت کا حجاب دور کر کے اور اختصار کو پھیلا کر دیکھا جائے تو گوئٹے کا پورا مفہوم پیش نظر ہو جاتا ہے۔

جادوگرنی کا باورچی خانہ

اور ایرباخ (شہر لائپزش) کے تہ خانے یا شراب خانے کی فضا بھی، انجام کار طلسمی بن جاتی ہے۔ شیطان وہاں بھی جادو کے کرشمے دکھاتا ہے۔ ساحرہ کے مطبخ کی فضا، سرتاسر طلسمی ہے۔ لیکن گوئٹے کا خلق کیا ہوا۔ یہ غیر فطری ماحول اصل میں تمثیل یا ایلگری ہے۔ نہایت پرمغز اور معنی خیز ہے۔ یہاں کے مکالموں سے ڈرامہ نگار نے، منافقت، فریبیت، خود بینی، خود نمائی، تبختر ریا، مکر، طمع، بوالہوسی، خام کاری، نفس کی بہت سی اسفل کیفیتوں اور معاشرت کی نت نئی خامیوں پر طنز کیا ہے۔ اس انواعِ طنز کے سارے مترادفات، غالب کے (اردو اور فارسی) کلام میں، کہیں کہیں سن وعن اور بجنسہ اور کہیں کہیں، لگ بھگ اور ملتے جلتے میسر آتے ہیں۔ غالب نے ہلکا سا طلسمی منظر "کھلا" کی ردیف والے قصیدے میں، استعاروں اور تشبیہوں کی وساطت سے پیدا کیا ہے، مگر یہ ایک غیر متعلق سی بات ہے۔ یہاں، زہد، ریا اور طمع کے موضوع پر غالب کے یہ اشعار یاد آئے۔

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی — پاداشِ عمل کی طمع خام بہت ہے
زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے — آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے
رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم — دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

فاؤسٹ کی خودداری اور انانیت اس کو جادوگرنی کا احسان اٹھانے سے روکتی ہے۔ کہتا ہے۔

"کیا میں اس بڑھیا کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں"

"احسان" کے موضوع پر غالب کا نظریہ یہ ہے۔

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے — طاقت کہاں کہ دید کا احسان اٹھائیے
دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم — اے خانماں خراب نہ احسان اٹھائیے

جادوگرنی کے باورچی خانے میں، شیطان کے سوال پر جانور جواب دیتا ہے۔

"ہم ادبِ لطیف کا چٹپٹا شوربہ پکاتے ہیں"

اس پر شیطان تبصرہ کرتا ہے۔

"شاباش سپھر تو خریداروں کی کمی نہ ہوگی"

یہ ادب ناشناسی اور ادبی جنس کی پذیرائی پر طنز ہے۔ غالب نے اس موضوع پر اپنے خیالات، اس طرح ظاہر کئے ہیں۔

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے　　بے سبب ہوا غالب دشمن آسمان اپنا

بر روئے شش جہت در آئینہ باز ہے　　یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا　　سمجھا ہوں دل پذیر متاع ہنر کو میں

حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجئے　　ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کہئے

جادوگرنی، شیطان کے ناشائستہ اشارے پر کہتی ہے۔

آپ ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں　　اب تک وہی شرارت چلی جاتی ہے

غالب اپنے معشوق کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

گرمی سہی کلام میں، لیکن نہ اس قدر　　کی جس سے بات، اس نے شکایت ضرور کی

دونوں باتوں کا محل مختلف ہے، لیکن طنز کا مزاج اور لب ولہجہ یکساں ہے۔

مارگریٹ (گریٹشن) کو دیکھ کر فاؤسٹ کہتا ہے۔

۔ اس کی یہ نیچی نظریں میرے کلیجے میں چبھ گئیں۔

غالب نے، شرمیلے پن کے موضوع پر، اس شعر میں، وہ مصوری کر دی۔ ہے جیسے اس نے گریٹشن کو خود ہی سڑک پر دیکھا ہو فرماتا ہے۔

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی　　ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

اس کی چھوٹی سی چوٹی کو دیکھ کر فاؤسٹ کہتا ہے۔

۔ اس کی چھوٹی سی چوٹی دیکھ کر دل پر سانپ لوٹ گیا۔

کاکل کی تعریف میں غالب فرماتا ہے۔

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا　　یہ زمرد بھی حریف دم افعیٰ نہ ہوا

ان اجزائے بیان کی مطابقت وہم آہنگی، دلنوازی و دلکشی کا مزہ صفحۂ قرطاس سے بہت زیادہ، اسٹیج پر آسکتا ہے، جہاں جیتی جاگتی تصویر سامنے آتی ہے۔

فاؤسٹ شیطان سے کہتا ہے۔

"اگر مجھے سات گھنٹے بھی ضبط کا یارا ہوتا، تو ذرا سی چھوکری کو پھسلانے کے لئے شیطان کی مدد کی کونسی ضرورت تھی"

ب اس اضطرابِ شوق کے لئے فرماتا ہے۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ان فاؤسٹ کو جواب دیتا ہے۔

" بھیرا کیوں جاتا ہے۔ اتنا تو سوچ کہ اگر وہ فوراً تیرے قابو میں آگئی تو کیا خاک لطف آئے گا۔

، محل کے لئے غالب فرماتا ہے۔

اے دلِ نا عاقبت اندیش ضبط شوق کر — کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدار دوست

ان کی اسی تقریر کا دوسرا جزو یہ ہے۔

" مزا تو جب ہے کہ کچھ دنوں ذرا چھیڑ چھاڑ رہے "۔

ب اس موقع کے لئے فرماتا ہے۔

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

ام کا وقت

مارگریٹے، ایک چھوٹے سے صاف ستھرے کمرے میں بیٹھی چوٹی گوندرہی ہے۔ شیطان فاؤسٹ کو، اس مقام سے ریب لے جاتا ہے، گوئٹے نے اس محل پر فاؤسٹ کے قلب کی کیفیت کی مصوری کی ہے۔ فاؤسٹ خود اپنے نفس سے مخاطب ہو کے کہتا ہے۔

" اور تو بتا، تو یہاں کس لئے آیا ہے۔ کیا چاہتا ہے، تیری روح کیوں تڑپتی ہے۔ تیرا دل کیوں بیٹھا جاتا ہے کیا تو فاؤسٹ ہے۔ میں تجھے نہیں پہچانتا۔ کیا یہ طلسمات کی فضا ہے۔ مجھے ناپاک آرزو کی خلش یہاں لائی تھی۔ اور اب پاک محبت کا خواب بہائے لئے جاتا ہے۔

ذیل کے اشعار، فاؤسٹ کے اضطرابِ قلب کے ترجمان ہیں۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پہلے شعر میں " دلِ ناداں " اور دوسرے میں " کوئے ملامت " اور " پندار کا صنم کدہ " فاؤسٹ کے حسبِ حال ور اس کی ذہنیت کی تصویریں ہیں۔ یہاں قلب کی فطری پاکیزگی اور محبت کے والہانہ اثرات کی بھی مصوری کی گئی ہے۔

ہمسائی کا مکان

مارتھے کے شوہر کی موت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے، شیطان کہتا ہے۔

" ہر غم کے بعد خوشی ہے اور خوشی کے بعد غم "

غالب نے اس موضوع پر یہ خیالات ظاہر کئے ہیں ۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں   موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام   دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

مارگریٹ، مارتھے کے شوہر کے حالات شیطان سے سُن کر کہتی ہے ۔

" ہائے دنیا میں کیسے بدنصیب انسان ہیں ۔

غالب فرماتا ہے ۔

مئے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجئے   لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

باغ :۔

مارگریٹ، فاؤسٹ کے بازو کا سہارا لئے ٹہل رہی ہے ۔ فاؤسٹ کہتا ہے ۔

" تیری ایک نظر میں، تیرے ایک لفظ میں جو بات ہے وہ ساری دنیا کی حکمت میں نہیں

غالب اپنی محبوبہ کی تعریف میں کہتا ہے ۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے   ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

فاؤسٹ اگریٹشن سے کہتا ہے ۔

" ہائے معصومی اور سادگی کو اپنی قدر بالکل نہیں ہوتی ۔

غالب نے سادگی اور معصومیت (تغافل) کا عاشق کے قلب پر، یہ اثر دکھایا ہے ۔

سادگی و پُرکاری، بے خودی و ہشیاری   حسن کو تغافل میں جرأت آزمایا پایا

گفتگو کے دوران اگریٹشن نے، راحت و تکلیف کے باب میں فاؤسٹ سے کہا ۔

" مگر یہ نہ ہو تو کھانے اور سونے کا مزا بھی نہیں ۔

رنج و راحت کے فلسفے کو، وسیع نظر سے غالب نے اس طرح بیان کیا ہے ۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا   نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

نکل بیٹھ کی گفتگو میں مارتھے، شیطان سے کہتی ہے ۔

" ہائے اللہ، آپ میری بات ہی نہیں سمجھتے ۔

غالب نے اسی بات کو ذرا زیادہ لطف سے شاعرانہ انداز میں کہا ہے ۔

یارب، وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات   دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

فاؤسٹ، مارگریٹ سے پوچھتا ہے کہ جب میں باغ میں آیا تو، تو نے مجھے پہچان لیا تھا ۔ وہ اس کا جواب دیتی ہے ۔

۔ آپ نے نہیں دیکھا، میں نے شرم سے سر نہوڑا لیا تھا۔

یہاں غالب کا وہی شعر پھر یاد آتا ہے، جو صدر میں نقل کیا جا چکا ہے۔

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

فاؤسٹ اور مارگریٹے کی ملاقات میں، آخرالذکر نے، ایک پھول توڑلیا، اور اس کی پنکھڑیاں الگ الگ کر کے ڈال کھولی۔ رواکی کے اس کھیل سے گوئٹے نے، جرمن معاشرے کی ایک رسم کا ذکر کیا ہے۔ غالب نے اپنے معاشرے کی ہی رسم کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے۔

اور ساتھ ہی ساتھ امید کی جھلک بھی دکھائی ہے۔

فاؤسٹ، مارگریٹے کے ہاتھ دباتا ہے اور کہتا ہے۔

"ان ہاتھوں کے، ان آنکھوں کے، زبان وہ پیام سن، جسے الفاظ ادا نہیں کر سکتے۔"

غالب، عاشق کی نگاہوں کے پیام کی اس طرح ترجمانی کرتا ہے۔

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی خون ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

معشوق اگر عاشق کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال دے، تو ظاہر ہے عاشق کی نگاہیں بھی، اس پرسشِ خاص کا جواب دینگی۔ جس کا ذکر فاؤسٹ نے کیا ہے۔

چنانچہ اس محل کے لئے غالب فرماتا ہے۔

کس منہ سے شکر کیجئے، اس لطفِ خاص کا پرسش ہے اور پائے سخن درمیان نہیں

جنگل اور غار

فاؤسٹ کہتا ہے۔

۔ میرا، مجھے آتشیں شعلے کی شکل میں دیکھنا بیکار نہیں گیا۔

یہاں گوئٹے کی مراد کوہ طور اور تجلی سے ہے۔ لیکن غالب نے، اس موضوع سے علم تشنگی، انسان کی عظمت اور عزتِ نفس کے مفاہیم پیدا کئے ہیں۔ ان پہلوؤں پر فرماتا ہے۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

فاؤسٹ خدا کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

"اے بلند و برتر روح تو نے مجھے وہ سب کچھ دیا۔ جو میں نے مانگا تھا.... تو نے مجھے نگارخانۂ فطرت کی بادشاہی بخشی۔ وہ نظر دی، جو اس کے حسنِ پنہاں کو دیکھتی ہے اور وہ دل، جو اس کے مزے لیتا ہے، یہ تیرا ہی فیض ہے کہ میں اسے حیرت کی سرد مہری سے نہیں دیکھتا۔ بلکہ ایسی گرمجوشی سے جیسے کوئی اپنے دوست کے قلب کی گہرائیوں میں نظر ڈالتا ہے۔

ذیل میں غالب کے ایک قصیدے کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ قصیدے کا موضوع حمد ہے۔ فرماتا ہے۔

اے ز وہمِ غیر غوغا در جہان انداختہ — گفتہ خود حرفے و خود را در گمان انداختہ
نقش بر خاتم ز حرفِ بے صدا انگیختہ — شور در عالم ز حسنِ بے نشان انداختہ
چرخ را در قالبِ ابداع زر دار ریختہ — خاک را بر نطعِ پیرائی ستان انداختہ
رنگہا در طبعِ اربابِ قیاس آمیختہ — نکتہ ہا در خاطرِ اہلِ بیان انداختہ
گل چو ماند دیر گردد بردلش بازار سرد — بہر تجدیدِ طرب، طرحِ خزان انداختہ
دجلہ در ساغر معنی طرازان ریختہ — رشحہ در کاسہ دریا دکان انداختہ
چشم را بخشیدہ، چونان گردشے کارباب ہوش — بر زمین دانند طرحِ آسمان انداختہ
رقصِ خس بر شعلہ زانسان سر خوشم دارد کہ من — دانم اندر بادہ ساقی زعفران انداختہ
می سرایم نغمۂ توحید و شور این نوا — چون نیم سوراخہا در استخوان انداختہ

مذکورہ صدر اشعار میں، قدرت کے ذوقِ ابداع اور مظاہرہ قدرت کے تنوعات کا ذکر ہے۔ ان کے الفاظ فاؤسٹ کے الفاظ سے قدرے مختلف ہیں مگر مفاہیم میں گہری مشابہت و ہم رنگی ہے اور ان سے قلب پر جو اثر مترتب ہوتا ہے، وہ بھی فاؤسٹ کے الفاظ کا ہم آہنگ ہے۔ لیکن دونوں کا کیف و مزاج، لہجہ و لوا، تمام و کمال یکساں ہے۔

فاؤسٹ، اپنی خود گفتاری میں، اپنے ہی نفس کو سنا کر بلند و برتر روح یعنی خدا سے کہتا ہے۔

"اب میں عجب کشمکش میں ہوں۔ آرزو مجھے لذت کی طرف کھینچتی ہے اور لذت میں میرا دل آرزو کے لئے تڑپتا ہے۔

غالب نے ذیل کے شعر میں، اسی نوعیت کے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر — کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

شیطان کہتا ہے۔

"تم اب تک اس زندگی سے نہیں اکتائے، تمہارا اس میں اتنے دن جی کیسے لگا۔ آدمی ایک بار اس کا بھی تجربہ کر لے مگر تھوڑے دن بعد، کوئی اور تماشا ڈھونڈنا چاہئے۔

اس گفتار میں تنوع پر حصر کیا گیا ہے۔ لیکن ذیل کے شعر میں، غالب نے تنوع اور ہنگامہ، دو پہلو نمایاں کئے ہیں۔

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

فاؤسٹ، شیطان سے کہتا ہے۔

تو کیا جانے، مجھے اُن ویرانوں کی سیر سے کیسی قوت زندگی حاصل ہوتی ہے۔ اگر تجھے اس کا اندازہ ہوتا تو اپنی شیطنت سے مجھے ہرگز، اس حال میں نہ رہنے دیتا۔

غالب گھر کی توہین اور دشت کی تبریک کے باب میں کہتا ہے۔

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

فاؤسٹ کو گریٹشن کے دردِ ہجر کا حال سناتے ہوئے شیطان کہتا ہے

کبھی جی بھر کے روتی ہے تو ذرا دل ٹھہر جاتا ہے مگر محبت کی لگن سے دم بھر خالی نہیں۔

اس موقع اور عالم کے لئے، غالب نے ایک مقطع کہا ہے۔

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفان نکلا

گریٹشن کے ذکر میں فاؤسٹ، شیطان سے کہتا ہے۔

میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا، کبھی نہیں چھوڑ سکتا، مجھے اس خیال سے رشک آتا ہے کہ اس عرصے میں اس کے لبوں نے عشائے ربانی کو نہ چوما ہو۔

رشک کے موضوع پر غالب کا مشہور مقطع یہ ہے۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

فاؤسٹ، نہایت افسردہ و ملول ہو کر شیطان سے کہتا ہے۔

"اس خوف کے زمانے کو مختصر کرنے میں میری مدد کر، جو کچھ ہونا ہے وہ ابھی ہو جائے۔ اس کی قسمت، میری قسمت سے ٹکرائے اور ہم دونوں برباد ہو جائیں۔

یہاں غالب کا یہ شعر پھر یاد آتا ہے۔

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

اس شعر کے انطباق کا یہ بھی محل ہے اور اس سے پہلے مذکور کئے ہوئے محل ہی کی طرح مناسبِ حال ہے۔

شیطان ہمت بندھانے کے لئے فاؤسٹ سے کہتا ہے۔

تیرے جیسے چھوٹی کھوپڑی والے کو جب کوئی تدبیر نہیں سوجھتی تو جھٹ سے موت کا تصور لے بیٹھتا ہے۔ سلامت رہیں وہ جو زندگی کے مرد میدان ہیں۔ . . . جو شیطان ہمت ہار بیٹھے، اس سے زیادہ

بدمذاق دنیا میں کوئی نہیں"

"پامردی" اور "ہمت" کے موضوعات پر غالب کے خیالات، بالکل گوئٹے کے ہم رنگ ہیں۔ ان موضوعات پر غالب نے کہا ہے۔

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا ۔۔۔ عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

تھی تو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند ۔۔۔ سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ۔۔۔ ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے ۔۔۔ آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

گریٹشن کی خواب گاہ

گوئٹے اور غالب عشق کے راز و نیاز کی پاکیزگی اور اچھوتے پن، سوز محبت کی ندرت، اور فراق کے کرب و الم کی دلدوزی کے باب میں بھی، ہم ذوق اور ہم نوا ہیں۔ دونوں کی شاعری کے یہ پہلو کریمانہ اخلاق سے سرشار ہیں اور شرافتِ نفس پر جلا کرتے ہیں۔ محبت کی ماری گریٹشن، درد ہجر میں تڑپتی ہے، چرخہ کاتتی ہے اور تڑپ تڑپ کر گاتی بھی جاتی ہے۔ اس کے گیت سے، سوزِ دروں کا گویا ایک سیلاب رواں ہے۔ کہتی ہے۔

میرے جی کا چین جاتا رہا، میرا دل بھاری بھاری ہے، ہائے اب وہ دن کبھی نہ لوٹیں گے، کبھی نہیں، کبھی نہیں، جہاں وہ میرا پیارا نہ ہو، وہ جگہ قبر سے بدتر ہے۔

گریٹشن کی بے تابی و بے کسی سے متعلق، مجھے غالب کے یہ چند اشعار میسر آئے ہیں جو اس کے عالم فراق کی مختلف کیفیتوں کی تصویریں ہیں۔

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے ۔۔۔ کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

گردش مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا ۔۔۔ ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں ۔۔۔ شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

کیجئے بیاں سرورِ تب غم کہاں تلک ۔۔۔ ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی ۔۔۔ اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

گریٹشن کہتی ہے:

میں اس کی راہ دیکھنے کو کھڑکی سے جھانکا کرتی ہوں

غالب فرماتا ہے:

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر ۔۔۔ لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

ی گیت میں آگے کہتی ہے۔

وہ اس کی شاہانہ چال
وہ اس کا اونچا اونچا قد
وہ اس کی پیاری مسکراہٹ
وہ اس کی آنکھوں کی کشش
وہ اس کی میٹھی میٹھی باتیں
جیسے جادو کا دریا بہتا ہو

چال، قد، مسکراہٹ، آنکھوں کی کشش، میٹھی میٹھی باتوں کے موضوعات پر غالب کے اردو کلام میں، جابجا اشعار موجود ہیں۔ لیکن ذیل کے چند اشعار مجھے، گریٹشن کے نغمہ ہمرکے ہم نوا محسوس ہوتے ہیں۔

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر — محشرستانِ بیقراری ہے۔
چال جیسے کڑی کمان کا تیر — دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق — لرزے ہے موجِ مے، تری رفتار دیکھ کر
سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر — تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم — قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجئے — یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے
ڈھونڈے ہے اس مغنیِ آتش نفس کو جی — جس کی صدا ہو، جلوۂ برقِ فنا مجھے

ت میں کہتی ہے۔

"اور ہائے وہ اس کا بوسہ"

ب نے فرمایا ہے۔

غنچہ کا شگفتہ کو دُور سے مت دکھا کر یوں — بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کر یوں

ریٹشن آگے کہتی ہے۔

"کاش میں اس کو پاؤں اور اپنا کر کے رکھوں"

ب نے ایک مطلعے میں فرمایا ہے۔

آ کہ میری جان کو قرار نہیں ہے — طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

گریٹشن کے گیت کا آخری جزو، گوئٹے کے تغزل کا کارنامہ ہے اور اپنی جگہ غیرفانی ہے۔ گریٹشن کہتی ہے۔

"اس کو اتنا پیار کروں جتنی جی کو خواہش ہے وہ میرے بوسے لیتا ہو اور میں دنیا سے گزر جاؤں"

ان جذبات کی نتھری سادگی، اچھوتی سچائی اور والہانہ سرشاری، صدقِ محبت وعینِ سپردگی کے صحیفے میں گویا حرفِ آخر ہیں۔

نثر کے ان مصرعوں میں، آپ نے محسوس کیا کہ گرٹیشن اپنے محبوب کو بے محابا آغوش میں لے کر بے تابانہ چومنا چاہتی ہے۔ اس عالم سپردگی کا عروج، اس نے یہ متعین کیا ہے کہ اپنے محبوب کے جوابی بوسوں کے دوران، دفورِ لذت کی فضا میں دنیا سے گذر جائے۔

اب ذیل کے سطلعے اور اشعار کا ڈرامہ دیکھئے۔ فرماتا ہے:۔

بالم بہ خویش بس کہ بہ بندِ کمندِ تو — مردم گمان کنند کہ تنگم بہ بندِ تو

آزادیم نخواہی وترسم کزین نشاط — بالم بہ خود چنان کہ نہ گنجم بہ بندِ تو

اس عالم وارفتگی کے اشعار، جو اتنی سرخوشی اور سرمستی سے معمور ہوں، جن میں تعامل و باہمہ گری کا ایسا سچا مرقع آنکھوں میں پھر جائے، عربی، فارسی، سنسکرت، اردو، برج بھاشا میں عنقا ہیں۔ غالباً وہ دنیا کے ہر ادب میں عنقا ہیں۔ واضح رہے کہ بیان کا یہی زور اور جذبے کی یہی شدت اور مزاج کی یہی شستگی شرط ہے۔ اگر کسی صاحب کی نظر سے گزریں تو التماس ہے کہ وہ اپنی لذت میں سے مجھے بھی حصہ دیں۔ ہاں، دینیس (اطالیہ) کے یگانۂ روزگار نقاش "رکٹن" نے اس عالم نشاط کا ایک مرقع بنایا ہے جس کا نام ہے۔ "دنیس اور ایڈونس" یہ نقش ہسپانیہ کے دارالخلافہ میڈرڈ کے قومی نگارخانے (پراڈو نیشنل گیلری) میں آویزاں ہے۔

مارتھا کا باغ

گرٹیشن، فاؤسٹ سے کہتی ہے۔

"تو دل کا بڑا اچھا ہے مگر میں سمجھتی ہوں تجھے دین پر اعتقاد نہیں۔"

فاؤسٹ جواب میں کہتا ہے:۔

"میری جان، ان باتوں کو جانے دے، تو جانتی ہے کہ میں تجھے پیار کرتا ہوں .... اور کسی سے، اس کا عقیدہ اُس کا کلیسا چھیننا نہیں چاہتا۔"

اس موضوع پر غالب نے اپنا مشرب اس طرح بیان کیا ہے:۔

ہاں وہ نہیں، خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی — جس کو ہوں دین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں

جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

مارگریٹ پھر فاؤسٹ سے پوچھتی ہے کہ تو خدا کو مانتا ہے یا نہیں۔ فاؤسٹ جواب دیتا ہے۔

"کس میں یہ تاب ہے کہ خدا کا نام لے اور اس پر ایمان لائے ..... کس احساس رکھنے والے دل کی مجال

ہے کہ کہے میں اُسے نہیں مانتا ۔ وہ محیطِ کل وہ قادرِ مطلق، کیا اس کی قدرت اور اس کی ذات مجھے، تجھے اور خود اُسے محیط نہیں، کیا اوپر آسمان کا گنبد نہیں۔ کیا نیچے زمین کا فرش نہیں۔ کیا ابدی ستارے محبت کی نظریں برساتے سیر میں مصروف نہیں۔ کیا میں تجھے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے نہیں دیکھ رہا ہوں۔ کیا تیرے دل و دماغ میں وجودِ محض بسا ہوا نہیں۔ کیا تیری آنکھوں میں، رازِ آشکارا چھایا ہوا نہیں، اس وسعتِ نامحدود سے اپنے دل کو معمور کرے اور جب اس کی واردات سے تجھ پر وجد طاری ہو جائے، تو اس کا جو نام چاہے رکھ لے سعادت، دلِ عاشق، یا خدا، میرے پاس اس کے لئے کوئی نام نہیں۔ جو کچھ ہے وجدان ہے۔ نام ایک آواز ہے۔ ایک دھواں ہے۔ جو کہر بن کر آسمانی نور کو چھپا لیتا ہے۔

غالب اور گوئٹے دونوں محدود و منضبط خدا کے قائل نہیں، لامحدود اور زمان و مکان سے آزاد خدا پر ایمان رکھتے ہیں ۔ دونوں لفاظی کے منکر اور سوزِ دروں کے معتقد ہیں۔ ذیل میں غالب کی ایک حمدیہ غزل درج کی جاتی ہے۔ اس فن پارے میں یہ توجہ طلب ہے کہ خدا کو کسی نام سے موسوم نہیں کیا گیا۔ مطلع میں فاؤسٹ کا وہ تصور سمویا گیا ہے۔ جو "محیطِ کل" یا "قادرِ مطلق" سے پیدا و آشکارا ہے۔

اے بہ خلا و ملا، خوئے تو ہنگامہ زا — باہمہ در گفتگو، بے ہمہ با ماجرا
شاہدِ حسنِ ترا، در روشِ دلبری — طرۂ پُرخم صفات، موئے میان ماسوا
دیدہ وران را کند دیدِ تو بینش فزوں — از نگہِ تیز رو گشتہ نگہ توتیا
آب نہ بخشی بہ دزد خونِ سکندر ہدر — جان نہ پذیری بہ ہیچ، نقدِ خضر ناروا
بزمِ ترا شمع و گل خستگیِ بوتراب — سازِ ترا زیر و بم واقعۂ کربلا
نکہتیانِ ترا قافلہ بے آب و نان — نعمتیانِ ترا مائدہ بے اشتہا
گرمیِ نبضِ کسے کز تو بدل داشت سوز — سوختہ در مغزِ خاک ریشۂ دار و گیا
مصرفِ زہرِ ستم دادہ بہ یادِ تو ام — ہنر بود جائے من در دہنِ اژدہا
کم مشمر گریہ ام زانکہ بہ علمِ ازل — بودہ درین جوئے آب، گردشِ ہفت آسیا
سادہ ز علم و عمل مہرِ تو ورزیدہ ام — مستیِ ما پایدار، بادۂ ما ناشتا

خلد بہ غالب سپار زانکہ بدان روضہ در
نیک بود عندلیب، خاصہ نو آئین نوا

وجودِ احدیت کے صفاتی تصورات، جو فاؤسٹ کے زاویۂ نظر سے اخذ ہوتے ہیں، وہ سارے کے سارے مندرجہ صدر فارسی غزل میں اپنی انفرادی ندرت و جدت کی ہر نوکِ پلک کے ساتھ منقوش کئے گئے ہیں۔ تیسرے شعر (دیدہ وران را کند)

ہیں وہی مفہوم، فارسی زبان کی پوری لطافت و بلاغت کے ساتھ سمویا ہوا ہے جو فاؤسٹ کے سوال:

"کیا تیری آنکھوں میں ماز آشکارا چھپایا ہوا نہیں" میں شعری معنویت کے ساتھ پیوست کیا گیا ہے۔

چھٹے شعر (یعنی نکتہیان ترا) کا تصور، جس سے یک قلم بے نیازی آشکارا ہے، مذہب پرستوں اور عقیدت کو سود و زیاں کی مادی نظر سے دیکھنے والوں کی رسائی سے بہت بالا تر ہے۔ اُس مشرب کے لوگ جو خدا کو جذبات کا تابع و معمول بنائے ہوئے ہیں، اور اُسے خوش اور ناخوش ہوسکنے والے بنی آدم کی قسم کی مخلوق بنا دینا پسند کئے ہوئے ہیں۔ تجرّد محض یا عینِ ذات کے عرفان کی اہلیت نہیں رکھتے۔ یہ زاویۂ نظر ترک کر دیں تو، اس گروہ کو خالق کے وجود کے خیال میں مزہ آنا بند ہو جائے۔

ساتواں شعر (گرمیٔ نبض کسے) خلوصِ یقین اور جوشِ محبت کا نقطۂ عروج (آئڈیل) ہے۔ یعنی یہ کہ اس کے مفہوم میں ضوابط پروری و مواعد پرستی کی تکذیب کی گئی ہے۔ گویا یہ کہ محبت اِن پابندیوں سے، تمام و کمال بے نیاز ہے۔ اسی شعر میں "بہ دل" کی شرط لگا کر، غالب نے اپنی" ادائے خاص سے، نمود و نمائش کے عوارض و قیود کو، احساسِ صادق کی قلمرو سے بدر کر دیا ہے۔ دسویں شعر (سادہ زعلم و عمل) کی بھی یہی نوا ہے، جو خلوصِ بے نہایت کی تبریک کرتی ہے۔

یہ سامنے کی بات ہے کہ غالب اِس فارسی غزل میں، اس کے ذوقِ بیان کے عام رویہ کے مطابق معانی کے کئی کئی رُخ نمایاں ہیں، اور پوشیدہ بھی ہیں۔ یہ آنکھ مچولی اُس کی عدیم المثال صناعی کا وہ نادر پہلو ہے۔ جو اردو اور فارسی کی شاعری میں تا حد مقابل سے ہنوز معرّیٰ ہے۔ اِن مفاہیم میں بعض وہ اچھوتے مفاہیم بھی مشترک ہیں، جو اپنی نزاکت و نفاست کی شدت کے باعث گوئٹے کے مفاہیم سے، قدرے پہلو بچا لیتے ہیں۔ لیکن یہ مسلم و ناقابل تردید ہے کہ غالب کا ہر شعر، گوئٹے کے مفاہیم کو محیط ہے۔

اثباتِ وجود (باری تعالیٰ) کے صفاتی تصورات کو۔ جو فاؤسٹ کی مذکورہ صدر تقریر میں مرکوز ہیں، اب غالب کے چند اردو اشعار میں دیکھئے۔

فاؤسٹ جب یہ کہتا ہے کہ:۔

"اُس وسعتِ نامحدود سے اپنے دل کو معمور کر لے۔"

تو گویا یہ رمز آشکارا کرتا ہے، جس کا عُقدہ، غالب نے بہ اندازِ طنز، ذیل کے پہلے مصرعے میں کھولا ہے

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخُو ہوگا   نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

اور دوسرے مصرعے میں مثال سے خوب واضح کر دیا ہے۔ ظاہر کہ دوسرا مصرعہ استفہامیہ ہے اور اس پر ہلکا جلباب بھی ڈالا گیا ہے جو اس کی صناعی کا منفرد کارنامہ ہے۔

فاؤسٹ کہتا ہے۔

"جب تجھ پر وجد طاری ہو جائے تو اس کا جو نام چاہے رکھ لے۔ سعادت، دل، عشق یا خدا، میرے پاس اُس کے

لئے کوئی نام نہیں۔ جو کچھ ہے وجدان ہے۔ نام ایک آواز ہے، ایک دھواں ہے، جو کُہر بن کر آسمانی نور کو چھپا لیتا ہے۔

ذیل کے شعر میں یہی بات، غالب نے قدرے طنز کی وساطت سے کہی ہے۔

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی　　کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا

فاؤسٹ کی تقریر کی بالکل ابتدا میں "تاب" کا لفظ وارد ہے، اس کا مفہوم غالب کے پہلے مصرعے کے تین آخری الفاظ (طاقتِ آشوبِ آگہی) سے تمام وکمال ادا ہوتا ہے اور قدرے متنزاد ہے۔ غالب فرماتا ہے کہ "آگہی" ایک "آشوب" ہے یہ پہلو فاؤسٹ کے تصور پر اضافہ ہے۔ اور "آشوب" کی جہت سے، اس کی برداشت بنی آدم کے نفس کے لئے دشوار ہے اس کو آسان بنانے کے لئے "مے" یعنی بیخودی درکار ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ "بیخودی" بہ قول فاؤسٹ "گوئٹے کے" وجدان" کی مترادف ہے۔

ہاں، انسان کا حوصلہ عاجز ہے۔ چنانچہ اس کی نارسائی یا "عجز حوصلہ" نے ایاغ کا خط کھینچ لیا ہے۔ یعنی حد بندی کر لی ہے۔ گویا۔ ایک نقطۂ بلندی تک فہم پہونچتا ہے۔ آگے فہم کی طاقت طاق ہو جاتی ہے۔ یہاں لفظ "نارسائی کو" نام" سے تعبیر کیا ہے۔ یہی بقول گوئٹے بہ زبان فاؤسٹ "آواز" ہے یا "دھواں" یا "کہر" بہ قول غالب یہ "خطِ ایاغ" ہے۔ غالب کے پہلے مصرعے میں "آگہی" اور "آشوب" دونوں لفظوں کی بہم آوری، استادی ہے اور ان سے مرکب بنا کر ایک مجرد تصور پیدا کر دینا، استادی عظمیٰ۔

یہ کہنا گستاخی ہے، مگر میں اُس استادِ اعظم کی روح سے دست بستہ معافی مانگ کر، جس کا نام گوئٹے ہے، عرض کرتا ہوں کہ "آشوبِ آگہی" کا مفہوم، اس کے یہاں نہیں ہے، یہ غالب کا اضافہ ہے۔

اسی موضوع پر اردو کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

یاس و امید نے ایک عربدہ، میدان مانگا　　عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

انسان کے ذہن میں، یاس و امید کی کشمکش جاری ہے اور اسی طرح عجز اور ہمت کی آویزش بھی جاری ہے۔ یاس کے رُسے آدمی اپنے کو عاجز محسوس کرتا ہے اور امید کے درخور سے پھر ہمت بندھ جاتی ہے۔ لیکن یہ دونوں فریب ہی فریب ہیں۔ "امید" نے تلاش وجستجو کے فریب کا ایک میدان پیدا کر دیا ہے اور ہمت نے سائلِ حقیقت کے لئے ایک طلسم خلق کر دیا ہے۔ "میدان" ناقابلِ عبور ہے اور "طلسم" ناقابلِ کُشایش ہے۔ تلاش کرنے والا "میدان" و "طلسم" میں گم ہو کر رہ گیا ہے۔

اب، ذہن یہ سوال کرتا ہے کہ آخر کیا ہو۔ غالب نے خود ہی اس کشمکش کا حل بھی بتایا ہے۔

یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات　　عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہئے۔

مطلب یہ ہے کہ جو شخص، جس حد تک صفات آشنا ہو جائے، اُس کو، اسی حد تک عارفِ ذات بھی ہو جانا چاہیئے یہ معیار ہر ذہن کے لئے سہولت اور حصولِ علمِ ذات کا امکان پیدا کرتا ہے۔ گوئٹے نے بھی سعیٔ عرفان کی طرف توجہ دلائی ہے۔ شیطان ایک جگہ فاؤسٹ کو طنزاً "یا کسبازِ بوالہوس" کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ "بوالہوس" کے استعمال سے غالب کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

والپرگس کی رات

فاؤسٹ (ڈراما) ایک دقیق و غامض تمثیل ہے۔ جس کے اشاروں کنایوں کی یورپ کے ادب میں بڑی اہمیت ہے۔ اس کی وساطت سے معاشرے کے بہت سے اداروں، بالخصوص مذہب زدوں کی سطحیت و منافقت اور پیشہ ور ادیبوں اور متشاعروں کی بدمذاقی و ارزانی پر نہایت پرلطف طنز کیا گیا ہے۔ مغرب کے اربابِ علم نے اس تمثیل سے بہت کچھ استفادہ بھی کیا ہے۔ آسکر وائلڈ سے، انگلستانی ادیب نے اپنے ناول میں ہیروئن کے بھائی جیمس وین کا کردار، گریٹشن کے بھائی ویلنٹائن کے نمونے پر خلق کیا ہے۔

"والپرگس کی رات" کی منظر آفرینی میں، گوئٹے نے اپنی نطفنت کا پورا زور صرف کر دیا ہے۔ یہاں کی فضا "طلسم ہوش ربا" کے اس مرحلے یا دربند کی فضا سے مشابہ ہے جس کا نام "ظلمات" ہے۔ بالکل یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ "سین" یا تو گوئٹے نے "طلسم ہوش ربا" پڑھ کر لکھا ہے یا اُس تصنیف کے مصنف نے فاؤسٹ (ڈراما) پڑھ کر "ظلمات" کی منظر کشی کی ہے۔ لیکن نفس الامر یہ ہے کہ "فاؤسٹ" "طلسم ہوش ربا" سے بہت پہلے کی تصنیف ہے اور آخر الذکر کا مصنف جرمن اور انگریزی زبانوں سے نابلد تھا۔ اس نے فاؤسٹ کا نام بھی نہ سنا تھا۔ اس "سین" کی رمزیت و ایمائیت "عیاں ہے۔ کم سے کم گہری اور مستور نہیں طلسم ہوش ربا کی مستور و دور از کار۔ اُس طلسم طرازی سے قطع نظر، جو "والپرگس کی رات" کے ابلیسی جشن کی ظاہری و پیکری خصوصیت ہے، اُس کی تمثیلی و معنوی خصوصیت بھی ہے۔ بہ خصوصیت، اس کا درسی و اخلاقی پہلو ہے۔ یہ ترکِ اوہام روشن خیالی اور ترقی پسندی کی تشویق و تلقین ہے۔ یہاں کے میلے میں، ایک ساحرہ، عجائبات دلنواز کی دکان سجائے بیٹھی ہے اور تماشائیوں کو مخاطب کر کے کہتی ہے۔

"میری بے نظیر دکان میں ایک چیز بھی ایسی نہیں جس سے کبھی نہ کبھی انسان کو اور دنیا کو، نقصان نہ پہونچا ہو۔ کوئی خنجر ایسا نہیں جس سے خون نہ ٹپک چکا ہو۔ کوئی پیالہ ایسا نہیں جس سے زہرِ قاتل نہ پیا گیا۔ کوئی زلور ایسا نہیں جس سے کوئی بھولی بھالی نازنین نہ پھسلائی گئی ہو۔ کوئی تلوار ایسی نہیں جس کا وار حریف پر پشت کی طرف سے نہ ہوا ہو۔

ساحرہ کا یہ تشہیری اعلان سُن کر، خود شیطان اُس سے کہتا ہے

- خالہ جان، تم زمانے کی ہوا نہیں پہچانتیں۔ جو گزر چکا اُسے بھول جاؤ۔ اب نئی چیزوں کی دکان لگاؤ۔ دلکشی صرف نئی چیزوں میں ہوتی ہے۔

ساحرہ کے اعلان اور شیطان کے جواب سے گوئٹے نے قدامت پرستی پر طنز کیا ہے۔ مرسوم روایات کی گرفت سے چھوٹنے اور مستقبل کی حیات آفرین جدتوں سے دل لگانے کی تلقین کی ہے۔ یہاں غالب کی حیات کا ایک عہد آفرین واقعہ یاد آتا ہے۔

جناب سرسید علیہ الرحمۃ نے، جب ابوالفضل کی مشہور تصنیف، آئین اکبری، صحت کرکے شائع کی تو غالب سے تقریظ کی فرمائش کی۔ غالب نے دلداری کی جہت سے تقریظ بہ طرز مثنوی لکھ دی، جس میں خود اُن کی ذات و شخصیت کو سراہا مگر ان کے کام کی داد نہیں دی۔ فرماتا ہے۔

مژدہ یاران راکہ این دیرین کتاب ۔۔۔ یافت از اقبال سیّد فتح باب
دیدہ بینا آمد و بازو قوی ۔۔۔ کہنگی پوشیدہ تشریف نوی

آئین اکبری کے باب میں، سرسیّد کی رائے کے متعلق کہتا ہے۔

دین کہ در تصنیف آئین رائے اوست ۔۔۔ ننگ دعار ہمت والائے اوست

غالب اپنی فطرت کے اعتبار سے "کہن آئینی" کے خلاف ہے اور "نو آئینی" کا حامی ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

کار و بار مردم ہشیار بین ۔۔۔ در ہر آئین، صد نو آئین کار بین
پیش این آئین کہ دارد روزگار ۔۔۔ گشتہ آئین دگر تقویم پار

پھر سرسید سے پوچھتا ہے۔

ہست، اے فرزانہ بیدار مغز ۔۔۔ در کتاب این گونہ آئین ہائے نغز
چون چنین گنج گہر بیند کسے ۔۔۔ خوشہ زان خرمن چرا چیند کسے

میں خالص تاریخی زاویے سے، اس مسئلے پر اظہار خیال نہیں کرتا۔ اس کا یہ محل نہیں ہے۔ مجھے "آئین کہن" اور "آئین نو" کے تقابل میں صرف کہنگی اور ندرت کے اجزاء سے سروکار ہے اور بس۔

ان اجزائے مثنوی سے ثابت ہے کہ غالب ندرت پسند ہے اور نو آئینی کی حمایت کرتا ہے، فارسی کلیات کی پہلی غزل کا مقطع ہے۔

خلد بہ غالب سپارزان کہ بدان روضہ در ۔۔۔ نیک بود عندلیب خاصہ "نو آئین" نوا

اس کے علاوہ اور کئی مقامات پر "نو آئینی" کے ذکر سے غالب نے اپنی مستقبل شناسی اور پیش روی کا ثبوت دیا ہے۔

یہ سین (والپرگس کی رات) اس ڈرامے کا اہم جز رہے۔ علامہ اقبال نے "جاوید نامے" کی ترتیب میں، اس منظر کے تصور رنگ سے بلیغ استفادہ کرکے اردو ادب میں نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

یوں تو فاؤسٹ کا سارا ترجمہ اس فن کا اعجاز ہے اور اردو ادب پر احسان، لیکن "والپرگس کی رات" کے ترجمے میں علامہ عابد حسین نے اردو محاورے پر استادانہ عبور اور زبان دانی کی قدرتِ کاملہ کا ثبوت دیا ہے۔

اِس جشن میں، ایک عورت کو دیکھ کر فاؤسٹ پوچھتا ہے کہ یہ کون ہے، شیطان جواب دیتا ہے کہ یہ آدم کی پہلی بیوی "للیتھ" ہے، پھر کہتا ہے۔

"ہوشیار رہنا اس کے خوبصورت بالوں سے، یہی اس کی زینت ہے، یہی اِس کا زیور ہے، جہاں کوئی نوجوان اِس دام میں گرفتار ہوا، پھر اس کی رہائی سہل نہیں"۔

ظاہر ہے کہ عورت کے بالوں کی سحرکاری کی طرف اشارہ ہے۔

غالب فرماتا ہے۔

تو اور آرائشِ خمِ کاکل میں اور اندیشہ ہائے دور دراز
نیند اُس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اُسکی ہیں تیری زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

اِس مقالے کے اِتمام پر، میں مسرور ہوں کہ مجھے حضرت علامہ کی اشارت و رمزکشائی کی اعانت سے بلیغ استفادے کا موقع ملا۔ لیکن یہاں جو کچھ پیش کیا جا سکا، وہ علمی دسرسری تقابل کی شعاعیں ہیں اور بس، حق یہ ہے کہ اِن دونوں یگانۂ روزگار ساونتوں کے فکر و تخیّل میں گہری مماثلت موجود ہے اور وہ سطح کے نیچے ڈوب کر مطالعہ کرنے سے نظر آسکتی ہے۔

انطباق و محلِ وقوع کے باب میں کوئی صاحب اگر مجھ سے اختلاف کریں تو میں اُن سے اتفاق کروں گا۔ شعر فہمی خالص انفعالی عمل ہے اور کسی کو کسی کی تردید کا حق حاصل نہیں۔ یہ سعی اگر اکتفلی ہے تو اسی سے گہری اور مکمّل تر کوشش کا امکان بھی پیدا ہے۔ یہ موضوع ایک کھلی ہوئی کتاب ہے، اربابِ فکر و نظر اور اصحابِ سعی و تلاش کے لئے چوٹی پر ہمیشہ جگہ خالی رہتی ہے، چنانچہ اس موضوع میں بھی معانی کا ذخیرہ ابھی باقی ہے۔ نکال لینے کے لئے کاوش اور رہ جوئی کی شرط ہے۔

غالب کے ایک ایک شعر میں، دس دس معانی اور بیس بیس پہلو مستور ہیں۔ ادبی نقادی نئی نئی وضاحت، نئی نئی شرح نئے نئے نکتے پیدا کرنے کا نام ہے۔ ایک پہلو پر جمے رہنے سے قوائے فکر و نظر میں جمود و اضمحلال پیدا ہوتا ہے اور قوائے عمل بھی شل ہو جاتے ہیں۔ سر بند تالاب کا پانی سڑنے لگتا ہے اور زندگی کے لئے مضر جراثیم بھی پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے۔

گوئٹے اور غالب کو نئے نئے زاویوں سے دیکھنے والے، دنیا میں ہمیشہ آتے رہیں گے اور نئے نئے دماغ، نئے نئے مطالب بھی پیدا کرتے رہیں گے اور قومِ انسان کا مستقبل روشن رکھیں گے۔ مجھے قوی امید ہے کہ آئندہ کوئی فاضل، غالب اور گوئٹے کی مماثلت کے مزید رموز کا پردہ اٹھائے گا اور وہ کام انجام دے گا۔ جو میری نظر کی رسائی سے بالاتر، یا عمیق تر رہا۔

میں پھر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اقبال نے گوئٹے اور غالب کا گہرائی میں ڈوب کر، دیدہ ریزی سے مطالعہ کیا ہے ہمارے عہد کے نوخیز جوان سال دانشوروں کا فریضہ ہے کہ اِن تینوں اکابر کا دقیق مطالعہ کریں۔ یہ تینوں ایک پروازِ فکر کے

شاعر ہیں ۔ یہ مثال غالباً منفا ہے کہ تین یگانۂ روزگار، جو فکر و نظر میں یکساں ہوں اور ملک و زمن کے معتد بہ تفاوت سے دنیا میں نمودار ہوئے ہوں، اُن کے مرتبے میں بھی، ایسی کانٹے کی تُلی یکسانیت پائی جائے ۔ اِن پر ایک مشترک سیر حاصل تصنیف مرتب ہو سکتی ہے ۔ جو دنیا کے گنجینۂ ادب میں اضافہ بھی جائے گی ۔ یہ تصنیف دنیا کی کسی عظیم المرتبت یونیورسٹی میں علّامگی کی اعلیٰ سند کا مقالہ بنائی جا سکتی ہے ۔

برنگِ غالب

(درد کاکوروی)

ہاں جود و کرم اے شہِ بطحاؐ کوئی دن اور — ملتا رہے سرکار کا صدقا کوئی دن اور
ہوتا رہے حضرتؐ کا نظارا کوئی دِن اور — مدہوش رہے دیکھنے والا کوئی دن اور
والشمس رخِ پاک کا اے سرورِ عالم — اے کاش رہے دل میں اُجالا کوئی دن اور
پڑھتے رہیں، ہم لوگ یوں ہی صلّ و سلّم — لے جاتا رہے اسکو فرشتا کوئی دن اور
اللہ مدد مشکلیں آسان ہوں اس کی — ہوتا رہے حضرت کا اشارا کوئی دن اور
وحدت کا ہمیں جام پلاتے رہیں حضرتؐ — بر آتی رہے دل کی تمنّا کوئی دن اور
مولا رہوں منظورِ نظر آپ کا ہر دم — دیکھوں یوں ہی سرکار کا جلوا کوئی دن اور
ذرّے بھی درخشاں ہیں تو پر نور فضائیں — ہاں دیکھنے دیں جلوۂ زیبا کوئی دن اور
اے کاش میں ان جالیوں کے سامنے رولوں — ہاں کرلوں طوافِ درِ والا کوئی دن اور
ہاں دیکھا کروں گنبدِ خضرا کے فرشتے — کیوں در پہ رہوں بیکس و تنہا کوئی دن اور
ہے صلّ علیٰ لب پہ تو دربارِ رسالت — ہونے کا نہیں اس سے تو اچھا کوئی دن اور

واللہ کہ ہو جاتا مرے درد کا درماں
رحمت کا اگر نور برستا کوئی دن اور

ڈاکٹر پروفیسر غلام مصطفیٰ خان، ایم اے پی ایچ ڈی
صدر شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی

غالبؔ اور صہبائیؔ

دہلی اور فضلائے دہلی کا ذکر کرتے ہوئے حالی کہتے ہیں۔

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ — نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلّی — ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
چپّے چپّے میں ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک — دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز
غالبؔ و شیفتہؔ و نیّرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ — اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
مومنؔ و علویؔ و صہبائیؔ و ممنونؔ کے بعد — شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
بزمِ ماتم تو نہیں، بزمِ سخن ہے حالی — یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

انہی فضلاء اور شعراء کے متعلق یادگارِ غالب میں حالیؔ لکھتے ہیں کہ، اگرچہ ان بزرگواروں میں بعض اصحاب ایسے بھی تھے جو ظاہرا مرزا کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے لیکن چونکہ یہ سب لوگ سخن فہم اور سخن سنج تھے اس لیے جس طرح قدر دانوں کی تحسین و آفرین سے مرزا کا دل بڑھتا تھا اسی طرح نکتہ چینیوں کے خیال سے ان کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا اور ان کے دل پر اپنا نقش بٹھانے کے لیے اظہارِ کمال میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی۔ اور اس طرح قدر دان اور نکتہ چیں دونوں ان کی ترقی کے باعث تھے۔ حالیؔ نے اس بیان سے نہ صرف غالبؔ کی شاعری کا پس منظر پیش کر دیا ہے۔ بلکہ یہ ہر اس پیش منظر کا پس منظر ہے جس میں مسابقت کی کارفرمائی سے معرکۂ کائنات برقرار رہتا ہے۔

غالبؔ ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے تھے، تقریباً پندرہ سال کی عمر سے پچیس سال کی عمر تک انھوں نے اردو میں سخن سرائی کی اور اس کے بعد ۱۸۲۲ء سے تقریباً ۲۵ ـ ۳۰ سال تک فارسی میں شعر لکھتے رہے۔ گو کہ اس دوران میں کبھی کبھی اردو میں بھی لکھ لیتے تھے[1]

---

[1] غالب کی شعرگوئی" (علی گڑھ میگزین ۱۹۴۹ء)۔ از مولانا امتیاز علی عرشی

اسی زمانے میں غالب کے دوسرے معاصرین بھی سرگرم سخن تھے جن کا ذکر حالی کے مذکورہ بالا اشعار کے علاوہ خود غالب کی ایک غزل میں اس طرح ہے

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود　　　باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ　　　حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظمِ شاں
غالبِ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بہ شمار　　　ہست در بزمِ سخن ہم نفس و ہمدمِ شاں

گویا "بزمِ سخن" میں غالب اور حالی دونوں نے معاصرین کو شامل کیا ہے۔ لیکن غالب ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "اہلِ ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے[1]" بہرحال اسی "بزمِ سخن" کے ایک رکن امام بخش صہبائی بھی تھے جن کے متعلق ایک معاصر مولوی کریم الدین نے طبقات الشعرائے ہند میں لکھا ہے کہ "فارسی میں بڑی قدرت رکھتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کتبِ فارسی میں مثل ان کے کوئی ماہر نہیں[2]"

گارساں دتاسی (خطبات خطبۂ پنجم) اور رسالہ آثار الصنادید (چوتھا باب) وغیرہ نے بھی ان کی فارسی دانی اور تبحرِ علمی کی بہت تعریف کی ہے۔ ان کی بیس کتابیں فارسی میں اور تین اردو میں شائع ہو چکی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے "رستخیزِ بےجا" میں وہ بے خطا طور پر بلا جرم مارے گئے۔

غالب کے متعلق حالی کا قول اوپر آچکا ہے کہ وہ اظہارِ کمال میں زیادہ کوشش کرتے تھے خود غالب بھی اپنی غزل کی خصوصیات کا ذکر مختلف مکاتیب میں کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "فارسی کی ترکیب اور فارسی اشعار کے معنی کے پردازی میں میرا قول اکثر خلافِ جمہور پائے گا" (اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۶)

دوسری خصوصیت کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "ماشاء اللہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو[3]" یہ بُعد ان کو لبید میں ہوا ہوگا۔ تاہم ؎

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

یہ "اندازِ بیاں" خلافِ جمہور ہی تھا اور اسی وجہ سے ان کے کلام میں بڑی دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ صہبائی کا کلام بظاہر عاشقانہ نہ ہونے کے باوجود اس "اندازِ بیان" سے خالی ہے تاہم دقتِ نظر کا شاہد ہے۔ ہم یہاں ان دونوں کی چند متحد البحر غزلوں کے اشعار کا موازنہ پیش کرتے ہیں۔

غالب کا ایک مطلع ہے:-

سوزد زبسکہ تابِ جمالش نقاب را　　　دانم کہ در میاں نہ پسندد حجاب را

اسی مضمون کو انھوں نے اردو شعر میں بھی بیان کیا ہے:-

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز　　　آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

---

[1] خطوطِ غالب صفحہ ۱۰۰ [2] طبقات الشعرائے ہند صفحہ ۴۱۲ مطبوعہ ۱۸۴۸ء [3] خطوط غالب ص ۳۲۱

حسنِ مضمون اور اس کا حسنِ تعلیل یقیناً بہت خوب ہے۔ اسی قافیے میں صہبائی کہتے ہیں :۔

میسند غرّہ بر رُخِ خود ماہتاب را　　　یک شب بیا زچہرہ برافگن نقاب را

صہبائی کا مضمون عام طرز کا ہے۔ اس میں جدت اور ندرت نہیں ہے جو غالبؔ کا خاصہ ہے۔ لیکن ایک دوسرے ہم قافیہ شعر میں صہبائی نے اپنا کمال دکھا دیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

با شرمِ حُسن دیدۂ آئینہ محو تست　　　لائق بنود حیرتِ چشم حجاب را

واقعی حُسن کی شرم وحیا کے باوجود آئینہ محوِ جمال ہے۔ لیکن عاشق کی نگاہ اس حیرت کے لائق بھی نہیں گو کہ اس نگاہ میں بھی حیرت موجود ہے۔ صہبائی نے ایک اور جگہ کہا ہے۔

نگاہ آئینہ رنگِ تحیّرے دارد　　　وگرنہ عصمتِ آں جلوہ وقفِ دیدۂ کیست

غالب کا ایک اور شعر ہے۔

سوز درُ ریشش دمے او بجناں پہ لہو　　　ریزد ز آبگینہ بساغر شراب را

اس مضمون سے کچھ قریب غالبؔ کا اردو شعر ہے۔

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے　　　آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

صہبائی مختلف کہتے ہیں لیکن تشبیہ خوب استعمال کرتے ہیں :۔

کو آشنائے لب دو سہ حرفِ عتاب را　　　از بہرِ ما دو آتشہ سازا یں شراب را

"دو سہ حرف" کی رعایت سے "دو آتشہ" ترکیب استعمال کی گئی ہے جو اپنی جگہ بڑی دلکش ہے۔

غالبؔ کا ایک اور شعر اس طرح ہے۔

آبش دہم بیادہ دادہ ہردم از تمیز　　　نوشندے و زجام فرو ریزد آب را

صہبائی اس قافیہ میں بہتر شعر کہتے ہیں کہ

ای وای دیدۂ من و نظارۂ رخت　　　حسنت بچشم آئینہ گرداند آب را

صہبائی کے یہاں ندرت ہے اور بڑا پاکیزہ خیال ہے کہ تیرے دیدار کی وجہ سے میری آنکھوں کی آب ہی ختم ہو گئی۔

غالبؔ کا ایک شعر ہے۔

نارفتہ دم ز وعدۂ باز آمدن زنند　　　تادر وصال یاد دہد اضطراب را

اردو میں انھوں نے کچھ مختلف کہا ہے کہ :۔

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر　　　آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

صہبائی کہتے ہیں :۔

در دلِ تو می تپیدن دل اضطرابِ تست　　زنہار رہ مدہ بہ دلم اضطراب را

صہبائی نے خوب کہا ہے کہ میرے دل میں تم ہو اس لیے میرے دل کے تڑپنے سے اضطراب کی تکلیف تم کو پہنچے گی۔ چنانچہ کبھی بھی میرے دل میں اضطراب پیدا نہ ہونے دو۔ اسی خصوصیت کو "مکرِ شاعرانہ" کہتے ہیں جس میں مخاطب کا فائدہ ظاہر کیا جاتا ہے لیکن دراصل کہنے والے کا فائدہ مقصود ہوتا ہے۔

پھر غالب کا شعر یوں ہے۔ ع

در دل خزد و بلا بہ و از جان بدر کشد　　دیرینہ شکوۂ ستمِ بے حساب را

مومن نے کچھ اس مفہوم کے قریب کہا ہے۔

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں　　سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

صہبائی کہتے ہیں کہ

لبریز حرفِ شکوۂ دلداری روم　　خواہم در از مدّتِ روزِ حساب را

رد میں غالب نے کچھ ہٹ کر کہا ہے کہ

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم　　ہم بھی باقی ہیں عنایت کی نظر ہونے تک

پھر غالب کہتے ہیں

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوئے اوست　　آمیختن ببادۂ صافی گلاب را

لیکن صہبائی نے اس قافیے میں بڑا لطیف مضمون نکالا ہے۔ کہتے ہیں کہ

بے پردہ است روئے تو امروز در چمن　　نتواں گرفت منّتِ آتش گلاب را

یعنی جب چمن میں تو بے پردہ ہے تو پھر گلاب میں کسی اور گرمی کی ضرورت ہی باقی نہیں۔ یعنی تندیِ صہبا کے لیے تیرا پرتو ہی کافی ہے۔ اسی زمین میں صہبائی نے ایک اور لطیف شعر کہا ہے کہ۔

در ہر طرف ز گرمیِ عشق است جلوۂ　　بر آتش ار چہ گریہ نگیرد کباب را

یعنی کباب ہیں جو آگ پر جلنے کے باوجود آہ و زاری نہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ محبوبِ ازلی کا جلوہ موجود ہے۔ گویا محبوب کا وصال نصیب ہے تو پھر آہ و زاری کیسی؛

ایک اور غزل میں غالب کہتے ہیں۔

چشم بر تازگیِ شورِ جنوں دوختہ است　　در خزاں بیش بود مستیِ دیوانۂ ما

غالب کا یہ مضمون بالکل اچھوتا ہے اور بقول اُن کے خلافِ جمہور رہا ہے۔ صہبائی اس قافیے میں صرف اس قدر کہہ سکے۔

یارب آں کن بجنونِ دلِ دیوانۂ ما　　کہ شود بالِ پری نالۂ مستانۂ ما

"نالۂ مستانہ" اگر "بالِ پری" بن کر پرواز کرے یعنی آہ کی رسائی عرش تک ہو اور محبوب کا دل پسیج جائے تو عاشق کا فائدہ تو ہے لیکن شاعرانہ ندرت کوئی نہیں۔

غالب کا ایک اور شعر ہے کہ۔

چراغے نہ رسیدیم درین تیرہ سرا   شمعِ خاموش بود طالعِ پروانۂ ما

مضمون بالکل سیدھا سادہ ہے۔ صہبائی نے اسی قافیے میں تعلّی کی ہے کہ

مست دریا کشِ عشقیم و بپیمانہ شوق   جرعۂ زد لبِ پیمانۂ ما

غالب کا ایک اور شعر ہے۔

مو برآید ز کفِ دوست اگر دہقان را   نیست ممکن کہ کند ریشہ سراز دانۂ ما

یعنی ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

لیکن صہبائی نے اس قافیے میں بہتر شعر کہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ

چون شرر حاصلِ ما در گرو دستِ فناست   برق با ریشہ کند سر بدر از دانۂ ما

صہبائی کا یہی مضمون غالب کے اردو شعر میں ملتا ہے جو ظاہر ہے کہ فارسی مشاعرے کے بعد ہی اختیار کیا گیا ہوگا۔ یعنی

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی   ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اُسی فارسی غزل میں غالب کا مقطع ہے۔

دادہ بر تشنگیِ خویش گواہی غالب   دہنِ ما بزبانِ خطِ پیمانۂ ما

اس مضمون کو غالب نے اردو میں بہتر طریقے پہ پیش کیا ہے کہ

قطرۂ مے بس کہ حیرت سے نفس پرور ہوا   خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

"پھر گناہِ کیست" والی مشہور غزل آتی ہے۔ یعنی وہی جو بکثرت شعراء نے اختیار کی تھی۔ شاید نامناسب نہ ہوگا اگر ہم چند شعراء کی نشاندہی کرتے چلیں۔ نظیری کہتے ہیں۔

گردِ سرِ گشتن و مردن گناہِ من   دیدن ہلاک و رحم نہ کردن گناہِ کیست

عرفی کا شعر ہے ؎

لائق بہ قید و بند نہ بودن گناہِ من   بُردن بہ زیرِ تیغ و نہ کشتن گناہِ کیست

قدسی کہتے ہیں ؎

در دلِ حزیں بہ ترک گفتن گناہِ من   دل بُردن و نگاہ نہ کردن گناہِ کیست

اسی طرح فائز، صائب، سالک یزدی وغیرہ کی غزلیں ہیں۔ جگر نے بھی کہا ہے۔

دیوانہ وار جان بفشاندن گناہِ من　　　بیگانہ وار رُخ نہ نمودن گناہِ کیست

لیکن غالب کا گریلہ غالب معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ۔

بخود بلرزشِ ذبح تپیدن گناہِ من　　　دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہِ کیست

اسی زمین کی دوسری غزل میں غالب پھر کہتے ہیں ۔

با تو بہ پند حرف بہ تلخی گناہِ من　　　با من بعشق غلبہ بدعوی گناہِ کیست

یہ شعر اسی زمین میں صہبائی سست خرام معلوم ہوتے ہیں ۔ فرماتے ہیں

گشتن گران ز شکوۂ طعنت گناہِ من　　　خستن بحرف غیر دلِ من گناہِ کیست

پھر غالب کا شعر اس طرح ہے ۔

ما با تو آشنا و تو بیگانہ از ما　　　آخر تو و خدا کہ جہانی گواہ کیست

غالب نے پہلے مصرع کا ترجمہ اردو کے اس شعر کے پہلے مصرع میں کر دیا ہے کہ

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار　　　یا الہٰی یہ ماجرا کیا ہے

یا دوسرا شعر ہے ۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے　　　کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

لیکن یہ دونوں شعر مکمل صورت میں فارسی شعر سے دور ہیں ۔ صہبائی بھی ایک دور افتادہ تشبیہ استعمال کرتے ہیں کہ

این شبنمِ عرق کہ کند پاک دامنت　　　بیباک نرگسِ تو ندانم گواہِ کیست

یہ پسینے سے پاک دامنی اور نرگس سے شہادت کا کام لیا ہے اور بڑا پاکیزہ انداز اختیار کیا ہے ۔

پھر غالب کا ایک شعر آتا ہے کہ

زین سان کہ سر بسر گل و ریحان و سنبل است　　　طرفِ چمن نمونہ طرفِ کلاہِ کیست

یعنی محبوب کی تاج داری اور کلاہ داری کے اثر سے ع

میں چمن میں کیا گیا　　　گویا دبستاں کھل گیا

صہبائی بھی خوب کہتے ہیں اور اسی مضمون سے قریب ہیں کہ

سنبل مرا بہ پہلوی گل میبرد ز خویش　　　این طرّہ سرکشادہ طرفِ کلاہِ کیست

لیکن صہبائی کو صرف سنبل میں محبوب کی کلاہ داری کا عکس نظر آتا ہے اور غالب کے یہاں یہ اثر نہ صرف سنبل میں ہے بلکہ گل و ریحان میں بھی ہے یعنی وہ صورت و سیرت کا مکمل پرتو دیکھتے ہیں ۔

پھر غالب کہتے ہیں کہ ۔

مو بہ تا بدا این ہمہ پیچ و خم و شکن — زلفِ تو را ز زمانۂ بختِ سیاہ کیست

اردو میں غالب نے

اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے ـــــ کہہ کر ایک دوسرا مضمون پیدا کیا ہے۔ لیکن صہبائی نے اس قافیے ایک لطیف مضمون نکالا ہے۔

گفتی کہ می‌کشد دلم امشب بیک طرف — غیرت برم کہ جذبۂ بختِ سیاہ کیست

رقیب کے بختِ سیاہ پر بھی رشک آتا ہے کہ محبوب آج رات دوسری طرف یعنی اُسی کی طرف ملتفت ہے۔ اب ہم غالب کے مطلع کی طرف رجوع کرتے ہیں جو ہم نے عمداً روک لیا تھا۔ غالب فرماتے ہیں۔

درگردِ نالہ وادیِ دل رزم گاہِ کیست — خونے کہ می‌دود دلش از تن سپاہِ کیست

اس کا دوسرا مصرع کسی حد تک ان کے اردو شعر میں آجاتا ہے کہ

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

صہبائی نے اس قافیے میں ایک مکمل مضمون باندھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

کافر نگاہِ دشنہ گذار از سپاہِ کیست — در خون طپیدہ بسملِ من دادخواہِ کیست

لیکن غالب کا مضمون بلند تھا۔ انہوں نے خود اپنے خون کو محبوب کی سپاہ میں شامل کر کے اپنی ہمہ تن سپردگی کا نقشہ پیش کیا ہے جو صرف انہی کا کام ہے۔

غالب کی ایک اور غزل ہے کہ

گفتم ز شادی نبودم گنجیدن آسان در بغل — تنگم کشید از سادگی در وصلِ جاناں در بغل

محبوب کی سادگی کے متعلق غالب کے کئی اردو شعر بھی ہیں۔ مثلاً

میں نے کہا کہ بزمِ ناز غیر سے چاہیے تہی — سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

یہ ستم ظریفی بھی ہے اور سادگی بھی کہ ! ع ضد کی ہے اور بات مگر خو بُری نہیں

تاہم غالب کے فارسی شعر میں بڑی ندرت ہے۔ اور دوسرے شعر میں سادگی کی جگہ مستی کا ذکر آتا ہے کہ

دانش بہ می در باختہ، خود را ز مستی نشناختہ — رخ در کنارم ساختہ از شرم پنہاں در بغل

اس طرز کے اشعار غالب کے اردو دیوان میں نظر نہیں آتے۔ صہبائی نے محبوب کی مستی کے اثرات ضرور بیان کیے ہیں کہ

چشمت فریبے می‌کند در کارِ زاہد کش بود — یک جرعہ پنہاں وقفِ لب یک جام پیمانہ در بغل

لیکن صہبائی نے حیرت و محویت کے مضمون سے عجیب لطافت پیدا کر دی ہے۔ فرماتے ہیں کہ

وقتے من و مجنوں صبا خاکِ سرِ کوئے بسر — لیکن من و چوں آئینہ تصویرِ جاناں در بغل

ایک اور شعر میں صہبائی بہتر طریقے پر فرماتے ہیں

حیرتِ دل پردہ پوشِ روئے کیست؟ جلوہ باشد رونما آئینہ را

صہبائی نے "پنہاں" والے قافیے میں ایک اور شعر بڑی اچھی تشبیہ کے ساتھ کہا ہے۔

راز دلم را چوں صبا کس نغمازی کند چاکِ دل خود می کنم چوں غنچہ پنہاں در بغل

بہت اچھی تشبیہ ہے اور حسنِ تعلیل سے بڑا حسن پیدا کیا ہے غنچے کی رعایت سے غالب نے ایک اور شعر اس طرح کہا ہے۔

چوں غنچہ دیدی در چمن گفتی بگلبن کیست زمن چوں رفتہ ناوک از جگر چوں ماندہ پیکاں در بغل

آتش نے غنچے کی روئیدگی کی توجیہہ دوسری طرح کی ہے۔

زیرِ زمیں سے آتا ہے غنچہ سو زر بکف قارون نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

رومی کی "روئیدگی" کی طرح غالب نے بھی اردو میں کہا تھا کہ

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

یہ اللہ اللہ توجیہہ ہے اور ع فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

اب ایک چھوٹی بحر کی غزل ملاحظہ ہو۔ غالب کہتے ہیں!

سرشک افشانیِ چشمِ تر شی ہیں شِ خوباں درِ گنجِ گوہر سش ہیں

غالب نے غالباً اپنے ہجر میں محبوب کو رلایا ہے۔ صہبائی نے محبوب کے دامن میں اپنے "وفا پروردہ" آنسو اس طرح پیش کیے ہیں

ہجومِ اشک در چشمِ تر شی ہیں وفا پروردہ ممنونِ برشی ہیں

غالب کا ایک اور شعر ہے

ادائے دلستانے رفتہ از یاد ہوائے جانفشانی در سرشی ہیں

غالب کی طرح صہبائی نے بھی محبوب کو صہبائے محبت سے سرشار کر لیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

زغیرتِ حرفِ معشوقی گراں داشت جنوں سودائی عشق اندر سرشی ہیں

غالب کا ایک اور شعر ہے

خدا دند شی بخونِ ما مگیراد بہ بیتابی نگہ بر خنجر سش ہیں

یعنی ع شہیدانِ نگہ کا خون بہا کیا

ایک اور شعر میں ہے۔

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اس کی گردن پر وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دم بدم نکلے

صہبائی نے اسی قافیے سے ایک لطیف اور نادر مضمون پیدا کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

تغافلہا زمن زد درستمہا معطل آن سنان دخنجرش بین

غالب کی ایک غزل ہے۔

ہرچہ فلک نخواستہ ست ہیچ کس از فلک نخواست ظرفِ فقیہ می نجست بادہ ما کزک نخواست

یعنی۔ ع دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

یا۔ ع کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا۔ لیکن شعر میں مسئلہ جبر و اختیار پیش کیا ہے۔

صہبائی نے قناعت کا دم بھرا ہے۔ فرماتے ہیں۔

مردِ رہِ قناعتم، دل مزہ خوشترک نخواست گر فلکم نمی نواخت کام طلب گزک نخواست

اسی زمین میں غالب کا ایک اور شعر ہے

زاہد ہزار شیوہ ما طاعتِ حق گراں نبود لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

اس شعر سے اقبال کے شعر کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ یعنی

جو میں سربسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

غرض کہ اسی طرح غالب اور صہبائی کی متعدد غزلیں متحد البحر ہیں اور ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ان دونوں شاعروں کے مضامین بھی اکثر موقعوں پر ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔ چند اشعار اور ملاحظہ ہوں

صہبائی کہتے ہیں۔

عاشق بہ نیم جلوہ تسلی نمی شود پیدا ست حال تشنہ دلیہائے آئینہ

غالب بھی ملتا جلتا شعر کہتے ہیں۔

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق آئینہ باندازِ گل آغوش کشا ہے

صہبائی کا ایک اور شعر ہے۔

حسن برآئینہ و قدنہ زند اکاش تا در جز بہ خود نبود جلوۂ جانانہ ما

غالب بھی کہتے ہیں کہ

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

صہبائی پھر کہتے ہیں کہ

فرصتِ عمر شرر مژگان کشودن بیش نیست ما عدم سرمایہ ایم از روزگارِ ما مپرس

غالب بھی کہتے ہیں کہ

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

صہبائی کا ایک اور شعر ہے۔

ز چہرۂ یوسفِ ما می کشد نقاب دلے   برائے دیدنِ آن رشکِ حور دیدہ کیست

غالب نے بھی اس مضمون کو خوب باندھا ہے۔

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن   غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

صہبائی کا ایک اور شعر سن لیجئے

تو گفتی رو بخوابت می دہیم بر غم حزن لیکن   چہ باید کرد خواب از دردِ ہجرانم نمی آید

غالب نے یہی مضمون کچھ فرق کے ساتھ عارف کے مرثیے میں باندھا ہے کہ

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت میں ملیں گے   کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

بہرحال غالب اور صہبائی دونوں ظہوری سے متاثر ہیں۔ صہبائی نے کہا ہے۔

بدل جستہ ایم از ظہوری کہ ما   بہ صہبائیِ نکتہ در ساختیم

اور غالب نے بھی کہا ہے کہ

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب   میرے دعوی پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

تاہم اگر غالب، صہبائی کے معترف ہیں تو صہبائی بھی کہتے ہیں کہ

نالۂ غالب و آزردہ ز لفِ پُر و شنا ان   سوختم سوختم از آتشِ گرمِ دمِ شان

اور یوں بھی کہ

چو دیدم غالب و آزردہ را از بندہ صہبائی   بخاطر ہیچ یاد از خاکِ ایرانم نمی آید

سید علی حسنین زیبا ردولوی ایم اے

غالب نام آورم[1]

سلطانِ جہانِ تجرید اور قہرمانِ تفرید ملک العشاق حضرت مولانا مظفر بلخی فردوسیؒ کے دودمانِ عالی کے مولوی سید رفیع الدین بلخی ایڈووکیٹ پٹنہ مرحوم نے "تجزیۂ کلام غالب" فرمایا اور شفیق و مکرم (خان بہادر) مرزا ابوجعفر کشفی صاحب اور حبیب لبیب سید الطاف علی بریلوی کی ستم ظریفی دیکھئے کہ مجھے "تجزیۂ کلام غالب" کے مقدمہ میں اُلجھا دیا۔ ادھر کلام غالب کا یہ عالم کہ ایک ڈاکٹر (عبدالرحمٰن بجنوری) اس کی بابت لکھتے ہیں کہ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ایک وید مقدس اور دوسری دیوان غالب" اور دوسرے ڈاکٹر (عبداللطیف صاحب) کے خیال میں غالب کا کلام عالمی ادب کی محفل میں پائین فرش جگہ پانے کو پا سکے۔ ان کے الفاظ تو یہ نہیں ہیں مگر مفہوم کچھ ایسا ہی ہے۔

بہت دن ہوئے حیدرآباد دکن کی ایک ادبی صحبت میں دونوں ڈاکٹر صاحبان کی ان متضاد تشخیصوں پر گفتگو ہو رہی تھی اور بلا استثنا ہر شخص دونوں آراء کو حقیقت سے بعید اور ان ڈاکٹروں کو مغرب زدہ وغیرہ کہہ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد موضوع سخن بدلا اور اساتذۂ قدیم کے فارسی یا اردو اشعار پڑھے جانے لگے۔ میں نے غالب کی یہ رُباعی پڑھی

گر ذوقِ سخن بدہر آئیں بودے　　دیوانِ مرا شہرت پرویں بودے
غالب اگر ایں فنِ سخن دیں بودے　　آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

سخن فہموں اور نکتہ شناسوں کا مجمع تھا۔ رباعی کی تعریف و توصیف تو خیر جو ہونا تھی ہوئی مگر ایک صاحب نے

---

[1] آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کی کتاب "تجزیۂ کلام غالب" از سید رفیع الدین بلخی پر جناب سید علی زیبا ردولوی ایم اے مرحوم (ف کیم جولائی ۱۹۶۲ء) نے ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا تھا جو العلم کے اس "غالب نمبر" میں مرحوم کی یادگار کے طور پر شامل کیا جا رہا ہے۔

فرمایا کہ غریب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو ہم لوگ بیکار بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔

اس مرحوم نے تو اسی رباعی کو ذرا گرم الفاظ میں دہرا دیا ہے۔ مجھے اس واقعہ کے بہت دنوں بعد خیال آیا کہ ڈاکٹر عبداللطیف صاحب نے بھی ممکن ہے اپنی رائے میں غالب ہی سے فیضان حاصل کیا ہو۔ آخر احتمالِ قوی اس قطعہ کی طرف ہوا جو ان کی رائے کی بنیاد بن سکتا ہے۔

اے کہ در بزمِ شہنشاہِ سخن رس گفتہ
کہ بہ پیرِ گوئی فلاں در شعر ہم سنگِ منست
راست گفتی لیک میدانی کہ نبود جائے طعن
کم تراز بانگِ دہل گر نغمۂ چنگ منست
نیست نقصاں یک دو جزو است از سواد ریختہ
کاں و ثمر برگے ز نخلستانِ فرہنگِ منست
فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ منست
فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیم خیال
مانی دارژنگم و آں نسخہ ارژنگ منست
دشمنی راہم فنی شرط است و آں دانی کہ نیست
از تو نبود نغمہ در سازے کہ در چنگ منست
در سخن چوں ہم زبان و ہم نوائے من نہ
چوں دلت را پیچ و تاب از رشکِ آہنگ منست
راست می گویم و ے از راست سر نتواں کشید
ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگِ منست

ظاہر ہے کہ یہ قطعہ اُستاد ذوقؔ کو مخاطب کرکے لکھا ہے اور ان کے طعن کا جواب طعن سے دیا ہے۔ غالبؔ نے اپنے اُردو کلام کو "ننگِ منست" کہا ہے اور ڈاکٹر عبداللطیف صاحب نے اسی "ننگ منست" کو غالبؔ کی فکر شعری کا نمائندہ بنا کر اپنی رائے ظاہر کی ہے۔

بہر حال دونوں ڈاکٹروں کی یہ متضاد تشخیص ہر شخص کو متعجب کر دیتی ہے۔ غالبؔ ملاءِ اعلیٰ کا باشندہ تھا اور نہ تحت الثریٰ کا چنانچہ ان آراء کے درمیان بہت سے ارباب فن و ادب کی رائیں ہیں جن میں سرِ فہرست مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

کا نام ہے جو کبھی فرماتے ہیں ؎

بیا دَرید گر ایں جا بود سخن دانے   غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد

کبھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ :۔

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج   میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

اور یہ بھی کہتے ہیں :۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کر ہو رشکِ فارسی   گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کر اسے سنا کہ یوں

غالب کے بعد اس فہرست میں ان صاحبان کے نام ہیں جنہوں نے غالب کی حیات میں یا ان کے بعد اُردو شعر یا اُردو زبان و ادب میں کتابیں یا رسالے لکھے ہیں ان میں شیفتہ عبد الغفور نساخ، امیر قطب الدین باطن صاحب تذکرہ گلستان بے خزاں مولوی امداد امام اثر (صاحب کاشف الحقائق) مولانا عبد الحئی (صاحب گل رعنا) محمد حسین آزاد، لالہ سری رام صفیر بلگرامی رام بابو سکسینہ شامل ہیں۔ بعد ازاں وہ حضرات ہیں جنہوں نے خاص غالب کی شخصیت اور اس کے کلام اور خطوط کے بارے میں موٹی موٹی یا چھوٹی کتابیں لکھیں اور ان کے حالاتِ زندگی لکھنے کے ساتھ ان کے پیدا کردہ ادب پر تبصرہ بھی کیا۔ ان میں بھی بڑی نام آور ہستیاں ہیں۔ مولانا حالی، ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر محمد عبد الطیف، مولانا مہر، شیخ محمد اکرام، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا عرشی۔ مرزا محمد حسن عسکری، مالک رام اور دوسرے حضرات ان کے علاوہ شارحینِ دیوان غالب ہیں۔ اتفاق دیکھئے کہ ان میں بھی سر فہرست نام اسد اللہ خاں غالب ہی کا ہے پھر حالی اور نظم طباطبائی وغیرہ وغیرہ کا نمبر آتا ہے۔ ان کے بعد غالب گویا بامِ شہرت پر پہنچنے کے لئے زینہ بن گیا لیکن اس میں شک نہیں کہ اس بہانے ادب اور شعر کے متعلق اُردو میں معلومات کے دریا بہا دیئے گئے۔

اسی ذیل میں ان لوگوں کے نام بھی شامل کئے جا سکتے ہیں جنہوں نے غالب کی صرف چند غزلوں یا محض متعدد اشعار پر تبصرہ اور ان کی شرح طویل مضامین کی شکل میں اخباروں، رسالوں یا مجموعۂ مضامین میں شائع کی یا غالب پر کوئی طویل مضمون تحریر فرمایا۔ ان حضرات میں بھی مولانا بیخود موہانی (صاحب مرآۃ تحقیق) حضرت جعفر علی خاں اثر، ڈاکٹر نذیر احمد کی ایسی ہستیاں نظر آتی ہیں۔

ذاتی شہرت کے حصول کا یہ طریقہ بہت دنوں تک رہا اور غالباً اب بھی ہے کہ غالب کا غیر مطبوعہ کلام۔ غیر مطبوعہ خطوط اور انتخاب کلام یا ان کے لطائف وغیرہ شائع کئے جائیں۔ اور کچھ نہیں تو غالب کے اشعار پر اعتراضات کی بھرمار کر کے یہی مقصد حاصل کیا جائے۔ چنانچہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس برصغیر میں جتنی کتابیں غالب کے متعلق اب تک لکھی گئی اتنی کسی دوسری ادبی، سیاسی یا مذہبی عظمت رکھنے والی ہستی کے متعلق نہیں لکھی گئیں۔

آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے تو بعض اچھے خوش گو شعراء علی الاعلان اپنے کو غالب کے نقشِ قدم پر چلنے والا

کہہ کر فخر کرتے تھے۔ خدا بخشے مرزا رسوا مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ میں نے غالب کا دیوان سامنے رکھ کے اس طرح شعر گوئی کی مشق کی ہے جیسے خطاطی کی مشق کرنے والے کسی مشہور خطاط کے لکھے ہوئے طغرہ اور قطعات کے خاکے بنا کر ان پر قلم پھیرتے اور پھر سامنے رکھ کر تختیوں پر تختیاں لکھتے ہیں۔ لکھنؤ کی "معیار" سوسائٹی کے روح ورواں جناب آبر اپنے نام کے آگے بڑے فخر کے ساتھ مقلد میر و غالب لکھا کرتے تھے چنانچہ "معیار" کے پرچہ میں جو اس سوسائٹی کا ترجمان تھا اور جس کے وہ ایڈیٹر تھے "آبر مقلد میر و غالب" لکھا جاتا تھا کچھ ان پر منحصر نہیں اس زمانے میں بلکہ اس کے بعد اور آج تک ایسے بہت سے شعراء موجود ہیں جو غالب کی روحانی شاگردی کا دم بھرتے ہیں۔ اور نہایت فخر کے ساتھ غالب سے اپنی وابستگی کا اعلان کرتے ہیں۔

کراچی میں بزم غالب قائم ہے اور اس کے صدر حضرت اسحٰق جہاں پوری واقعی غالب کے رنگ شعر کی پیروی نہایت کامیابی سے کرتے ہیں۔ تیسرا ن کو تو آپ پرانے زمانے کا کہہ لیجئے مگر اس کو کیا کیجئے گا کہ مشکل ہی سے کوئی قابل ذکر جدید ناقد ہوگا جس نے غالب پر کوئی نہ کوئی تبصرہ نہ لکھا ہو۔ انتہا یہ ہے کہ ابھی کچھ دن ہی ہوئے رسالہ "ماہ نو" میں غالب کی ایک رباعی پر بہت کچھ جرح و تعدیل شائع ہوئی تھی۔ ان تمام باتوں کو درج کرنے سے منشا یہ ہے کہ غالب ابھی تک ادبی حلقوں میں پڑھا جاتا ہے۔ اس پر گفتگو کی جاتی ہے اور اس کی تقلید کی جاتی ہے۔ یعنی غالب کو ابھی عظیم مانا جاتا ہے۔ اس کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ اور لوگ اس کے برجستہ اشعار کسی نظریہ کی دلیل شعری کے طور پر پڑھتے ہیں۔ حالانکہ وہ تمدن اور وہ تہذیب جس میں غالب پیدا ہوئے اور پروان چڑھے مدت ہوئی فنا ہو گئی۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ غالب کی شاعری کو حیات جاودانی حاصل ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ وہ ابھی تک زندہ ہے اور نہ جانے کب تک زندہ رہے۔

تجزیۂ کلام غالب اس بات کا جدید ترین ثبوت ہے۔ بلخی مرحوم صفحہ ۱۴ پر تحریر کرتے ہیں:-

> "خود معیاری چیزیں جو کسی شاعر کی عظمت یا مقبولیت کا سبب بتائی جاتی ہیں یعنی جذبات کی رفعت، خیالات کی بلندی اور عنوان نگارش کی دلپذیری سماج کی تابع ہیں۔ یہ چیزیں خود بھی حالات سے متاثر ہوتی ہیں۔ جن خیالات یا جذبات کو قدیم زمانہ میں ارفع واعلیٰ سمجھا جاتا تھا عہد وسطیٰ میں ان کی کوئی جگہ باقی نہیں رہی اور خود عہد وسطیٰ میں جو خیالات مقبول تھے۔ اب ان کی وہ حیثیت باقی نہیں رہی"

آگے چل کر مصنف علام تحریر فرماتے ہیں:-

"بالکل اسی طرح طرزِ نگارش بھی امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں انقلاب کے تھپیڑے کھاتی رہی۔ طرزِ تحریر کی دلبری بھی حالات کی بنا پر مختلف ہوتی رہی ہے۔"

اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ :-

"ایسا کوئی مصنف نہیں جو ہمیشہ یکساں مقبول رہا ہو۔ اور اسی سبب سے کوئی شاعر، ادیب یا مفکر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مقبولیت یا عظمت کا مستحق نہ رہ سکا۔"

اس نتیجہ کو پڑھ کر دل کو ٹھیس ضرور لگتی ہے اور ہم بغیر سوچے ہوئے اس کو "غلط" کہہ دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں مگر ذرا غور کے بعد اس کی صحت رفتہ رفتہ روشن ہونے لگتی ہے اور شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کے سحر نگار قلم نے "شہرتِ عام اور بقائے دوام" کا جو دربار سجایا تھا وہ اجڑا اجڑا سا نظر آنے لگتا ہے لیکن بکُلِّ قومٍ اَجَلٌ کے آگے سرخم کرنا ہی پڑتا ہے۔

مقبولیت اور عظمت کی بحث میں بھی تلخی مرحوم نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں :-

"کسی کی عظمت کا اعتراف حقیقتاً اس کی مقبولیت کا زوال ہے۔"

مگر اس حسین نظریہ کے اطلاق میں مرحوم ذرا ڈگمگا گئے ہیں۔ یہ کہنا ذرا زیادتی ہے کہ عظمت کی پہچان یہ ہے کہ مقبولیت کا چرچا کم ہو جائے ...... زیادہ لوگ اس کو نہ پڑھیں بلکہ صرف یہ خیال کریں کہ وہ کبھی مقبول تھا..... غرض یہ کہ مقدس اور متبرک ہو کر رہ جائے اور عوام میں اس کا صرف احترام ہی احترام باقی رہ جائے۔ کسی کی عظمت کا اعتراف حقیقتاً اس کی مقبولیت کا زوال ہے۔

انقلاب اور ادیب' کی بحث مصنف نے واقعی بہت صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں کی ہے۔ فرماتے ہیں :-

"لوگ جسے آخری دور سمجھتے ہیں حقیقتاً وہ ایک دوسرے دور کی ابتدا ہوتی ہے۔"

غالب کی تمام مقبولیت وعظمت کا راز اسی میں ہے کہ وہ اس دور کی سرحد پر کھڑا تھا جہاں ایک طرف جاگیردارانہ عہد مغلیہ کا آفتاب غروب ہو رہا تھا اور دوسری جانب انگریزی سامراج اور مغربی سرمایہ داری کے ابھرتے ہوئے سورج کی کرنیں اُفق پر پھیل رہی تھیں۔ غالب کا کلام صرف آخری دور کے نظام اور اس کے تمام رجحانات ہی کا آئینہ دار

نہیں بلکہ اس کش مکش کا بھی ترجمان ہے جو ایک عبوری دور میں
ہوا کرتی ہے"
اسی ذکر میں آگے چل کر لکھتے ہیں :-
"غالب پرانی روش پر بھی چلتا ہے۔ اس سے ذرا جھجکتا بھی ہے"
اسی ذیل میں تصور توحید، عبدیت، دعا طلبی، عبادت، ثواب و عذاب وغیرہ کا ذکر کر کے بلخی مرحوم نے کیا پتہ کی بات لکھی ہے :-

"پھر اس (غالب) نے جس بیباکی اور جرأت کے ساتھ گناہ کے تصور کو ملیامیٹ کرنے کی کوشش کی یا بہشت و دوزخ کے وجود سے انکار کیا یہ سب اسی الجھن کا نتیجہ ہے جو اس دور کی خصوصیت تھی"

نئے دور کی عہد آفریں ایجادات اور تمدن میں پیدا ہونے والے انقلابات کا بیان کر کے غالب کی شعری دنیا پر ان باتوں کا اثر اور پھر غالب کی شاعری کا آنے والی نسلوں پر اثر واضح کرتے ہوئے کس مزے میں لکھتے ہیں :-

"بڑے شاعروں یا ادیبوں کی مثال پہاڑ کی اس سب سے اونچی چوٹی کی سی ہوتی ہے جس پر آفتاب کی کرنیں سب سے پہلے پڑتی ہیں اور آخر تک رہتی ہیں"

غالب واقعی تاریخ کے اس موڑ پر کھڑا تھا جہاں پرانی تہذیب کا راستہ ختم ہو رہا تھا اور سامنے مختلف نئی نئی راہیں نظر آ رہی تھیں۔ مسلمانوں کی زبوں حالی کو مدت مدید گزر چکی تھی قومی عادات، خصائل انفرادی تدبر اور بصیرت یہاں تک کہ تمدن اور نجی زندگی بھی صحت مند نہیں رہی تھیں۔ اورنگزیب کے بعد سے بہادر شاہ ظفر تک جس طرح رفتہ رفتہ ایک عظیم الشان فاتح قوم کی حالت ایک پسماندہ مفتوح قوم میں تبدیل ہوئی۔ وہ داستان دردناک بھی ہے اور عبرت انگیز بھی چنانچہ ملاحظہ ہو :-

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بنغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

ان اشعار میں غالب نے قومی زبوں حالی کی ایسی جاندار تصویر کھینچی ہے کہ ہر اہلِ دل اس کو اب تک کلیجے سے لگائے ہوئے ہے لیکن اس کے باوجود اس کو قومی شاعری کا آغاز کہنا شعر دشمنی سمجھتا ہوں۔ اسی طرح غالب کے اس قطعہ کو ـــ

بسکہ فعالِ ما یرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرہ ذرہ آج — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا الخ

دلی کو گورا گردی کی شکایت کے علاوہ کچھ اور سمجھنا غالب کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اصل میں غالب ہر شاعر کی طرح انسان دوست مرنجان مرنج اور امن و عافیت پسند انسان تھے۔ ان کو انگریزوں کے قبضہ کے بعد دلی کے مسلمانوں کے قتل ہونے کا دکھ اور رنج ہوا۔ اس سے پہلے کالوں نے جن دنوں دلی پر قبضہ کر رکھا تھا اور انگریزوں کو قتل کرتے پھرتے تھے اس وقت غالب انگریزوں کے قتل پر بھی صدمے اٹھاتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"کوئی نہ سمجھے کہ اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں جو دکھ مجھکو ہے اس کا بیان تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں، انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھوں قتل ہوئے ان میں سے کوئی میرا امیدگاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد، ہندوستانیوں میں کچھ عزیز کچھ دوست کچھ شاگرد کچھ معشوق سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست

کیوں کر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ اب جو میں مروں

گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا"

عذر اور غالب کے سلسلہ میں اور زیادہ چھان بین درکار ہو تو خواجہ حسن نظامی کا "روزنامچہ غالب" اردو میں اور خود غالب کا تحریر کردہ دستنبو فارسی میں ملاحظہ فرمائیے۔ اس کے علاوہ مولانا مہر نے "غالب" میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور جو نتائج اخذ فرمائے ہیں وہ شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ قوم کا موجودہ تصور اس زمانہ میں تھا ہی نہیں۔ انفرادی تعلقات ہی سب کچھ تھے۔ تاریخ کے ابواب میں بہت سی مثالیں ایسی ملتی ہیں جن میں ہندوؤں نے اپنے مسلمان دوستوں اور حلیفوں کا ساتھ دے کر ہندوؤں کا خون بہایا اور مسلمانوں نے اپنے ہندو حلیفوں کی دوستی میں ان کے مسلمان دشمنوں پر حملہ کیا۔ یہ بات انفرادی حیثیت سے بھی اتنی درست ہے جتنی کہ اجتماعی حیثیت سے۔ مذہب اس زمانہ میں شخصی نجی اور ذاتی معاملہ تھا۔ سلطنت مغلیہ کے ابتدائی عروج یعنی اکبر کے عہد میں ہندوؤں سے جو روابط اور تعلقات قائم ہوئے تھے وہ انتہائی عروج یعنی عہد اورنگ زیب میں بھی جوں کے توں قائم رہے۔ اورنگ زیب کے بعد بھی ان میں کسی طرح کی کمی نہیں آئی۔ دونوں کے عہد میں ہندوؤں نے ہندوؤں اور مسلمانوں نے مسلمانوں سے جنگ کی ہے، مرہٹہ گردی بھی ہندو مسلمان آویزش نہیں تھی۔ سلطنتوں کی جنگ کہئے یا جنوب و شمال کی لڑائی۔ حالانکہ احمد شاہ ابدالی یہی سمجھ کے آیا تھا کہ مسلمانانِ ہند کو ہندوؤں کے پنجۂ غلامی سے آزاد کرانا ہے۔ خیر اس بحث کو طول دینا ہمارے موضوع سے باہر ہے۔

یہاں ضرورت اس بات کی ہے اور نہ ہی کہ غالب کی نجی زندگی اور عادات و خصائل پر بھی روشنی ڈالی جاتی ان کو آباؤ اجداد سے ورثہ میں جو عادات ملی تھیں انھیں لکھا جاتا اور غالب کی پرورش جس انداز و نہج سے ہوئی تھی اس کا تفصیلی ذکر کیا جاتا کیونکہ یہی سب باتیں مل کر انسان کی ذات کی تشکیل کرتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایک شاعر بھی اپنی ذات سے باہر نہیں جا سکتا۔ یہ ذکر بھی ضروری تھا کہ غالب کی شاعری پر کن کن شعراء کا اثر پڑا ہے۔ دربارِ دلی سے منسلک ہونے سے قبل ان کا رنگ کلام اور ان کے موضوعاتِ سخن کیا تھے۔ پھر متوسلین قلعۂ معلیٰ میں شامل ہونے کے بعد ان میں کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ اسی طرح جب وہ محفل بھی اجڑ گئی اور نئے حاکموں نے دلی کا راج پاٹ سنبھالا تو غالب کی شاعری پر کیا اثر مرتب ہوا۔ اس سلسلہ میں بلخی مرحوم اشارتاً لکھتے ہیں:-

"غالب کو اگر ایک طرف سماج کی طرف سے خیالات و جذبات ملے
تھے تو دوسری طرف اس نے خود اپنی کد و کاوش سے بھی خیالات
کی دولت میں افزائش کی۔ اس طور سے غالب نے ارث پر اکتفا
نہ کی بلکہ اقلیم سخن میں نئے خیالات اور جذبات پر غلبہ پایا۔ غرض

یہ ہے کہ غالب نہ موروثی ترکہ ہی کے باعث ایک دولتمند جاگیردار تھا بلکہ اس نے ذاتی فتوحات اور کسب سے خزانے کی افزائش کی۔

تاہم غالب کی مشکل پسندی اور ان کے کلام میں فارسی ترکیبوں کی کثرت کی بابت یہ کہنا کہ :-

"مسلمانوں کے سماج نے پہلی مرتبہ بہت سی نئی چیزوں کا مشاہدہ کیا جو انگریزوں کے آنے کے سبب یکایک پیدا ہو گئی تھیں۔ پھر چھاپہ خانہ کی ایجاد نے جو نئی ترقی خیالات اور علم میں پیدا کی اس کے اظہار کے لئے اُردو غزل گوئی کی زبان ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔

یا یہ کہنا کہ :-

اس کی مشکل پسندی بطور یادگار اس کے دیوان میں موجود ہے جو ہمیں یاد دلاتی ہے کہ نئے نئے خیالات کی فراوانی کو اُردو زبان کے محدود الفاظ میں قلم بند کرنا اس زمانہ میں لوگوں کے لئے کس قدر دشوار تھا۔

بہت سے لوگوں کے نزدیک حد سے تجاوز ہوگا مگر اس میں شک نہیں کہ یہ اس ذیل میں بالکل نیا نقطۂ نظر ہے اور اگر اس کو بالکلیہ صحیح نہ سمجھا جائے تو بھی قابل غور ضرور ہے۔

ویسے غالب کا قول اپنے ابتدائی کلام اُردو کے بارے میں یہ ہے کہ :-

" ابتدائے فکر سخن میں بیدل، امیر و شوکت وغیرہ کے طرز پر ریختہ کہتا تھا چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا ؎

طرز بیدل میں ریختہ کہنا اسداللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا اوراق یک قلم چاک کئے "

ایک دوسری جگہ اپنی شاعری کی بابت فرماتے ہیں :-

" میری غزل گوئی کی ابتدا تھی کہ ناسخ مرحوم کا دیوان دہلی میں پہلے پہل پہنچا۔ شیخ کی سخن سنجی کی تمام شہر میں دھوم مچ گئی۔ میں نے اور مومن نے ان کا متبع ہونا چاہا۔ ہم لوگوں نے شیخ مرحوم کے

رنگ میں مشق کلام کرنا شروع کیا مگر شیخ کا رنگ ہم لوگوں میں
نہ آیا۔ مومن مشق کے بعد ویسے ہو گئے جیسا رنگ دیکھا جاتا ہے
اور ہم میر کے رنگ میں در آئے (کاشف الحقائق صفحہ ۱۲۴)

اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ناسخ کی بلند پروازی اور مضمون آفرینی اس عہد میں بھی مانی ہوئی تھی اور آج بھی مسلم ہے۔ اس زمانہ میں تو اقطاعِ ہند میں ان کے سینکڑوں مقلد تھے۔ استاد ذوق بلکہ ان کے بھی استاد شاہ نصیر کا کلام آج بھی اس بات کی شہادت کو موجود ہے۔ اس زمانہ میں ناسخ کی مقبولیت کا اندازہ اسی سے لگائیے کہ "گلشن بیخار" میں شیفتہ جیسا سخن سنج و سخن فہم" ان کی بابت لکھتا ہے:۔

"نسیم چمن طبع نکہت ریز و شمیم گلِ فکرش دل آویز، طائر بلند پرواز
غورش جز شاخِ سدرہ آشیاں نہ سازد و مرغ تیز بال خیالش جز
ببام فلک جلوہ نپردازد، والا مایہ عالی پایہ بلند اندیشہ نازک خیال
است، در تلاش مضمون تازہ و معنی سیراب بے مثل و مثال..."

اس کے بعد ساڑھے چار صفحات کا انتخاب اشعار ہے جو صرف دیوان اول سے منتخب کئے گئے ہیں۔ ان کے سوا "ایک دو سہ شعر از غزلہائے جدید ہمکو بعض احباب از لکھنؤ ارمغاں کردہ بودند نگارش یافتہ"

غور سے دیکھئے تو غالب کے متذکرۂ بالا دونوں قولوں میں کوئی تضاد نہیں یعنی بیدل، اسیر، و شوکت ہوں، یا شیخ ناسخ یا صائب و ظہوری سب کے سب خیال آفریں شعراء تھے اور غالب کی طبیعت اس زمانہ میں اسی جانب مائل تھی۔ اس کے بعد جب سمجھ آئی تو غالب، غالب ہوئے مگر ناسمجھی سے سمجھ آنے تک کا زمانہ دو چار دن یا دو ایک برس کا نہیں ہے۔ یہ تبدیلی بتدریج ہوتی رہی اور آخر ایک زمانہ ایسا آیا جب غالب نے نہ صرف یہ کہ اپنے لئے ایک میزان شعر مقرر کر لی بلکہ اپنے احباب اور شاگردوں کو بھی اس سے آگاہی بخشی، چنانچہ ایک خط میں فرماتے ہیں:۔

"اس رقعہ میں ایک میزان عرض کرتا ہوں۔ حضرت صاحب ان صاحبوں
کے کلام کو یعنی، ہندیوں کے اشعار کو قتیل اور واقف سے بیدل اور
ناصر علی تک اس میزان میں تولیں۔"

رودکی و فردوسی سے لیکر خاقانی و سنائی و انوری وغیرہم تک ایک گروہ۔ ان حضرات کا کلام تھوڑے سے تفاوت سے ایک وضع پر ہے۔

پھر حضرت سعدی طرزِ خاص کے موجد ہوئے۔ سعدی و جامی و ہلالی یہ اشخاص متعدد نہیں۔
فغانی ایک اور شیوۂ خاص کا مبدع ہوا۔ خیالہائے نازک و معانی بلند لایا۔ اس شیوے کی تکمیل کی۔ ظہوری و

نظیری و عرفی و نوعی نے سبحان اللہ! قالب سخن میں جان پڑ گئی۔ اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے مفاہمت کا چھپر بہ دیا۔

صائب و کلیم و سلیم و قدسی و حکیم شفائی اس زمرے میں ہیں۔

رودکی و اسدی و فردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا۔ اور سعدی کی طرز نے بسبب سہل ممتنع ہونے کے رواج پایا۔ فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے۔

تو اب طرزیں تین ٹھہریں!

(۱) خاقانی۔ اس کے اقران (۲) ظہوری اس کے امثال (۳) صائب اس کے نظائر خالصاً للّٰہ! ممتاز و اختر وغیرہم کا کلام۔ ان تین طرزوں میں سے کس طرز پر ہے؟ بے شبہ فرماؤ گے کہ یہ طرز اور ہی ہے۔ بس تو ہم نے جانا یہ طرز چوتھی ہے۔ کیا کہنا ہے! خوب طرز ہے، مگر فارسی نہیں ہے۔ ہندی ہے۔ دارالضرب شاہی کا سکہ نہیں ہے۔ ٹکسال باہر ہے۔ داد، داد! انصاف! انصاف!

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار ‌ ‌ ‌ زیک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں ‌ ‌ ‌ خمارِ چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعارِ ایں قوم ‌ ‌ ‌ ورائے شاعری "چیزے دگر" است

وہ "چیزِ دگر" حصے میں پارسیوں کے آئی ہے، ہاں! اردو زبان میں اہلِ ہند نے وہ چیز پائی ہے:-

میر تقی میر:- بدنام ہو گئے، جانے بھی دو امتحاں کو ‌ ‌ ‌ رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو
سودا:- دکھلائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار ‌ ‌ ‌ خواہاں نہیں، لیکن کوئی واں جنسِ گراں کا
قائم:- قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی، کیونکر مانوں ‌ ‌ ‌ ہے تو نادان، مگر اتنا بھی بد آموز نہیں
مومن خاں:- تم میرے پاس ہوتے ہو، گویا ‌ ‌ ‌ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا!

"ناسخ کے ہاں کمتر اور آتش کے ہاں بیشتر یہ تیر و نشتر ہیں۔ مگر مجھے ان کا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں آتا۔" (عود ہندی صفحہ ۴۵، ۴۶)

خلاصہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کے نزدیک اچھے شعروں میں "لفظاً" سلاست و متانتِ الفاظ، پاکیزگی و صفائی، روزمرہ، ندرت و دل پسندی و بندش، اور حسنِ بیان اور "معنیً" بلندیٔ خیال، نزاکتِ معنی، عمدگیٔ مضمون اور سلاست و تازگیٔ فکر ہونا چاہیئے۔ اس کا نام شیوا بیانی ہے اور یہی خوبیاں کلام کو "سہل ممتنع" بناتی ہیں۔

(انتخابِ غالب۔ نسخۂ رامپور۔ دیباچہ)

"خود ستائی ہوتی ہے۔ سخن فہم اگر غور کرے گا، تو فقیر کی نظم میں سہل ممتنع اکثر پائے گا۔"
(عود ہندی ص ۱۴۰)

پروفیسر طاہر حسین نقوی

شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار

مرزا غالب کے ایک کامل فنکار ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ انھوں نے لیلائے سخن کے طرۂ طرار کو دلکش اور دلربا مرغولوں سے آراستہ کیا۔ اس کام میں انہیں اس درجہ انہماک رہا کہ گیارہ برس کے سن سے مرتے دم تک کم و بیش ساٹھ باسٹھ سال تک وہ اسی میں مستغرق رہے۔ زندگی کے سفینہ کو طوفان حوادث کی امواج مسلسل نے شکستہ کر دیا لیکن ہر حال میں وہ فن کی تہذیب میں مصروف رہے۔ جوئے خوں سر سے گذر گئی لیکن وہ آستانِ شعر و سخن سے نہ سرکے ان کے سر پہ بار بار قیامت آئی لیکن وہ اس در سے نہ اٹھے ستم ہائے روزگار کے رہین رہنے کے باوجود وہ پرورش فن کے خیال سے غافل نہ رہے۔ انہیں شعر سے عشق تھا اور شعر کو ان سے فطری وابستگی تھی۔ وہ ایک خط میں رقمطراز ہیں۔

"شعر و سخن را بانہاد کمترین پیوند روحانی است"

اور اسی کو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں اپنی انا کو قائم رکھتے ہوئے یوں فرمایا ہے ؎

"ما نبودیم بدین مرتبہ راضی غالب شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما"

اس شعر کے پہلے مصرع سے اتفاق کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ دوسرے مصرع کی صداقت مسلم ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ فنِ شعر جس پر غالب شیدا تھے یا جو خود غالب پر فریفتہ تھا۔ کیا وہ صرف کلام موزوں تھا۔ اگر موزونی ہی کا نام شاعری ہے تو بقول کسے ؏

بس جہاں شاعر بود چوں دیگراں

غالب کے خیال میں شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

؏ غالب بنود شیوۂ من قافیہ بندی

اور اس اجمال کی تفصیل تفتہ کے نام ایک مکتوب میں ملتی ہے ۔

"کیا ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھتے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا۔ یا اس کے قوافی ۔ اور اُن قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے ۔ لاحول ولا قوۃ"

یہ معنی آفرینی ہی شاعروں کی جان ہے ۔ اور ان کی مخصوص ادا ۔ انھوں نے فن کی تکمیل میں جو محنت کی اس کی بنیاد کچھ اصولوں پر تھی جو اُن کا مطمح نظر بنے رہے ۔

اپنے اردو دیوان کے دیباچہ میں جو غالب نے ۱۸۳۳ء میں لکھا گیا (جبکہ ان کی عمر پینتیس، چھتیس ۳۶ سال تھی اور ان کی شاعری کی عمر کم و بیش ۲۵ سال ہو چکی تھی۔ اور فارسی و اردو دونوں زبانوں میں وہ ہندوستان بھر میں مسلم الثبوت استاد مان لئے گئے تھے)۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جس طرح حسن صنم کیلئے اٹھارہ خوبیاں ضروری ہیں اسی طرح حسن فن کیلئے بیس خوبیاں شاعر کے کلام میں پائی جانی چاہئیں۔ جہاں انہوں نے حسن صورت کیلئے ان خوبیوں کا بیان انتہائی دلنشیں انداز میں کیا ہے ۔ وہاں حسن سخن کے لئے لوازم کا بیان بھی کچھ دلچسپ نہیں ہے۔ ان لوازم کی تفصیل یہ ہے ۔

۱۔ دوشیزگی نہاد ۲۔ پاکیزگی گوہر ۳۔ برشتگی مضمون ۴۔ گداختگی نفس ۵۔ چاشنی سپاس ۶۔ نمک شکوہ ۷۔ نشاط نغز ۸۔ اندوہ شیون ۹۔ روائی کار ۱۰۔ رسائی بار ۱۱۔ ہر دو کشائی راز ۱۲۔ جلوہ فروشی نوید ۱۳۔ سازگاری آفرین ۱۴۔ دلخراشی نکوہش ۱۵۔ ہمواری صلا ۱۶۔ ۱۷۔ گذارش وعدہ ۱۸۔ سپاس پیام ۱۹۔ بارنامہ بزم ۲۰۔ ہنگامہ رزم

شاید ان کی مراد یہ تھی کہ اگر تمام ارکان نہیں تو کم از کم شاعر اپنے کلام میں جس قدر زیادہ ان اوصاف کو پیدا کرتا ہے تب کہیں وہ نغز گوئی کی منزل پر پہنچتا ہے ۔ اور ہر شاعر نغز گو نہیں کہلایا جا سکتا بلکہ نغز گو شعراء میں بھی بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے وہ فرماتے ہیں ؎

اگرچہ شاعران نغز گفتار — ز یک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادہ بعضے حریفاں — خمار چشم ساقی نیز پیوست

لیکن چونکہ خمار چشم ساقی جن کے بادہ میں شامل ہے وہ بھی کبھی کبھی معیار سے گر جاتے ہیں اس لئے انھوں نے عرفی شیرازی کے اس قول کو اپنا رہنما بنایا کہ ؎

شائستہ بدست آر کہ بینند درین شہر — شائستگی جنس چہ بسیار وچہ کم را

اور اس پر عمل کر کے دکھایا جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؎

نگویم تا نہ باشد نغز غالب — چہ غم گر ہست اشعارم اندک

ان کے اس بیان کی تصدیق واقعات سے بھی ہوتی ہے ۔ کیونکہ ان کے شعر کہنے کی رفتار بہت سست تھی وہ اشعار کے سنوارنے اور بنانے میں پوری قوتیں صرف کرتے تھے ۔ اور اگرچہ زمانہ نوجوانی میں دس سال کی مدت میں اچھا خاصہ دیوان جمع کر لیا تھا لیکن ان اشعار کو بھی بڑی محنت اور کاوش سے سرانجام دیتے تھے بعد میں تو ان کی رفتار اور بھی سست ہو گئی تھی ۔

فارسی میں بھی البتہ ان کی شعرگوئی کی رفتار نسبتاً تیز تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ دماغی جمناسٹک کے وہ کرتب جو انھوں نے اپنی دشوار پسند طبیعت کی تسکین کے لئے اردو میں دکھائے وہ تقلید بیدل و اسیر و جلال و شوکت کا نتیجہ تھا۔ انکی طبع دشوار پسند انہیں یہ کہنے پر مجبور کر دیتی تھی کہ ؎

سخنِ سادہ دلم را نفریبد غالب نکتۂ چند ز پیچیدہ معانی بہ من آر

اور اسی پیچیدہ معانی کے نکات پیدا کرنے کی سعی میں ان کے کلام میں اغلاق پیدا ہو گیا جس کے لئے وہ فرماتے ہیں ؎

مرنج از من اگر بنو دکلامم با صفا غالب خمستان غبارم سر لبریز دردلیست ہر خوشم

طرز بیدل میں شعر کہہ کر انہیں اردو میں تو قیامت کا سامنا کرنا ہی پڑتا۔ لیکن فارسی میں جن شعرائے گرامی کا تتبع اُن سے عمل میں آیا اس کا نتیجہ تھا کہ ان کا کلام زیادہ صاف اور جاندار ہو گیا۔ لیکن طبع مشکل پسند انہیں وہاں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی اور فارسی قصیدوں پر وہ اتنی ہی محنت کرتے تھے جتنی ریختہ کی غزلوں پر اور اپنی بلندیٔ فکر، پرواز تخیل، ابروانِ معانی اور ندرتِ اسلوب کے جوہر دکھانے کا زیادہ خیال رہتا تھا اس کے ثبوت میں یوسف مرزا کے نام ایک مکتوب کی عبارت پیش کی جاتی ہے۔

"دو مہینہ دن رات خونِ جگر کھایا۔ اور ایک قصیدہ چونسٹھ بیت کا لکھا"[1]

الغرض انکی نغز گوئی کی ایک اہم وجہ انکی کم گوئی بھی ہے اور یہ کم گوئی اختیاری ہے ورنہ وہ فی البدیہہ بھی کہہ سکتے تھے جس کی مثالیں ان کے اردو اور فارسی کلام میں ملتی ہیں۔ حقیقتاً یہ ورزشِ فن کا خیال انہیں پُرگوئی سے باز رکھتا رہا۔

غالب نے جو بیس لوازم نغز گوئی اپنے دیباچہ میں تحریر کئے ہیں۔ اُن پر تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت ہے اور انکے کلام سے ان لوازم کے ملحوظ رکھنے کی مثالیں بآسانی دستیاب ہو جاتی ہیں لیکن بخوفِ طوالت یہاں صرف چند لوازم کا بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

پاکیزگیٔ گوہر اور روشن گیٔ نہاد کو کمالِ فن میں کچھ دخل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یہ ایک معرکتہ الآرا مسئلہ ہے ماہر نفسیات اور ماہرین علم الحیات میں سے اکثر کی رائے غالب کے خیال کی تائید کرتی ہے۔ اسلاف کے محاسن و معائب اخلاف میں منتقل ہوتے ہیں۔ آج یہ ایک سائنسی صداقت بن گئی ہے اور فن کی تکمیل میں قلب انسان سے اٹھی ہوتی امواج اپنی کارفرمائی کے جلوے دکھاتی ہیں اسکو اقبال نے یوں بیان کیا ہے ؎

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرورِ مے اصل اسکی نے نواز کا دل ہے نہ چوبِ نے

---

[1] اس قصیدے کا مطلع ہے ؎

زسال نو دگر آبے بروئے کار آمد ہزار وحشت صد دشت در شمار آمد

غالب نے جو اپنے خاندان کی عظمت کے گیت گائے ہیں ان کی تہ میں بھی یہی عقیدہ کارفرما نظر آتا ہے وہ فرماتے ہیں۔

ناطقہ آن لیلیٔ شیریں ادا　　سوئے من از بہر گرایہ ہمی
ناز سخن بر گہرِ من رواست　　بر سخنم ناز نہ شاید ہمی

ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جب تک شاعر طبعاً شریف نہ ہوگا۔ پاکیزہ خیالات اس کی کارگاہ فکر میں نہیں ڈھل سکتے جس کو وہ حسن لفظ و معنی سے تعبیر کر کے فرماتے ہیں ۔

حسنِ لفظ و معنیم غالب گواہ ناطق است　　بر عیارِ کامل نفسِ من و آبائے من

شرافت نسبی تو انسان کی خواہش نصیبی ہے لیکن شرافت نفس کچھ تو توریث سے ملتی ہے اور کچھ اس کے کسب کے لئے جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ نفس کو درد و غم کی بھٹی میں ڈالا جائے جس سے دل کو گداختگی حاصل ہو۔ کبھی کبھی تو یہ عمل اضطراراً عمل میں آتا ہے اس صورت میں درد و غم سے فرار کی کوشش کا امکان بھی ہے۔ لیکن اگر یہ عمل اختیاری ہے تو سبحان اللہ۔ ایسی صورت میں درد و غم سے فرار کی تو اس سے والہانہ عشق ہوگا۔ اور اس طرح نیش نوش کی طرح خوشگوار ہوگا اور خلش درد لذت افزا ہو گی۔ عذاب ناز خود یار بیکر خوشگوار ہو جائیگا۔ دم شمشیر سے مرنا پسند نہ آئیگا کیونکہ اس طرح حسرت لذت دیدار باقی رہ جائے گی۔ اس منزل پر پہنچ جانا کمال ایذا طلبی ہے اور جب تک کہ درد و غم سے لذت حاصل نہ ہو گی گداختگیٔ دل کا افادہ معلوم۔

ان کے کلام میں گداختگیٔ دل کے مضامین میں جگہ جگہ بکھرے نظر آتے ہیں اور وہ خود فرماتے ہیں ۔

بینیم از گداز دل در جگر آتشے چو سیل　　غالب اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من بری

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ۔

نازم آن دل را کہ چون اجزائے شمع از تاب خویش　　سوز در در ریزد بر دنش کامی اہتزاز سلجودہ است
این کہ افشارند و کم گیرند مشمع بینش نیست　　آن کہ خود خون گرد و در ریزد گدازے بودہ است

۔ رہی ان کی شاعری کی غرض و غایت تھی جیسا کہ وہ فرماتے ہیں ۔

زجام سخن گوئی غالب بہ تو گوییم　　خون جگر است از رگ گفتار کشیدن

اگر خداوند عالم یہ گداختگی دل کی فطرت میں خود ودلیعت فرمادے تو کیا کہنا ورنہ اس کے پیدا کرنے میں بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ جو یا داخلی ہونگے یا خارجی۔ داخلی تو انسان کی خود پیدا کردہ ہیں لیکن خارجی عوامل جن کو ماحول کہا جاتا ہے۔ انسان کی گداختگی دل میں بہت زیادہ کارفرما ہوتے ہیں ۔

غالب کو لڑکپن سے جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ان کی تفصیل اجمالاً یہ ہے ۔

یتیم ہوئے ، شفیق چچا کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ دولت بری صحبت میں گنوائی۔ کم عمری ہی میں دام تاہل میں پھنس

گئے۔ شریکِ حیات سے روحانی مماثلت نہ تھی۔ جوانی میں دکھ اٹھائے۔ پنشن کے مقدمہ میں سرگرداں رہے۔ اور انجام کار ناکامی ہوئی۔ قید ہونے کی ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ عارف کا صدمہ اٹھایا۔ اُن کے بچوں کے پالنے میں معاشی دشواریاں پیش آئیں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے دل و دماغ کی چولیں ہلا دیں، دوستوں کی اموات، اُن سے دوری کا غم، آمدنی کی راہیں مسدود تھیں۔ مستزاد آخر عمر میں دس گیارہ برس کا طویل سلسلہ علالت۔ ذہنی سکون ایک خواب تھا جو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ ایسے ماحول میں گداز دل کے سارے اسباب مہیا تھے۔

آخر وہ رگ گفتار سے خونِ جگر کے کشید کرنے میں کامیاب ہوئے اور ایک دن وہ بھی آیا جبکہ وہ اس مقام پر پہنچے کہ فرماتے ہیں۔

دیدۂ خونبار کھا دت سے مگر آج ندیم   دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

اس ہجوم مصائب سے گداختگی دل کے پیدا کئے مضامین ان کے کلام میں بڑی کثرت سے نظر آتے ہیں۔ مثلاً انکی یہ غزل۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں   وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے   ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا   شورِ سودائے خط و خال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا   دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں   میں کہاں اور یہ وبال کہاں

یا

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں   روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

یا

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں   میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں
ہوں دردمند جبر ہو یا اختیار ہو   گہہ نالۂ کشیدہ گہ اشکِ چکیدہ ہوں
جاں لب پہ آئی تب بھی نہ شیریں ہوا دہن   از بسکہ تلخیٔ غم ہجراں چشیدہ ہوں
جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت   میں یوسفِ بقیمتِ اول خریدہ ہوں
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ   ہوں میں کلامِ نغز مگر ناشنیدہ ہوں

یہ ان کا اپنا مرثیہ ہے جو زندگی بھر طوفان حوادث کے تھپیڑے کھانے کے بعد شعر کے پیکر میں ڈھل گیا۔ اور یہ اُن کی شرافت نفس تھی کہ پھر بھی وہ اس ستم وجود کو گوارا کرتے رہے ؂

وضعِ نیرنگیٔ آفاق نے مارا ہم کو   ہو گئے سب ستم و جور گوارا ہم کو

اس نیرنگیٔ آفاق کا بیان بڑے دلکش پیرایہ میں کیا جاتا ہے ؎

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی — مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اس حسنِ ادا اور شگفتگیٔ بیان کی تہ میں جو چیخیں اور کراہیں چھپی ہوئی ہیں وہ اہلِ دل کو صاف محسوس ہوتی ہیں۔

مالک رام۔ ایم اے

غالب اور رقیب

غالب نے جہاں دوسری متعدد باتوں میں شاہراہِ عام پر چلنے سے اجتناب کیا، وہاں رقیب سے متعلق بھی اس کا رویہ بہت احتیاط اور رکھ رکھاؤ کا ہے۔ اس کے پورے اردو دیوان میں رقیب کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جو اس کے خود اپنے یا کسی اور خوددار آدمی کے مرتبہ سے فروتر ہو۔ یا جسے سنکر کسی شخص کی شرم سے آنکھیں جھک جائیں۔

عام طور پر جب شعرا رقیب کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے سامنے دو باتیں ہوتی ہیں۔ یا تو اس میں شکایت کا پہلو ہوتا ہے کہ معشوق نے اپنی دنیا کا حال بیان کرکے اس کے دل میں رحم اور انصاف کے جذبات پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے کہ تم میری قدر نہیں کرتے، حالانکہ تمہارا جاں نثار ہوں اور میرے مقابلے میں رقیب کو ترجیح دیتے ہو جو بوالہوس اور ہرجائی ہے یا پھر اس میں واسوخت کا رنگ ہوتا ہے کہ معشوق کو ظلم و ستم جور و جفا کے طعنے دیکر اپنی بغاوت کا اعلان کیا جاتا ہے۔

غالب نے ان دونوں سے الگ روش اختیار کی۔ اس نے جہاں بھی رقیب کا ذکر کیا ہے وہ گویا ضمناً آگیا ہے ہر جگہ مقصود معشوق کی کسی خوبی کا بیان ہے اور برسبیلِ تذکرہ اس میں رقیب کا نام ہے۔

شمار الحق ایم اے

کلامِ غالب میں تصوف کا عنصر

مرزا غالب نہ ولی تھے نہ صوفی شاعر۔ وہ ایک رند مشرب بلکہ اپنے اس قول کے مطابق رندِ شاہد باز تھے

اسد اللہ خان تمام ہوا　　اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

لیکن انھوں نے مسائلِ تصوف کو اپنی شاعری میں جس خوبی اور بے تکلفی سے بیان کیا ہے، اس کو دیکھ کر کسی کے لئے دھوکا کھا جانا اور ان کو صوفی شاعر اور ولی اللہ سمجھ لینا کچھ عجیب نہ ہوگا۔ مرزا کو اپنی کمزوریاں معلوم تھیں اس لئے وہ خود تو اس دھوکے میں مبتلا نہیں ہوئے کہ اپنے آپ کو ولی اللہ سمجھ بیٹھیں البتہ اپنے اس کلام کو دیکھ کر جس میں تصوف کے مسائل بیان ہوئے ہیں وہ بھی یہ ضرور کہہ گئے ہیں کہ

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ　　تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

گویا یہ احساس انھیں بھی ہے کہ تصوف کے مسائل کو اتنی بے تکلفی اور کثرت کے ساتھ کوئی ولی یا اہلِ دل ہی بیان کر سکتا ہے۔ حقیقتاً مسائلِ تصوف میں جو نزاکت ہے، اور اُن سے لذت یاب ہونے کیلئے جس احساس و وجدان کی ضرورت ہے وہ ہر شخص کو ارزانی نہیں ہوتا۔ اس لئے مرزا کا یہ کہنا غلط نہیں کہ تجھے قدرت نے وجدان و صلاحیت تو وہ عطا کی ہے جو ان باریکیوں کو سمجھ سکتی اور ان نزاکتوں کا ادراک کر سکتی ہے مگر رندی اور بادہ خواری نے تیری اس صلاحیت کو دبا رکھا ہے۔

غیر صوفی ہونے کے باوجود غالب کا مسائلِ تصوف کو اس طرح بیان کر دینا عجیب سی بات ہے یہ ایسا ہی ہے جیسا ریاض خیرآبادی کا لذتِ مے سے ناآشنائے محض ہونے کے باوجود خمریات کا ایک دفترِ بے پایاں اردو شاعری کو دے جانا۔ لیکن ریاض کے مسئلہ کو حل کرنا خواہ ممکن ہو یا نہ ہو غالب کے معاملہ کے لئے کچھ توجیہات بآسانی فراہم کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ غالب کا دور وہ تھا جب دہلی اور اس کے آس پاس پیری　مریدی اور تصوف کا کافی چرچا تھا۔ غالب کے شناساؤں میں کئی حضرات ایسے تھے جو عملاً نہیں تو نظری طور پر بادۂ تصوف سے سرشار تھے۔ ان میں مولانا فضلِ حق خیرآبادی جن سے غالب

کے تعلقات نہایت گہرے تھے اور جن کا غالب پر خاصا اثر تھا۔ توحید وجودی کے نظریہ کے بڑے علمبردار تھے۔ اور اس نظریہ کی تائید میں بڑے فلسفیانہ دلائل رکھتے تھے۔ ان کے اثر سے غالب کا تصوّف کے کوچہ میں قدم رکھنا ایک قدرتی بات تھی چنانچہ اُن کا رجحان کلیتاً ہمہ اوست اور توحید وجودی کی جانب ہوگیا۔

۲۔ خود غالب کو بھی مسائلِ تصوّف سے فطری حد تک بڑا لگاؤ تھا۔ چنانچہ بقول خواجہ الطاف حسین حالی انھوں نے تصوّف کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور اکثر اس موضوع سے متعلق کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ یہ مطالعہ اور لگاؤ جو ان کے دل و دماغ کو اس حد تک متاثر کر چکا تھا ان کے کلام کے آئینہ میں کیسے منعکس نہ ہوتا۔ چنانچہ اس کا پورا اور گہرا عکس ہمیں غالب کے متعدد اشعار میں دکھائی دیتا ہے۔

۳ غالب ایک ہمہ گیر طبیعت لے کر پیدا ہوئے تھے وہ زندگی کے جملہ مسائل کو اپنے کلام میں بیان کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ اردو کے وہ واحد شاعر ہیں جن کے یہاں اختصار کے باوجود ہمیں زندگی کے جملہ مسائل نظر آتے ہیں۔ وہ عشق و محبت، رنج و الم، کیف و مستی بے خودی و ہشیاری، رندی و بادہ خواری، زندگی کی بے ثباتی، حیات کی رنگینی و رعنائی، فلسفہ حیات و ممات وغیرہ سب ہی کچھ بیان کرتے ہیں، ایسی صورت میں وہ تصوّف جیسے اہم موضوع کو کس طرح نظر انداز کر سکتے تھے جو ایک طرف تو اس وقت کی عام دلچسپی کا ایک مسئلہ تھا دوسری جانب کلام میں جاذبیت اور حلاوت پیدا کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہو سکتا تھا جس میں قلبی کیفیات اور حریم ناز کے لطیف مسائل و معاملات کا ذکر ہوتا ہے۔ جو ایک ذات بے ہمتا و بے نیاز کی معرفت کی راہ دکھاتا ہے اور جس سے اس راہ کی خواہش اور کاہشیں اور لذت و الم کی کیفیتیں دل میں پیدا ہوتی ہیں۔ ایسی رنگین و دلکش داستان شاعری میں کتنے حسین و لطیف مرقعے تیار کر سکتی ہے اس کا اندازہ کچھ اہل دل ہی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ غالب جیسا ذکی الحس و لطیف طبع انسان ایسا مواد نظر میں ہونے کے باوجود اسکو کلام میں نہ لاتا یہ ایک انہونی بات تھی۔ اس نے ان مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اپنے کلام کے گلزار بے خزاں کو ان سدا بہار پھولوں سے زینت دی۔

تصوّف کا مادہ صفہ، صوف، صفا اور سوفس (یونانی میں مرد دانا کہتے ہیں) کچھ بھی ہو یہ ضرور ہے کہ اس کوچہ میں داخل ہونے کے بعد ایک سالک کو ان تمام چیزوں ہی سے واسطہ پڑتا ہے، اُسے اصحاب صفہ کی طرح ترک علائق کرنا دین اور رضائے حق کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دینا اور دوسروں کی اصلاح حال و اعمال میں مصروف رہنا پڑتا ہے، موٹا جھوٹا لباس اس کے بدن کی زینت ہوتا ہے، تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب اس کا منتہا ہوتا ہے۔ اور ان سب باتوں پر عمل پیرا ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بحر حکمت کا غوّاص بنکر اس کی گہرائیوں سے دُر بے بہا رچنتا اور اپنے دامنِ شوق و طلب کو اُن سے پُر کرتا ہے۔

تصوّف اکثر قدیم و جدید قوموں میں مقبول رہا اور ہر قوم بقدر لب و دنداں اِس مائدہ حقیقت سے لذت یاب ہوئی۔ مسلمان بھی جن کا مرکز توجہ ہی وہ ذات بے چون و بے چگون تھی جو اِس کارخانہ عالم کے وجود کا سبب بنی اور جو اِس

پردۂ زنگاری میں نگاہوں سے اوجھل رہ کر آج بھی اسکے آرائش گیسو کا اہتمام کر رہی ہے۔ تصوف اسی ذاتِ بے مثل و بے ہمتا کے کنہ و حقیقت تک پہنچانے کا دعویٰ لیکر ان کے سامنے آیا تھا لہٰذا انہوں نے اُسے فوراً سینہ سے لگایا اور آیاتِ قرآنی کے ملبوسات سے اس کو سجا کر ایک ایسا حسین پیکر بنا دیا کہ پھر اہل دل کی نگاہیں اس کی طرف اٹھنے لگیں۔ شریعت کا دم بھرنے والے بھی ظاہر کی اصلاح کے ساتھ باطن کی صفائی کیلئے اس سے تعلق پیدا کرنا ضروری سمجھنے لگے۔ چنانچہ دنیائے اسلام میں تصوف کا مذاق عام ہو گیا۔ جو اہل دل تھے انھوں نے اس کے سہارے اعلیٰ مدارج طے کئے اور ان کے اثر سے عوام بھی اس کی لذتوں کا اعتراف کرنے لگے اور اس کی بعض اصطلاحوں کو بے تکلف کام میں لانے لگے۔

اس کو بھی حسن اتفاق سمجھئے کہ جو لوگ بادۂ تصوف سے سرشار تھے وہ عموماً دنیائے شاعری کے بھی رہ نورد تھے چنانچہ انھوں نے اپنے قلب کی مختلف کیفیات کو اشعار کے رنگین پردے میں بیان کر دیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں فارسی شاعری خصوصیت سے مسائلِ تصوف سے بھر گئی۔ اور ان مسائل نے اس شاعری کو وہ رنگ و آہنگ دیا کہ جو غیر صوفی شاعر تھے وہ بھی "بے تصوف برائے شعر گفتن خوب است" کا نعرہ لگا کر اس میدان میں اتر آئے اور انھوں نے بھی اسی کی مصطلحات سے اپنی شاعری کے گلزاروں کو سجانا شروع کر دیا۔ اردو شاعری کا آغاز ہوا تو فارسی شاعری کی دیگر روایات کے ساتھ تصوف کے مسائل بھی اس میں داخل ہو گئے۔ شعرائے اردو نے خواہ وہ تصوف کے کوچے سے آشنا تھے یا نہیں تھے تھوڑا بہت ان مسائل کو اپنے کلام میں جگہ دی۔ خواجہ میر درد تو خود بادۂ تصوف کے متوالے تھے اس لئے انھوں نے واقف راز ہو کر حریم راز کا پردہ اٹھایا۔ تصوف کو اردو شاعری میں داخل کیا اور اس کے مسائل کو نہایت خوبی سے بیان کیا۔ لیکن ان کے ہمعصر دیگر شعرا، سودا، میر اور قائم کا کلام بھی اس لذت سے خالی نہیں رہا۔ بعد کے شعرا نے بھی اس سلسلہ میں تھوڑی بہت نغمہ سنجی کی۔ غالب چونکہ نظری طور پر ان مسائل سے دلچسپی رکھتے تھے لہٰذا انھوں نے بھی اپنے گلزار شاعری کو ان گل بوٹوں سے زینت دی۔

تصوف اگرچہ نام ہے اخلاص فی العبادت کا۔ اور حضرت مجدد الف ثانی کے ارشاد کے بموجب اس کا مقصد تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب ہے اور ابتداءً اس کی غرض و غایت یہی سمجھی جاتی تھی لیکن رفتہ رفتہ اس میں اضافے ہوتے چلے گئے اور اس کا ایک پورا فلسفہ بن گیا معرفت کو اس کا مقصد قرار دیا گیا۔ اور حقیقت الحقائق اور کنہ ذات و صفات کی معرفت سے متعلق ایک دفتر بے پایاں جمع ہو گیا۔ اس وسیع فلسفہ کے اجزائے ترکیبی کس کس وقت میں اور کہاں کہاں سے فراہم ہوتے اس کی تحقیق کی نہ ضرورت ہے نہ اس کا موقعہ، تاہم چونکہ اس کی مختلف کڑیوں کو ملانے کے لئے بے شمار اصطلاحیں وضع ہو گئی ہیں مثلاً وجود، شہود، مشاہدہ شاہد، مشہود، تعینات، اعیان ثابتہ، تجلیات، ممکنات، فنا، بقا وغیرہ اور ان ہی سے فارسی اور اردو شاعری نے ایک گونہ لذت و چاشنی حاصل کی ہے اس لئے ضروری ہے کہ ابتداءً تصوف کا فلسفہ مختصر الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔

تصوف کا مرکزی نقطہ وحدت الوجود ہے، اسی کو فلسفۂ تصوف کا نقطۂ آغاز سمجھنا چاہئے۔ اس کی توضیح و تشریح مختلف طریقوں پر کی گئی ہے لیکن چونکہ یہ مسئلہ نہایت نازک ہے اس لئے تشریح و تاویل میں ذرا سی بھی لغزش گمراہی کا موجب ہوتی ہے۔

بعض حضرات نے احتیاط کو کام میں لاکر اس کی صراحت اس طرح کی ہے ۔

"وجود" ایک ہے۔ ابتداءً وہ بسیط اور غیر معیّن تھا۔ مقام وجہت سے ماوراء یہ وجود ہی ذات خداوندی تھا جو لاتعیّن ہونے کی وجہ سے پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ دوسری الفاظ میں وہ ایک چھپا ہوا خزانہ تھا جس کا اظہار ضروری ہوا۔ چنانچہ اس وجود نے چاہا کہ اپنے آپ کو خلوت سے جلوت میں لائے اور اجمال کو تفصیل میں ظاہر کرے۔ لہذا اس نے تعینات اور تنزلات کے ذریعہ کائنات کو اس طرح پیدا کیا کہ وہ اس کی ذات و صفات پر دلالت ہو۔ حدیث قدسی "کُنتُ کنزاً مخفیاً فاحببتُ ان اُعرفَ فخلقتُ الخلق" (میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں، پس میں نے خلقت کو پیدا کیا) کے ذریعہ اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے۔

بہر حال اُس ذات لاتعیّن نے اپنے اسماء و صفات کو تنزلات کے چھ مراتب سے گذار کر انسان کو صورت پذیر کیا ہے۔ ان چھ مراتب کو تنزلات ستّہ کا نام دیا جاتا ہے۔

مرتبہ اولیٰ میں وہ ذات مجرد اور مطلق ہے۔ اسی کو مرتبہ احدیت کہتے ہیں اس کا مقام ھوٗ اور عالم ھاھوت ہے

مرتبہ ثانیہ جس کو تنزّل اول یا تعیّن اول کے نام سے موسوم کرتے ہیں مرتبہ وحدت ہے یہ تعیّن حق سبحانہٗ تعالیٰ کا علم اپنی ذات و صفات اور تمام موجودات کے لئے اجمال کے طور پر ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں اسکو حقیقت محمدیہ کہا جاتا ہے اور عالم لاہوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مرتبہ ثالثہ جس کو تنزل دوم یا تعیّن دوم کہا جاتا ہے حق سبحانہٗ تعالیٰ کا اپنی ذات و صفات اور تمام موجودات کیلئے تفصیل کے طور پر علم ہے، یہیں پہنچکر تمیز و امتیاز ہوتا ہے۔ یہ مرتبہ واحدیت ہے اس کو حقیقت انسانی اور اعیان ثابتہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ تعیّن عالم جبروت میں پہنچا دیتا ہے۔

نزول کے اِن مرتبوں کو قدیم کہا جاتا ہے اس لئے یہ بتانا ممکن نہیں کہ ان میں مقدم کونسا ہے اور موخر کونسا اور اسی لئے اِن کو محض عقلی اور ربانی سمجھنا چاہئیے کیونکہ ذات حق سبحانہٗ تعالیٰ جیسی پہلے تھی ویسی ہی اب بھی ہے اور اس لئے اس میں کسی قسم کا تغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ آلانَ کما کانَ (اب تک ویسا ہی ہے جیسا کہ تھا) سے اِسی حقیقت کو ظاہر کیا گیا ہے۔

دراصل جب ذات کا بہ حیثیت مجموعی صفات سے متصف ہونا ملحوظ ہو تو اس کو لاہوت کا مرتبہ کہدیا جاتا ہے۔ اور جب تفصیل وار جدا جدا صفت سے متصف ہونا ملحوظ ہو تو اس کو مرتبہ جبروت سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ اِن مراتب کو مراتب الٰہیہ بھی کہا جاتا ہے۔ اِن میں تنزّل اور تعیّن کے الفاظ حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوتے۔

مرتبہ رابعہ جس کو تنزل سوم یا تعیّن سوم کہا جاتا ہے مرتبہ عالم ارواح ہے۔ اس سے مراد اشیائے کونیہ ہے جو مجرد اور بسیط ہیں۔ اِس مرتبہ کو عالم ملکوت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اسی کو روحوں اور فرشتوں کی دنیا اور عالم غیب بھی کہتے ہیں۔

مرتبہ خامسہ جو تنزل چہارم ہے دراصل عالم مثال ہے یہ وہ اشیاء کونیہ ہیں جو مرکب اور لطیف ہیں اور انمیں تجزیہ تقسیم

جمع اور ترکیب کے اصول کارفرما نہیں ہوتے۔ یہ عالم ارواح اور عالم اجسام کے درمیان ایک برزخ ہے۔

مرتبہ سادسہ جس کو تنزل پنجم کہا جاتا ہے عالم ناسوت ہے۔ اس سے مراد اشیاء کونیہ مرکبہ کثیفہ ہے جس میں تجزیہ، تقسیم ترتیب و ترکیب سب ممکن ہیں۔ اس عالم کو عالم شہادت بھی کہا جاتا ہے۔

مرتبہ سابعہ تنزل ششم ہے اسمیں انسان مظہر اتم واکمل صفات الٰہی ہوکر سامنے آتا ہے

تنزل سوم، چہارم اور پنجم کو مراتب امکانی کہا جاتا ہے۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ

اللہ تعالیٰ (ذات احدیت) ایک مخفی خزانہ ہے۔ اس نے اپنی معرفت کرانے کے لئے پہلے مرتبہ وحدت اور واحدیت میں اپنی صفات اور اسماء کو ممیز کیا۔ پھر عالم ارواح، عالم مثالی اور عالم اجسام کی ترتیب اور تکوین کے ساتھ انسان کو پیدا کرکے مظہر اتم واکمل اپنی صفات اور اسماء کا بنایا۔ ان مراتب پنجگانہ میں فرق نہ کرنا اور ایک مرتبہ کے احکام دوسرے پر ثابت کرنا حضرات صوفیہ کے نزدیک زندقہ ہے۔

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد   گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

(عمدۃ السلوک حصہ دوم)

یہ تمام بحث اتنی نازک ہے کہ اس کو سمجھنا اور مختلف مراتب کے درمیان تعلق قائم کرنا ہر شخص کے لئے ممکن نہیں اسی لئے طرح طرح کی تاویلیں کی جانے لگیں اور چونکہ تمام تنزلات اور تعینات کا آغاز وجود مطلق یا ذات لاتعین سے کیا جاتا ہے اس لئے وحدت الوجود کی اصطلاح کی تشریح و تفسیر میں کافی موشگافیاں کرنی پڑیں اور بہت سے لوگ افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے۔

بعض حضرات نے تعینات اور تنزلات کو اسی ذات واحد کے اندر قرار دے کر صرف اسی ذات کا اثبات کیا ہے اور نہایت فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا ہے کہ وجود درحقیقت ایک ہے اور جملہ اشیاء اسی وجود کے اندر ہیں یا جملہ اشیاء میں وہی وجود جاری و ساری ہے۔ لہٰذا ماسوا کچھ نہیں۔ اسی ہستی مطلق کی حیثیت ایک بحر ناپیدا کنار کی سی ہے۔ جس کی سطح پر بلبلے بھی پیدا ہوتے ہیں اور لہریں بھی اٹھتی ہیں۔ لیکن ان بلبلوں اور لہروں کو ان کے مرئی ہونے کے باوجود بحر سے علیحدہ کوئی چیز نہیں سمجھا جاسکتا۔ لہٰذا ہستی مطلق اور جملہ موجودات ایک ہی ہیں اور ان میں عینیت کا تعلق ہے۔ یہی نظریہ وجودیت کا یا ہمہ اوست کا نظریہ کہلاتا ہے۔ اس نظریئے کو ماننے والے اس درجہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں کہ ماسوا اللہ اور غیر اللہ کہنا بھی ناجائز بلکہ کفر کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب وجود کو ایک مان لیا گیا تو پھر اس کے سوا یا اس کا غیر کیا باقی رہ گیا۔ لہٰذا ماسوا اللہ اور غیر اللہ کا تصور دوئی کو مستلزم ہوا جو یقیناً شرک ہے۔ مرزا غالب بھی اسی نظریہ کے حامی تھے۔ ان کے اشعار میں تمامتر اسی نظریہ کا اظہار کیا گیا ہے۔

دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ جملہ ممکنات یا اشیاء ذات احدیت کا عکس ہیں اور چونکہ عکس ذات سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ عکس کا تصور بھی اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ذات کا تصور کیا جائے لہذا وجود ایک ہی ہے اور جملہ اشیاء اسی کے اسماء وصفات کے ظلال ہیں

ایک تیسرے گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ ممکنات کا وجود اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ علم میں موجود ہیں۔ اور کائنات کا وجود کون و حصول کے سوا کچھ نہیں۔ پھر چونکہ کون وحصول خالص وہم ہیں اس لئے ممکنات بھی وہم سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن آیۂ کریمہ صُنعَ اللّٰه الذی اتقن کُلَّ شَیءٍ (یہ اللہ تعالےٰ کی صنعت ہے کہ ہر چیز کو مضبوط بنا رکھا ہے) کی بنیاد پر اشیاء موہوم ہونے کے باوصف بعدوم نہیں کہی جا سکتیں اور وہم کے ارتفاع سے ان کا ارتفاع لازم نہیں آتا۔ گویا اشیائے کائنات موہوم تو ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ قوی بھی ہیں۔ اور بقا کے اعتبار سے موہوم قوی کی حیثیت وہی ہے جو موجود ضعیف کی۔ علماء اشیاء کو موجود ضعیف مانتے ہیں اور لفظ وہم سے اجتناب کرتے ہیں۔ صوفیاء اشیاء کو موہوم قوی قرار دیتے ہیں اور وہم کے ارتفاع کے باوجود ان کے عدم ارتفاع کے قائل ہیں اس طرح علماء اور صوفیہ ایک سطح پر آجاتے ہیں اور ان کے درمیان محض لفظی اختلاف رہ جاتا ہے بہرکیف صوفیہ کے اس نظریہ کو سامنے رکھ کر اشیاء کل کی کل موہوم ہیں موجود صرف ایک ہی ذات رہ جاتی ہے اور وہ ذات احدیت ہے اور اس لئے وحدت الوجود کہنے میں کوئی الجھن پیدا نہیں ہوتی۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ

"وحدت الوجود کے ماننے والوں کے شیخ الرئیس یعنی شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرّہٗ اس وہم کے عدم ارتفاع میں بے انتہا مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور اس کا رفع ہونا کسی طرح بھی جائز نہیں سمجھتے اور ناقص لوگوں کی ایک جماعت جو خود کو ان کا پیرو سمجھتی ہے ان کے مقصد کو نہ پاکر اس وہم کے رفع کی قائل ہوگئی اور ایک عالم کو الحاد و زندقہ میں مبتلا کر دیا۔" (شرح رباعیات حضرت خواجہ باقی باللہ۔ اردو ترجمہ)

توحید وجودی کی ایک تقریر اس طرح بھی کی گئی ہے کہ وجود مشترک جو ماہیت واحدہ ہے اور ایجاد حق کا ظل ہے۔ سب وجودوں میں مشترک ہے اور کوئی وجود یا اس کا جزو دوسرے سے مختلف بالماہیت نہیں صرف آثار و عوارض کا اختلاف ہے۔ ایجاد حق کا تعلق اس فیضان میں سب کے ساتھ یکساں ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے اعتبار میں وحدت وجود کہہ سکتے ہیں

~ برہمہ عالم ہمے تابد سہیل جائے انبان می کند جائے ادیم (عمدۃ السلوک حصہ دوم)

ان کے علاوہ اور بھی کئی طریقوں سے توحید وجودی یا وحدت الوجود کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن بعض نظریئے ان ہی کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں اور بعض نظریئے ایسے ہیں جن سے مسئلہ سلجھنے کے بجائے اور الجھ جاتا ہے۔ سب سے زیادہ محفوظ راستہ یہی ہے کہ اشیاء کو موہوم کہہ کر صرف ایک وجود کا اثبات کیا جائے اور پھر موہوم کو موہوم قوی قرار دے کر اس کے معدوم ہونے کے شبہ کو رفع کر دیا جائے۔ اس طرح شریعت سے اس نظریہ کا ٹکراؤ نہیں ہوگا۔

ذات وصفات اور کائنات کی اِس مختصر بحث کے بعد اب تصوف کے دیگر مسائل کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ عام طور پر تصوف یا سلوک کا مقصد معرفت سمجھا جاتا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ معرفت کا حصول فنا پر منحصر ہے، بعض کہتے ہیں کہ فنا ایک درمیانی منزل ہے اس سے آگے بڑھ کر معرفت حاصل ہوتی ہے۔

حضرت مجدد صاحب کا کہنا ہے کہ جن معنوں میں معرفت کے لفظ کو استعمال کیا جاتا ہے وہ ذات وصفات خداوندی کی ممکن نہیں۔ اس لئے کہ وہ ذات انسان کے عقل وخرد اور وجدان سے وراء الورا ہے۔ اصل معرفت یہ ہے کہ انسان سمجھ لے کہ کسی طرح اس کا عرفان ممکن نہیں اور جب معرفت کی حقیقت صرف یہ رہ گئی تو اب تصوف کا مقصد معرفت کو قرار دینا ٹھیک نہیں بلکہ تصفیہ قلب اور تزکیہ نفس ہے۔

بہرحال صوفی جب راہ سلوک میں قدم رکھتا ہے تو اسے حصول مقصد کے لئے چار منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے جو سیور اربعہ کہلاتی ہے۔ سیور کے معنی سیریں ہیں۔ گویا اس راہ سے گذرتے وقت انسان کو چار سیریں نصیب ہوتی ہیں (۱) سیر الی اللہ (۲) سیر فی اللہ (۳) سیر عن اللہ باللہ (۴) سیر فی الاشیاء باللہ۔

۱۔ سیر الی اللہ۔ سالک کو اس سیر کے لئے اپنی توجہ اپنی ذات اور کائنات سے ہٹا کر ذات خداوندی پر مرکوز کرنا پڑتی ہے دوسرے الفاظ میں اسماء وصفات الٰہی کے ظلال (مرحود ات) سے وہ اسماء وصفات الٰہی کی طرف بڑھتا ہے۔ اور آخر کار ممکنات کے علوم طے کر کے اور کلی طور پر ان کے فنا ہو جانے کے بعد واجب تعالیٰ کے علم تک حاصل کر لیتا ہے۔ اسی کو فنا کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ اس فنا کو فنائے وجودی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ وحدت سے کثرت میں تنزل واقع ہوا ہے اس لئے دوسری مرتبہ کثرت کی طرف سے یا اس کا کچھ حصہ عروج کر کے اس وحدت میں فانی اور مستہلک ہو جاتا ہے جس طرح پانی کے چند قطرے دریا سے علیحدہ کر لئے جائیں اور پھر دریا کے پانی میں ملا دیئے جائیں۔ حضرت مجدد صاحب فرماتے ہیں کہ یہ نظریہ صحیح نہیں کیونکہ اس کو ماننے کے بعد آدمی زندقہ میں جا پڑتا ہے۔ دراصل فنا سے مراد فنائے شہودی ہے یعنی کہ ماسوا کی تمام نظر سے چھپ جاتی ہے اور سوائے ایک کے اور کوئی شے بھی مشہود نہیں رہتی۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ سالک جب اس راہ پر چلتا ہے تو اپنی صفات بشری کو ایک ایک کر کے ترک کرتا جاتا ہے۔ اپنی خواہشات، اپنے ارادے، اپنی تمنائیں اپنی آرزوئیں مٹا دیتا ہے اور اس طرح گویا وہ دنیوی اعتبار سے مر جاتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے موتوا قبل ان تموتوا (مرنے سے پہلے ہی مر جاؤ)۔ اسی خیال کو خواجہ میر درد نے اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

موت کیا آ کے فقیروں سے تجھے لینا ہے مرنے سے آگے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں۔

۲۔ سیر فی اللہ۔ فنا کے بعد سالک اسماء وصفات کے دائرہ میں داخل ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفات، اسماء، شیون، اعتبارات، تقدیسات و تنزیہات میں سیر کرتا ہے۔ اب گویا خدائی صفات اس کی رہبری کرتی ہیں تو یہیں اس کو بقا نصیب ہوتی ہے۔ یہیں نفس کو طمینان حاصل ہوتا ہے (نفس مطمئنہ) اور یہیں تمر...

ہوتا ہے۔ اب سالک جو کچھ کرتا ہے اپنی مرضی اور خواہش سے نہیں کرتا بلکہ وہ کلیتاً اللہ کی مرضی کا تابع ہوتا ہے۔ اس سیر کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے۔ اسی لئے بعض لوگ تو ہمیشہ اسی سیر میں رہتے ہیں۔ خود کو ذات باری میں ہلاک کر دینے اور مستہلکین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ گویا ان کے سلوک کی یہ انتہا ہے۔

۳۔ سیر من اللہ باللہ۔ بعض سالکین کو جنہیں الی الدعوۃ کے مرتبہ پر سرفراز کر دیا جاتا ہے وہ خلق اللہ کی ہدایت کے لئے مخلوق کی طرف لوٹا دیئے جاتے ہیں۔ لیکن اب ان کو مخلوق کے ساتھ کسی قسم کی گرفتاری نہیں ہوتی۔ خلق کی طرف توجہ کرنا اُن کے لئے محض اللہ کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔

۴۔ سیر فی الاشیاء باللہ۔ تیسری سیر میں مخلوق کی اصلاح کے دوران سالک کو اشیاء کے علوم جو پہلی سیر کے دوران مٹ گئے تھے پھر یکے بعد دیگرے حاصل ہو جاتے ہیں اور سالک بظاہر کلی طور پر مخلوق کے ساتھ ملا جلا رہتا ہے۔ اس کے تمام افعال عوام کی طرح دنیا کی مشغولیت سے متعلق ہوتے ہیں لیکن دل برابر دوست کی یاد میں لگا رہتا ہے۔ یہی وہ انتہائی درجہ ہے جو عبدیت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جہاں انسان کلیتاً تسلیم و رضا کا خوگر ہو جاتا ہے پہلی دو سیروں کو عروج سے تعبیر کرتے ہیں اور بعد کی سیر بن نزول کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں بظاہر نزول، عروج کے مقابلہ میں ادنیٰ ہے۔ لیکن حقیقتاً نزول، عروج کے بعد کا درجہ ہے اس لئے اسکو بلند سمجھا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ پہلی سیر یعنی سیر الی اللہ کے دوران سالک کائنات اور اپنی ذات سے توجہ ہٹا کر اسکو صرف خدا کی ذات پر مرکوز کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سیر کے اختتام تک سوائے ذات خداوندی کے سب چیزیں اس کی نظر سے چھپ جاتی ہیں۔ اس وقت اس کو ایک ہی ذات کا جلوہ نصیب ہوتا ہے اور خود کو بھی وہ اسی ذات کا ایک حصہ مشاہدہ کرتا ہے اس وقت وہ از دیاد شوق میں کہہ اٹھتا ہے کہ صرف ایک وجود ہے اور باقی کوئی شے نہیں۔ اُسی کو وہ وحدت الوجود سے تعبیر کرتا ہے۔ بعض سالک جن میں ضبط کی کمی ہوتی ہے خود کو اسی وجود میں شامل سمجھ کر انا الحق (میں خدا ہوں) اور بعض سبحانک شانی (میری شان کتنی بڑی ہے) کہہ گذرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ منصور اور بایزید بسطامی دونوں کا یہی معاملہ تھا۔ حضرت شیخ مجدد الف ثانی اس خیال کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سالک کو اس مقام پر پہنچ کر جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ اسکا مشاہدہ ہے حقیقت نہیں۔ دراصل اس وقت بھی سب چیزیں موجود رہتی ہیں۔ لیکن تجلیات الٰہی کی اسد رجہ فراوانی ہوتی ہے کہ اس میں وہ چیزیں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں جیسے سورج کی روشنی میں چاند ستارے دکھائی نہیں دیتے حالانکہ ان کا وجود باقی رہتا ہے لہٰذا اس مشاہدہ کو وحدۃ الوجود سے تعبیر کرنا غلط ہے وحدۃ الشہود کے نام سے موسوم کرنا چاہئے۔

مسائل تصوّف کے اس آئینہ میں کلام غالب کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ابتداً وجود بسیط وغیر متعیّن تھا۔ جب اس نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو اپنے اسماء و صفات کو تنزلات سے گذار کر کائنات اور انسان کو اپنی صفات اور اسماء کا مظہر بنایا۔ اس چیز کو غالب نے کس خوبی سے

اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں   ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

یہ شعر اس حدیث قدسی کا کتنا حسین ترجمہ ہے "کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق (میں ایک مخفی خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں، پس میں نے خلقت کو پیدا کیا) شاعر کہتا ہے کہ کائنات ذات واحد کی خود بینی اور خود اظہاری کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ ذات اپنا اظہار نہ چاہتی تو اسی طرح بسیط اور غیر معین رہتی اور حدود و جہت جو تعینات و تنزلات کے ذریعہ ظاہر ہوئے کبھی شرمندۂ معنی نہ ہوتے۔

دوسری جگہ اس بات کو کہ ذات لاتعین کو تعینات کی کیوں ضرورت پڑی اور جو وجود بسیط و لطیف تھا اس نے اپنے اظہار کیلئے کثافت میں جلوہ کیوں کیا اس حسین انداز میں پیش کرتے ہیں۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

ہر شخص جانتا ہے کہ جب چمن میں قوت نامیہ جوش مارتی ہے۔ پردۂ خاکی سے حسینان چمن اپنے چہرے نکالتے ہیں نہال تازہ اور رنگین پھولوں سے باغ و راغ میں ایک رونق آجاتی ہے، نئی نئی کونپلیں پھوٹ کر اور ہرے ہرے پتے نکل کر خزاں دیدہ اشجار کو دھانی جوڑے پہنا دیتے ہیں اس وقت سمجھ لیا جاتا ہے کہ بہار کا موسم آگیا ہے گویا بہار جو ایک لطیف شے تھی اس کا وجود اس وقت متحقق ہوا جب اس نے چمن کے کثیف پردوں سے اپنا اظہار کیا۔ اسی طرح آئینہ جو ایک صاف و شفاف وجود رکھتا ہے اس میں چمک اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اس پر زنگار کی کثافت لگائی جائے۔

یہ دونوں مثالیں پیش کر کے مرزا نے اس بات کو واضح کردیا ہے کہ ذات لاتعین اور وجود بسیط کے اظہار کے لئے بھی تعینات کے پردوں سے اپنے اظہار کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس ذات واحد نے انہیں کے ذریعہ اپنی تجلیات کا اظہار کیا اور کائنات کی زنگارنگی نے محبوب حقیقی کے وجود پر دلالت کی۔ حالانکہ آلان کما کان (وہ اب تک ویسا ہی ہے جیسا تھا)

وجود صرف ایک ہے اور وہ ایک بحر بیکراں ہے۔ جملہ اشیا اس کی سطح پر قطرہ، حباب اور موج کی حیثیت رکھتی ہیں اور جس طرح موج، حباب وغیرہ بحر کی صور مختلفہ ہیں اسی طرح جملہ اشیا، وجود واحد کی مختلف شکلیں ہیں۔ اور چونکہ ان کا بنا وجود، وجود حقیقی کی وجہ سے ہے، خود ان کی کوئی ہستی و حقیقت نہیں اس لئے ان کا ذکر ہی فضول ہے۔ اس خیال کو مرزا نے اس ایک شعر میں کس خوبی سے ادا کیا ہے ؎

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر   یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

دوسرے مصرع کی طرز ادا نے شعر میں بلاغت کا عنصر بدرجۂ اتم پیدا کردیا ہے۔ حالانکہ توجیہ وجودی کے لئے مثال رہی استعمال کی ہے جو وحدت الوجود کے ماننے والے مدت مدید سے استعمال کرتے ہیں لیکن مرزا کے انداز بیان "یاں کیا دھرا ہے

قطرہ و موج و حباب میں" نے اس خیال کو قطعًا اچھوتا بنا دیا ہے۔

مادہ میں جنبش و تحریک پیدا کرنے والی شے حرکت ہے اور حرکت کو متعین کرنے والی ہستی وہ ذات واحد ہے جو کارخانہ قدرت کے پس پردہ کام کر رہی ہے۔ اور جس کو علت العلل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے وہی وجود حقیقی ہے باقی چیزیں اسی سے سامان وجود حاصل کرتی ہیں۔ مرزا صاحب کے ان دو اشعار میں یہ حقیقت عریاں ہو کر سامنے آتی ہے۔

ہے تجلی تری سامانِ وجود ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے پرتو سے آفتاب کے ذرہ میں جان ہے

چونکہ مرزا توحید وجودی اور ہمہ است کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اسی نظریہ پر ان کا عقیدہ تھا اس لئے اس خیال کو طرح طرح کے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ کبھی کہتے ہیں

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

یعنی جس طرح قطرہ ناچیز ہونے کے باوجود انا البحر کہہ کر دریا ہونے کا دعویدار ہے اسی طرح ہم بھی جزو ضعیف ہونے کے باوجود انا الحق (میں خدا ہوں) کے مدعی ہیں۔ اور قطرہ کی طرح اپنے مبدا کے ساتھ عینیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔

کبھی ارشاد ہوتا ہے۔

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

گویا عارف کے لئے ضروری ہے کہ وہ قطرہ میں دریا اور جزو میں کل کا نظارہ کرے۔ اس کی دیدہ بینا بچوں کا کھیل نہیں ہے کہ وہ اس حقیقت کو نہ دیکھ سکے۔ اس کو یہ تماشہ نظر آنا لازمی ہے۔

ایک جگہ اسی خیال کا اظہار اس انداز میں کیا ہے۔

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دم سماع گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

چنگ و رباب سے جو آوازیں نکلتی ہیں وہ اگر اسی وجود واحد کی صدائیں ہیں تو ان کو سنکر ہماری روح بالیدہ ہونے کے بجائے کاہیدہ کیوں ہوتی ہے۔ اور ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بوقت سماع ہماری جان نکلنے لگتی ہے حالانکہ اس کو ایک گونہ سرور حاصل ہونا چاہئے — نہایت اچھوتے انداز میں اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ صدائے چنگ و رباب ایک ہی ساز کے مختلف نغمے ہیں اور جملہ اشیاء اسی وجود واحد کے مظاہر ہیں۔

اپنی ذات اور کائنات کو وجود حقیقی کا جزو قرار دینے کے لئے ایک شعر میں اس سے بھی زیادہ اچھوتا انداز اختیار کرتے ہیں کہ

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

انسان کی اصل علت العلل ہے اور ہونا ہست کے معنی ہیں اپنے مبدا سے الگ ہو کر دنیا میں آنا گویا وجود انسانی کا سب سے زیادہ کچھ نہیں کہ یہ بیکراں سمندر سے ایک قطرے کو جدا کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ جدائی اس کے لئے مژدہ مباہات نہیں بلکہ

اضطراب و بے چینی کا موجب ہے۔ قطرہ یقیناً اپنے مبدا سے جدا ہو کر اپنی کم مایگی کا احساس کرے گا۔ اور اپنے اصل سے متصل ہونے کیلئے بیقرار رہے گا۔ یہ اسی بیقراری کا نتیجہ ہے کہ ذات واحد اور وجود حقیقی تو اسی طرح الآن کما کان کا مصداق ہے لیکن قطرہ تڑپ تڑپ کر یہ صدا بلند کر رہا ہے۔

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بظاہر اس مصرع میں عدم کو وجود پر ترجیح دی گئی ہے لیکن دراصل جس کو ہم عدم سمجھ رہے ہیں وہ مرزا کے نزدیک وجود حقیقی ہے۔ جب اس سے جدا ہوئے تو ہمیں ایک ایسے وجود کا جامہ پہنا یا گیا جو عدم سے بھی بدتر ہے۔ ایسی صورت میں بیقراری و اضطراب کا ہونا ایک امر ناگزیر ہے۔ اسی کی جانب تو مولانا جلال الدین رومی نے اشارہ فرمایا ہے۔

از نیستاں تا مرا ببریدہ اند　　　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

وجود واحد کی جلوہ گری مرزا کے ایک اور شعر میں ملاحظہ ہو۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا　　　　ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے

کہتے ہیں کہ اشیاء کائنات ہمیں مختلف شکلوں اور صورتوں میں نظر آتی ہیں۔ لیکن جلوۂ حقیقی سب میں موجود ہے۔

بعض جگہ اس اعتراف کے باوجود کہ اشیائے کائنات وجود حقیقی کے مختلف جلوے ہیں مرزا صاحب نے اس بات کا بھی صاف لفظوں میں اظہار کر دیا ہے کہ کوئی شے اس وجود حقیقی جیسی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جزو کو کل سے اور قطرے کو بحر سے تعلق ہوتا ہے۔ مگر نہ جزو کل کی طرح ہو سکتا ہے اور نہ قطرہ بحر کے مثل۔

ارشاد ہوتا ہے

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے　　　　پر تجھ سی کوئی شئے نہیں ہے

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک وجود ماننے کے بعد جب اس کے مختلف مظاہر پر نظر پڑتی ہے تو لامحالہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی کیا تاویل و توجیہہ کی جائے۔ وادی تحیر سے گذرتے وقت یہ تجسس شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ مرزا غالب اس کیفیت کا اظہار کر کے خود اسی ذات واحد سے ان مظاہر اور اشیاء کے کنہ و حقیقت کو ان الفاظ میں دریافت کرتے ہیں۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں　　　　غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکن زلف عنبریں کیوں ہے　　　　نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں　　　　ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

وجود حقیقی کو ایک سمجھنے کے بعد جملہ اشیاء کی حیثیت موہوم بلکہ معدوم کی سی ہو گئی۔ ایسی صورت میں ایک توحید پرست کا فرض ہے کہ وہ کائنات اور اس کے جملہ لوازم کو غیر حقیقی سمجھے اس کے عدم وجود نما سے دھوکا نہ کھائے۔ اور اس سراب کو

حقیقت سمجھ کر شرک میں مبتلا نہ ہو۔ مرزا صاحب نے بھی سالک راہ کو مختلف طریقوں پر ان خدشات سے آگاہ کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

عالم کو شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر کہہ کر اس کے عدم پر استدلال کیا ہے۔ یہاں بھی اندازِ بیان نے شعر میں بلاغت بدرجہ اتم پیدا کر دی ہے دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

عالم دراصل حلقۂ دامِ خیال ہے اس لئے تم اس میں پھنس کر ہستی کو ہستی نہ سمجھ لینا بلکہ نیستی یعنی معدوم ہی سمجھنا۔ اس خیال کو ایک دوسری جگہ اس طرح پیش کیا ہے۔

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

غرض یہ تصور دلاکر کہ وجودِ حقیقی دراصل ایک ہے باقی سب کچھ موہوم و معدوم ہے اب یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جو چیز معدوم ہے اس کو غیر اللہ یا ما سوا اللہ کہنا اس کو موجود دیکھنے کے مترادف ہے اور اس سے دوئی کا تصور پیدا ہونا لازمی ہے۔ جو توحید خالص کے منافی ہے۔ لہٰذا یہ نہیں کہنا چاہئے کہ خدا کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے۔ توحید وجودی اور ہمہ اوست کے نظریہ کا منتہا یہی خیال ہے کہ خدا کے سوا کسی چیز کا بھی ذکر نہ کیا جائے۔ ورنہ شرک کہا جائے گا۔ اسی نظریہ کے تحت لا الٰہ الا اللہ کا مطلب صوفیہ لا موجود الا اللہ لیتے ہیں

مرزا صاحب نے اس خیال کو ایک مقام پر اس طرح ظاہر کیا ہے۔

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

شاعر کے نزدیک کثرت کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ کثرت کا تصور وحدت کے مقابلہ میں ابھر کر اس کو وحدت نہیں رہنے دیتا اور توحید خالص کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔ دراصل جنہیں ہم مظاہر سمجھ رہے ہیں وہ ہمارے خیال کے تراشے ہوئے بت ہیں اور ان کا تصور ہمیں کفر کی طرف لے جاتا ہے۔ اس لئے جب تک ہم کثرت کے تصور سے اپنے ذہن کو خالی نہیں کریں گے ہم وہم کی پرستش سے آزاد نہیں ہو سکتے اور توحید خالص کا حصول ہمارے لئے ممکن نہیں۔

ایک اور شعر میں مرزا صاحب ما سوا کے تصور کی نفی ایک دوسرے طریقے پر کرتے ہیں کہتے ہیں۔

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

دیکھنے کے لئے دو الگ الگ چیزوں کا ہونا ضروری ہے ایک دیکھنے والا اور دوم وہ چیز جو دیکھی جائے۔ اب غور کیجئے کہ خدا کو جو ہم نہیں دیکھ سکتے اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اور ہم الگ الگ وجود نہیں رکھتے۔ ہم اسی کا ایک جز ہیں لہٰذا کون دیکھے اور کس کو دیکھے اگر ہم میں اور اس میں دوئی کا کوئی شائبہ بھی ہوتا تو کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی وقت نظر آتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی ہستی وحدت خالص کی حامل ہے۔ دوسرا مصرع " جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا " اپنے پیرایۂ بیان

کے لحاظ سے نہایت بلیغ ہے۔

اسی خیال کو ذرا مختلف انداز میں مرزا نے اپنے ایک مشہور شعر میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

یہاں شہود، شاہد اور مشہود کی ایک اصل بتاکر توحید وجودی کا اثبات کیا جارہا ہے۔ اور پھر اس خیال پر حیرت کا اظہار ہو رہا ہے کہ سب چیزوں کی اصل ایک ہے تو پھر مشاہدہ کا مفہوم کیا رہ جاتا ہے۔ کیونکہ مشاہدہ کیلئے شاہد و مشہود کا الگ الگ ہونا ضروری ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے دونوں کی اصل ایک ہے لہٰذا مشاہدہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس سلسلہ میں ایک اور شعر قابل توجہ ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب ہیں

سالک ہر طرف مشاہدۂ حق کرتا ہے۔ لیکن ذات احدیت جو لاتعین ہے مرتبۂ غیب الغیب میں ہے۔ اور اس کا ادراک عقل و خرد اور وجدان سے ماوراء ہے چہ جائیکہ اس کا مشاہدہ۔ مرزا ان دونوں باتوں کو سامنے رکھ کر بیان کرتے ہیں کہ جس چیز کو ہم مشہود سمجھ رہے ہیں وہ اصل میں غیب الغیب ہے۔ اور یہ ہماری فہم کا قصور ہے۔ دراصل اس معاملہ میں ہماری مثال اس شخص کی سی ہے جو خواب میں خود کو جاگتا ہوا محسوس کرے۔

توحید وجودی کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو اپنے اسماء و صفات کا مظہر بنا کر اپنا اظہار کیا لیکن اس اظہار کے بعد اس نے سکوت و جمود اختیار نہیں کیا۔ بلکہ پیہم اس کی شانوں کا اظہار ہو رہا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس آیتہ کل یوم ھو فی شان سے اسی حقیقت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ مرزا صاحب کا اس مضمون کا ایک اور شعر سنئے ؂

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز — پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

تقریباً اسی مضمون کا شعر اقبال نے کہا ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

لیکن اقبال کا انداز قدرے فلسفیانہ ہے اور مرزا کا خالص شاعرانہ۔ مضمون کی لطافت کے پیش نظر مرزا کے طرز ادا کو ترجیح دینی پڑتی ہے۔ حسنِ ازل کیلئے آرائشِ جمال کی ترکیب اور پھر اس ذات واحد کے لئے جو مرتبہ احدیت میں سب سے پوشیدہ ہے تعینات کے پردوں کے پیچھے سے پیہم آرائشِ جمال کرنا ایک لطیف تصور ہے اور اس کیلئے انداز بیان بھی اتنا ہی حسین و لطیف ہے۔

جہاں ایک طرف مرزا نے اپنے اس شعر

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

کے ذریعہ بالواسطہ طریقہ پر یہ بتادیا ہے کہ ذات احدیت کا مشاہدہ یا عرفان کسی طرح نصیب نہیں ہوسکتا وہیں دوسری جگہ یہ بھی جتادیا ہے کہ اس ناکامی سے بددل ہونے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ اگر ذات لاتعین کا مشاہدہ نہیں ہوسکتا تو اس کی تجلیات کو تو دیکھا جاسکتا ہے تو

ہر چیز میں جاری و ساری اور ہر طرف ظاہر و باہر ہیں۔ لیکن ان کے لئے بصیرت اور چشمِ بینا درکار ہے۔ اگر کسی کو یہ تجلّیات نہیں نظر آتیں تو یہ اس کا قصور ہے کہتے ہیں۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یعنی چونکہ تم اسرارِ خداوندی کے نغموں سے نا آشنائے محض ہو اس لئے نغمۂ حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اگر تم گوش شنوا کو کام میں لاؤ تو تمہیں ہر شے سے یہ نغمے پھوٹتے ہوئے معلوم ہوں اور اشیائے کائنات جو ان اسرار کے لئے بظاہر حجاب معلوم ہوتی ہیں فی الحقیقت ساز کے پردے ثابت ہوں۔

ذات لاتعیّن، تعیّنات، تنزّلات، تجلّیات وغیرہ پر اظہارِ خیال کرنے کے بعد مرزا صاحب سلوک کی مختلف کیفیتوں کی بھی چند اشعار میں نشان دہی کرتے ہیں۔

پہلے بتاتے ہیں کہ ذات احدیت کا مشاہدہ اور حصول چونکہ ناممکن ہے اس لئے انتہائی سعی و جہد کے باوجود اس کی معرفت شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ جو لوگ معرفت حاصل ہو جانے کے مدعی ہیں وہ بھی در حقیقت اس خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ غیب الغیب کو مشہود سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن اکثر لوگوں کو یہ مقام کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ہمت کے مطابق اس راہ میں چلتے ہیں اور جب انھیں معرفت حاصل نہیں ہوتی تو ہمت چھوڑ دیتے ہیں۔ کوئی کسی منزل پر پہنچ کر رک جاتا ہے کوئی کسی منزل پر۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟

مرزا صاحب کہتے ہیں کہ اس میں اُن کا قصور بھی کیا ہے۔ وہ ذات احدیت، لاتعیّن ہونے کی وجہ سے انسان کی پہنچ سے ماورا ہے۔ نہ وہاں عقل و خرد کی رسائی ہے نہ وجدان کی ایسی صورت میں بیچاروں کو ناکامی سے دوچار ہونے کے سوا کچھ چارہ نہیں لہٰذا

" وہ اگر تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں "

اس ناکامی سے بچنے کے لئے مرزا صاحب سالک راہ کو مشورہ دیتے ہیں کہ تم ذات کی معرفت کے درپے نہ ہو بلکہ صفات کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ چونکہ صفات، ذات سے الگ نہیں کی جا سکتیں اس لئے اگر صفات کی معرفت حاصل کر لوگے تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے ذات کی معرفت حاصل ہو گئی۔ اس مضمون کو ان دو اشعار میں بیان کیا ہے

سرپائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بےخودی　　رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے
یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات　　عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

یعنی پیمانۂ صفات کی گردش کے مطابق عارف کو ہمیشہ مئے ذات سے مست و بےخود رہنا چاہئے۔

ذات احدیت تک عقل و خرد اور وجدان کی رسائی نہ ہونے اور اس کی معرفت میں ناکام رہنے کی وجہ مرزا صاحب یہ بتاتے ہیں کہ ذات لاتعیّن نے تعیّنات کے اتنے حجابات ڈال لئے ہیں کہ ان کے درمیان میں حائل ہونے کی وجہ سے یہ جاننا کہ وہ ذات کون

اور کہیں ہے جس کی جلوہ گری تعینات کے ان پردوں میں ہو رہی ہے ممکن نہیں انکے نزدیک تعینات کے ان پردوں کو چاک کر کے اُس ذات لاتعین تک رسائی حاصل کرنا ممکن ہے۔ اس تصور کو مرزا کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

یعنی وہ ذات جو تعینات کے پردوں کے پیچھے رہ کر اپنے جلوے دکھاتی ہے اس کے کنہ حقیقت کو ان پردوں میں چھپے ہونے کی وجہ سے کوئی سمجھ نہیں سکتا اور کسی کیلئے ان پردوں کا بیچ سے ہٹانا ممکن ہے۔ ایسی صورت میں اس کی معرفت ہو تو کیونکر ہو۔

ذات احدیت یا ذات لاتعین کی معرفت اگرچہ ممکن نہیں تاہم اس کی تجلیات یا اس کے جلوے اور مظاہر جو تعینات کے پردوں پر ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں ان کا مشاہدہ تو کیا جاسکتا ہے اور صفات کے ان مظاہر سے ذات کا کچھ عرفان حاصل کرسکتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے کچھ تو اس کے جلوؤں کی فراوانی سے آنکھوں میں وہ چکا چوند پیدا ہوتی ہے کہ نظر میں خیرہ ہوکر رہ جاتی ہیں اور کچھ اپنے اندر طاقت کی کمی کہ دید کی تاب لانا ممکن نہیں۔ سورج اتنی روشن اور نمایاں چیز ہے لیکن جب اس پر نظر جمانے کی کوشش کی جائے تو اس کی تیز روشنی کی وجہ سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ جب سورج جو اجرام فلکی کا محض ایک جرم اور تجلیات الٰہی کا ایک ادنیٰ مظہر ہے اُس کی روشنی اور تابانی یہ اثر دکھاتی ہے تو آفتابِ حقیقت کے جلوؤں کی کوئی کیا تاب لاسکتا ہے۔ دیکھئے مرزا نے اس حقیقت کو کس کس طرح بیان کیا ہے۔

پہلے کہتے ہیں۔

صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اٹھائیے طاقت کہاں کہ دید کا احسان اٹھائیے

یعنی آنکھ اٹھا کر دیکھیں تو محبوبِ حقیقی کے جلوے ہر طرف بکھرے ہوئے دکھائی دیں لیکن دیکھیں کس طرح جب آنکھیں تابِ نظارہ ہی نہ لاسکیں۔

دوسرے شعر میں اسی بات کو اس طرح بیان کیا ہے

نظارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حسن کا جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

پہلے شعر میں اپنی بصارت کی کمزوری کا اعتراف تھا۔ اس میں جلوؤں کی فراوانی اور ان کی شدت کو اپنی ناکامی کا موجب قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں اُس حسنِ ازل کے جلوے تو ہمارے سامنے موجود ہیں لیکن اُن جلوؤں میں اس قدر جوشِ بہار ہے کہ وہ بجائے خود نقاب بن گئے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ذات احدیت کے لئے جوشِ بہار یا تعینات نقاب کا کام کر رہے ہیں لہٰذا جب ہم اُس کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں تو نگاہیں اس نقاب سے ٹکرا کر رہ جاتی ہیں اور ہم اس کی دید سے محروم رہتے ہیں۔

تیسرا شعر بھی قریب قریب اسی کے ہم معنی ہے کہتے ہیں ؎

ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

یہاں بھی نگاہ کی ناکامی کا سبب برقِ نظارہ سوز کو بنایا ہے۔

ایک اور شعر میں مرزا نے خود نظارہ کو اس ناکامی کا موجب قرار دیا ہے۔ دیکھئے اندازِ بیان کتنا حسین و جمیل ہے ؎

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

گویا تابِ نگاہ نے تیرے رخ پر بکھر کر ایک ایسا جالا بن دیا کہ وہی میرے لئے نقاب بن گیا اور میں تیرے دیدار سے یکسر محروم رہا۔

اب تصوّف کا ایک اہم مسئلہ آتا ہے وہ ہے سالک کے فنا فی اللہ ہونے کا درجہ غالبؔ جیسے توحید وجودی کے ماننے والوں کے لئے یہ مسئلہ سب سے زیادہ بہتم بالشان ہے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک تو انسان کی معراج یہی ہے کہ وہ اپنے مبداء سے واصل ہو جائے۔ زندگی کی ساری تب و تاب، سلوک کی تمام کوششیں اسی لئے تو ہوتی ہیں کہ قطرہ جو دریا سے الگ ہو گیا تھا پھر دریا میں مل جائے اور دریا کی سی وسعت حاصل کر لے۔ جزو جو کل سے جدا کر دیا گیا تھا پھر کل سے مل کر پائیدار بن جائے۔

مرزا غالب بھی قطرہ کے دریا میں مل کر فنا ہونے کو اس کا حسنِ مآل قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے — کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

قطرہ کے دریا میں مل جانے کو ایک اچھا نتیجہ قرار دینے کی وجہ یہی ہے کہ وہ دریا میں مل کر ایک ناچیز قطرہ نہیں رہتا بلکہ دریا بن جاتا ہے اور بے حد وسعت اختیار کر لیتا ہے اسی طرح سالک بھی فنا فی اللہ کے درجہ پر پہنچ کر ذاتِ احدیت کا ایک حصہ بن جاتا ہے اور محدود سے غیر محدود اور متعیّن سے لا تعیّن ہو جاتا ہے۔

دوسری جگہ کہتے ہیں

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

جب تک قطرہ دریا سے جو اس کا مبداء ہے جدا رہتا ہے اس وقت تک اس کو ایک گونہ بے چینی و بے قراری لاحق رہتی ہے لیکن جب وہ دریا میں پڑ کر فنا ہو جاتا ہے اس کی بے چینی و بے قراری ختم ہو جاتی ہے۔ گویا دریا میں مل جانا اس کے درد کا درماں ہے۔ اسی طرح انسان جب تک اپنے مبداء یعنی ذاتِ احدیت سے جدا رہتا ہے اس وقت تک اس کو کرب و اضطراب رہتا ہے لیکن جوں ہی وہ اپنے مبداء سے واصل ہوا اضطراب ختم ہو کر اسکو پوری طرح سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے ہستی کا مقصود فنا ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

مرزا صاحب فنا فی اللہ ہونے کی ایک حسین توجیہہ بھی پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت — دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

کہتے ہیں کہ محبوبِ حقیقی ذات لا تعیّن ہے اس لئے اس کے ملنے کی تو کوئی امید نہیں لہٰذا اس خیال سے کہ اہلِ طلب کے یہ طعنے کون سنے کہ سرِ معرفت کے حصول میں ناکام رہے ہم نے بہتر سمجھا کہ خود اپنی ہستی کو اس میں گم کر دیا۔ یہ بھی ایک اچھوتا اندازِ بیان ہے۔ ورنہ مقصد صرف یہ ہے کہ انسان کے لئے ذاتِ احدیت کی معرفت ممکن نہیں اس لئے اس کا منتہا یہ ہونا چاہئے کہ خود اپنی ذات کو اس کی ہستی میں فنا کر دے اور اس ساری تگ و دو کا یہی ماحصل بھی ہے۔

آخر میں مرزا صاحب منصور حلاج کے مقابلہ میں اپنی عالی ظرفی کا اِس طرح اظہار کرتے ہیں :-

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

کہتے ہیں کہ منصور کی تُنک ظرفی تھی کہ وہ فنا کے درجے پر پہنچکر انا الحق (میں خدا ہوں) کہہ گزرا اور اس نے یہ نہ سمجھا کہ میں تو ایک ناچیز قطرہ تھا یہ وسعت تو مجھے اپنے مبدا یعنی ذات احدیت سے واصل ہونے کے بعد نصیب ہوئی۔ اس کے برعکس ہم یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمارا قطرہ اُسی بحرِ حقیقت کا ایک حصہ ہے اور اس میں مل کر وہ بھی کٹر دریا بن جاتا ہے ہم اس تُنک ظرفی کا شکار نہیں ہوتے کہ انا الحق چیخنا شروع کر دیں۔ صوفیہ کا کہنا ہے کہ ایسا صرف وہ لوگ کہتے ہیں جو ضبط کا یارا نہیں رکھتے لیکن جن میں ضبط کا مادہ ہوتا ہے وہ اس منزل پر پہنچ کر خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ مرزا صاحب نے صوفیہ کے اسی خیال کی ترجمانی کی ہے -

---

قاضی محمد افضل حق قرشی (لاہور)

خورشید دہلویؒ (تلمیذ غالب)

"ہدیہ احمدیہ" دیکھ رہا تھا کہ اس کے صفحہ ۱۰۶ پر شاہ خورشید احمد کے ذیل میں لکھا پایا کہ وہ غالب کے شاگرد تھے۔ عبارت یہ ہے:

"شاہ خورشید احمد بعد خرابی دہلی سکونت کابل اختیار کردہ بودند۔ در اشعار فارسی از مستفیدان غالب و در ریختہ از تلامذہ مومن خاں بودند"

"در ۱۲۹۱ھ در مکہ معظمہ رحلت کردند، سہ پسر و سہ دختر میاں قیوم احمد سلمہ ربہ، میاں معصوم احمد، میاں مخدوم احمد لاعقب لہا، بی بی مجددی بیگم بمیاں معصوم احمد بن شیخ عزیز احمد بن فضل احمد معصومی بی بی فاروقی بیگم لاعقب لہا، بی بی معصومی بیگم بہ غلام مرتضٰی بن میر حیدر یحیوی"

ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے:-

شاہ خورشید احمد بن میاں شکور احمد بن شیخ محمد اشرف بن فقیر اللہ بن شیخ رضی الدین بن شیخ زین العابدین معروف بہ شاہ فقیر اللہ بن خواجہ محمد یحیٰی عرف شاہ جیو بن شیخ احمد سرہندی [1]

[1] ۱۸۴۹ء/۱۲۶۵ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے سیر سیاحت کا ذوق تھا، ہندوستان و افغانستان تک سیاحت کی، شاہ رؤف احمد رافت (ف ۱۲۵۳ھ) سے بیعت تھے اردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے نمونۂ اشعار:-

کیا پہلو میں دل خورشید جسکو ہم تسلی دیں | جو کچھ تھا آنسوؤں کے ساتھ خون ہو کر نکل آیا
پھاڑنے کو اور کیا باقی رہا دستِ جنوں | چاک دامن ہو گیا پُرزے گریباں ہو گیا
جاتا نہیں آنکھوں سے تصور کبھی خورشید | موجود ہے ہر وقت وہ گویا مرے آگے!
نویدِ وصل یہ مانا، کہ جھوٹ ہے خورشید | کسی طرح کوئی تسکین اضطراب تو دے (تلامذہ غالب ص ۱۰۳، ۱۰۵)

جشنِ صد سالہ بیادِ غالب

(سید ہاشم رضا)

چمک رہا ہے بلندی پہ نام غالب کا
اتر رہا ہے دلوں میں پیام غالب کا

صریرِ خامہ بنی کس طرح نوائے سروش
یہ دیکھنا ہو تو پڑھیے کلام غالب کا

طویل جادۂ صد سالہ کے برابر ہے
زمینِ شعر میں صرف ایک گام غالب کا

وہ فارسی ہو کہ اردو وہ نثر ہو یا نظم
ہے فردِ بزمِ ادب میں نظام غالب کا

مقام و وقت کی قیدوں سے ہو گئے آزاد
ہے ثبت آج دلوں پر دوام غالب کا

ستم ظریف معاصر تو قدر کر نہ سکے
ادائے قرض ہے یہ احترام غالب کا

وہ وقت آ ہی گیا سو برس کے بعد سہی
کہ جس میں ذکر ہوا صبح و شام غالب کا

حسد سے رنگ ہوا زرد جلنے والوں کا
خوشی سے رنگ ہوا لالہ فام غالب کا

ملا نصیب سے ہم کو یہ فیض ترکستاں
شکوہِ بابری و احتشام غالب کا

دلیلِ راہ ہے رومی و حافظ و خسرو
کن آسمانوں میں گونجا سلام غالب کا

زمینِ "شیکسپیر" "سرزمینِ" گیٹے[1] ہیں
خدا کا شکر کہ ہے عام نام غالب کا

کہاں کہاں ہوئے گلشن نئے نئے پیدا
چمن میں شعر کے ہے فیض عام غالب کا

تلاش کر کے کریں کیا ہزار مینا لے
ہمارے واسطے کافی ہے جام غالب کا

جہاں ظفر کو تو دو گز زمین بھی نہ ملی
وہاں ہے تاجِ بقائے دوام غالب کا

قطعہ بیادِ غالب

وہ رند تھا جس پہ پارسائی ہے نثار
درویش تھا جس پہ بادشاہی ہے نثار
اردو ہے عروس اُس کا نوشہ غالب
ان دونوں کی سج دھج پہ خدائی ہے نثار

[1] گوئٹے

پروفیسر لطیف اللہ ایم اے
گورنمنٹ کالج، کراچی

غالب اور مسائل حیات

غالب مسائل حیات کو انسانی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ اور ان کا حل بھی انسانی استعداد و صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے سوچتے تھے ان کے کلام میں جن مقامات پر حکیمانہ نکات اور انسانی زندگی کے اسرار و رموز بیان ہوئے ہیں ان کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد منکشف ہوتا ہے کہ ان کے مشاہدات و تجربات میں کوئی بات ماورائے بشریت نہیں ہے۔ وہ ہماری طرح کے انسان ہیں گوشت پوست رکھتے ہیں۔ ان کے دل میں اچھی زندگی بسر کرنے کی تمنائیں کروٹیں لیتی ہیں۔ وہ اپنی صلاحیت اور استعداد سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اور اجتماعی زندگی میں قابل وقعت مقام حاصل کرنے کے طلبگار رہیں۔ ان کے کلام سے قطع نظر جو اہل ذوق کی روحانی و وجدانی تسکین کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ اگر ہم ان کی سوانح حیات کا مطالعہ کریں تو بھی ان کی زندگی کا ہر واقعہ اور بہتر زندگی کے لئے سعی و طلب انہیں ایک مثالی انسان ثابت کرنے کے لئے کافی ہے

سوانحی حالات کے مطابق مرزا کی عملی زندگی کی ابتدا آگرہ کی ترک سکونت سے شروع ہوتی ہے۔ اس زمانے سے دم واپسیں تک انہوں نے مشکلات و مصائب کا جس پوری دلیری سے مقابلہ کیا اور جس ذوق و شوق سے زندگی کی نعمتوں کے حصول کے لئے جد و جہد کی، ان کی تفصیلات تذکرہ نگاروں نے تمام و کمال قلم بند کر دی ہیں۔ اور ان سب سے مستزاد گراں بہا خطوط کا مجموعہ ہے جس کی موجودگی میں کسی خارجی شہادت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ نواب شمس الدین احمد خاں والیٔ فیروز پور جھرکہ سے جاگیر اور حق وراثت پر نزاع، اور اس نزاع کے سلسلے میں سفر کلکتہ، قاطع برہان کے معاملے میں اپنے نقطۂ نظر کا بیباکانہ اظہار، دربار شاہی میں رسائی کا اشتیاق اور زمانۂ غدر میں پورے ثبات و یقین کے ساتھ دہلی کا قیام یہ سب واقعات اگر ایک جانب مرزا صاحب کی عالی ہمتی کی نشاندہی کرتے ہیں تو دوسری جانب تقاضائے بشریت کا اظہار ہیں جن کے بغیر انسان کی زندگی میں بے شمار جھول نظر آتے ہیں۔

مرزا صاحب کی شخصیت کے مطالعہ کے سلسلے میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ دنیا میں جس قدر عظیم فنکار اور ارباب کمال گذرے ہیں ان میں سے بیشتر کی زندگی اور فن میں کھلا ہوا تضاد پایا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فنکار اپنی شخصیت و کردار

کے کمزور پہلوؤں کو جنہیں زمانے کی معاشرت اخلاقی قدروں کے منافی خیال کرتی ہے۔ لوگوں کی نگاہوں سے نہاں رکھنا چاہتا ہے شعوری طور پر فنکار کی یہ کوشش اس جذبے کے تحت جاری رہتی ہے کہ جس فن پارے کو وہ اہل ذوق کی "لذتِ کام و دہن" کے لیے پیش کر رہا ہے اس کی دلکشی و رعنائی میں فرق نہ آنے پائے اور وہ "طلسم سیمیائی" جو اس نے اپنی تخلیق کے گرد اگرد پیدا کیا ہے وہ معدوم نہ ہو جائے قطع نظر اس بحث کے کہ فنکار اس قسم کے فریب پیدا کرنے میں حق بجانب ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ اس تخلیقی عمل کے اسباب وعلل کیا ہیں؟ ادب و فن کی دنیا میں یہ حقیقت متفقہ طور پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ یہی فرار و گریز عظیم تخلیقات کو عالم وجود میں لاتا ہے۔ اس تجزیے کے باوصف جب کبھی فن کار کی شخصیت اور فن کا تضاد ظاہر ہوتا ہے تو ہماری نگاہ میں فن کی وقعت اگرچہ باقی رہتی ہے لیکن فن کار کی اہمیت ضرور کم ہو جاتی ہے ـــ

مرزا کے باب میں اس قسم کے احتمال کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی محقق یا نقاد ان کی شخصیت اور فن میں تضاد محسوس کرے یہ اس لیے کہ وہ اپنی بشریت اور احساس بشریت کو کسی حال میں بھی فراموش نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی شعراء اور فنکاروں کے عام انداز فکر کے متضاد وہ انتہائی جرأت کے ساتھ اپنی خامیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ ایک فارسی شعر میں اپنی بشریت کا اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام ‏ ‏ آشکارا دم ز عصیاں می زنم

سعدی نے بھی چند مقامات پر ایسی ہی جرأت کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

گر کند میل بہ خوباں دلِ من خردہ مگیر ‏ ‏ کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند
ہیچ کس بے دامنِ تر نیست اما دیگراں ‏ ‏ باز می پوشند و ما در آفتاب افگندہ ایم

لیکن اہل نظر غور فرمائیں۔ مرزا کا اعتراف ان کی افتاد طبیعت کا برملا اظہار ہے۔ برخلاف اس کے سعدی اظہار خطا میں جرأت تو کرتے ہیں لیکن دوسروں کو بھی خطاوار ٹھہراتے ہیں اور سخن کے پردے میں اپنی برأت کی صفائی پیش کرتے ہیں۔

مرزا نے دوسرے مقامات پر بھی اپنی کمزوریوں کا اعتراف کیا ہے۔ وہاں بھی ان کو جو کچھ عیب نظر آتے ہیں اپنی ہی ذات میں نظر آتے ہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ عام انسانوں کی حالت ان ہی جیسی ہو۔ مرزا کے انداز فکر میں یہ جرأت اس سبب سے ہے کہ وہ استنباطِ نتائج اور تجزیہ میں کسی قسم کے التباس کو روا نہیں رکھتے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شخصیت میں اس تصنع اور تضاد کا قطعی فقدان تھا جو مسائل زندگی کو حقیقت کے بجائے معمہ بنا دیتے ہیں۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد ‏ ‏ پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ‏ ‏ یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
تماشائے گلشن تمنائے چیدن ‏ ‏ بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم
ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال ‏ ‏ حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

کہا جا سکتا ہے کہ مرزا نے اپنے اردو فارسی کلام میں جن جذبات و کیفیات کا اظہار کیا ہے ان میں بڑی حد تک تخالف و تضاد پایا جاتا ہے۔ اور کیا یہ تضاد اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ مرزا کی ذہنی اور نفسی کیفیتوں میں وہ اعتدال و توازن کارفرما نہیں تھا جس سے ایک مثالی شخصیت کے تار و پود بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے مندرجہ ذیل اشعار میں ایک طرف انسانی عظمت منتہائے کمال پر متمکن نظر آتی ہے تو دوسری جانب انتہائی پستی کے احساسات کا ترشح ہوتا ہے ؎

پہلی مثال

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے — عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

بہ وادئی کہ دراں خضر را عصا خفت ست — بہ سینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفت ست

در گرم روی سایہ و سرچشمہ نجوییم — با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخئ فرشتہ ہماری جناب میں

بسکہ مشکل ہے ہر ایک کام کا آساں ہونا — آدمی کو میسر نہیں انساں ہونا

دوسری مثال

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی — اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے جو پاسباں کے لئے

دان گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب — یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

اسدؔ خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے — کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

یہ اعتراض کافی اہم ہے اور جدید تنقید کے اصولوں کی روشنی میں تفصیل سے وضاحت کا محتاج ہے۔ اس لئے کہ نہ صرف مرزا کے معاملے میں اس قسم کی غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے بلکہ دنیا کے اکثر مشاہیر شعراء جو جاذب توجہ شخصیت کے حامل ہیں اس ظن و تخمین کا شکار ہو سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شخصیت و کردار کی پیمائش کا فن بھی سائنسی علوم کی مانند ایک نازک فن ہے۔ اور جس طرح ذرا سی غفلت و بے توجہی سے کوئی کیمیائی تجزیہ اور طبعیاتی مشاہدہ بے سود ہو کر رہ جاتا ہے اسی طرح شخصیت کی تنقید کے سنجیدہ اور متوازن اصولوں سے بے احتیاطی غیر مفید تجزیہ کا باعث ہوتی ہے۔ اس قسم کی تنقید جو غیر متوازن اصولوں پر مبنی ہو ناقد کے ذہنی میلانات کی تسکین کا ذریعہ تو بن سکتی ہے لیکن خود تنقید کے فن کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اور تنقید نگار سے جس علمی و ادبی خدمات سرانجام دینے کی توقع کی جاتی ہے اس کا تکمیل پانا محال ہو جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ شخصیت کی پیمائش کا فن اگرچہ سائنسی علوم کی طرح نازک اور لطیف ضرور ہے لیکن یہ کوئی سائنسی تجزیہ نہیں ہے جس میں مادوں کے خواص اپنی حالتوں سے سرمو تجاوز نہیں کرتے اور ان سے وہی نتائج برآمد ہوتے ہیں جو ان کی ساخت اور تخلیق میں ودیعت ہو چکے ہیں۔ برخلاف اس کے شخصیت کی تنقید قطعی طور پر ایک

ذہنی و وجدانی عمل ہے جس کے نتائج بہت کچھ پاسبانِ عقل سے نہار ہ کر سمجھے اور پرکھے جاتے ہیں۔

اس موضوع پر پروفیسر آل احمد سرور نے جس رائے کا اظہار کیا ہے اس کا اعادہ نامناسب نہ ہوگا۔

"کسی شاعر کی شخصیت کا مطالعہ اس کے کلام سے کرنے کے لئے ماہرِ نفسیات ہونا کافی نہیں۔ شاعری کے آداب سے واقف ہونا ضروری ہے۔ نفسیات کا علم ہمیں شخصیت کی خصوصیات سے آگاہ کرتا ہے۔ اس کی نوعیت بتاتا ہے۔ اس کے میلان یا جھکاؤ سے واقف کرتا ہے۔ مگر شاعری جس طرح شخصیت کو ظاہر کرتی ہے وہ اس کا اپنا طریقہ ہے۔ یہ ایک طلسمی دنیا ہے جس میں کہیں بہت تیز روشنی اور کہیں بہت گہری تاریکی ہے۔ یہاں آوازیں حقیقی نہیں، ملی جلی ہیں۔ ہر آواز شاعر کی نہیں ہے اور کوئی آواز شاعر کی لے سے محروم نہیں ہے۔ شاعر کی آواز میں بھی بہت سی پچھلی آوازوں کی گونج ہے" [1]

آگے چل کر تحریر کرتے ہیں

"اس لئے شاعری میں شخصیت کا مطالعہ خاصا دلچسپ اور مفید مگر مشکل کام ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے شاعر کی آواز سے مانوس ہونے کی ضرورت ہے۔ شاعر کی فضا سے آشنا ہونا۔ شاعر سے ذہنی ہمدردی پیدا کرنا تحسین کے فرائض سے عہدہ برآ ہونا شاعری کی اپنی حقیقت اور اس کے اپنے قواعد کا جاننا ضروری ہے" [2]

اس لحاظ سے کسی شاعر کے کلام سے اس کی شخصیت کو جانچنے کے لئے وہ بندھے ٹکے اصول کام میں نہیں لائے جاسکتے جو ریاضی اور اقلیدس کے مسائل کو حل کرنے میں مستعمل ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ شاعر جہاں اپنی ذہنی حالت اور مزاج کا ترجمان ہوتا ہے وہیں دوسروں کی ذہنی افتاد کو اپنی ذات سے متعلق بھی کرلیتا ہے۔ ایسی صورت میں شخصیت کی پیمائش کرنے والے پر حزم و احتیاط سے کام لینا زیر تجزیہ شخصیت کے لئے بھی مفید ہوتا ہے اور ان کے لئے بھی جن سے شخصیت متعارف کی جارہی ہے۔

شخصیت کی پیمائش کے سلسلے میں جو اصول پیش کئے گئے ہیں ان کی روشنی میں بہ آسانی کہا جاسکتا ہے کہ صفحات مذکورہ میں جو پہلی مثال اشعار کی سامنے آئی ہے۔ اس سے مرزا صاحب کے شخصی اور ذہنی میلانات مترشح ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ اندازِ فکر ان کے کلام اور خطوط میں نصاحیات کی مانند رواں دواں ہے۔ ان کے ہاں اس قسم کے خیالات و رجحانات کی کثرت ہے۔ اشعار کی دوسری مثال اپنے عہد کی خوش باش اور خوش فکر طبقے کے میلانات کی نمائندہ ہے جن کو مرزا صاحب نے اپنی ذات سے متعلق کرلیا ہے۔ ایسے موقع پر مرزا صاحب تو کیا کسی بھی ثقہ اور متدین بزرگ کے ہاتھ پاؤں پھول سکتے ہیں۔ اور گالیوں کا جواب بھی وہی دعائیں ہونگی جو صرف دربان ہوجائیں۔ اس مقام پر بھی مرزا صاحب نے ظاہری حالات و نتائج سے گریز کرنے کی بجائے حقیقتِ نفس الامری کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ یہ حقیقت طرازی اور واقعیت پسندی اس وقت ممکن ہے جب شخصیت طلسماتی دنیا سے عالمِ ارض کی جانب صعود کرتی ہے۔ لیکن

ہر کس نہ شناسندۂ راز ست وگرنہ　　　اینہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام است

---

[1] شاعری میں شخصیت علی گڑھ میگزین شمارہ (۱) ۱۹۵۹ء [2] ایضاً

غالب نے ایک جگہ کہا ہے کہ ؎

رازدانِ خوئے دہرم کردہ اند   خندہ بر دانا و ناداں می زنم

لیکن ان کی حقیقت پسندی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ "دانا و ناداں" کو دیکھ کر زیر لب تبسم کرتے ہیں۔ اپنے آپ پر بھی قہقہہ لگا کر ہنستے ہیں۔ اس تمسخر و تضحیک میں ایک عظمت اور ایک عالی ہمتی ہے۔ ہماری آپ کی دنیا میں ایسے عالی حوصلہ افراد بہت کم نظر آتے ہیں جو اپنی ذات اور اپنے نفس کا محاسبہ بھی کرتے ہیں۔ ورنہ انسانوں کا عام گروہ دوسروں کی عیب جوئی اور اس کے اظہار میں ہمیشہ سے دلیر رہا ہے۔ اگرچہ یہ طریق فکر پراگندگیٔ نفس اور انتشار ذہنی کی علامت ہے۔ لیکن ہم اس سے اکثر ان بدیہات سے چشم پوشی اور اغماض کر جاتے ہیں غالب جہاں اہل دنیا کے غلطیہائے مضامین کی بات کرتے ہیں خود کو بھی نہیں بخشتے۔

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ   آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ   شرم تم کو مگر نہیں آتی

ہرزہ مشتاب و پئے جادہ شناساں بردار   اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

ان کے خطوط میں اپنی ذات پر تبصرہ کی لے اور شدید ہو گئی ہے۔ اس لے کی شدت کبھی کبھی ان کو "طریق ملامتیہ" کی حدود میں لے جاتی ہے۔ قربان علی بیگ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں   رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں

یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں آج دور دور تک میرا جواب نہیں لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا کافر مرا۔ ہم ازراہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو مرنے کے بعد جنت آرام گاہ و عرش نشین خطاب دیتے ہیں چونکہ یہ اپنے آپ کو شہنشاہ قلمرو سخن جانتا تھا، "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے، "آیئے نجم الدولہ بہادر" ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ" ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے میں ان سے پوچھ رہا ہوں، اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب! آپ سلجوقی و افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے کچھ تو بولو کچھ تو اکسو" بولے کیا بے حیا، بے غیرت کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام۔ قرض لیے جاتا تھا یہ بھی سوچا تھا کہ کہاں سے دوں گا" [1]

کہتے ہیں کہ ہنسی کی انتہائی آواز آہ و گریہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس خط میں مرزا صاحب خود پر ایسے بے تحاشہ ہنسے ہیں کہ قہقہہ گریہ ہو گیا ہے۔ شاید اسی حقیقت نے ان سے یہ شعر کہلوایا ہے۔

---

[1] خطوط غالب مولانا مہر ص۱۱۱

گریہ را دل نشاطِ دیگر است　　　خندہ بر لب ہائے خنداں می زنم

حقیقت یہ ہے کہ اہلِ بصیرت اس کارگہِ حیات میں ہر واقعہ اور افتاد سے باخبر اور نگراں گذرتے ہیں۔ کائنات ان کی نگاہ میں کفِ دست کی مانند کھلی ہوئی اور عیاں ہوتی ہے۔ وہ ہر شے کا مطالعہ دانش و بینش کی روشنی میں کرتے ہیں۔ اور استنباطِ نتائج میں کبھی دھوکا نہیں کھاتے۔ ان کی آنکھیں ماضی، حال اور مستقبل کو بیک وقت رقصاں و درخشاں دیکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نظریات و تصورات انسانی بصیرت و سعی کی حد تک بیگانۂ صداقت نہیں ہوتے۔ اسی صداقت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مرزا صاحب نے کہا ہے ؎

راہ زیں دیدہ وراں پرس کہ در گرم روی　　　جادہ چوں نبض تپاں در رگِ صحرا بینند

ان کی شخصیت کا ایک عظیم اور توانا پہلو یہی ہے کہ رگِ صحرا میں جادہ کو نبض تپاں کی مانند دیکھنا ہے۔ انھوں نے مسائلِ حیات کو انسانی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے اور اس کے حل کرنے کی جد و جہد کی ہے۔ یہ سعی و جہد ان کی پوری زندگی میں کارفرما نظر آتی ہے ؎

خونِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل　　　تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی

یہ آشفتگیٔ جنوں حقیقت طراز بھی ہے اور حقیقت نما بھی۔ مگر جب افراد اس قربانی سے گریز اور اغماض کرتے ہیں تو انھیں محرومی و ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

غلام بسم اللہ بسمل بریلوی

غزل برنگِ غالب

شب جو فوارۂ اشک سے گردوں کفِ سیلاب تھا　　　حلقۂ چشم کو اک حلقۂ گرداب تھا
واں حنابندی اعضا گیرِ خرامِ ناز تھی　　　یاں تنِ کاہیدہ غرقِ اشکِ خونِ ناب تھا
واں رخِ پر نور، صبحِ امیدِ زندگی　　　یاں ہر اک داغِ جگر خورشیدِ عالمتاب تھا
حسنِ تمکیں آزما کو پاسِ خودداری ادھر　　　خانہ زادِ عشق کو ملحوظ یاں آداب تھا
ان کو پاسِ ننگ دامن گیر مجھ کو پاسِ وضع　　　وہ ادھر بیتاب تھے اور میں ادھر بیتاب تھا
ہو گیا بیساختہ لیلیٰ آج سرگرمِ سخن　　　ایک مدت سے نوا سنجی کو دل بیتاب تھا

میں نے دیکھا رات بسمل کو پڑا تھا خاک پر
بستر سنجاب تھا نے بالشِ کمخواب تھا

کلیم زیدی ایم۔اے

غالب کی فلسفیانہ شاعری

شہرت عام و بقائے دوام سے ہر شخص بہرہ اندوز نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو علم و فضل اور کمال و ہنر کے اعتبار سے وحید العصر و فرید الدہر ہونے کے باوصف گوشہ یاس و گمنامی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے اور آج کوئی ان کی شکستہ قبروں کی نشاندہی کرنے والا بھی نہیں لیکن اس کے برعکس ایسی مثالیں بھی بکثرت ملتی ہیں کہ وہ لوگ جو نہ کسی شعبۂ علم میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور نہ انہیں کسی خاص فن میں مہارت تامہ حاصل تھی بخت و اتفاق یا ابنائے روزگار کی مردم ناشناسی و سفلہ پروری کے باعث اعزاز و شہرت کے آسمان پر آفتاب و مہتاب بنکر جلوہ گر ہوئے اور کچھ مدت کے لئے دنیا کی نگاہوں کو خیرہ کر گئے بقول حافظ ؎

فلک بہ مردمِ سفلہ دہد زمامِ مراد　　　تو اہلِ دانش و فضلی ہمیں گناہ بس است

اور اقبال کہتے ہیں

لب گردوں سفلہ و دوں پرور است　　　وائے بر مردے کہ صاحب جوہر است

لیکن جیسا کہ ظاہر ہے کہ اس قسم کی پادر ہوا کامرانی دیرپا نہیں ہوا کرتی۔ جب اہلِ تحقیق کی نگاہیں انکی تخلیقات کا جائزہ لیتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جس انبارِ گراں کو گنج شائیگاں خیال کیا جاتا تھا اس میں بجز جھوٹے موتیوں اور زخارف کے کچھ بھی نہ تھا۔

مرزا غالب اگرچہ گمنامی و کس مپرسی کے عالم میں تو راہئی ملک عدم نہیں ہوئے، شہرت و مقبولیت نے زندگی ہی میں انکی قدمبوسی شروع کر دی تھی۔ خلعت و انعام اور صلہ و وظیفہ کا سلسلہ تا دم آخر جاری رہا لیکن بقولِ مالی مرحوم "یہ تمام قدردانی زیادہ سے زیادہ اس پیرزال کی سی قدردانی تھی جو ایک سوت کی انٹی لے کر یوسف کی خریداری کو منہ کے۔

بازار میں آئی تھی " یادگار غالب ص)

مرزا چونکہ حد سے زیادہ خود نگر، خود شناس اور انفرادیت پسند تھے۔ انہیں اپنے فن و کمال پر نہ صرف ناز تھا بلکہ وہ اپنے آپ کو یگانۂ روزگار خیال کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ بانگ دہل پکار اٹھے ؎

آج مجھ سا نہیں زمانے میں شاعر نغز گو و خوش گفتار

نیاز فتحپوری "نگار" کے غالب نمبر میں فرماتے ہیں "کمال کے ساتھ احساسِ خودی ضروری ہے لیکن بعض کا یہ انا ظاہر نہیں ہوتا اور بعض کا زبان تک آجاتا ہے۔ فارسی شعراء میں عرفی اور غالب دونوں میں یہ انانیت پائی جاتی تھی اور اتنی شدید کہ دونوں نے کھلم کھلا اس کا اظہار کیا۔ اور بار بار کیا۔ عرفی نے تو حد کر دی تھ

من کیستم آں سالک کونین مسیرم
کز بخت جوہر قدس ست خمیرم

لیکن غالب بھی کچھ اس سے پیچھے نہیں رہے بلکہ اسی خیال کو ایک دوسرے زاویہ سے ظاہر کیا ؎

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

یہاں لفظ "کچھ" قابل غور ہے۔ یعنی روح القدس سے بھی جو داد ملتی ہے وہ بھی "کچھ" کی حد سے آگے نہیں بڑھتی۔ یہی سبب ہے کہ اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ یہاں تک کہہ گئے ؎

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ "
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

انھیں اس امر کا شدت سے احساس تھا کہ لوگ ان کے کلام کی وہ قدر و منزلت نہیں کرتے جس کا وہ مستحق ہے۔ چنانچہ "مہر نیمروز" میں ایک موقع پر بہادر شاہ ظفر کی طرف خطاب کر کے کہا ہے کہ شاہجہاں کے عہد میں کلیم شاعر سیم و زر میں تولا گیا تھا مگر میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی ایک دفعہ کلیمؔ کے کلام کے ساتھ تول لیا جائے۔ (یادگار غالب ص) بنا بریں جب احساسِ ناقدری شدید تر ہوا تو اس قسم کے اشعار زبان تک آئے بغیر نہ رہ سکے ؎

دراں دیار کہ گوہر خریدن آئین نیست دکاں کشادہ ام و قیمت گہر گویم
بہ کلبۂ کہ ز مہر شب چراغ خس پوش ست سخن ز تیرگی طالع ہنر گویم

مع بلا ہیمہ انھیں اس امر کا بھی یقین تھا کہ اگر زندگی میں نہیں تو مرنے کے بعد ان کو وہ شہرت و عزت ضرور نصیب ہو گی جس کے وہ تمام عمر متمنی رہے ؎

کوکبِ من در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

چنانچہ انھیں وہ لازوال شہرت و عزت اور قدر و منزلت نصیب ہوئی کہ باید و شاید۔ لیکن اس قدر و منزلت کے جہاں اور متعدد وجوہ ہیں وہیں ان کا فلسفیانہ انداز بیان بھی ہے۔

غالب کے فلسفیانہ کلام کے متعلق جہاں تک ہماری معلومات ہیں حالی نے کچھ نہیں لکھا۔ انھوں نے یادگار غالب کے دوسرے حصہ میں عاشقانہ، تصوف آمیز، شوخی و شکایت پر مبنی، نگوں طالعی سے متعلق، رندانہ اور شکوۂ چرخ وغیرہ کے بارے میں اشعار کا انتخاب اور ان پر اظہار رائے کیا ہے لیکن ناقدین مابعد نے فلسفۂ کلام غالب پر کھل کر تبصرہ کیا ہے حتیٰ کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے "فلسفۂ کلام غالب" کے نام سے ایک کتاب ہی تصنیف کر دی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنی کتاب غزل اور مطالعۂ غزل میں لکھا ہے "غالب اردو کے پہلے فلسفی شاعر ہیں"۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں "جب مرزا نے اپنے ذہن کو اپنی دلی کیفیات اور حیات انسانی کی کشمکش بیان کرنے کے لئے استعمال کیا تو ان کے کلام میں فلسفیانہ خیالات کثرت سے آ گئے لیکن ان کا مقصد کسی خاص فلسفہ کی ترجمانی نہیں تھا محض دل پر گزری ہوئی کیفیتوں کا اظہار مقصود تھا۔" (حکیم فرزانہ ص)

پروفیسر یوسف سلیم چشتی خصوصیات کلام غالب پر تبصرے کے دوران فرماتے ہیں "بارھویں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اردو غزل کو فلسفیانہ مضامین سے روشناس کیا ان سے پہلے غزل میں تصوف تو موجود تھا مگر فلسفہ طرازی نہ تھی۔" (شرح دیوان غالب ص)

پروفیسر موصوف کتاب مذکورہ میں ایک دوسرے مقام پر رقمطراز ہیں "ہم قبل ازیں واضح کر چکے ہیں کہ غالب شاعر فلسفی نہیں تھے بلکہ فلسفی شاعر تھے یعنی انھوں نے بیدل یا اقبال کی طرح کوئی فلسفیانہ نظام اپنی شاعری کے ذریعہ سے دنیا کو نہیں دیا بلکہ فلسفہ کے بعض حقائق یا نکات اپنے کلام میں نظم کئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قدرت نے انھیں فلسفیانہ دماغ عطا کیا تھا" (شرح دیوان غالب ص)

رفیع الدین بلخی مرحوم "تجزیۂ کلام غالب" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔ "پھر اس کی مانگ بھی کم نہیں ہے کہ انیسویں صدی کی میسری کے عظیم ترین اور مقبول ترین فلسفی شاعر غالب کے امتیازی زاویۂ نگاہ کا شرح و بسط کے ساتھ تجزیہ کیا جائے" اور غالب کو عام طور پر فلسفی کہا جاتا ہے۔ بعض نقادوں، خصوصاً غیر معمولی ذہین و طباع جوان مرگ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا تو یہ خیال ہے کہ سقراط، افلاطون اور ارسطو سے لے کر کانٹ، برگساں وغیرہ وغیرہ کے جتنے بھی مایۂ ناز نظریئے تھے وہ سب کے سب سمٹ کر غالب کے دیوان میں آ گئے اور جس حسن و خوبی کے ساتھ غالب نے قلمبند کئے ہیں یا جس موثر انداز سے ان کا اظہار کیا ہے وہ ان فلسفیوں کو بھی حاصل نہ تھا۔" (تجزیۂ کلام غالب ص)

خود بجنوری مرحوم کی یہ رائے تھی "غالب اور گوئٹے (Goethe) دونوں کی ہستی انسانی تصور کی آخری حدود کا پتہ دیتی ہے شاعری کا دونوں پر خاتمہ ہو گیا ہے۔ عتیق اور جدید خیالات، حقیقت اور مجاز، قدرت اور حیات کی کثرت ان کے دماغوں میں وحدت میں منتقل ہو کر وجود پاتی ہے۔ دونوں اقلیم سخن کے شہنشاہ ہیں، تہذیب، تمدن، تعلیم، تربیت

نطرت، کوئی، زندگی کا ایسا پہلو نہیں جس پر دونوں کا اثر نہ پڑا ہو" (محاسن کلام غالب ص۹) اور غالب ایک فلسفی ہے جو
شاعری کا جامہ زیب تن کئے ہوتے ہے،، (محاسن کلام غالب ص۴۶)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم فرماتے ہیں "غالب کی ایک امتیازی خصوصیت جس نے اسکو اہل علم میں ہر دلعزیز بنایا اس کا حکیمانہ انداز تفکر ہے۔ وہ فلسفی نہیں لیکن فلسفیانہ شاعر ہے اس کے اکثر اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فلسفہ اور تصوف کے مسائل سے پوری طرح آگاہ ہے وہ نہ فلسفی ہے اور نہ صوفی لیکن فلسفیانہ اور صوفیانہ افکار سے لذت حاصل کرتا اور دوسروں کو حسنِ بیان سے لذت بخشتا ہے۔ عملاً وہ صوفی نہیں بلکہ عام معنی میں مذہبی شخص بھی نہیں لیکن حقیقی مذہبیت کا احترام کرتا ہے اور شاعرانہ اور حکیمانہ انداز میں تصوف کے زاویۂ نگاہ کو درست رکھتا ہے،، (افکار غالب ص۲۲)

ڈاکٹر موصوف دوسری جگہ رقمطراز ہیں "یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ غالب کا کوئی خاص فلسفہ بھی تھا۔ ہاں یہ دیکھ سکتے ہیں کہ کس قسم کے فلسفیانہ افکار کا اس کے کلام میں غلبہ نظر آتا ہے۔ اس نے خود کوئی خاص فلسفہ پیدا نہیں کیا البتہ جو فلسفیانہ نظریات دنیا میں موجود تھے اور جن سے وہ آشنا تھا ان میں توحید وجودی یا وحدت وجود کا فلسفہ اس کو اس قدر قرین قیاس اور دلنشیں معلوم ہوتا ہے کہ اردو اور فارسی کلام میں اس نے ایک رنگ کے مضمون کو سو ڈھنگ سے باندھا ہے" (افکار غالب ص۲۷)

علاوہ ازیں بعض دوسرے نقادوں اور انشارپردازوں نے بھی فلسفۂ کلام غالب پر دلچسپ تبصرہ کیا ہے جس سے ہم بخوفِ طوالت صرفِ نظر کرتے ہوئے اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

"فلسفہ یونانی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی تلاشِ حق ہیں۔ فلاسفر جویائے حق کو کہتے ہیں۔ ہر تلاش اور جستجو کا لازمی عنصر یہ ہے کہ متلاشی نئے نئے راستوں پر چلتے، نئے نئے مقامات طے کرے" (تجزیہ کلام غالب ص۱۸۲)

فلسفہ و فلسفی کی محولہ بالا تعریف کی روشنی میں اب بطور "مشتے نمونہ از خروارے" غالب کے کچھ ایسے اشعار مع تبصرہ و تشریح ملاحظہ فرمایئے۔ جو فلسفیانہ مضامین سے ہم آہنگ ہیں۔ ان کا یہ شعر سرِ مطلع دیوان ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اس شعر کو جہاں تک راقم الحروف کو معلوم ہے طبا طبائی کے علاوہ تمام قابلِ ذکر شارحین نے بامعنی بتایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر نہ صرف بامعنی بلکہ غالب کی شوخیِ فکر اور فلسفۂ ہستی کا آئینہ دار ہے۔ غالب کے نزدیک "ہستی اگرچہ مثلِ نقش دیرا اعتبار محض ہو (اشیائے کائنات کی ہستی اگرچہ اعتباری ہو) موجب رنج و آزار ہے" (خط بنام عبدالرزاق شاکر گورکھپوری)

کون نہیں جانتا کہ ہستی مورد رنج و بلا ہے۔ فنا ہر مولود کا مقسوم ازلی ہے اور سلسلۂ غم از مہد تا لحد جاری رہتا ہے لیکن اس کے باوجود ہر شخص ہستی کو عزیز رکھتا ہے اور ہر فانی کے دل میں بقائے حیات کی خواہش موجزن ہے۔

پروفیسر سلیم چشتی اس بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں "غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس شعر میں غالب نے اپنا نظریۂ حیات پیش کر دیا ہے کہ ہستی خواہ اعتباری (غیر حقیقی) ہی کیوں نہ ہو بہر حال موجبِ آزار ہے۔" (شرح دیوانِ غالب ص۲۳۶)

اس فلسفۂ حیات کی تائید میں اشعار ذیل بھی پیش کئے جا سکتے ہیں ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

زندگی اپنی جب اس طور سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت
می‌تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

ہر ذی ہوش جانتا ہے کہ یہ دنیا از خود عدم سے وجود میں نہیں آگئی اس کی پیدا کرنے والی ایک ایسی ذات ہے جو خالق ہونے کے ساتھ ہی قادرِ مطلق بھی ہے۔ نقش سے نقاش کے وجود کا سراغ ملتا ہے اور مصنوعِ ہستیِ صانع کی شہادت دیتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ظاہر بین اور کوتاہ اندیش مسلمات و بدیہیات کو سمجھنے سے بھی قاصر رہتے ہیں۔ یہ نکتۂ عجیب کہ ہر شے مظہرِ ذاتِ الٰہی ہے اور ہر ممکن الوجود واجب الوجود کی ہستی کی گواہی دے رہا ہے لیکن اس کے باوجود بھی اگر کوئی ادراکِ حقیقت سے قاصر ہے تو قصور اس کے فہم کا ہے، زبانِ غالب سے شعر کی صورت میں اس طرح ظاہر ہوتا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

غالب کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یگانہ دیکھتا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسری ہستی حقیقی طور پر موجود نہیں ہے اس لئے کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا۔ ہاں! اس کے سوا کوئی حقیقتاً موجود ہوتا تو وہ (اللہ تعالیٰ) دکھائی دے سکتا تھا۔ ؎

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

اس شعر کی تشریح میں پروفیسر سلیم چشتی فرماتے ہیں "اگر کائنات میں کسی غیر کا وجود ہوتا تو وہ غیر اللہ سے کہیں نہ کہیں دوچار ہو جاتا یا اللہ اس غیر سے کہیں نہ کہیں دوچار ہو جاتا مگر جب اس کے سوا کوئی موجود ہی نہیں تو اسے کون دیکھ سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ دیکھنے کے لئے ناظر اور منظور دو ہستیوں کا ہونا شرط ہے لیکن اس کے سوا دوسرا تو موجود ہی نہیں ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ بنیادی تصور اثباتِ وحدۃ الوجود۔" (شرح دیوانِ غالب ص۳۲)

یہاں یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس شعر کے باب میں رفیع الدین ہاشمی پروفیسر صاحب موصوف سے کلیتہً اختلاف کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ شعر مذکورہ میں غالب نے وحدۃ الشہود کا اعلان کیا ہے چنانچہ رقمطراز ہیں "جو کوئی

بھی وحدۃ الوجود کا قائل ہو یہ نہیں کہہ سکتا کہ" اسے کون دیکھ سکتا" وحدۃ الوجود کے ماننے والوں کے پاس تو "ہمہ اوست" ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ " اسے " کس کی طرف اشارہ ہے اور پھر دیکھنے والا کون ہے، وہاں تو نہ کوئی شاہد ہے نہ شہود اور نہ مشاہدہ " (تجزیۂ کلام غالب ص۱۹۱)

الغرض تمام فلسفۂ تصوّف، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی بحث و تشریح پر مشتمل ہے اور غالب نے اس پر نظم و نثر دونوں میں اظہار خیال کیا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں" غالب کی مقبولیت کا باعث ان کا تصوف نہیں ہے بلکہ ان کے نفسیاتی حقائق ہیں۔ وہ نہ فلسفی تھے نہ صوفی۔ ان کی طبیعت فلسفیانہ مضامین کی طرف ایک کلیاتی نظر کی وجہ سے مائل تھی اور تصوف سے دلچسپی بھی اسی ذیل میں آتی ہے" (نئے اور پرانے چراغ ص۱۹)

شیخ محمد اکرام کا خیال ہے" نفی اور اثبات کی کشمکش کا مستقل فلسفیانہ حل، مرزا نے وحدۃ الوجود میں تلاش کیا یعنی لاموجود الا اللہ اور لاموثر فی الوجود الا اللہ" (حکیم فرزانہ ص۱۶۵) خود غالب کہتے ہیں، خود اس تماشا گاہ کی سیر سے، جسے دنیا کہتے ہیں جی بھر گیا ہے اور عالم نیرنگی کا مشتاق ہوں لا الٰہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ و لا موثر فی الوجود الا اللہ " (خط بنام قاضی عبدالجمیل بریلوی)۔ " مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب اور ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لاموجود الا اللہ اور لاموثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں " (خط بنام علاؤ الدین احمد خاں)

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب جیسے رند شاہد باز و بادہ خوار نے اپنے کلام کو تصوّف کی چاشنی سے مملو کیوں کیا۔؟ " اس کا سبب ایک تو یہ تھا کہ غالب نے بیدل کا بغائر مطالعہ کیا تھا اور کلام بیدل کی اس خصوصیت نے کہ کوئی اسے سمجھ پائے نہ سمجھے اس کا اثر قبول کر لیتا ہے، غالب کو بھی کافی متاثر کیا تھا، دوسرا سبب یہ تھا کہ غالب کے زمانے میں تصوف کا نام تھا صرف چند مخصوص الہیاتی نظریوں کا جن میں " وحدۃ الوجود " کو خاص فلسفیانہ اہمیت حاصل تھی اس لئے غالب کو اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی کیونکہ وہ فلسفیانہ دل و دماغ لے کر آیا تھا اور اس طرح اس کا ذوق دقت آفرینی اور دشوار نگاری بھی پورا ہو جاتا تھا " (سالنامہ نگار جنوری سنہ ۶۱ ص۵۹)

مولانا شبلی نعمانی فرماتے ہیں" گو مسئلہ وحدۃ الوجود کی اصل حقیقت کچھ ہو لیکن صورۃً وہ سراپا حیرت ہے اور شاعری کی یہی چیز بنیاد ہے۔ ہر چیز جو دل پر تعجب کا اثر پیدا کرتی ہے، حقیقی شعر ہے، فضائے بیز محدود، بحر بیکراں، سیلاب ہائے خیر متناہی، گلہائے چمن، امواج دریا، سب مجسم شعر ہیں اور اس بنا پر وحدت وجود کا مسئلہ سرتا پا شاعری ہے (شعر العجم ص۱۲۴)

فراق گورکھپوری لکھتے ہیں کہ" انسان کی عظمت کا شعور، عرفان نفس اور کائنات کے روحانی پہلو کا احساس یہ تمام باتیں غزل میں تصوف ہی کے نکاؤ سے آتی ہیں (نگار مئی ۱۹۳۶ء)

مولانا حالی کا ارشاد ہے" مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا

اصل اصول اور رکنِ رکین جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بظاہر اہلِ حال نہ تھے مگر جیسا کہ کہا گیا ہے من احبّ شیئاً اکثر ذکرہٗ توحید وجودی ان کی شاعری کا عنصر بن گئی تھی اس مضمون کو انھوں نے جس قدر اصنافِ سخن میں بیان کیا ہے غالباً نظیری اور بیدل کے بعد کسی نے نہیں بیان کیا مرزا کے حق میں اگر کچھ نہیں تو عرفی کا یہ شعر ضرور صادق آتا ہے ؎

امید ہست کہ بیگانگیٔ عرفی را
بہ دوستیٔ سخن ہائے آشنا بخشید (یادگارِ غالب)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں "وحدت وجود کے مسائل اس بصیرت اور لذت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ کائنات اس سے وجد میں آجائے اور فرشتے گوش بر آواز ہو جائیں۔ تصوف میں ایسی بصیرت کا اظہار کرتا ہے کہ منصور کا ثانی معلوم ہوتا ہے اور کسی جگہ اپنے مقابلے میں منصور کو بھی تنگ ظرف قرار دیتا ہے اس کا دل و دماغ انسانی نفسیات کا محشرستان ہے اور اس کا یہ مصرعہ اس کی اپنی فطرت کا آئینہ ہے ؎

قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد (افکارِ غالب ص ۲۶)

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کہتے ہیں "غالب وحدۃ الوجود کے قائل ہیں وہ خدا کو ماسوا سے علیحدہ نہیں خیال کرتے بلکہ ان کا مذہب ہمہ اوست ہے۔ فلسفہ میں کوئی سوال اس سے زیادہ مشکل نہیں کہ دنیا کی آفرینش کس وجہ سے ہوئی۔ غالب اس کا جواب دیتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

اس شعر پر رفیع الدین بلخی کا تبصرہ بھی ملاحظہ کیجیے "غالب کے لئے یہ ناممکن تھا کہ جہاں اس نے اتنے مابعد الطبیعاتی مسائل پر نہ صرف غور ہی کیا ہو بلکہ ان کو شاعرانہ اسلوب بیان میں نظم بھی کر دیا ہو وہ اس بڑے سوال کو نظر انداز کر دے آخر دنیا کیوں بنی۔ وہ کونسی شے تھی جس نے خالق کو مجبور کیا کہ وہ تخلیق کرے؟ اس مسئلہ میں غالب کا خیال ہے کہ خدا نے عالم کی تخلیق صرف اپنی خود نمائی اور خود بینی کی خاطر کی ہے۔ اگر خدا خود بیں اور خود نما نہ ہوتا تو نہ دنیا کی تخلیق ہوتی اور نہ یہ عالم جلوہ گاہ ہوتا ؎"

دہر جز . . . . (تجزیۂ کلامِ غالب ص ۱۹۳)

المختصر غالب نے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے فلسفہ کو آرائشِ کلام کے لئے اپنے اکثر اشعار میں ظاہر کیا ہے جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں ؎

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر — ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل — کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر ۔۔۔ یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ۔۔۔ ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود ۔۔۔ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے ۔۔۔ پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود ۔۔۔ قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

جادب بلیار کہ این شرک فی الوجود ۔۔۔ با گرد فرش سینہ بالیوان برابر است
ذات حق ست واحد و ہستی ست عین ذات ۔۔۔ بزم جہان ز مجمع اعیان برابر است

توی فتادہ چو نسبت ادب مجو غالب ۔۔۔ ندیدہ کہ سوئے قبلہ پشت محراب ست
ز وہم نقش خیالے کشیدہ در نظر ۔۔۔ وجود خلق چو عنقا بدہر نایاب ست

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بشمار دلبری ۔۔۔ در دل سنگ بنگرد رقص بتان آزری
اے کہ در ایچ ذرہ راجز برہ نوردے نیست ۔۔۔ در طلبت توان گرفت بادیہ را بہ رہبری

کفر و دیں چیست بجز آلائش پندار وجود ۔۔۔ پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دین تو شود
کو فنا تا ہمہ آلائش پندار برد ۔۔۔ از صور جلوہ و از آئینہ زنگار برد

تصوف کے علاوہ دیگر فلسفیانہ مضامین سے بھی غالب کو غیر معمولی دلچسپی تھی جس کا اظہار انھوں نے اپنے مختلف اشعار میں کیا ہے مثلاً تقاضائے دانشمندی یہ ہے کہ انسان کسی کا شرمندۂ احسان نہ ہو کیونکہ احسان اٹھانا پست ہمتی کے مترادف ہے غالب کہتے ہیں ؎

ہنگامۂ زبونی ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

انسانی طبیعت کا قاعدہ ہے کہ جب کسی شخص پر متواتر و مسلسل رنج و غم کا نزول ہوتا ہے تو وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے حتیٰ کہ ناگفتہ بہ مصائب و آلام بھی اسے آسان معلوم ہونے لگتے ہیں۔ غالب نے اس فطرت انسانی کی کس قدر صحیح تصویر کشی کی ہے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

"تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ" مشہور ہے۔ جو مقسوم میں لکھا ہے وہ بہرحال پورا ہو کر رہتا ہے اور حوادث عالم مشیت ایزدی کے تابع ہیں۔ اس لئے ایک شخص کو دوسرے کی تباہی و بربادی کا کاملاً ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا ؎

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ ۔۔۔ اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

اگرچہ تمام بنی آدم انسان ہیں لیکن انسانیت کے مرتبۂ کمال تک پہنچنا یعنی اخلاقِ حسنہ و اوصافِ حمیدہ سے متصف ہونا بیحد مشکل ہے ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

حالی کہتے ہیں ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

عارف رومی کا ارشاد ہے ؎

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر   کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

انسان متضاد صفات سے متصف ہے۔ عشق بھی کرتا ہے جس کا لازمی نتیجہ رسوائی و بدنامی اور خاتمۂ حیات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے لیکن اسے عزت و آبرو اور زندگی بھی عزیز ہے جس سے عشق کو ازلی دشمنی ہے ؎

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

اس عالمِ رنگ و بو کی تمام دلکشی و جاذبیت عشق کی مرہونِ منت ہے اگر عشق نہ ہوتا تو یہ نگارخانۂ رنگینی ہرگز درخورِ اعتنا نہ ہوتا ؎

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

مولانا روم فرماتے ہیں ؎

دورِ گردوں را ز فیضِ عشق داں   گر نبودے عشق بفسردے جہاں

نشۂ عشق کے بغیر زندگی بے کیف رہتی ہے حقیقی لطفِ حیات اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب کوئی شخص پیمانۂ عشق کی مئے مردافگن سے سرشار ہو جاتا ہے ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا   درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

ظہوری نے کہا ہے ؎

شد طبیعت با محبت نقش بر جانِ ما   محنتِ ما، راحتِ ما، دردِ ما، درمانِ ما

انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت دشوار گزار مراحل طے کرنے پڑتے ہیں بغیر اس کے آئینۂ دل مجلی نہیں ہوتا ؎

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

انسان کی ہمت کے بقدر تائیدِ غیبی شاملِ حال ہوتی ہے ؎

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے ۔۔۔ آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

ایک اہم نفسیاتی نکتہ ہے کہ جب انسان گوشۂ عزلت میں راحت گزیں ہوتا ہے تو تنہائی اس سے کوسوں دور ہو جاتی ہے یعنی تصورات و خیالات کا جم غفیر اسکی خلوت کو جلوت میں بدل دیتا ہے ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

فاعل حقیقی یا متصرف فی الامور بنیادی طور پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات ہے لیکن یہ اسرارِ مشیت سے ناواقف اور کوتاہ بین انسان اس دنیائے رنگ و بو کی دل کشی کو اپنے حسنِ تدبیر کا نتیجہ خیال کرتا ہے ؎

غافل بوہمِ نازِ خود آرا ہے ورنہ یاں ۔۔۔ بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

اقبال کہتے ہیں ؎

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو ۔۔۔ کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنابندی

لطافت اپنے ظہور کے لئے کثافت کی محتاج ہے۔ یعنی مجرّد، مادہ کی آمیزش کے بغیر جلوہ گر نہیں ہو سکتا ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

اس شعر پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم فرماتے ہیں۔ جمالِ الٰہی اگر بہ تقاضائے حسن وجود چاہتا ہے تو وجود مادی کیوں اختیار کرتا ہے اس کا جواب مرزا غالب کے سوا آج تک دنیا کے کسی فلسفی نے نہیں دیا اور وہ جواب یہ ہے۔ ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی ۔۔۔ (محاسنِ کلام غالب ص ۵۲)

ڈاکٹر شوکت سبزواری رقمطراز ہیں "کائنات کی کثیف اشیاء آئینہ فطرت کے لئے قلعی کا کام دے رہی ہیں۔ آئینہ پر جب تک قلعی نہ کی جائے، اس وقت تک اس میں پوری طرح انعکاس نہیں ہوتا۔ ہر انعکاس کے لئے ایک کثافت کا بطور پس منظر ہونا ضروری ہے۔ آسمان کی شعاعیں فضائے آسمانی میں تیرتی ہوئی نظر نہیں آتیں، جبتک زمین یا اور کسی کثیف جسم پر پڑکر مستنیر نہ ہوں۔ لطافت اور کثافت کا یہی امتزاج، وجودِ مطلق (ذاتِ حق) کی جلوہ فروزی کے لئے ضروری ہے،،

(فلسفۂ کلام غالب ص ۴۲)

پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں۔ غالب نے اس شعر میں ایسا کلیہ بیان کیا ہے جو اس کائنات کے ہر شعبے میں کارفرما ہے۔ مثلاً بوئے گل ایک لطیف شے ہے اس لئے وہ اوراقِ گل کے واسطے سے اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ روح بھی بواسطہ جسم انسانی کارفرما ہے اسی طرح مطلق بھی مقیّد کے لباس میں ظاہر ہوتا ہے۔ خلاصۂ کلام اینکہ تعرف الاشیاء باضدادھا "

(شرح دیوانِ غالب ص ۳۹۵)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں "یہ کمال درجہ کا حکیمانہ شعر ہے اس میں ایک اصول بیان کیا گیا ہے جو حیات و کائنات کے تمام شعبوں پر حاوی ہے" (افکار غالب ص ۱۵۲)

یہ کائنات اپنی تمام رنگینی و رعنائی کے باوجود ہنوز منتہائے کمال کو نہیں پہنچی۔ حسن لم یزل نئی نئی صورتوں میں جلوہ گر ہو رہا ہے ؎

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

بجنوری مرحوم یہ کہکر کہ غالب نے بھی مسئلہ ارتقا کو پہچانا ہے، فرماتے ہیں "زمانۂ جدید کا سب سے بڑا فلسفی برگسان (Bergson) اسکو جانتا ہے اور کہتا ہے کہ حیات جو تمام عالم میں جاری و ساری ہے بالذات آمادۂ ارتقا ہے۔ دنیا برابر تکمیل پا رہی ہے اور منتظر ہے۔ مرزا غالب نے اس بات کو کس نزاکت سے کہا ہے ؎

آرائشِ جمال . . . .

اقبال کہتے ہیں ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکوں

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں، غالب کہتا ہے یہ نہیں کہ دنیا کو خلاقِ حسن آفریں نے ایک مرتبہ پیدا کر دیا اور جو جمال اس میں رکھنا تھا رکھ دیا۔ وہ کہتا ہے کہ حسن آفرینی کی خلاقی کا عمل مسلسل جاری ہے۔ سارا عالم کل یوم ھو فی شان کی تفسیر ہے۔ حسین لوگ دوسروں کی نظر کے سامنے سنگار نہیں کرتے۔ فطرت کی حسن کاری کا بھی یہی انداز ہے۔ زمین کے پردۂ خاک ہی کو لیجئے جو حسن لا متناہی اس میں مضمر ہے اور جو گل و لالہ اور حسین شکلوں میں مسلسل عدم سے وجود میں آتا رہتا ہے اس کی گل کاری کا سامان زیرِ نقابِ خاک ہی تیار ہوتا رہتا ہے" (افکارِ غالب ص ۱۸۹) اس ضمن میں اقبال کا ایک فارسی شعر بھی خوب ہے ؎

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک ست

یہ دنیا یکسر فریب، شعبدۂ وہم و گماں اور ناقابلِ اعتبار ہے ؎

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے
شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں
نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

زندگی کا لطف اور اس کی تمام سرگرمیاں مرگِ مفاجات کے اندیشے کی بنا پر ہیں ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

انسان جو مسلک بھی اختیار کرے اس پر مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے عمل پیرا رہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

خارجی مظاہر اور نفسیاتی کیفیات کا بڑا گہرا تعلق ہے اور بزم ہستی کی اساس واحد ہے ؎

وہی اک چیز ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

عشقِ مجازی کی صورت میں وصلِ حبیب زوالِ شوق کا باعث ہوتا ہے لیکن عشقِ حقیقی کی کیفیت اس کے برعکس ہے۔ اس میں فنا فی اللہ ہو کر باقی باللہ ہو جاتا ہے جہاں زوالِ شوق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ؎

گزرے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

ڈاکٹر سبزواری لکھتے ہیں، "اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم یہ سمجھو کہ وصل کی حالت میں جذبۂ شوق سرد پڑ جاتا ہے تو یہ غلط ہے۔ شوق کا زوال تو بڑی بات ہے اس میں کمی تک نہیں ہوتی۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ موجیں، دریا سے ہم آغوشی کے باوجود برابر ہاتھ پاؤں مارتی رہتی ہیں جو دراصل ان کے اضطراب و شوقِ وصال کی ایک کھلی ہوئی علامت ہے وہ وصل ہی کیا جو باعثِ زوالِ شوق ہو۔ (فلسفۂ کلامِ غالب ص۱۶۸) اسی مضمون کو غالب نے فارسی میں یوں ادا کیا ہے ؎

بلبل بہ چمن بنگر و پروانہ بہ محفل
شوق ست کہ در وصل ہم آرام ندارد

معرفتِ نفس اور عرفانِ حقیقت کے لئے صفاتِ رذیلہ فنا کر کے اخلاقِ فاضلہ پیدا کرنا ناگزیر ہے ؎

فنا کو سونپ اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اس ضمن میں شیخ علی ہجویری کا ارشاد قابلِ مطالعہ ہے۔ "نفی (فنا) سے صفاتِ مذمومۂ بشری کی نفی مراد ہے۔ سالک کو چاہئے کہ نفیِ صفاتِ مذمومہ کرتا رہے اور ان کی جگہ (اتباعِ شریعت کی بدولت) صفاتِ محمودہ (صفاتِ حق تعالیٰ) پیدا کرتا رہے۔ (کشف المحجوب ص۲۹۶)

یہ نکتہ فلسفۂ اخلاق اور مذہب دونوں میں مسلّم ہے کہ اعتدال و میانہ روی کی زندگی قابلِ تحسین ہوتی ہے۔ افراط

یا تفریط کسی معاملے میں ہو موجب رسوائی و پریشانی ہے ؎

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے، اتنے ہی کم ہوئے

تعمیر ہی میں اسبابِ تخریب پوشیدہ ہوتے ہیں ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اس شعر کی تشریح میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی رقمطراز ہیں "غالب نے اس شعر میں فلسفے کا وہ نکتہ نظم کیا ہے جس پر مشہور جرمنی فلسفی ہیگل نے اپنے نظامِ فکر کی بنیاد رکھی ہے وہ کہتا ہے کہ ہر اثبات میں اس کی نفی مضمر ہے۔ یعنی بقا اور فنا، تعمیر اور تخریب یا زندگی اور موت، متضاد حقائق نہیں بلکہ ایک حقیقت کی دو شانیں ہیں" (شرح دیوان غالب ص۲۷۵)

بجنوری مرحوم فرماتے ہیں "مرزا غالب کا فلسفۂ حیات ابن رشد سے مشابہ ہے۔ اندلسی فلسفی نے بیان کیا ہے کہ مادہ ہمیشہ ہیولیٰ کا محتاج ہوتا ہے بے صورت مادہ کا تصور ناممکن ہے۔ ہیولیٰ ارواح کی طرح مادہ سے صورت آشنا ہونے کے لئے پریشان علیحدہ تصور میں نہیں پھرتے بلکہ مادے سے یک جان ہیں مادہ چونکہ ساتل ہے مادہ کے جزو حیات ہونے سے کثافت اور خرابی عالم اجسام میں راہ پاتی ہے۔" (محاسن کلام غالب ص۶)

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم کہتے ہیں، غالب اور ہیگل کا وجدان معاشی دنیا میں خوفناک ثبوت مہیا کر رہا ہے لیکن یہ فلسفہ صرف معاشیات ہی تک صحیح نہیں بلکہ نفسیات، روحانیات، تہذیب و تمدن اور وجود کے ہر شعبے پر قابل اطلاق معلوم ہوتا ہے۔ دیکھئے دلی کی زوال پذیر تہذیب میں پیدا ہونے والا شاعر حکیم کیسی دور رس بصیرت اور کیا حقیقت رس وجدان پیش کر گیا ہے۔" (افکار غالب ص۹۷)

نعمت خان عالی نے اس نکتے کو یوں بیان کیا ہے ؎

دارد نفسم آمد و شد بہر کشتن
ہر لحظہ کمن می کشد ایں تیغ دو دم را

از مولوی سید رفیع الدین بلخی
ایڈووکیٹ پٹنہ

غالب کی شاعرانہ مقبولیت و عظمت[1]

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

طلبائے تاریخ جانتے ہیں کہ ہر انقلاب سے قبل ملک کے افق پر ایک مفکر یا ادیب نمودار ہوتا ہے اور دوران انقلاب یا بعد میں کوئی شمشیر زن مدبر اہتمام و انتظام ملک میں سرگرم نظر آتا ہے۔ اس کلیہ سے فکر کا عمل پر تفوق ہی ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک تاریخی ضرورت بھی معلوم ہوتی ہے۔

یونان کے اس عظیم الشان ہنگامی دور سے پہلے جب وہاں کی جمہوریتیں یعنی اسپارٹا، اتھنس اور تھیبس وغیرہ ایک دوسرے سے طریق حکومت میں انقلاب لانے کے لئے زور آزمائی کر رہی تھیں۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے مفکر ملک کو نئے نظریئے اور نئے خیالات بخش رہے تھے اور اسی دوران میں یا بعد میں منطقی نتیجے کے طور پر فلپ اور اسکندر اعظم رونما ہوئے۔ امریکہ کی جنگ آزادی کا سبب نہ سہی تو بیشتر دوسرے پین جیسا فلسفی تھا جس کے بعد اس کے خیمہ بردار جارج واشنگٹن کا نام بھی اسی کلیہ کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ انقلاب فرانس میں والٹیر اور روسو نے حریت، اور اخوت و مساوات کے سبق پڑھائے اور نپولین نے ملک گیری کے جھنڈے نصب کئے۔ اسی طرح روس کے خونیں انقلاب کے سلسلے میں ٹالسٹائے اور میکسم گورکی کا لینن کے ساتھ وہی رابطہ ہے۔

ٹھیک اسی طرح یہ ادعا غلط نہ ہوگا کہ عظمت و ہمہ گیری کے لحاظ سے نہ سہی بہ لحاظ نوعیت یقیناً میرزا اسد اللہ خاں غالب

---

[1] آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی مطبوعہ کتاب "تجزیۂ کلام غالب" سے ماخوذ

اور سرسید احمد خاں کو بھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے وہی نسبت ہے جو یونان، امریکہ فرانس اور روس کے ادیبوں اور مدبروں کو اپنے اپنے ملک کے انقلاب سے تھی۔

عظمت و ہمہ گیری کے لحاظ سے مرزا غالب کا مقابلہ ارسطو، ٹومس پین، روسو اور ٹالسٹائی وغیرہ کے ساتھ کرنا غلط ہوگا۔ اس لئے کہ مدبروں کی عظمت کا انحصار انقلاب کی عظمت پر ہے، اور انقلاب کی عظمت خود اسی مناسبت سے ہوا کرتی ہے جتنی اسکے ادیبوں میں پائی جاتی ہے۔ اس زنجیر کی آخری کڑی یعنی ادیب کی عظمت کا دارومدار قوموں کی خلقی عظمت اور جبلی بڑائی پر ہوا کرتی ہے۔ غرض یہ کہ جس حد تک خود قوموں کی جبلی عظمت ہوگی اسی مناسبت سے اس کے مفکرین انقلاب اور سیاستداں بلند اور عالی مرتبہ ہوں گے مگر یہ واقعہ ہے کہ مسلمان انیسویں صدی کے وسط میں جس پستی میں گر گئے تھے اس سے یہ امید ہرگز نہ ہوسکتی تھی کہ ہمارے ہاں غالب سے زیادہ بڑا مفکر پیدا ہوسکے۔

غالب کی شاعرانہ اور مفکرانہ مقبولیت و عظمت کے سبھی قائل ہیں خواہ وہ عظمت کسی بھی درجہ کی ہو۔ اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ اس امر کے باوجود کہ غالب کو مرے تقریباً سو سال ہوچکے آج بھی اس کے کلام اور فلسفہ کی بیش از بیش اشاعت ہو رہی ہے اب سوال یہ ہے کہ غالب کی مقبولیت و عظمت کے کیا اسباب تھے اور بڑے شاعروں میں اس کا درجہ خود اس کے ملک کے لوگوں کے سامنے کیا تھا نیز دوسرے ممالک کے شاعروں میں اس کی جگہ کہاں ہے اور کتنی اونچی ہے؟

مقبولیت کا سبب
یا
عظمت کی وجہ؟

کسی چیز کا سبب یا وجہ کیا دریافت کیجئے؟ انسانی فطرت کی محدود نگاہی کو کیا کہئے؟ اس حیرت آباد میں جہاں ہر ماہیت ایک معمّہ ہے جس کی ہر چیز ایک نگارخانۂ چین ہے کسی نقش کی حقیقت کیا پوچھئے۔

سیب پکا اور گرا۔ اس کے گرنے کا سبب کیا تھا؟ کیا یہ سیب اس وجہ سے گرا کہ زمین میں کشش ثقل موجود ہے؟ کیا یہ سیب اس وجہ سے گرا کہ اس کے وہ ریشے جو اس کو سنبھالے ہوئے تھے آفتاب کی تمازت سے سوکھ کر کمزور ہوگئے تھے؟ کیا یہ سیب اس وجہ سے گرا کہ ہوا کے جھونکے تیز تھے اور اس کا صدمہ اس سے برداشت نہ ہوسکا؟ کیا یہ اس وجہ سے گرا کہ فطرت کو اس کی نسل زمین پر قائم رکھنی تھی؟ کیا یہ سیب اس وجہ سے گرا کہ کوئی غریب، یتیم اور کا سماج کی غیر منصفانہ تقسیم دولت کا مارا، بھوکا اس درخت کے نیچے کھڑا تھا اور اس کی بقائے حیات کے لئے اس کی شکم پری کو فطرت نے اپنا فرض سمجھا — ؟

ان میں سے کوئی ایک سبب تھا؟ یا دو تین اسباب مل کر ایک سبب بنا تھا۔ یا یہ ان میں سے کوئی بھی سبب نہ تھا۔

موجودہ معیار مقبولیت

جب ایسے بیّن اور صاف مشاہدات کے متعلق جن کو ہم، آپ بلکہ ساری دنیا روزانہ دیکھا کرتی ہے۔ اتفاق رائے نہیں ہوسکتا۔ تو پھر کیا کہا جائے کہ شاعرانہ مقبولیت و عظمت کے کیا اسباب

ہو سکتے ہیں ؟

دنیا کے کسی ادیب، مفکر یا شاعر کی مقبولیت و عظمت کے راز یا اسباب تنقید نگاروں نے اب تک جو بتلائے ہیں کہ ادیب اور شاعر کو انسانی فطرت کا غائر مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اور اسے نفسیات انسانی پر کافی عبور ہونا چاہیئے۔ زیادہ ہمہ گیری جیسی ان امور میں اس کو حاصل ہوگی اتنا ہی زیادہ اس کا رتبہ ہوگا۔ دوسری خوبی، جو لوگ کسی ادیب یا شاعر میں ڈھونڈھتے ہیں اور جس کی بنا پر اس کو بڑا ادیب یا شاعر کہا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ شاعر کو مشاہدات عالم، حقیقت رسی یا حقیقت نگاری کا بھی خاصا سلیقہ ہو۔ پھر تیسری چیز جو کسی شاعر یا ادیب کی عظمت کا سبب ہوا کرتی ہے۔ وہ اس کی اختراع اور جدت اور مضامین میں شگفتگی پیدا کرنا ہے۔ چوتھی خوبی اس کے طرز بیان کی دل آویزی یا جاذبیت ہے۔ بالفاظ دیگر اس کے جذبات ارفع —— خیالات بلند اور عنوان نگارش دلپسند ہوں۔ غرض یہ کہ ان ہی یا ان ہی جیسی چیزوں کو اب تک تنقید نگاروں نے کسی شاعر کی عظمت کو جانچنے کا معیار سمجھا ہے۔ بلاشبہ یہ سب خوبیاں آج کل کے طریقۂ تنقید کے لحاظ سے بھی کسی شاعر یا ادیب کی عظمت کے لئے جزو لاینفک ہیں لیکن انہیں مقبولیت کے اسباب نہیں کہا جا سکتا۔ اسباب مقبولیت کچھ اور ہیں اور اگرچہ ان تمام اوصاف کے باوجود بہت سے ادیب اور شاعر مقبول نہ ہوئے اور بغیر ان اوصاف کے بھی بہتوں نے عرف عام میں مقبولیت حاصل کر لی۔

چند مثالیں سقراط میں یقیناً یہ تمام خوبیاں پہلے ہی موجود تھیں اور اس وقت بھی جبکہ لوگوں نے اس ہفتاد سالہ بوڑھے کو زہر کا پیالہ اس جرم میں پلا کر اس دنیا سے رخصت کیا کہ وہ فطرت انسانی کا نکتہ رس کیوں ہے؟ اس کے مشاہدات حقیقت پر کیوں مبنی ہیں؟ اور وہ حقیقت طرازی سے کیوں کام لیتا ہے؟ لیکن اس وقت اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سقراط کا "مکالمہ" دنیا کے بہترین ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔

اسی حقیقت کی تاریخ ذرا رنگ بدل کر پیرس میں یوں دہرائی گئی کہ والٹر کی تصانیف سڑکوں پر جلائی گئیں۔ اس کے کتب فروشوں کو بیسٹائل کا قید خانہ دیکھنا پڑا اور خود والیٹر کو فرانس کی سرحد سے نکل کر جلا وطنی اختیار کرنی پڑی۔ حالانکہ ادیب کی تصانیف میں جو خوبیاں ہونی چاہیئے تھیں وہ والیٹر کی تصانیف میں اس وقت موجود تھیں جب یہ سب کچھ اس کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔

عمر خیام[1] کی رباعیات جس طور پر وہ لکھی گئی تھیں اگرچہ جوں کی توں موجود نہیں لیکن پھر بھی تقریباً سات سو سال تک وہ خود ایران میں غبار نسیاں میں اٹی پڑی رہیں۔ آخر انھیں اتنے دنوں تک کیوں بھلائے رکھا گیا؟

عظیم المیہ نگار "یوری پائڈس" (۴۸۰ - ۴۰۶ ق م) کے نام سے پوری دنیائے ادب واقف ہے اس کو سب سے بڑا

---

[1] چہار مقالہ میں جو اس کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ بحیثیت شاعر نہیں بلکہ ماہر علم نجوم اور ریاضی داں کی حیثیت سے ہے۔

ڈرامہ نویس تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کی سوانح حیات کا یہ واقعہ بھی سب پر روشن ہے کہ اپنی اس خوبی کی وجہ سے جس کے لئے آج وہ ممتاز سمجھا جاتا ہے، اپنی زندگی میں اس طرح مطعون تھا کہ کوچہ و بازار کے لڑکے اس کا مضحکہ اڑایا کرتے تھے۔ اس کی زندگی اس قدر دو بھر ہو گئی تھی کہ اس کو اپنا گھر بار چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور ایک عرصہ تک اس کے ڈراموں کا پڑھنا اور کھیلنا تو درکنار، رکھنا بھی گناہ تصور کیا جاتا تھا۔ لہذا اب ہمیں اسباب کا پتہ چلانا ہوگا کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر وہ اس وقت مقبول نہ ہوسکا اور آج اس کی عظمت تسلیم کی جا رہی ہے۔

ڈینٹے کی عظمت کو ن ماننے کے لئے تیار نہیں ہے لیکن جب اس کے ادبی اور شاعرانہ کارناموں کی زندگی ہمارے سامنے آتی ہے تو یہاں بھی وہی حالات رونما نظر آتے ہیں جو مندرجہ بالا لوگوں کے ساتھ پیش آئے تھے۔ وہ بھی دوسروں کے مانند ہر جگہ رسوا اور بے آبرو ہوتا رہا اور عرصۂ دراز تک اس کی عظمت کا پہچاننے والا غیر ملکوں میں تو درکنار خود اطالیہ میں موجود نہ تھا۔ اس کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک دن جب وہ سڑک پر گذر رہا تھا تو اس نے دو عورتوں کو باتیں کرتے سنا ...... پہلی عورت نے دوسری عورت سے پوچھا "بہن تم نے اس آدمی کو نہیں دیکھا جو جہنم سے ابھی ابھی واپس آ رہا ہے اور دنیا کو باشندگان دوزخ کے احوال سنا رہا ہے۔" دوسری عورت نے زیادہ کٹی جلی باتوں سے کام لیا اور اس کی تائید میں کہنے لگی۔ "ہاں ہاں جب ہی تو اس کی داڑھی یوں آگ میں جھلس گئی ہے۔" یہ تھی عظمت شناسی!

انگلستان کے مشہور شاعر کیٹس کی موت کا واحد سبب نہ سہی تو ایک بڑا سبب معاندانہ تنقید بھی تھی۔ اس طرح مسلمہ طریقۂ تنقید کے رو سے وہ کون سی خوبی تھی کہ جو یہاں موجود نہ تھی۔ لیکن اس کی عظمت کا اعتراف تو درکنار اس کا نام تک عوام اور خواص کے حلقوں میں روشناس نہیں۔

ان مثالوں کی داستان ان ہی چند شخصیتوں پر ختم نہیں ہوتی۔ ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان لوگوں میں وہ تمام خوبیاں جو دلیل عظمت و مقبولیت متصور ہوتی ہیں، بہ حد کمال موجود تھیں۔

سقراط، والیٹر اور عمر خیام وغیرہ کی مثالوں کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان سب میں فطرت انسانی کا مطالعہ، نفسیات کا تجزیہ، مشاہدات سے سبق آموزی، جدت طرازی، عبارت آرائی اور دل پذیری بدرجہ اتم موجود تھی۔ لیکن ان کے زمانے میں لوگوں نے ان کی عظمت نہ مانی۔ حالانکہ ایسی شخصیتیں بھی بہت سی گذری ہیں جن میں کوئی قابل ذکر وصف نہ تھا۔ پھر بھی دنیا نے ان کو عظمت کا مستحق تصور کر لیا۔ ممکن ہے آپ کہیں کہ لوگوں کا ماننا اور نہ ماننا وقتی تھا۔ اس وقت دیکھی کچھ دنوں کے بعد لوگوں نے ان کی خوبیوں کی بنا پر ان کی عظمت مان لی۔ لیکن جس طرح سو دو سو یا سات سو برس تک لوگوں نے ان کی خوبیوں اور عظمتوں کو نہیں پہچانا اسی طرح یہ بھی ممکن تھا کہ یہ مدت اتنی دراز ہو جاتی کہ لوگ ان کو قطعاً بھلا دیتے۔ اگر یہ خوبیاں اپنی جگہ پر واقعی خوبیاں تھیں جن کی بنا پر کسی ادیب یا شاعر کی عظمت لابدی اور مسلّم ہوتی ہے تو پھر ان کے زمانہ ہی میں کیوں نہ تسلیم کر لی گئی۔ کیا لوگوں کو ان کی عظمتیں تسلیم کرنے میں اس کا انتظار تھا کہ صاحب

تصنیف پہلے مرجائیں تو ان کے بعد ان کی خوبیوں اور عظمتوں کا اعتراف کیا جائے۔

آپ کہیں گے کہ یہ زمانہ کی ناقدر دانی تھی کہ لوگوں نے ان کی عظمت کو نہ پہچانا لیکن یہ زمانہ کی ناقدری کہہ کر یہ سوال ٹالا نہیں جا سکتا کیونکہ اس کے جواب میں بہت سی حقیقتیں پنہاں ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ناقدر دانوں کا اگر یہی عہد زیادہ دراز اور وسیع ہو جاتا تو ان عظمتوں کے مالک ہونے کے باوجود بھی سقراط، والیٹر اور عمر خیام کی عظمتوں سے ہمارا زمانہ یقیناً ناآشنا رہتا۔

مفقود کتابیں اسی سلسلے میں ایک سوال اور بھی پیدا ہوتا ہے کہ بعض اوقات کچھ ادیب کس لئے بے انتہا مقبول ہو جاتے ہیں اور ان کی تصانیف سینوں اور آنکھوں سے کیوں لگائی جاتی ہیں لیکن پھر کچھ عرصہ بعد انھیں قطعاً بھلا دیا جاتا ہے۔ مثلاً کتاب المرحومین، مصریوں کی وہ مقدس کتاب۔ جو ان کے مندروں میں اس عظمت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی کہ پجاریوں کے سوا اور کسی کو اس تک دسترس نہ تھی۔ بعد میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ بہت سی زبانوں میں اسکے قصے اور عقائد منتقل کرلئے گئے لیکن آج اس کے نام تک سے بھی بہت کم لوگ آشنا ہیں۔ یہی حال دنیا کے سب سے پرانے قصے "اندا" اور "امپا" کا تھا جس کی عظمت اسرائیلیوں نے بھی مان لی تھی مگر آج وہ گم نام ہے۔ اگر کتاب المرحومین میں کچھ خوبیاں ضرور تھیں جن کی بنا پر اس کی مقبولیت مسلّم تھی تو پھر نہ معلوم وہ خوبیاں آج تسلیم کیوں نہیں کی جاتیں؟ اسی طرح اور بھی کتابیں ہوں گی جن کے بارے میں ہم لوگ اتنا بھی نہ جان سکیں گے جتنا "امپا" یا کتاب المرحومین کے متعلق جانتے ہیں۔ ہاں ذرا اور انتظار کیجئے تو کچھ دنوں بعد امتداد زمانہ سے ممکن ہے کہ سقراط کے مکالمے، والیٹر کی کینڈڈ، دینٹے کی طربیۂ خداوندی وغیرہ بھی شاید بھلا دی جائیں۔

ہمارے سامنے دونوں مثالیں موجود ہیں۔ ایک وہ جس میں لوگوں نے مانی ہوئی عظمتوں کو بھلا دیا۔ یا بالفاظ دیگر ان کی عظمتوں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ دوسری سقراط، والیٹر اور عمر خیام کی وہ مثالیں بھی جن میں انکار کے بعد عظمتوں کا اعتراف کیا گیا ہے۔ عظمت کی تاریخ میں یہ الٹ پھیر کیوں ہوتا ہے۔

اسباب عظمت اگر ان تسلیم کردہ اوصاف کی بنا پر کسی شاعر یا ادیب کی عظمت اور مقبولیت نہیں ہوتی تو پھر کسی شاعر یا ادیب کی مقبولیت اور عظمت کے اسباب کیا ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ عظمت کا پہلا اور اصلی سبب مقبولیت ہے۔ آخر عظمت تو وہی ہے جس کا لوگ اقرار کریں۔ بغیر مانی ہوئی عظمتیں، حقیقتاً ایک ممکن الوقوع منطقی بحث اور محتاج تحقیق قیل وقال ہے۔ جس سے کوئی عملی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ آپ شاید کہیں گے کہ مقبولیت تو خود نتیجہ ہے عظمت کا۔ تو یہاں پھر اسباب وعلل کی تقدیم وتاخیر کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے جس پر آگے چل کر بحث کی جائے گی اور بتایا جائے گا کہ عظمت اور مقبولیت کے درمیان خود آپس میں کیا واسطہ ہے اور کس حد تک یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اور کون مقدم اور کون موخر ہے۔

ادب کا سماج میں رتبہ اور ادیب کی مقبولیت کا راز

انفرادی زندگی کا یہ مشاہدہ ہے، (جس کو ہر آدمی روزانہ دیکھتا ہے) کہ ہر شخص کی زندگی میں سب سے بڑا جذبہ اس کی بقائے ذات وحیات کا ہے۔ اس کا ہر فعل، خواہ وہ شعوری ہو یا غیر شعوری اسی جذبہ کے تحت ظہور میں آتا ہے، بالکل اسی طرح جب دنیا انفرادیت سے گزر کر بتدریج ایک جماعت اور سوسائٹی اور سماج کی شکل میں آگئی تو رہی جذبہ جو انفرادی زندگی میں اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کے لئے کارفرما ہو کر جماعت میں تھا، اب جماعتی زندگی کے احساس کے باعث شعوری اور غیر شعوری طور پر ہر فرد کا یہ فرض ہو گیا کہ جمعیت سوسائٹی اور سماج کی بقا اور حیات کے لئے بھی وہی کرے جو وہ اپنی ذات کی بقا کے لئے کرتا تھا۔ ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا کیونکہ ہر گام پر اس کو سوسائٹی اور سماج سے لاکھوں فائدے ہوا کرتے ہیں جو لازمی طور پر اس کی ذاتی حیات وبقا کے براہِ راست یا بالواسطہ سبب ہوتے ہیں جمعیت اور سوسائٹی کی بقا اور حیات سے خود اس کی ذاتی بقا اور حیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس طرح سوسائٹی کے تمام نظام، اداروں، خیالات اور جذبات کی عزت وقعت اور حیات کا احساس واحترام ہر فرد وبشر میں پیدا ہونے لگا۔ سوسائٹی کی بقا کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ چند مخصوص قوانین ماحول کے لحاظ سے عائد کئے جائیں، چنانچہ یہ طے کر لیا گیا کہ ادب اور شاعری میں بھی ایسے ہی خیالات ظاہر کئے جائیں جو سوسائٹی کے تمام اداروں، مسلّم عقیدوں، خیالوں اور جذبوں کے برقرار رکھنے میں مفید ثابت ہو سکیں۔ اس کے ساتھ ہی سماج کا یہ بھی فتویٰ ہوا کہ ہرگز کسی ایسے ادیب یا شاعر کو فروغ نہ ہو جس کی تحریریں مسلّم رواج اور سماجی نظام میں برہمی پیدا کر دیں۔ اس طرح رائے عامہ ایک مستقل اور مسلّم ادارہ انسٹی ٹیوشن، بن گئی سب سے بڑا کار ثواب رائے عامہ کا احترام اور سب سے بڑا گناہ رائے عامہ سے انحراف ہے سب سے بڑی مقبولیت اسی کو ہو سکتی ہے جو صرف رائے عامہ پر چلے اور اس کو سراہے بلکہ رائے عامہ کا وکیل اور مبلغ بن جائے اور اپنا اختراع اور اپج سے رائے عامہ کی تائید کے لئے نئی نئی دلیلیں، نئے نئے براہین، پیدا کرے۔ سب سے بڑا گناہ گار وہ ہے جو رائے عامہ کی خلاف ورزی کرے، اس کے خلاف تبلیغ کرے، اور مانی ہوئی باتوں کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کرے سماجی زندگی کو بحال وبرقرار رکھنے کے لئے یہ اصول بھی ضروری تھا۔ ان ہی جانے ہوئے خیالات کی بنا پر سماج کے سینکڑوں ادارے قائم تھے۔ جن سے نہ صرف جمعیت کو بلکہ ہر فرد کو لاکھوں فائدے ہوا کرتے تھے۔ وہ سماج کے تسلیم کردہ خیالات کو فی الفور کیونکر ترک کر سکتا تھا۔ غرض یہ کہ جس طرح ذاتی زندگی میں ایک انسان کسی دوسرے کی کوئی ایسی بات پسند نہیں کرتا جو خود اس کے جذبات، خیالات، عقائد اور مفاد سے متصادم ہو، بالکل اسی طرح کوئی جماعت کسی ایسے ادیب کی کسی ایسی تصنیف کو پسند نہیں کرتی جو عام جذبات، خیالات، عقائد اور مفاد کے برخلاف ہو۔ ہر دل عزیز وہی مقرر ہوگا جو سننے والوں کے دل کی بات کہے۔ مقبول وہی ادیب ہوتا ہے جو قوم کے جذبات وخیالات کی آئینہ داری کرے۔ جس طرح ہر فرد اپنا وہ ڈراما جو زندگی میں نہ کھیل سکا ادب یا شعر کے پردوں میں دیکھنا اور دکھلانا چاہتا ہے۔

اسی طرح ہر قوم اپنی سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، جمالیاتی تمنائیں۔ رزمیہ شاعری یا تاریخی ادب کی کہانیاں کہہ کر پوری کرتی ہے۔ آزاد ہوں یا قومیں اپنی چھپی تمناؤں اور اپنے بیم و رجا کی حکایتوں کو ادب یا شاعری میں نمایاں دیکھنا چاہتی ہیں کسی شاعر یا ادیب کی رفعتِ خیال، جدتِ مضامین، علو جذبات یا خوبی نگارش سے ذرہ برابر نہ ہمدردی ہوتی ہے اور نہ اس کے لئے کوئی جذبۂ احترام، اگر ادیب کی رفعت خیال۔ جدت مضامین اور طرز نگارش خود لوگوں کے مانے ہوئے اصول، جذبات یا مفاد کے خلاف ہوں۔

ادب اور شاعری کا سماج میں وہی مرتبہ ہے جو دربار شاہی میں مصاحب یا وزیر کا ہوا کرتا ہے۔ یعنی سب سے زیادہ مقبول وہی ادیب ہے جو وزیر ملک کی طرح سماج کے انتظام میں مصروف رہے اور مصاحبوں کی طرح اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہے۔ لیکن جس طرح ایک مدبّر کسی وزیر کی طرح معزز و وقیع نہیں ہوتا اسی طرح وہ ادیب یا شاعر جو مجرداً سماج کے نظریوں کی حمایت اور ہمنوائی پر اکتفا کرتا ہے، مقبول تو ہوتا ہے لیکن معزز اور وقیع نہیں ہوتا۔ وقیع اور قابل احترام تو وہی ادیب یا شاعر ہوتا ہے جو ادب یا سماج کی خدمت اس طرح کرے جس طرح لائق وزیر یا مدبر ملک کی خدمت کرتا ہے۔ مقبولیت کا اصل راز اپنے سماج اور ماحول کی بہترین ترجمانی ہے۔ کلام میں جس حد تک سماج کے جذبات، خیالات اور طرز بیان سے کام لیا جائے اسی قدر مقبول سمجھا جائے گا۔ مقبولیت کا اصلی راز بس اسی میں ہے کہ کوئی ادیب کسی حد تک اپنے سماج اور ماحول کی ترجمانی کر سکتا ہے اور اپنے کلام میں کس حد تک وہی جذبات وہی خیالات اور اسی طرح کا طرز بیان لا سکتا ہے جو اس وقت کا سماج چاہتا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ سماجی معتقدات خود سماج کے لئے واقعی مفید ہیں یا نہیں اور حقیقت پر مبنی ہیں یا نہیں۔

کسی شاعر و ادیب کی مقبولیت کی پیدائش، بلوغ، فروغ اور حیات اسی وقت تک رہتی ہے جب تک اس کے خیالات سماج کے نظریوں سے ہم آہنگ رہتے ہیں۔ اس کی موت اس وقت ہوتی ہے جب سماج کے نظریئے اور سماج کے عقائد و خیالات اس کے خیالات سے مختلف اور جداگانہ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کسی شاعر یا ادیب کی مقبولیت یا عدم مقبولیت کا انحصار ان سماجی خیالات، جذبات اور طرز تحریر پر ہے جن کی وہ ترجمانی کرتا ہے۔ شاعر اور ادیب کی زندگی ادب کی زندگی تک ہے اور خاص قسم کے ادب کی زندگی کا دائرہ سماج کے خیالات اور جذبات تک محدود رہتا ہے۔ عوام کے جذبات اور حسیات کی جتنی مدت ہوگی اتنی ہی یا اسی حد تک شاعر کی مقبولیت کی مدت بھی ہوگی۔ اب سوال یہ ہے کہ سماج کے خیالات یا جذبات خود کیونکر بدلتے ہیں؟ سماجی خیالات و جذبات خود بھی ایک فکری طریقۂ اظہار ہیں دماغ اور نفسیات کا دماغی اور نفسیاتی مظاہرے رد عمل ہوا کرتے ہیں۔ مادی ماحول کے، اور ماحول تابع ہیں، ذرائع پیداوار اور وسائل پیداوار کے۔ اسی طرح خیالات اور جذبات بھی ہمیشہ ذرائع پیداوار اور وسائل پیداوار سے متاثر ہوا کرتے ہیں چنانچہ جب کبھی سماج میں ذرائع یا وسائل پیداوار میں تبدیلی ہوئی تو خیالات اور جذبات میں بھی تغیر آیا۔ اور یہ تغیر شدہ خیالات

جذبات اس وقت تک قائم رہے جب تک کوئی دوسرا ذریعہ پیدا وار یا وسیلۂ پیدا وار یا طریقۂ پیدا وار عمل میں نہ لایا گیا بہ الفاظ دیگر مادّی پیداوار ذرائع اور وسائل کے پہلو بہ پہلو دماغی پیدا وار کے مظہر ادب، شاعری اور فلسفہ بھی متغیر و متبدل ہوتے رہتے ہیں۔

اس کلیہ کی تشریح چند مثالوں سے شاید زیادہ واضح ہو سکتی ہے۔ سقراط جن مضامین کو معرض بحث میں لایا جو طریقۂ استدلال اس نے اپنے مضامین میں پیش کیا وہ ایسا تھا جو بنیادی طور پر اس دور کے عقائد اور مسلمہ نظریوں کی بیخ کنی کر رہا تھا۔ اس لئے اس کو "مخرب الاخلاق" اور نوجوانوں کو گمراہ کرنے والا کہا گیا۔ اور یہ سب اس لئے کہ خود اس زمانے کے نظریۂ اخلاقیات سے اس کی تعلیم بالکل مختلف تھی۔ لیکن جب وہ سماج بدل گیا، اس سماج کے نظام اور رواج کے برتنے والے نہ رہے اور اس نظام اور رواج کے لئے کوئی احترام نہ رہا تو اس وقت پھر کسی کو کیا عذر ہو سکتا تھا۔ کہ سقراط کی عزت نہ کرے بلکہ اب تو اس کو اور بھی زیادہ وقعت اور عزت اس لئے ہونے لگی کہ اس نے ان گمراہیوں سے زمانہ کو نجات دلوائی۔ اسی طرح عمر خیام نے اپنی رباعیوں میں ایسے مضامین لکھے ہیں جو سراسر مادّیت کی تعلیم دے رہے تھے یعنی ہماری اور تمہاری دنیا بس ختم ہے اسی مادّے تک کمہار کی مٹی کی طرح ہم آب و گل سے ترکیب دیئے گئے اور شکلیں بدل بدل کر اسی آب و گل میں ملتے رہیں گے۔ جس کے صریحاً یہ معنی تھے کہ حشر و نشر، سزا و جزاء، خدا اور معاد وغیرہ کوئی چیز نہیں۔ ظاہر ہے کہ خیام کے وقت تک جو اسلامی عقائد تھے یہ تمام تعلیم اس کے برخلاف تھی۔ اسی لئے اسلامی سماج میں ان کا چرچا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن جب عمر خیام مادہ پرست یورپ میں پہنچا جہاں مادّیت کا زور تھا تو وہ نہایت مقبول ہوا۔ اور پھر شدہ شدہ انگریزی تمدن کے اثر سے جب اسلامی ممالک میں بھی مادیت اپنا اثر دکھانے لگی تو پھر اسلامی عقائد کی طرف سے بھی لوگوں کو نہ صرف ایک گونہ بے توجہی ہو گئی بلکہ اس سے ٹھٹھول میں کچھ لطف ہی آنے لگا۔ اب عمر خیام کے وہی اشعار جن پر کفر کا فتویٰ لگایا جا سکتا تھا لطف صحبت کے لئے برجستہ پڑھے اور لکھے جانے لگے۔

مصری، کلدانی، اشوری، وغیرہ وغیرہ ادب دنیا سے ناپید ہو گئے اور اب وہ صرف ادبی آثار خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ سماج، وہ ماحول جس میں وہ لکھے گئے تھے، اب نہ صرف ہم سے بہت دور ہو گئے، بلکہ ان کو ہم اب داستان پارینہ سمجھنے لگے ہیں۔ اس سلسلہ میں ٹالسٹائے کی مثال بھی کارآمد ہو گی۔ اس نے اپنی تحریروں میں روسی عہد اشرافیہ کی زندگی کا نمونہ پیش کیا اور خوب کیا۔ وہی عیش و عشرت کی زندگی وہی امراء کی ازدواجی زندگی کی خوش گواریاں یا تلخیاں، وہی عیسائی فلسفہ جو مسیحؑ نے ازدواجی زندگی کے متعلق پیش کیا تھا۔ غرضکہ تمام وہ چیزیں جو زراعتی زندگی کے اثر سے جاگیرداری نظام کی شکل اختیار کر چکی تھیں وہ سب کی سب بدرجہ اتم اس کے ادب میں نمایاں ہیں۔ ٹالسٹائے کی تحریروں اور خصوصاً "جنگ اور امن" نے عہد حاضر میں وہ کام کیا ہے جو مہابھارت نے ہندوستان میں ہومر کی ایلیڈ نے یونان میں کیا تھا۔ ان کتابوں میں اس دور کے تمام خیالات، جذبات اور رسومات کی نہ

صرف ترجمانی کی گئی ہے بلکہ ان چیزوں میں سے جس کو مستحسن سمجھا گیا اس کو خوب خوب سراہا گیا۔ اور اسے برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی۔ جن خیالات، جذبات اور رسومات کو زشت جانا ان کی بیخ کنی اور پوری شدت کے ساتھ مذمت کی گئی۔ بہ حیثیت ایک فن کار اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ٹالسٹائی کا فن ناول نگاری میں حرفِ آخر ہے۔ لیکن پھر بھی جب خود روس میں انقلاب آیا اور انقلاب کے ساتھ ساتھ ان کا تمام سماجی نظام بھی بدل گیا تو اس وقت ٹالسٹائی سے زیادہ مقبول ناول نویس میکسم گورکی اور دوسرے انقلابی ناول نگار ہوگئے اور جہاں تک مقبولیت کا تعلق ہے میکسم گورکی کو آج روس میں جو مقبولیت حاصل ہے وہ ٹالسٹائی کو نہیں، کیونکہ ہر ادب نہ صرف اپنے زمانہ کی ذہنی تاریخ کا آئینہ دار بلکہ ہر مقبول ادیب اپنے کچھ خیالات، جذبات یا رسومات کا دانستہ یا نادانستہ مبلغ بھی ہوتا ہے

ادیب کے جذبات اور تصوّرات

خود معیاری چیزیں بھی جو کسی شاعر کی عظمت یا مقبولیت کا سبب بتائی جاتی ہیں۔ یعنی جذبات کی رفعت، خیالات کی بلندی اور عنوانِ نگارش کی دلپذیری سماجی نظام کی تابع ہیں، انسانی خیالات و جذبات کچھ اٹل چیزیں نہیں۔ ایک مورخ نے جس نے انسانی خیالات و جذبات کی تاریخ پر نظر ڈالی ہو، یہ بات پوشیدہ نہیں کہ چیزیں خود بھی حالات سے متاثر ہوا کرتی ہیں۔ اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ جن خیالات، یا جذبات کو قدیم زمانہ میں ارفع و اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔ عہد وسطیٰ کے سماج میں ان کی کوئی جگہ باقی نہ رہی اور خود عہدِ وسطیٰ میں جو خیالات مقبول تھے اب ان کی وہ حیثیت باقی نہیں۔ جذبات خیالات اور عنوانِ نگارش کا معیار ہر زمانے میں علیحدہ اور جداگانہ رہا ہے۔ اور اس معیار سے ان کی مقبولیت کو برقرار رکھنا ممکن نہیں کیونکہ ان کا معیار ہمیشہ صرف اسی وجہ سے بدلتا ہی رہا کہ ماحول جس کی پیداوار یہ خصوصیات ہیں، خود تغیر پذیر ہے بہرحال یہ کہنا یقیناً غلط ہوگا کہ کسی شاعر کی عظمت کا راز خیالات کی بلندی اور جذبات کی رفعت پر ہے جس معیار سے پرانی کتابیں مثلاً وید، وغیرہ مقبول تھیں۔ اسی طرح جدید ترین مقبول اور قابلِ قدر کتابوں کو اگر ایسے لوگوں کے سامنے رکھ دیا جائے جن کا ذہنی پس منظر وہی ہو جو آج سے چار ہزار برس قبل کے لوگوں کا تھا تو وہ نہ تو ان جذبات کی رفعت۔ خیالات کی بلندی اور طرزِ نگارش کی دلپذیری سے ہم آہنگ ہوں گے اور ان کی لطافتوں سے آشنا۔ خیالات، جذبات اور طرزِ نگارش حقیقتاً ردِ عمل ہے۔ ماحول اور مادی حالتوں کا یہ ماحول کی اساسی نوعیت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے ایسا کوئی مصنف نہیں جو ہمیشہ یکساں مقبول رہا ہو۔ اور اسی سبب سے کوئی شاعر، ادیب یا مفکر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قبولیت یا عزت کا مستحق نہ رہ سکا جس عہد میں لوگ عناصر کی پوجا کرتے اور آفتاب، ماہتاب ستاروں، جنگل اور پہاڑوں کو ذی روح تصور کرتے تھے۔ اس وقت کی شاعری میں جن جن مقامات پر آفتاب کو ذی روح انسان تصور کرکے اس کی حمد و ثنا کی گئی ہے۔ آج وہ بیانات شاعری کی دنیا میں یادہ گوئی سمجھے جاتے ہیں۔ اب جو لوگ سر

سے روح ہی کے قائل نہیں یا کم سے کم عناصر میں روح نہیں پاتے تو ظاہر ہے کہ ان کو نہ تو ایسے جذبات اور خیالات کے ساتھ دلچسپی ہو سکتی ہے اور نہ وہ ان خیالات کو آج قبول کر سکتے ہیں۔

طرزِ نگارش بالکل اسی طرح طرزِ نگارش کی سوانح حیات بھی اسی امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں انقلاب کے تھپیڑے کھاتی رہی ہے۔ طرزِ تحریر کی لہریں بھی اسی کی بنا پر مختلف ہوتی رہی ہے۔ قومی جنگ کے زمانہ میں جس طرح کی طرزِ تحریر ادب میں درکار ہے یقیناً سکون کے دور میں مقبول نہ ہوگی پھر مادی حالات کے ساتھ ساتھ طرزِ تحریر میں بھی تغیر آتا ہے، مہابھارت اور ایلیڈ وغیرہ جیسی کتابوں میں بعید از فہم استعاروں اور مضحکہ انگیز مبالغوں کی بھی جگہ بالکل وہی ہے جو کسی قیمتی زیور میں نگینوں اور جواہرات کی ہوا کرتی ہے۔ آج وہی مبالغے بیش پا افتادہ ذرّاتِ سنگ کی طرح بے آبروئی کے ساتھ ٹھکرائے جا رہے ہیں۔

غزل صنفِ شاعری میں غزل کا بھی وہی حال ہوا۔ غزل کو لوگوں نے کبھی اس قدر سر چڑھا دیا تھا کہ غزل اور غزل گو شعرا کو پیغمبروں کی سی عظمت عطا کرنے میں باک نہ کیا ؎

در شعر سہ کس پیمبرانند ہر چند کہ "لا نبی بعدی"
ابیات و قصیدہ و غزل را فردوسی، و انوری، و سعدی

اور آج وہ ایسی بے آبروئی اور ذلت کی کیچڑ میں گھسیٹی جا رہی ہے کہ ایک جدید نقاد نے اس کو نیم وحشیانہ صنف شاعری قرار دیا ہے۔ یہ اعتراض غزل پر واقعات کے لحاظ سے یا مجرداً طریقۂ استدلال کی رو سے غالباً شک کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ لیکن اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں کہ غزل کو "نیم وحشیانہ" کہنا اس بات کا آئینہ دار ضرور ہے کہ لوگوں کو اس صنف سے توغل نہ رہا۔ آخر گفتگو میں ہمارا ہاتھ ہلانا، بدن کے دوسرے حصوں کو جنبش دینا بھی تو وحشیانہ وراثت کی دلیلیں ہیں۔ لیکن باوجود اس وراثت کے بھی ہم لوگ ہاتھوں کی جنبش سے وہ کام لیا ہی کرتے ہیں جو بڑے سے بڑا مقرر اپنی تمام فصاحت و بلاغت کے باوجود نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ہمارا قہقہہ خود بھی تو اس عہد کی یادگار ہے۔ جبکہ ہمارے مورث قابل فہم قوت گویائی سے محروم تھے لیکن آج تک باوجود تمام تمدنی ارتقا کے ہم لوگوں نے اپنی انتہائی مسرت کے اظہار کا کوئی دوسرا بہتر طریقہ ایجاد نہیں کیا۔ لہٰذا مجرداً وحشیانہ یا "نیم وحشیانہ" یادگاریں اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتیں کہ وہ بیکار ہی ہیں۔ بات یہ ہے کہ غزل جس ماحول میں پلی تھی اور جو اس کے گہوارے تھے وہ نہ رہے۔ اسی سبب سے آج وہ "نیم وحشیانہ" صنفِ شاعری کہلانے لگی۔ غزل اس جاگیردارانہ نظام کے تحت پروان چڑھی تھی جس میں ایک طبقہ بے فکری کے ساتھ دولت کا ایک اچھا بڑا حصہ ذہنی تعیش میں صرف کر سکتا تھا۔ زیادہ کد و کاوش کے بغیر منفرد شعروں سے جامعیت کا لطف اٹھا سکتا ہے اور تھوڑی مہلت میں زیادہ محظوظ ہو سکتا تھا کیونکہ ایک دو مصرعوں یا شعروں میں زیادہ سے زیادہ کیفیتیں سموئی جا سکتی ہیں، غزل

کے ہر شعر میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے کہ اس میں تفصیلات کا اجمال پایا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایران میں شیخ سعدی سے لیکر ہندوستان میں غالب تک اس کا چرچا رہا۔ جب وہ جاگیردارانہ سماج ختم ہوگیا تو یہ صنف شاعری یعنی غزل گوئی جو اسی جاگیردارانہ دور میں پلی تھی اپنی فطری موت مرگئی۔ آج ہمارے زمانہ میں نہ وہ فراغت ہے اور نہ وہ مجلس طرب، نہ وہ گل و بلبل کی حکایتیں ہیں نہ شمع و پروانہ کے سوز و گداز ہر شخص معاشیات کی الجھنوں میں یا تو مل اور فیکٹری کی گھڑگھڑاہٹ مشینوں کے شور و غوغا اور سیاسی نظریوں کی الٹ پھیر میں مبتلا ہے۔ یہی سبب ہے کہ لوگوں کو نئے حالات کے تحت اپنے خیالات بدلنے پڑے اور غزل گوئی کو مذموم سمجھنا پڑا۔ کیونکہ یہ وہی صنف تھی جو جاگیردارانہ نظام کی یاد تازہ کرادیتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ غزل گوئی کی طرف سے لوگوں کی بے رخی بھی بتدریج بڑھتی گئی۔

ان مثالوں کے بعد اس میں تو کلام نہیں کہ مقبولیت کا انحصار عوام کے خیالات اور جذبات کی ہم آہنگی پر ہے۔

عظمت کی وضاحت

مقبولیت اگر زیادہ وسیع دائرہ اختیار کرلیتی ہے یا بالفاظ دیگر کوئی شاعر یا ادیب ایسی باتیں کہتا ہے جو بہت زیادہ لوگوں کے جذبات یا خیالات سے ہم آہنگ ہوں اور لوگ اس کی باتوں کو سماج کے لئے مفید سمجھنے لگیں۔ اور یہ مقبولیت ایک مدت تک قائم بھی رہ جائے تو ایسے ادیب کے سر عظمت کا سہرا باندھ دیا جاتا ہے۔ اور جب ایک مدت تک اس کی مقبولیت سماج میں مسلم رہتی ہے تو اس کو حقیقی عظمت کہتے ہیں۔ مقبولیت ایک کیفیت کا نام ہے اور عظمت ایک خطاب ہے۔ یہ خطاب اس وقت ملتا ہے جبکہ مقبولیت نصف النہار سے گزر چکتی ہے۔ اور اس کی سہ پہر شروع ہوجاتی ہے۔ عظمت کی پہچان یہ ہے کہ مقبولیت کا چرچا کم ہوجائے اور اس کے تاثرات عوام کی زبانوں پر رہنے کے بجائے خواص کے دلوں میں جاگزیں ہونے لگیں۔ زیادہ لوگ اس کو نہ پڑھیں بلکہ صرف یہ خیال کریں کہ وہ کبھی مقبول تھا۔ اور کثیر تعداد میں لوگ اس کو پڑھا کرتے تھے۔ غرض یہ کہ مقدس اور متبرک ہوکر رہ جائے۔ اور عوام میں اس کا صرف احترام ہی احترام باقی رہ جائے۔ کسی عظمت کا اعتراف حقیقتاً اس کی مقبولیت کا زوال ہے۔ عظمت کا آغاز زیادہ تر مقبولیت کی موت ہے مقبولیت جب اپنی آخری سرحد کو پہنچنے لگتی ہے تو اس وقت تک کوئی دوسرا ادیب افق پر نمودار ہوجاتا ہے جو مقبول حریف کا مدمقابل ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کی روشنی کو ماند کردیتا ہے اس وقت پبلک بطور نعم البدل پہلے کو بجائے مقبول بنائے رکھنے کے عظمت کا خطاب دے کر طاق نسیاں کی بلندی پر رکھدیتی ہے۔ اس کی عزت تو کرتی ہے لیکن اس سے کام نہیں لیتی، جس طرح ہم بوڑھوں کی عزت کرتے ہیں لیکن ان کو کام کا نہیں سمجھتے۔ وید، ایلیڈ اور شاہنامہ وغیرہ وغیرہ اس عظمت کی تابدار ضرور ہیں لیکن مقبول نہیں۔ اور اس کا واحد سبب

یہ ہے کہ اب نہ وہ سماج ہے جس کی وہ ترجمانی کرتی تھیں اور نہ وہ خیالات ہیں جن سے وہ ہم آہنگی کرتی تھیں بلکہ وہ جذبات جن کی نشوونما کے لئے یہ شاہکار لکھے گئے تھے بالکل بدل گئے ہیں۔ وہ رسوما ت وعقائد جس کے یہ مبلغ تھے اب بھلا دئے گئے ہیں۔ غرض یہ کہ عظمت کا دارومدار صرف مقبولیت کی "مدت" پر ہوا کرتا ہے پسند کرنے والوں کی تعداد اور مقبولیت کی مدت کے معنی یہ ہیں کہ جس ادیب کو سب سے زیادہ تعداد مانتی ہو یا جس نے سب سے زیادہ مدت تک یہ مقبولیت حاصل کرلی ہو وہ سب سے بڑا شاعر یا ادیب ہے۔ شاعر اور ادیب کو ماننے والوں کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کے
نیست
جذبات وخیالات اور اس دور کے سماجی نظام کی حمایت کس حد تک کرتا ہے اور مدت کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ خود الشا ان خیالات وجذبات اور سماجی نظام کو کس حد تک برقرار رکھتی ہے۔ زندگی ہیں، یا ہنگام مقبولیت میں بعض کو عظمت کا خطاب دے دیا جاتا ہے اور وہ اس لئے کہ لوگ کسی ادیب میں ایسی خوبیاں پاتے ہیں جن سے اُمید کی جاتی ہے کہ وہ بہت دنوں تک زیادہ سے زیادہ لوگوں کے خیالات کا ترجمان رہے گا تو بغیر انتظار وقت یا انتظار نتیجہ اس کو عظمت کا خطاب بخش دیتے ہیں۔ غرضکہ بغیر مقبولیت کے کوئی عظمت نہیں۔ اور خود ان دونوں چیزوں کا انحصار سماجی ماحول کے ساتھ ہم آہنگی پر ہوتا ہے۔ سماجی نظام چونکہ خود نتیجہ ہے گردوپیش کی مادی تبدیلیوں کا اس لئے جب بھی ذرائع پیداوار یا وسائل پیداوار میں تبدیلی آجاتی ہے سماجی نظام بھی بدل جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ خیالات وجذبات بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں سماجی نظام، خیالات اور جذبات کی میعاد اور زندگی اس وقت تک ہے جب تک ذرائع پیداوار ایک ہی رو پر رہیں اور اُن میں تبدیلی نہ آئے۔

انقلاب اور ادیب

اس جگہ اس امر کی صراحت بھی کردینی ضروری ہے کہ کیوں انقلاب کے زمانہ والے ادیب یا شاعر زیادہ سے زیادہ مقبولیت یا عظمت کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ انقلاب کے وقت دو طاقتیں اپنے اپنے پورے زور کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ رجعت پسند طاقتیں اپنی آخری لڑائی کے لئے تمام قوتیں فراہم کرتی ہیں اور آخری افاقۃ الموت، کے بعد مرجاتی ہیں۔ ترقی پسند قوت بھی اسی طرح اپنے تمام ذہنی اور مادی وسائل کو پوری شدت سے مہیا کر کے کام میں لاتی ہے۔ اس انقلابی یا عبوری دور کا شاعر یا ادیب جو ترقی کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ حقیقتاً حالتِ جنگ میں رہتا ہے ——— اس لئے اس کو اپنی ہر صلاحیت کو کام میں لانا پڑتا ہے، چونکہ اس کو نئے راستے پر چلنا پڑتا ہے۔ اور نئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے انقلابی یا عبوری دور کے ادیب کی دماغی صلاحیت ان پُرانے روش پر چلنے والوں سے خود ہی بہتر ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ انقلاب کے بعد سماج ایک ہی رو پر اس وقت تک چلتا رہتا ہے...... جب تک کہ دوسرا انقلاب نہ آجائے اس لئے جو شخص پہلے ہی آنے والی ضروریات کا پاس کر کے (جو انقلاب کی وجہ سے سماج میں آنے والی ہیں) اپنے شعروں یا کتابوں میں ایسے نئے خیالات اور مضامین درج کر لیتا ہے جن کی مدت حیات طویل ہوتی ہے اور اس طرح عبوری دور کے اس شاعر یا ادیب کو اولیت بھی

حاصل ہوجاتی ہے اور اس کی مقبولیت کی مدت بھی دراز ہوجاتی ہے۔ چنانچہ جمہوری یا انقلابی دور کا شاعر یا ادیب عوام اور شمار دونوں ہی کا تاجدار رہتا ہے اس نظریہ کی رو سے بڑا شاعر یا ادیب وہ ہے جو ایسی باتیں لکھے ایسے جذبات وخیالات کا اظہار کرے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے جذبات اور خیالات سے ہم آہنگ ہوں اور خود ان خیالات کی زندگی بھی زیادہ سے زیادہ ہو اور اس کے ساتھ طرز نگارش بھی متقضائے وقت کا ہمرکاب ہو۔

(۲)

اگر یہ دعویٰ صحیح ہے کہ شاعر کی مقبولیت کا راز اس میں ہے کہ وہ اپنے عہد کے جذبات وخیالات کی ترجمانی کرے تو غالباً بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے اس آخری دور کا جو جاگیردارانہ نظام کے تحت ۱۸۵۷ء تک رہا۔ یا اس عہد کا، جس کی عمارت مغلیہ سلطنت کے ملبہ پر بنی تھی سب سے بڑا اور مقبول شاعر غالب تھا۔ اور اس نظریئے کے تحت ضروری ہوگا کہ غالب کے عہد کے تمام سماجی نظام کو پیش نظر رکھا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ اس پر بھی غور کیا جائے کہ اس سماجی نظام میں لوگوں کے خیالات کا رجحان کیا تھا وہ کس قسم کے جذبات کو قابل احترام اور کن کو قابل احترام سمجھتے تھے اور غالب نے کس حد تک ان خیالات وجذبات اور سماجی نظام کی ترجمانی یا نمائندگی اپنے اشعار میں کی ہے

غزل گوئی کی کم مائیگی کا احساس

یہ جاگیردارانہ طرز نظام کی آسودگی تھی جس میں لازمی طور پر غزل کا جنم، عروج اور فروغ ہوا۔ غالب کے زمانہ میں بھی سب سے مقبول صنف شاعری یہی تھی۔ اور غالب نے اسی کو اپنے خیالات وجذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ مجرداً غزل گوئی سے تو کوئی مقبول یا بڑا شاعر ہو نہیں سکتا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ غزل گوئی میں بھی اہتمام وانتظام مملکت کی طرح کچھ نئے بند وبست ایسے کئے جائیں جن سے اس قلمرو میں کچھ بنیادی ترقی اور اضافہ ہو سکے چنانچہ ایک طرف اگر غالب نے اپنی غزل گوئی میں گل وبلبل اور شمع وپروانہ کی رسمی تمثیل سے حسن وعشق کی داستان سرائی میں لوگوں کی ہمنوائی کی، تو دوسری طرف اس میں نئے عنوانوں سے نفیس مضامین میں کچھ ایسی کیفیتیں پیدا کیں جو اب تک لوگوں کی نظر سے نہ گذری تھیں۔

میر تقی میر سے لیکر ذوق تک کسی نے نہ تو عاشقانہ شاعری کے مضامین میں اضافہ کیا تھا اور نہ ان کے ادا کرنے میں کوئی جدت پیدا کی تھی۔ خاص کر "داخلی شہادت" اور "رشک" میں ان کا ذکر لائق مطالعہ ہے۔ یقیناً میر تقی میر سے لیکر ذوق تک ایک ہی طرح کے مضامین سنتے سنتے لوگوں کے جی اکتا گئے ہوں گے اور ایسا ہونا ضروری تھا۔ سلطنت بدل رہی تھی، وسیلہ پیداوار، اور طریقۂ پیداوار وغیرہ سب کے سب انگریزوں کے آتے ہی بدلتے جا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں دماغی پیداوار کا بدلنا بھی ضروری تھا۔ اور یہ کمی کچھ نہ کچھ ترقی پسند لوگوں نے ضرور محسوس کی ہوگی۔ اس وقت نئے مشاہدات سے ان کو دوچار ہونا پڑا ہوگا اور ان کا جی نہ صرف اس عہد کے سماجی نظام ہی سے بھر گیا ہوگا بلکہ اس ادب سے بھی جو پرانے سماجی نظام کا پروردہ تھا۔ ایسی حالت میں رسمی غزل گوئی سے جو بیزاری محسوس کیا

غیر محسوس طور پر ہو رہی ہوگی ۔ وہ آگے چل کر یوں ظاہر ہوگئی کہ آج اُردو شاعری میں کوئی بھی اچھا یا بڑا شاعر ڈاکٹر اقبال ہوں یا جوش ملیح آبادی ایسا نہیں ہے جو اس طرف توجہ نہ کرتا ہو چنانچہ قدیم طرز غزل گوئی سے انحراف کی پہلی کرنیں، مبہم طور پر غالب کے یہاں ضیاء بار نظر آتی ہیں ؎

بقدر ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل　　　کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

یہ تھا اثر اس ابتدائی مگر مبہم بیزاری کا جو غزل کی طرف سے غالب نے پہلی مرتبہ ظاہر کیا اور جس کو نادانستہ طور پر علیم صاحب نے" نیم وحشیانہ کہہ کر پکارا۔

سماجی نظام کی کش مکش کا اثر غالب کے مختلف مضامین شاعری میں

یہ کچھ عجیب اور دل چسپ حقیقت ہے کہ ہر دور کے آخر میں لوگوں نے اپنے عہد سے اور اس کے سماجی نظام سے مبہم طور پر ہی سہی بیزاری کا اظہار کیا ہے۔

وانی وان کنتُ الاخیر زمانہ
لاٰتٍ عالم تستطعہ الاوائل لہ　　(ابوالعلاء معری)

اسی طرح جامیؒ کا شعر ہے ؎

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند　　　تہی خم خانہ ہا کردند و رفتند

یہ اشعار اسی مبہم بیزاری کا نتیجہ ہیں۔ لیکن یہ بھی دل چسپی سے خالی نہیں کہ لوگ جسے آخری دور سمجھتے ہیں حقیقتاً وہ ایک دوسرے دور کی ابتدا ہوتی ہے۔ غالب کی تمام مقبولیت و عظمت کا راز اس میں ہے کہ وہ اس دور کی سرحد پر کھڑا تھا جہاں ایک طرف جاگیر دارانہ عہد کے ساتھ سلطنت مغلیہ کا آفتاب غروب ہو رہا تھا ۔ اور دوسری جانب انگریزی سامراج اور مغربی سرمایہ داری کے اُبھرتے ہوئے سورج کی کرنیں اُفق پر کھیل رہی تھیں غالب کا کلام صرف آخری دور کے نظام اور اس کے تمام رجحانات ہی کا آئینہ دار نہیں، بلکہ اس کش مکش کا بھی ترجمان ہے جو ایک عبوری دور میں ہوا کرتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ عہد نو کے تصور سے بھی ضروری حد تک آشنا ہو کر اس کا نقیب ہے ۔ غالب کی تمام شاعری میں، خواہ وہ معاملات عشق میں ہو، کاروبار زندگی میں ہو یا تصوف میں یہ خوبیاں موجود ہیں۔ وہ گزشتہ نظام کو سنوارتا بھی ہے اور اس سے

لہ مولانا تسیم بہاری صاحب نے میری فرمائش سے اُردو اور فارسی میں یوں ترجمہ کیا ہے ۔ ۱۲

؎ آخر دور کہ گردید ترجامم دادند　　　لذت از پیش رواں بردہ بکامم دادند

میرا وجود ہوا بعد اوّلیں لیکن　　　ملی جو مجھ کو سعادت وہ ان کو مل نہ سکی

بیزاری کا اظہار بھی کرتا ہے۔ پھر ایک نئے دور کا تصور بھی کرتا ہے۔ اس طرح وہ نہ صرف ان گزشتہ لوگوں کے لئے ذہنی تعیش کا سامان فراہم کر دیتا ہے جس کے متعلق وہ کہتا ہے ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو ؛ جو مئے ونغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

بلکہ ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں کی پریشانیوں کا بھی ذکر کرتا ہے جو اس دور کی کش مکش میں گرفتار تھے۔ وہ مستقبل کا بھی موہوم خواب دیکھتا ہے۔ جس کے لئے وہ اس طرح مواد فراہم کرتا ہے ؎

ہوں گرمئ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج میں عندلیب گلشنِ نا آفریدہ ہوں

غالب پُرانی روش پر بھی چلتا ہے۔ اس سے ذرا جھجکتا بھی ہے۔ اس سے انکار بھی کرتا جاتا ہے اور پھر ایک نئے دور کی جھلک بھی دیکھتا ہے۔ اس کا یہ طبعی رجحان اس کی ہر کیفیات یعنی معاملات عشق، معاملات زندگی اور ما بعد الطبیعاتی فلسفے میں جا بجا نمایاں ہیں۔ یوں تو ہر طباع شخص کے ساتھ ہمیشہ یہ دشواری رہی کہ وہ ہر شے اپنے ہی دماغ کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اور اپنی ہی بنائی ہوئی ترازو میں تولتا بھی ہے اور چونکہ وہ عام لوگوں کے تصور میں کچھ اور مختلف آب و گل سے بنا ہوتا ہے، یا بالفاظ دیگر خود عبوری یا انقلابی دور سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے مذکورہ دور کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے مختلف طرح کا انسان دکھائی دیتا ہے۔ سماجی نظام کے ساتھ ساتھ خدا کے تصورات، معشوق کے تصورات، طریقۂ زندگی کے تصورات، غرض سارے تصورات بدل جاتے ہیں حتیٰ کہ دماغی پیداوار کے نظم میں بھی طبعی تبدیلیاں ہونے لگتی ہیں۔ ایسے عہد کا شخص اپنا ایک نیا خدا ایک نیا معاشرتی نظام اور نیا معشوق بنانا چاہتا ہے۔ وہ پُرانے تصورات سے اُلجھتا ہے اور ایک نئے دور کا نقیب بننا چاہتا ہے۔ چند مثالوں سے اس کی وضاحت کی جاسکتی ہے۔

(الف) **مضامین فلسفہ**:۔ مضامین فلسفہ ہی کو لے لیجئے۔ اگر ایک طرف وہ توحید مطلق، اور اسلامی توحید کی تعلیم دیتا ہے تو دوسری طرف وحدت الوجود کا (جو صوفیائے کرام کی بدولت حاصل ہوتی تھی) سبق دیتا ہے اور تیسری طرف ہندوؤں کے خلا ملا کے باعث مایا کے جنجال میں بھی پھنستا ہے۔ جہاں وہ مذہب اور وحدانیت الٰہی کے تصور کا نظارہ پیش کرتا ہے۔

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یا یہ کہ ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی، حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یا تو یہ عبودیت ہے یا اس کے بعد جب اُسے چین اور آسودگی حاصل نہ ہو سکی تو اس سے بیزاری کا اس طرح اظہار کرتا ہے ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت وزُہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی،

اب وہ دعاؤں کو بے سود ثابت کرنا چاہتا ہے ؎

دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز　　حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز

پھر بالآخر اس کو یوں ترک کرتا ہے کہ ؎

دل گذرگاہِ خیال مئے و ساغر ہی سہی　　گر نفس جادۂ سر منزل تقویٰ نہ ہوا

اور اس کشمکش کو چھپانے کے لئے تمام چیزوں سے قطعاً انکار کرتا ہے ؎

وفِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم　　دُردِ یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

اور آخر میں عبدیت کے ساتھ خودداری کا یہ عالم ہے کہ ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم　　اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر　　کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

پھر اس نے جس بیباکی اور جرأت کے ساتھ گناہ کے تصور کو ملیا میٹ کرنے کی کوشش کی یا بہشت اور دوزخ کے وجود سے انکار کیا یہ سب اسی دماغی الجھن کا نتیجہ ہے جو اس دور کی امتیازی خصوصیت تھی۔

معاملات حسن و عشق :۔ اسی طرح وہ معاملات عشق میں گھبرا کے اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتا۔

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر　　پردہ میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو　　نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

یا ؎

فردا و دی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا　　کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی،

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

لیکن ابتدائی بیزاری اس کو اس طرح ہوتی ہے ؎

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے　　نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

اس کشاکش کے بعد ترک عشق کر لیتا ہے لیکن پھر گرفتار ہو جاتا ہے ؎

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

پھر اس کیف بیزاری کو ذرا زیادہ واضح کر کے کہتا ہے ؎

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

اور منافرت کی تو یہ حد ہو گئی کہ ؎

پھر نہ کہنا تو نہیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

اس کے بعد تو ہلکے ہلکے سروں میں قطعاً عشق ہی سے انکار کرنا چاہتا ہے۔ اگرچہ "خواہش" کا اب تک قائل ہے

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں

بالآخر وہ سرے سے عشق ہی کا ٹھٹھول کرتا ہے ؎

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جسکو عشق خلل ہے دماغ کا

نظریۂ زندگی :- اسی طور پر وہ زندگی کے تدریجی مشاہدات میں بھی اس ہیجان کی ترجمانی کرتا ہے۔ کچھ شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں پہلے تو مصیبت کا ذکر کرتا ہے۔

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤں

پھر چارہ سازوں کے ہمدردانہ جذبہ کو ابھارتا ہے ؎

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

بالآخر یوں اپیل کرتا ہے ؎

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

لیکن کچھ بن نہ آئی تو ؎

ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا ہی نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

مگر اس کے ساتھ پھر ترغیب عمل بھی یوں دیتا ہے ؎

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل
کیا ہے کس نے اشارہ کہ ناز بستر کھینچ

ایجادات :- یہ اشعار حقیقتاً دو عہدوں کی یادگار ہیں جن کے ڈانڈے غالب کے عہد سے مل رہے تھے۔ ان سے تمام تدریجی کیفیتیں نمایاں ہو رہی ہیں۔ ایک عہد کے اختتام کی اور دوسرے دور کے آغاز کی اس دور میں نقط سلطنت ہی کا اختتام یا آغاز نہیں ہو رہا تھا۔ اور سماجی نظام ہی کی کایا پلٹ نہیں ہو رہی تھی بلکہ دماغی اور ذہنی کیفیتوں میں انقلاب لانے والی سب سے بڑی چیز مطبع کی ایجاد تھی۔ غالب کے زمانہ ہی میں پہلی مرتبہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں بہت سے مطابع کھل گئے تھے کچھ اخبار اور رسالے بھی نکل رہے تھے۔ اور مختلف قسم کی کتابیں طبع ہو کر سہولت کے ساتھ کم داموں میں لوگوں کو دستیاب ہونے لگی تھیں۔ ظاہر ہے کہ علم میں کس سرعت کے ساتھ

اضافہ ہوا ہوگا۔ غالب ہی کے زمانہ میں ریل جیسی ایجاد ہندوستان میں آئی۔ ذہنی ہیجان پیدا کرنے میں ظاہر ہے کہ ریل نے کیا حصہ نہ لیا ہوگا۔ اب تک اس زمانہ کی آنکھ نے رسل و رسائل کے لئے زیادہ سے زیادہ ذی روح مادی طاقتوں کو کام میں لاتے دیکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ ریل کی ایجاد نے کیسی کیسی ہلچل ان کے دماغ میں نہ پیدا کی ہوگی۔ اسی طرح تار برقی کی ایجاد کے لئے بھی تو اس وقت کا دماغ تیار نہ تھا کہ یکایک لوگوں نے اس کا مشاہدہ بھی کر لیا۔ ٹیلی گراف میں بعضوں نے "اشراق" کے تصور کی تکمیل دیکھی۔ اس نے ان کے عقائد میں سکہ سے تزلزل پیدا کر دیا۔ اس طرح مادی ایجادات کے ساتھ ساتھ ذہنی ایجادات کا ہونا ضروری ہی تھا۔ "مادہ کا اثر جوہر پر" اور "جوہر کا اثر مادہ پر" ہی تو دنیا کے تمام مظاہر کا دارومدار ہے۔ ان نئی ایجادات ہی کا نتیجہ تھا کہ لوگوں نے غالباً ناممکنات کو ممکنات تصور کرنا شروع کر دیا۔ اس ترقی کا دانستہ یا نادانستہ اثر تھا کہ غالب نے کہا ؎

سمجھ اس فصل میں کوتاہئ نشو و نما غالب   اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

اسی طرح اس نے معاملات زندگی کے ہر شعبہ میں اگر ایک طرف رسمی خیالات کا اظہار کیا ہے تو دوسری طرف اس نے نئے زاویۂ نگاہ سے جو پرتو تھا نئی الجھنوں کا ان کے اظہار میں بھی دریغ نہیں کیا۔

ہمہ گیری

تیسری خوبی جو اس زمانہ کی خصوصیت تھی اور جس کا غالب بے انتہا شارح رہا وہ ایک امتزاج پیدا کرنا تھا۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں انسانی طبیعت کو ہمیشہ ایک ایسے اسم اعظم یا سنگِ پارس کی ضرورت رہی جس کے ذریعہ ہر قسم کی مقصد براری ہو سکے۔ ہنگامی دور میں جب کہ پرانی چیزیں نئی ضرورتوں کے لئے ناکافی ہوتی ہیں عہد نو کا مفکر ایک طرف تو پرانی چیزوں کو موانست کی بنا پر عزیز اور برقرار رکھنا چاہتا ہے اور نئی چیزوں کو مجرداً نئے ہونے کی بنا پر قبول کرنے میں بھی تکلف کرتا ہے تو دوسری طرف خود زمانہ کے تقاضے کو بھی محسوس کرتا ہے کیونکہ نئی چیزوں کو اختیار کئے بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ ایسے انقلابی دور میں انسان مجبور ہے کہ ایک ایسا لائحۂ عمل اختیار کرے جو سب حالتوں کے لئے بھی صادق آتے ہیں۔ اور روزمرہ کے کاروبار زندگی پر بھی ٹھیک اترتے ہیں اور پھر وادئ تصوف کی بادیہ پیمائی میں رہنما ہوتے ہیں۔ گویا یہ ایک ایسا ہنر ہے جس کو عیسائی مذہب والے بہت اچھی طرح سمجھ سکے تھے۔ یہی وہ مقامات ہیں جہاں تثلیث میں وحدت اور وحدت میں تثلیث کا لطف آتا ہے ؎

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے   بے نیازی تری عادت ہی سہی

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟   بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ   جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی!

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابندِ نے نہیں ہے

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

یہ اور ایسے بہت سے اشعار ہیں جنکو بے تکلف مناسب حال مواقع پر، آدمی خدا کے لئے، معشوق کے لئے اور معاملات زندگی میں آپس کے برتاؤ کے لئے یکساں اثر پیدا کرنے کی غرض سے پڑھ سکتا ہے۔

تنوع

غالب کی عظمت کا راز یہ تھا کہ اگر ایک طرف اس نے ادق سے ادق مضامین کے لئے ادق سے ادق طریقۂ بندش اختیار کیا، جس کے لئے وہ خود کہتا ہے۔ ع گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل تو دوسری طرف اس نے سہل ممتنع کی وہ مثال پیش کی جو اپنی مثال آپ ہے۔ وہ کبھی تو سنجیدگی اور متانت کی انتہائی رفعت کو پہنچا اور کبھی پستی اور تمسخر کی بھی سرحد سے بے تکلف گزر گیا۔ فلسفے کی گتھیاں بھی سلجھائیں۔ کاروبار زندگی سے بھی اُلجھا۔ اور معاملات عشق کی لذتوں میں بھی گم ہوا۔ غرضیکہ مختلف قسم کے جذبات وخیالات کی ترجمانی کی۔ شدت شوق ن والہانہ کیفیت بھی سنائی اور اس سے اجتناب کے جذبات بھی اُبھارے غالب کے یہاں نہ صرف مختلف جذبات و خیالات پائے جاتے ہیں۔ بلکہ متضاد جذبات وخیالات بھی موجود ہیں۔ دو متضاد جذبات وخیالات کی انتہا پسندی ی ترجمانی کے ساتھ ساتھ اس کے درمیان کی جتنی کیفیتیں ہو سکتی ہیں، موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا بازار جہاں ضروریات زندگی کی تمام چیزیں ایک ہی ماحول میں دستیاب ہو سکتی ہوں خلقت کے اژدہام کا مقام ہوگا۔ اس دور سے پہلے ل وسماج مل رہے تھے وہیں غالب نے اپنی دوکان کھول رکھی تھی۔ لوگ کسی شاعر یا ادیب کو اس کی خصوصیت کے لئے پسند نہیں کرتے پڑھنے والے تو خود اپنی تمناؤں کا عکس اس کے شعروں اور کتاب کے صفحات میں دیکھنا چاہتے ہیں اور لوگوں کی تمنا تابع ہوا کرتی ہے۔ اس روح عصر کی جو کسی خاص زمانے میں کارفرما ہو۔

عہدِ غالب کا تقاضہ

اس دور کے لوگ پرانے طرز کے علاوہ نیرنگی، دورنگی اور ہمہ رنگی کے دلدادہ تھے۔ اس ضرورت کو غالب نے پورا کیا۔ لیکن اس بیان سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیئے کہ ہر زمانے میں ایسے شاعر لوگ پسند کرتے ہیں جس کے یہاں بہت سی مختلف اور متضاد کیفیات ہوں۔ ایسے زمانہ میں جبکہ قوموں کو کیسوئی درکار ہوتی ہے جیسے کہ زمانہ جنگ یا مذہبی جوش کے دور میں تو اس وقت اس طرح کے مختلف ومتضاد جذبات کا اظہار

نہ یہ کہ مقبولیت کا باعث ہوگا۔ بلکہ کلیتۂ غیر مقبولیت کا سبب بن جائے گا۔ اس طرح غالب کی وہ خوبیاں جن کے لئے وہ بے انتہا ممتاز ہے یعنی طنز، ظرافت یا مشکل پسندی[1]۔ جدت ایک، ندرتِ خیال، نزاکت بیان، حسن ترکیب، حسن بیان، تنوع، جذبات کی رفعت، خیالات کی بلندی، مذہب، فلسفہ وغیرہ تو حقیقتاً یہ چیزیں اس عہد کی مانگ کا نتیجہ تھیں اور حسن کی ترجمانی غالب نے بعنوان احسن، اسی طرح کی جس طرح لوگ چاہتے تھے۔ آسودہ حالوں کا وہ طبقہ جو ابھی تک جاگیردارانہ خواب میں مسکرا رہا تھا وہ تو ظرافت ہی سے خوش ہو سکتا تھا۔ طنز بھی حقیقتاً ایک زہرخند ہے جو نصیحت اور ظرافت کے امتزاج سے ترکیب دیا جاتا ہے۔ سہ

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں   دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

مشکل پسندی

مشکل پسندی کا بھی یہی حال ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے سماج نے پہلی مرتبہ بہت سی نئی نئی چیزوں کا مشاہدہ کیا جو انگریزوں کے آنے سے یکایک پیدا ہوگئی تھیں۔ پھر چھاپے خانہ کی ایجاد نے جو نئی ترقی خیالات اور علم میں پیدا کی اس کے اظہار کے لئے اردو غزل گوئی کی زبان ناکافی ثابت ہو رہی تھی لیکن جب غالب نے فارسیت اور فارسی ترکیبوں سے کام لینا شروع کیا تو ایک نیا دور شروع ہوگیا تھا جسے بعد میں اقبال نے بے انتہا سنوار کر مقبول کر دیا۔ لیکن یہ دور خود غالب کے لئے بہت سی الجھنوں کا باعث ہوگیا تھا۔ اس کی مشکل پسندی بطور یادگار اس کے دیوان میں موجود ہے۔ جو ہمیں یاد دلاتی ہے کہ نئے نئے خیالات کی فراوانی کو اردو زبان کے محدود الفاظ میں قلم بند کرنا اس زمانہ میں لوگوں کے لئے کس قدر دشوار تھا نئے نئے استعاروں اور ترکیبوں کا استعمال جو کچھ فارسیت اور کچھ عربیت کا پر تو لئے ہوئے تھیں۔ ان کا فہم و ادراک کس درجہ ذہنی الجھن کا باعث تھا جس طرح نئے راستہ پر چلنے میں کچھ لغزشیں ضرور ہوتی ہیں بالکل اسی طرح نئے خیالات کے اظہار میں بھی دشواریاں ہوتی ہیں۔ ہم کو ماننا پڑے گا کہ غالب پہلا شخص تھا جس نے محسوس کیا کہ محاورے اور اصطلاح کی قید و بند سے اردو ادب کو آزاد کرایا جائے، کیونکہ جدت، ندرت اور نزاکتِ خیال وغیرہ حقیقتاً اس عہد کی مانگ تھیں۔ جدید تجربات سامنے آرہے تھے نئے نئے تماشے آنکھوں کا امتحان لے رہے تھے۔ پھر جدت طرازی اور ندرت کیوں طبیعت میں نہ آتی۔

ذاتی تعلّی

یوں تو کم و بیش ہر آدمی میں "انانیت" اور "ما و من" کا جذبہ موجود ہے اور ہر شاعر اس کا اظہار کسی نہ کسی طرح کر ہی دیتا ہے۔ اور اگر اس کا کوئی ثبوت اس کے دیوان میں نہ ملے تو سرے سے شعر کہنا ہی اس کی خودی اور انانیت کی ایک آواز ہے۔ لہٰذا غالب نے بھی رسمی طور پر ایسے بہت سے اشعار اپنی تعلّی میں کہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے   جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے   مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

---

[1] اس کی تفصیل ہم سے پہلے اور بہتر مستند ادیبوں مثلاً حالی وغیرہ کے پاس ملتی ہے۔ یہاں صرف اسکی توضیح اور توجیہ مقصود ہے ۱۲

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے   عرش سے پرے ہوتا کاش کے مکان اپنا

لیکن ان کے دھاگے آگے بڑھ کر کچھ اور ہی رنگ لائے۔ یہی خودی اور انانیت تھی جو اس مخصوص دور میں غالب کے کلام میں آفتاب کی پہلی کرنوں کی طرح رونما ہوئی اور جو نصف النہار کی تابندگی کی طرح اقبال کے پاس قومی اور اجتماعی خودی کا درس دینے لگی۔ اگرچہ مسلمانوں کی سلطنت غالب ہی کے وقت میں گئی۔ لیکن اسی وقت ایک ایسی نئی جماعت بھی پیدا ہونے لگی تھی جو خود اعتمادی سے سرشار تھی محض تخم کی طرح وہ غالب اور سرسید کے زمانہ میں رونما ہوئی ابتداء میں وہ اس قدر مخفی اور نازک تھی کہ خوردبین جیسی آنکھ رکھنے والوں کے سوا دوسرے اسے نہ دیکھ سکتے تھے۔ اور نہ سمجھ سکتے تھے۔ لیکن بیسویں صدی عیسوی کے اوائل ہی میں اقبال کے فلسفۂ خودی کی شکل میں نمایاں ہو کر تصور پاکستان بن کر ابھری۔ سچ ہے تحریکیں نہ ایک دن میں پیدا ہوتی ہیں اور نہ ان تحریکوں کے نتائج ابتدائے کار میں دکھائی دیتے ہیں۔

غالب کا اثر آنے والے شاعروں پر

غالب کے کسی مطالعہ کرنے والے سے یہ بات چھپی ہوئی نہیں ہے کہ اس کی شاعری کی چار اہم خصوصیتیں[1] ہیں۔ اولاً اس کی معاملہ بندی کی ندرت اور لطافت، یعنی پرانے دور کی غزل گوئی میں نئی حلاوت، چاشنی، ظرافت اور طنز، دوسرے اپنے عہد کی تمام گرد و پیش کی چیزوں سے بیزاری، تیسرے فکری سلاست کے ساتھ لفظی بندش کا اہتمام جس نے اس کے کلام میں بے ساختگی، بے تکلفی کی شان پیدا کر دی۔ چوتھی خوبی دقیق اور اہم مسائل کی شاعرانہ موشگافی ہے لیکن قابل غور بات یہ ہے اور یقیناً یہ کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں کہ غالب کے بعد جو سب سے بڑے چار شاعر داغ، اکبر، حالی اور اقبال منصۂ شہود پر آئے ان میں یہ چاروں خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ داغ نے غزل سرائی میں اسی معاملہ بندی کو اختیار کیا۔ اکبر الٰہ آبادی نے اپنے عہد سے اسی بے زاری کا اظہار کیا، مگر نفس مضمون اور نفسیاتی کیفیت وہی رہی۔ حالی نے سادگی اور بے تکلفی کو معراج پر پہنچایا۔ اور اقبال نے دقیق مضامین فلسفہ و سیاست کو شاعری کا گل سرسبد بنایا۔ آنے والے چار بڑے شاعروں یعنی داغ، حالی، اکبر الٰہ آبادی اور اقبال میں ان چار مختلف امتیازی خصوصیتوں کا پایا جانا جو بیک وقت تنہا غالب میں پائی جاتی ہیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ درج ذیل شعر اقبال نے غالباً اپنے سے زیادہ غالب کے لئے کہا ہے ؎

اڑائی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے   چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری

بڑے شاعروں یا ادیبوں کی مثال پہاڑ کی اس سب سے اونچی چوٹی کی سی ہوتی ہے جس پر آفتاب کی کرنیں سب سے پہلے پڑتی ہیں۔ اور آخر تک رہتی ہیں۔ اور یہ خوبی عبوری دور کے صرف ایسے شاعر یا ادیب میں ہوتی ہے جو ماضی و حال دونوں عہدوں کے جذبات و خیالات میں امتزاج پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔ غالب آخری دور کا آخری شاعر بھی تھا اور نئے عہد کا پہلا شاعر بھی جس کے دماغ پر ماضی کا چودھویں کا چاند ضیاباری کر رہا تھا جس کے ضمیر میں شب دیجور کی کلفتیں حشر سامانی کر رہی تھیں۔ اور پھر صبح نو کی دل آویزیاں بھی جودت و جولانی پیدا کر رہی تھیں

[1] ان چاروں خوبیوں کو ہم سے قبل بہت سے لوگوں نے وضاحت سے بیان کیا ہے اس لئے ان کا اعادہ نہیں کیا

سید آلِ حیدر ایم اے

غالب اور اُردو شاعری

یوں تو غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ابھی اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ کتنا اور لکھا جائے گا کیونکہ غالب پر جب بھی تنقیدی نظر ڈالی جاتی ہے اُن کی زندگی کے رُموز ہائے پوشیدہ عیاں ہوتے جاتے ہیں لہٰذا غالب کی عظمت اور جامعیت کو اختصار سے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ــــ "غالب ایک مکمل عہد کا نام ہے" ــــ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے دیوانِ غالب کو الہامی کتاب قرار دیا ہے۔

رشید احمد صدیقی غالب کے متعلق کہتے ہیں۔

"مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ مغلوں نے ہندوستان کو کیا دیا تو میں بے تکلف

طور پر ۳ نام لوں گا ــــ غالب ــــ اُردو ــــ تاج محل"

سوال یہ ہے کہ غالب کے متعلق ہند و پاک کے اِن عظیم لوگوں نے جو غیر معمولی الفاظ استعمال کئے ہیں تو کیا محض اس لئے کہ غالب ایک قادر الکلام اور عظیم شاعر تھے ــــ! ہرگز نہیں کیونکہ شعراء تو اور بھی ہوئے ہیں جن کی قادر الکلامی اور عظمت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ــــ پھر ــــ؟ ــــ اس لئے کہ غالب کی حیثیت ایک تخلیق کار اور خلّاق شاعر کی ہے اور غالب کی عظمت کا راز اُن کی اسی حیثیت میں پوشیدہ ہے۔

غالب نے اُردو میں حالانکہ آٹے میں نمک کے برابر کہا ہے لیکن اُن کا یہ نمک ایسا ہے جس نے پورے "آٹے" کو ایک لطیف نمکین پن بخشا ہے۔ شاعری کا طرۂ امتیاز ضخیم دیوان نہیں بلکہ ندرتِ کلام ہے اور غالب کے یہاں پر ندرتِ کلام اور تراش خراش جس حُسن اور انداز سے پائی جاتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ الفاظ کی بندش اور تراکیب کی ایجاد کے لحاظ سے غالب کے بعد اگر کوئی شاعر ہے تو وہ عصرِ حاضر کا انقلابی شاعر جوشؔ ہے۔ غالب نے مشکل سے سو صفحات پر مشتمل اپنے چھوٹے سے دیوان میں انواع و اقسام کے ذائقے جمع کر دیئے ہیں، زندگی کا کونسا گوشہ ہے جسے تشنہ چھوڑا

آ گیا ہے معنی آفرینی کا ایک دریا ہے جو ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ غمِ عشق و غمِ روزگار، دل اور دماغ کے معاملات حُسن و عشق کے راز و نیاز، زندگی کی عکاسی کیا ہے جو اس مختصر سے دیوان میں ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ شاعر بنتا نہیں بلکہ شاعر پیدا ہوتا ہے۔ قدرت یہ ملکہ بچے کی سرشت میں ودیعت کرتی ہے۔ شاعری کوئی اکتسابی دولت نہیں۔ غالب فطرتاً شاعر تھے اور شاید قدرت اس دولت کی دین میں اوروں کے مقابلے میں غالب کے ساتھ زیادہ فیاض تھی۔ حالانکہ غالب سے پہلے بھی اور بعد میں بھی شاعری میں نئے تجربے اور تخلیقی مواد ملتا ہے لیکن نہ ہونے کے برابر۔ غالب نے اپنی وضع علیحدہ اختیار کی تھی اُنھوں نے دوسروں کے دریافت شدہ راستوں پر چلکر نشان دریافت کرنے کو ہمیشہ کسرِ شان خیال کیا اور اس امر میں احتیاط کو اس قدر ملحوظ رکھا کہ جب اُنھیں معلوم ہوا کہ کسی اور شاعر نے اسد تخلص اختیار کیا ہے تو اُنھوں نے اس تخلص سے ہاتھ اٹھا لیا اور غالب اختیار کیا۔ مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"دلی میں پلیگ کی وبا عام ہے زیادہ تر لوگ اس مرض کا شکار ہو کر مر رہے ہیں۔ میرے لئے مناسب نہیں کہ میں بھی اسی میں مبتلا ہو کر مروں۔ اسی واسطے زندہ ہوں۔"

تقلید سے گریز اور تخلیق سے رغبت اُن کی زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں ہے۔ غالب پہلے شاعر ہیں جنہوں نے تقلید کی لاٹھی کے سہارے چلنے کے مقابلے میں اپنی آنکھیں کھول کر چلنے کو ترجیح دی اور اسی اصول اور وضع میں اُن کی عظمت نہاں ہے۔

غالب سے پہلے شعراء کا عشق روحانیت اور خیالی اساس پر تھا۔ غالب نے اپنے عشق کی بنیاد حقیقت پر رکھی اور اُن کا محبوب کوئی خیالی کردار نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا انسانی کردار بن کر سامنے آیا۔ اسی لئے اُن کا محبوب محبت نفرت، عشق، جنسی اور تمام انسانی صفات سے بہرہ ور ہے۔ وہ جب نقدِ دل لیکر محبوب کی طرف التفات کی آرزو میں بڑھتے ہیں تو محبوب جذبۂ بے وفائی کے تحت اُسے ٹھکرا دیتا ہے اور غالب تڑپ اُٹھتے ہیں ؎

سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن — شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

اور ایک انسان کی حیثیت سے ردِ عمل کے طور پر وہ بھی انتقاماً بیوفائی کا اعلان کر دیتے ہیں ؎

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

وہ ایسی محبت کے خواہاں ہیں جو اُن کے جنسی تقاضوں کو آسودگی دے ؎

نیند اسکی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں — تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

اِسی مادہ پرستی کے طفیل غالب نے زندگی کی ...... اُن پوشیدہ باتوں کی تہ تک رسائی حاصل کی جن تک اِس سے پہلے نہ ہوئی تھی ؎

ہزاروں خواہش ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں — روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

اپنی اِس حقیقت پسندی کے صدقے میں غالب نے غمِ دنیا اور غمِ دل سے بچانے فرار اختیار کرنے کے مردانہ مقابلہ کرنا سیکھا ہے ؎

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے — غمِ دل اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا ...!
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ — دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

اور غمِ دنیا اور غمِ دل کے اِس مردانہ وار مقابلے کا سبب تھا کہ بالآخر غالب مشکل کو خاطر میں ہی نہیں لاتے گویا مشکلات اُن کی زندگی کا معمول بنکر سامنے آتی ہیں جن کا وہ خنداں پیشانی سے مقابلہ کرتے ہیں ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

غالب کہتے ہیں کہ اِس دُنیا میں کوئی بھی شے ایسی نہیں جس کو قرار حاصل ہو بلکہ کائنات کا ذرہ ذرہ ایک پریشانی میں مبتلا ہے گویا پریشانی کائنات کا طرۂ امتیاز ہے ؎

بُو نے گُل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

غالب کا فلسفۂ غم جس قدر جامع اور اٹل ہے اِس کا اندازہ ان اشعار سے بخوبی ہو سکتا ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اور پھر غم بھی کوئی معمولی غم نہیں بلکہ ؎

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ رُکتا — جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

جہاں غالب کوچۂ حُسن میں عجز و انکساری کا پیکر بنے نظر آتے ہیں ؎

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا مری جو شامت آئے — اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

وہیں وہ عزتِ نفس کے محافظ بھی نظر آتے ہیں ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم — اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا،
دردِ منتِ کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا — بات کرتے کہ میں لبِ تشنۂ تقریر بھی تھا

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

وہ انسانی عظمت کے اس درجہ قائل ہیں کہ ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

کیا ہوتا ــــ ! خدا ہوتا ــــ ظاہر ہوا کہ انسان کی اپنی نظر میں خود کی اس سے زیادہ اور کیا عظمت ہوسکتی ہے ؟ غالب نے جو کچھ کہا وہ ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ رہ گیا اُس کا اندازہ اِس شعر سے ہوتا ہے جس میں اُنھوں نے صنفِ غزل کو متحمل بیان قرار نہیں دیا ؎

بقدرِ ظرف نہیں ہے یہ تنگنائے غزل کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

غزل پر میر کے علاوہ غالب کے برابر کسی اور کا احسان نہیں۔ میر نے غزل کی بنیادوں کو پختہ کیا لیکن غالب نے بقول رشید احمد صدیقی ــــ "غزل کو آبرو دی ــــ" اور غزل کو "صنفِ کلام سے بلند کر کے معیار کلام بنایا" اِس کو تہذیب کا درجہ دیا اور آخر کار غزل کو ــــ "اُردو کی تاثیر اور تقدیر بنا دیا"

غالب سے پہلے اُردو میں کسی مبسوط فلسفے یا مربوط سلسلۂ حقائق کا وجود نہیں ملتا۔ انھوں نے اُردو شاعری کو جو گرانقدر تحفہ دیا وہ فلسفہ ہے اور اسی فلسفیانہ نہج شاعری نے اقبال سا فلسفی شاعر پیدا کیا جس نے اُردو کو اس درجہ کی شاعری دی جسے دُنیا کی اعلیٰ ترین فلسفیانہ شاعری کے مدمقابل رکھا جا سکتا ہے۔

جلیل قدوائی ایم اے

غالب اور اُردو غزل

غالب کے ہاتھ میں اس صنف (اُردو غزل) نے ترقی و تکمیل کے اعلیٰ ترین مدارج طے کئے اور غالب کے فن کا کمال اسی صنف میں ظاہر ہوا۔ اور اُردو ہی کی غزلیات کے سبب اس لئے کہ میرے خیال میں عام عقیدہ کے برخلاف، فارسی کے مقابلہ میں اُردو میں غالب نے نہ صرف اپنے فن کا کہیں بہتر مظاہرہ کیا ہے بلکہ بہتر اہلِ زبان ہونے کا بھی ثبوت دیا ہے۔ فارسی میں وہ زیادہ سے زیادہ اس زبان کے اساتذہ سے اُنہیں کے میدان میں بازی لیجانے کی کوشش کر سکتے تھے مگر نئی طرح نہیں ڈال سکتے تھے۔ اُردو میں اُنھوں نے ایک نئے مکتبِ خیال کی داغ بیل ڈالی ہے اور اس حیثیت سے وہ آج تک تنہا نہیں یوں بھی اگر ہمیں غالب کو اپنا شاعر کہنا ہے تو اپنی زبان یعنی اُردو میں اُنھوں نے جو شاعری کی ہے اس پر زیادہ توجہ دینی ہوگی۔

ناظر انصاری جھنگاوی

کلامِ غالب میں شاعرانہ تعلّی

فطرتِ انسانی کا ایک جز فخر و مباہات بھی ہے اور کم و بیش ہر انسان میں انانیت اور ما و من کا جذبہ موجود رہتا ہے۔ بعض اوقات وہ اپنے بزرگوں اور پیش روؤں کے کمالات پر فخر کرتا ہے۔ کبھی اپنی ذاتی برتری اور افضلیت پر اور کبھی نسبی فوقیت پر ناز کرتا ہے۔ جب وہ کسی فن کا ماہر بن جاتا ہے تو یہ جذبہ پختہ ہو جاتا ہے وہ اپنے فنی کمالات پر ناز کرتا ہے جسے مختلف پیرایوں میں ظاہر کرتا ہے۔ شاعر کے اقوال و دعاوی سے اس کی نفسیات کا پتہ ملتا ہے اور اس کی شخصیت کی عکاسی ہو جاتی ہے۔ اس کی زندگی کے خاص خاص واقعات و لمحات پر بھی روشنی پڑتی ہے شاعرانہ تعلّی اس کی واضح اور روشن دلیل ہے۔ جو دنیا کے ہر دور کے شعراء میں قدرِ مشترک کے طور پر جلوہ گر رہی ہے۔ اردو کے شعرا کو بھی اپنے فن پر ناز رہا ہے لیکن ان میں اکثر مبالغہ آمیزی اور غلو کا شکار رہے ہیں۔ ہر دور کے شعرا نے اپنے کلام میں اپنی استادی، فنکاری اور سخن دانی کا اظہار کیا ہے۔ مگر ان کی یہ تعلّیاں حیاتِ جاوید نہ پا سکیں۔ داغ نے اپنی اردو دانی پر فخر و مباہات کا اظہار یوں کیا ہے ؎

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

کوئی اردو کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں۔

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

مشہور غزل گو حکیم مومن خاں مومن دہلوی نے بھی بے جا تعلّی کا اظہار کیا ہے ؎

شعر تر وہ ہیں ترے مومن کہ ہنگامِ جواب خوف سے منہ اور زبانِ ہر سخنور خشک ہے

جب ترقیِ فن کی ہوس ہے مومن کو — زیادہ ہوئیگا کیا عکس سے بے مثال تو ہے

میر انیس کے کلام میں بھی شاعرانہ تعلّی کے نمونے ملتے ہیں ؎

کسی نے تری طرح سے اے انیس — عروسِ سخن کو سنوارا نہیں
مری قدر کر اے زمینِ سخن — تجھے بات میں آسماں کر دیا
لو سنجیوں نے تری اے انیس — ہر اک زاغ کو خوش بیاں کرلیا

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

اگرچہ اکثر شعراء اپنے فنی کمالات پر فخر و ناز کا اظہار کرتے رہے ہیں لیکن ان میں سے چند ہی شعرا کی شاعرانہ تعلّیاں مبالغہ آمیزی سے پاک اور حقیقت پر مبنی رہی ہیں۔ عظیم شاعری جو زندۂ جاوید ہو سکتی ہے اس کے لئے دل گداختگی اور دل سوزی کی ضرورت ہے۔ تب ہی شمعِ سخن کے حسن کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اردو شاعری کے قصرِ رنگین میں صرف شاعرانہ مصوری کے رنگا رنگ اور دلکش نمونے ہی نہیں ملتے بلکہ اس میں وسعتِ فکر اور ہمہ گیری بھی ملتی ہے۔ مگر یہ صفات صرف عظیم شاعری میں پائی جاتی ہیں۔ عظیم شاعر دنیا کی محدود فضاؤں سے نکل کر کائنات کے حالات و واقعات کا جائزہ لیتا ہے۔ اس کے مشاہدۂ فطرت میں گہرائی اور گیرائی ہوتی ہے اور باریک بینی کارفرما ہوتی ہے۔ حیات و کائنات کی رنگا رنگ بزم آرائی اور بنی نوعِ آدم کی نفسیات کی منظر کشی وہ نہایت ماہرانہ چابکدستی اور فنی پختگی سے کرتا ہے اس لئے وہ عظیم شاعر اور بلند پایہ مسلّم الثبوت فنکار کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔

غالب کے کلام میں ندرتِ خیال ہی نہیں ندرتِ ادا بھی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری سوز و گداز اور جذبہ کے خلوص کی مظہر تھی۔ تشبیہ و استعارے، تلمیحات و توضیحات کے جوہر سے انہوں نے اپنی شاعری کے حسن کو نکھارا تھا۔ ان کی شاعری آراستگی اور آرائشِ در و بام کی نہیں بلکہ دروں بینی اور تب و تاب کی مظہر ہے۔ قارئین اور سامعین نے تجربہ کی کسوٹی پر اسے کھرا پایا ہے۔ اسی لئے ہم انہیں دنیا کے عظیم شاعروں کی صفِ اول میں پاتے ہیں۔ ان کی شاعری واقعیت اور حقیقت کا دلکش مرقع ہے وہ عظیم بھی ہے اور الہامی بھی۔ یقیناً وہ ملہمِ غیب تھے اسی لئے ان کے وہ اقوال و دعاوی جو شاعرانہ تعلّی کے ذیل میں آتے ہیں حقیقت پر مبنی ہیں اور ان کا یہ دعویٰ حقیقت آفریں ہے ؎

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر — کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح — میرے اجمال پہ کرتی ہے تراوش تفصیل

غالب اپنے فنی کمالات پر نازاں ہیں۔ اور فنِ شعر و سخن میں اپنے آپ کو حریفوں سے کم تر نہیں مانتے ع

نہ کم تر م ز حریفاں بہ فنِ شعر و سخن

روح القدس بھی ان کے کلام کی داد نہیں دے سکتا۔ اس دعوے کو اس شعر میں ملاحظہ فرمایئے [۱]

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی

روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

غالب شاعرانہ عظمت کے حامل کیوں ہیں! انہیں یہ عظمت کیوں ملی؟ ان کی شاعری کو الہامی کیوں تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی مقبولیت کا راز کیا ہے۔ آج ایک صدی کے بعد بھی دنیا کے عظیم دانش ور، فلسفی اور مفکر ان کی شاعری کو عظیم اور الہامی کیوں تسلیم کر رہے ہیں۔ اس کے لئے ہمیں اُن کے ماحول اور زندگی کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ان کے پیش رو اور ہم عصر شعرا کا اجمالی جائزہ لینا چاہئے۔ ان کے پیش رو کاملین فن میں میر کی پوری زندگی غم رہا اس کا مرقع رہی ہے شاعری میں وہ اسی کی عکاسی کرتے رہے ہیں اسی لئے ان کے یہاں داخلیت کا رنگ غالب ہے۔ میر درد متصوفانہ خیالات کے دائرے سے باہر نہ نکل سکے۔ اور انہیں اپنے دل زندہ کے مرجانے کا خطرہ لاحق رہا [۱]

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجائے

کہ زندگی تو عبارت ہے تیرے جینے سے

سودا طنز و مزاح کے تیروں سے مخالفین کے دلوں کو زخم پاتے رہے۔ اگرچہ ان کے پُر زور اندازِ بیان نے اردو شاعری کو تقویت بخشی ہے [۱]

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت

خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

مصحفی اور انشا میں شاعرانہ چشمک زنی رہی۔ اور وہ اپنی خداداد ذہانت کے باعث باہم نبرد آزما رہے ہیں۔ ان سب میں مومن البتہ غالب کے مدمقابل اور حریف بننے کی اہلیت رکھتے تھے۔ سب پر غالب کو نمایاں فوقیت و برتری حاصل تھی۔ وہ اپنی خاندانی عظمت اور نسبی فوقیت کو نہایت فخر و مباہات سے بیان کرتے ہیں [۱]

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم ۔۔۔ لاجرم در نسب فرہ مندیم

ترک زادیم و در نژاد ہمے ۔۔۔ بہ سترگانِ قوم پیوندیم

ایبکیم از جماعۂ اتراک ۔۔۔ در تمامی ز ماہ دہ چندیم

---

[۱] مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں ایک کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔

تن آبائے ما کشا ورزی است
مرزبان زادۂ سمرقندیم

وہ اپنے اجداد کی شاہانہ سطوت و عظمت پر فخر و ناز کر رہے ہیں۔ ان کے پیش رو بزرگوں نے شمشیر خارا شگاف اور مسلم پر اعتماد و یقین کے باعث بلند مرتبہ پایا۔ لیکن غالب نے شمشیر و علم کے بالمقابل اپنے آپ کو بےلبس پاکر خانۂ بہار آفریں سے ناموری حاصل کی۔ اگرچہ اُن کی تعلیم کچھ زیادہ نہ تھی۔ لیکن مُلا عبد الصمد[1] ایرانی نے انہیں بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ غالب نے اس سے صرف دو سال تک تعلیم حاصل کی تھی اور اکابر

"ایبک ترکی لفظ ہے۔ مرکب اے اور بک سے۔ اے چاند کو اور بک کامل اور بزرگ کو کہتے ہیں۔ پس ایبک کے معنی ماہ تمام۔ بزرگ، کے ہیں۔ اسی لئے مرزا نے کہا ہے ؎

"در تمامی زماہ دہ چندیم"

[1] مُلا عبد الصمد نامی کوئی ایرانی عالم غالب کے استاد تھے۔ وہ ایران کے ایک جلیل القدر امیرزادے تھے یزدان کا وطن تھا اور نسلاً زرتشتی تھے۔ وہ اپنا آبائی مذہب ترک کرکے اسلام قبول کر چکے تھے۔ اسلام لانے سے قبل ان کا نام ہرمزد تھا۔ وہ ۱۲۲۶ھ میں وارد ہندوستان ہوئے۔ اکبرآباد میں دو سال تک غالب کے یہاں قیام کیا۔ ان کے استاد کی حیثیت سے دو سال گذارنے کے بعد رخصت ہوگئے۔ اردو ادب میں ان کے متعلق بڑے متضاد بیانات ملتے ہیں۔ ممتاز و مشہور ماہر غالبیات مالک رام صاحب دلائل و براہین سے ثابت کرتے ہیں کہ ملا عبد الصمد حقیقتاً غالب کے استاد تھے اور مشہور محقق قاضی عبد الودود صاحب مُصر ہیں کہ غالب نے عبد الصمد نامی ایک فرضی شخص کو اپنا اتالیق لکھا ہے۔ خود غالب کے بیانات میں تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک جگہ وہ رقمطراز ہیں۔

"بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ بارے مراد بر آئی اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبرآباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا۔ میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کئے۔ اب مجھ اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے"۔

لیکن دوسری جگہ اپنے اس بیان کی تردید بھی کر رہے ہیں۔

"مجھ کو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں۔ عبد الصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ لوگ مجھے بے استادا کہتے تھے اُن کا منہ بند کرنے کے لئے ایک فرضی استاد گھڑ لیا"۔

علمائے زبان و ادب کے ہم رتبہ و ہم پلہ بن گئے تھے۔

غالب نے زود فہم طبیعت پائی تھی۔ مُلا عبدالصمد کی تعلیم نے اُن کے ذہن کو اس قدر پختگی اور شگفتگی عطا کی تھی کہ وہ اپنے ہم عصر اکابر فاضلین اور علمائے ادب کے ہم جلیس بن گئے تھے۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ، مصطفیٰ خاں شیفتہ، امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن، مولانا فضل حق خیر آبادی، حکیم احسن اللہ خاں کی ہم جلیسی غالب کے لئے باعثِ صد افتخار تھی۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

مومن و نیر و صہبائی و علوی و نگاہ
حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

غالب نے اپنی علمی صلاحیت اور ذہن رسا سے انفرادیت حاصل کر لی تھی۔ انہوں نے روایت سے بغاوت کی اور پرانی روش ترک کر دی۔ اپنے پیش رو اساتذہ میں مرزا بیدل کی پیروی وہ اپنے لئے باعث نمود مباہات سمجھتے تھے۔ چنانچہ اپنے اشعار میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے ؎

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

مضطرب دل نے مرے تارِ نفس سے غالب
ساز پر رشتۂ پے نغمۂ بیدل باندھا

اسد ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا

یہ اشعار بیدل سے گہری عقیدت کی پختہ دلیل پیش کر رہے ہیں۔

شیخ محمد اکرام صاحب مصنف "غالب نامہ" لکھتے ہیں۔

"مرزا کی شاعری کا صحیح اندازہ اُسی صورت میں ہو سکتا ہے جب بجائے میر اور سودا کے انھیں بیدل اور عرفی کا جانشین سمجھا جائے۔ بے شک انہوں نے اردو شعر لکھے ہیں۔ انہوں نے کسی اردو شاعر کی پیروی نہیں کی بلکہ اردو میں بھی پہلے بیدل اور بعد میں عرفی اور نظیری کے طرز میں اشعار لکھے"

ان کی جدت پسندی نے انفرادیت عطا کی اور راہیں نئی اور مشکل شاہراہوں کی جستجو میں منہمک رکھا انہوں نے روایت سے بغاوت کر کے اپنی شاہراہ متعین کر لی فرماتے ہیں ؎

بیا و ریدگر ایں جا بود سخن دانے   غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد

اور یہ ادعائے سخن سنجی دیکھئے ؎

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

غالب کے زمانہ میں تاریخ، طب، ہیئت، اخلاقیات، منطق اور تصوف کی تعلیم دی جاتی تھی۔ انہوں نے ان علوم کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کے مکاتیب میں کئی مقامات پر مختلف موضوعات پر سیر حاصل مواد فراہم ہوتا ہے۔ لیکن وہ علم تصوف کی جانب زیادہ مائل تھے اور مسئلہ وحدت الوجود کے قائل تھے مولانا حالی یادگار غالب میں رقم طراز ہیں۔

علم تصوف سے جس کی نسبت کہا گیا ہے "برائے شعر گفتن خوب است"، ان کو خاص نسبت تھی۔ اور حقائق و معارف کی کتابیں کثرت سے ان کے مطالعہ سے گزری تھیں۔ اور سچ پوچھئے تو انہیں متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہم عصروں میں بلکہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے شعراء میں ممتاز بنا دیا۔

مولانا حالی کی یہ تحریر غالب کی علمی استعداد، فنی صلاحیت اور اعلیٰ ذہنیت کی پختہ دلیل ہے۔ انہوں نے روایت سے بغاوت کی۔ اپنی انفرادیت کی راہ تلاش کی اور اس پر گامزن رہے۔ آغاز میں مشکل پسندی کو وسیلہ اظہار بنایا۔ اس لئے طعنہ زنی کا شکار ہوئے۔ ناقدین عصر نے بھی ان کے اشعار کو بے تعلق اور بے مطلب اور رادتی و مہمل قرار دیا۔ چنانچہ اس طعنہ زنی سے زچ آکر انہوں نے شکست تسلیم کرلی اور ایک رباعی میں اس کا اعتراف کیا ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل [1]

اوّل تو یہ ادعا کیا تھا ؎

آج مجھ سا نہیں زمانے میں　　شاعرِ نغز گو و خوش گفتار
رزم کی داستان گر سنئے　　ہے زباں میری تیغِ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجئے
ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار　　(گزارش مصنف بحضور شاہ)

---

[1] مولانا حالی نے چوتھے مصرعے کے دو معنی پیدا کئے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر میں ان کی فرمائش پوری کروں اور آسان شعر کہوں تو یہ مشکل ہے کہ اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف ہے۔ اور اگر آسان کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ برا مانتے ہیں اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس باب میں صاف صاف کہتا ہوں تو سخندانِ کامل کی نافہمی اور کند ذہنی ظاہر کرنی پڑتی ہے۔ اور اگر صاف صاف بات نہ کہوں تو آپ ملزم ٹھہرتا ہوں۔

اب مخالفین کی تنقید کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے فرمایا ہے

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اپنی برتری، افضلیت اور خود اعتمادی پر انہیں بجا طور پر ناز ہے۔ اپنے ایک شعر میں اس کا اظہار اس طرح کر رہے ہیں ؎

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

حضرت عیسٰی علیہ السلام کی مسیحائی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی عظمت و شوکت کا تذکرہ قرآن مجید میں مفصل طور پر درج ہے۔ غالب ان واقعات سے شاعرانہ تعلّی تخلیق کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ گستاخی کی حد تک پہنچی ہوئی بات ہے ؎

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

زمانے نے ان کے کلام کی صحیح قدر نہ کی۔ اس کی توجیہہ انہوں نے یہ کی کہ لوگوں کی کم عقلی، کوتاہ فہمی اور بے مائگی یا کم مایگی اس کا باعث ہے ؎

بہ آں دیار کہ گوہر خریدن آئیں نیست
دکاں کشودہ ام و قیمت گہر گویم

مگر ان کی دشوار پسند طبیعت نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ اوّل تو وہ طرز بیدل کے دلدادہ تھے۔ لیکن اپنی طبعی ذہانت اور تحقیقی و جستجو کے باعث طرز بیدل کو ترک کر کے فارسی کے پانچ مشاہیر شعرا کا طرز اختیار کرنے لگے۔ اس کا اظہار بڑے فخر و ناز سے کر رہے ہیں۔

"شیخ علی حزیں نے مسکرا کر بے راہ روی مجھ کو جتائی، طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں موجود تھا اس کو فنا کر دیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گہرائی سے میرے بازو پر تعویذ باندھا۔ اور نظیری نے اپنی خاص روش پر مجھ کو چلنا سکھایا۔ اب اس گروہ والاشکوہ کے فیض تربیت سے میرا کلک رقاص چال میں کبک ہے نوا گستری میں موسیقار، جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا"

مرزا کے کلام میں حسن و عشق کی عکاسی ملتی ہے۔ اور فلسفیانہ نکات بھی۔ انہوں نے زندگی کا مشاہدہ

اور یہ ادعائے سخن سنجی دیکھئے ؎

ہوں گرمئ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشنِ ناآفریدہ ہوں

غالب کے زمانہ میں تاریخ طب ہیئت، اخلاقیات، منطق اور تصوف کی تعلیم دی جاتی تھی۔ انہوں نے ان مضامین کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کے مکاتیب میں کئی مقامات پر مختلف موضوعات پر سیر حاصل مواد فراہم ہوتا ہے۔ لیکن وہ علم تصوف کی جانب زیادہ مائل تھے، در مسئلہ وحدت الوجود کے قائل تھے مولانا حالی یادگار غالب میں رقم طراز ہیں۔

"علم تصوف سے جس کی نسبت کہا گیا ہے "برائے شعر گفتن خوب است" ان کو خاص نسبت تھی۔ اور حقائق و معارف کی کتابیں کثرت سے ان کے مطالعہ سے گزری تھیں۔ اور سچ پوچھئے تو انہیں متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہم عصروں میں بلکہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے شعرا میں ممتاز بنا دیا۔"

مولانا حالی کی یہ تحریر غالب کی علمی استعداد، فنی صلاحیت اور اعلیٰ ذہنیت کی پختہ دلیل ہے۔ انہوں نے روایت سے بغاوت کی۔ اپنی انفرادیت کی راہ تلاش کی اور اس پر گامزن رہے۔ آغاز میں مشکل پسندی کو وسیلہ اظہار بنایا۔ اس لئے طعنہ زنی کا شکار ہوئے۔ ناقدین عصر نے بھی ان کے اشعار کو بے محل، بے مطلب اور رادق و مہمل قرار دیا۔ چنانچہ اس طعنہ زنی سے زچ آکر انہوں نے شکست تسلیم کرلی اور ایک رباعی میں اس کا اعتراف کیا ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل ؎[1]

اوّل تو یہ ادعا کیا تھا ؎

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گو وخوش گفتار
رزم کی داستان گر سنئے
ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجئے
ہے قلم میرا ابر گوہر بار

(گذارش مصنف بحضور شاہ)

؎[1] مولانا حالی نے چوتھے مصرعے کے دو معنی پیدا کئے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر میں ان کی فرمائش پوری کروں اور آسان شعر کہوں تو یہ مشکل ہے کہ اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف ہے۔ اور اگر آسان کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ برا مانتے ہیں اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس باب میں صاف صاف کہتا ہوں تو سخندانِ کامل کی نافہمی اور کندذہنی ظاہر کرنی پڑتی ہے۔ اور اگر صاف صاف بات نہ کہوں تو آپ ملزم ٹھہرتا ہوں۔

اب مخالفین کی تنقید کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے فرمایا ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اپنی برتری، افضلیت اور خود اعتمادی پر انہیں بجا طور پر ناز ہے۔ اپنے ایک شعر میں اس کا اظہار اس طرح کر رہے ہیں ؎

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

حضرت عیسٰی علیہ السلام کی مسیحائی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی عظمت و شوکت کا تذکرہ قرآن مجید میں مفصل طور پر درج ہے۔ غالب اِن واقعات سے شاعرانہ تعلّی تخلیق کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ گستاخی کی حد تک پہنچی ہوئی بات ہے ؎

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

زمانے نے ان کے کلام کی صحیح قدر نہ کی۔ اس کی توجیہہ انہوں نے یہ کی کہ لوگوں کی کم عقلی، کوتاہ فہمی اور بے مائگی یا کم مایگی اس کا باعث ہے ؎

بہ آں دیار کہ گوہر خریدن آئیں نیست
دکاں کشودہ ام و قیمتِ گہر گریم

مگر ان کی دشوار پسند طبیعت نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ اوّل تو وہ طرز بیدل کے دلدادہ تھے۔ لیکن اپنی طبعی ذہانت اور تحقیق و تجسس کے باعث طرز بیدل کو ترک کر کے فارسی کے پانچ مشاہیر شعرا کا طرز اختیار کرنے لگے۔ اس کا اظہار بڑے فخر و ناز سے کر رہے ہیں۔

"شیخ علی حزیں نے مسکرا کر بے راہ روی مجھ کو جتائی، طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں موجود تھا اس کو فنا کر دیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گہرائی سے میرے بازو پر تعویذ باندھا۔ اور نظیری نے اپنی خاص روش پر مجھ کو چلنا سکھایا۔ اب اس گروہ والاشکوہ کے فیض تربیت سے میرا کلک رقاص چال میں کبک ہے نو راگ میں موسیقار، جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا"

مرزا کے کلام میں حسن و عشق کی عکاسی ملتی ہے۔ اور فلسفیانہ نکات بھی۔ انہوں نے زندگی کا مشاہدہ

نہایت گہری نظر سے کیا تھا ۔ عاشقانہ رنگ، متصوفانہ رموز و نکات، زندگی کا مشاہدہ ان موضوعات کے
یں ان کا کلام شعریت کے توام سے دوآتشہ بلکہ سہ آتشہ بن گیا ہے ۔ عامی اور عارف دونوں ان کے کلام کی
کے معترف ہیں ۔ صوفی اور عارف ان کے کلام سے صوفیانہ اور عارفانہ نکات اخذ کرتے ہیں اور غالب انہیں
خانقاہ نظر آتے ہیں ۔ اور بعض حضرات کو ان کے کلام میں تاریخی واقعات و حالات کا شعور ملتا ہے اور وہ ا
اشعار سے عصری رجحانات کا پتہ لگاتے ہیں ۔ دراصل یہ عظیم شاعر واقعات عالم سے عبرت حاصل کرتا ہے ۔
اسی رنگ کو اپنے اشعار میں سمو دیتا ہے ۔ وہ ایک عبوری دور سے گذر رہے تھے جو ابتلا اور پریشانی کا ز
تھا ۔ انہوں نے اس دور سے بے اطمینانی، بیزاری اور ناآسودگی کا اظہار کیا ہے ۔ طنزیات، شگفتگی، تہ
اور فلسفے سے ان کا کلام معمور ہے ۔ اُن کے فکر و فن میں قدیم روایت کی جھلک بھی ملتی ہے اور دورِ نو کی
بھی قدیم اور جدید کی ہم آہنگی نے ان کی شاعری کو عظیم المرتبت بنا دیا ہے ۔ لیکن اس عظمت کے حصول کے
انہیں سخت ریاضت کرنی پڑی ۔ رفتہ رفتہ انہیں اپنی افضلیت اور شاعرانہ عظمت کا احساس ہوا ۔ مخالفین کی
طنز سے جو پریشانی پیدا ہوتی تھی وہ خود اعتمادی سے بدل گئی ۔ اپنے انداز بیان پر نازاں ہونے کا احساس پید
اسی لئے اپنے دور کے تمام شعراء پر اپنے انداز بیان کو فوقیت دیتے ہیں ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

انداز بیان پر یہ ناز حقیقتاً ان کی شاعرانہ عظمت کی نشان دہی کرتا ہے ۔

غالب کی آمدنی کم اور مصارف بے انتہا تھے ۔ اکل و شرب میں ان کی آمدنی ختم ہو جاتی تھی یہاں تک
قرض دام لے کر زندگی کے ایام گزارتے تھے ۔ شراب نوشی کی عادت نے انہیں مقروض بنا دیا تھا ۔ اس کا اعتراف
ایک شعر میں کرتے ہیں ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

قرض کی مے نوشی اور فاقہ مستی نے انہیں رسوائے عالم بنا دیا تھا ۔ اپنی رسوائی، بدنامی کو ایک شعر میں بیان کر رہے
لیکن شاعرانہ تعلی بطرز احسن ادا کی گئی ہے ؎

ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

انہوں نے اپنے زمانے کا مطالعہ نہایت غور و فکر سے کیا تھا ۔ اپنی شاعری میں حقیقی اور صحیح زندگ

ستعاروں میں بیان کر گئے ۔ آلامِ روزگار پر نظر ڈال کر ذاتی کا ہشوں کو طنز یہ پیرایہ میں بیان کر کے اسے آفاقیت عطا کی۔ ان کی شاعری داخلیت کے ساتھ خارجیت کی بھی آئینہ دار ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اشعار کو گنجینۂ معانی کا طلسم کہتے ہیں لہ

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

زمانے نے ان کی زندگی میں اُن کے کلام کی قدر نہ کی ۔ اس ناقدری اور ناشناسی پر ان کا دل کڑھتا تھا انہیں اپنے کلام کی عظمت و اہمیت کا بے حد احساس تھا ۔ چنانچہ اپنے دیوان کو نہایت فضل و برتری عطا کرتے ہیں لہ

گر شعر و سخن بدہر آئین بودے
دیوانِ مرا شہرتِ پروین بودے
غالبؔ اگر این فنِ سخن دین بودے
آن دین را کتابِ ایزدی این بودے

بقول ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری ۔

کلامِ غالبؔ سنی سنائی باتوں کا بیان نہیں بلکہ قلبِ غالبؔ کے مشاہدات کا آئینہ ہے ۔ اس رباب پر دستِ قدرت نے سارے سُر ایک ایک کر کے بجائے ہیں ۔ اور کلامِ غالبؔ انہی سروں کی صدائے بازگشت ہے"

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اُن کی شاعرانہ صناعی، حسن آفرینی، نکتہ بینی اور ژرف نگاہی نے انہیں بت عرانہ عظمت عطا کی۔ یہ اوصاف ان کی نازک آفرینی اور شاعرانہ تعلّی کے بیّن اور پختہ شاہد ہیں۔ اسی لئے انہوں نے اپنے کلام کی دلیل میں بجا طور پر صحیح کہا ہے ؎

ہو جہاں گرم غزل خوانی نفس
لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

تضمین بر غزلِ غالب

(مزاحیہ)

★

ڈاکٹر سید انعام الحسن ظریف

واہ کیا انداز ہے ٹیڈی بتِ بے پیر کا
جسم آئینہ بنا عریانیِ تعمیر کا
پردہ کوشی پر گماں ہوتا ہے ٹیڑھی کھیر کا
نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن، ہر پیکرِ تصویر کا

غم کی یورش، درد کی ہنگامہ آرائی نہ پوچھ
ہجر میں کٹتی ہیں راتیں کسطرح، بھائی نہ پوچھ
حال ہو جاتا ہے کیا، بجتے ہیں جب ڈھائی نہ پوچھ
کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

اُن کے ابرو پر پسینہ ہے، تو پھر کیا چاہیئے
حُسن کا موتی اسی کانٹے پہ تولا چاہیئے
تختۂ مشقِ ستم ہاں کوئی مجھ سا چاہیئے
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

توسنِ فکرِ رواں جب تیز رفتاری پہ آئے
میری لکنت اُس پہ کاٹھی کس کے جب آسن جمائے
باگ منہ زوری کے جھٹکوں پر، کہاں تک بل نہ کھائے
آگہی دامِ شنیدن جسقدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

کہہ رہا ہے کچھ عجب دُھن میں حریفِ بے نوا
شعلۂ جاں ہے سوزِ دل، اُس پر مہینہ جُون کا
قیدِ ہستی، فرشِ زندانِ ستم تپتا ہوا
بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

پروفیسر سردار احمد خان ایم اے
اسلامیہ کالج سکھر

غالب اور علمِ نفسیات

دورِ جدید میں حکمت و دانش کے فروغ نے مختلف علوم کی درجہ بندی اس طرح کی ہے کہ کسی ایک علم کے بسیط مطالعے کے نتیجہ میں الحاقی علوم بھی معرضِ وجود میں آگئے اور ہر شعبہ علم بجائے خود علیحدہ علم کی صورت اختیار کر گیا۔ سترھویں صدی عیسوی میں یورپ میں جب احیائے علوم ہوا تو بے شمار عالموں نے مختلف علوم کے بارے میں نئے نئے نظریات پیش کیے اور ہر علم کی جداگانہ طور پر ترتیب و تدوین کی۔ فلسفہ ایک قدیم علم ہے جس کی نشو و نما یونان میں ہوئی۔ عقلائے یونان نے اس علم کو اپنے خونِ جگر سے سینچا اور عہد بہ عہد اس میں اضافے ہوتے رہے۔ کائنات اور اشیائے کائنات کے بارے میں بے شمار نظریات وضع ہوئے اور انسان اور اس سے متعلق اشیاء کا گہری نظر سے مطالعہ کیا گیا۔ انسان چونکہ اس دنیا میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اس لیے انسانی افعال و اطوار کا بہت غور و فکر سے مطالعہ کیا گیا۔ اور انسانی سیرت و کردار سے متعلق اصول وضع کیے گئے۔ یہ تمام افکار و خیالات انسانی زندگی کے مذہبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور روحانی مسائل سے متعلق تھے جن کو ہم مختصر طور پر فلسفۂ حیاتِ انسانی کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ ان تمام مسائل کا جائزہ خالصتاً عقلی اور فکری تھا۔ اور مادے کی عینک لگا کر روحانیت کی حقیقت کو پانے کی کوشش کی گئی تھی یہی وجہ ہے کہ علمائے یونان بیشتر مقامات پر نسلِ انسانی کی رہنمائی کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔

عقل کے دھندلکوں اور مادہ کی کثافت پر جب اسلام کی شعاعوں کا عکس پڑا تو عقلِ انسانی نے مادی حقائق کو روحانی اقدار سے فروتر پایا۔ اور روحانی بصیرت اور حکمتِ ملکوتی نے کائنات اور اشیائے کائنات کے بارے میں ایک واضح تصور پیش کیا اور انسان کو مرکزی کردار قرار دے کر اس کو ایک ایسی سیرت اور کردار کی تعمیر کا درس دیا جو فطرتِ کائنات سے ہم آہنگ ہو۔ فلسفہ کی پیچیدہ راہوں کو روحانی بصیرت سے طے کیا گیا اور انسانی اطوار و عادات کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالا گیا اور علما و عقلا کا ایک ایسا گروہ تیار ہوا جس نے قدیم علوم کی ہیئت ترکیبی میں دور رس تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ لیکن ایک وقت پھر ایسا آیا کہ احیائے علوم کی تحریک مغربی مادہ پرستو

کے ہاتھوں میں جا پہنچی۔ اور عقلی بنیاد پر نئے مفروضات وضع کیے گئے۔ اور ہر علم کی اتنی چھان پھٹک کی گئی کہ اس سے بہت سے دیگر علوم پیدا ہوگئے۔ یہی حال علم نفسیات کا ہے۔ یہ پہلے فلسفہ کی ایک شاخ تھا لیکن سترھویں صدی اور اٹھارویں صدی عیسوی میں اس کو علاحدہ ایک باضابطہ علم کا درجہ دیدیا گیا۔ اس علم کے نامور علماء ڈس کارٹ Descartes (۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۰ء) ہابز Hobbes (۱۵۸۸ء تا ۱۶۷۹ء) لاک Locke (۱۶۳۲ء تا ۱۷۰۴ء) ہیوم Hume (۱۷۱۱ء تا ۱۷۷۶ء) جان مل John Mill (۱۸۰۶ء تا ۱۸۷۳ء) ہربرٹ اسپنسر Herbert Spencer (۱۸۲۰ء تا ۱۹۰۳ء) فرائیڈ Freud (۱۸۵۶ء تا ۱۹۳۹ء) گذرے ہیں ان فلسفیوں اور محققوں نے اپنے اپنے زاویہ ہائے نگاہ سے علم نفسیات کو پیش کیا ہے۔ حتیٰ کہ ۱۸۷۹ء میں ایک جرمن ماہر نفسیات ولیم ونٹ William Wundt نے لیپزگ کے مقام پر ایک معمل گاہ بھی قائم کردی جہاں ذہنی نفسیات کا مطالعہ تجرباتی اور مشاہداتی طور پر کیا جاتا تھا۔ ان تمام باتوں کے پس پردہ کونسے عوامل تھے اس سے قطع نظر ہم یہ ضرور محسوس کرتے ہیں کہ یورپ میں جدید علم نفسیات کو فروغ غالب سے پہلے نہیں ہوا۔ انسانی کردار افعال و اطوار اور فطرت کائنات سے ان کا باہمی تعلق وغیرہ کے جو نظریات وضع ہوئے وہ آج بھی تغیر پذیر اور لچکدار یا دوسرے الفاظ میں مفروضات پر قائم ہیں لیکن ان مفکرین مغرب سے بہت پہلے ایک مشرقی شاعر جس نے علم نفسیات کی باضابطہ تحصیل کہیں سے نہیں کی تھی۔ اپنی فطری فرزانگی اور باطنی مشاہدے کے ذریعہ ۱۸۶۹ء تک ایسے مستحکم نفسیاتی نظریات پیش کرگیا جن کی بنیاد حقائق پر ہے اور جو آج بھی ناقابل تردید ہیں۔

غالب اردو کے محض ایک شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی شخصیت بہت پہلو دار اور ہمہ رنگ ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں جا بجا علم نفسیات کے اہم مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ اور اپنے اصولوں کو اپنے مخصوص طرز استدلال سے تقویت دے کر قابل فہم اور دلنشیں بنایا ہے۔ آج ہم غالب کے اس پہلو کا مطالعہ کریں گے جس میں انھوں نے نفسیات انسانی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اس کی جبلت اور فطری تقاضوں کی پردہ کشائی کی ہے۔ غالب نے یہ اصول کسی خود ساختہ مفروضہ پر قائم نہیں کئے ہیں بلکہ فطرت انسانی کے عمیق مطالعہ کے بعد انھوں نے مختلف کیفیات بیان کی ہیں۔ غالب نے ایک بھرپور تہذیبی معاشرتی اور مجلسی زندگی بسر کی تھی۔ ان کا تعلق اپنے دور کے ممتاز ترین افراد سے لیکر گمنام ترین افراد تک سے تھا۔ انھوں نے اقتدار کو بنتے اور بگڑتے دیکھا۔ عروج و زوال کی کیفیات کا مطالعہ کیا۔ وہ خوشحالی بے سرو سامانی اور لاچاری کے حالات سے گذرے اور مسرت و شادمانی اور غم و آلام سے پُر زندگی کے دونوں رخ دیکھے تھے۔ اس لیئے ان کے مشاہدات اور تجربات حقیقت سے بے حد قریب ہیں اور آئے دن ہمارے اپنے مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔ غالب کے یہ مشاہدات زندگی کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور انسانی زندگی کی مختلف المنوع کیفیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے دور کے حالات کو جانچا اور پرکھا۔ ان کا سابقہ جن لوگوں سے پڑا اور جو مشاہدات کئے ان کو نہایت صحت کے ساتھ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ انسانی افعال و عادات کا غائر نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد ہی وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں۔

میں آدمی نہیں ہوں پر آدم شناس ہوں

غالب کے ہاں ہم کو نفسیات کا درجہ بدرجہ مطالعہ کرنے کی سہولت حاصل ہے۔ پہلے وہ انفرادی نفسیاتی مطالعے مثلاً ہلے اور تجربے میں مصروف نظر آتے ہیں اور انسان کی ذہنی کیفیت اور اس کی جبلی صفات کا تجزیہ کرتے نظر آتے ہیں اور بعد میں وہ اجتماعی طور پر آفاقی حقائق کا جائزہ لے کر یہ بتاتے ہیں کہ انسان پر ان کا کتنا اثر پڑتا ہے اور انسان ان کلیات کا کہاں تک تابع ہے۔ ذیل میں ہم مختلف عنوانات کے تحت ان کے نفسیاتِ انسانی کے مشاہدے کو پیش کریں گے۔

۱۔ جذبۂ محبت

فطری طور پر انسان میں کچھ احساسات و جذبات مشترک ہوتے ہیں۔ عام طور پر اردو شاعری میں عشق و محبت کی کارفرمائی ہے۔ اور محبت کے جذبہ کو اس کی اصلیت سے بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ جذبہ ایک شدید قسم کی ہیجانی اور اضطراری کیفیت کی پیداوار ہے اور اس میں دو ذہنوں کے درمیان کچھ مشترک اقدار کا ہونا لازمی ہے۔ صرف ایک ذہن اگر کسی ہیجانی اور اضطراری کیفیت سے متاثر ہے تو دوسرے ذہن پر اس کیفیت کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ مرتب نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے غالب نے اس کو ایک طرفہ اضطراری کیفیت قرار دیا ہے۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل — کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

عام ذہنی کیفیت پر جب کوئی بیرونی ہیجان خلل اندازی کرتا ہے تو دماغ اس بیرونی ہیجان کے زیرِ اثر ہو جاتا ہے۔ اور اس کی حرکات و سکنات سے اس مخصوص کیفیت کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ عمر کے ایک حصہ میں جنسی شعور اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ عنفوانِ شباب میں ذوقِ نظر کا طالب ہوتا ہے۔ اور پا لینے کا جذبہ ذہن کے گوشوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں ہے کہ یہ جذبات مستقل کیفیت کے حامل ہوں۔ لہٰذا کسی وقتی کیفیت کے زیرِ اثر اگر ذہنی شعور پراگندہ ہوتا ہے۔ تو اس کو ایک مستقل کیفیت نہیں کہا جا سکتا۔ یہی ہیجان جب عام ہو جائے تو ذہن خس و خاشاک کی طرح سلگنے لگتا ہے۔ لیکن جنسی کیفیت کی تسکین پذیر ہونے کے بعد ذہنی کیفیت نارمل ہو جاتی ہے۔

زدرِ شعلہ خس یک نفس ہے — ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

اس لیے غالب نے محبت کو ادراکِ حسن اور حصولِ حسن کو ہوس کی اصطلاحوں سے واضح کیا ہے۔ جذبۂ محبت ایک مستقل چیز ہے جبکہ ہوس ذہنی اضطراب اور جنسی ہیجان کا پیدا کردہ ہے۔ جذبۂ محبت کی پختگی کا اثر شخصی کردار پر پڑتا ہے اور کردار بندہ میں ذوقِ رسم سے صنعت کی طرف مراجعت کرتا ہے۔ اس وقت ظاہری کیفیات اصل حقیقتِ حال کی شارح بن جاتی ہیں۔

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

اس لیے جذبہ کا استحکام داخلی محرکات پر موقوف ہے۔ اگر قلبی کیفیت کو جذبۂ محبت برقرار نہیں رکھے گا تو عشق کا شعلہ خود بخود سرد پڑ جائے گا۔

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی — تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی

۲۔ نفسیاتِ نسواں :- نوعِ انسانی ہونے کے اعتبار سے مرد و عورت کے جذبات و احساسات یکساں ہوتے ہیں

لیکن کچھ خاص قسم کی عادتیں ایسی ہیں جو صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہیں۔ غالب نے صنف لطیف کی عادات، انداز فکر، طرز عمل اور ذہنی کیفیات کا مطالعہ بہت گہری نظر سے کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ نسائیت بظاہر سادہ ہے۔ لیکن اس سادگی کے پس پردہ، بہت چالاکی پوشیدہ ہے۔ بظاہر ہم حسن کو لاابالی سمجھتے ہیں لیکن حقیقت میں وہاں پوری ہوشیاری کارفرما ہے۔ حسن کے اس تجاہل اور تغافل کا مطلب محض یہ ہے کہ طالب کو اس بات کی جرائت دلائی جائے کہ وہ حسن کی جانب بڑھے۔

سادگی و پرکاری بےخودی و ہشیاری حسن کو تغافل میں جراءت آزما پایا

نسائیت اس بات کا اقرار نہیں کرتی کہ وہ وابستگی رکھتی ہے۔ غالب حسن کے اس تصنع کا پردہ چاک کرکے خود حسن ہی سے حقیقت حال کا اعتراف کرا لیتے ہیں۔

کہتے ہو نہ دیں گے دل ہم نے گر پڑا پایا دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

خود نمائی کا جذبہ صنف نازک میں صنف دگر سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غالب تصویر کشی کا فن صرف اس وجہ سے سیکھتے ہیں کہ مصور بن کر وہ حسینوں کی محفل میں بار پاسکیں گے۔ کون ہے جو اپنی تصویر بنوانے سے دلچسپی نہیں لے گا۔

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

صنف نازک کا عمل ہمیشہ اس کے رجحان سے مختلف ہوتا ہے۔ دل کی بات ظاہر ہونے نہ دینا اس کی سب سے بڑی کوشش ہوتی ہے۔ غالب اس مخصوص طرز عمل کو دوسرے رخ سے دیکھتے ہیں۔

دوستی کا پردہ ہے بے گانگی منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

صنف نازک کی چشم اشکبار صنف قوی کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ آنکھ سے ٹپکا ہوا ایک آنسو مرد کے دل کے تمام غبار کو دھو دیتا ہے۔ غالب نے دونوں کی نفسیاتی کیفیات کا نہایت عمدگی سے تجزیہ کیا ہے۔

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا قیامت ہے یہ اشک آلود ہونا تیری مژگاں کا

۴۔ نفرت :۔ نفرت کا جذبہ محبت کے جذبے سے زیادہ تند و تیز ہوتا ہے۔ جب اس کا شدید قسم کا عمل ہوتا ہے۔ تو جس سے نفرت ہوتی ہے اس کا ذکر اگر کوئی پسندیدہ شخص بھی کرے تو گوارا نہیں ہوتا۔ بلکہ بسا اوقات اگر پسندیدہ شخص برائی کے ساتھ بھی اس شخص کا نام لے جس سے نفرت ہے تو نفرت کرنے والا پسندیدہ شخص کو بھی ناپسند کرنے لگتا ہے۔

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

یا

دشمنی نے میری کھویا غیر کو کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

غالب نے نفرت، دشمنی اور عداوت کے بارے میں اثباتی پہلو کو ملحوظ رکھا ہے۔ یہ ان کا ایک بنیادی تصور ہے۔ ان کے نزدیک نفرت، دشمنی اور عداوت دراصل دوستی اور آشنائی کی دلیل ہے کسی اجنبی اور ناواقف شخص سے نہ نفرت ہو سکتی ہے نہ

دشمنی اور عداوت ۔ یہ جذبات اسی شخص کے بارے میں پرورش پائیں گے جو واقف کار ہو جس سے راہ و رسم رہی ہو اور جو کبھی عزیز اور پسندیدہ رہا ہو ۔

خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہوجائے　　غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہوجائے

نفرت و عداوت دو ہستیوں کے درمیان ایک گہرے رشتے کو ظاہر کرتی ہے ۔ جتنی زیادہ نفرت یا عداوت ہوگی اتنا ہی دونوں کے مابین گہرا تعلق رہا ہوگا ۔

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے　　کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

۴۔ حسد ۔ معاشرتی اور مجلسی زندگی میں ایک دوسرے پر برتری اور تفوق حاصل کرنے کا جذبہ عام ہوتا ہے ۔ ہر شخص مسابقت کی جنگ میں مصروف نظر آتا ہے ۔ بسا اوقات ذاتی اور ودیعت کیے ہوئے جوہروں کی بنا پر ایک شخص اپنے دور میں دوسرے ہم چشموں سے گوئے سبقت لے جاتا ہے ۔ اس وقت ودیعت کیے ہوئے ہنر اور اکتسابی ہنر میں آویزش اور ٹکراؤ ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں اہل ہنر کے ساتھ حسد اور کینہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ۔ پورا ماحول اس کے خلاف سرگرم کار ہو جاتا ہے اور معاشرے میں اسے سخت اذیت ناک زندگی بسر کرنا پڑتی ہے جب کسی شخص کو ایسے حالات سے گذرنا پڑے تو غالب کے نقطۂ نظر سے وہ اس کے کمال فن کی دلیل ہے اور حالات کا نامساعد ہونا اس کی دولت علم کی زکوٰۃ ہے ۔

حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجے　　ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کیجے

یا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے　　بے وجہ ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

اور

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل　　دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہل دنیا جل گیا

۵۔ رشک و رقابت ؛۔　ارتباط و یگانگت کے نتیجہ میں جذبہ رشک و رقابت پیدا ہوتا ہے خلوص اور محبت کی زیادتی اس جذبہ کو تقویت دیتی ہے اور بسا اوقات اپنے مفاد میں کام کرنے والے کے خلاف رشک پیدا ہونے لگتا ہے ۔

گذرا اسد مسرتِ پیغامِ یار سے　　قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

ہر چند کہ جس سے تعلقِ خاطر ہے ۔ اس پر کامل اعتبار ہے پھر بھی رشک دامن نہیں چھوڑتا

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے　　وگرنہ خوفِ بد آموزیٔ عدو کیا ہے

جذبہ رقابت کی تسکین غیر کو معمولی سی تکلیف پہنچنے سے بھی ہو سکتی ہے ۔

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا　　نالہ کرتا تھا وے طالبِ تاثیر بھی تھا

کبھی کبھی رشک کے جذبے اور شخصی مزاج میں عدم مطابقت کی وجہ سے عجیب گومگو کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف　　عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

۴۔ **خوف** :- خوف کی حالت میں ذہنی اور جسمانی کیفیتیں ایک خاص نہج پر نہایت سرعت سے کام کرتی ہیں۔ کچھ واقع ہو جانے کا خوف انسان کو آنے والے واقعہ کے لئے مستعد و تیار رکھتا ہے۔ کبھی غیر متوقع طور پر اگر کوئی بات واقع ہوتی ہے تو فی الفور پوشیدہ قوتیں بچاؤ کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھی کسی نہ ٹلنے والی بات سے بچنے کے لئے انسان بہت دلچسپ پناہ گاہیں تلاش کرنا چاہتا ہے۔ اس قسم کی ایک پناہ گاہ غالب کے ذہن کی بھی بنائی ہوئی ہے۔

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین　　ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

۵۔ **انتقام** :- انتقام کا مادہ ہر شخص میں ہوتا ہے۔ یہ جذبہ اتنا شدید ہے کہ دیگر شخصی اوصاف پر غلبہ پاکر انسان کو یکسر غیر انسانی حرکات کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ یہ جذبہ کبھی کبھی ایسی ہستیوں کے خلاف بھی پیدا ہوتا ہے جن کا بال بیکا ہونا بھی ہمیں گوارا نہیں ہوسکتا۔

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا　　بارے اپنی بے کسی کی پائی ہم نے داد یاں

یا

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر　　آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیئے

انتقامی جذبہ کو اس طرح بھی تسکین ہوتی ہے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے　　صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

۶۔ **مصلحت کوشی** :- عملی زندگی میں انسان قدم قدم پر محتاط رہتا ہے۔ وہ ماحول اور اپنے عمل میں مطابقت رکھتا ہے۔ معاملہ فہمی اور مصلحت کوشی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اگر ایک شکل سے دلی مدعا پورا نہیں ہوتا تو دوسرے طریقہ سے حصول مقصد کی کوشش کرتا ہے

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

کبھی کسی فرد کی توجہ کسی دوسرے فرد پر ہوتی ہے تو دیگر افراد جو اس سے تعلق خاطر رکھتے ہیں اول الذکر کو سرد مہر اور بے وفا کہتے ہیں۔ اس وقت وہ شخص جس پر عنایت ہو رہی ہے دوسروں کے الزامات کو زائل کرنے اور اپنے مہربان کو متاثر نہ ہونے دینے کے لئے کچھ اور ہی بات کہتا ہے۔

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں　　ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

دوست اور دشمن کی تمیز بہت مشکل ہے۔ یہ وقت پڑنے پر ہی معلوم ہوتا ہے کہ کون دوست ہے اور کون زمانہ ساز اس لئے آزمائش کے لئے کبھی یہ طریقہ اختیار کر لینا بھی مناسب ہے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب　　تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

کبھی انسان دشمن کو بھی دوست بنا لیتا ہے اور اس کا رازدار بن کر در پردہ اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

تاکرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو — دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

اس قبیل کا ایک یہ بھی عمل ہے جس میں

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام — مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

۹۔ معاملہ فہمی :- کسی حقیقت سے آگاہ ہونے کے لئے تجربہ شرط ہے۔ لیکن عملی زندگی میں ہم کبھی کبھی بغیر تجربہ کئے بھی عام ظاہری کیفیات اور تاثرات سے معاملے کی حقیقت کو پہچان لیتے ہیں۔

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا — نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

۱۰۔ احساسِ فخر اپنی خداداد صلاحیتوں کا احساس شخصیت کو خود بخود ہو جاتا ہے۔ اگر اس جیسی خوبیوں کا حامل کوئی دوسرا اس کی نظر میں نہیں ہوتا ہے اس وقت صاحبِ صلاحیت فرد اپنی یکتائی کا دعویٰ کرتا ہے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق — ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اور

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں — روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

۱۱۔ جذبۂ آزادی :- فطرتِ انسانی آزادی کی خواہاں ہے۔ وہ کسی بیرونی دباؤ یا تسلط کو قبول نہیں کرتی۔ انسان کا جسم قید ہو سکتا ہے۔ روح کو غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ ظلم سلسلۂ حیات منقطع کر سکتا ہے لیکن روح کی پکار کو دبایا نہیں جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی قوت کو اخراج کا راستہ نہیں ملتا تو وہ شدید سے شدید تر ہو جاتی ہے مثلاً

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے — زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

اور

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو — لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

یا

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے — رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

۱۲۔ ضد بندشوں کے خلاف فطرتِ انسانی آواز اٹھاتی ہے۔ پابندی کے ردعمل کے طور پر اس میں بغاوت اور ضد کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے — آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

اور

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں — روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں — بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

۱۳۔ خودداری :۔ اپنی روش پر قائم رہنا اور سبک سری سے بچتے رہنا غیرت وحمیت اور خودداری کی دلیل ہے خودداری ایک اعلیٰ صفت ہے جو عظمتِ کردار کا پتہ دیتی ہے ۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں ۔۔۔ سبک سر ہو کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

بلکہ

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم ۔۔۔ الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے ۔۔۔ یار کا دروازہ گر پائیں کھلا

اور

تغافل دوست ہوں میرا دماغِ عجز عالی ہے ۔۔۔ اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے

۱۴۔ تحفظِ کردار :۔ شدتِ جذبات میں ڈوب کر انسان کسی فعل کو کرنا چاہتا ہے لیکن اس وقت عظمتِ کردار مانع آتی ہے خواہ آرزوؤں کا خون ہی کیوں نہ ہو جائے ۔

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر ۔۔۔ ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

۱۵۔ پختگیٔ عادت :۔ زندگی میں ہم بعض عادتوں کے شعوری ولاشعوری طور پر تابع ہو جاتے ہیں۔ ہم بہت سی حرکتیں بغیر سوچے سمجھے کرتے رہتے ہیں۔ کبھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمارے کسی عمل کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا ہم اس عمل کو عادتاً دہراتے رہتے ہیں۔

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب ۔۔۔ مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

یا

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ۔۔۔ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

کبھی ہماری تعمیرِ عادت یا پختگیٔ عادت کا علم دوسروں کو بھی ہو جاتا ہے اور ہماری عادت کا یقین ان کے دل میں اتنا راسخ ہو جاتا ہے کہ خواہ وہ فعل ہم سے سرزد نہ بھی ہوا ہو مگر وہ اسے ہم ہی سے منسوب کرتے ہیں۔

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا ۔۔۔ غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

۱۶۔ عفو و درگذر معاف کر دینے کا جذبہ انتقام لینے کے جذبے کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ اکثر ہم یہ تہیہ کر لیتے ہیں کہ کسی مسئلہ پر مخالف سے باز پرس کریں گے لیکن جب وہ مسئلہ وقت گذرنے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے تو ہم اپنے اس ارادے کو ترک کر دیتے ہیں۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب ۔۔۔ خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

۱۷۔ پشیمانی پشیمانی ردِ عمل ہے کسی غلط کام کو سرانجام دینے کا۔ جس قسم کا غلط فعل ہوگا اسی نوعیت سے پشیمانی بھی ہوگی۔

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

ایک دوسری جگہ

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

پشیمانی کی ایک یہ بھی صورت ہے۔

کبھی نیکی بھی اُسکے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے جفائیں اپنی کر کے یاد شرما جائے ہے مجھ سے

یا

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار اے کاش جانتا نہ تری رہ گذر کو میں

۱۸۔ **اذیت پسندی** انسانی فطرت کا ایک دلچسپ پہلو اذیت پسندی کا ہے۔ کبھی یہ جذبہ اذیت رسانی کی صورت میں رونما ہوتا ہے جس میں دوسروں کو ایذا دے کر لطف محسوس ہوتا ہے۔

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ مبارک باد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

اور

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

اور کبھی خود کو اذیت پہنچا کر سکون محسوس ہوتا ہے۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

اور

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

یا

سر کھجاتا ہے اگر زخمِ سر اچھا ہو جائے لذتِ سنگ بہ اندازۂ تقریر نہیں

۱۹۔ **جبلت حصول** :- ہماری ساری زندگی خواہش اور طلب سے عبارت ہے۔ ارمانوں اور تمناؤں کا ایک طوفان ہے جو امنڈتا رہتا ہے۔ بہت سے ارمان پورے ہونے پر بھی مزید کی تکمیل کیلئے دم نکلتا رہتا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بلکہ کبھی کبھی تو یہ حالت ہو جاتی ہے۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

جبلت حصول کے ذریعہ ہم نہ صرف جد وجہد کی طرف مائل ہوتے ہیں بلکہ اس کی وجہ سے ہماری زندگی میں ایک ہماہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ہمارا ذہن خالی اور ہماری زندگی بے مقصد ہو تو عمر بسر کرنا دشوار ہو جائے۔ بغیر کسی مشغلہ کے یہ مختصر زندگی کاٹے نہیں کٹ سکتی

یہی وجہ ہے کہ ہم یہ جانتے ہوئے بھی کہ مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکتی ہم اپنے کام میں معروف رہتے ہیں اور اسی طرح زندگی مصروف رہ کر کٹ جاتی ہے۔

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کہوں   آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

اور

بس ہجومِ نا امیدی خاک میں مل جائے گی   وہ جو اک لذت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے

۱۹۔ **حوصلہ:**- جہدِ زندگی میں حوصلہ اور ہمت شرط ہے۔ ظاہری اسباب کی موجودگی اور اس کی فراہمی کسی معجزاتی انداز سے نہیں ہوتی۔ بلکہ آرزو اور طلب جو کسی مطلب کے حصول کے لیے ہوتی ہے اسباب و سامان فراہم کرتی ہے۔ اگر حالت بے سرو سامانی کو عدمِ جد و جہد کا جواز بنا لیا جائے تو مقصدِ زندگی فوت ہو جاتا ہے۔ حصولِ مقصد کے لیے جذبہ اور طلب لازمی ہے۔ یہی پریشان خاطر اسبابِ جمعیتِ دل فراہم کرتی ہے۔

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست   ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

اگرچہ کامیابی اور ناکامی کے احساس ایک دوسرے سے الجھتے رہتے ہیں۔ اس جنگ میں اہل معاملہ سخت کشمکش اور اضطراب میں مبتلا ہوتا ہے۔ لیکن کامیابی اور ناکامی کے ان احساسات کے درمیان مقصد کو پانے کے لیے ایک بیچ کا راستہ انسانی شعور خود نکال لیتا ہے۔ اور غالب کی اصطلاح میں وہ عجزِ ہمت ہے۔ یہ عجزِ ہمت یا شعور خود اعتمادی انسان کو ذاتی تحفظ اور بچاؤ کا احساس دلاتی ہے

یاس و امید نے اک عربدہ میداں مانگا   عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

راہِ طلب میں بہت صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ راحت طلبی قدم اٹھانے نہیں دیتی۔ لیکن حوصلہ اور یہی طریقہ کار اختیار کرتا ہے۔

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی   ہر قدم سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا

۲۰۔ **احساسِ محرومی** - زندگی بجائے خود ایک المیہ ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک ہم کو محرومیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے   برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

یہ شکستگی اور قنوطیت زندگی کا عنوان بن جاتی ہے اور زندگی کا ہر غم سرنگونی اور گرانباری میں اضافہ کر دیتا ہے اور انسان آہ و زاری کرنے لگتا ہے۔

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا   ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

اور

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے   نالہ پابندِ نے نہیں ہے

۲۱۔ **مایوسی** محرومی و مایوسی اور ناکامیوں کا غم مل کر ایک اضمحلالی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ دنیاوی سہارے جب

ساتھ چھوڑ دیتے ہیں تو دل شکستگی کے باعث انسان خدا کی امداد و اعانت سے بھی مایوس ہونے لگتا ہے۔

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے　　کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے۔

اور جب دنیا اندھیر ہو جاتی ہے تو زندگی بوجھل معلوم ہوتی ہے۔ اور شمع زندگی کو گل کرنا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا　　نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

لیکن سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ خود موت بھی اپنے اختیار میں نہیں ہے۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں　　وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

ان کیفیات سے گذر کر انسان خود بخود اس حقیقت کو سمجھ لیتا ہے کہ جب تک زندگی قائم ہے آفاتِ دنیاوی سے نجات نہیں مل سکتی کیونکہ

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یہیں سے انسانی شعور میں ایک خاص قسم کا تحمل اور نظر افروزی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ غم و آلام کو حیات کا لازمہ سمجھ لیتا ہے۔ اور ہنگامہائے روزگار کو غنیمت سمجھتا ہے

نغمہ ہائے غم ہی کو اے دل غنیمت جانیئے　　بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

کیونکہ

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق　　نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

مزید یہ کہ اگر انسان غم کا خوگر ہو جائے اور خوشی کے تصور کو محو کر دے تو پھر غم اور کشاکشِ حیات کا عمل دخل کم ہو جاتا ہے

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج　　مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اور

شادی سے گذر کہ غم نہ ہووے　　اُردی جو نہ ہو تو دَے نہ ہووے

یہیں سے قناعت اور طمانیت قلب کا جذبہ انسان کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔ حالت بے سر و سامانی بجائے خود ایک دولت معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس طرح انسان بہت سی کلفتوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔

ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا　　عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

اور

نہ لٹتا دن کو تو یوں رات کو کیوں بے خبر سوتا　　رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

مزید یہ کہ ہر اکائی بجائے خود ایک اعدادی کشمکش ہے اگر سیر چشمی کے ساتھ حالات کو برداشت کیا جائے تو پھر اعدادی کشمکش خود ختم ہو جاتی ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

اسی کیفیت کو غالب ایک خاص نام "بے دلی" سے پکارتے ہیں اور اسی کے سہارے کشاکشِ دنیا دی کو آسان کر لیتے ہیں۔

بہ فیضِ بے دلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے ۔ کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

اس طرح کبھی کبھی خود فریبی کے ذریعہ وہ کسی تلخ حقیقت کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم ۔ گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مسائل حیات جتنے پیچیدہ ہیں اسی قدر نفسیاتی الجھنیں بھی مشکل و دشوار ہیں۔ ہر لمحہ انسانی ذہن مختلف جذبات وکیفیات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ غالب کے کلام میں انسانی ذہن کی بے شمار کیفیات موجود ہیں۔ زیر نظر مضمون میں اجمالاً چند مسائل کو پیش کیا گیا ہے ورنہ غالب کا ایک مفکر نفسیات کی حیثیت سے مطالعہ کیا جائے تو اس علم میں ان کو نامور علمائے نفسیات میں سرِ فہرست شمار کرنا چاہیئے علم نفسیات کے جن موضوعات پر انھوں نے اظہار خیال کیا ہے اس کی اہمیت اور افادیت اس لحاظ سے بہت زیادہ ہے کہ غالب ایک شاعر تھے۔ اور انھوں نے اس علم کے بنیادی نکات جس صحت کے ساتھ پیش کئے ہیں اس سے ان کے مشاہدے کی داد دینا پڑتی ہے اور یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ ان کا مطالعہ عمیق ہے اور انھوں نے ہر مسئلہ پر ایک مدلل طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ مغربی مفکرین نفسیات کے مقابلے میں ان کے نتائج زیادہ دقیق ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی مفکرین نے عقلی بنیادوں پر روحانی اقدار سے ہٹ کر غور کیا ہے۔ جبکہ غالب کے انداز فکر میں روحانی بصیرت کارفرما ہے۔ تصوف کے رموز ان کی رہبری کرتے ہیں اور حقیقتِ کائنات کا فہم و ادراک ان کے اصل حقیقت کو بہت جلد پا لینے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ انفرادی نفسیاتی الجھنوں سے ہٹ کر وہ اجتماعی اور آفاقی مسائل پر جب روشنی ڈالتے ہیں تو ان کی فکر کو پا نا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کے ہاں صرف الجھنوں کا ذکر ہی نہیں بلکہ ان کا حل بھی ہے۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جو حل انھوں نے پیش کئے ہیں وہ فطرت کے اصولوں کے عین بموجب ہیں اور اختلاف طبائع کے باعث ان کے لگائے ہوئے حکم میں تزلزل پیدا نہیں ہوتا وہ فطرتِ انسانی کو فطرتِ کائنات کے تابع رکھنا چاہتے ہیں۔ اور ان کے اس نظریہ کی رو سے پھر کسی تصادم کا امکان باقی نہیں رہتا۔

دنیاوی نفع ونقصان اور دیگر مسائل روحانی اقدار کے تابع ہیں۔ مذہبی اصولوں کی پابندی ذہن کو بالیدگی بخشتی ہے اور اس طرح بے شمار ضمنی اور غیر اہم باتوں سے ذہن آزاد ہو جاتا ہے۔ اس طرح غالب علم نفسیات کے واحد عالم ہیں جنھوں نے عقلی اور قلبی اقدار کو مربوط کر کے ایک منظم اور متوازن انداز فکر اختیار کیا ہے۔ ان کے ہاں تشنگی نہیں آسودگی ہے۔ اضطراب نہیں بلکہ سکون ہے۔ وہ مفروضات پر نتائج مرتب نہیں کرتے بلکہ مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں حقائق کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد اپنی رائے دیتے ہیں۔ اگر مغربی مفکرین سے ان کا مقابلہ کیا جائے تو وہاں سطحیت پوری طرح نمایاں ہے جبکہ غالب کے ہاں گہرائی اور آفاقیت ملتی ہے۔ وہ اپنے طرز استدلال سے سائل کو لاجواب نہیں بلکہ مطمئن کر دیتے ہیں اور ان کی عظمت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔

ابراہیم خلیل ایم، اے لیکچرار گورنمنٹ کالج دادو

غالبؔ اور علمِ نجوم!

شعرائے اردو میں صرف مومنؔ کو نجومی تصور کیا جاتا ہے اور انجم شناسی کی متعدد حکایتیں ان سے منسوب ہیں مطالعہ کلامِ غالبؔ سے پتہ چلتا ہے کہ غالبؔ بھی علم نجوم سے کما حقہٗ واقف تھے۔ لیکن وہ مومن کی طرح شعبدہ گری نہیں کرتے تھے۔ شعبدہ بازی سے میرا اشارہ چھپکلی اور چوری کے واقعات کی طرف ہے۔ کہتے ہیں ایک دن مومن اپنے احباب میں بیٹھے ہوئے تھے دیوار پہ ایک چھپکلی نظر آئی انھوں نے حکم لگایا کہ اس کا جوڑا فلاں جانب سے آئے گا کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک بساطی آیا اس نے سامان تجارت نکالا۔ سامان سے ایک چھپکلی نکلی اور دیوار پر چڑھ گئی اور دونوں چھپکلیاں ساتھ ساتھ چلی گئیں۔ اسی طرح ایک چوری کا واقعہ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ ایک شخص آیا اس نے کہا میرا زیور چوری ہو گیا ہے۔ مومنؔ نے حکم لگایا کہ تمہارا زیور چوری نہیں ہوا۔ وہ فلاں جگہ رکھا ہے۔ یہ واقعات صحیح ہوں یا غلط لیکن ان کی صحت کسی کے ماہر نجوم ہونے کی دلالت نہیں کرتی۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ ان کے برج طالع میں آفتاب اور ماہتاب دونوں جمع ہوں۔ علمائے نجوم کا کہنا ہے کہ اس قسم کے طالع کا حامل اگر اندھا دند بھی حکم لگا دے تو وہ بھی صحیح ہوتا ہے یہ سہم الغیب کی کارفرمائی ہوتی ہے اس استثناء کے علاوہ ائمہ فن کا کہنا ہے کہ اس قسم کے احکامات کے لئے ارتفاع معلوم کرنا طالع درست کرنا۔ زائچہ کھینچنا۔ ستاروں اور برجوں کو قائم کرنا۔ شرائط جبی اور ضمیر پوری کرنا وغیرہ وغیرہ ضروری ہے لطف یہ کہ جب مومن کوٹھے سے گرے تو حکم لگایا کہ میں پانچ دن یا پانچ ماہ یا پانچ سال میں مرجاؤں گا۔ چنانچہ پانچ ماہ کے بعد انتقال کیا یا تو یہ عالم کہ کھویا ہوا سامان بتا رہے ہیں اور چھپکلی کا جوڑا تلاش کر رہے ہیں اور اپنے معاملہ میں پانچ کا پہاڑہ پڑھ رہے ہیں۔ چہ خوش۔

مومن کی شاعرانہ عظمت سے ہمیں انکار نہیں دوسری صلاحیتوں کے علاوہ علم نجوم میں انکی مہارت کے بھی بہ دل معترف۔ لیکن ایسی بے سر و پا باتیں داستانوں اور افسانوں میں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ تاریخ۔ تحقیق و تنقید سے

سے ان کا کیا علاقہ۔

چونکہ غالب کے حالات میں اس قسم کے چٹپٹے نجوم کے قصے درج نہیں ہیں اس لئے کسی نے اس جانب توجہ نہیں دی بلکہ کسی کو اگر خیال بھی آیا ہوگا تو اس نے اسے غالب کی ظرافت پر محمول کیا ہوگا۔ حال آنکہ غالب جس دور سے تعلق رکھتے تھے اس میں طب، نجوم، شاعری، فلسفہ، منطق وغیرہ کا علم شامل نصاب تھا اور لازمی تصور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ میر مہدی کو ایک خط میں لکھتے ہیں[1]۔

"مجتہد العصر سلطان العلماء مولانا سرفراز حسین کو میری دعا
دینا اور کہنا حضرت ہم تم کو دعا کریں تم ہم کو دعا دو۔ میاں کس
قصّے میں پھنسا ہے؟ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا۔ طب و نجوم و ہیئت
و منطق و فلسفہ پڑھ جو آدمی بنا چاہتا ہے"

چونکہ خط کا انداز مزاحیہ ہے اس لئے نجوم پڑھنے کی نصیحت کو بھی جیسا ہم نے گزشتہ سطور میں عرض کیا مزاح پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ ان کے کلام سے مزید استناد فراہم کرنے سے پہلے یہ متعین کر لیا جائے کہ جس شعبہ سے مرزا متعلق تھے اس کے لئے کن علوم کا مطالعہ ضروری تھا۔ یا جو مقام وہ حاصل کرنا چاہتے تھے اس کے لوازم کیا تھے۔ مرزا کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ استاد شاہ مقرر ہوں اس لئے قربت شاہ لازمی ہوئی اب دیکھنا یہ ہے کہ مصاحبین شاہ کو کن اوصاف کا حامل ہونا چاہئیے۔ ان کی تعلیم کیسی اور کیا ہونی چاہئیے اور بادشاہ کے لئے کن لوگوں کا وجود لازمی ہے یا تھا۔

مولانا نظامی عروضی سمرقندی جو ایک بلند پایہ عالم بدیہہ گو اور بے نظیر شاعر اور فقید المثال منجّم تھے اور مختلف سلاطین کے دربار سے وابستہ بھی رہے تھے انھوں نے بادشاہوں اور سلاطین کی رہنمائی کے لئے "چہار مقالہ" تصنیف کیا تھا جس کا مقصد سلاطین کو یہ سمجھانا تھا کہ انھیں کس تعلیم، کس قابلیت، کس انداز کے مصاحب منتخب کرنا چاہئیں اور کن لوگوں کا وجود بادشاہوں کے لئے لازمی، ضروری اور ناگزیر ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ دبیر، شاعر، منجّم اور طبیب بادشاہ کے خواص ہیں اور ان کے بغیر چارہ نہیں۔ مولانا نے ان ہی چار فنوں کی مناسبت سے کتاب کا نام چہار مقالہ رکھا۔ تمہید میں ہر فن کا تعارف کرایا اور اس کی اہمیت کو واضح کیا اور ہر ایک کی متعدد مثالیں دیں۔ فرماتے ہیں[2]

"پس در ہر مقالتے از حکمت آنچہ بدین کتاب لائق بود آوردہ

---

[1] عود ہندی ص ۲۰۴ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔
[2] چہار مقالہ ص ۱۹ مرتبہ شعبہ تالیف و ترجمہ ادارہ شرقیہ دہلی ۱۹۴۹ء۔

شد۔ بعد ازاں دہ حکایت طرفہ از نوادر آں باب و از بدائع
آں مقالت کہ آں طبقہ را افتادہ باشد آوردہ آمد تا بادشاہ
را روشن شود و معلوم گردد کہ دبیری نہ خرد کارے ست،
و شاعری نہ اندک شغلے و نجوم علمی ضروری است و طب
صنعتی ناگزیر و بادشاہ خردمند را چارہ نیست ازیں چہار
شخص دبیر و شاعر و منجم و طبیب ۔

ظاہر ہے کہ جو شخص مصاحبت شاہ کا متمنی ہوگا وہ ان علوم کو حاصل کرے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ زمانہ قدیم کے وابستگان دولت کی تحریروں میں بالعموم اور بلند پایہ شعراء کے یہاں بالخصوص ان علوم پر قدرت کے اشارے ملتے ہیں۔ فارسی میں ظہیر فاریابی، خاقانی، انوری، قاآنی۔ اردو میں غالب، میر، سودا، ذوق کے قصائد میں ان علوم کی اصطلاحیں اور اشارے پائے جاتے ہیں ان میں سے کسی نے بھی مشتری کو جلاد فلک، مریخ کو قاضی فلک یا زہرہ کو نحس اکبر اور زحل کو رقاصہ فلک نہیں کہا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے نجوم کے اسماء اور اصطلاحات نہیں رٹ لی تھیں بلکہ ان کے اثرات ان کی چالوں سے واقفیت اور فن کے اسرار و رموز سے بھی کلی واقفیت بہم پہنچائی تھی۔ اور یہ لوگ ان کے صحیح استعمال پر قدرت رکھتے تھے۔ شعراء کی ان علوم پر قدرت ایسی مستند اور متفق الیہ ہے کہ فرہنگ نویسوں کو بھی جب سند دینی ہوتی ہے تو وہ اساتذہ کے اشعار بطور سند پیش کرتے ہیں۔ اب بات صرف اتنی رہ جاتی ہے کہ کیا شعراء نے اس فن سے کوئی منفعت حاصل کی۔ احکامات نکالے۔ یا نجوم کو بطور فن برتا۔ چونکہ ہمارا موضوع "غالب کی انجم شناسی ہے" اس لئے ہم دیگر شعراء سے قطع نظر کرکے صرف غالب پر گفتگو کریں گے۔ اشعار غالب میں گو جا بجا بروج، سیاروں اور ستاروں کا ذکر ہے لیکن سے مبادیات نجوم سے آشنائی پر محمول کیا جا سکتا ہے اس لئے ہم دانستہ طور پر اشعار سے استناد کرنے سے گریز کرتے ہیں اس کے بجائے ہم غالب کی نثری نگارشات کو اپنے موقف کی توثیق میں پیش کریں گے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ فن کی باریکیوں سے بخوبی واقف تھے۔

اصل موضوع کی جانب رجوع کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ اس امر کا تجزیہ بھی کرلیں کہ نظامی عروضی سمرقندی نے مصاحبت سلطانی کے لئے جن لوازم کا ذکر کیا ہے غالب ان پر کہاں تک پورے اترتے ہیں۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا نظامی کا کہنا ہے کہ بادشاہ کے لئے دبیر، شاعر، نجومی اور طبیب کا وجود لازمی ہے۔

۱:- یہ مسلم ہے کہ غالب جادو بیان شاعر تھے۔

۲:- (الف) ان کی تصانیف میں صرف مہر نیم روز ہی ان کی فارسی انشا کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ دبیر الملک کا خطاب اسی پر مستزاد ہے۔

(ب)، اردو میں خطوط غالب جنکی شہرت وہ اپنی سخن وری کے شکوہ کے منافی تصور کرتے تھے اردو داں طبقہ نے اسے آنکھوں سے لگایا ہے۔

۳۱۔ نادرات غالب میں غالب کی طبی دستگاہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ غالب کی شاعری، دبیری اور طبی دستگاہ کے لوگ معترف ہیں۔ لیکن علم نجوم سے واقفیت پر کسی نے بحث نہیں کی ہے۔ ایسی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ غالب نے لازمہ مصاحبت چار چیزوں میں سے تین چیزوں کی تو تحسین کی اور چوتھی کو نظر انداز کر دیا۔ غالب قال اللہ قال الرسولؐ بھی نہیں کرتے تھے کہ مذہبی نقطہ نظر سے انھوں نے اسے قابل اعتنا نہ سمجھا۔ شراب وہ پیتے تھے۔ لہو و لعب کے معترف تھے۔ جوئے سے متہم ہوئے۔ آخر نجوم کیوں چھوڑتے۔

تعجب ہے کہ اس جانب اعتنا نہیں کی گئی حالانکہ ان کے خطوط میں جابجا اس علم سے واقفیت کے واضح ثبوت ملتے ہیں مثلاً نواب یوسف علی خاں والی رام پور کو اپنے خط مورخہ ۲۲ مارچ ۱۸۶۲ء میں لکھتے ہیں۔

ہمانا، دریں روزگار، خسرو ستارگان کہ مہر منیرش دانی، در برّہ
واز سوی فرانہ نخستین سیارگان کہ زحلش خوانی، در ترازو،
سعد اکبر بہ قوس، سعد اصغر بہ ثور، آن نیّر بہ بیت الشرف
خوشنود و شاد، و این دو اختر بکاشانہ ہائے خویشتن آباد گمان
ندارم کہ از خسروان پارس و سلاطینِ عرب ہیچ کس را چنیں طالع
بہر جلوس اتفاق افتادہ باشد، کہ حضرت ولی نعمت را برائے
غسلِ صحت دست بہم دادہ است[1]۔

اتفاق دیکھئے کہ یہاں بھی اعتراض وارد کیا جا سکتا ہے کہ خط والی رام پور کو لکھا گیا تھا اور والی رام پور سے غالب مشاہرہ پاتے تھے اس لئے والی کو خوش کرنے کے لئے شاعری کی ہے کہ حضور پر نور زندہ پر ور بڑی اچھی ساعت میں آپ نے غسلِ صحت فرمایا بس اب آپ امر ہو گئے اور ادھر ادھر کتابوں سے دیکھ کر یا لوگوں سے مشورہ کر کے یہ چند جملے لکھ دیئے لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ شاگردوں اور دوستوں سے تو وظیفہ نہیں ملتا تھا ان سے بھی تو نجوم کے اسرار و نجوم پر مراسلت رہی ان سے تو عذر کر سکتے تھے کہ بھائی میں شاعر ہوں نجومی نہیں۔ لیکن شاعروں اور دوستوں کے استفسارات کا بڑے عالمانہ انداز میں جواب دیا ہے۔

مولوی نعمان صاحب کے استفسار کے جواب میں ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو لکھتے ہیں۔

---

[1] مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی عرشی ص ۳۱-۳۲ ۔ ناظم برقی پریس رام پور ۱۹۳۵ء۔

"قران کے باب میں یہ ہے کہ زہرہ مشتری کا ایک برج و دقیقہ میں برابر ہونا قران السعدین ہے اور یہ قرانات عزیزیہ میں سے ہے اور اکثر واقع ہوتا ہے اور یہ قران جب سلطنت موعود نہیں۔ اگر کسی بادشاہ کے ہنگام ولادت یہ قران آپڑا ہوگا۔ بشرطیکہ برج طالع میں یا اوتاد ثلثہ یا مائل اوتاد میں واقع ہو کہ نظر اس کے طالع موعود پر ہو تو وہ افادہ صحت و عیش و عشرت کرتا ہے اور بس وہ قرانات اور ہیں جو موجب تغیر اوضاع عالم و انتقال سلطنت ہوتے ہیں۔ از ان جملہ ایک یہ قران تھا کہ زحل و مریخ سرطان میں فراہم ہوئے تھے۔ مرا سر ہندوستان کی خاک اڑادی"[1]

مولوی نعمان صاحب نے استفسار ہی اس وقت کیا ہوگا کہ جب ان کے علم میں آیا ہوگا کہ غالب کو نجوم میں بھی دخل ہے اور مرزا کے جواب کے بعد مزید کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں۔ یہ قیاس کرنا مناسب نہ ہوگا کہ غالب بہر حال ایک بلند پایہ فاضل تھے اس لئے جو مشکل درپیش ہوتی شاگرد اور احباب بلا تکلف رجوع کر لیتے ہوں گے مکاتیب غالب اس امر کے شاہد ہیں کہ مرزا نے کسی کو ترکیب وضو۔ نیت نماز۔ مسائل حج روزہ اور زکوٰۃ نہیں بتائے۔ ادبی علمی مسائل اور نجی معاملات کے سوا کسی سے مراسلت نہیں کی اور نہ کسی نے ان سے غیر متعلق سوال کرنے کی جرأت کی۔

۵ر نومبر ۱۸۵۸ء کو چودھری عبدالغفور کے نام ایک خط مرزا صاحب نے لکھا ہے اس میں صاحب عالم مارہروی کو جو فاضل اجل، اور متبحر عالم تھے لکھتے ہیں۔

"پیر و مرشد کو سلام و نیاز پہنچے۔ 'کف الخضیب' صور جنوبی میں سے ایک صورت ہے اس کے طلوع کا حال مجھ کو کچھ معلوم نہیں اختر شناسان ہند کو اس کا کچھ علم نہیں اور ان کی زبان میں اس کا نام بھی یقین ہے نہ ہوگا۔

وقبول دعا وقت طلوع، منجملہ مضامین شعری ہے جیسے 'کتان' کا پرتو ماہ میں پھٹ جانا اور 'زمرد' سے افعی کا اندھا

---

[1] غالب کی نادر تحریریں مرتبہ خلیق انجم ص۳۰ مطبوعہ مکتبہ شاہراہ دہلی فروری ۱۹۶۱ء۔

ہوجاتا۔ آصف الدولہ نے انھیں تلاش کرکے منگوایا اور قطعات
زمرّد اس کے محاذی چشم رکھے۔ کچھ اثر نہ ہوا۔ ایران و روم و
زنگ سے انواع کپڑے منگوائے، چاندنی میں پھیلائے کوئی
مسکا بھی نہیں۔

"تحویل آفتاب برج حمل، کے باب میں موٹی سی بات
یہ ہے کہ ۲۲ مارچ کو واقع ہوتی ہے کبھی ۲۱ کبھی ۲۳ بھی
آپڑتی ہے اس سے تجاوز نہیں۔ رہا طالع وقت تحویل درست
کرنا۔ بے کتبِ فن اور مبلغ علم ممکن نہیں میرے پاس یہ دونوں
باتیں نہیں "[1]

"قبول دعا وقت طلوع" مولینا کا از روئے نجوم استفسار تھا۔ ظاہر ہے ایک ایسا شخص جو خود بلند پایہ عالم دین ہو نہ جانے گا کہ اس بارے میں احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ انھیں مرزا سے رجوع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

انوار الدولہ شفیق کو خط مورخہ ۵ رنومبر ۱۸۵۸ء میں فرماتے ہیں۔

"اب ضرور آپڑا کہ کچھ حال اس ستارۂ دم دار کا لکھوں چنانچہ
جس وقت سے وہ خط پڑھا ہے سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں
چونکہ بسبب فقدانِ اسباب یعنی عدم رصد و کتاب کچھ نہیں
کہا جاتا ناچار مرزا صائب کا مصرع زبان پر آجاتا ہے۔

ع ازیں ستارہ دنبالہ داری ترسم

یہ مطلع ہے اور پہلا مصرع یہ ہے۔

ع زخال گوشہ ابروئے یاری ترسم

کیا آپ مجھ کو بے ہنری اور ہیچ میرزی میں صاحب کمال
نہیں جانتے اور خاص عبارت فارسی کو میرا مصداق حال نہیں
مانتے۔

"پیش ملا طبیب و پیش طبیب ملا و پیش ہیچ ہر دو، پیش
ہر دو ہیچ، آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم

---

[1] عود ہندی ص ۱۔ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنو۔

لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونی طبع کے اور کیا رکھا ہے۔ بہرِ علم
نجوم کے قاعدے کے موافق جب زمانہ کے مزاج میں فساد کی
صورتیں پیدا ہوتی ہیں تب سطح فلک پر یہ شکلیں دکھائی دیتی
ہیں جس برج میں یہ نظر آئے اس کا درجہ و دقیقہ دیکھتے ہیں۔
ہزار طرح کے جال ڈالتے ہیں تب ایک حکم نکالتے ہیں تا ہم یہاں
آبادیں بعد غروب آفتاب افق غربی شہر پر نظر آتا تھا اور
چونکہ ان دنوں آفتاب اول میزان میں تھا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ
صورتِ عقرب میں ہے۔ درجہ اور دقیقہ کی حقیقت نامعلوم رہی
بہت دن شہر میں اس ستارہ کی دھوم رہی اب دس بارہ دن سے
نظر نہیں آتا۔ وہاں شاید اب نظر آیا ہے جو آپ نے اس کا حال
پوچھا ہے۔ بس میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ صورتیں قہر الٰہی کی ہیں اور
دلیلیں ملک کی تباہی کی۔ قِران نحسین۔ پھر کسوف، پھر خسوف
پھر یہ صورتِ پُر کدورت۔ عیاذاً باللہ و پناہ بخدا۔[۱]"

اس خط سے تو یہ واضح ہو ہی گیا کہ نواب صاحب نے استفسار کیا تھا جہاں تک "آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے" کا تعلق ہے تصوف کے باب میں ہم خاموش ہیں اس لئے کہ "تصوف برائے شعر گفتن خوب ست" لیکن نجوم کے بارے میں یہ ضرور عرض کریں گے کہ مرزا صاحب کا عذر صرف آرائش مضمون ہی کے واسطے تھا ورنہ نجوم کے بارے میں گفتگوئیں یہ مراسلات اور پھر ہیچ مدانی کا دعویٰ۔ تکلف محض سے زیادہ نہیں۔ اگر بالفرض مرزا کے اس قول سے اغماض روگردانی نہیں کی جا سکتی تو اسی خط میں یہ جملہ بھی اس کے بعد ہی موجود ہے کہ "سوائے موزونی طبع کے اور کیا رکھا ہے"۔ اسے بھی بجنسہٖ تسلیم کر لیجئے۔ جہاں نجوم گیا وہاں شاعری اس کے ساتھ۔

ع اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

مرزا کی مذکورہ بالا تحریریں (بجز مکتوب رام پور) کسی نہ کسی خط کے جواب میں تھیں اب چند ایسی چیزیں پیش کی جاتی ہیں جو انھوں نے از خود لکھیں اور جو ان کی اس علم سے واقفیت، لگاؤ اور اس پر کسی نہ کسی حد تک توجہ کی غمازی کرتی ہیں۔

---

[۱] خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر ص ۳۵۷۔

نواب امین الدین احمد خاں والیٔ ریاست لوہارو کو لکھتے ہیں :۔

"آج ۲۲ر جون ہے ۔ آفتاب سرطان میں آگیا نقطۂ انقلاب صیفی میں دن گھٹنے لگا ۔ چاہیئے کہ تمہارا غیظ وغضب ہر روز کم ہوتا جائے"[1]

نواب علاؤ الدین احمد خاں نسیمی ثم علائی والی ریاست لوہارو کو لکھتے ہیں :۔

"مکان کے مالکوں کی طرف سے مدد شروع ہو گئی ہے نہ لڑکا ڈرتا ہے ، نہ بی بی گھبراتی ہے ۔ نہ میں بے آرام ہوں ۔ کھلا ہوا کوٹھا ۔ چاندنی رات ، ہوا سرد ۔ تمام رات فلک پر مریخ پیش نظر دو گھڑی کے تڑکے زہرہ جلوگر ادھر چاند مغرب میں ڈوبا ۔ ادھر مشرق سے زہرہ نکلی ۔ صبوحی کا وہ لطف ، روشنی کا وہ عالم"[2]

امثلہ بالا سے یہ مدعا ہے کہ مرزا صاحب نے نجوم کا سطحی مطالعہ نہیں کیا تھا اور ان کی معلومات کا دائرہ صرف متداول کتب پر ہی منحصر نہ تھا بلکہ وہ سیاروں کی گردش کا بھی دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے نیز تقویم ان کے پیش نظر رہتی تھی جس کی تصدیق ان کے خطوط سے ہوتی ہے ۔ اس لئے تاریخ عیسوی کے ساتھ تاریخ ہجری کا التزام نظر آتا ہے اور جہاں تقویم میں سہو ہوتا اس کی نشان دہی کرتے تھے ۔ چنانچہ نواب انور الدولہ رئیس کالپی کو خط کے اخیر میں یوں تاریخ لکھی ہے :

"دوشنبہ بہ حساب تقویم یازدہم و از روے رویت دہم ربیع الاول ۱۲۶۳ھ (۱۰ر نومبر ۱۸۵۶ء)"[3]

حبیب اللہ ذکا کے خط میں تاریخ یوں رقم کی ہے :۔

"سہ شنبہ از روے جنتری ۲۶ اور از روئے رویت ۲۵ رجب ۱۲۸۳ھ اور ۴ر دسمبر ۱۸۶۶ء"[4]

---

[1] خطوط غالب ۔ مہر ص ۵۲

[2] " " " ص ۹۲

[3] " " " ص ۳۵۵

[4] " " " ص ۳۵۵

نواب ابراہیم خاں وفا (بقول عسکری رئیس سورت) کو لکھتے ہیں :۔

"میر صاحب قبلہ سید عالم علی خاں بہادر کی دو غزلیں پہنچیں۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ میں رجب کے مہینے میں وطن کو جاؤں گا اور وہاں سے تیرے پاس آؤں گا۔ آج بحساب جنتری ۲۷ اور از روئے رویت ۲۶ رجب ہے۔ غزلیں ان کی موجود مگر بھیج نہیں سکتا آپ میری بے گناہی کے گواہ رہیں "

اخیر میں عیسوی تاریخ لکھی ہے :۔

"پنجم دسمبر ۱۸۶۶ء رجب کی تاریخ اوپر لکھ آیا ہوں[1]"

مضمون تشنہ رہے گا اگر مرزا کے احکامات کے باب میں گفتگو نہ کی جائے۔ مرزا نے غالباً ۱۸۳۹ء میں اپنی وفات کا حکم لگایا تھا چنانچہ اپنے ایک خط مورخہ ۳ جنوری ۱۸۵۹ء میں خواجہ غلام غوث بے خبر کو لکھتے ہیں :۔

"جانتا ہوں کہ تم کو ہنسی آئے گی کہ کیا بکتا ہے۔ مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے ؟ چاہے الہام سمجھئے، چاہے اوہام سمجھئے، بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے ؂

من کہ باشم کہ جاوداں باشم　　چوں نظیری نماند و طالب مُرد
در بگویند در کدامیں سال　　مُرد غالب ؟ بگو کہ غالب مُرد

اب بارہ سو چھتر ہیں اور غالب مُرد کے بارہ سو ستتر ہوتے ہیں اس عرصہ میں جو مسرت پہنچنی ہو پہنچے۔ ورنہ پھر ہم کہاں[2]۔"

قاضی عبدالجمیل صاحب کو تقریباً نو ماہ کے بعد ۸ ستمبر ۱۸۵۹ء کو لکھتے ہیں۔

؏　کیستم من کہ تا ابد بزیم

لاحول ولا قوۃ ! یہ مصرع میرا نہیں "تا ابد بزیم" یہ فارسی لاتفتیل کی ہے۔ میرا قطعہ یہ ہے ؂

کیستم من کہ جاوداں باشم　　چوں نظیری نماند طالب مُرد
در بگویند در کدامیں سال　　مُرد غالب ؟ بگو کہ غالب مُرد۔

---

[1] خطوط غالب۔ مہر ص ۴۱۹

[2] 〃 〃 ص ۳۲۴

یہ مادہ تاریخ ازروئے نجوم نہیں بلکہ ازروئے کشف ہے -

انا للہ و انا الیہ راجعون۔[1]

مرزا صاحب کی مجوزہ تاریخ وفات کے بارے میں تمام اقتباسات ہم نے پیش کر دیئے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اپنی پیش گوئی کا کس حد تک یقین تھا - چنانچہ مرزا صاحب نے اپنی اس پیش گوئی کو کہیں الہام، کہیں اوہام، کہیں کشف سے تعبیر کیا ہے -

کشف کا جہاں تک تعلق ہے یہ ہر ایک کو نہیں ہوتا - اس کے لئے ریاض، مجاہدہ، مراقبہ کرنا ہوتا ہے اور یہ کلام صوفیائے کرام کا ہے - لطف یہ کہ آپ کا عقیدہ اثنا عشری جس میں تصوف کی گنجائش نہیں بلکہ ایک دوسرے کی ضد اور کشف کے مدعی -

الہام بھی ایسی آسان چیز نہیں آپ کا عالم تو یہ تھا کہ "عمر بھر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ بھی نماز پڑھی تو مسلمان نہیں - الہام کے لئے کچھ شرائط ہوتی ہیں عالم سرخوشی میں کوئی کیفیت طاری ہو جائے اسے تو کوئی الہام تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوگا - پھر یہ کیسا الہام ہے کیسا کشف ہے کہ غلط ثابت ہو -

رہا معاملہ اوہام کا - حضرت معوج الذہن نہ تھے - صحیح الدماغ تھے - علیل نہ تھے صحت مند تھے - مراق جنون مالیخولیا کا شکار نہ تھے جو بیس سال بعد مرنے کی پیش گوئی کر دی - یہ تو ممکن ہے کہ ایک شخص بیمار ہوا - اسے وہم ہو گیا کہ اب میں جلد ہی مر جاؤں گا سال دو سال زیادہ سے زیادہ ورنہ دو چار ماہ کی زندگی اور ہے آپ نے کسی بیمار یا مریض کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ بیماری نے بالکل نڈھال کر دیا - اب مجھ میں کچھ نہیں رہا صرف ایک ربع صدی کا مہمان ہوں سبحان اللہ کیا مبارک اور شاعرانہ مرض ہے کہ بیماری میں بھی مبالغہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیا - راقم الحروف نے تو بمشکل پانچ سال کا اضافہ کرکے اغراق تک پہنچایا تھا لیکن مرزا صاحب نے آخری لمحہ اس میں مزید تین سال کا اضافہ کیا اور سرحد غلو تک پہنچا دیا -

حقیقت یہ ہے کہ نہ یہ پیشین گوئی ازروئے کشف تھی نہ ازروئے الہام بلکہ خالصتہً ازروئے نجوم تھی - لیکن جیسے مرزا صاحب کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ نہ ان کے پاس رصد اور اصطرلاب تھی (جسے انھوں نے فقدان اسباب سے تعبیر کیا ہے) اور نہ کتب نجوم تھیں اس لئے صرف ظن و تخمین پر حکم لگایا تھا - علاوہ ازیں نجوم میں ریاضی کی بے حد ضرورت پڑتی ہے - بے انتہا جمع تفریق تقسیم کرنی پڑتی ہے - مرزا صاحب کو حساب سے کوئی مناسبت نہ تھی بلکہ انھیں الجھن ہوتی تھی (یہ بھی انکی تحریروں سے ثابت ہے) اس لئے انھیں خود بھی اپنی پیش گوئی پر یقین کامل نہ تھا اس لئے پیش بندی کے طور پر اپنی

---

[1] عود ہندی مجلس ترقی ادب لاہور - ص ۲۰۵ - ۲۰۶ -

گوئی کو الہام وکشف سے تعبیر کیا تھا۔ اس میں کلام نہیں کہ جس سال انھوں نے اپنے مرنے کی پیش گوئی کی تھی اسی
لی میں زبردست وبا پھیلی تھی اور بے انتہا اموات واقع ہوئی تھیں۔ اور جب جناب پر کوئی آنچ نہ آئی تو پھر شوخیاں
ع کر دیں۔ میر مہدی کو لکھا۔

"میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے
لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسر شان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا
سمجھ لیا جائے گا[۱]"

یا قاضی عبدالجمیل صاحب کو لکھا کہ :-

"۱۲۷۷ھ میں میرا نہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا[۲]"

گمان غالب ہے کہ مرزا کی ان ہی نکتہ طرازیوں نے ناقدین غالب کی توجہ نجوم کی جانب منعطف نہ ہونے دی اور
سنے ان کی پیش گوئی اور علم نجوم سے متعلق نگارشات کو کوئی اہمیت نہ دی ۔

یہاں یہ عرض کرنا مناسب ہوگا کہ کسی بھی نجومی کے کسی حکم کے غلط ہو جانے سے اس کے علم نجوم میں مہارت پر
نہیں آتا۔ بادی النظر میں تو بات بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن غور فرمایئے کیا ماہر سرجن سے آپریشن میں لغزش
ہوتی کیا اسپیشلسٹ ڈاکٹروں سے کیس نہیں بگڑتے کیا بلند پایہ انجینئروں کی زیر نگرانی تعمیر کی جانے والی عمارتیں
جاتیں، پل منہدم نہیں ہو جاتے۔ اس کے باوجود انھیں ڈاکٹری اور انجینئری کے شعبہ سے خارج نہیں کیا جاتا۔ پھر کوئی معقول جواز نہیں
نجومی کا سہو قابل معافی نہ سمجھا جائے۔ نجوم میں حکم لگانے سے پیشتر کافی جمع تقسیم کا عمل کرنا پڑتا ہے ہزار طرح کی چال
پڑتی ہے ظن و تخمین سے کام لینا پڑتا ہے پھر کہیں حکم لگایا جاتا ہے کہیں بھی سہو ہوا اور نتیجہ معلوم۔ باوجود یکہ
باقاعدہ سائنس تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن غالباً اسی لئے اس کے احکامات پر یقین کرنے کی ممانعت آئی ہے اور
ے علم نجوم کے ماہر کا کہنا یہ ہے کہ :-

"احکام نجوم اگرچہ صنعتے معروف است اعتماد را نشاید و باید
کہ منجم در آں اعتماد نکند و ہر حکم کہ کند حوالہ با قضا کند[۳]"

یہاں یہ خیال پیدا ہوگا کہ نجوم باقاعدہ ایک علم ہے۔ اس کا مطالعہ بھی مرزا نے کیا پھر اس واقفیت سے انکار

---

[۱] خطوط غالب ۔ مہر صفحہ ۲۳۶
[۲] " " صفحہ ۵۱۹
[۳] چہار مقالہ صفحہ ۹۹ و ۱۰۰ ۔

کیوں۔ اور احکامات لگانے سے گریز کیوں اور احتراز کی کیا وجہ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مرزا ریاضی سے طبعاً متنفر تھے اسی لئے تاریخ گوئی سے دامن بچاتے تھے لیکن اس کے باوجود دوستوں، شاگردوں اور احباب کے اصرار پر آخر تاریخیں کہنی پڑیں۔ اگر نجوم سے واقفیت کا اعتراف کرتے تو احباب کے اصرار پر مجبوراً زائچے اور تقویمیں بھی بنانی پڑتیں۔ . .
علاوہ ازیں انھوں نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ مومن کی نجوم میں مہارت کی عوام نے کیا قدر کی۔ عبداللہ خاں اوج مومن کی علم نجوم میں مہارت کی داد یوں دیتے ہیں ؎

جہنموں میں وہ اپنا مکان لیتا ہے
نجومی بن کے جو جنتی کا دان لیتا ہے

غالب نے سوچا ہوگا کہ میرے خلاف پہلے ہی کیا کم محاذ کھلے ہیں جو ایک نیا محاذ کھولنے کی لوگوں کو دعوت دوں۔ اور اگر ایسا ہوتا تو کیا حکیم آغا جان عیش۔ اوج مذکور وغیرہم انھیں معاف کر دیتے۔ علاوہ ازیں کیا غالب کو فارسی کے مشہور شاعر انوری کا حال نہ معلوم ہوگا کہ غریب کو ایک حکم لگانے پر ملک سنجر کا عتاب سہنا پڑا تھا (جسکی تفصیل تذکرۃ الشعراء دولت شاہ سمرقندی میں دی گئی ہے۔ صفحہ ۵۲)
یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ غالب اپنی فارسی کے مقابلہ میں کسی چیز کو پیش کرنا پسند نہیں کرتے تھے جس طرح انھوں نے اپنی اردو شاعری اردو نثر نگاری کو فارسی کے مقابلہ میں لانا پسند نہ کیا اسی طرح نجوم کو بھی دونِ مرتبہ عالی سمجھا ہوگا۔

غالب کا تنقیدی شعور

● پروفیسر آل احمد سرور

غالب کے یہاں ہمیں حیرت انگیز تنقیدی شعور ملتا ہے یہاں میرا یہ مطلب نہیں کہ غالب نے اپنے خطوط میں یا باتوں میں شاعری اور شاعروں کے متعلق گہر افشانی کی ہے یا نثر کے اقسام اور انشاء پردازی کے آداب بتائے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ غالب کے یہاں شاعری ایک مقدس دیوانگی نہیں ہے مہذب سنجیدگی ہے۔ غالب نے بہت کچھ کہا، مگر اردو میں اپنی زندگی میں، دوستوں کے مشورے کے بعد ایک انتخاب شائع کیا، انھوں نے اپنی ابتدائی بے راہ روی کی صرف چند یادگاریں چھوڑ دیں۔ ان کے یہاں تخیل کی بے اعتدالیاں شروع میں ملتی ہیں مگر جلد وہ ان سے خبردار ہو جاتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی عمر کے آخری دس سال میں شعر بہت کم کہے۔ ان کی شاعری کا چشمہ خشک ہونے لگا تو وہ اس رمز سے آگاہ ہو گئے کہ دنیا میں کوئی چیز اتنی مضحکہ خیز نہیں جتنی بڑھاپے کی عاشقانہ غزلیں، ڈرائڈن کی طرح غالب نے بھی آخر عمر میں نثر کی طرف زیادہ توجہ کی اور شعری پیکروں کے بجائے نثر میں مرقع نگاری کی۔ غالب کے ان سادہ نقوش میں نثر کی روشنی اور وضاحت ہے مگر شعر کی دلنشیں اور تاثیر بھی، ان کی ظرافت سے ان کے چھوٹے پھنسیوں کو بھی "سرو چراغاں" بنا دیا۔

مولانا سعید انصاری

مرزا غالب کا علمِ کلام

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اقبال کے "علم کلام" پر مولانا سید سلیمان اور مولانا عبد السلام ندوی نے ایک مقالہ تحریر فرمایا تھا جو مقالات یوم اقبال کے تذکرہ میں شامل ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ مرزا غالب کے "علم کلام" سے چند اہم مسائل نکال کر یہاں پیش کیے جائیں چونکہ انھوں نے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں دھو دھو کر پیئے تھے، ان کا کلام اس سلسلے میں بہت صاف اور بامزہ ہوتا ہے۔

"حور" کے متعلق رند نے صاف کہہ دیا تھا کہ

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

لیکن مرزا صاحب نے حور کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس سے دو بنیادی مسائل پیدا ہوتے ہیں (۱) حوریں پیدا ہو چکی ہیں (۲) حوریں ابھی تک نہیں پیدا ہوئی ہیں۔ بلکہ آئندہ پیدا ہوں گی۔ یہ وہی نظریات ہیں جو جنت و دوزخ کے نسبت علمائے کلام کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

پہلے نظریہ کو مرزا صاحب اپنے مخصوص انداز میں اس طرح ادا فرماتے ہیں۔

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کو کیا کرے کوئی

دوسرا نظریہ ذرا شک کے پیرائے میں، مگر بڑے تیکھے طرز ادا کے ساتھ، یوں بیان ہوا ہے

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

قدرت کے کرشمے سے پری زادوں یعنی معشوقوں کا حوروں کی شکل میں تبدیل ہونا پھر عرصۂ محشر میں داورِ محشر کے حضور عشاق کے دل میں ان کی نسبت انتقام کا جذبہ پیدا ہونا مضمون کی نزاکت اور بیان کی جدت کا بڑا شاندار نمونہ ہے۔

(حور کے متعلق لطیفے کے طور پر یہاں اگر مرزا صاحب کا ایک شعر اور لکھ دوں تو شاید بیجا نہ ہو۔)

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

اس شعر میں اگرچہ زبان و بیان کی بے انتہا خوبیاں اور رعنائیاں ہیں، لیکن جانتا ہوں کہ علم کلام کے کوچے میں اس کا گذر نہیں جنت کی نسبت جو شعرا صاف لفظوں میں انکار یا اقرار کا پہلو اختیار کرتے ہیں، ان کے ہاتھ سے شوخی، نزاکت اور لطافت کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔ مرزا صاحب اس معاملہ میں "گومگو" ہیں انھوں نے اس مسئلہ کے رخ پر "ابہام" کا ایسا ہلکا پردہ ڈال رکھا ہے کہ شاہدِ حقیقت نہ تو صاف چھپتا ہے اور نہ سامنے ہی آتا ہے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش کرنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

"وجود" اور عدم میں سے وجود کے متعلق مرزا صاحب نے ایک شعر میں جو خیال باندھا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ وجود کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

آہِ آتشیں اور بالِ عنقا، خیالی دنیا کی مخلوقات ہیں اور شاعر ان کو "عدم" کے دائرے میں سمجھتا ہے۔ لیکن عدم سے بھی "پرے" وہ جس دنیا کا نشان دے رہا ہے، وہ وجود ہی تو ہے۔!

شہود کو مرزا صاحب نے ایک بدیع مثال کے ذریعے سمجھایا ہے!

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

شہود کی تعریف میں "غیب غیب" کی ترکیب اضافی، الاشیاء تعرف باضدادھا کا حیرت انگیز پیرایہ ہے۔
"وحدۃ الوجود" کی ماہیت ظاہر کرنے کے سلسلے میں اس "مرد مسلمان" نے اپنے کفر کی خوب نمائش کی ہے

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

"ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا" کی زبان سے کفر کا ایسا خوبصورت اعلان کس قدر جاذب توجہ ہے۔
"انسان" بہت ہی کھلا ہوا اور صاف بھی ہے، اور ساتھ ہی نہایت پیچیدہ بھی۔ پہلا خیال، شاعر کو "جلوت در خلوت" بنانے پر آمادہ کرتا ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

دوسرے خیال نے آدمی اور انسان کا فرق نمایاں کیا ہے جو بہت ہی دقیق اور نازک ہے۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

"بت" اور توحید کا تضاد سب کو معلوم ہے لیکن شاعر نے دونوں کے درمیان ایک نسبت پیدا کر لی ہے گو دور ہی سہی

گو واں نہیں وہاں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

اتنا سننے کے بعد اب بتوں کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ کعبہ سے اپنے رشتے کا اعلان کر دیں۔
گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ۔ ذرۂ آفتاب تابانیم۔ "روزہ" کی نسبت "ایک نہیں رکھا" کہنے والے نے روزہ داری اور روزہ خوری کی کیا پرلطف توجیہ کی ہے۔

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

"قربانی" مرزا صاحب نے ایک حج کا قصد کیا تھا! چنانچہ جب وہ لکھنؤ کے ارادے سے دلی سے نکلے تو آئندہ پروگرام کے متعلق یہ ارشاد فرمایا

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے وہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لیکن وہ راجہ غضنفر علی خاں تو تھے نہیں، جو ہوائی جہاز پر بیٹھ کر جلدی سے مکہ معظمہ پہنچ جاتے۔ بہرحال ان کو حج کی توفیق نہیں ہوئی! لیکن قربانی! تو وہ ہندوستان میں بھی ہو سکتی تھی! اور اس کے متعلق ان کا ایک پیش رو کہہ بھی گیا تھا۔

یہ عجب ماجرا ہے کہ بروزِ عیدِ قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

مرزا صاحب جو معشوق کو خنجر آزمائی کی ہمیشہ دعوت دیا کرتے تھے اس مسئلہ میں امریکہ کے بیل (تام بل) کا پارٹ ادا کرتے ہیں! وہ جس طرح قیادت کر کے مذبح میں بیلوں کو خوش خوش پہنچا تا ہے، مرزا صاحب بھی نمائندہ بن کر قربان ہونے والوں کی طرف سے کہتے ہیں۔

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

مرزا غالب کے "علم کلام" کی گذشتہ دقیق بحثیں سن کر غالباً ناظرین مرعوب ہو گئے ہوں گے! جس طرح مولوی مناظر احسن گیلانی نے "جامع المجددین" پڑھ کر یہ اعتراف کیا ہے کہ مولوی اشرف علیؒ صاحب تھانوی کی اخلاقی تعلیمات "امام غزالیؒ کے اخلاقیات سے بڑھ گئی ہیں۔ اسی طرح آپ بھی اپنے دل میں کہہ رہے ہوں گے کہ مرزا غالب کے "کلامیات" کا مرتبہ سر سید، شبلی، چراغ علی، اقبال، حتیٰ کہ امام رازیؒ کے علم کلام سے بھی بالاتر ہے! میں نے ان طویل مباحث کو حد درجہ مختصر کر کے لکھا ہے۔ یعنی دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے۔ ورنہ خیال تو کچھ اور تھا۔

نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضموں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

کلامِ غالبؔ کی مقبولیت

اردو ادب پر غالبؔ کے اثر کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اردو کے تمام گذشتہ اور موجودہ شعرا میں سب سے زیادہ مرزا اسداللہ خان غالبؔ کے اشعار ایسے ہیں جو ہماری زبان میں بطور ضرب المثل مستعمل ہیں۔ لکچرار اور مقررین اکثر ان کے اشعار اپنے لکچروں اور تقریروں میں بیان کرتے ہیں۔ صحافی اور مضمون نگار اپنے رسالوں اور اخباروں میں بکثرت ان کے اشعار موقع بموقع استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے مصنفین اور مؤلفین اپنی تصنیفات اور تالیفات میں بہت کثرت کے ساتھ ان کے اشعار نقل کرتے ہیں۔ ہمارے پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ طبقے میں بھی جو قبولیت غالب کے اشعار کو حاصل ہے وہ شاید کسی اور اردو شاعر کو نہیں ہے۔ غرض ہر کہ و مہ غالب کا شیدا اور فریفتہ ہے۔ اور ہمارا ہر چھوٹا بڑا غالب کے کلام کو پسند کرتا اور عام بول چال میں اسے استعمال کرتا ہے۔ اس خصوصیت میں اردو کا کوئی اور شاعر اسداللہ الغالب کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اور غالب اس خصوصیت میں بالکل منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ میں نے اس مضمون میں غالب کے ایسے اشعار جو ہماری زبان میں عام طور پر بطور ضرب المثل مستعمل ہیں، جمع کر دیئے ہیں۔ تاکہ غالب سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب انہیں شوق سے مطالعہ فرمائیں اور یہ ان کے لئے تفریحِ طبع کا باعث ہوں۔ وھو ھذا

۱ کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ　　صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

۲ تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ　　سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

۳ ع آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

۴ بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل　　جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

۵ ع ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

۷ ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا　　وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

۷ مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی   ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا
۸ محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے   کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا
۹ ع   حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا
۱۰ دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا   ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
۱۱ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا   آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
۱۲ کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ   ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
۱۳ حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب   جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا
۱۴ دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا؟   زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟
۱۵ بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک   ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟
۱۶ حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ   کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا؟
۱۷ ع   ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟
۱۸ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا   اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
۱۹ ترے وعدے پہ جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا   کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
۲۰ کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو   یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
۲۱ یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح   کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا
۲۲ ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا   نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا
۲۳ یہ مسائلِ تصوف! یہ ترا بیان غالب   تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا
۲۴ ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا؟   نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا
۲۵ تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے   دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا
۲۶ ع   دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائے گا
۲۷ ہے خبر گرم، اُن کے آنے کی   آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
۲۸ کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟   بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
۲۹ جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی   حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
۳۰ نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا   ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟
۳۱ ع   کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا
۳۲ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
۳۳ تم سے بجا ہے اپنی تباہی کا گلا   اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا
۳۴ پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق   آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟
۳۵ گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار   لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

۳۶ ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے — بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا
۳۷ سرمۂ مفت نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے — کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
۳۸ رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا
۳۹ پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے — کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا
۴۰ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
۴۱ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
۴۲ رہا گر کوئی تا قیامت سلامت — پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت
۴۳ علی الرغم دشمن شہیدِ وفا ہوں — مبارک مبارک، سلامت سلامت
۴۴ کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں — لیوے نہ کوئی نام "ستمگر" کہے بغیر
۴۵ ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
۴۶ ع دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
۴۷ یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل ان کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور
۴۸ ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور
۴۹ ع تو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم مری گردن پر
۵۰ لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور
۵۱ جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے — کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
۵۲ ہاں اے فلکِ پیر! جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مرتا کوئی دن اور
۵۳ ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالبؔ — قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور
۵۴ تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ — واقعہ سخت ہے اور جان عزیز
۵۵ دہنِ شیر میں جا بیٹھئے لیکن اے دل — نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس
۵۶ آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
۵۷ ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن! — خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک
۵۸ غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
۵۹ ع مجھ سے مرے گنہ کا حساب، اے خدا! نہ مانگ
۶۰ مجھ کو دیارِ غیر میں مارا، وطن سے دور — رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
۶۱ مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ — وہ عناصر میں اعتدال کہاں
۶۲ ع ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
۶۳ ع اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انہیں کچھ نہ کہو
۶۴ مہرباں ہو کے بلا لو، مجھے چاہو جس وقت — میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

۶۵ زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر! ورنہ — کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

۶۶ قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں — رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی یک دن

۶۷ دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں — ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

۶۸ ع ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

۶۹ غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

۷۰ کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ — ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

۷۱ بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب — تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

۷۲ قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں — میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

۷۳ حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں — مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

۷۴ وہ دن بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے — یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

۷۵ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

۷۶ کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب — تم کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں؟

۷۷ دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا — یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں؟

۷۸ تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟

۷۹ ع غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ

۸۰ یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے؟ — لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

۸۱ سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

۸۲ ع یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

۸۳ ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم — ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

۸۴ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں مجھ پہ پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

۸۵ ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

۸۶ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا! — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

۸۷ دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا — دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

۸۸ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

۸۹ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

۹۰ طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

۹۱ وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے — مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

۹۲ نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

۹۳ جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
۹۴ وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں — سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟
۹۵ وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگدل! تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟
۹۶ ع ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟
۹۷ رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
۹۸ پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار — اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو
۹۹ ع مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
۱۰۰ ع تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
۱۰۱ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو — اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے
۱۰۲ کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالب — بدی کی اس نے جس سے کی تھی ہم نے بارہا نیکی
۱۰۳ خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی — اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے
۱۰۴ ع مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے
۱۰۵ ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے
۱۰۶ گر [illegible] نہیں تجھے وقت آگہی ہے سدا — ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے
۱۰۷ قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
۱۰۸ ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں — نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی
۱۰۹ ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی
۱۱۰ یار سے چھیڑ چلی جائے اسد — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی
۱۱۱ [illegible] پہ کون مرے [illegible] کا معاملہ — شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے
۱۱۲ زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
۱۱۳ مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم — تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟
۱۱۴ ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں — بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے
۱۱۵ غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا؟ — مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے
۱۱۶ ع ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے
۱۱۷ دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

۱۱۸ ع ذکر میرا۔ مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

۱۱۹ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

۱۲۰ لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں — مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

۱۲۱ ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

۱۲۲ کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی

۱۲۳ موت کا ایک دن معیّن ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

۱۲۴ آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

۱۲۵ جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

۱۲۶ ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

۱۲۷ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

۱۲۸ مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

۱۲۹ کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ — شرم تم کو مگر نہیں آتی

۱۳۰ میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے؟

۱۳۱ جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

۱۳۲ ہم کو ان سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟

۱۳۳ ہاں بھلا کر۔ ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے؟

۱۳۴ ع مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

۱۳۵ بے خودی بے سبب نہیں غالب — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

۱۳۶ پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے — اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

۱۳۷ یوں ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب۔ ورنہ کہتا — کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

۱۳۸ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

۱۳۹ ع اک شمع رہ گئی تھی۔ سو وہ بھی خموش ہے

۱۴۰ یک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق — نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

۱۴۱ نہ ستائش کی تمنا۔ نہ صلے کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

۱۴۲ ع اک ذرا چھیڑیئے۔ پھر دیکھیئے کیا ہوتا ہے

۱۴۳ خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ   کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

۱۴۴ نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب   لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

۱۴۵ دیکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف   آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

۱۴۶ ہر اک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے"   تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

۱۴۷ رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل   جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

۱۴۸ ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا   وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

۱۴۹ میری قسمت میں غم گر اتنا تھا   دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

۱۵۰ ع جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

۱۵۱ اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا   ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے

۱۵۲ بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے   وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

۱۵۳ ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق   وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

۱۵۴ ع کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

۱۵۵ ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن   دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

۱۵۶ خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو   ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

۱۵۷ عشق نے غالب نکما کر دیا   ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

۱۵۸ کب وہ سنتا ہے کہانی میری؟   اور پھر وہ بھی زبانی میری

۱۵۹ منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید   ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

۱۶۰ ع کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

۱۶۱ عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب   کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

۱۶۲ پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے   پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

۱۶۳ ع غالب کو برا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے

۱۶۴ سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے   کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

۱۶۵ بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے   ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

۱۶۶ ع آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

۱۶۷ گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے   رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

۱۶۸ جو مدعی بنے اُس کے نہ مدعی بنیئے   جو نا سزا کہے اس کو نہ نا سزا کہیئے

۱۶۹ سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب   خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے ؟

۱۷۰ ع   دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

۱۷۱ اِبن مریم ہوا کرے کوئی   میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

۱۷۲ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ   کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

۱۷۳ کیا کیا خضر نے سکندر سے   اب کسے رہنما کرے کوئی

۱۷۴ جب توقع ہی اٹھ گئی غالب   کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

۱۷۵ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے   بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

۱۷۶ نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن   بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

۱۷۷ محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا   اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

۱۷۸ کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ   پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

۱۷۹ ع   ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

۱۸۰ غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے   ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

۱۸۱ واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو   کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

۱۸۲ گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں   کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

۱۸۳ کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب   آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

۱۸۴ نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں   گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

۱۸۵ ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے   شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

۱۸۶ ع   بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

۱۸۷ گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی

۱۸۸ اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیئے

۱۸۹ ع   کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

۱۹۰ زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا   کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

۱۹۱ ع   صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

۱۹۲ اس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا   صبح جو جائے اور آئے شام

۱۹۳ ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

۱۹۴ دیکھیو! غالب سے گر الجھا کوئی — ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

۱۹۵ ع ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہئے

۱۹۶ ع ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

۱۹۷ منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

۱۹۸ سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

۱۹۹ آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

۲۰۰ ع مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات

۲۰۱ ع مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

۲۰۲ ع روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ

۲۰۳ ع قسمت بری سہی، پہ طبیعت بری نہیں

۲۰۴ صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ — کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

۲۰۵ تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

۲۰۶ ع گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

۲۰۷ ہے دعا بھی یہی کہ دنیا میں — تم رہو زندۂ جاوداں، آمین

۲۰۸ چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط — بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

غالب کے یہ کم و بیش دو سو اشعار اور مصرعے جو خواص کی زبان اور عوام کی بول چال میں عام طور پر رائج اور مروّج ہیں صاف طور پر اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں کہ اردو کے عوامی اور تصنیفی ادب پر جس قدر گہرا اثر مرزا غالب کا ہے اتنا کسی اور شاعر کا نہیں اگر کسی صاحب کو اس بات کے ماننے اور قبول کرنے میں تامل یا انکار ہو تو انہیں چاہئے کہ اسی قدر ایسے اشعار کسی دوسرے اردو شاعر کے کلام سے نکال کر دکھائیں جو ہماری زبان میں ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتے ہوں۔ پس اگر میرا دعویٰ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے تو ثابت ہوا کہ اردو ادب پر تمام شعراء سے زیادہ غالب کا اثر غالب ہے۔ اور اس سلسلہ میں کوئی بھی دوسرا شاعر غالب کے درجے کو نہیں پہنچ سکا ہے

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

خورشید نہرا ایم۔اے (لیکچرار)
اسلامیہ کالج برائے خواتین لاہور۔

اَوراقِ گُل

(بیسویں صدی کے بعض شعرائے کبار اور غالب کا انتخاب)

"ریاستِ عالیۂ مصطفےٰ آباد (رامپور) ہمیشہ سے علم و ہنر کی سرپرستی کرتی رہی ہے۔ شاعروں میں سے اکثر نے اس کے والیوں کے دامنِ لطف و کرم میں پناہ لے کر اپنے فن کی آبیاری کی اور قائم و مصحفی سے امیر و داغ تک اسی دربار کی قدردانی اور قدر افزائی سے آسمانِ شہرت پہ چمکے" ——— بشیر حسین زیدی

"میرزا غالب مرتے دم تک اسی دربار سے وابستہ رہے، داغ، امیر، تسلیم، جلال کی شاعری یہیں پروان چڑھی۔ دربار نے ان کو طرح طرح سے نوازا، انھوں نے شاعری کو رنگ رنگ سے سنوارا.... اور اہلِ رامپور کے ادبی ذوق کی ایسی تربیت ہوئی کہ گو زمانے نے دیوانِ زندگی کے کئی ورق اُلٹ دیئے، مگر شعر کی گرمی، اب بھی دلوں کو گرماتی ہے" ——— ضمیر ہاشمی

شعرائے رامپور اور مستند بیرونی اساتذۂ شعر کے درمیان رابطہ، اتحاد و اعانت پیدا کر کے دبستانِ رامپور کی از سرِ نو آبیاری کی غرض سے ۱۹۴۰ء میں رامپور میں ایک مجلس "بزمِ سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس بزم نے دو سال کے اندر رامپور میں متعدد یادگار معیاری مشاعرے منعقد کئے۔ ان ادبی نشستوں کی رُوداد کو زیادہ ہمہ گیر، مفید اور دلچسپ

[redacted]

بنانے کے خیال سے شریکِ مشاعرہ اساتذہ کے چیدہ کلام، تصاویر، عکسِ خط اور مختصر حالاتِ زندگی پر مشتمل ایک مجموعہ ترتیب دیا گیا۔ "اوراقِ گُل" کے نام سے یہ مجموعہ ضمیر ہاشمی (ڈپٹی ریذیڈنٹ) نے مرتب کیا اور سلسلۂ مطبوعاتِ کتاب خانۂ رامپور کے چھٹے نمبر کے بطور ۱۹۴۴ء میں آرٹ پیپر پر اہتمام کے ساتھ شائع ہوا۔ بزمِ سخن کے صدر اور رامپور کے چیف منسٹر کرنل بشیر حسین زیدی نے اس پر مختصر تعارف لکھا، یہ مجموعہ اب نایاب ہے۔

رامپور کے اِن مشاعروں میں اُس دور کے مشہور شعراء میں سے منتخب کو دعوت دی گئی اور حضراتِ شعراء سے بزمِ سخن کے اراکین کی یہ استدعا رہی کہ وہ اپنے اور دیزبان کسی دوسرے شاعر کے چند منتخب اور پسندیدہ اشعار کی نشاندہی فرمائیں اکابر شعراء کی اکثریت نے دیگر شعراء کے بشمول غالب کے کسی نہ کسی شعر کو ضرور اپنے منتخب اور پسندیدہ اشعار میں شمار کیا۔ یہ اس امر پر دال ہے کہ ہمارے دور کے اصحابِ شعر و ادب پر غالب کی گرفت کیسی مضبوط رہی ہے۔ شعر کا انتخاب ذوقی بات ہے اس سے حالِ دل بھی کھلتا ہے۔ اِن اکابر شعراء میں سے زیادہ ایسے ہیں جو آج ہم میں نہیں اور جو موجود ہیں۔ (خدا انھیں تا دیر سلامت رکھے) آج بھی ہمارے شعر و ادب کی آبرو ہیں۔ اور اس لئے یہاں اس انتخاب کو ان شعراء کی یادگار کے طور پر "العلم" (غالب نمبر) کے قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ پنڈت امر ناتھ ساحر دہلوی:۔

جی ڈھونڈتا ہے، پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

★

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا (اوراقِ گل ص ۲۱۳)

★

۲۔ ثاقب لکھنوی:۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

★

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی!

★

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا،
تو پھر اے سنگ دل، تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو (اوراقِ گل ص ۱۱۵)

★

۳۔ جلیل مانکپوری:۔

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
(اوراقِ گل، ص ۱۰۶)

خورشید نہال ایم اے (لیکچرر)
اسلامیہ کالج برائے خواتین لاہور

اوراقِ گُل

(بیسویں صدی کے بعض شعرائے کبار اور غالب کا انتخاب)

"ریاستِ عالیہ مصطفےٰ آباد (رامپور) ہمیشہ سے علم و ہنر کی سرپرستی کرتی رہی ہے۔ شاعروں میں سے اکثر نے اس کے والیوں کے دامنِ لطف و کرم میں پناہ لے کر اپنے فن کی آبیاری کی اور قائم و مصحفی سے امیر و داغ تک اسی دربار کی قدردانی اور قدرافزائی سے آسمانِ شہرت پر چمکے" ــــــــ بشیر حسین زیدی

"میرزا غالب مرتے دم تک اسی دربار سے وابستہ رہے، داغ، امیر، تسلیم، جلال کی شاعری یہیں پروان چڑھی۔ دربار نے ان کو طرح طرح سے نوازا، انھوں نے شاعری کو رنگ رنگ سے سنوارا.... اور اہلِ رامپور کے ادبی ذوق کی ایسی تربیت ہوئی کہ گو زمانے نے دیوانِ زندگی کے کئی ورق اُلٹ دیئے، مگر شعر کی گرمی، اب بھی دلوں کو گرماتی ہے" ــــــــ ضمیر ہاشمی

شعرائے رامپور اور مستند بیرونی اساتذۂ شعر کے درمیان رابطہ، اتحاد و اعانت پیدا کرکے دبستانِ رامپور کی ازسرِنو آبیاری کی غرض سے ۱۹۴۰ء میں رامپور میں ایک مجلس "بزمِ سخن" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس بزم نے دو سال کے اندر اندر متعدد یادگار معیاری مشاعرے منعقد کئے۔ ان ادبی نشستوں کی رُوداد کو زیادہ ہمہ گیر، مفید اور دل چسپ

بنانے کے خیال سے شریکِ مشاعرہ اساتذہ کے چیدہ کلام، تصاویر، عکسِ خط اور مختصر حالاتِ زندگی پر مشتمل ایک مجموعہ ترتیب دیا گیا۔ "اوراقِ گل" کے نام سے یہ مجموعہ ضمیر ہاشمی (ڈپٹی رجسٹرار) نے مرتب کیا اور سلسلۂ مطبوعاتِ کتاب خانۂ رامپور کے چھٹے نمبر کے بطور ۱۹۴۴ء میں آرٹ پیپر پر اہتمام کے ساتھ شائع ہوا۔ بزمِ سخن کے صدر اور رامپور کے چیف منسٹر کرنل بشیر حسین زیدی نے اس پر مختصر تعارف لکھا، یہ مجموعہ اب نایاب ہے۔

رامپور کے اِن مشاعروں میں اُس دور کے مشہور شعراء میں سے منتخب کو دعوت دی گئی اور حضراتِ شعراء سے بزمِ سخن کے اراکین کی یہ استدعا رہی کہ وہ اپنے ورد زبان کسی دوسرے شاعر کے چند منتخب اور پسندیدہ اشعار کی نشاندہی فرمائیں اکابر شعراء کی اکثریت نے دیگر شعراء کے بشمول غالب کے کسی نہ کسی شعر کو ضرور اپنے منتخب اور پسندیدہ اشعار میں شمار کیا۔ یہ اس امر پر دال ہے کہ ہمارے دور کے اصحابِ شعر و ادب پر غالب کی گرفت کیسی مضبوط رہی ہے۔ شعر کا انتخاب ذوقی بات ہے اس سے حالِ دل بھی کھلتا ہے! اِن اکابر شعراء میں سے زیادہ ایسے ہیں جو آج ہم میں نہیں اور جو موجود ہیں۔ (خدا انھیں تا دیر سلامت رکھے) آج بھی ہمارے شعر و ادب کی آبرو ہیں۔ اور اس لئے یہاں اس انتخاب کو ان شعراء کی یادگار کے طور پر "العلم" (غالب نمبر) کے قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی:-

جی ڈھونڈتا ہے، پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

★

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا (اوراقِ گل ص ۲۱۳)

۲۔ ثاقب لکھنوی:-

★

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

★

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی!

★

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا،
تو پھر اے سنگ دل، تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو (اوراقِ گل ص ۱۱۵)

★

۳۔ جلیل مانکپوری:-

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
(اوراقِ گل، ص ۱۴۰)

۴۔ نوح ناروی :۔

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا (اوراقِ گل ص ۳۳)

۵۔ آزاد انصاری :۔

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں (اوراقِ گل ص ۱۷)

۶۔ برج موہن دتاتریہ کیفی :۔

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے! (اوراق گل ص ۲۸۳)

۷۔ تلوک چند محروم :۔

واعظ نہ خود پیو، نہ کسی کو پلا سکو!
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی! (اوراقِ گل ص ۳۱۱)

۸۔ اثر صہبائی :۔

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پہ نہیں آتی، (اوراقِ گل ص ۳۹)

۹۔ جوش ملیح آبادی :۔

مجھے اب دیکھکر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر (اوراق گل ص ۵۰)

۱۰۔ فراق گورکھپوری :۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم، کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے (اوراقِ گل ص ۲۷۰)

۱۱۔ احسان دانش :۔

کرتے کس مُنہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں! (اوراقِ گل، ص ۶۳)

۱۲۔ حفیظ جالندھری :۔

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا! (اوراقِ گل ص ۱۷۳)

۱۳۔ روش صدیقی :۔

دل چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو وہ لہو کیا ہے
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اِک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

(اوراقِ گل، ص ۱۹۸،۱۹۷)

سہیل برکاتی

خطوطِ غالب میں اشعارِ غالب

مراسلت میں اشعار کے استعمال کا ہمارے یہاں عام رواج ہے، اسے مکتوب نگار کے حُسنِ ذوق اور ادبیت کی دلیل سمجھا جاتا ہے، مکتوب الیہ بھی زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ کیونکہ اولاً تو وزن میں خود کشش اور جاذبیت ہے ثانیاً شعر خصوصاً غزل کا شعر مفہوم کو حسین پیرائے اور کم سے کم الفاظ میں ادا کرتا ہے، جس سے عبارت کا زور، اثر اور حسن بڑھ جاتا ہے۔ پھر شعر بھی اگر اعلیٰ درجہ کا ہو تو حسنِ عبارت میں چار چاند لگ جاتے ہیں اسی لئے بالعموم معروف و مقبول شعراء کے مشہور و مقبول اشعار استعمال کئے جاتے ہیں۔

اُردو شعراء میں غالبؔ کو خواص میں جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی تفصیل کی محتاج نہیں ہے، فلموں، کتابوں اور رسائل و جرائد کے نام، مضامین و مقالات اور فسانوں ڈراموں کے عنوانات، اس کے اشعار اور مصرعوں کے ٹکڑوں یا ترکیبوں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ رسائل و جرائد کی لوحِ پیشانی کے لئے اس کے اشعار منتخب کئے گئے۔ مکاتیب میں اس کے اشعار استعمال کئے گئے۔

ضرورت ہے کہ گزشتہ صدی کے ان کتابوں رسالوں اور مضامین، فسانوں اور ڈراموں کا جائزہ لیا جائے جن کے نام اور عنوان غالبؔ کے مصرعوں یا ترکیبوں سے ماخوذ ہیں۔ ان رسائل و اخبارات کی فہرست مرتب کی جائے، جن کی لوحِ پیشانی پر غالبؔ کا کوئی شعر درج ہوتا تھا اور اس صدی کے مطبوعہ مجموعہائے مکاتیب کو دیکھا جائے کہ ان میں غالبؔ کے کتنے اور کون کون سے اشعار استعمال ہوئے ہیں؟ اور دوسرے اُردو شعراء کے شعروں کے مقابلے میں غالبؔ کے ان شعروں کا تناسب کیا ہے؟

فی الحال ہم اس مہم کا آغاز خود غالبؔ کے مکاتیب سے کر رہے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں ہم نے غالبؔ کے وہ

اشعار جمع کئے ہیں جو خود غالبؔ نے اپنے خطوں میں استعمال کئے ہیں۔ یوں تو غالبؔ کے مکاتیب میں اس کے بہت سے اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً غالبؔ نے مکتوب الیہ کو اپنا کوئی شعر قطعہ، قصیدہ یا غزل بھیجی ہے، مگر اس کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ہم نے صرف ان اشعار کو منتخب کیا ہے جن کو غالبؔ نے بحیثیت شاعر تحفتہً ارسال نہیں کیا بلکہ بحیثیت مکتوب نگار ادائے مطلب یا حسنِ بیان میں اضافہ اور ازدیادِ اثر کے لئے اس طرح استعمال کیا ہے کہ وہ چسپاں ہو گئے اور جزوِ عبارت بن گئے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح دوسرے لکھنے والے اس کے اشعار کا استعمال کرتے ہیں۔

ان شعروں کا دیوان سے مقابلہ کرنے پر یہ بھی اندازہ ہوا کہ (۱) بعض بعض موقعوں پر اس نے اپنے شعروں میں ضرورتاً ترمیم و تغیر کر دیا ہے۔ ایسے مقامات پر ہم نے نشاندہی کر دی ہے (۲) ایسے مصرعے اور شعر بھی ملے جو ان کے کسی دیوان میں نہیں پائے جاتے۔ خط لکھتے ہوئے برجستہ موزوں ہو گئے ان میں سے بعض میں شعریت اور دلکشی ہے اور بعض ہنگامی نوعیت کے یا مزاح کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ ہم نے ان کی بھی صراحت کر دی ہے۔ ہمارے پیشِ نظر مولانا غلام رسول مہرؔ کا مجموعہ "خطوطِ غالبؔ" ہے (۱۹۵۱ء لاہور)

(۱)

(بدھ ۲ر فروری ۱۸۵۹ء)

بنام میر مہدی مجروحؔ

"آج تمہارا خط آیا۔ دوپہر کو جواب لکھتا ہوں:

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے　　　کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

"میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت ہے۔" (صفحہ ۲۷۳)

مندرجہ بالا شعر غالبؔ کے دیوان میں موجود نہیں۔

(۲)

(۲۸ر نومبر ۱۸۶۳ء)

بنام صفیر بلگرامی

"آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا کہ یہ ستّرواں برس مجھے جاتا ہے ؎

سنین[1] عمر کے ستر ہوئے شمار برس　　　بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

یہ شعر غالبؔ کے دیوان میں نہیں ہے۔　　　(صفحہ ۵۹۰)

---

[1] "سنین عمر کے برس" کی ترکیب ایسی ہی ہے جیسے شب برات کی رات۔

(۳)

(سنہ ۱۸۶۳ء)

بنام علاؤالدین احمد خاں علائی

ولیعہدی میں شاہی ہو مبارک   عنایاتِ الٰہی ہو مبارک

(صفحہ ۸۴)

غالب نے اس شعر سے علائی کے نام خط کی ابتداء کی ہے۔ دیوان غالب میں یہ شعر نہیں ہے۔

(۴)

(۱۹ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء)

بنام انوار الدولہ شفق

پیر و مرشد معاف کیجئے گا   میں نے جمنا کا کچھ نہ لکھا حال

"یہاں کبھی کسی نے اس دریا کی کوئی حکایت ایسی نہیں کی کہ جس سے استبعاد اور استعجاب پایا جائے۔ پرسش کے بعد بھی کوئی بات نہیں سنی" (صفحہ ۳۶۰)

(۵)

بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر

"بھائی جان، کل جو جمعہ روز مبارک و سعید تھا گویا میرے حق میں روزِ عید تھا

چار گھڑی دن رہے نامۂ فرحت فرجام اور چار گھڑی کے بعد وقت شام

سات جلدوں کا پارسل پہنچا   واہ کیا خوب بر محل پہنچا (صفحہ ۲۲۲)

(۶)

(جون ۱۸۶۱ء)

بنام چودھری عبدالغفور سرور

"حضرت چودھری صاحب عنایت نامۂ سابق

تھا تو خط، پہ نہ تھا جواب طلب   کوئی اس کا جواب کیا لکھتا

آج دوپہر کو یہ خط پہنچا، آج ہی آخر روز جواب لکھ کر چھوڑتا ہوں"

(صفحہ ۴۹۳)

(۷)

(۱۳ر دسمبر ۱۸۵۹ء)

بنام میر مہدی مجروح

" مجھے تو دربار و خلعت کے لالے پڑے ہیں تم کو پنشن[1] کی فکر ہے۔ یہاں کے حاکم نے میرا نام فرد میں نہیں لکھا۔ میں نے اس کا اپیل[2] نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کے یہاں کیا ہے۔

ع دیکھئے کیا جواب آتا ہے　(صفحہ ۴۸۶)

(۸)

(۱۸۶۰ء)

بنام شاہ عالم

" مشفقی و مکرمی چودھری عبدالغفور صاحب کو میرا اسلام شوق کہئے گا اور یہ پیام پہونچایئے گا کہ حضرت صاحب عالم کی تمنائے دیدار بعید از بہرہ کنایہ اس سے ہے کہ اور کسی کا بھی دیدار مطلوب ہے ع

"خواہش وصل مقدر ہے جو مذکور نہیں"　(صفحہ ۵۰۹)

دیوان غالب میں یہ مصرع اس طرح ہے

ع مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

(۹)

(۱۷ر جولائی ۱۸۶۵ء)

بنام میر مہدی مجروح

" قرۃ العینین میر مہدی و میر سرفراز حسین مجھ سے ناخوش و گلہ مند ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ دیکھو ہمیں خط نہیں لکھتا ہے

ہم بھی منہ میں زباں رکھتے ہیں　　کاش پوچھو کہ ماجرا کیا ہے

ماجرا یہ ہے کہ تمہارا بھی تو کوئی خط نہیں آیا۔ میں جس کا جواب لکھتا "　(صفحہ ۳۱۱)

دیوانِ غالب میں یہ شعر اس طرح ہے ؎

میں بھی منہ میں زباں رکھتا ہوں　　کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

---

[1] غالب ہمیشہ پنشن کو پنسن لکھتے تھے [2] " اپیل " آج کل مونث مستعمل ہے۔

(۱۰)

(۲۶ نومبر ۱۸۶۲ء)

بنام منشی ہرگوپال تفتہ

"بھائی مجھ میں اب کچھ باقی نہیں ہے برسات کی مصیبت گزر گئی لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں۔ بیٹھ نہیں سکتا۔ اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں..... تین باتیں جمع ہوئیں۔ میری کاہلی، تمہارے کلام کا محتاج بہ اصلاح نہ ہونا، کسی تعصب سے کسی طرح کے نفع کا تصور نہ ہونا۔ نظراں مراتب پر، کاغذ پڑے رہے۔ لالہ بالمکند بے صبر کا ایک پارسل آیا ہے کہ جس کو بہت دن ہوئے۔ آج تک سرنامہ بھی نہیں کھولا۔ نواب صاحب کی دس پندرہ غزلیں پڑی ہوئی ہیں ؎

ضعف نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے (صفحہ ۱۹۱)

دیوان غالب میں مصرعۂ اولیٰ اس طرح ہے ع "عشق نے غالب نکما کر دیا

(۱۱)

بنام منشی ہرگوپال تفتہ

"....... سو گناہ جب دل اُلٹنے لگتا ہے۔ تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے ؎

زندگی اپنی اسی ڈھب سے جو گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

دیوان غالب میں مصرعۂ اولیٰ اس طرح ہے

ع زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں" پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرعہ پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں ع اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے۔

(۱۲)

(۵ ستمبر ۱۸۶۶ء)

بنام میاں داد خاں سیاح

"بھائی سیف الحق، تمہارا خط پہنچا۔ قاضی صاحب بڑودہ کو معاف رکھو اگر کوئی وجہ اپنے پیران کے عتاب کی پاتا تو ان سے عذر کرتا اور اپنا گناہ معاف کرواتا۔ جب سبب ملال

کا ظاہر نہیں تو میں کیا کروں۔ تم بُرا نہ مانو کس واسطے کہ اگر میں بُرا ہوں تو اس نے سچ کہا اور اگر میں اچھا ہوں اور اس نے بُرا کہا تو اس کو خدا کے حوالے کرو ؎

غالب بُرا نہ مان جو دشمن بُرا کہیں ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے (صفحہ ۴۴۵)

دیوان غالب میں مصرعہ اولیٰ اس طرح ہے ع "غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے"

(۱۳)

بنام مرزا رحیم بیگ مصنف ساطع برہان

"آگے جو ہمت نہیں ہاری تھی اور غیب سے توقع مددگار تھی تو یہ اپنا شعار دو میرے ورد زبان اور اس ہنجار سے میں زمزمہ سنج فغاں رہتا تھا ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اب جو اصلاح حال و حصول مطالب سے دل مایوس ہے تو طبیعت اسی غزل کی اس بیت کے ترنم سے مانوس ہے ؎

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ[۵۱] مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا (صفحہ ۶۱۹)

(۱۴)

(۱۸۶۲ء)

بنام چودھری عبدالغفور

"اب دو باتیں سوچتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں۔ یوں ہی ر دیا کروں گا. دوسری یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مروں گا۔ یہ صغریٰ و کبریٰ دلنشیں ہے۔ نتیجہ اس کا تسکین ہے یہاں ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید[۵۲]
نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے (صفحہ ۴۹۶)

(۱۵)

(۱۸۶۰ء)

بنام نواب انوار الدولہ شفق

"سرے سے سنئے آپ کا قصیدہ بعد اصلاح پہنچا اس کی رسید آئی. کئی کٹے ہوئے شعر اُلٹے آئے اُن کی قباحت پوچھی گئی۔ قباحت بتائی گئی۔ الفاظ قبیح کی جگہ بے عیب

---

۵۱ غالب نے یہی شعر ایک خط بنام صاحب عالم مارہروی ۱۸۵۹ء میں نقل کیا ہے ص ۴۰۲
۵۲ غالب نے یہی ایک خط بنام یوسف مرزا میں بھی نقل کیا ہے

الفاظ لکھ دیئے گئے۔ لو صاحب، یہ اشعار بھی قصیدے میں لکھ لو۔ اس نگارش کا جواب آج تک نہیں۔ شاہ اسرارالحق کے نام کا کاغذ اُن کو دیا گیا۔ جواب میں جو کچھ اُنھوں نے زبانی فرمایا وہ آپ کو لکھا گیا۔ حضرت کی طرف سے اس تحریر کا جواب بھی نہ ملا۔

پُرہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا　　اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے　　(صفحہ ۳۵۶)

(۱۶)

(جولائی ۱۸۶۱ء)

بنام میر مہدی مجروح

"وبا کو کیا پوچھتے ہو، قدرِ انداز قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا قتل ایسا عام، لُوٹ ایسی سخت، کال ایسا پڑا وبا کیوں نہ ہو۔ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام　　ایک مرگِ ناگہانی اور ہے　　(صفحہ ۲۹۸)

(۱۷)

(۲ دسمبر سال حال ۱۸۵۹ء)

بنام میر مہدی مجروح

"اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں میرٹھ میں مصطفےٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین خاں، بلی ماران میں سگِ دنیا موسوم بہ اسد تینوں مردود و مطرود و محروم و مغموم ع

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے　　(صفحہ ۳۸۵)

یہ شعر دیوان میں نہیں ہے۔

(۱۸)

بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر

"پس اگر کسی بے درد پر دل آیا ہے تو شکایت کی کیا گنجائش ہے بلکہ یہ غم تو نصیب دوستاں درخورِ افزائش ہے بقول غالب علیہ الرحمۃ ع

کسی کو دیکے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو!
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

(صفحہ ۲۲۲)

(۱۹)

بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر

"اور اگر خدانخواستہ باشد غم دنیا ہے تو بھائی ہمارے ہمدرد ہو۔ ہم اس بوجھ کو مردانہ وار اُٹھا رہے ہیں۔ تم بھی اُٹھاؤ اگر مرد ہو۔ بقول غالب مرحوم ؎

ولایہ درد والم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر ۔۔۔ نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے (صفحہ ۲۲۳)

(۲۰)

بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر

"جناب مرزا صاحب دلی کا حال تو یہ ہے ؎

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اُسے غارت کرتا ۔۔۔ وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

یہاں دھرا کیا ہے جو کوئی لوٹے گا" (صفحہ ۲۲۷)

(۲۱)

(۱۸۶۴ء)

مولوی عبدالرزاق شاکر

"بندہ نواز، زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری وضعف کے صدموں سے محنت پژوہی وجگر کاہی کی قوت مجھ میں نہ رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے ؎

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب

وہ عناصر میں اعتدال کہاں (صفحہ ۵۲۹)

(۲۲)

(۲؍ جولائی ۱۸۶۰ء)

بنام مرزا تفتہ

"تمہارے دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے اور دیکھنا تمہارا موقوف اس پر ہے کہ تم یہاں آؤ کاش اپنے والد ماجد کے ساتھ چلے آتے اور مجھکو دیکھ جاتے۔ اُردو کا دیوان رامپور سے لایا ہوں اور وہ آگرہ گیا ہے۔ وہاں منطبع ہوگا ایک نسخہ تمہارے پاس پہنچ جائے گا ؎

تم جا تو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو ...!

مجھکو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو (صفحہ ۵۶)

(۲۳)

(۱۹ر جون ۱۸۶۲ء)

بنام مرزا علاؤالدین خاں علائی

"حق سبحانہٗ تعالیٰ ان دونوں صاحبوں کو یا ایک کو ان میں سے توفیق دے یا مجھکو طاقت یا تم کو انصاف تک میرے نہ آنے کو دلی کی دل بستگی پر محمول نہ کرو مجھکو رشک ہے جزیرہ نشینوں کے حال پر اور رئیس فرخ آباد پر خصوصاً کہ جہاز سے اُتار کر سرزمین عرب میں چھوڑ دیا۔ اہاہاہا ؎

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو (صفحہ ۳۴۷)

(۲۴)

(جنوری ۱۸۶۶ء)

بنام مرزا تفتہ

"ترک لباس سے قید ہستی مٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھائے پیئے گزارا نہ ہوگا۔ محنت و سستی، رنج و آرام کو ہموار کرو جس طرح ہو، اسی صورت سے ہر صورت گزرنے دو

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز (صفحہ ۲۰۶)

(۲۵)

بنام میر مہدی مجروح

"کیسا پنشن اور کہاں اس کا ملنا یہاں جان کے لالے پڑے ہیں ؎

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

اگر زندگی ہے اور پھر مل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی۔" (صفحہ ۲۶۶)

(۳۶)

بنام شیخ لطیف احمد بلگرامی

"فخر ایجاد و تکوین مولانا فضل حق ایسا دوست مرجائے۔ غالب نیم مردہ نیم جان رہ جائے

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

اگر جوان ہوتا اور بیمار تو آپ سے دعائے خیریت چاہتا۔ اسی برس کا بڈھا ہونے آیا ہوں۔ دعائے مغفرت کا امیدوار ہوں۔ شراب کم بخت اب بھی چھوٹتی نہیں

نماز کا اب بھی عادی ہوتا نہیں ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی
کعبہ کس منہ سے جاؤگے غالب　　شرم تم کو مگر نہیں آتی،

(۲۷)

(۱۶ ستمبر ۱۸۶۲ء)

بنام میر مہدی مجروح

"قبائل تمہارے یہیں ہیں اگر وہاں کچھ حاصل ہو رسائی تو خیر ورنہ یہاں کیوں نہ چلے آؤ ؎　　میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جان
کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکان!

برسات کا حال نہ پوچھو خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے میں جس مکان میں رہتا ہوں عالم بیگ خاں سے کڑہ کی طرف دروازہ گر گیا۔" (صفحہ ۳۰۴)

(۲۸)

(۱۷ جولائی ۱۸۶۵ء)

بنام میر مہدی مجروح

"کیا کہوں کہ کیا حال ہے؟ پیش ازیں اپنا یہ شعر پڑھا کرتا تھا ؎

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائیگی　　یہ جو اک لذت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے (صفحہ ۳۱۲)

(۲۹)

بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر

"سبحان اللہ تم نے قصیدے میں وہ رنگ دکھایا ہے کہ انشاء کو رشک آیا مثنوی کے اشعار جو میں نے دیکھے کیا کہوں۔ کیا حظ اٹھایا ؎

خدا سے میں بھی چاہوں ازرہ مہر　　فروغ میرزا حاتم علی مہر (صفحہ ۲۲۸)

(۳۰)

تم سلامت رہو قیامت تک

یہ مصرعہ مرزا غالب نے خواجہ غلام غوث بیخبر کے نام دو خطوں کے اختتام پر بطور دعا لکھا ہے۔

غالب کے وہ اشعار جن سے انھوں نے اپنے بعض خطوط کی ابتدا کی ہے:-

(۱)

بنام تفتہ

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف   آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے   (صفحہ ۱۴۲ عودِ ہندی)

(۲)

بنام مرزا حاتم علی مہر

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے   غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہے
سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی   یقیں ہے ہمکو بھی لیکن اب اسمیں دم کیا ہے   (صفحہ ۲۱۰)

(۳)

بنام منشی غلام غوث خاں بیخبر

میں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں   یعنی سبقِ شوقِ مکرر نہ ہوا تھا

پیر و مرشد خفا نہیں ہوا کرتے۔ یوں سُنا مجھے باور نہ آیا یہاں تک تو میں موردِ عتاب نہیں ہو سکتا۔ (صفحہ ۳۳۱)

(۴)

(۱۶ جون ۱۸۶۶ء)

بنام شہزادہ بشیر الدین

تم سلامت رہو ہزار برس[1]   ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار   (صفحہ ۵۶۷)

(۵)

بنام علاؤ الدین احمد خاں علائی

ولیعہدی میں شاہی ہو مبارک
عنایاتِ الٰہی ہو مبارک   (صفحہ ۸۴)

---

[1] نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں رئیسانِ رامپور کے نام غالب نے جو خط لکھے ہیں ان کے آخر میں بھی اکثر یہ شعر لکھا ہے (مکاتیب غالب عرشی)

جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹرایٹ لا پٹنہ

غالب نے

اُردو میں خط وکتابت کب سے شروع کی

غالب نے اُردو میں خط وکتابت کب سے شروع کی؟ اس سوال کا جواب سب سے پہلے حالی کی یادگارِ غالب میں تلاش کرنا چاہیئے۔ حالی لکھتے ہیں:-

"معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط وکتابت کرتے تھے مگر سنہ مذکور میں جبکہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کئے گئے اور ہمہ تن مہر نیم روز کے لکھنے میں معروف ہو گئے۔ اس وقت بضرورت ان کو اُردو میں خط وکتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر فارسی خطوط جن میں قوتِ متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے، نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب ان کی ہمت مہر نیم روز کی ترتیب و انشاء میں معروف تھی، ضرور ہے کہ اس وقت ان کو فارسی زبان میں خط وکتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرزِ خاص میں شاق ہوئی ہوگی۔ اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ اُنھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو زبان میں خط لکھنے شروع کئے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہ رہی۔"

حالی نے غالب[1] کا جو قول نقل کیا ہے، وہ غدر کے بعد کا ہے اور اس سے صرف اسی قدر ثابت ہوتا ہے کہ ضعف پیری کی وجہ سے غالب نے فارسی میں خط لکھنا ترک کر دیا تھا۔ اردو میں پہلے پہل کب خط لکھا اور کیوں لکھا اس کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچنے میں اس سے مطلق مدد نہیں ملتی۔ حالی کا یہ دعویٰ کہ اردو میں خط لکھنا شروع کیا جب وہ مہر نیم روز کی تصنیف میں مصروف تھے محض قیاس پر مبنی ہے اور کوئی ایسی روایت اس کی مؤید ہو موجود نہیں۔ اس سے قطع نظر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب یہ ظاہر مہر نیم روز کی تصنیف اواسط ۱۸۵۰ء[2] سے شروع ہوئی تو حالی نے یہ کیوں لکھا کہ غالب غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اردو میں خط لکھنے لگے ہیں۔ یہ سوال بھی جواب طلب ہے کہ حالی کی ہمیشہ سے کیا مراد ہے۔ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ۱۸۵۰ء تک غالب نے کبھی اردو میں خط لکھا ہی نہیں، یا ان کا یہ مطلب ہے کہ عموماً فارسی میں لیکن کبھی کبھی اردو میں بھی لکھا کرتے تھے۔ حالی نے یادگار غالب میں ایک جگہ ہمیشہ کو عموماً[3] کے معنی میں استعمال کیا ہے لیکن اس سے لازمی طور پر نتیجہ نہیں نکلتا کہ اس موقع پر بھی ان کا یہی مطلب ہے۔ ایک بات اور بھی قابل توجہ ہے۔ اقتباس بالا میں شاید[4] ہی کوئی بات حالی نے قطعی طور پر کہی ہو۔ معلوم ہوتا ہے، غالباً، قیاس چاہتا ہے اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ جا بجا ملتے ہیں۔

غلام رسول صاحب مہر کی رائے میں[5] "غالب ۱۸۵۰ء سے قبل اردو میں خط و کتابت شروع کر چکے تھے

---

[1] غالب کا قول ایک خط سے ماخوذ ہے جو شاکر کے نام عود ہندی میں ہے اس خط پر کوئی تاریخ ثبت نہیں لیکن شاکر غالباً غدر کے بعد غالب کے شاگرد ہوئے ہیں، "شدت نسیان" اور جان کنی کے خیالات کا ذکر ہے۔ یہ باتیں غدر کے بعد کی ہیں۔

[2] مہر نیم روز۔ کلیات نثر غالب طبع اول ص ۱۳۲

[3] "ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا۔ ہمیشہ کرائے کی کتابیں منگوا لیتے تھے اور ان کو دیکھ کر واپس کر دیتے تھے" یادگار غالب شائع کردہ دائرۂ ادبیہ ص ۶۸ اسی کتاب میں ص ۱۹ پر "کبھی کوئی کتاب نہیں خریدتے تھے۔ الا ماشاء اللہ

[4] نادر خطوط غالب مرتبہ جناب رسا ہمدانی میں مرتب کے پردادا کرامت کے نام کا ایک خط ہے جناب رسا مقدمۂ نادر خطوط ص ۱۳ تا ۱۵ میں مدعی ہیں کہ یہ پہلا خط اردو کا ہے (یہ اور کرامت کے نام کے دوسرے خط جعلی ہیں۔ تبصرۂ نادر خطوط مطبوعۂ راقم جنوری ۱۹۴۲ء کے معاصر ندیم میں ملاحظہ ہو) بعد کو اپنے ایک مضمون میں جو اپریل ۱۹۴۴ء کے ندیم میں چھپا ہے بغیر کسی ثبوت کے انھوں نے یہ لکھا ہے کہ یہ خط جو یکم جنوری ۱۸۵۱ء کا ہے۔ حالی کی نظر سے گزرا تھا، اور حالی نے اسی کو دیکھ کر یادگار غالب میں تحریر کیا تھا کہ اردو میں خط و کتابت ۱۸۵۰ء کے بعد سے شروع ہوئی۔

[5] طبع ثانی میں مہر صاحب نے اپنی رائے میں ترمیم کی ہے۔

لیکن چونکہ اس زمانہ میں اُردو نثر کو اہلِ علم بلند پایہ نہیں دیتے تھے، اس لئے وہ خطوط محفوظ نہ رہ سکے لیکن جیسے جیسے اُردو کا رواج بڑھتا گیا اور فارسی کا رواج کم ہوتا گیا۔ غالب کی خط و کتابت فارسی کے بجائے اُردو میں زیادہ ہوتی گئی" (غالب طبع اول ص ۳۰۸) انھوں نے اُردو کے ایک خط کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کے نزدیک یکم دسمبر ۱۸۴۵ء کے کچھ بعد لکھا گیا ہے۔

مہر صاحب حالی کے اس نظریئے کو کہ مہر نیمروز کی تصنیف میں معروفیت اُردو میں خط و کتابت شروع کرنے کا باعث ہوئی تسلیم نہیں کرتے، مہر نیمروز کوئی ضخیم کتاب نہیں اور کئی سال کی مدت میں لکھی گئی ہے۔ غالب کے فارسی خطوط اُردو کے خطوط کی طرح تکلفات سے عموماً آزاد ہیں، اور ان کے لکھنے میں زیادہ کاوش نہیں کی گئی۔ اس کتاب کی تصنیف غالب سے " قادر الکلام اور مشاق نثر نگار " کو فارسی خط لکھنے سے مانع نہیں ہوسکتی۔ ص ۳۰۷-۳۰۸

امتیاز علی خاں صاحب عرشی اسے ناممکن نہیں سمجھتے کہ غالب نے ۱۸۵۰ء سے قبل بھی اُردو میں مراسلت کی ہو۔ لیکن وہ اس کے قائل نہیں کہ اس سنہ سے قبل کا کوئی اُردو خط موجود ہے۔ یہ امکان بھی محض فلسفیانہ امکان ہے، ورنہ ان کا اصلی خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے ۱۸۵۰ء سے پہلے اُردو میں کوئی خط لکھا ہی نہیں۔ مہر نیمروز کے معاملہ میں وہ حالی کے ہمنوا ہیں۔ (دیباچہ مکاتیب غالب طبع ثانی ص ۱۳۵ و ص ۱۴۵)[1]

مہیش پرشاد صاحب نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی لیکن انھوں نے ایک خط کا زمانہ تحریر اگست ۱۸۴۹ء متعین کیا ہے۔ (خطوط غالب ص ۲)

سوال زیر بحث کا تسلی بخش جواب حاصل کرنے کے لئے غالب کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کرنا مناسب ہوگا۔

۱۔ تقریباً ۱۸۰۵ء تک

غالب نے دو ایک جگہ[2] فخریہ لکھ دیا ہے کہ میری زبان فارسی ہے مگر یہ ان کا اصلی خیال نہیں، فارسی سے ان کا تعلق کس قسم کا ہے اس کے بارے میں ان کی حقیقی رائے قاطع برہان میں ملتی ہے:-

"نیازمے آرم و پوزش مے گسترم تا مردم نگویند کہ خود ہندوستان زا بودن و
ہندوستان زایان دیگر را ..... مسلّم نہ داشتن و خود علم پندار زباں دانی افراشتن
چہ معنی دارد۔ گویم سے گویم کہ نیا ئے من از ماوراء النہر بود و پدرم در دہلی پیکر
پذیرفت و من در آگرہ منشور ہستی یافتم، حاشا کہ خود را از اہل زبان گیرم۔ نباد انی

---

[1] دیباچہ ص ۱۴۵ "۱۸۵۰ء ..... تک۔ میرزا صاحب تقریباً اس زبان (یعنی فارسی) میں خامہ فرسائی کرتے رہے "تقریباً" سے عرشی صاحب کی کیا مراد ہے؟

[2] تقریظ گلشنِ بے خار و نامۂ غالب

من بہ فرزانہ فرزانۂ خدا آفریدہ گوہر ازل آوردست (قاطع طبع ثانی ص[۱۳۱])

فارسی غالب کی مادری زبان نہ تھی۔ اسے اُنھوں نے استاد ہی سے سیکھا تھا۔ اپنی تعلیم کے ابتدائی زمانہ میں وہ لکھنا پڑھنا جاننے پر بھی فارسی سے ناواقف رہے ہوں گے اور ایسا زمانہ بھی ہوگا جب وہ فارسی اتنی کم جانتے ہوں کہ اس زبان میں خط نہ لکھ سکتے ہوں۔ اس زمانہ کا کوئی خط موجود نہیں اور نہ اس کی شہادت پیش کی جا سکتی ہے کہ کسی کو خط لکھا، لیکن قیاس چاہتا ہے کہ خط لکھے ہوں اور وہ اُردو میں ہوں۔ غالب نے شعر بھی پہلے اُردو میں کہے ہیں، پھر فارسی میں۔

۲۔ اواسط ۱۸۵۰ء تک

اس دور میں غالب نے رفتہ رفتہ فارسی پر قدرت حاصل کی، اور کچھ مدت کی مشق کے بعد صاحب طرز انشاء پرداز قرار پائے یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس دور کے آخر میں غالب کی عمر ۵۰ سے اوپر تھی، اور ان کے قوائے جسمانی کا انحطاط شروع ہو چکا تھا زمانے کی روش کے مطابق غالب نے عموماً فارسی میں خط لکھے ہوں گے۔ لیکن کبھی کبھی اُردو میں لکھنے کی بھی ضرورت پیش آئی ہوگی۔ اس کی دو وجہیں ہیں:

(۱) غالب سے سروکار رکھنے والوں میں ایسے لوگ جو لکھنا پڑھنا جاننے کے باوجود فارسی سے بالکل ناواقف ہوں یا اس سے کافی واقفیت نہ رکھتے ہوں ضرور ہوں گے۔ اور وقتاً فوقتاً ایسے لوگوں سے مراسلت بھی ہوئی ہوگی، اُنھیں فارسی میں خط لکھنے کے معنی یہ ہوتے کہ خواہ مخواہ ترجمہ کرانے کی زحمت دی جائے۔ ناچار اردو ہی میں خط لکھنا پڑا ہوگا۔ اسی طرح کبھی کبھی ناخواندہ لوگوں کو بھی خط لکھنے کی ضرورت پڑی ہوگی، اور اُنھیں بھی فارسی کی جگہ اُردو میں خط لکھا ہوگا۔ غالب کی زوجہ امراؤ بیگم[۱]، گمانِ غالب ہے کہ ناخواندہ ہوں۔ بنارس و کلکتہ سے جو خط غالب نے اُنھیں بھیجے تھے اور جن کا ذکر پنچ آہنگ[۲] کے نام کے خطوط میں ہے، وہ کس زبان میں ہوں گے؟

---

[۱] ایسی شریف خواتین جو بالکل پڑھی لکھی نہیں یا صرف قرآن مجید پڑھ سکتی ہیں اب بھی موجود ہیں۔ اور غالب کے زمانے میں آج کل کی بہ نسبت بہت زیادہ ہونگی۔ غالب رامپور سے غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں۔ "یہ تم کیا لکھتے ہو کہ گھر میں خط جلد جلد لکھا کرو، تم کو جو خط لکھتا ہوں گویا تمہاری استانی جی کو لکھتا ہوں۔ کیا تم سے اتنا نہیں ہوتا کہ جاؤ اور پڑھ کر سناؤ" (خط نمبر ۱۶) خط پڑھکر سُنا دینے کی ہدایت خط نمبر ۱۱ و ۱۹ میں بھی ہے، ثاقب کے نام کے خط ۹ میں بھی یہی لکھا ہے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ غالب کا یہ عام انداز تھا۔ خط ۱۸ بنام غلام نجف خاں میں یہ عبارت ہے" لڑکے بہ خیر و عافیت ہیں۔ اپنی اُستانی سے کہہ دینا۔ میرزا شہاب الدین خاں کو دُعا۔ نواب ضیاء الدین خاں کو سلام۔ میرا رقعہ ان دونوں صاحبوں کو پڑھا دینا۔" اُمراؤ بیگم اگر خط پڑھ سکتیں تو ان کے بارے میں بھی یہ ہوتا کہ خط پڑھوا دینا۔ اُمراؤ بیگم کے خطوط بنام کلب علی خاں خود اُمراؤ بیگم کے لکھے ہوئے نہیں۔ (عرشی صاحب کا خط بنام راقم)

[۲] پنچ آہنگ ص ۴۷ ......

(۲) "پنج آہنگ" کے ڈیڑھ دو سو خطوں میں بہت کم خط ایسے ہیں جن میں غالب نے انشا پردازی کا کمال دکھانے کی کوشش نہ کی ہو۔ ایسے خط "محنت پژوہی اور جگر کاوی" کے بغیر نہیں لکھے جا سکتے۔ کم از کم غالب کے لئے یہ ممکن نہ تھا اور اس کا خود اُنھیں اعتراف ہے (خط بنام شاکر) ان کی زندگی میں ایسے لمحات جب وہ محنت سے گھبراتے ہوں ضرور ہوں گے ایسی صورت میں اگر مراسلت کی ضرورت پیش آئی ہو تو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ یا تو "سرسری" اور عامیانہ فارسی میں خط لکھیں، یا اُردو کو (اذیں۔ "پنج آہنگ" میں ایسے خط جن میں "شاعری کا عنصر" کم یا بالکل مفقود ہیں ضرور۔ لیکن ایسے خط نہیں جو "قلم سنبھال کر" نہ لکھے گئے ہوں۔ "سرسری" اور عامیانہ فارسی پر غالب کا اُردو کو ترجیح دینا بالکل قرین قیاس ہے اس لئے کہ معمولی فارسی لکھنا ان کے ادبی شکوہ کے منافی تھا، اور اُردو ایسی زبان ہی نہ تھی جس میں کسی کو یہ اُمید ہو کہ غالب یا کوئی اور شخص انشاء پردازی کا کمال دکھا سکے گا۔ غالب حسام الدین حیدر خاں نامی کو لکھتے ہیں:-

> "جواب این نامہ سرسری باید نہ پہلو ی ودری، واگر خواہم کہ روش بہ گردانم
> ہر آئینہ ناموس سخن وری مرا زیاں دارد۔۔۔۔ اُمید کہ طلازمان (؟) بندۂ خود را دریں
> کشاکش نہ پسندند" پنج آہنگ ص ۱۲۸ و ص ۱۵

اُردو خطوں اور اُردو زبان کے متعلق غالب کی رائے، "کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہو" (خطوط غالب ص ۳۰) میں اُردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں؟ اس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے؟

(خطوط ص ۳۹۱)

اس دور کے اواخر میں اختلاط قوی کی وجہ سے اُردو خطوں کی تعداد بڑھ گئی ہوگی اس زمانے کے کم از کم دو خط موجود بھی ہیں۔ پہلا خط اُردوئے معلی میں ہے مگر اس پر تاریخ ثبت نہیں۔ خطوط (ص ۲۱) میں مہیش پرشاد صاحب نے داخلی شہادت کی بناء پر اس کا زمانہ تحریر اگست ۱۸۴۹ء بتایا ہے۔ تبصرۂ خطوط غالب میں جو معاصر نے شائع کیا تھا، میں اس کے متعلق لکھا تھا "غالب نے دیوان تفتہ کا دیباچہ تحریر کیا تھا، تفتہ کو اپنی تعریف اُمید سے کم نظر آئی غالب

لہ عود ہندی الہ آباد

کہ شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن صاحب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس غالب کے چند غیر مطبوعہ فارسی خطوط ہیں جن کی عبارت بالکل معمولی ہے۔

سہ نامی غالب سے فارسی میں ایک خط کا جواب لکھوانا چاہتے تھے۔ غالب کی طبیعت شاعرانہ نثر لکھنے پر اس وقت مائل نہ تھی اُنھوں نے بہانہ کر دیا کہ خط اس کا مستحق نہیں کہ اس کا جواب "پہلوی و دری" میں دیا جائے نثر کے بدلے ۴ رباعیاں بھیجتا ہوں۔ اپنی طرز خاص میں نثر لکھنے سے رباعیاں لکھنے میں زیادہ سہولت نظر آئی ہوگی (عود ہندی صفحہ ۲۲۳)

سے شکایت کی تو غالب نے دیباچے کا ایک فقرہ بدل دیا۔ خط میں اسی کی اطلاع ہے۔ اس کا زمانہ مرتب نے اسعد الاخبار آگرہ کے ۲۰ راگست کے پرچے سے متعین کیا ہے۔" اس لئے کہ اس میں غالب کی تقریظ[1] کا ذکر ہے"، ذیل میں اسعد الاخبار کے دو اقتباس اور عرشی صاحب کے خط کا ایک ٹکڑا نقل کیا جاتا ہے۔ ان سے جو نتائج نکلتے ہیں ان سے مرتب کے بتائے ہوئے زمانے کی قطعی طور پر تغلیط ہوتی ہے:-

(۱) دیوان[2] تفتہ جو اس مطبع میں چھپا ہے ربع سے زیادہ چھپ چکا ہے وہ بھی اس موسم سرما میں انشاء اللہ تعالیٰ تمام ہوگا۔ اس کی ضخامت ۴۵ جزد کے قریب ہے اور قیمت چار روپئے بعد اختتام کے پانچ ہو جائیں گے۔ اکثر شائقانِ سخن نے اس کی درخواست مع زرِ ثمن داخلِ مطبع کی ہے۔ کیونکہ وہ دیوان عجب فصاحت خیز اور لطف انگیز ہے۔ اکثر اشخاص اس کے طبع ہونے کی خبر سنکر بہت خوش ہوئے ہیں۔ خصوصاً اسد اللہ خاں غالب دہلوی تو اس کے بہت ثناخواں ہیں۔ اسعد الاخبار ۲۰ راگست ۱۸۴۹ء مطابق ۲۹ رمضان ۱۲۶۵ھ

(۲) ان دنوں میں دیوانِ تفتہ سکندر آبادی اس مطبع میں چھپنا شروع ہوا ہے اور یہ وہی دیوان ہے جس کا اشتہار اخبار ہذا میں اواخر ۱۸۴۷ء میں دیا گیا تھا۔ بہ سبب عدیم الفرصتی کے اتبک ملتوی رہا۔ اب اس کی تدبیر کی گئی ہے۔ اسعد الاخبار ۱۰ ردسمبر ۱۸۴۸ء مطابق ۱۲ رمحرم ۱۲۶۵ھ۔

(۳) تفتہ کے دو دیوان[3] ہیں۔ ان میں سے پہلے کے شروع میں میرزا صاحب کی تقریظ ہے۔ اس کا چھاپا اواخر ۱۲۶۵ھ میں شروع ہوا اور اوائل ۱۲۶۶ھ میں انجام کو پہنچا۔ تقریظ میں تاریخ نہیں دی۔ جس صفحے پر یہ ختم ہوتی ہے اس کی باقیماندہ جگہ میں" حقیر کا قطعۂ آغاز طباعت ہے جس سے ۱۲۶۵ھ برآمد ہوتے ہیں"

ان اقتباسات سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:-

(۱) دیوان اور اس کی تقریظ غالباً اواخر ۱۸۴۷ء ہی میں صاحب مطبع کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو تقریظ ۱۸۴۷ء یا اس سے بھی قبل کی لکھی ہوئی ہے۔

(۲) دیوان تفتہ کا چھاپا اوائل ۱۲۶۵ھ (اواخر ۱۸۴۸ء) میں شروع ہو گیا تھا (جناب عرشی[4] نے اواخر سہواً لکھا ہے)

---

[1] خط میں دیباچے کا ذکر ہے اور پنج آہنگ میں بھی دیباچہ ہی لکھا ہے۔ دیوان میں یہ دیباچہ تقریظ کے نام سے چھپا ہے۔ اگر اس طرف اشارہ کر دیا جاتا تو بہتر تھا۔

[2] یہ اقتباس مرتب نے نقل نہیں کیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس میں تقریظ کا ذکر ہی نہیں۔ [3] دو نہیں، تین دیوان ہیں۔

[4] سہو دراصل کارپردازانِ مطبع کا ہے، رمضان ۱۲۶۵ھ تک ایک ربع چھپ چکا تھا۔ یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اس کا چھاپا اواخر ۱۲۶۵ھ میں شروع ہوا؟ تقطیع بڑی تھی، ۴ صفحوں سے زیادہ ایک پتھر میں نہیں آتے ہوں گے (باقی صفحہ ۳۸۰ پر)

(۳) ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء تک ۱۲ جز کے قریب چھپ چکا تھا۔

(۴) تقریظ آغاز دیوان میں ہے، اور اس کے آخری صفحے میں حقیر کا قطعۂ تاریخ' اس لئے دیوان کا یہ حصہ سب سے پہلے چھپا، اور اس کا زمانہ انطباع اواخر ۱۸۴۸ء ہے۔

یہ متحقق ہو جانے کے بعد کہ تقریظ کا زمانۂ انطباع اواخر ۱۸۴۸ء ہے یہ قطعی طور پر معلوم ہوگیا کہ اسے اواخر ۱۸۴۸ء سے پیشتر لکھا ہوگا۔ اس کے بعد یہ تسلیم کرنا ناممکن ہے کہ خط اگست ۱۸۴۹ء میں تحریر ہوا۔"

عرشی صاحب نے دیباچۂ مکاتیب غالب طبع ثانی میں (ص ۱۴۱ تا ص ۱۴۳) میرے بیان پر نا قدانہ نظر ڈالی ہے اور خط زیر بحث کے زمانۂ کتابت کے متعلق بالکل مختلف رائے ظاہر کی ہے۔ عرشی صاحب کی تنقید کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) تقریظ سرورق کے دوسرے رخ سے شروع ہوتی ہے اور سرورق پر مہتمم مطبع نے لکھا ہے:۔

این نسخہ ...... دیوان تفتہ در مطبع اسعد الاخبار ...... بہ اواخر ۱۲۶۵ھ شروع
گردیدہ باوصف انواع موانع وعوائق در اوائل ۱۲۶۶ھ بہ اختتام رسید،

(۲) ۲۰ اگست کے بعد اسعد الاخبار میں بظاہر تقریظ ہی کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ غالب کی پسند یدگی کا اظہار پہلی بار اواسط ۱۸۴۹ء میں ہوا۔ لازماً اس کا اظہار اسی زمانہ میں کیا گیا ہوگا۔ (یعنی یہ تقریظ اسی زمانے کی لکھی ہوئی ہے)

(۳) غالب نے ۱۰ فروری ۱۸۴۹ء اور ۲۰ اگست ۱۸۵۰ء مذکورہ کی درمیانی مدت میں یہ تقریظ لکھی اس لئے کہ ایک فارسی خط میں غالب نے تفتہ کو لکھا ہے:۔

از اں دو ہزار بیت کہ نوشتہ اند کہ در اکبر آباد گفتہ ام، ما ہم در اوراق اخبار اکبر آبادی
شاہدہ کردم ایم، خوش گفتہ اند و بہ راہے کہ ما مے خواستیم رفتہ اند،

۱۰ فروری تک غالب نے یہ دو ہزار اشعار نہیں دیکھے تھے، غالب اظہار رائے میں بڑے محتاط تھے تفتہ نے ان اشعار کی اصلاح کے بعد تقریظ کی درخواست کی ہوگی

(۴) تقریظ کی ترمیم اواخر ۱۸۵۰ء میں تقریظ کے چھاپے جانے سے کچھ قبل ہوئی۔ غالب اس زمانہ میں زیادہ تر اردو میں خط لکھنے لگے تھے۔ ترمیم کی اطلاع اردو خط کے ذریعہ دی۔

میری گذارش حسب ذیل ہے:۔

(۱) عرشی صاحب نے دیوان تفتہ کے متعلق جو خط مجھے لکھا تھا اس میں سرورق کا حال نہ تھا۔ ورنہ میں یہ دعویٰ نہ کرتا کہ تقریظ دیوان سے پہلے اواخر ۱۸۴۸ء میں چھپی تھی سرورق کی عبارت سے صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ...

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۹ سے آگے) ایک ربع ۱۱ جز ہی ہوں تو ۴۴ پتھر کی ضرورت ہوئی ہوگی۔

اواخر ۱۸۵۸ء میں طبع ہوئی۔ اور اس میں ترمیم اس سے قبل ہو چکی تھی۔ کس قدر قبل؟ اس پر یہ عبارت مطلق روشنی نہیں ڈالتی

(۲) دیوان تفتہ کا اشتہار اسعد الاخبار میں پہلی بار اواخر ۱۸۴۸ء میں چھپا تھا۔ میری نظر سے ۱۱ دسمبر ۱۸۴۸ء سے قبل کے پرچے نہیں گزرے، اس لئے مجھے علم نہیں کہ اشتہار اول میں غالب کے متعلق کچھ تھا یا نہیں۔ عرشی صاحب ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء کے پرچہ میں جو اشتہار ہے اس کی بناء پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس سے پہلے تقریظ کی طرف اشارہ ہوا ہی نہیں۔ مزید تحقیق سے یہ ثابت بھی ہو جائے جب بھی یہ لازم نہیں کہ تقریظ کے دیکھتے ہی صاحب مطبع نے اس کا ذکر کر دیا ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ صاحب مطبع کو تقریظ کا علم ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء کو یا اس سے پہلے ہو چکا تھا۔ یہ تقریظ اصلی تھی یا ترمیم شدہ، اشتہار اس کے بارے میں ساکت ہے۔ یہ بھی قطعی نہیں کہ تقریظ ہی کی طرف اشارہ ہے، مگر قیاس یہی چاہتا ہے۔

(۳) اواخر ۱۸۴۸ء میں دیوان کا اشتہار چھپا تھا مگر دیوان اس وقت کس شکل میں تھا اس کا مطلق علم نہیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ مکمل ہو۔ اور اس میں زیادہ[۱] رد و بدل کی گنجائش نہ ہو۔ اس صورت میں یہ دو ہزار اشعار دیوان دوم میں داخل ہوئے ہوں گے۔ اس کے خلاف بھی ہو تو تقریظ ایسی نہیں کہ اس کے لکھنے سے قبل کل کلام کا مطالعہ ضروری ہو۔ تفتہ غالب کے شاگرد تھے، اور غالب اس سے واقف تھے کہ شاعری میں تفتہ کا کیا پایہ ہے۔ تقریظ کے لئے یہ بالکل کافی تھا۔ ذیل میں تقریظ کی وہ عبارت جس کا تعلق کلام تفتہ سے ہے نقل کی جاتی ہے۔

"رہ رو را بہ رہ گزارے مرغزارے درنظر آوردہ ودر بیابانے بہ خیابانے در آوردہ اند کہ دراں تماشاگاہ بہ لب بہ نیم گام زند موج سبزہ را بیند۔ تا بہ کمر رسیدہ" د..... گوشۂ دستار را نگر واز گرانی بارِ گل خمیدہ ..... ہمانا رہ گذارے کہ بہ سبزہ زارے انگشت نما شدہ وپیابانے کہ بہ خیابانے روشناس آمدہ ہمیں غالیہ اندودہ سواد مردمک مراد وہمیں ریحان رقم صحیفۂ مشکیں سواد است کہ درنظر داشتہ ایم ونی (؟) بے نوا را بہ دیباچہ نگاری آں گماشتہ۔ یا رب ابن سخن پیوند نشش مند در فن فرزانگی یگانہ و در آئین یگانگی فرزانہ آسمانِ سخن را ماہِ دو ہفتہ، منشی ہرگوپال تفتہ کہ ایں فہرست گنج خانۂ راز راقم کردۂ اوست وایں مجموعۂ سوز وگداز فراہم آوردۂ او چہ مایہ دیدہ و .... دل باہم آمیختہ باشد تا ایں نقش بدیع انگیختہ باشد۔ سخن عشق وعشق سخن کلام حسن وحسن کلام را بہ یک دگر سرشتند تا چار آخشیج ہستی شیوا بیانی سرانجام یافت کہ از گرمی نفس وتشنگی جگر کہ در سخن بہ سخن

---

۱ متفرقات سے بحث نہیں۔

داشت بہ مناسبت برشتگی حسن گفتار تفتہ تام یافت۔ واد شناسان شناسند
و اندازہ داناں دانند کہ باآں کہ خامہ درکف سخن دراز فراوانی آزورزش
سخن لاأبالی پوئے و بے پرداخرام است، سخن بہ نغزی وخوبی وروانی درنفس
خویش تمام است...... لاجرم باچنیں دم گرم کہ ہیچ گہ دلش را از گفتار سرد
نہ دارد سیہ مست مے سخن تفتہؔ از خود رفتہ درسخن ہائے آمدہ ہم آمدہ نہ دارد۔
زیں پس..... گدار دل حق ستائش خوبی سخن بہ دیدہ دراں مے گزارم"
(پنج آہنگ ص ۳۹، ۴۰)

تعریف یا تو بہت عام لفظوں میں ہے یا ایسی ہے کہ تفتہ کا کلام اس کا بالکل مستحق نہیں۔ غالبؔ یہی الفاظ ہر اس شاعر کے لئے جسے وہ ناراض نہ کرنا چاہتے ہوں استعمال کرسکتے تھے۔ اظہار رائے میں بڑے محتاط ہونے سے اگر عرشی صاحب کا یہ مطلب ہے کہ غالبؔ جچی تلی اور بے لاگ رائے ظاہر کیا کرتے تھے، تو اس سے اختلاف کی بہت کچھ گنجائش ہے جہاں تک معاصرین کا تعلق ہے، اُن کی ناقدانہ رائیں زیادہ تر مصلحت وقت کی تابع نظر آتی ہیں۔ مثالیں بہت دی جاسکتی ہیں مگر طوالت کے خوف سے صرف چند پر اکتفا کیا جاتا ہے:۔

حیاؔ کے متعلق لکھا ہے:۔

"سخنش رائے زندگی سیمائے کلام الملوک ملوک الکلام است وگرمش را اندرخشندگی فروغ جوہر الہام" پنج آہنگ ص ۳۸

میر حسن خاں بسملؔ کو خاقانی پایہ، کہکر مخاطب کیا ہے۔ پنج آہنگ ص ۹۹

تلقؔ کی شاعری کے متعلق لکھا ہے:۔

"امیر خسرو وسعدی وجامی کی روش کو سر حدِ کمال کو پہنچایا ہے"
خطوط غالب ص ۱۵۲

شفقؔ، ہاشمیؔ اور عسکریؔ کی شاعری۔ "متاخرین یعنی صائب وکلیم وقدسی کے انداز کو آسمان پر لے گئے ہیں۔ خطوط غالب ص ۱۵۲

(۴) عرشیؔ صاحب کی رائے میں تقریظ کی ترمیم اواخر ۱۸۵۰ء میں تقریظ کے چھاپے جانے سے کچھ قبل ہوئی ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ تقریظ اگست ۱۸۴۹ء میں یا اس سے بھی کچھ پہلے تفتہ کے پاس پہنچ گئی۔ اور باوجود اس کے کہ وہ اس سے مطمئن نہ تھے، اُنھوں نے اسے بعض اصحاب کو دکھا بھی دیا، لیکن غالبؔ سے ترمیم کی درخواست برس ڈیڑھ برس کے بعد کی۔ عرشیؔ صاحب کے پاس اس کا ثبوت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ خط جس میں ترمیم کا ذکر ہے اردو میں ہے۔ یہ

رائے کہ غالب ۱۸۵۰ء سے قبل اُردو میں خط نہیں لکھتے تھے پہلے ہی قائم کر لی گئی تھی، خط زیر بحث کا زمانۂ تحریر ۱۸۵۰ء کو قبل قرار نہ دینا ناگزیر تھا۔ ترمیم جیسا کہ خود غالب نے لکھا ہے بہت کم تھی۔ غالب نے صرف ایک فقرہ بدل دیا تھا۔ میرے لئے یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ تقریظ کی ترمیم اس کی تصنیف کے برس ڈیڑھ برس بعد ہوئی۔ میری رائے میں تقریظ کی ترمیم اس کی تصنیف کے کچھ ہی بعد ہوئی ....

...... اور اس زمانہ میں خط بھی لکھا گیا۔ یہ زمانہ ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء سے قبل ہے لیکن یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ کس قدر قبل ہے[1]

دوسرا خط جواہر سنگھ جوہر خلف لالہ ہیرا سنگھ کے نام کا ہے۔ خطوط غالب میں جوہر کے نام سے جو تین خط ہیں ان میں یہ پہلا ہے۔ خط یہ ہے:۔

> خط تمہارا پہنچا ..... قطعے جو تم کو مطلوب تھے اس (کذا) کے حصول میں جو کوشش ہیرا سنگھ نے کی ہے میں تم سے نہیں کہہ سکتا ..... پانچ پانچ اور چار چار روپئے اور دو دو روپئے کو قطعے محل نے اور بنوائے ..... دوڑتا پھرا۔ کلیم صاحب کے پاس کئی بار جا کر حضور والا کا قطعہ لایا۔ اب دوڑ رہا ہے ولیعہد بہادر کے قطعے کے واسطے یقین ہے کہ دو چار دن میں وہ بھی ہاتھ آئے اور بعد اس قطعے کے آنے کے وہ سب کو یکجا کر کے تمہارے پاس بھیجدے گا۔ مدد میں بھی اس کی کر رہا ہوں لیکن اس نے بڑی مشقت کی ..... کیوں صاحب وہ ہماری لنگی اب تک کیوں نہیں آئی؟ بہت دن ہوئے جب تم نے لکھا تھا کہ اسی ہفتے میں بھیجوں گا ....

مہر صاحب نے غالب کے ایک فارسی خط کی مدد سے اس خط کا زمانۂ کتابت ۱۸۴۸ء کے لگ بھگ مقرر کیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

> "فارسی مکاتیب میں ایک خط ..... جوہر کے نام ہے جس میں ..... لنگی کی فرمائش

---

[1] تفتہ کے نام کے خط ۲ (خطوط ص ۲۔۳) کا زمانۂ تحریر مہیش پرشاد صاحب نے اگست ۱۸۵۸ء لکھا ہے۔ میں نے غالب کے ان الفاظ کی بنا پر کہ "جب تمہارا دیوان چھاپا جائے گا یہ قطعہ بھی چھپ جائے گا" یہ رائے ظاہر کی تھی کہ عجب نہیں یہ خط ۱۸۵۸ء سے پہلے کا ہو۔ عرشی صاحب لکھتے ہیں کہ وہ قطعہ جس کا ذکر اس خط میں ہے دیوان تفتہ میں موجود ہے، اور ۱۸۵۸ء کا لکھا ہوا ہے ظاہر ہے کہ مہیش پرشاد صاحب کے قول کی صحت میں جو شبہ میں نے ظاہر کیا تھا اس کے لئے کوئی سبب نہیں۔

کی ہے۔ اس خط کے آخر میں مطبوعہ پنج آہنگ میں یکم دسمبر ۱۸۴۹ء مطابق چہارم محرم ۱۲۵۱ھ ثبت ہے ہجری اور عیسوی تاریخ میں مطابقت نہیں ہوتی ..... کم از کم ایک تاریخ ضرور غلط ہے اگر تاریخ ہجری کو ۱۲۵۱ھ کے بجائے ۱۲۶۱ھ رکھا جائے تو عیسوی تاریخ ۱۸۴۵ء ہونی چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ یہی صحیح ہے۔ ان کے اردوئے مُعلیٰ کے ایک خط میں بھی ..... لُنگی کا تقاضہ موجود ہے .... یہ دونوں خطوط لازماً ایک دوسرے سے قریب کے زمانے میں لکھے گئے ہوں"

(غالب طبع اول ص ۳۰۸)

پنج آہنگ غدر سے قبل دو بار طبع ہوئی تھی، لیکن غدر کے بعد کلیات نثر میں شامل کر لی گئی۔ کلیات پہلی بار غالب کی زندگی ہی میں شائع ہوا تھا۔ اس کی پہلی اشاعت میں "آدینہ یکم دسمبر ۱۸۴۹ء چہارم محرم ۱۲۱۵ھ" مرقوم ہے۔ ۱۲۱۵ھ دراصل ۱۲۶۵ھ ہے، اور اس طرح عیسوی اور ہجری تاریخوں اور سنین میں مطابقت ہو جاتی ہے۔ مہر صاحب نے ۱۲۵۱ھ کلیات کی تیسری اشاعت میں دیکھا ہوگا۔ دونوں سنین کو بدلنے کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ ان کا یہ قول کہ فارسی اور اردو خط لازماً ایک دوسرے سے قریب زمانے میں لکھے گئے ہیں البتہ قابل قبول ہے۔

عرشی صاحب کی رائے میں خط زیرِ بحث کا زمانہ تحریر کیا ہے، اس کا ٹھیک پتا نہیں ملتا۔ ان کا بیان حسب ذیل ہے:۔

"پنج آہنگ اور اردوئے معلی میں چند خط جوہر کے نام پائے جاتے ہیں (اس کے بعد خطوں کی فہرست دی ہے) ..... ان میں سے پہلے اور تیسرے خط میں ساڑھے تین سال چوتھے اور پانچویں میں آٹھ مہینے اور پانچویں اور چھٹے میں دس سال یا زیادہ کا فرق ہے کم تر مدت تیسرے اور چوتھے مکتوب کے درمیان ہے جو تین ماہ ہوتی ہے۔ اب محولۂ بالا مکتوب کی اصل عبارت ملاحظہ ہو ..... کیوں صاحب وہ ہماری لنگی اب تک کیوں نہیں آئی؟ بہت دن ہوئے جب تم نے لکھا تھا کہ اس ہفتے بھیجوں گا۔ اس عبارت کا جملہ بہت دن ہوئے، غور طلب ہے چونکہ میرزا صاحب کے فارسی خطوط نمبری ۲ اور ۳ میں یہ شکایت کی گئی ہے کہ بہت دنوں سے تمہارا خط نہیں آیا

جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جوہر خطوں کے جواب میں بیحد سست تھے اور ان کے نام کے خطوط کے درمیانی وقفے ہمیں معلوم ہیں۔ لہٰذا کچھ بعید نہیں ہے کہ

انھوں نے لنگی بھیجنے میں ڈیڑھ دو برس گزار دئے ہوں۔ یہاں ایک اور امر قابل بیان ہے جہاں تک میں نے جستجو کی ہے بہ استثنائے نواب فردوس مکان ایسا کوئی مکتوب الیہ نہیں ہے جس کو میرزا صاحب فارسی میں خط لکھتے ہوں اور پھر فارسی مراسلت کے درمیان میں کوئی اور خط اسے لکھا ہو۔ جب وہ کسی سے اُردو میں مراسلت شروع کر دیتے ہیں تو اس کے بعد اس کو فارسی خط نہیں لکھتے۔ جوہر کے نام ۱۸۵۲ء میں ایک اور اس کے بعد ۱۸۵۳ء دو فارسی خط لکھے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بہ درمیان میں اُردو کا خط کیوں تحریر کیا گیا۔

اس خط میں میرزا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہیرا سنگھ نے بڑی کوشش سے بادشاہ کے ہاتھ کے قطعے مہیا کر لئے ہیں اب ولیعہد کے دستخطی قطعات کی فکر میں ہے میں بھی اس کی مدد کر رہا ہوں۔ میرے نزدیک ولیعہد سے مراد میرزا فتح الملک ہیں جو ۱۸۴۹ء میں دارابخت کے انتقال کے بعد ولیعہد اور ۱۸۵۴ء میں میرزا صاحب کے شاگرد ہوئے تھے اس لئے ان کے دستخطی قطعوں کی تحصیل میں میرزا صاحب نے مدد دی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر لنگی کے تقاضے والے اُردو خط کو فارسی کے خط مورخہ اگست ۱۸۵۲ء کے بعد کا مانتا ہوں اور ایک دو اور تقاضائی خطوں کو گمشدہ تصور کرتا ہوں''

(دیباچہ ص ۱۳۸ تا ص ۱۴۰)

میں عرض کر چکا ہوں کہ خط زیر بحث کے زمانۂ تحریر کے متعلق عرشی صاحب کی اصلی رائے کا پتا نہیں ملتا۔ اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو:-

عرشی صاحب فرماتے ہیں کہ جوہر نے لنگی بھیجنے میں ڈیڑھ دو برس گزار دئے ہوں گے۔ فارسی خط کی تاریخ تحریر یکم دسمبر ۱۸۵۱ء ہے عرشی صاحب کے بتائے ہوئے حساب سے اُردو خط کی آخری تاریخ تحریر ۱۲ مئی ۱۸۵۳ء ہوسکتی ہے، گو اس کا بھی امکان رہتا ہے کہ اس سے مہینوں قبل لکھا گیا ہو۔ ان کے اس قول سے کہ غالب اُردو خط لکھنے کے بعد فارسی خط نہیں لکھتے یہ نتیجہ نکلتا ہے اور خود انھوں نے نکالا بھی ہے کہ اُردو خط اگست ۱۸۵۳ء والے فارسی خط کے بعد کا ہے آخر میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ خط اس زمانہ کا ہے جب غالب میرزا فتح الملک کے نوکر ہو چکے تھے۔ یہ مسلّم ہے کہ ملازمت کا زمانہ ۱۸۵۴ء تا ۱۸۵۶ء ہے خط کے زمانۂ کتابت کے متعلق اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے ظاہر ہے، گو خود انھوں نے صراحۃً نہیں لکھا کہ اس حساب سے خط کا زمانۂ تحریر کیا ہے۔

خطوں کے درمیانی وقفے اور جوہر کی کاہل قلمی کی نسبت جو کچھ عرشی صاحب نے لکھا ہے اس کے متعلق میں یہ کہنا

چاہتا ہوں کہ خطوں کے درمیانی وقفے محض مطبوعہ خطوں کی مدد سے ثابت نہیں کئے جا سکتے۔ مطبوعہ مجموعوں میں جو خط ملتے ہیں وہ ان خطوط کے مقابلے میں جو شائع نہ ہو سکے بہت کم ہیں۔ جوہر کے والد غالب کے دوست، خود جوہر[1] ان کے "عزیز شاگرد" اور مخصوصین میں تھے (یادگار ص ۷۰، ۱۰۰، ص ۳۱۰) اور مدتوں دلی سے باہر بھی رہے۔ غالب نے انھیں بہت زیادہ خط لکھے ہوں گے ۱۸۵۸ء تا ۱۸۶۰ء کے کل خط ہیں کہاں کہ خطوں کے درمیانی وقفوں کا صحیح علم ہو سکے اور اس سے کوئی نتیجہ نکالا جا سکے؟ عرشی صاحب کا قول ہے کہ دو خطوں میں بہت دنوں سے خط نہ آنے کی شکایت ہے ذیل میں دونوں خطوں کی ضروری عبارتیں درج کی جاتی ہیں:-

(۱) دیر است کہ مارا یاد نہ کردہ اند و ما جگر تشنۂ خود را بہ زلال خیرے کہ از کتا رنامۂ موسومہ رائے چھجمل تراود تسکین مے دہیم (پنج آہنگ ص ۱۲۰)

(۲) نامۂ شما دیر است تا بہ من رسیدہ است، پاسخ جونہ بود، ورنہ دریں روز ہا نیز بنشستن نامہ دریغ نہ داشتے (ایضاً ص ۱۲۰ ص ۱۲۱)

پہلے خط میں جوہر کی شکایت ہے لیکن دوسرے میں معاملہ برعکس ہے۔ غالب نے خود جواب نہ دینے کی معذرت پیش کی ہے۔ صرف اس بنا پر کہ ایک خط میں غالب نے دیر سے یاد نہ کرنے کی شکایت کی ہے، عرشی صاحب یہ کہنے میں حق بجانب نہیں کہ "جوہر جواب میں بیحد سست تھے"۔ غالب نے اپنے لئے بھی وہی 'دیر' کا لفظ استعمال کیا ہے، کیا یہی حکم غالب پر بھی لگایا جا سکتا ہے؟ غالب اس کے زیادہ مستحق ہیں اس لئے کہ غالب جواب نہ دینے کے معترف ہیں اور جوہر کے بارے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ خط لکھنے میں سبقت نہ کی۔ مزید یہ کہ اگر ایک خط میں یاد نہ کرنے کی شکایت ہے تو ایک میں جوہر کے متواتر خطوں کا ذکر ہے:-

نامہ ہائے شما پیہم رسیدہ۔ پاسخ آن[2] نامہ ہا نیز پے بہم بہ پدر بند گوار شما سپردہ شد۔ ایں نامہ کہ امروز می نگارم و مے خواہم کہ بسبیل ڈاک رواں دارم بہ پاسخ دو صحیفۂ باز پسین است نگاشتہ، ۲۲ نومبر رقم زدہ و ۲۶ نومبر کہ ہر دو بہ ہنگام خویش بہ من رسیدہ نخستین چوں شوقیہ بود جواب نہ خواہد و دومیں را پاسخ ازیں است (پنج آہنگ ص ۱۲۱)

---

[1] جوہر اور رے کش کے حق میں غالب کی رباعی کلیات نظم میں ہے، یادگار میں بھی نقل ہوئی ہے:-

تا نے کش و جوہر دو سخنور داریم ۔۔۔ شان دگر و شوکت دیگر داریم
در میکدہ پیریم کہ مے کش از ماست ۔۔۔ در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

[2] یہ خط پنج آہنگ میں کہاں ہیں۔

بہت دن ہوئے، چند دنوں کے لئے بھی مستعمل ہو سکتا ہے، چند مہینوں کے لئے بھی۔ اور چند برسوں کے لئے بھی مجروح کے نام ایک خط ہے جس میں غالب نے اپنا اور میرن صاحب کا اصلی یا فرضی مکالمہ نقل کیا ہے، اس میں یہ الفاظ محض چند دنوں کے لئے آئے ہیں" اس کے (مجروح کے) خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے .... ہیں۔ وہ خفا ہوا ہوگا جواب لکھنا ضرور ہے" حضرت' وہ آپ کے فرزند ہیں خفا کیا ہوں گے؟ خطوط ص ۲۶۹
خط زیر بحث میں کس مدت کے واسطے استعمال ہوا ہے اس کے فیصلے میں وہ خط جس میں لنگی کی فرمائش کی تھی مدد دے سکتا ہے۔ ضروری عبارت یہ ہے:۔

کلہے از پوست برہ داشتم، حالیا آں را کرم خورد سرم بے کلاہ ماند۔ اگرچہ کلہ نہ مے
جویم اما لنگ ابریشمی چناں کہ در پشاور و ملتان سازند و اعیان آں قلم رو بہ سر
بپیچند .... و غالب کہ دراں دیار ایں چنیں متاع زود و آساں بہ دست آید
بہ جویند و بہم رسانند و سوئے من و رڈاک رواں دارند و قیمت آں برنگارند۔
تا بہانہ خواہند نوشت نخوا زست .... در فرستادن لنگ درنگ و نگاشتن
قیمت تکلف نہ کنند ....." (پنج آہنگ ص ۱۲۰)

غالب کو لنگی کی ضرورت فوری استعمال کے لئے ہے، اسی لئے وہ ایک جگہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ جلد مل جائے گی اور دوسری جگہ جلد بھیجنے کی تاکید کرتے ہیں۔ لنگی کوئی نایاب چیز نہیں۔ غالب قیمت ادا کرنے کو تیار بلکہ اس پر مصر، غالب اور جوہر کے تعلقات بزرگانہ اور خوردانہ۔ یقین ہے کہ غالب کا خط ملتے ہی جوہر نے لکھا ہوگا کہ اسی ہفتے بھیجوں گا۔ کسی سبب سے وعدہ ایفا نہ ہوا تو غالب نے یاددہانی کی۔ میرے لئے یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ فرمائش اور یاددہانی کے درمیان برس ڈیڑھ برس کا وقفہ ہے چند ہفتے بہت ہیں۔

عرشی صاحب کا یہ نظریہ کہ غالب کسی شخص سے اردو میں خط و کتابت شروع کرنے کے بعد اُسے فارسی خط نہیں لکھتے تھے، غالب کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے قابل قبول نہیں۔ اس قسم کے خود ساختہ قاعدوں کی سختی کے ساتھ پابندی ان سے بعید ہے۔ یوں ہی بے شمار فارسی خط غائب ہیں، غالب کے عمل کا پتا کیونکر چلے؟ اس کا اعتراف خود عرشی صاحب کو ہے کہ اس کلیے کا استثنا موجود ہے۔ جہاں ایک مستثنیٰ ہے وہاں ایک اور سہی! غالب جب یوسف علی خاں کو اردو میں خط لکھنے کے بعد فارسی خط لکھ سکتے تھے تو جوہر سے اس طرح مراسلت میں کونسا امر مانع ہو سکتا تھا؟

اب رہا معاملہ قطعوں کا۔ عرشی صاحب کے پاس کون سا ثبوت اس دعوے کا ہے کہ ولیعہد سے مرزا فتح الملک ہی مراد ہیں۔ دارابخت وارا بھی خطاطا تھے (خم خانۂ جاوید جلد ۳ ص۱۲۱) ممکن ہے کہ انھیں کے قطعے کی تلاش ہو، مرزا فتح الملک ہوں جب بھی، یہ کیونکر معلوم ہو سکتا ہے کہ قطعے کی تلاش غالب کی نوکری کے بعد کا واقعہ ہے۔ میرے نزدیک تو غالب

کی اعانت کو کسی خاص قطعے کی تلاش پر محدود کر دینا ہی صحیح نہیں۔ غالب نے اپنی مدد کا ذکر کیا ہے، اس کی تصریح نہیں کی کہ کسی خاص قطعے کے حصول میں مدد دے رہے ہیں۔

میری رائے میں جوہر کے نام کا اردو خط ان کے نام کے فارسی خط مورخہ یکم دسمبر ۱۸۴۸ء کے چند ہفتے بعد کا ہے، اس کا امکان ہے کہ چند مہینے بعد کا ہو، لیکن میرے لئے یہ باور کرنا کہ تنگی کی فرمائش یا جوہر کے وعدے اور غالب کی یاد دہانی میں پانچ چھ برس کا وقفہ ہے، مشکل نہیں ناممکن ہے۔

۳. تیسرا دور بادشاہ کی ملازمت

یعنی جولائی ۵۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ مہر نیمروز کی تصنیف کا آغاز اس کے بعد ہی ہوا گا۔ اس کی عبارت میں "قوت متخیلہ" کا عمل بہت زیادہ ہے۔ اور اس کی تصنیف میں مصروفیت ضرور ہے کہ اردو خطوں کی تعداد میں معتد بہ اضافے کا باعث ہوئی[1]۔ رفتہ رفتہ کس طرح فارسی کم اور اردو زیادہ ہوتی گئی اور آخر میں صرف اردو پر انحصار رہ گیا، اس کی تفصیلات کے لئے مکاتیب غالب طبع ثانی کا دیباچہ (ص ۱۴۳ تا ص ۱۴۵) ملاحظہ ہو۔ اس بحث پر اس سے بہتر بیان میری نظر سے نہیں گزرا۔ خلاصہ بحث یہ ہے:

(۱) قیاس چاہتا ہے کہ غالب نے فارسی سے پہلے اردو میں خط لکھے ہوں۔

(۲) غالب جس زمانے میں بالعموم فارسی میں مراسلت کرتے تھے، کبھی کبھی اردو میں بھی خط لکھا کرتے تھے۔

(۳) کم از کم دو خط ۱۸۵۰ء سے قبل کے موجود ہیں۔

---

[1] بشرط ضرورت معاصرین کی شہادت پیش کی جا سکتی ہے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

غالبیت

غالب کے کلام اور ان کے ناقدین کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ جس بات کو انھوں نے "انداز بیان" سے تعبیر کیا ہے وہ دراصل ان کی وہ جدت طرازی ہے جو زبان، تراکیب، خیالات، محاکات، الفاظ، تشبیہات، استعارات، کنایات غرضکہ تمام لوازم شعری میں پائی جاتی ہے۔ غالب کا مطمح نظر یہ تھا کہ پیش پا افتادہ، فرسودہ اور معمولی بلکہ سریع الفہم مضامین کو ایسے ڈھنگ سے بیان کیا جائے کہ پڑھنے والا آسانی مطلب تک نہ پہنچ سکے بلکہ خوب غور کرے تاکہ نفس مضمون اگرچہ وہ بذات خود معمولی ہی کیوں نہ ہو، اس کی نگاہوں میں وقیع ہو جائے اور یہ بات ہر شخص جانتا اور مانتا ہے کہ جو چیز بہت غور و خوض یا جستجو کے بعد حاصل ہوتی ہے وہ بہت قیمتی ہو جاتی ہے۔ جدت طرازی اسی بے پناہ جذبہ کا منطقی نتیجہ ہے جسے انھوں نے "انداز بیان" اور ادائے خاص سے تعبیر کیا ہے۔ اسی کو "غالبیت" کہتے ہیں۔

محمد حبیب اللہ رشدی ایم، اے

کلام غالب کے وہ الفاظ جو متروک ہیں

جناب حبیب اللہ رشدی نے یہ مقالہ ہماری گذارش پر اپنی شدید علالت کے زمانے میں تحریر فرمایا تھا افسوس ہے کہ مقالہ کے اختتام کے ایک روز بعد ہی مقالہ نگار کی کتاب حیات کا بھی اختتام ہوگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون، ۲۷ جنوری ۱۹۶۹ء

وہ جامعۂ عثمانیہ کے ایک پرانے گریجویٹ اور دکن کے سب سے پہلے روزنامہ نظام گزٹ کے بانی و مدیر تھے، ایک عرصہ تک نظام گزٹ کی ادارت کرنے کے بعد محکمۂ تعلیم سے متعلق ہوگئے اور آخر میں گلبرگہ کالج کے پرنسپل ہوگئے تھے، تقسیم کے بعد ریاست حیدرآباد کی طرف سے پبلسٹی آفیسر ہو کر کراچی تشریف لائے تھے اور یہیں لیاقت آباد کے قبرستان میں مدفون ہوئے،

مرحوم کا ایک اہم کارنامہ اردو کے نستعلیق ٹائپ کی ایجاد ہے جو افسوس ہے کہ کام میں نہ آسکا۔

مرحوم کے علمی کارناموں میں، دیوان ثاقب تنوی اور دیوان محسن، جگر مرادآبادی کی حیات اور شاعری پر ایک مبسوط اور عالمانہ کتاب ہے، آخر الذکر کتاب ابھی غیر مطبوعہ ہے اور اول الذکر دونوں کتابیں سندھی ادبی بورڈ کراچی کی طرف سے شائع ہوچکی ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف رسائل میں علمی ادبی اور تاریخی مقالات اور خاکے مرحوم کی یادگار ہیں۔

دہلی کے آخری بادشاہ سراج الدین ظفر کے زمانے میں دہلی میں مومن، ذوق، غالب اردو کے تین بڑے شاعر ہم عصر تھے۔ ذوق بادشاہ ظفر کے استاد تھے۔ پہلے مومن نے وفات پائی، پھر غدر سے کچھ پہلے ذوق نے وفات پائی۔ بادشاہ نے

غالب کو اپنا استاد بنایا لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر سے سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ بھی گل ہوگیا۔ بادشاہ ظفر کو انگریزوں نے رنگون میں جلاوطن کر دیا۔ غدر کے بعد غالب تقریبًا بارہ برس زندہ رہے۔ انہوں نے غدر کے پہلے کا مغلیہ زمانہ بھی دیکھا اور بعد کا بھی۔ مذکورہ بالا تین بڑے شاعروں میں صرف غالب ہی ایک ایسے شاعر تھے جنہیں غدر کے بعد انگریزوں کا زمانہ دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ اس وقت اردو زبان منجھتے منجھتے ایسی ہو چکی تھی جیسی کہ اب ہے۔

غالب اصل میں فارسی کے شاعر تھے انہوں نے فارسی میں شعر کہنے میں اپنا بہت سا وقت اور توانائی صرف کی۔ کبھی کبھی اردو بھی کہتے تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ غدر کے کچھ پہلے ہی سے وہ زیادہ تر اردو ہی کہنے لگے تھے۔ فارسی میں خط وکتابت بند کر کے اردو میں خط لکھنے لگے تھے۔ جس کے دو ضخیم مجموعے ہمارے ہاں ہیں۔

ابتدا میں غالب فارسی میں بیدل وغیرہ خیال بند شعرا کا تتبع کرتے تھے اردو میں بھی انہوں نے وہی رنگ اختیار کیا تھا۔ اس لئے ان کا کلام بہت مغلق ہوگیا تھا۔ بعد میں دوستوں کے اصرار پر انہوں نے اپنے کلام کا انتخاب کیا جس سے ایک چھوٹا سا دیوان مرتب ہوا اس منتخب کلام میں بھی انہوں نے چند مغلق اشعار نمونے کے طور پر رکھ چھوڑے ہیں۔ لیکن جو کلام سادہ الفاظ میں ہے اس نے ان کی شاعری کی دھاک بٹھا دی۔ خاکسار رشدی کا ذاتی خیال یہ ہے کہ ابتدا میں ان کا خیال بندی کے رنگ میں فارسی شعر کہنا کچھ نقصان کا باعث نہیں ہوا۔ ان کے فارسی دیوان میں اچھے اچھے اشعار موجود ہیں مگر اب فارسی کا رواج ہی اٹھ گیا ہے اس لئے غالب کا فارسی کلام بہت ہی کم پڑھا جاتا ہے۔ بہرحال فارسی کی اس مشق و مزاولت نے ان کے ذہن کو ایسی جلا دے دی جس کی وجہ سے ان کے اردو کلام میں اتنی بلندی پیدا ہو سکی۔ اگر غالب استاد ذوق کی طرح فارسی میں شعر کہنے کی تربیت حاصل نہ کر چکے ہوتے تو ان کا اردو کلام بھی ذوق کا سا یا دہلی اور لکھنؤ کے دوسرے بہت سے شعراء کے کلام کی طرح سیدھا سادا ہوتا۔ اس میں وہ معنوی عمق اور گہرائی نہ ہوتی جس کی وجہ سے وہ کلام ایک جاندار کلام بن گیا ہے۔ اس لحاظ سے غالب کی فارسی گوئی کی مشق اردو کے بڑے کام آئی۔

زندہ زبانیں ایک حالت پر قائم نہیں رہتیں۔ اردو زبان میں بھی تبدیلی کا عمل جاری ہے غدر کے بعد بارہ برس زندہ رہنے کی وجہ سے ہم غالب کو اپنے زمانے کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ یعنی انگریزوں کی حکومت کے قائم ہونے کے بعد سے ۱۹۴۷ء تک (جب کہ انگریزوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا) ہمارا پورا معاشرہ انگریزوں کی غلامی کے سایہ میں رہا۔ غالب کا آخری زمانہ اسی دور میں گزرا۔ اس بارہ سال کی مدت میں انہوں نے بڑھاپے اور امراض کے باوجود اردو ادب کو بہت کچھ دیا۔ ان کے اردو خطوں نے اردو نثر کو سادگی، واقعیت اور بے تکلفی کا راستہ دکھایا۔ نظم نے ایک بلند کلام کا معیار پیش کیا۔

غالب کو وفات پائے سو سال ہوتے ہیں زبانوں کی عمر میں سو سال کی مدت کچھ بڑی مدت نہیں ہوتی۔ اس قلیل مدت میں بھی اردو زبان میں اتنا تغیر ہوگیا ہے کہ غالب کے استعمال کئے ہوئے بہت سے الفاظ اور محاوروں کو موجودہ اردو نے ترک کر دیا۔ بعض الفاظ کے معنی بدل گئے، بعض الفاظ کا استعمال بدل گیا۔ ہم ذیل میں ایسے الفاظ اور محاوروں کو پیش کرتے ہیں جنہیں

غالب نے اپنے کلام میں استعمال کیا ہے۔ لیکن غالب کا کلام بکثرت پڑھا جانے کے باوجود موجودہ اردو ان الفاظ اور محاروں وغیرہ کو قبول نہیں کرتی۔

الف۔ الفاظ

لفظ کے معنی یا استعمال کا فرق — کوئی بمعنی کچھ عارف کے مرثیہ والی غزل کی ردیف کوئی دن اور ہے۔ اس میں ایک دو شعر کے سوا سارے اشعار میں لفظ کوئی بمعنی کچھ استعمال ہوا ہے۔ موجودہ اردو میں کوئی صرف بطور حرف تنکیر استعمال ہوتا ہے، کچھ کے معنی میں اس کا استعمال بالکل متروک ہوچکا ہے اس مرثیہ کا مطلع

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور　　تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

یعنی لازم تھا کہ تم کچھ دن اور میرا راستہ دیکھتے/ انتظار کرتے۔ اب چونکہ تنہا گئے ہو، اس لئے کچھ روز تنہا رہو۔ چند روز تنہا رہنے کے لئے اس لئے کہہ رہے ہیں کہ انہیں جلد مرنے کی توقع رکھتے تھے۔ ایک اور غزل کا شعر ہے۔

دیتا، نہ اگر دل تمہیں لیتا کوئی دم چین　　کرتا جو نہ مرتا، کوئی دن آہ و فغاں اور

مطلب یہ کہ اگر تمہیں دل نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا۔ اگر مر نہ جاتا تو چند روز اور آہ و فغاں کرتا۔

• — کیونکہ بمعنی کیونکر

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی　　گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

یعنی ریختہ کیونکر رشک فارسی ہوسکتا ہے۔

نہ جانے کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی　　تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

یعنی طعنِ بدعہدی کا داغ نہ جانے کیونکر مٹے

• — تا بمعنی تاکہ

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے　　بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ　　تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

یعنی تاکہ مجھ کو زندگی دشوار نہ ہو۔

• — سے بجائے پر

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے　　آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

یعنی اے ندیم رونے پر مجھے ملامت نہ کر۔

• — سو بجائے وہ

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو　　تو وا کرے اس عقدے کو سو بھی باشارت

یعنی جس عقدۂ دشوار کو کوئی حل نہیں کر سکتا اس کو تو حل کر دیتا ہے اور وہ بھی صرف اشارے سے ۔

● — تاکہ بجائے جب تک

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ   آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

یعنی جب تک دیدۂ نخچیر کا آئینہ نہ ہو اس وقت تک اپنے کو نہیں دیکھتا

● — میں بجائے کا

صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ   کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

یعنی اپنے قول کا صادق ہوں ۔

● — وہی بجائے وہیؔ ۔ ہم ہیؔ بجائے ہمیں

وہی صد رنگ نالہ فرسائی   وہی صد گونہ اشک باری ہے

حرف تیدہیؔ کے استعمال کی قدیم صورت یہی تھی ۔ مرزا سودا نے وہیں کے لئے وہیں باندھا ہے ، شعر سودا

یقین تو جان گیا ٹوٹ دل مرا وہ ہیںؔ   جو خار چبھ کے مرے پاؤں میں ذرا ٹوٹا

اس طرح غالب نے ہمیں کے بجائے ہم ہی نظم کیا ہے ۔

ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جوان میر بھی تھا   پیشہ میں عیب نہیں رکھیئے نہ فرہاد کو نام

اصولاً ہم اور وہ کے ساتھ ہی کا استعمال غلط نہیں ہے لیکن حرف ہ کی تکرار بولنے اور سننے ، دونوں صورتوں میں خوشگوار نہیں ، غالباً اسی بنا پر اس ترکیب میں تصرف کیا گیا اور اس کی جگہ ایک لفظ ہمیں (بہ یائے معروف) مروّج ہو گیا ۔ اس کے رواج دینے میں غالباً داغ کے کلام کو بڑا دخل ہے ۔ مثلاً داغ کا ایک شعر ہے ۔

اردو ہے نام جس کا ہمیں جانتے ہیں داغؔ   ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اسی طرح تم ہی کی جگہ تمہیں (بہ یائے معروف) ان ہی کی جگہ انہیں (بہ یائے معروف) رائج ہے ۔ غالب نے تم ہی کی جگہ تمہیں (بیائے معروف) استعمال کیا ہے ۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے   تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب   کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ہم ہی کی طرح یہاں تم ہی ہونا چاہیئے تھا مگر غالب نے تمہیں (بہ یائے معروف) استعمال کیا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ غالب کے زمانہ ہی میں یہ تصرف ہو چکا تھا ۔ ممکن ہے اسی نمونے پر ہم ہی کو ہمیں (بہ یائے معروف) ان ہی کو انہیں (بہ یائے معروف) بنا لیا گیا ہو ۔ واضح رہے کہ ان الفاظ میں یائے معروف ہے ۔ اگر یائے مجہول سے پڑھے جائیں تو ان کے معنی ۔ ہم کو ، ان کو ، ہوں گے ، غالب نے ہم کو کے معنی میں ہمیں (بہ یائے مجہول) بھی استعمال کیا ہے ۔ مثلاً ۔

ہم سے مت کہو، تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی　　　زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

یعنی ہم سے اب یہ مت کہو کہ زندگی سے بھی مرا جی اِن دنوں بیزار ہے کیونکہ تو تو ہم کو اپنی زندگی کہا کرتا تھا

ہمیں پھر ان سے امید، اور انہیں ہماری قدر　　　ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

ہمیں اور انہیں دونوں الفاظ میں یائے مجہول ہے جو ہم کو اور ان کو کے مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں، یعنی ہم کو امید کیونکر ہو، اور ان کو ہماری قدر کیونکر ہو جبکہ وہ تو ہماری بات ہی نہیں پوچھتے۔

تلسی داس کا ایک دوہا بہت مشہور ہے جس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ بات پوچھنا بہت قدیم محاورہ ہے۔ تلسی داس اکبر شاہ کے زمانہ کا ہندی کا شاعر ہے۔ دوہا ہے۔

مایا سے مایا ملے کر کر لمبے ہات　　　تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات

اس محاورے کا استعمال بھی کم ہوتا جا رہا ہے، حالانکہ اس کا مفہوم دوسرے الفاظ میں مشکل ہی سے ادا ہو سکتا ہے۔

۵ — کر۔ کی۔ کے کا حذف

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسد　　　پھر ہوا وقت کہ ہو بال کُشا موجِ شراب

یعنی جلوۂ گل دیکھ کر میرے ہوش اڑتے ہیں۔

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو　　　جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل

یعنی۔ غالب مجھے اس سے ہم آغوشی کی آرزو ہے۔

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو　　　روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

یعنی۔ جس کے پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو، مجبوراً وہ اگر روزہ نہ کھائے تو کیا کرے

تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس　　　رنگ کا زرد پر کہاں بو باس

یعنی۔ خسرو کے پاس ایک ترنجِ زر تھا۔

۶ — الفاظ کی قدیم شکلیں۔ مثلاً کسو بجائے کسی۔ وو بجائے وہ

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے　　　یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

ہمیں پھر ان سے امید، اور انہیں ہماری قدر　　　ہماری بات ہی پوچھیں نہ وو تو کیونکر ہو

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے　　　اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

اس شعر میں وہ کی جگہ وو استعمال ہونے کے علاوہ۔ کہو کوئی — کا انداز بیان بھی موجودہ اردو میں رائج نہیں۔ کوئی حرف تنکیر ہے اس کے ساتھ امر کا صیغہ استعمال نہیں کیا جاتا۔ مضارع کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ موجودہ زبان میں اس جگہ۔ کوئی کہو کے بجائے کوئی کہے۔ استعمال ہوتا ہے۔ ایک اور شعر ہے۔

نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا　　کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے

• — فارسی افعال کا ترجمہ — مثلاً دانستن کا امر بدان کا ترجمہ جان

شکیبِ لباس کعبہ علی کے قدم سے جان　　نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

اوپر مرزا سودا کا ایک شعر پیش کیا گیا ہے اس میں جان کا لفظ اسی طرح استعمال ہوا ہے۔

• — توگوئی کا ترجمہ توکہے تو کہوے

نقشِ پا کی صورتیں وہ دل فریب　　تو کہے بت خانۂ آذر کھلا

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے　　سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

• — علامت مصدر کا حذف

ہے کچھ ایسی ہی بات جوچپ ہوں　　ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

یعنی۔ کیا بات کرنی نہیں آتی یا کیا بات کرنا نہیں آتی۔

• — محاورے کے الفاظ کا فرق۔ مثلاً، کسی کو گردن مارنا

۱۔ قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے　　اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

۲ شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے　　ہو نگہ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے

پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی قاتل یا ڈاکو وغیرہ کو گردن مارنے کی سزا مغلیہ دورِ حکومت میں تھی جس کو قصاص کہتے تھے۔ انگریزی حکومت نے سزائے موت کے لئے پھانسی دینے کا طریقہ رائج کیا۔ سزا کا یہ طریقہ غدر کے کئی سال پہلے جبکہ شہر دہلی پر انگریزی حکومت قائم ہوئی، رائج ہو چکا تھا (بادشاہ ظفر کا اقتدار صرف قلعہ کی چار دیواری تک محدود رہ گیا تھا)۔ اس زمانے کا ایک مشہور واقعہ داغ دہلوی کے والد نواب شمس الدین خاں کو انگریز ریذیڈنٹ کے قتل کے الزام میں پھانسی دینا تھی۔ غدر کے بعد تو ہر صوبے میں قتل، ڈاکے وغیرہ کے مجرموں کو پھانسی دی جانے لگی۔ گردن مارنا بالکل بند ہو گیا۔ اس لئے اس محاورے کو استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ہے۔ البتہ بعض تاریخی واقعات یا قدیم افسانوں میں یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اس مرتبع پنجاب "کو" کے بجائے "کی" استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً — کوتوال شہر نے قاتل کو گردن ماردی۔ کے بجائے اب — کوتوال شہر نے قاتل کی گردن ماردی۔ لکھا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا اشعار میں پہلے شعر میں — قاصد کو گردن نہ ماریئے ہے۔

(شاید حضرت غالبؔ کے زمانے میں پری چہرہ معشوقاؤں میں یہ رواج عام تھا کہ اگر کوئی عاشق کسی قاصد کے ہاتھ اپنا پیغام محبت ان کے ہاں بھیجتا تو انہیں اتنا غصہ آتا کہ قاصد کو اپنے دربانوں سے پکڑوا کر اس کے ہاتھ پاؤں بندھوا دیتیں اور پھر تیغِ آبدار میان سے نکال کر ایک ہی ضرب میں اسکی

گردن کھٹ سے اڑا دیتیں۔ اس کی لاش سے جو خون بہتا اس کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے بغلیں بجاتیں! یا ممکن ہے حضرت غالب ہی کو خوش قسمتی سے ایسی خونخوار معشوقہ ملی ہو دوسرے اشعار سے بھی اس محبوبہ کی ہیبت کا ثبوت ملتا ہے!!

اس شعر میں حضرت غالب یہ واقعہ سنا رہے ہیں کہ انہوں نے اپنا پیام محبت ایک قاصد کے ذریعہ محبوبہ کے پاس بھجوایا تھا۔ محبوبہ نے قاصد کو گرفتار کر کے اس کے ہاتھ پاؤں بندھوا دئے اور اپنے ہاتھ سے اس کی گردن مارنے کے لئے تلوار لینے گھر میں گئیں۔ سروش غیبی نے فوراً اس کی اطلاع حضرت غالب کو پہنچائی کہ تمہارے قاصد کی گردن ماری جا رہی ہے۔ حضرت غالب دوڑے ہوئے محبوبہ کے گھر پہنچے۔ وہاں یہ منظر دیکھا کہ قاصد ہاتھ پاؤں بندھا پڑا ہے۔ محبوبہ نے میان سے تلوار نکال لی ہے اور ضرب لگانے ہی والی ہے۔ یہ دیکھ کر جناب غالب کو قاصد پر بڑا رشک آیا کہ ان کی محبوبہ کے ہاتھ سے گردن کٹوانے کی سعادت قاصد مفت میں حاصل کر رہا ہے۔ اس لئے انہوں نے محبوبہ سے یہ عرض کیا کہ۔ اس کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے کیونکہ خطا اس کی نہیں ہے بلکہ اس فدوی کی ہے۔ اس لئے قاصد کے بجائے اس فدوی کی گردن مار دیجئے تاکہ آپ کو میری سچی محبت کا قطعی ثبوت مل جائے۔!

دوسرے شعر میں — مجھے گردن مارے — کا مطلب — مجھ کو گردن مارے — ہے۔ یہاں بھی گردن مارنے کے ساتھ "کو" استعمال ہوا ہے۔

• — قسم کھانا

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالبؔ | تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

جناب طباطبائی اس شعر کی شرح میں لکھتے ہیں — "تعجب ہے کہ تو اور مے کشی کی قسم! کسی چیز کی قسم کھانا محاورہ ہے اور اس کے ترک کی قسم کھانا مراد ہے"۔

قسم جنازے پہ آنے کی کھاتے ہیں غالبؔ | ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

حضرت طباطبائی اس کی شرح میں لکھتے ہیں — "یا تو یہ محبت کہ (میری) جان کی قسم کھایا کرتے تھے یا یہ نفرت کہ (میرے) جنازے پر آنے سے انکار ہے"!!

۴ سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا | ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

کھلے گا کس طرح مضمون مرے مکتوب کا یارب | قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

مطلب یہ ہے کہ اس کافر نے کاغذ کے نہ جلانے کی قسم کھائی ہے۔ جناب طباطبائی اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔ یعنی "خط کھولنے کی تو اس سے امید ہی نہیں۔ اب جلانے کی بھی اس نے قسم کھائی ہے۔ کاغذ جلاتا اور مکتوب سے شعلہ اٹھتا تو مضمون مکتوب کھلتا اور حال سوز غم اس پر ظاہر ہو جاتا۔ یعنی مرے مکتوب

کے کھلنے کی وہاں کوئی صورت اگر تھی تو یہی تھی کہ وہ اسے جلا دیا کرتا تھا۔ اب وہ بھی امید نہ رہی "

غرض مذکورہ بالا مثالوں میں کسی چیز کی قسم کھانے کا مطلب اس چیز کو نہ کرنے کا عہد ہے۔ لیکن موجودہ اردو میں "قسم کھانے" کے ساتھ اثبات یا نفی کی صراحت کر دی جاتی ہے۔ مثلاً

— غالب تم نے شراب نہ پینے کی قسم کھائی ہے۔ یا۔ اے غالب وہ میرے جنازے پر نہ آنے کی قسم کھاتے ہیں جو پہلے مجھے اتنا عزیز رکھتے تھے کہ میری جان کی قسم کھاتے تھے۔

● — پرورش دینا۔

غالب نے فارسی کے متعدد افعال کا بھی ترجمہ کیا ہے مگر ان میں سے شاید ہی کوئی اردو میں رائج ہوا ہو۔

غم آغوش بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو چراغِ روشن اپنا قلزم صرصر کا مرجاں ہے

موجودہ اردو میں "پرورش دینا" کے بجائے "پرورش کرنا" رائج ہے۔ مثلاً چچا نے اس کی پرورش کی۔

غالب نے بہت سی فارسی ترکیبوں اور محاروں کا ترجمہ کیا ہے۔ اردو پر فارسی زبان کا شروع سے اثر رہا ہے غالب کے اور دوسرے شعرا کے ترجمہ کئے ہوئے بہت سے الفاظ اور محاورے اردو کا جزو بن گئے ہیں۔ یہاں تک کہ "شرم" سے "شرمانا" اور "گرم" سے "گرمانا" وغیرہ بہت سے مصادر بھی فارسی الفاظ سے بنائے گئے جو اب اردو میں بے تکلف استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات اس پر افسوس ہوتا ہے کہ اردو کے بعض جدید ادیب انگریزی محاوروں کا بھی اردو میں بلا وجہ ترجمہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً اردو میں ایک مصدر "توجہ کرنا" موجود ہے۔ لیکن موجودہ زمانے کے بعض ادیب "توجہ دینا" لکھنے اور بولنے لگے ہیں۔ یہ انگریزی کا ترجمہ ہے۔ انگریزی محاورہ ہے (to give attention to) ہے جس کا لفظی ترجمہ "توجہ دینا" ہے۔ البتہ "توجہ دینا" صوفیانہ حلقوں کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب کسی پیر کا اپنے مرید پر روحانی اثر ڈالنا ہے۔

اس سے بڑھ کر مضحکہ خیز ایک اور ترجمہ بعض ادیب استعمال کر رہے ہیں۔ انگریزی زبان میں "لکھنے والا"۔ "پڑھنے والا" کی سی کوئی ترکیب یا سانچہ موجود نہیں ہے اس لئے وہ ایک فعل کی مدد سے "والا" کا تصور پیدا کرتے ہیں مثلاً کوئی شخص جلسہ میں تقریر کر رہا ہو، وہ کہتا ہے "I am going to tell you a good news" اس کا ترجمہ ہوگا۔ میں آپ کو ایک اچھی خبر کہنے والا ہوں (یعنی سنانے والا ہوں) مذکورہ قسم کے جدید ادیب ایسے جملوں کا لفظی ترجمہ کر دیتے ہیں جو مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ وہ مذکورہ بالا انگریزی جملے کا مفہوم اس طرح ادا کریں گے۔ " میں آپ کو ایک اچھی خبر کہنے جا رہا ہوں "۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح لفظی ترجمہ کرنے کی ضرورت کیا تھی۔

● — (کسی) سے طرف ہونا

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

حضرت طباطبائی اس شعر کی شرح میں لکھتے ہیں ۔ " اے زاہد یہ رند جو میخانہ کے دروازہ پر بھیڑ لگائے ہوئے ہیں بہت گستاخ ہیں، زنہار ان کے منہ نہ لگنا۔ کہیں شراب کی حرمت ان کے سامنے بیان نہ کرنا۔

"کسی سے طرف ہونا" اب متروک ہے، میر کے زمانہ کا محاورہ ہے ۔"

• — نقش درست کرنا

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

• — بابِ نبرد ہونا

دھمکی میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

• — گفتار میں آنا

۱۔ جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
۲۔ اس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

• — مرغوب آنا

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

• — مانع آنا

بکوہشِ مانع بے ربطیٔ شورِ جنوں آئی ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

• — منفعل چاہنا

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ ہے ہے خدا نکردہ تجھے بے وفا کہوں

اس شعر کی شرح میں جناب طباطبائی لکھتے ہیں ۔ " یعنی میرا گمان تو تجھے بے وفا کہتا ہے اور میں باوفا کہتا ہوں۔ ایسا نہ کر کہ مجھے اپنے گماں سے منفعل ہونا پڑے۔ مطلب یہ کہ بے وفائی نہ کر کہ خدانخواستہ مجھے بھی بے وفا کہنا پڑے ۔"

• — ناز کھینچنا

وہ بھی دن ہو کہ اس ستم گر سے ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

• — منت کھینچنا

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سرتا پا نمک

• — تماشا کرنا

۱۔ ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز تو وہ نہیں کہ تجھ کو نظارہ کرے کوئی
۲۔ اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

• ـــ (کسی کا) تسلی ہونا

جگر تشنۂ آزار تسلی نہ ہوا — جوئے خوں ہم نے بہائی بن ہر خار کے پاس

حضرت طباطبائی اس کی شرح میں لکھتے ہیں ـــ "جگر تسلی نہ ہوا" خلاف محاورہ ہے"

• ـــ مصدر "مانگنا" کا مفہوم

۱۔ نقش نازِ بتِ طنّاز بآغوشِ رقیب — پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
۲۔ تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے — غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے
۳۔ وہ تپ عشق تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع — شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے
۴۔ مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

موجودہ زبان میں مصدر "مانگنا" کے معنی "طلب کرنا" ہیں جیسے بھیک مانگنا۔ دعا مانگنا وغیرہ۔ لیکن غالب نے مذکورہ بالا اشعار میں "چاہنے" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ غالب کے زمانے میں "مانگنا" صرف چاہنے کے معنی میں استعمال ہوتا تھا اس لئے کہ غالب نے "طلب کرنے" کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے مثلاً

۱۔ گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ — یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ
۲۔ آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

خبر نہیں فارسی مصدر "خواستن" کا ترجمہ "مانگنا" کس زمانے میں کیا گیا تھا۔ اور کس زمانے میں یہ لفظ انگریزوں تک پہنچا۔ انگریز سالہا سال تک ہندوستان میں رہتے تھے مگر صحیح اردو بولنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ اپنی ایک "کرنٹی اردو" الگ ایجاد کی تھی اور وہی بولتے تھے۔ اہل ملک کی طرح صحیح اردو بولنا اپنے لئے کسرِ شان سمجھتے تھے۔ کسی طرح "مانگنے" کا مصدر "کرنٹی اردو" میں داخل ہو گیا۔ تقسیم ہند سے پہلے تک جس انگریز سے ملو وہ یہ نہیں کہتا تھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں بلکہ یہ سوال کرتا تھا ـ "آپ کیا مانگتا" ـــ صاحب بہادروں سے یہ لفظ ان کے بیروں کی زبان پر چڑھ گیا۔ کسی انگریز یا دیسی عیسائی کے گھر جائیے تو اس کا بیرا پوچھتا ـــ آپ کیا مانگتا صاحب ـــ اور شہروں کے مقابلے میں بمبئی شہر بندرگاہ ہونے کی وجہ سے بڑا کاروباری مرکز بن گیا ہے۔ وہاں انگریزوں، پارسیوں اور دیسی عیسائیوں کی بڑی کثرت تھی۔ رفتہ رفتہ "مانگنے" کا لفظ وہاں کی اردو میں عام ہو گیا ہے۔

مصدر "چاہنا" کے معنی میں خواہش کا مفہوم بھی ہے لیکن "مانگنا" کے معنی محض طلب کرنا ہے۔ موجودہ اردو میں مانگنا صرف طلب کرنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے چاہنے کے مفہوم میں قطعی استعمال نہیں ہوتا۔

• ـــ اردو جملوں کے درمیان فارسی واوِ عطف

۱۔ دل مدعی و دیدہ بنا مدعیٰ علیہ — نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

۴۔ غفلت کفیلِ عمر و اسد ضامنِ نشاط اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

پہلے شعر کے مصرعۂ اوّل کی نثر یہ ہوگی ـــ دل مدعی بنا و دیدہ مدعی علیہ بنا ـــ یعنی دو اردو جملوں کے درمیان فارسی کا واو عطف استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ کی نثر یہ ہوئی ـــ غفلت کفیل عمر ہے و اسد ضامن نشاط ہے ـــ پہلے مصرعہ میں ہے دونوں جملوں میں محذوف ہے۔ ان دو جملوں کے درمیان میں فارسی کا واو عطف ہے۔ موجودہ اردو میں یہ غلط سمجھا جاتا ہے۔

۵ ـــ فارسی کا اندازِ بیان

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے داغِ دلِ بے درد نظر گاہِ حیا ہے

پہلے مصرعہ کی نثر ہوگی ـــ گلِ لالہ پر شبنم خالی ز ادا نہ ہے ـــ صاف ظاہر ہے کہ یہاں نہ کے بجائے نہیں کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اردو لفظ "سے" کے بجائے فارسی حرف "ز" بے جوڑ ہے۔ غالباً غالب کے ذہن میں فارسی کا یہ جملہ آیا ہوگا۔ شبنم بہ گلِ لالہ خالی ز ادا نیست ـــ "نیست" کے بجائے وزن کے مطابق "نہ" اور "ہے" رکھ دینے سے مصرعہ موزوں ہوگیا۔

غالب نے متعدد فارسی کے سالم مصادر استعمال کئے ہیں، مثلاً ـــ افشردن، باختن۔ فسردن۔ شکستن۔ شنیدن۔ بردن۔ چکیدن وغیرہ۔ موجودہ اردو فارسی کے سالم مصادر کو برداشت نہیں کرتی۔

"تکلف برطرف" کی فارسی ترکیب شاید غالب کی شعری زبان پر چڑھی ہوئی تھی۔ اردو میں یہ ترکیب کبھی رائج نہیں ہوئی

۱۔ "تکلف برطرف" نظارگی میں بھی سہی لیکن وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

۲۔ رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے تکلف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

۶ ـــ غالب کے زمانے میں اردو میں جو مدالتی اصطلاحیں مروّج تھیں ان میں سے کئی ایک اب متروک ہوچکی ہیں۔

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال ایک فریاد و آہ و زاری ہے

"سوال دینا" بمعنی نالش کرنا

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا آج پھر اس کی روبکاری ہے

"روبکاری" بہ معنی "پیشی"

ب ۔ اردو افعال کی متروک صورتیں

۱۔ امر :۔ مثلاً ۔ آیئو ۔ جایئو ۔ یعنی ۔ آ ۔ جا ۔ یا ۔ آؤ ۔ جاؤ ۔

راقم الحروف رشدی کا خیال ہے کہ امر کی سادہ صورتوں (آ ۔ جا ۔) میں شائستگی کا پہلو نہیں تھا اس لئے اس کی شائستہ صورت ۔ آیئو ۔ جایئو اختیار کی گئی ہوگی جو غالباً جمع کے لئے استعمال کی جاتی ہوگی۔ اس اصلی شکل آیئو ۔ جایئو سے ہمزہ اور یا کی آواز حذف کی گئی تو آؤ ۔ جاؤ ۔ بنا ۔ بعد میں اس میں اور تبدیلی ہوئی ۔ اور زیادہ شائستگی کا پہلو پیدا کیا گیا

تو آؤ - جاؤ بنا - بعد میں اس میں اور تبدیلی ہوئی۔ اور زیادہ شائستگی کا پہلو پیدا کیا گیا تو آئیو - جائیو سے وآؤ حذف کر دیا گیا۔ اب اس کی صورت آئیے - جائیے بن گئی۔ گویا آؤ اور آئیے دونوں کا ماخذ آئیو ہی ہے۔ اس طرح امر کی تین شکلیں (۱) آ - (۲) آؤ - (۳) آئیے - بن گئیں اس لئے آئیو کی ضرورت باقی نہیں رہی اور یہ شکل متروک ہوتی گئی۔

موجودہ اردو میں امر کی ان تین شکلوں کے علاوہ محض مصدر سے بھی امر کا کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً - ذرا اِدھر آنا یعنی۔ ذرا ادھر آؤ - یا - اپنے بھائی کو خط لکھ دینا کہ میں آ رہا ہوں - یعنی اپنے بھائی کو خط لکھ دو کہ میں آ رہا ہوں — آ - یا آؤ میں جو کسی قدر تحکم کا پہلو ہے وہ آنا میں نہیں ہے۔ اس لئے اپنے سے چھوٹے یا برابر والے کو اِدھر آ — یا اِدھر آؤ کے بجائے ادھر آنا کہنا، اس تحکم کے پہلو سے بچا دیتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے بول چال میں یہ شکل بہت استعمال کی جاتی ہے۔

غالب کے زمانے تک آئیو - جائیو کا استعمال باقی تھا۔ غالب نے کئی مصادر کے امر کو اس شکل میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً (مکررات کو چھوڑ کر)

۱۔ رکھیو = رکھ	۴۔ رہیو = رہ	۷۔ کھائیو = کھا۔ کھاؤ
۲۔ ہوجیو (ہوجو) = ہو	۵۔ کہیو = کہہ، کہو	۸۔ لکھ دیکھیو = لکھ دے۔ لکھ دو
۳۔ رکھ لیجو = رکھ لے	۶۔ سمجھیو = سمجھ۔ سمجھو	۹۔ آئیو = آ۔ آؤ

۱　بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا　　رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

۲　مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک "ہوجیو"　　نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک
　　بے خودی بستر تمہید فراغت "ہو جو"　　پُر ہے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

"ہو جو" کے متعلق حضرت طباطبائی اس شعر کی شرح میں لکھتے ہیں۔

"ہوجیو" خود ہی واہیات لفظ ہے مصنف مرحوم نے اس پر اور طرّہ کیا کہ تخفیف کر کے "ہو جو" بنایا"۔

۳　وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا　　"رکھ لیجو" میرے دعوئے وارستگی کی شرم

۴　رنجِ نومیدیٔ جاوید گوارا "رہیو"　　خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

۵　تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم　　میرا سلام "کہیو" اگر نامہ بر ملے

۶　رفوئے زخم سے مطلب ہے لذتِ زخمِ سوزن کی　　"سمجھیو" مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

۷　ہاں "کھائیو" مت فریبِ ہستی　　ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔

۸　جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی　　"لکھ دیجیو" یارب اسے قسمت میں عدو کی

۹　یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے　　تمہارے "آئیو" اے طرّہ ہائے خم بہ خم آگے

اس شعر کی شرح میں حضرت طباطبائی کہتے ہیں۔

"تمہارے آگے آئیو اور تمہیں آگ لگو۔ اور تمہیں مبارک ہو جیو وغیرہ غائب کے لئے دلی و لکھنؤ دونوں جگہ سے متروک ہے۔ لیکن خطاب میں البتہ اس کا استعمال باقی ہے ......"

شئے یا شخص غائب کے لئے، دعا یا بددعا کے الفاظ میں حاضر کی طرح خطاب کرنے میں آئیو۔ جائیو۔ کا استعمال غالباً اس لئے متروک ہو گیا کہ یہ موقع امر کا نہیں، مضارع کے استعمال کا ہے۔ گو یا اس سے معناً صرف و نحو (گرامر) کی خلاف ورزی ہوتی ہے

حضرت طباطبائی کی مذکورہ بالا مثالوں کو موجودہ اردو میں اس طرح ادا کریں گے۔

(۱) تمہارے آگے آئیو = تمہارے آگے آئے۔ (۲) تمہیں آگ لگو = تمہیں آگ لگے (۳) تمہیں مبارک ہو جیو = تمہیں مبارک ہو۔ غالب کے اس شعر کی نثر یہ ہوگی۔

ــــ ہم نے عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں، اے طرۂ خم بہ خم وہ سب تمہارے آگے آئیں۔ یعنی تمہیں لاحق ہو جائیں۔

شعرا کے نزدیک محبوب کی زلفوں کا پریشان ہونا ایک وجہ خوبی ہے۔ غالب نے اس وجہ خوبی کو بددعا کی شکل میں پیش کر کے ایک نیا اسلوب بیان کیا ہے

۲۔ مضارع مطلق :۔ مثلاً آوے۔ جاوے۔ بجائے۔ آئے۔ جائے

غالب نے حسب ذیل مصادر کو اس شکل میں استعمال کیا ہے (مکررات کو چھوڑ دیا گیا ہے)

۱۔ ہووے = ہو	۳۔ آجاوے = آجائے	۵۔ کہوے = کہے
۲۔ لیوے = لے	۴۔ لاوے = لائے	۶۔ آوے = آئے (ردیف غزل)

۱۔ شادی سے گذر کہ غم نہ ہووے — اردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

۲۔ نہ لیوے گر خس جوہر طراوت سبزۂ خط سے — لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

۳۔ اگر وہ سرو قد گرم خرام ناز آجاوے — کف ہر خاک گلشن شکل قمری نالہ فرسا ہو

۴۔ کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو — نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو

۵۔ چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے — سرمہ تو کہوے کہ دود شعلۂ آواز ہے

۶۔ جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے — جاں کالبد صورت دیوار میں آوے

(اس غزل کی ردیف ہی "آوے" ہے)

۳۔ مضارع مطلق صیغہ جمع غائب :۔ مثلاً آویں۔ جاویں۔ بجائے۔ آئیں۔ جائیں

غالب نے صرف ایک مصدر "کہنا" کی یہ شکل "کہویں" استعمال کی ہے۔

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید — مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

۴۔ **مضارع بہ معنی حال**۔ مثلاً آئے ہے۔ جائے ہے بمعنی آتا ہے۔ جاتا ہے۔ غالب نے فعل کی اس قدیم صورت کو بہت استعمال کیا ہے۔ انہوں نے (مکررات کو چھوڑ کر) حسب ذیل مصادر کا استعمال کیا ہے۔

۱۔ بخشے ہے = بخشتا ہے
۲۔ دوڑے ہے = دوڑتا ہے
۳۔ آئے ہے = آتا ہے
۴۔ لرزے ہے = لرزتا ہے
۵۔ دیکھے ہے = دیکھتا ہے
۶۔ دوڑائے ہے = دوڑاتا ہے
۷۔ نکلے ہے = نکلتا ہے
۸ دیکھا جائے ہے = دیکھا جاتا ہے
آجائے ہے = آجاتا ہے (اس غزل کی ردیف ہی جائے ہے
۹ پگھلا جائے ہے = پگھلا جاتا ہے
۱۰۔ شرما جائے ہے = شرما جاتا ہے
۱۱۔ گھبرا جائے ہے = گھبرا جاتا ہے
۱۲۔ پا جائے ہے = پا جاتا ہے
۱۳۔ بٹھا جائے ہے = بٹھا جاتا ہے
۱۴۔ کھلتا جائے ہے = کھلتا جاتا ہے
اڑتا جائے ہے = اڑتا جاتا ہے
۱۵۔ کھنچتا جائے ہے = کھنچتا جاتا ہے
۱۶۔ ٹھہرا جائے ہے = ٹھہرا جاتا ہے
۱۷۔ پوچھا جائے ہے = پوچھا جاتا ہے
بولا جائے ہے = بولا جاتا ہے (اس غزل کی ردیف جائے ہے بھی ہے)
۱۸۔ چھوٹا جائے ہے = چھوٹا جاتا ہے
۱۹۔ سونپا جائے ہے = سونپا جاتا ہے
۲۰۔ پھرے ہے = پھرتا ہے
۲۱۔ کرے ہے = کرتا ہے
۲۲۔ پوچھے ہے = پوچھتا ہے
۲۳۔ گزرے ہے = گزرتا ہے
۲۴۔ روکے ہے = روکتا ہے
کھینچے ہے = کھینچتا ہے
۲۵۔ مانگے ہے = مانگتا ہے
۲۶۔ چاہے ہے = چاہتا ہے

۱ بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب — چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا
۲۔ بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر — شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب
۳ آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالب — کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد
۴۔ ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق — لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر
۵۔ داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ — یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک
۶۔ شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں — جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں
۷۔ پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے — اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں
۸۔ دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے — میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
۹۔ ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے — آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے
۱۰۔ غیر کو یا رب وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے — گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے
۱۱۔ شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے — دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے
۱۲۔ گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق — پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اس [illegible] اتنا [illegible] | [illegible] جاتا ہے
ہوئے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گئے | رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے
نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہے | کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے
سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسد | پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے
[illegible] مژگاں [illegible] | [illegible] دیکھا جائے ہے [illegible] جائے ہے مجھ سے
[illegible] کیا قیامت ہے | گرد باد خیالِ یار [illegible] جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب | وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے
بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا | وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے
۱۰ کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ | خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے
سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر | وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا | کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر | کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس | زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو | سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

۵۔ **مضارع بمعنی حال۔ صیغہ واحد متکلم** :- مثلاً آؤں ہوں۔ جاؤں ہوں بجائے آتا ہوں۔ جاتا ہوں
غالب نے کروں ہوں اور رکھوں ہوں استعمال کیا ہے

۱ مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال | تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے
۲ رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے | مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

۶۔ **صورت ماضی بمعنی مصدر** :- مثلاً آیا چاہیے۔ جایا چاہیے بمعنی آنا چاہیے۔ جانا چاہیے
غالب نے اس کو حسبِ ذیل مصادر میں استعمال کیا ہے۔

۱ بنایا چاہیے = بنانا چاہیے
۲ کھینچا چاہیے = کھینچنا چاہیے
۳ سمجھا چاہیے = سمجھنا چاہیے
۴۔ چھوڑا چاہیے = چھوڑنا چاہیے
۵۔ دیکھا چاہیے = دیکھنا چاہیے (غالب نے اس صورت کو بہت استعمال کیا ہے۔ بعض مقامات میں قابلِ دید ہے کہ مفہوم میں ہے)

۱ بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے | کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
۲ صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر | جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے

۳ چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل — بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہئے
۴ دشمنی نے میری کھو یا غیر کو — کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہئے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — نا امیدی اس کی دیکھا چاہئے
چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد — آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہئے — سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
برشگال گریۂ عاشق ہے دیکھا چاہئے — کھل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن

سیٹھ ایس۔ ایم۔ یوسف

رہنے دو ابھی ساغر و مینا....

ہے ساقی جان ہاتھوں میں نہ دم آنکھوں میں ہے باقی — پلا دے اپنے ہاتھوں سے جو ہو تھوڑی سی شے ساقی
صنم خانوں میں میرا کفر اب تو معتبر ٹھہرے — جسے ایمان کہتے ہیں نہیں دل میں وہ شے باقی
مری تشنہ لبی کو ہے گلہ تیرے تغافل کا — مرے ساقی نہیں ہے کیا ترے مینا میں مے باقی
نقاب الٹا مگر بیگانہ وش آنکھوں کو کیا کہئے — جو پہلے تھی وہی وجہ شکایت اب بھی ہے باقی
بقدر ظرف بادہ خوار ہے ساقی اگر ہمت — تو بسم اللہ پلا دے جتنی ہو شیشے میں مے باقی
بہ لے شعلہ زبانے لسحن پر سوز ہے، دم گرنے — نوا گر تھا دزی، اللہ رکھے تیری نے باقی

حوادث نے کیا بے ذوق یوسفؔ اس قدر ہم کو
کہ سازِ زندگی میں اب نہیں کوئی بھی لے باقی

مولانا ماہر القادری
مُدیر فاران

کلامِ غالب اور لفظی و معنوی صنائع

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے یہ الفاظ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، وید مقدس اور دیوانِ غالب۔"
آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں، اتنا حسین خراجِ تحسین کسی شاعر کو شاذ و نادر ہی میسّر آیا ہوگا، اس جملہ کے قبولِ عام کا یہ عالم ہے کہ اسے اردو شعر و ادب میں "ضرب المثل" کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ دیوان غالب کمیّت کے اعتبار سے کتنا مختصر مگر کیفیت کے لحاظ سے کس قدر وزنی ہے اور اشیا کی قدر و قیمت میں اصل اعتبار کیفیت ہی کا ہے۔
غالب کے مجموعہ کلام کی اشاعت پر ایک سو سال سے زاید مدت گزر چکی ہے اس وقت سے اب تک اردو کا کوئی ایسا شاعر نہیں ہے جس نے کسی نہ کسی عنوان سے غالب کے کلام کا اثر نہ قبول کیا ہو۔ یہاں تک کہ علامہ اقبال بھی غالب سے متاثر ہیں۔
اقبال کی غزل کا مطلع۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں — کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

مرزا غالب کے دیوان کے پہلے شعر

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کے اسلوبِ اظہار اور آہنگ سے کس قدر مشابہ ہے۔
غالب نے اردو زبان کو۔ لالہ رنگ، دامانِ خیالِ یار، ہجومِ پیام، حلقۂ دامِ خیال، شوقِ منفعل، دودِ شعلہ آواز، برگِ عافیت، عرضِ گرانجانی، رہزنِ تمکین و ہوش، من جملہ اسبابِ ویرانی، رنجِ گراں نشیں، صبر گریز پا، فشارِ تنگیٔ خلوت، قفسِ رنگ جیسی نادر و بدیع ترکیبیں دیں۔ غالب کی شاعری نے فکر و خیال کو اس طرف متوجہ کیا کہ اردو زبان بلند سے بلند خیال لطیف سے لطیف اور نازک سے نازک فکر کی ترجمانی کی صلاحیت رکھتی ہے[۱]۔ اس لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اگر اردو شاعری میں

[۱] مرزا غالب کا دیوان پڑھتے ہوئے، دو شعروں نے چونکا دیا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

غالب پیدا نہ ہوتا تو اقبال کا ظہور بھی ممکن نہ تھا

غالب نہ پیغمبر تھا اور نہ فرشتہ وہ ایک شاعر تھا اور شاعر انسان کے کلام میں جو اشعار ہیں ان سے کہ تا خرات بجائی اور یکسانیت [illegible] بلند سے بلند شاعروں میں کہیں فکر و اظہار کے اعتبار سے پستی بھی ہو جاتی ہے۔ غالب کے اردو دیوان میں بھی بعض ایسے اشعار ملتے ہیں جن کے [illegible] میں دل نہیں مانتا کہ ایسے معمولی شعر غالب نے کہے ہوں گے اور نہ کہے تھے تو انہیں اپنے دیوان میں کس طرح رہنے دیا۔ مثلاً

ع ہوں پاس اگر تو آنکھ اٹھا کے [illegible] چاہیے

افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے — جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

ع چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک — کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

دلِ آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے — سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم — لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی — سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا — کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر — مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد — مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

دیدۂ خوں بار ہے مدت سے ولے آج ندیم
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون میں شامل آئے

[illegible] یہ کہنا کہ ان بہاروں اس طرح لیے ہیں

" [illegible] شامل آیا "

لیکن یہ [illegible] غالب کا یہ شعر پڑھ کر پتہ چلا کہ [illegible] میں بھی شامل [illegible] اس معنی میں بولا جاتا تھا مگر [illegible]

اسی طرح [illegible] دیل گاڑی کے [illegible]

" [illegible] "

مرزا غالب نے [illegible] استعمال کیا ہے۔

[illegible] کھیلنے کا بھی [illegible] — تھا بار گاہِ خاص میں خلقت کا ازدحام — (قصیدہ)

[illegible] غالب کے بعد اہلِ دلی [illegible] روزمرہ ہے۔

دلی [illegible] [illegible] ہوتے ہیں [illegible] سب [illegible] بولے جاتے ہیں [illegible]

[illegible] کی مسلمہ [illegible]

[illegible]

مرزا غالب کے یہاں دو چار شعروں میں "ذم" بھی پایا جاتا ہے مثلاً

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

مرزا غالب جیسے بدیع الفکر عظیم شاعر سے ان اشعار کی نسبت کتنی عجیب لگتی ہے۔ مرزا غالب کے یہاں ژولیدگی، ابہام بلکہ بعض شعروں میں اہمال تک پایا جاتا ہے لہٰذا "خذ ما صفا دع ما کدر" کے نظریہ کے تحت اشعار غالب کا یہ دھندلا رخ نظرانداز کر دینے کے قابل ہے اتباع و تقلید، اخذ و استفادہ اور اثر قبول کرنے کے قابل غالب کے اس قسم کے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

نفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسم پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

اشعار ہیں "جو اردو غزل کی آبرو ہیں" یہ بات میں نے خاص طور سے اس لئے کہی ہے کہ ہماری نئی نسل "محاسن" کے مقابلے میں "معائب" کا زیادہ اثر قبول کرتی ہے اور بد ذوقی اور بے راہ روی مزاج بنتی جا رہی ہے

صنائع اردو شاعری میں لفظی و معنوی صنائع و بدائع کا رواج رہا ہے مگر بعض صنعتیں ایسی ہیں جو ارباب ذوق نے خود بخود ترک کر دیں اور آج ان کا چلن نہیں ہے مثلاً ایک صنعت ہے "واسع الشفتین" یعنی جس کو پڑھتے ہوئے ہونٹ ایک دوسرے سے نہ ملیں۔

لالہ و گل ہیں یا نگینے ہیں
رنگ و نکہت کے یہ خزینے ہیں

اس کے مقابل دوسری صنعت "واصل الشفتین" ہے ایسا کلام موزوں جس کے پڑھنے سے ہونٹ ملتے رہیں۔

من جملۂ ارباب کرم صاحب مقدور
مہر و مہ پر روز بھی قدم چوم کے مسرور

صنعت خیفا:۔ شعر میں ایک لفظ نقطہ سے خالی ہو اور ایک نقطہ دار ہو۔

مالِ دنیا اور عقبیٰ کا خیال
آہ ایسے درد و غم کا یہ مآل

صنعت تحت النقاط:۔ شعر میں ایسا کوئی لفظ نہ آئے، جس لفظ کے اوپر نقطہ ہو۔

ہوا کے گھوڑے پہ بادل سوار آیا ہے
عجیب طرح کا یہ راہوار آیا ہے

اس قسم کی صنعتوں میں آورد سے کام لینا پڑتا ہے، اور سوچ سوچ کر کھینچ تان کے مصرعے جوڑے جاتے ہیں اور شاعر کو دماغی ورزش کرنی پڑتی ہے۔

لفظ و معنی کی وہ صنعتیں جو آج بھی حسین سمجھی جاتی ہیں ان کو کوئی شاعر اگر التزام کے ساتھ اپنے شعروں میں لائے تو کلام میں روانی اور بے ساختگی باقی نہیں رہے گی۔ جس کلام میں تکلف اور بناوٹ پائی جائے، وہ کلام شاعری کے ساتھ ایک طرح کا مذاق ہے۔ شاعری تو بے ساختگی، روانی اور سادگی و پرکاری کا نام ہے۔ ہاں! شعر میں کسی تکلف، کوشش، غور و فکر اور زحمت کے بغیر کوئی صنعت آ جائے تو اس کے کلام میں لطف پیدا ہو جاتا ہے۔

مرزا غالب کے کلام میں لفظی و معنوی صنائع ملتے ہیں، یہ صنعتیں ان کے یہاں بغیر کسی کوشش کے خود بخود آ گئی ہیں، کسی کسی شعر میں تھوڑا بہت تکلف پایا جاتا ہے مگر زیادہ تر اشعار میں یہ صنعتیں آب گہر کی طرح جھلکتی ہیں

تنسیق الصفات :- کسی شخص کی متواتر صفات بیان کرنا۔

سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری — حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات — عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا
ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم — آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے

مراعات النظیر :- ایسے لفظوں کے جمع کرنے کو کہتے ہیں جو آپس میں مناسبت رکھتے ہوں مگر ان میں تضاد اور تقابل نہ پایا جائے۔ اس صنعت کے عربی میں دو نام اور بھی ہیں۔ توفیق ایتلاف اور تلفیق تناسب۔

نشتر، پنبۂ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا — آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا
جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو — نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغ بدگمانیِ شمع
خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز — شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ردالعجز علی الصدر :- اس صنعت کی کئی صورتیں ہیں، پہلی صورت یہ ہے کہ مصرعہ اولی کا پہلا لفظ مصرعہ ثانی کے آخر میں بھی نظم کیا جاتا ہے۔ مرزا غالب فرماتے ہیں۔

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے — پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

ایراد المثل :- کسی مشہور "مثل" کو شعر میں لانا۔

دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال — ہو گیا گوشت کا ناخن سے جدا ہو جانا
اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا — صبح جو جائے اور آئے شام

صنعت التزام:- اس صنعت کے نام لزوم مالایلزم، تضمین، تشدید اور عنایت بھی ہیں، شاعر اپنے شعر میں کسی ایسی بات کو لاتا ہے جو واقعہ کے اور علم کے اعتبار سے غیر ضروری ہوتی ہے۔

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں — دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پاؤں

عرض کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

ترصیع:- ہر مصرعہ کے رکنِ اول کا قافیہ دار ہونا۔

دریوزۂ ساماںہا، اے بے سروسامانی — ایجادِ گریباںہا، در پردۂ عریانی (نسخۂ حمیدیہ)

حسنِ تعلیل:- کسی چیز کی شاعر ایسی علت بیان کرتا ہے جو درحقیقت اس کی علت نہیں ہوتی۔

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا — بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

صنعت چہرہ:- کسی قصیدہ، مثنوی یا نظم میں ایسا شعر یا اشعار شروع میں لانا جس کے پڑھنے اور سننے والوں کو اس کا پتہ چل جائے کہ شاعر نے کس واقعہ کو آگے چل کر بیان کیا ہے۔

گنی ہیں سال کے رشتہ میں بیس بار گرہ — ابھی حساب میں باقی ہیں سو ہزار گرہ

اس شعر سے خیال اس طرف جاتا ہے کہ مرزا غالب نے اپنے ممدوح کی سالگرہ کا آگے چل کر بیان کیا ہوگا اس صنعت کو عربی میں "براعۃ الاستہلال" کہتے ہیں۔

مشاکلت:- ایک لفظ کو دوسرے لفظ کی معنوی حالت سے مشابہ اور ہم شکل بنانا۔

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا — وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

صنعت ارصاد:- ایسا شعر کہنا جس کے چند الفاظ پڑھ کر یا سن کر مصرعہ ثانی کا قافیہ پڑھے اور سنے بغیر ذہن میں آجائے۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

لف و نشر:- شعر میں ایسی چند چیزوں کا بیان جو آپس میں مناسبت رکھتی ہوں۔

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا — یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

صنعت ضلع:- عربی میں اس صنعت کا نام "تجنیس" ہے (۱) ایسے ہم شکل الفاظ کا شعر میں لانا جن کے معنی جدا جدا ہوں۔

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں — زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے — دیکھیں اب مر گئے، پر کون اٹھاتا ہے مجھے

سہ جان دینے میں اس کو یکتا جان

(۲) ایسے دو لفظ جن کا "املا" ایک جیسا ہو لیکن نقطوں میں فرق ہو۔

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

صنعتِ طباق :۔ اس کے نام صنعت تضاد و تقابل بھی ہیں، ایسے دو لفظوں یا اموں کو جمع کرنا جو ایک دوسرے کی ضد واقع ہوں۔

کم نہیں نازش ہمنامی چشم خوباں تیرا بیمار برا کیا ہے جو اچھا نہ ہوا
نہ بندھے تشنگی ذوق کے مضمون غالب گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا
محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

صنعت سیاق الاعداد :۔ کلام میں گنتی (اعداد NUMBERS) کا آنا ترتیب وار ہو، یا بے ترتیب

مے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

مصرع ثانی میں "ایک دو چار" (۱ + ۲ + ۴ = ۷) کا مجموعہ "سات" (۷) بنتا ہے فلک کے سات برج سات طبق اور سات سیارے (سبع سیارہ) مشہور ہیں۔ ایک دو چار" محاورہ بھی ہے اس محاورے کے ساتھ کس حسن و بے تکلفی کے ساتھ شعر میں "صنعت سیاق الاعداد" پیدا ہو گئی۔

غالب کے کلام میں ہر طرح کی خوبیاں ملتی ہیں، حسنِ اتفاق کہ مرزا کی تلاش و سعی، کے بغیر صنائع بدائع بھی ان کے یہاں آگئے ہیں یہ صورت "آورد" کی نہیں "آمد" کی ہے۔

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے

پروفیسر نظیر حسین زیدی
گورنمنٹ کالج حیدرآباد

اُردُوئے معلّٰی پر ایک نظر

غالب کے خطوط کا دوسرا مجموعہ اردوئے معلّٰی کا پہلا حصہ ۱۸۶۹ء میں چھپا۔ افسوس کہ مرزا صاحب اس کی اشاعت سے ۱۹ دن پہلے انتقال فرما چکے تھے۔ ۱۸۹۹ء میں دونوں حصے یکجا مجتبائی پریس دھلی میں چھپے اس کے بعد پھر مختلف مطابع سے متعدد بار شائع ہوئے اس مجموعہ میں کل خطوط میری شمار کے مطابق ۴۸۰ ہیں جن میں سے ۲۶۱ خطوط ایسے ہیں جنکی تاریخ و سنہ موجود ہے اور تقریباً ۲۱۹/۲۲۰ خطوط ایسے ہیں جن پر تاریخ نہیں دی گئی یا اگر تاریخ ہے تو سن غائب ہے ایک بڑی دشواری اس سلسلہ میں یہ بھی آپڑی ہے کہ خطوط کی اشاعت تاریخ وار نہیں ہے بلکہ افراد کے نام خطوط یکجا کردئے گئے ہیں اگر تاریخی تحریک کے اعتبار سے جمع کئے جاتے تو ان خطوط سے زیادہ مفید مطلب تاریخی چیزیں ترتیب سے نظر کے سامنے آجاتیں۔ اس نسخۂ موجودہ میں نہ فہرست ہے نہ تعداد خطوط ہے نہ افراد کے نام خطوط کی تعداد کا شمار ہے۔ بعض جگہ تو سن بھی غلط ہیں۔ اس لئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ جو کچھ نظر ڈالی گئی ہے وہ بالکل حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ یہ ایک کوشش ناتمام ہے جو کچھ کی جا سکی ہے۔ اگر تمام ایڈیشن نظر کے سامنے ہوں تو بہت سی حل طلب چیزوں کے متعلق مزید معلومات حاصل ہونے کا امکان ہے۔

بہرحال اس مجموعہ خطوط میں عود ہندی کی طرح علمی مسائل تو زیادہ نہیں ہیں لیکن زبان و بیان کے اعتبار سے اس کتاب کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اسی کتاب سے خود غالب کے متعلق بعض نئے انکشافات ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق ذاتی معلومات کے علاوہ ان کی بشری کمزوریوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جن کو غالب نے کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے مزاج، آداب زندگی، خانگی قصے۔ گھریلو پریشانیوں کے ساتھ ساتھ ان کی پرخلوص نسبت۔ مراسم دوستی۔ جواب خطوط میں عجلت ان کے احباب و آشنا سے نوعیت مراسم کا بھی خوب پتہ چلتا ہے۔ اگر تاریخی نوعیت سے یہ خطوط مرتب ہوکر سامنے آجائیں تو غالب سے بہتر ۱۸۵۷ء کے واقعات پر تبصرہ کرنے والا کوئی غالباً اس انداز سے سامنے نہ آسکے گا۔ غالب کی فضول خرچیاں ہمیشہ ان کی پریشانیوں میں اضافہ کا باعث ہوئیں۔ اور قناعت پسندی کے

جذبے سے وہ کوسوں دور نظر آتے ہیں۔ اس لئے انکی زندگی مطمئن نہیں گذری جام سفال کو وہ جام جم سے بہتر تو ضرور سمجھے۔ لیکن جام جم کی تلاش میں وہ اتنے سرگرداں رہے کہ جام سفال کا خیال انہیں سکون زندگی نہ بخش سکا ایسی بات نہیں ہے کہ انکے زمانے کے ارباب علم نے ان کی طرف سے عدم توجہی اختیار کر لی ہو۔ ان کو مستقل مدد کے علاوہ فتوحات ملتی رہیں۔ لیکن ان فتوحات نے بھی ان کے دل میں اطمینان کی لہر پیدا نہ کی۔

یہی وجہ تھی کہ ان کی بیگم ان کی اس روش سے ناراض رہیں اور غالب مرحوم اولاد سے تو محروم ہو گئے تھے بیگم کی محبت و توجہ سے بھی محروم ہو گئے۔

خود غالب کی لاابالی زندگی کو اس میں بہت زیادہ دخل ہے۔ بچپن کے مزاج بگڑے ہوئے تھے۔ جوانی میں کچھ متوسط طور پر زندگی گزری لیکن عائلی ذمہ داریوں سے وہ کوسوں دور رہے۔ اسی لئے ۱۸۵۷ء کے بعد کا دور ان کے لئے ان کے اظہار بیان کے مطابق سخت دور تھا۔ اگرچہ اسی زمانے میں انکی مدد رام پور اور دوسرے ذرائع سے ہوتی رہی جو اس سے قبل اس طرح مسلسل نہیں تھی۔ لیکن انکی زندگی کے انداز زمانہ شاہی میں جس طرح سکون پیدا کر سکتے تھے۔ بعد میں وہی انداز ان کے لئے بلا تے جان بن گئے۔

کاش کہ میر کی زندگی اگر غالب کی سی گزرتی اور وہ قناعت، صبر و سکون کے جذبے کے ساتھ مطمئن زندگی گزارتے تو غالب ۱۸۵۷ء کے بعد اپنی وفات تک (۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء) اردو ادب کے لئے اور بھی زیادہ بیش قیمت سرمایہ چھوڑ جاتے۔ لیکن از ماست کہ بر ماست۔ اس کا کیا علاج کہ خود غالب عقیدے کے مطابق جبر کے قائل تھے۔ (اردوئے معلی صفحہ ۳۵۷)

لیکن اس سے انکار کس کو ہو سکتا ہے کہ اردو کی آبرو میر و غالب کے دم سے ہے اور ان کا فرمایا ہوا ہر لفظ ہماری زبان کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ وہ خود مالی اعتبار سے تہی دامن تھے لیکن ادب کی جھولی کو اپنے کلام کے موتیوں سے بھر دیا۔ اس لئے غالب کی عظمت کا اعتراف کس کو نہیں ہے؟ اور جس غالب نے میر کے کمالات کا اعتراف کیا اسی طرح آج ہر ذی فہم غالب کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے اور۔ ع

ایں سعادت بزور بازو نیست

جب تک اردو زبان ہے غالب کی زبان کا سکہ جاری رہے گا۔ باقی رہے نام اللہ کا۔

میں نے غالب کے خطوط کے اس مجموعہ سے جو موتی چنے ہیں ان کو پیش کر رہا ہوں۔

(الف)

(سلیس و لطیف جملے جن میں ظرافت کا پہلو بھی اکثر جلوہ گر ہے)

•

صفحہ ۱۰:۔ ریل پیل کرتے چلے آؤ۔

جہاں دولت نہیں وہاں مصیبت ہے۔ جہاں دولت ہے وہاں خصومت ہے۔

صفحہ ۲۰ :- بدن پھوڑوں کی کثرت سے سروِ چراغاں ہوگیا۔

صفحہ ۳۰ :- غالبؔ سوختہ اختر کو ہنر کی داد نہ ملی۔

صفحہ ۵۲ :- پائینچے لیر لیر۔ جوتی ٹوٹی ہوئی یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف۔ سنبلستان ایک معشوق خوبرو ہے۔

صفحہ ۵۵ :- بے صبر کو اب کی بار مینہ بھر صبر چاہیئے۔

صفحہ ۸۳ :- کھچڑی کھائی دن بہلائے (یا بہلائے) کپڑے پھاڑے گھر کو آئے۔

صفحہ ۹۶ :- ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو رونے والا بھی نہ ہوگا۔

صفحہ ۹۸ :- ننگا نہ ہوتا تو گریبان پھاڑ ڈالتا۔ اگر جان عزیز نہ ہوتی تو سر پھوڑ ڈالتا۔

صفحہ ۱۰۹ :- غلہ گراں ہے۔ موت ارزاں ہے۔ میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔

صفحہ ۱۱۰ :- میں ہر وقت اسی شہر میں قلزمِ خون کا شناور رہا ہوں۔

ڈپٹی صاحب کو کثرت اشغال سے فرصت نہیں۔ مجھ کو افراط ضعف سے طاقت نہیں۔

صفحہ ۱۱۵ :- حضرت کی تحریر کا ایک لفظ سوائے شاہ عالم کے اگر پڑھا گیا ہو تو

(۱) دیدے پھوٹیں۔ ایمان نصیب نہ ہو۔

(۲) جو تمہارا ڈھنگ ہے وہی میرا رنگ ہے۔

صفحہ ۱۱۸ :- تمہارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو بوئے پیرہن نے یعقوب کے ساتھ کیا تھا۔

صفحہ ۱۱۹ :- یہ دیکھو کہ ہم اپنا نام نہیں لکھتے بھلا دیکھیں تو سہی تم جان جاتے ہو کہ یہ خط کس کا ہے۔

صفحہ ۱۲۹ :- دیکھیئے نو من تیل کب میسر ہو اور رادھا کب ناچے۔

صفحہ ۱۳۱ :- یہ جواب سن کر نومیدی کی پوٹ باندھ کر لے آیا۔

صفحہ ۱۳۴ :- نہ نخوری رہی نہ سخندانی کس برتے پر تتا پانی۔

صفحہ ۱۳۹ :- بنئے سے سیانا سو دیوانہ۔

صفحہ ۱۴۰ :- تمہارے بھائی نے نعل در آتش کر رکھا ہے۔

صفحہ ۱۴۳ :- حسن بھی کیا چیز ہے قادر کا اتنا خوف نہیں جتنا حسین آدمی کا ڈر ہوتا ہے۔

مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹا بھر برسے۔

صفحہ ۱۴۵ :- میں نے روپیہ آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔

صفحہ ۱۴۵ :- دلّی کی ہستی کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ۔ چاندنی۔ ہر روز مجمع بازار مسجد جامع۔

ہر ہفتہ سیر جمنا کے پُل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب کہاں۔

پھر کہو - دلّی کہاں - ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔

صفحہ ۱۴۹ :- علّتی دارم چہ غم دارم

" تم میرے ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں، میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں "

صفحہ ۱۵۱ :- مجھے دیکھو میں کب سے دلی میں رہتا ہوں نہ کوئی اپنا ہم نام ہونے دیا۔ نہ کوئی اپنا ہم حرف بننے دیا
نہ اپنا ہم تخلص بہم پہنچایا۔

صفحہ ۱۵۲ :- آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی۔

صفحہ ۱۵۸ :- عید وہاں کرو تو باسی عید یہاں۔

صفحہ ۱۶۱ :- آنکھیں انکے حسن صورت سے روشن ہوگئیں اور دل ان کے حسن سیرت سے خوش ہوگیا - واہ خاک پاک بلگرام! میں نے
جس بزرگوار کو دیکھا اچھا پایا۔

صفحہ ۱۶۴ :- ہم تمہارے خط کو مفرّح روح سمجھتے ہیں۔

صفحہ ۱۶۵ :- وہ دونوں میرا کام مجھ سے کرا کے اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے سو ان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔

صفحہ ۱۶۸ :- میں کہاں اور نمائش گاہ کہاں - خود اس نمائش گاہ کا سیر میں جس کو دنیا کہتے ہیں دل بھر گیا۔

صفحہ ۱۶۸ :- وہ غزل جو کبار الٰہ آباد تھا وہاں پہنچی جہاں اب میں جانے والا ہوں یعنی عدم (مدعا یہ کہ گم ہوگئی)

صفحہ ۱۷۴ :- اتحاد اسمی دلیل مودّت روحانی ہے۔

صفحہ ۱۸۲ :- جاڑا خوب پڑ رہا ہے - تونگر عزدہ سے، مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے۔

صفحہ ۱۸۴ :- آبکاری کے بند و بست جدید نے مارا - عرق نہ کھینچنے کی قید شدید نے مارا - ادھر انسداد دروازۂ آبکاری ہے۔
ادھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے - انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

صفحہ ۱۸۳ :- ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے - ایک کو تنہائی سے نفور ہے - ایک کو تنہائی منظور ہے۔

صفحہ ۱۸۴ :- احتمال تعیش و تنعم بشرط تجرید صورت (اجرا پنشن) میں سوچتا ہوں اور وہ موہوم ہے - بیدل کا شعر مجھ کو مزا دیتا ہے

نہ شام ما را سحر نویدی نہ صبح ما را دم سپیدی!
چو حاصل ماست نا امیدی غبار دنیا بفرق عقبیٰ

صفحہ ۱۸۵ :- بعد تیس کوس اور آدھ کوس کا برابر ہے۔

صفحہ ۱۹۶ :- نظم و نثر کا کام صرف ۵۰ برس کی مشق کے زور سے چلتا ہے - ورنہ جوہر فکر کی درخشندگی کہاں۔
بوڑھا پہلوان پیچ بتاتا ہے زور نہیں دلوا سکتا۔

صفحہ ۱۹۶ :- آپ سیّد صحیح النسب تمام امت مرحومہ کے قبلہ و کعبہ - جب آپ مجھے قبلہ و کعبہ لکھیں تو پھر میں آپ کو کیا لکھوں۔

غور کیجئے قبلۂ قبلہ اور کعبۂ کعبہ یہ کیا ترکیب ہے۔

صفحہ ۱۹۸:۔ میاں کالے مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو پھر گئی کاغذ کا پرزا۔ سونے کا تار۔ پشمینے کا بال باقی نہ رہا۔

صفحہ ۲۰۱:۔ ایک ایک غزل آپ تینوں بھیج دیا کیجئے۔ مگر میرے قبلہ و کعبہ واسطے خدا کے شجرۂ منظومہ ارسال نہ فرمائیے گا۔

اس کی اصلاح میرے حدِ وسع سے باہر ہے۔

،۔ (آپ) سو روپے کے نوٹ کی رسید سو بار مانگتے ہیں۔

صفحہ ۲۰۲:۔ آنکھ کی بینائی میں فرق۔ ہاتھ کی گیرائی میں فرق۔ رعشہ مستولی۔ حافظہ معدوم

آگے ناتواں تھا اب نیم جان ہو رہا ہوں۔

صفحہ ۲۰۴:۔ بینائی اگرچہ سب کو عزیز ہے مگر شنوائی بھی تو آخر کوئی چیز ہے۔

صفحہ ۲۰۶:۔ سنو صاحب! شعرا میں فردوسی، فقرا میں حسن بصری۔ عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین فن میں سرِ دفتر اور پیشوا ہیں۔

شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے، فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے، عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی طرح

ہمطرحی نصیب ہو۔

صفحہ ۲۰۸:۔ میرا قد درازی میں انگشت نما ہے۔

صفحہ ۲۰۹:۔ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔

کسی کے مرنے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے۔

صفحہ ۲۱۲:۔ میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے کہ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے

مزے لیا کرو۔

صفحہ ۲۱۳:۔ ایسا لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو۔

صفحہ ۲۱۶:۔ فقیر شکوہ سے برا نہیں مانتا۔ مگر شکوہ کے فن کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ شکوہ کی خوبی یہ ہے کہ راہ راست سے منہ نہ

موڑے اور مہندا دوسرے کے واسطے جواب کی گنجائش نہ چھوڑے۔

صفحہ ۲۱۸:۔ دولت کا ہاتھ آنا مع نیک نامی اس سے بہتر دنیا میں کوئی بات نہیں۔

صفحہ ۲۱۹:۔ وہ دن آئے کہ قلم بے کار ہو جائے زبان پر میر گفتار آئے۔

صفحہ ۲۲۱:۔ اگر کسی بے درد پر دل آیا ہے تو شکایت کی کیا گنجائش ہے۔ بلکہ یہ غم تو نصیبِ دوستاں درخورِ افزائش ہے۔

صفحہ ۲۲۸:۔ کمالِ یاس مقتضیٔ استغنا ہے۔

صفحہ ۲۳۰:۔ ایسے محبوب کا فراق اور پھر بقید دوام کیونکر جانگزا نہ ہو۔

صفحہ ۲۴۵:۔ حواس کھو بیٹھا حافظہ رو بیٹھا اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں ایک قد آدم دیوار اٹھے۔

آپ کی پرستش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا نام نہ سُنا۔ میری خبر نہ لی۔

صفحہ ۲۴۶:۔ اگر میں نے امید گاہ بکاف عربی از راہ شکوہ لکھا تو کیا گناہ۔ نہ خط کا جواب نہ قصیدہ کی رسید۔

صفحہ ۲۴۸:۔ کافر نعمت ہو جاؤں اگر یہ آداب نہ بجالاؤں۔

صفحہ ۲۵۰:۔ شرم کم خدمتی سے دل ریش اور فرط خجلت سے سر در پیش ہو کر قصیدہ بھیجتا ہوں۔

صفحہ ۲۵۱:۔ خط میں نے کھولا۔ پڑھا پہلے کو انگرکھا۔ کرتا۔ گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا میں گریبان پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا۔ میرا نقصان ہوتا۔

صفحہ ۲۶۳:۔ میں نے تم کو خدا کو سونپا۔ تم مجھے کس کو سونپ چلے۔

صفحہ ۲۶۴:۔ آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا۔

صفحہ ۲۶۶:۔ رسم تحریر خطوط بسبب ضعف ترک ہوتی جاتی ہے۔ تحریر کا تارک نہیں ہوں بلکہ متروک ہوں۔

صفحہ ۲۶۸:۔ (میں نے) بنیوں کی طرح الغرض اس کو سمجھائی کہ لالہ جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے تو اس کو پانی دیتے ہیں۔

صفحہ ۲۷۲:۔ (حکام دلی کے) احکام۔ احکام قضا و قدر ہیں ان کا مرافعہ کہیں نہیں۔

صفحہ ۲۷۵:۔ صبر ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں۔ اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا اور لوگ کہتے ہیں تو نہ تڑپ۔ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں بتائی نہیں جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔

پہلے بیٹا مرا پھر باپ۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سر و پا کس کو کہتے ہیں۔ میں کہوں گا۔ یوسف مرزا کو۔

علی کا غلام کبھی مرتد نہ ہو گا۔

بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔

صفحہ ۲۷۸:۔ پنشن ضبط، بطریق ترحم دس دس روپیہ مہینا ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کا کیا قہر ہوگا۔

صفحہ ۲۷۹:۔ اللہ اللہ حسین مرزا کی داڑھی سفید ہو گئی بشدت رنج و غم کی خوبیاں ہیں۔

صفحہ ۲۸۰:۔ نصیب اعداء ناظر جی بہت بیمار ہیں۔

صفحہ ۲۸۳:۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوت میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے۔ بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے غم مرگ۔ غم فراق۔ غم رزق۔ غم عزت۔

ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔

صفحہ ۳۰۲:۔ خط لکھنے نہ لکھنے پر مدار نہیں۔ تمہاری جگہ میرے دل میں ہے۔

صفحہ ۳۱۳:۔ چڑھا ہوا روپیہ دام دام ملا۔

صفحہ ۳۱۶ :- اگر قافلہ کو روٹی نہ دو گے تو چنے دو گے - اگر چنے بھی نہ دو گے تو میری بلا سے -

" بعد تبدیل آب و ہوا دو فائدے اور بھی ہیں - کثرت اطبّا اور صحبت احباء -

صفحہ ۳۱۹ :- تعزیت کی واسطے تین باتیں ہیں (۱) اظہار غم (۲) تلقین صبر (۳) دعائے مغفرت -

صفحہ ۳۲۴ :- وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در در بھیک مانگے - وہ میں ہوں -

صفحہ ۳۲۶ :- آغا صاحب بسواری ریل مانند دولت دلخواہ کہ ناگاہ آوے فقیر کے تکیہ میں تشریف لائے -

صفحہ ۳۳۰ :- خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے -

صفحہ ۳۳۰ :- اگر آیا تو ہرگز اس کو نہ ٹھہرنے دو - ہانک دو - خبردار اپنے پاس رہنے نہ دینا -

صفحہ ۳۳۱ :- اگر سرنوشت آسمانی میں اواخر رجب میں ہمارا تمہارا مل بیٹھنا مندرج ہے تو زبانی کہہ سن لیں گے - قلم کو ان اسرار کی محرمیت نہیں ہے -

جو شخص اپنے ملک و مال و جان و تن و ننگ و نام کے امور میں آشفتہ و سرگرداں - بلکہ عاجز و حیراں ہو - دوسرے کو اس سے کیا گلہ -

صفحہ ۳۳۶ :- ہر دم دم نزع ہے - دل غم سے خوں پذیر ہو گیا ہے - کہ کسی بات سے خوش نہیں ہو سکتا - مرگ کو نجات سمجھے ہوئے ہوں اور نجات کا طالب ہوں -

صفحہ ۳۳۶ :- یہ خود پسند اور معہذا سپارش کا دشمن ہے -

صفحہ ۳۴۰ :- مجھے کافور و کفن کی فکر پڑ رہی ہے - وہ ستمگر شعر و سخن کا طالب ہے -

" لو صاحب مرزا رجب بیگ مرے ان کی تعزیت آپ نے نہ کی - شعبان بیگ پیدا ہو گئے - کل ان کی چھٹی ہو گئی - آپ شریک نہ ہوئے -

صفحہ ۳۴۱ :- مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میرا ممدوح جیتا نہیں . . . . اور جسکی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا -

صفحہ ۳۴۲ :- اگر میں تمہارے نزدیک امیر نہیں نہ سہی - اہل حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے ہرکارہ میرا پتہ نہ پائے - آپ صرف دہلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجئے - خط پہنچنے کا میں ضامن -

" ایک بڈھا کسی گلی میں جاتے جاتے ٹھوکر کھا کر گر پڑا - کہنے لگا ہائے بڑھاپا - ادھر ادھر دیکھا - جب جانا کہ کوئی نہیں ہے - کہتا ہوا بڑھا کہ جوانی میں کیا پتھر پڑے تھے -

صفحہ ۳۴۷ :- کبھی یہ تصور کرتا ہوں کہ میر جان صاحب اس مصری کے ٹکڑے چبا رہے ہوں گے - تو یہاں رشک سے اپنا کلیجہ چابنے لگتا ہوں -

صفحہ ۳۵۵:۔ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا۔ بھٹئی کرتا تھا۔ خلعت پاتا تھا خلعت موقوف بھٹئی متروک۔ نہ غزل۔ نہ مدح۔ ہزل و ہجو میرا آئین نہیں۔ پھر کہو کیا لکھوں۔ بوڑھے پہلوان کے سے پیچ بتانے کو رہ گیا ہوں۔

صفحہ ۳۵۶:۔ یہاں لاموجود الا اللہ کی بادۂ ناب کا رطل گراں چڑھائے ہوئے اور کفر و اسلام و نور و نار کو مٹائے ہوئے بیٹھے ہیں۔

صفحہ ۲۶۲:۔ میں دوزخ کا ایندھن ہونگا اور دوزخ کی آنچ تیز کروں گا۔ تاکہ مشرکین و منکرینِ نبوت مصطفوی و امامت مصطفوی اس میں جلیں۔

(ب)

زبان و مفاہیم کے بارے میں غالبؔ کے فیصلے

صفحہ ۵۰:۔ شیہہ۔ صدائے اسپ (صہیہ صحیح نہیں ہے)

〃 :۔ مہرخواں کے دو معنی ہیں (۱) خطاب (۲) عرف

صفحہ ۱۱۷:۔ ناسخ کے ہاں کمتر اور آتش کے ہاں بیشتر تیز نشتر ہیں۔

صفحہ ۱۷۳:۔ جفا۔ مونث ہونے میں لکھنؤ دلی کو اتفاق ہے۔

〃 ستم و ظلم و بیداد مذکر ہے۔

صفحہ ۲۲۳:۔ ناسخ مرحوم جو تمہارے استاد تھے۔ مگر یک فنی تھے۔ صرف غزل کہتے تھے۔

صفحہ ۲۲۴:۔ جو مادّے اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں وہ بیشتر لچر ہوا کرتے ہیں۔

صفحہ ۳۶۰:۔ جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کردیں تو کیا بعید ہے کہ وہ شاعر متوفیٰ کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو۔

(د)

فارسی آمیز ترکیبیں جو اب کمتر استعمال ہوتی ہیں یا ان کا استعمال اکثر متروک ہو چکا ہے

صفحہ ۱۲ :۔ حاجتی (یعنی چوکی)

صفحہ ۱۹ :۔ سراسر دیکھ لیا تھا۔

صفحہ ۲۱ :۔ مسترد آیا۔

صفحہ ۲۲ :- روزگارہ عمدہ کئے ہوئے ہیں۔

صفحہ ۲۷ :- تفقّد نامہ۔

درنگ ورزی۔

صفحہ ۲۹ :- میں پاسخ طراز ہوا۔

صفحہ ۳۶ :- دل سوادزدہ نے آرام پایا۔

صفحہ ۳۸ :- صاحب مطابع جب تک طلب رخصت نہ کریں۔ اپنے مطبع میں اس کے چھاپنے کی جرأت نہ کریں۔

۵۱ و ۸۹ :- اصلاحی کو اغذ ہر طرف کے آتے ہیں (کاغذ کی جمع بنائی گئی)

صفحہ ۵۳ :- نیمروز (دوپہر کے لئے)

صفحہ ۵۴ :- سود کنواں دینا پڑے گا۔

صفحہ ۵۶ :- کٹگرہ ہے (تختہ پھانسی)

صفحہ ۱۲۷ :- جریدہ بعد برسات جاؤں گا۔ (تنہا)

صفحہ ۱۲۸ :- ہرکارہ (ڈاکیا)

صفحہ ۲۱۳ :- بیورا بھجوایا۔

صفحہ ۲۴۹ :- ہوا میں فرط برودت سے گزند پیدا ہو گیا۔ ہوا ٹھنڈی بے گزند چل رہی ہے۔ ابر تنک محیط ہے۔

صفحہ ۲۵۰ :- اب کے تو مقرر بھیجئے گا۔

نامردانہ مر گیا۔ (بے کسی میں)

خوبی دین و دنیا روزی باد۔

ابلاغ سلام مسنون الاسلام۔

خاطر عاطر جمع رہے۔

درویش دلریش فرو ماندۂ کشاکش معاصی۔

آپ کا نوازش نامہ آیا۔ میں نے حرز بازو بنایا۔

عوارض احتراق خون (خون کی گرمی کی بیماری)

عنوان ناکشودہ

غم فزا نامہ

منصبہائے خطیر اور مدارج عظیم۔

محسن و مُربّی قدیم ۔
برادر جلیل المناقب عمیم الاحسان ۔
خانہ دولت آباد ۔

(س)

بعض نئی ترکیبیں

صفحہ ۲۷۷ :- جایا چاہتے ہیں ۔ (جانا چاہتے ہیں)
صفحہ ۳۰۱ :- جس غزل کی پانچ شعر لکھی ہیں ۔ یہ نو شعر کی ہیں (شعر کو مونث لکھا گیا)
صفحہ ۳۰۷ :- لوگوں کے اخبار آتے رہتے ہیں اور میری نظر سے بھی گزر جاتے ہیں ۔
اخبار کے دو معنی ہیں (۱) بمعنی روزنامہ (۲) اطلاعات ذاتی)
صفحہ ۲۹۲ :- پیش دست (نوکر) (۲) اوگاہ کر لے گیا ۔ (وصول کر کے لے گیا)
صفحہ ۳۰۸ :- اس شہر کے اخبار سنیئے (حالات ۔ اطلاعات)
صفحہ ۳۰۷ :- شہر کے اخبار لکھتا ہوں سوانح لیل و نہار لکھتا ہوں ۔ گرچہ یک فنہ ہوں ۔
صفحہ ۳۰۸ :- ٹھلیا ۔
صفحہ ۳۱۵ :- گمزی (حویلی پر گلدستے بنائے جاتے تھے)
صفحہ ۳۲۴ :- میں لوا کر لے گیا ۔
صفحہ ۳۲۸ :- قریب طلوع آفتاب بچشم نیم باز ۔ یہ رقعہ تمہارے نام لکھا ہے ۔
صفحہ ۳۲۹ :- نگاشتہ و رواں داشتہ ۔
صفحہ ۳۳۴ :- آنکھ کی گھاجنی (انجن ہاری ۔ آنکھ میں پھنسی کا نکلنا)
صفحہ ۳۵۱ :- نیم نا معقول ۔ صفحہ ۳۵۹ ۔ اپنے بیگانے کو ہر وقت چھلپاٹیاں نظر آئیں ۔

س

انگریزی الفاظ کا استعمال

۱ :- اگریمنٹ ۔ ۲ ۔ ٹین (ٹفن) ۳ ۔ کمپنی ۴ ۔ لمبر (نمبر) ۵ ۔ پم فلٹ ۶ ۔ انکم ٹکس ۷ ۔ کمیٹی ۔ ۸ ۔ پنسن (بعض جگہ پنشن ہی لکھا ہے)
۹ ۔ لارڈ صاحب ۔ ۱۰ ۔ گورنمنٹ ۔ ۱۱ ۔ اکسٹرا اسسٹنٹ ۱۲ ۔ پولیس ۱۳ ۔ کرنیل ۔

محمد قطب الدین سوداگان

کلامِ غالب اور ضلع و رعایت

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی — مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

اپنے ایک خط میں مرزا غالب لکھتے ہیں کسی نے میرے سامنے یہ شعر پڑھا تو میں نے کہا کہ جس بزرگ کا یہ شعر ہے اُن پر بیشک رحمت خدا کی لیکن اگر میرا ہو تو مجھ پہ لعنت، اسد، شیر، وفا، جفا، بُت، خدا یہ ضلع و رعایت میرا طرز کلام نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ جہاں ضلع و رعایت اور اسی نوع کی متعدد لفظی وصوری صنعتیں شعر میں ایک زمانہ میں قدر کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں غالب کے زمانہ میں اس کو اگر عجیب نہیں تو کم از کم معنی آفرینی اور نکتہ سنجی کے منافی و منتضاد تصور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ غالب کے ہمعصروں ذوق، مومن، آزردہ اور شیفتہ نے بھی اس قسم کی صنعت سے احتراز واجتناب کو اولیٰ جانا۔

لیکن جب ہم غالب کے اُردو دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو متعدد غزلوں میں ایسے شعر ملتے ہیں جن میں ضلع و رعایت کو ملحوظ رکھا گیا ہے تو اس میں شک نہیں کہ جس خوش اسلوبی اور خوبصورتی سے اس صنعت کو برتا گیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے

چھا لیا اوس نے مجھے ورنہ میں ایسا کب تھا

(کتھا — چھالیہ)

جاؤ بھی چوں نہ کرو پانسو گالی دیدو

(چونا — پان)

چھالیہ چونا کتھا اور پان سب ضلع کے الفاظ ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف کلام غالب نے اس صنعت کو وہ جلادی کہ ضلع جگت کے الفاظ انگشتری میں سلیقہ سے جڑے ہوئے نگینے معلوم ہوتے ہیں اور ساتھ ہی شعر معنوی حیثیت سے

اپنی عظمت و بلندی کو کھوتا نہیں ہے اور لغوی اعتبار سے پر شکوہ معلوم ہوتا ہے۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں دیجاتی ہیں خط کشیدہ الفاظ ضلع و رعایت کو ظاہر کرتے ہیں۔ زیر نظر دیوان غالب کا طاہر ایڈیشن ہے جو کیبل آرٹ پریس میں فراش خانہ دہلی میں چھپا ہے۔ اس میں طاہر صاحب نے مرزا توشہ کے عنوان سے مرزا اسد اللہ خاں غالب کے حالات زندگی اور فن شعر و سخن پر مختصر سا نوٹ لکھا ہے۔ تاریخ طباعت ۱۳۶۵ھ ہجری ہے اور آخر میں طاہر بنیاد آزاد دہلوی کے الفاظ درج ہیں۔ کتابت خوب صورت اور طباعت دیدہ زیب ہے گو بعض اشعار دوسرے ایڈیشنوں سے مختلف پائے جاتے ہیں۔

(۱) شور پسند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزہ پایا

مندرجہ صدر شعر میں جیسا کہ ظاہر ہے شور، نمک اور مزہ ضلع کے الفاظ ہیں لیکن بڑی خوب صورتی سے استعمال ہوئے ہیں۔

(۲) دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا آتش خاموش کے مانند گویا جل گیا

خاموش اور گویا کے الفاظ اس مصرع میں کس لطیف انداز میں نظم ہوئے ہیں کہ جن پر ضلع کے الفاظ ہونے کا گمان تک نہیں ہوتا۔

(۳) عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

عرض و جوہر کی رعایت ملاحظہ کیجئے۔

(۴) شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

رنگ کا لفظ یہاں تصویر کی مناسبت سے استعمال کیا گیا ہے۔

ورنہ مصرع اول یوں بھی ہو سکتا تھا۔

شوق ہر حال .... الخ

(۵) ناگہاں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا دل کہ ذوق کاوش ناخن سے لذت یاب تھا

رنگ کا لفظ یہاں خون کی نسبت سے استعمال کیا گیا ہے ورنہ "اس طرح" بھی کیا جا سکتا تھا

میر تقی میر نے بھی ایک شعر میں خون اور رنگ کو اسی رنگ میں استعمال کیا ہے

اب آنکھوں میں خوں دم بدم دیکھتے ہیں نہ پوچھو جو کچھ رنگ ہم دیکھتے ہیں

(۶) موج سراب دشت وفا کا نہ پوچھ حال ہر ذرہ مثل جوہر تیغ آب دار تھا

موج اور آب دار میں جو رعایت ہے ظاہر ہے

(۷) گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانہ کی در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

ٹپکنے کا لفظ گریہ کی مناسبت سے ہے ورنہ "ظاہر" بھی کہا جاسکتا تھا۔

(۸) کم نہیں نازشِ ہمنامیٔ چشمِ خوباں تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

دوسرا مصرع یوں بھی ہوسکتا تھا۔

ع تِرا بیمار یوں ہی خوش ہے کہ اچھا نہ ہوا

(۹) کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

شیریں اور مزہ کے الفاظ آپس میں جو مناسبت رکھتے ہیں مخفی نہیں" گالیاں کھا کے خفا نہ ہوا" بھی کہا جاسکتا تھا۔

(۱۰) شرحِ اسبابِ گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

شرح، تنگ اور گرفتاری و زنداں میں جو لفظی مناسبت ملحوظ ہے ظاہر ہے

(۱۱) جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل آتش کدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

یہاں تحصیل کا لفظ جاگیر کی رعایت سے استعمال ہوا ہے۔

(۱۲) جاں در ہوائے یک نگہِ گرم ہے اسدؔ پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

پروانہ، وکیل اور داد خواہ کے الفاظ جو مناسبت لفظی رکھتے ہیں مخفی نہیں۔

(۱۳) خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

خاک و خون ضلع کے الفاظ ہیں۔

(۱۴) در خورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا نگہ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد

مصرع اول میں عرض و جوہر ضلع کے الفاظ ہیں۔

(۱۵) یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیٔ رفتار ہنوز

یک قلم کا لفظ کاغذ کی مناسبت سے استعمال کیا گیا ہے مصرعہ اولیٰ شاید یوں بھی کہا جاسکتا تھا۔

زبسکہ کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت .....

(۱۶) شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج گردِ ساحل ہے بزخمِ موجۂ دریا نمک

اس شعر میں خط کشیدہ الفاظ میں جو لفظی مناسبت ہے ظاہر ہے

(۱۷) عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

رنگ اور خون کے الفاظ میں رعایت لفظی کو ملحوظ رکھا گیا ہے

(۱۸) آزادیٔ نسیم مبارک کہ ہر طرف ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

ہوائے محمل یہاں نسیم کی نسبت سے استعمال ہوا ہے۔

(۱۹) کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے — پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

تاریکیٔ زندان کی مناسبت سے لفظ اندھیر لایا ہے۔ دونوں الفاظ میں جو رعایت لفظی ہے ظاہر ہے

(۲۰) دائم پڑا ہوا ترے در پہ نہیں ہوں میں — خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

خاک اور پتھر میں جو لفظی مناسبت ہے نمایاں ہے۔

(۲۱) دی سادگی سے جان، پڑوں کوہکن کے پاؤں — ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

ہیہات اور پاؤں ضلع کے الفاظ ہیں، ورنہ دوسرا مصرع یوں بھی کہا جا سکتا تھا۔

"اے کاش کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں"

(۲۲) اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد — اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

خط کشیدہ الفاظ میں جو رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے عیاں ہے

(۲۳) مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے — بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

مسجد اور قبلہ کے الفاظ میں جو تعلق ہے ظاہر ہے

(۲۴) اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں — بارے اب اے ہوا ہوس بال و پر گئی

ہوا و ہوس میں رعایت لفظی موجود ہے۔

(۲۵) لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ہاتھ قلم ہونے کا محاورہ لکھنے کی مناسبت سے باندھا گیا ہے

(۲۶) کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب — شاہِ دیندار نے شفا پائی

دین و دنیا کا ضلع عیاں ہے۔

(۲۷) اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا — ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

برے اور بھلے کا استعمال رعایتِ لفظی کو ظاہر کرتا ہے۔

(۲۸) بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے — کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

بھوکے اور کھائیے میں جو لفظی رعایت ہے ظاہر ہے۔

پہلا مصرع کچھ اس طرح بھی ہو سکتا تھا:

ع "محتاج گرچہ سیرِ گلستاں کے ہم نہیں"

(۲۹) نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ — کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

آب اور ہوا کا ضلع ملاحظہ ہو۔

(۳۰) اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے

لفظ تاکے اور مے میں جو رعایت لفظی ملحوظ ہے ظاہر ہے۔ تاکے پر شاخِ تاک کا گمان ہوتا ہے

پہلا مصرع :-

اک "نو بہار ناز کو ڈھونڈے ہے پھر نگاہ" بھی ہو سکتا تھا۔

(۳۱) ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

خاص و عام کا ضلع ملاحظہ کیجئے کس خوبصورتی سے باندھا گیا ہے۔

(۳۲) مستیٔ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ ریزۂ شیشۂ مے جوہر تیغ کہسار

عرض و جوہر کا مرغوب ضلع غالب نے پھر اس شعر میں بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔

مندرجہ صدر مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غالب نے ہر چند رعایت لفظی سے احتراز کرنا چاہا لیکن اس سے بالکلیہ دامن نہ بچا سکے اگرچہ مرزا نے اس صنعت کو استعمال کرنے میں بڑی چابکدستی سے کام لیا ہے اور اپنی مخصوص معنیٰ آفرینی اور نزاکتِ خیال کو متاثر نہ ہونے دیا جو بلاشبہ ان کی نادر الکلامی پر دال ہے۔

غالب کی شخصیت

ڈاکٹر شوکت سبزواری

عشق و محبت ہماری غزل کا ایک خاص باب ہے محبت میں خواری غزل کا خاص جوہر تھا غالب نے اسکو خودداری سے آشنا کیا، اس میں جلال کا رنگ بھرا۔ فرشتوں کی بے لوثی اور طہارت پیدا کی، سوز کی جگہ ساز، گداز کی جگہ شگفتگی اور افسردگی کی جگہ درد میا عشق کا آب و رنگ بہ مردانہ صفات ہیں۔ غالب نے اپنی غزلوں میں اپنی پوری شخصیت سمو دی ہے۔ ان میں رفعت، خودداری اور بے نیازی کی لہریں دوڑا دی ہیں غالب کا کلام ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ انسانیت کے اعلیٰ جذبات کی صدائے بازگشت ہے۔ اس میں فطرت کے جوہر چمکتے ہیں۔ وہ ہمیں اس مقام تک لے جاتا ہے جہاں سے فرشتے کوتاہ قد و حقیر نظر آتے ہیں۔ یہ انسانیت کا مقام ہے۔ وہ انسانیت جس کے سامنے فرشتے جھکنے پر مجبور ہوئے وہ انسانیت جو خدا کی مقدس امانت کی حامل ہے، محبت کے اصلی جوہر یہیں کھلتے ہیں۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

⁂ ⁂ ⁂

سید انیس شاہ جیلانی

کتنے شیریں ہیں تیرے لب

یوں تو ہر آدمی کی زندگی نشیب و فراز، خیر و شر سے عبارت ہوا ہی کرتی ہے اور انسان ہوتا بھی مجموعہ اضداد ہے مگر دلی کے اس "رسوائے زمانہ" مرزا کے اوقات کچھ اس طرح گزرے ہیں کہ پچھلے سو برس سے تقریباً ہر پڑھے لکھے کی زبان پر اسی کا نام ہے ہر شخص غالب کے نام کی مالا جپ رہا ہے، اس کی زندگی کا مطالعہ جس دیدہ ریزی سے ایک عالم کر رہا ہے وہ اس کی زمانہ ساز عظمت کا مظہر ہے "خودی اور "بے خودی" کے عجیب و غریب "حادثات" کا مرقع مرزا کی تصویر حیات ہے، عوامی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اکثر یہ سنا گیا ہے "چچا غالب نے یہ کہا ہے۔" "چچا کیا خوب کہہ گئے ہیں" اور کھٹ سے خود ساختہ اشعار پر سنا دیں گے غالب زندہ ہوتے تو نجانے "فصاحت و بلاغت" کے کیا کیا خم لنڈھاتے یہ سن کر ؎

.. پتوں کی کمی نہیں غالب
ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں

یہ شعر زبان زد عام ہے، خواص تک کی زبان پر چڑھا ہوا، ایک اور شعر ہے

جی خوش ہوا ہے مسجد ویران کو دیکھ کر
میری طرح خدا کا بھی خانہ خراب ہے

کسی اسد نے انٹ شنٹ کچھ کہہ دیا تھا مرزا نے سنا تو ہن کے رکھ دیا اور پھر اسد تخلص سے توبہ کر لی، خواص کا یہ حال ہے کہ دیوان اور مکتوبات کو حرز جاں بنائے ہوئے ہیں آئے دن کہیں نہ کہیں سے کوئی خط کوئی غزل کھوج نکالتے ہیں، بصد اہتمام چھپواتے ہیں ہفتوں چرچا رہتا ہے، اس پر بھی جی نہیں بھرتا اور کوہ کنی کا سلسلہ تندہی سے جاری رہتا ہے غالبین کا شمار کہاں ممکن ہے۔ البتہ مولانا غلام رسول مہر، مالک رام، گویا سند کا درجہ رکھتے ہیں، بنارس کے خیر بھوروی

ہند یونیورسٹی کے زیرِ سایہ خرابات، غالب اکادمی" قائم کئے ہوئے ہیں ۔ ماہِ نو کراچی تو جب سے پیدا ہوا ہے غالب کے گن گا رہا ہے، اور آج پورے برصغیر پاک و ہند ہی میں نہیں پوری دنیا اس بڈھے کی صد سالہ برسی منانے کے اہتمام میں لگی ہوئی ہے، ہر شخص ہر ادارہ ہر ملک اپنی والی کوشش اگر کر رہا ہے تو یہی کہ جس قدر ممکن ہو شایانِ شان طریقے پر اس تقریب کو پایۂ تکمیل تک پہونچائے، خزانوں کے منہ کھول دیئے گئے ہیں، کہیں غالب کے نام پر ڈرامے کھیلے جا رہے ہیں تو کہیں پوری زندگی کو پردۂ فلم پر دکھایا جانے والا ہے، کوئی غالب پنسل ایجاد کر لایا ہے تو کوئی کسی سگرانی کو روشناس کرانے پر تلا ہوا ہے، فارسی خطوط اردو میں ڈھل رہے ہیں ضرورت فارسی اشعار کو بھی جامۂ اردو میں ملبوس کرنے کی تھی مگر یہ "مشقت" اٹھائے کون، غالب کو فارسی سے عشق تھا ضمنی طور پر اردو سے بیچ لڑ گئے، حیاتِ جاوید اسی لئے بخشی بڈھا پھر بھی ناک بھوں چڑھائے رہا۔ کبھی "نظرِ عنایت" ہوئی بھی تو جان لیوا، گلہ تنگ دامانی کا زبان پر آیا۔

"بھائی تم غور کرو اردو میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں اور عبارت میں معانی کیونکر بھروں گا"،

"میاں اردو کیا لکھوں۔ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ سے اردو کی فرمائش ہو"،

"جناب ریڈ صاحب صاحبی کرتے ہیں میں اردو میں اتنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں اس میں گنجائش عبارت آرائی کہاں"

"صاحبی کرتے ہیں" لکھنا بجائے خود کمال تھا جس سے غالب بے خبر نہ رہے ہوں گے، نظم میں غالب کا آہنگ سب سے جداگانہ، نثر کو مکالمے کا رنگ دیا، پرکاری وسادگی کو بہت کم ہاتھ سے جانے دیا ہے، لوگ شاکی ان کی مشکل نویسی کے تھے۔ غیر شعوری طور پر لوگوں کا منہ بند کرنے کے لئے سادگی کو اپنایا، سخت جان تھے زبان سے اقرار کرنا ہنر نہیں عیب جانا۔ اُس کے ادبی شعری مقام کو با انداز دگر پرکھا جا رہا ہے، غرض سارے جہاں میں دھوم مچی ہوئی ہے۔ اس "مردہ پرستی" پر ڈرتے ڈرتے بھی اگر کہوں تو کم از کم پچاس لاکھ تو ضرور اٹھ جائیں گے۔ یہ کم سے کم ہے زیادہ سے زیادہ کا آپ تصور خود کر لیں، روپے کا کیا ہے آج ہے کل نہیں ہاتھ کا میل،

اس صرفِ کثیر کو دیکھ کر مجھے غالب پر گزرے ہوئے پہاڑ سے دن اور راتیں یاد آنے لگے، وہ راتیں جو "بیچ و تاب رزمی و رازی" میں نہیں فکرِ معاش اور جبر زمانہ سہتے کٹ گئیں، کبھی تو وہ رات کی شراب میں سرگرداں کہیں سرِ شام ایک گھنٹے برسے ہوتے مینہ کے نتیجے میں رات بھر ٹپکتی ہوئی چھت سے افتاں و خیزاں، اس رندِ خرابات کی پرہیزگار اور پارسا بیوی نے اور نالے میں ذم کر رکھا تھا کھانے پینے کے برتن تک الگ، گھبرا کر منصوبے : پیچھا چھڑانے کے بنائے، طلاق دینا خلاف تہذیب تھا۔ عارضی علیحدگی کا بہانہ : یہ تراشا کر سیاحت کے ارادے ہیں، صبح ہوتی تو "کمپنی" اور "قلعہ" کا رخ کرنے، کبھے ارباب اقتدار زربائی کی دلجوئی کا سامان کرنے کسی کا قصیدہ لکھتے کسی کا سہرا، میرے خیال میں غالب پہلا اردو شاعر ہے جس نے انگریزوں کی مدح سرائی پر کمر باندھی جو بھیک تک پہونچی جس کا اعتراف خود بھی کر چکے ہیں۔ احباب غزل کا تقاضا کرتے یہ

ہے یہ دعا کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے اقلیمِ ہند و سندھ سے تا ملکِ روم و شام

پر اکتفا کرتے، اس کے باوجود تصیدے اس نوٹ کے ساتھ واپس آنے لگے کہ آئندہ ایسی چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کریں۔ فتح دلی پر چراغاں کی بہار بھی غالب کے مکان نے دکھائی۔ نواب شمس الدین کی چغلی کھا کر مشکلیں آسان ممکن ہے ہو جاتیں لیکن ناکامی مشکلکشا بھی مارا گیا، انگریزوں کے منشیوں کی چاپلوسی بھی اپنا شعار بنا لیا۔ سید اسد علی انوری تو یہ بھی کہتے ہیں کہ "آئین اکبری" کے دیباچہ میں انگریز پرستی کا ایسا مظاہرہ کیا کہ سرسید جیسے انگریز دوست کو بھی ناگوار ہوا، تصیدہ گوئی کا یہ سلسلہ پچیس برس تک چلا اور تان اس پر ٹوٹی کہ پنشن واگذار نہ ہو سکی۔

اے لبا آرزو کہ خاک شدہ

کہنا چاہئے اک عمر گزار دی اس دشت کی سیاحی میں پھر بھی گوہر مقصود ہاتھ نہ لگا،

دلی پر انگریزوں کی لائی ہوئی تباہی کا رونا بھی اُس زمانے کے تقریباً ہر خط میں رو دیا ہے، مگر اصل معاملہ پیٹ کا تھا نظیر نے پیٹ کو خطاب "بدکار" کا کچھ یونہی نہیں دے دیا تھا، میں سمجھتا ہوں گھر کے قمار خانہ بن جانے کی لم بھی یہی تھی، احباب بازیاں بد کر کھیلتے، حصہ ہر داؤں میں ان کا بھی رہتا ہوگا۔ اغیار تو تاک میں رہتے ہیں مخبری ہوئی اور رئیس شعرائے ہندوستان جیل کی ہوا کھانے لگا۔ اقتضائے وقت اور معیار شرافت و اخلاق یہ تھا کہ جس نے سزا پائی اس کا حقہ پانی بند، کوئی چھا نکنے تک کا روادار نہ رہا کہ بھلا ہو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ و حسرتی کا جاتے اور قیدی کا دل بہلاتے، شیفتہ کی شرافت نفس سے یہ بھی بعید نہ رہا ہو گا کہ خاطر نوش کا اہتمام بھی کر دیا ہو ورنہ غالب کا زندہ رہنا دشوار ہو جاتا اور جیل سے رہا ہونے سے پہلے قید زندگی سے رہائی پاتے۔

غالب کی خوبی کہہ لیجئے یا خامی ہوا کا رخ دیکھ کر چلتے تھے، بادشاہ ہند اپنی سادہ لوحی اور خلوت نشینی کے طفیل شہنشاہ دلی بن کر رہ گئے تھے اس پر بھی سوا لاکھ کے، دربار شاہی میں ذوق کا طوطی بولتا تھا۔ یہ ہر طرح کی ذلت اٹھا کر مصاحبین میں شمار ہونے کے آرزو مند، اس پر بھی نجانے کس ترنگ میں "دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا"، کہہ گزرے، بگڑے ہوئے شاہانہ تیور دیکھ کر یہ بھی کہنا پڑا ؎

استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں ہے مجھے،

اس معذرت نامے میں یہ شعر بھی موجود ہے۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا، سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

البتہ اس میں شک ہے کہ

ہرچہ در گفتار لست آن ننگِ من است

انہوں نے ذوق ہی سے مخاطب ہو کر کہا ہو، عزتِ نفس کا پاس یہاں تک بھی تھا کہ اگر کوئی شاگرد درست بتا پوچھتا تو اسے اپنی تذلیل

سمجھتے اور لکھتے کہ تم نے جان بوجھ کر مجھے چھیڑا ہے ورنہ میرے نام کے ساتھ دلی کافی ہے اور تم جانتے ہو یورپ تک سے خط اسی طرح چلے آتے ہیں۔

غالب کی ہر بات نرالی ہے مردم بیزار ایسے کہ بھائی کے جنازے میں شریک نہ ہوئے مرنے والے کے بیوی بچوں کی خبر کیا لیتے کہ خود ان کا پرسانِ حال کوئی نہ تھا۔

ایک تنہا قتیل ہی جان کا روگ بن گیا تھا اُس کی حیات جاوید بھی غالب کے بغض و عداوت میں پنہاں تھی ورنہ فارسی دانی تو اسے بھی لے ڈوبی تھی، پنشن کے چکر میں کلکتے تک گئے لکھنؤ میں بھی خاطر خواہ پذیرائی نہ ہوئی وہاں پہنچے تو ان کے اعزاز میں برپا کی جانے والی مجلس مشاعرہ میں اعتراض جڑ دیے گئے، جھوٹوں سند قتیل کے نام کی پیش کی گئی۔ یہاں کسے دماغ کہ تحقیق کرتا پھرے یہ تو کاٹا اور لے دوڑی کے مصداق خواہی نخواہی جلا گئے، کڑھا کئے، موقعہ بے موقعہ زہر اگلتے، دوستوں کو بھی بھڑکاتے، خود لکھتے اور دوستوں کے نام سے چھپواتے (جلیل صاحب قدوائی کے اس شبہے کو تقویت پہنچتی ہے کہ مکاتیب، غالب نے بعد از نظرثانی اشاعت کے لئے دیئے ہونگے ترمیم و اضافے کے بعد) جہاں غلط فارسی دیکھتے قتیل کو الزام دیتے، بقول الوری دلیل کی کمزوری کو گفتگو کی تلخی سے پورا کرتے "آپ قتیل کو مرحوم لکھیں گے جواباً غالب دیوالی سنگھ ہندو بچہ کھتری منوفی" تحریر کریں گے کہیں کہیں اپنے جذبات کا خون قتیل کے حامیوں کی خوشامد کر کے کرتے انگریز کا بیر منشی ہونا بھی کیا قیامت تھی۔ بگاڑتے تو کس برتے پر۔

ضرورت غالب کے ساتھ ساتھ قتیل پر کام کرنے کی بھی ہے، لکھنؤ میں مطبوعہ وغیر مطبوعہ مکمل مواد کی موجودگی کی نشاندہی سید مسعود حسن رضوی ادیب کر چکے ہیں کاش وہ یونیورسٹی یا غالباً کسی لائبریری کو منتشر نہیں مرتبہ مواد عطا کرتے تو یہ ایک بڑی خدمت ہوتی، اسلامیہ کالج قصور کے پرنسپل جناب غلام ربانی عزیز بھی ستم ظریف نکلے غالب کے خط کسی نے نذر کئے کہیں ڈال دیئے پھر پتہ نہ چلا کیا ہوئے۔

بات مرزا کی ہو رہی تھی جب تک جیا ناشاد جیا، بہت کم جیسا چاہا ویسا پایا، مرتے ہی بھاگ جاگ اٹھے اور اس وقت تک اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ نیا عنوان کوئی سوجھتا ہی نہیں، سید قدرت نقوی نے غالب کے مستعملہ انگریزی الفاظ چھانٹ کر سبھی دروازے بند کر دیئے صد سالہ برسی نے اردوئے معلیٰ سے راز و نیاز پر اکسایا، ورق گردانی کرتے ہوئے دور کی یہ سوجھی کیوں نہ مرحوم کی شگفتہ نگاری کے جس میں خشونت کی تلخی بھی موجود ہے چند منتخب "جواہر ریزے" ترتیب دے کر شہیدوں میں نام لکھوا دوں، عرف عام میں ان پر لیبل "گالی" کا بھی چسپاں ہو سکتا ہے۔ یعنی خطوں میں کس کس انداز سے کون کون تختۂ مشق بنا، غالب کی انفرادیت یہاں بھی قائم رہی۔ تحریری "گالیوں" کا یہ عالم ہے تو "منہ زبانی" خدا جانے کیا کیا کچھ بکتے ہونگے۔ تاہم نوبت جبر لیجیئے دہن بگڑا تک نہیں پہونچی یا پھر میں غلط کہتا ہوں،

شہروں میں کوّے اول تو درجہ عنقا کا رکھتے ہیں، اگر ہوں بھی تو وہ ایسے جری کہاں کہ ادھر آپ صحن میں کھلی ہوا

میں ناشتے کے لئے بیٹھے اور ان کی یلغار شروع ہو گئی، کائیاں ایسے کہ ادھر پیشانی پہ بل پڑے اور وہ ہوا ہوئے۔ نادیدے ایسے کہ منہ سے نوالہ چھین لینے کی تاک میں رہتے ہیں، بچے ان کے ہاتھوں زک اٹھا کر روتے پھرتے ہیں، مجھے اکثر کوّوں کو دیکھ کر خیال ہابیل قابیل کا آیا کرتا ہے، ہاتھاپائی تو بعد کی چیز ہے تو تکار کس زبان اور کن الفاظ میں ہوئی ہو گی، حالتِ غیظ و غضب میں سخت سست تو لیک دوجے کو کہا گیا ہو گا، وہ فی البدیہہ مذاکرات گالی کی تہمت سے آزاد تو نہ رہے ہوں گے، اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو "گالی" ہمیں ورثے میں ملی ہے، غم و غصہ، ہنسی اور خوشی تاریکی اور روشنی، علم و جہالت نیکی اور بدی کا ساتھ چولی دامن کا ہے بلکہ بات خدا اور رسول، انسان اور شیطان کے بغیر بھی کہاں بنتی ہے، جذباتِ لطیفہ کے اظہار کے ذرائع کی وسعت اور ہمہ گیری کے کیا کہنے۔ غزل، نظم، اخلاقیات، مذہبیات، ناول افسانہ ڈرامہ موسیقی سب اسی کے مظہر ہیں، "فاعل سماع کا انعقاد بھی روحانی لذت کا حصول اور کثافت کو دھونے کا ذریعہ ہے۔

جذباتِ کثیفہ کے اظہار کو بظاہر غیر ضروری قرار دیا گیا ہے مگر یہ وہ آتش فشاں ہے جو آپ ہی آپ پھٹ پڑتا ہے اس کے لاوے کی تپش دور دور تک اثر انداز ہوتی ہے، یوں تو بڑی بھاری بھرکم اٹھائے نہ بنے اور مقفّیٰ و مسجّع گالیوں کا ایک دفتر موجود ہے جس سے زبان و بیان کی وسعت عیاں ہے مگر چند ہلکے پھلکے نشتر بعض چہروں پر بڑے بھلے لگتے ہیں اور جی چاہتا ہے سے

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تحت اللفظ میں اپنا "مدعا" بیان کرتے ہیں، بہت سے گا بجا کر اپنا غم غلط کرتے ہیں بعضوں کا تکیہ کلام ہی مادر پدر آزاد چند ملائم و ناملائم الفاظ بن کر رہ جاتے ہیں جس کی زد میں بہن بیٹی تک اس کثرت اور بے تکلفی سے آجاتی ہیں کہ غور کیجئے تو حیرت ہوتی ہے، کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جو شب و روز منہمک اور مستغرق نئی نئی ترکیبیں اور نکتے پیدا کرنے میں رہتے ہیں اور اس بحر کی غواصی میں نت نئے لعل و گہر کا اضافہ کرتے ہیں، انہی میں ایک غالب نکتہ داں بھی ہے، مکتوب نگاری ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ جہاں اشعار پر بحث و نظر کے موتی رولتے تھے وہاں نجی خطوط میں ہلکا ہلکا لغاتِ نادرست کا ترشح بھی جاری رہتا اور یہ لطف دے جاتا ہے، آئیے آپ کو مرزا کی چڑھی ہوئی تیوریوں، "بدزبانی" اور کسی حد تک "دریدہ دہنی"، "دشنام طرازی" کا تماشا دکھاؤں، کہیں کہیں اپنے آپ پر بھی پھول برسائے ہیں۔

چڑا تو ہر غلط اور خلافِ مزاج بات سے ان کو تھی ہی مگر قتیل کا نام آتے ہی آتش زیر پا ہو جاتے کھتری بچہ سے کم یہ بات ہی نہیں کرتے تھے، اگر کسی نے کسی اور کا نام لیا تو وہ بھی بچ کر نہ نکل سکا، تفتہ کو لکھتے ہیں۔

<u>حیف کالنتہ ۔ دو جوتیاں</u>

" وہ شخص کہاں کا فارسی داں ہے اور عالم ہے کہ میں لڑکوں کی طرح بیت بحثی کروں۔ دو جوتیاں

آپ لگا دیں ایک جوتی تم سے لگوادی، میں برہان کا خاکا اڑا رہا ہوں، چار شربت اور غیاث اللغات کو حیض کالتہ سمجھتا ہوں ایسے گمنام چھوکروں سے کیا مقابلہ کروں گا (اردوئے معلیٰ حصّہ دوم ص۳۲)

ولد الزنا۔ زن جلب۔ مفسد۔ ملعون۔ لعنت۔ ولد الحرام

مرزا شہاب الدین احمد خاں نے کہیں سے چند اشعار نقل کرکے بھجوائے اور غالب سے نسبت کی تردید یا تصدیق چاہی، غیر معیاری اور مہمل اشعار کو اپنی طرف منسوب ہوتے دیکھ کر آپے سے باہر ہوگئے اور ایک ہی سانس میں کیا کیا کچھ لکھ گئے، مرزا اسے اپنی توہین سمجھتے تھے کہ معمولی اور ناموزوں افکار و خیالات فکرِ غالب تصور کئے جائیں۔

"یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں خدا جانے کس ولد الزنا نے داخل کر دیئے ہیں دیوان نو چھاپے کا ہے۔ متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں اور اگر حاشیہ پر ہوں تو میرے نہیں ہیں بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جاویں تو یوں سمجھنا کہ کسی ملعون زن جلب نے اصل کلام کو چھیل کر یہ خرافات لکھ دیئے ہیں، خلاصہ یہ کہ جس مفسد کے یہ شعر ہیں اس کے باپ پر اور دادا پر لعنت اور وہ ہفتاد پشت تک ولد الحرام اس کے سوا اور کیا لکھوں (اردوئے معلیٰ حصّہ اوّل ص۲۲۰)

میر مہدی کے نام دیوان اردو کے چھپ جانے کی نوید ہے، غلط سلط چھپ گیا لکھنوی چھاپہ خانوں کی تعریف کرنے کے بعد دلی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"دلی پر اور اس کے بانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت" (اردوئے معلیٰ حصّہ اوّل ص۱۱۴)

حکیم غلام نجف کو واسطہ بنا کر میاں فضل حسن سے شکوہ سنج ہوتے ہیں اس خط پر "خطوط غالب" مرتبہ مولانا غلام رسول مہر میں یکشنبہ، ۱۲ر نومبر ۱۸۶۵ء اور "اردوئے معلیٰ" مطبوعہ نامی گرامی مفید عام آگرہ، میں تاریخ تحریر یکشنبہ ۱۲ر نومبر ۱۸۶۱ء چھپی ہے، مستند نسخہ مہر صاحب ہی کا ہے۔

"ہائے قسمت اس قسمت پر لعنت کہ میاں فضل حسن میرے مربی و محسن نہیں اور پھر دلانے محرومی کہ مطلب برآری نہ ہو" (اردوئے معلیٰ جلد اول ص۱۷۵ خطوط غالب ص۳۹)

"جھوٹے پر لعنت، تو بھی کہہ، بیش باد" (اردوئے معلیٰ ص۱۲۶ جلد اول)

اپنی صفائی میں لکھا کہ تمہارے خط کا جواب لکھ چکا ہوں، قاضی عبد الجمیل کو لکھتے ہیں۔

"ایک صاحب نے مجھے آگرہ سے لکھا کہ یہ غزل بھیج دیجئے ع اسد اور لینے کے دینے پڑے، میں نے کہا لاحول ولاقوۃ اگر یہ میرا کلام ہو تو مجھ پر لعنت، اسی طرح زمانہ سابق میں ایک صاحب نے میرے سامنے یہ مطلع پڑھا

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے سن کر عرض کیا کہ صاحب جس بزرگ کا یہ مطلع ہے اس پر بقول اس کے رحمت خدا کی اور اگر میرا ہو تو مجھ پر لعنت" (اردوئے معلیٰ حصّہ اول ص۱۹۱)

تفتہ نے شبہ ظاہر کیا کہ قصیدہ لکھنے وقت نظیری کا قصیدہ پیش نظر رہا ہوگا۔ غالب کے بیان سے توارد کا پتا چلتا ہے

"بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اُس کے قوافی پیش نظر رکھ لئے ہوں" (اردوئے معلیٰ حصہ دوم ص۱۱)

نامرد - لعنت

لعنت کا ذکر کانی چلا، تفتہ نے کہیں لکھ دیا کہ اب تو آپ اچھے ہیں شراب دن میں بھی پی جا رہی ہے، سنی سنائی لکھنے کے نتیجے میں جلی کٹی سننا پڑی، حقیقت یہ تھی کہ مرزا کے پاؤں میں پیپ پڑی ہوئی تھی رات کی شراب سے بھی جی چرانے لگے تھے "تلوار زخمی، پنڈلی زخمی اس پر بھی کسی کے اچھا کہہ دینے کا اعتبار کر لیا،

"اگر وہ نامرد بے درد جھوٹا ہے تو اس پر ہزار لعنت اور اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر سو ہزار لعنت" (اردوئے معلیٰ حصہ دوم ص۲۵)

ملعون

تفتہ سے تعلق خاطر سب سے بڑھا ہوا تھا، بڑھاپے اور معذوری میں بھی اصلاح دیتے رہے کسی مرحلے پر اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں تمہاری خاطر سے یہ مشقت اٹھاتا ہوں ورنہ

"لاحول ولا قوۃ کس ملعون نے بسبب ذوق شعر اشعار کی اصلاح منظور رکھی" (اردوئے معلیٰ حصہ دوم ص۲۹)

جھوٹ اور جھوٹ بولنے والوں سے اظہار بیزاری

"میں جھوٹ سے بیزار ہوں اور جھوٹے کو ملعون جانتا ہوں کبھی جھوٹ نہیں بولتا" (اردوئے معلیٰ حصہ دوم ص۳۱)

احمق - پاگل

احمقوں کی جنت میں رہنا مثل مشہور ہے، دنیا کی بے رنگ تصویر میں رنگ آمیزی احمقوں کے دم سے ہے بے ضرر اور لطیف ترین "گالی" ہے، فارسی دانان ہند کو کبھی خاطر میں نہ لاتے تھے کیڑے نکالتے اور لکھتے،

"بات یہ ہے کہ اوچھی پونجی والے گمنام اپنی شہرت کے لئے مجھ سے لڑتے ہیں واہ واہ اپنے نامور بنانے کو ناحق احمق بگڑتے ہیں"
(اردوئے معلیٰ حصہ اول ص۹)

اپنے شاگردوں کا دل رکھنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ میاں داد خاں سیاح پر ایک معاصر رحیم بیگ نے قلم اٹھایا، اس کا ذکر خطوں میں آیا جواباً لکھا،

"وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملائے مکتب دار کا خط ہے رحیم بیگ اُس کا نام میرٹھ کا رہنے والا، کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے" (اردوئے معلیٰ حصہ اول ص۲۲)

نواب سعید الدین شفق نے کسی کے لئے تعارفی خط کی سفارش کی لیکن یہ صراحت نہیں تھی کہ خط کس کے نام اور کیا کیا کچھ لکھا جائے گا مرزا صاحب رقمطراز ہیں ۔

"منشی صاحب کو خط بھیج دوں اُن کے نزدیک احمق نہوں کہ کس امر موہوم مجہول میں مجھ کو لکھا ہے" (اردوئے معلیٰ جلد اول ص۲۹)

تفتہ نے سرنامہ پہ "چاوِ گرما بہ" لکھا مرزا نے فرمایا یہ تم نے "حمام کے کنویں" کی مٹی خراب کی ہے میں اگر بلی ماروں کو محلہ جگر بہ کشاں لکھوں تو کیسا رہے، یا ایلی کے محلے کو "محلہ تمر ہندی"، کیونکہ لکھیں گے، بہرحال

"ناچار تمہاری خاطر سے احمق بننا قبول کیا اور وہی لفظ مہمل لکھ کر خط بھیج دیا ہے" (ماہنامہ نقوش لاہور جنوری ۶۳ء صفحہ ۹)

مرزا، شعرائے ایران کے علاوہ خسرو کو بھی سند مانتے تھے رودکی و فردوسی سے لے کر جامی اور جامی سے صائب و کلیم تک کسی نے فرہنگ مرتب نہیں کی اس لئے ہندیوں کا فرمایا ہوا کیونکر مستند ٹھہراتے، صاحب برہان قاطع پر عتاب ملاحظہ فرمائیے۔

"ان سب فرہنگ لکھنے والوں میں یہ دکن کا آدمی یعنی جامع برہان قاطع احمق اور معوج الذہن ہے مگر قسمت کا اچھا ہے مسلمان اس کے قول کو آیت اور حدیث جانتے ہیں اور ہندو اس کے بیان کو مطالب مندرجہ بید کے برابر مانتے ہیں" (اردوئے معلی جلد دوم ص ۴۹)

غالب "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" کے قائل نہیں تھے۔ اگر کوئی غلط سلط حوالے نقل کر کے ان سے رجوع کرتا تو بے تکلف لکھتے۔

"یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ حق ہے کیا آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے" (اردوئے معلی جلد دوم ص ۲۶)

"زمان و زمانہ کو میں پاگل ہوں جو غلط کہوں گا۔"

بے حیا

برہان قاطع کے سلسلے میں جو ادبی معرکہ رہا اس میں مرزا نے بڑے چڑچڑے پن کے مظاہرے کئے ملاحظہ فرمائیے۔

"میں اس خرافات کا جواب کیا لکھتا مگر ہاں سخن فہم دوستوں کو غصہ[1] آ گیا ایک صاحب نے فارسی میں اس کے عیوب ظاہر کئے دو طالب علموں نے اردو زبان میں دو رسالے جدا جدا لکھے دانا ہو اور منصف ہو محرق کو دیکھ کر جان گئے کہ مولف اس کا احمق ہے اور جب وہ احمق دافع ہذیان و سوالات عبد الکریم اور لطائف غیبی کو پڑھ کر متنبہ نہ ہوا اور محرق کو دھو نہ ڈالا تو معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے"۔ (اردوئے معلی جلد اول ص ۲۷)

بے حیا، کا استعمال اپنی ذات کے لئے بھی دو چار جگہ پایا گیا ہے مثلاً

"بے حیا ہوں سال گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ کر مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔"

"یہ زمین قدسی علیہ الرحمۃ کے حصہ میں آ گئی ہے میں اس میں کیوں کر تخم ریزی کروں اور اگر بے حیائی سے کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤں تو اس شعر کا جواب کہاں سے لاؤں ؎

ہرگز نتواں گفت دریں قافیہ اشعار　　　بیجاست برادر اگر از من گلہ دارد" (ج ۱، ص ۳۱۶)

"میں بے حیا بعافیت مرا اچھا ہونے لگا عوارض میں تخفیف ہے طاقت آتی چلی ہے" (ج ۱ - ص ۳۲۱)

---

[1] سخن دریں است ۔ انمیں)

اس کے علاوہ بھی اپنی شان میں طرح طرح سے "گستاخیاں" کی ہیں یہ بھی یکجا ہو جائیں تو برا کیا ہے

"میں بھی ایک ذلیل، علیل، فقیر، حقیر آدمی ہوں، (حصہ اول اردوئے معلی صفحہ ۱۳)

"چھیاسٹھ برس کی عمر میں اس طرح کی شرمساریاں اور روسیاہیاں بہت اٹھاتی ہیں جہاں ہزار داغ ہیں ایک ہزار ایک سہی،" صفحہ ۱۴

"خرف ہوں پوچ ہوں عاصی ہوں، فاسق ہوں روسیاہ ہوں یہ شعر میر تقی کا میرے حسب حال ہے۔"

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم " ج ا صفحہ ۲۵

"بہر حال مجھ کو کہ نالائق و ذلیل ترین خلائق ہوں اپنا دعاگو سمجھتے رہو،" بنام تفتہ ج اول صفحہ ۶۱

"ملکہ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا،" صفحہ ۹۱

"میں کم بخت یہ بھی نہیں جانتا کہ آغا جان کہاں رہتے ہیں،" صفحہ ۱۲۴

"دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں میرٹھ میں مصطفیٰ خاں سلطان جی میں مولوی صدر الدین خاں بلی ماروں میں سگِ دنیا موسوم اسد تینوں مردود و مطرود و محروم مغموم

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسمان سے بادۂ گلفام گر برسا کرے (صفحہ ۱۳۸ ج اول)

انگریز کے مکمل تسلط کے بعد دلی کی تباہی کا رونا رو رہے تھے اسی میں ذکر ان بقیہ "تین اہل اسلام" کا بھی نکل آیا،

پشم اکھڑ جانا

جد وجہد آزادی ۱۸۵۷ء میں غالب ہی نہیں ہر مسلمان پر قیامت توڑی گئی، یوں تو مرزا کے بہت سے خطوں میں دلی اور مسلمانوں کی تباہی کا ذکر ہے مگر یوسف مرزا کے نام اپنی اور دوسروں کی بے بسی کا نقشہ بھی اپنے انداز خاص میں کھینچا ہے جی چاہتا ہے اس خط کا بڑا حصہ آپ بھی پڑھ لیں۔

"زبان زدِ خلق ہے کہ قدیم نوکروں سے باز پرس نہیں، مشاہدہ اس کے خلاف ہے اسے کوئی دن ہوئے کہ حمید خاں گرفتار آیا ہے پاؤں میں بیڑیاں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں حوالات میں ہیں دیکھئے حکم اخیر کیا ہو صرف لونڈ رائے کی کار مختاری پر قناعت کی گئی جو کچھ ہوتا ہے وہ ہو رہے گا ہر شخص کی سرگزشت کے موافق حکم ہو رہے ہیں نہ کوئی قانون ہے نہ قاعدہ ہے نہ نظیر کام آئے نہ تقریر پیش جائے ارتضیٰ خاں ابن مرتضیٰ خاں کی پوری دو سو روپے کی پنشن کی منظوری کی رپورٹ گئی اور ان کی دو بہنیں سو سو روپیہ مہینہ پانے والیوں کو حکم ہوا کہ تمہارے بھائی مجرم تھے تمہاری پنشن ضبط، بطریق ترحم دس دس روپیہ مہینا تم کو ملے گا ترحم یہ ہے تو تغافل کیا ہو گا میں خود موجود ہوں اور حکام صدر کار دستناس، پشم نہیں اکھڑ سکتا، ۵۳ برس کا پنشن تقرر اس کا بہ تجویز لارڈ لیک و منظوری

گورنمنٹ اور پھر نہ ملاپ نہ ملے گا، خیر احتمال ہے ملنے کا، جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں، اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا، اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں بعد اس کے نہ کہیں سے قرض کی امید ہے نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل اگر رامپور سے کچھ آیا تو خیر ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون، بعض لوگ یہ بھی گمان کرتے ہیں کہ اس مہینے میں پنشن کی تقسیم کا حکم آجائے گا دیکھئے آتا ہے یا نہیں اگر آتا ہے تو میں مقبولوں میں ہوں یا مردودوں میں۔"

(اردوئے معلیٰ جلد اول ص۲۵۵)

اس خط میں انسانی سیرت اور ملکی حالات کا ایک دفتر پنہاں ہے، ترحم انگریزی پر طنز بھی کرتے ہیں محتاج بھی ہیں، جذبہ توکل بھی موجود ہے، منتظر احکام بھی ہیں۔ ڈرتے بھی ہیں کہیں مردودوں میں نہ گنا جاؤں، جیب کی حالت کا پتا بھی ملتا ہے اور گھر کا سامان گروی رکھنے کا بھی، زعم یہ بھی ہے کہ حکام میں روشناس ہوں، خفت یہ کہ پشم بھی نہیں اکھیڑ سکتا۔ یعنی کچھ بس نہیں چلتا قرض نہ ملنے کا خدشہ الگ، آس اور نراس کے کیسے عبرت انگیز پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں اور یہ عطیہ ہے غالب کی عاف گوئی کا کوئی کچھ کہے میں تو یہی کہوں گا اپنی حالت کا جس ایمانداری سے تجزیہ کیا ہے اردو دنیا میں اس کی مثال شاذ ہی ملے گی، ملکی حالت آپ نے دیکھ لی ہر شخص بیڑی ہتھکڑی سے سجا ہوا ہے، عورتوں تک کو نہیں بخشا گیا، دو وقت کی روٹی جڑنا عذاب ہو گیا ہوگا سوکے دس ہوں گے تولا محالہ اسے آفتِ ناگہانی کہنا پڑتا ہے،

بت در

مرزا کی خوش گفتاری کے ساتھ ساتھ دلی کا مرثیہ بھی پڑھتے چلیے، دلی کا بھی اور مسلمانوں کا مرثیہ بھی،

"بڑے دریبہ کا دروازہ ڈھایا گیا قابل عطار کے کوچہ کا بقیہ مٹایا گیا، کشمیری کٹرہ کی مسجد زمین کا پیوند ہو گئی اسٹرک کی وسعت دوچند ہو گئی اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہندو کے ڈیوڑھیوں کے جھنڈیوں کے پرچم پھراتے ہیں ایک نیبر زدر آور اور بیلتن بنڈ پیدا ہوا ہے مکانات جا بجا ڈھاتا پھرتا ہے فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو گلدستے ہیں جس کو عوام گمزی کہتے ہیں ان میں سے ہلا ہلا کر ایک کی بنا ڈھا دی اینٹ سے اینٹ بجا دی واہ رے بت ندیہ زباد تی الخ"۔ (اردوئے معلیٰ جلد اول ص۲۹۳)

آپ نے دیکھا بے زبان در و دیوار کو بھی کھیت کیا گیا اور محراب و منبر بھی یکساں زد میں آئے۔

بھوت، پلید، غول (جن حرامزادہ) نامعقول

میاں داد خاں سیاح کے نام ایک خط مورخہ ۱۱ جون ۱۸۶۰ء میں "قلعہ کے لاہوری دروازہ سے شہر کے لاہوری دروازہ تک ہے سراسر بگڑ گئی (صورت) اور بگڑتی جاتی ہے"، لکھ کر کسی عظیم الدین کو کوسا ہے۔ جب دیوان نے تو چھاپنے کے لیے گیا مگر چھپوایا کچھ نہیں الٹے مسودہ کی واپسی میں بھی لیت و لعل کرنے لگا،

"عظیم الدین جس نے مجھ سے دیوان منگا بھیجا آدمی نہیں ہے بھوت ہے، پلید ہے۔ غول ہے تمہ مختصر سخت

نامعقول ہے "۔ (اردوئے معلی جلد اوّل ص ۱۳)

ماں مرے

غالب نے ایک قصیدہ نصیر الدین حیدر کی شان میں لکھا، خود تو نہ جا سکے مختلف واسطوں سے گزرا تا۔ پانچ ہزار منظور ہوئے یہاں پانچ روپے بھی نہ پہونچے، ناسخ کو لکھا کہ میرے ساتھ یہ معاملہ ہوا ہے اُس نے لکھا تم ایک خط اس مضمون کا لکھو کہ جو پانچ ہزار میرے قصیدے کے منظور ہوئے ہیں لے غاصبین سے اگلوا لوں گا، اِدھر سے خط چلا اُدھر نصیر الدین حیدر اس جہان فانی سے چلے اس قصہ کو برسوں بعد تفتہ نے کسی خط میں چھیڑا۔ ایک خط لکھنؤ اس زمانہ میں لکھا تھا، یا صرف خاقانی کا شعر جس کے نام یہ شعر لکھا گیا تھا اس کا پیشہ اور وطنیت وغیرہ تفتہ زیر بحث لائے تو مرزا نے لکھا۔

"صاحب مجھے اس بزرگوار کا معاملہ اور یہ جو تم نے اس کا وطن اور پیشہ اب لکھا ہے سابق کا سب لکھا ہوا سب یاد ہے میں نے اس کو دوست بطریق طنز لکھا ہے بہرحال وہ جو میں نے خاقانی کا شعر لکھ کر اس کو بھیجا اس کی ماں مرے اگر میرے اُس خط کا جواب لکھا ہو بڑا پرانا قصہ تم نے یاد دلایا" (جلد اول ص ۴۶)

اوچھا

میر مہدی مجروح کے شاگرد خاص تھے ایک کتاب عاریتاً دے کر بار بار تقاضا کرنے لگے مرزا نے جل کر لکھا۔

"کتنے اوچھے ہو مصطلحات الشعرا مصطلحات الشعرا بھائی وہ کتاب تمہاری ہے میں نے غصب نہیں کی۔ میرے پاس متعار ہے دیکھ چکوں گا بھیج دوں گا تقاضا کیوں کرو" (اردوئے معلی جلد اوّل ص ۱۳۰)

دماغ چلنا

مرزا چونکہ طرز نو کے موجد تھے اس لئے جب کوئی ان کے مکالمانہ انداز پر چونکتا تو یہ آڑے ہاتھوں لیتے،

"تمہارا دماغ چل گیا ہے لفافہ کو کریدا کر دسعہ وہ کو بار بار دیکھا کر د باؤ گے کیا۔ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں، یہاں خیریت ہے وہاں کی عافیت مطلوب ہے" (اردوئے معلی جلد اول ص ۱۴۱)

خبیث النفس، حاسد، احمق

وہ کون بزرگ تھے جن کی عزت غالب کو اس قدر مطلوب تھی کہ نواب علائی کو بطور خاص لکھا کہ تم کہیں اس کو سربازار بے حرمت نہ کرنا کہ یہ "خلاف شیوۂ مومنیں ہے"، طرح طرح کے "خطاب" دے کر اس کی جان بخشی کا جواز پیدا کرتے ہیں۔

"جو تم نے اس مدبر کے صفات لکھے سب سچ ہے، احمق، خبیث النفس، حاسد، طبیعت بری سمجھ بری قسمت بری

(اردوئے معلی جلد اول ص ۳۲۵)

"حضرت وہ شرفنامہ نہیں ہے کسی احمق نے شرفنامہ میں سے کچھ لغات اکثر غلط کمتر صحیح چن کر جمع کئے ہیں (اردوئے معلی جلد اول ص ۳۴۹)

دلی کا مرثیہ اور مجسٹریٹ کلکٹر اجرٹن کا ماجرا

"آبادی کا یہ رنگ ہے کہ ڈھنڈورا پٹوا کر ٹکٹ چھپوا کر اجرتن صاحب بہادر لبطریق ڈاک کلکتہ چلے گئے دلی کے حقاجو باہر پڑے ہوئے ہیں منہ کھول کر رہ گئے اب وہ جب معاودت کریں گے تب شاید آبادی ہو گی یا کوئی اور نئی صورت نکل آئے۔ (اردوئے معلی حصہ اول ص ۱۳۵)

..تیا

شہاب الدین احمد خاں ثاقب کو قلم اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

"میاں وہ قاضی تو مسخرہ ..تیا ہے ان کا خط دیکھ لیا، خیر ملن علاؤالدین خاں کا خط گنٹہ بھر بھانڈ کے طائفہ کا تماشا ہے" (اردوئے معلی حصہ اول ص ۲۲۲)

..خطوط غالب، مرتبہ مولانا غلام رسول مہر، میں لفظ ".. تیا" کتابت نہیں ہوا،

فروہا یہ تقیل سے تو جلے ہی رہتے تھے صاحب غیاث اللغات نے بھی اپنا ماخذ قتیل کو لکھا، اس سے زیادہ کی ضرورت ہی کیا تھی ۔

"یہ کون ہے ایک معلم زنانہ رامپور کا رہنے والا فارسی سے ناآشنائے محض" (ص ۱۲۱ اردوئے معلی حصہ اول)

قرم ساق

یہ لطیفہ غالب کی زبانی سنیئے "لطیفہ نشاط انگیز"

"ڈاک کا ہرکارہ جو بلی ماروں کے خطوط پہنچاتا ہے ان دنوں میں ایک بنیا پڑھا لکھا حرف شناس کوئی فلاں ناتھ ڈھمک داس ہے، میں بالا خانہ پر رہتا ہوں حویلی میں آکر اس نے داروغہ کو خط دے کر مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مبارک ہو آپ کو جیسا کہ دلی کے بادشاہ نے نوابی کا خطاب دیا تھا اب کابل سے خطاب کپتانی کا ملا، حیران کہ یہ کیا کہتا ہے سرنامہ کو غور سے دیکھا، کہیں قبل از اسم مخدوم نیاز کیشان لکھا تھا اس قرمساق نے اور الفاظ سے قطع نظر کر کے کیشان کو کپتان پڑھا" (اردوئے معلی حصہ اول ص ۲۲۶)

الو

اکثر دیکھا گیا ہے کہ مشہور شعرا کی غزلوں میں بھرتی کے اشعار لوگ گاتے پھرتے ہیں غالب بھی نہ بچ سکے ۔

"مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی الو کے۔ جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ دو شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو" (اردوئے معلی حصہ اول ص ۲۲۳)

گھاگھس

بنیا فارسی دانی کا بیانگ دہل اعلان، اور خود اعتمادی کے مظاہرے ۔

"ہندی لوگ جو دادِ فارسی دانی میں دم مارتے ہیں وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں جیسا وہ گھاگس، اَلّو عبدالواسع ہانسوی لفظ نامراد کو غلط کہتا ہے۔" (اردوئے معلیٰ حصہ دوم ص۲۱)

"زمان لفظ عربی۔ ازمنہ، جمع دونوں طرح فارسی میں مستعمل، زمانے، یک زمان، ہر زمان، زمان زمان، درین زمان دراں زمان، سب صحیح اور فصیح، جو اس کو غلط کہے وہ گدھا"، (اردوئے معلیٰ حصہ دوم ص۲۱)

خطابات تو آپ نے سینکڑوں سنے بھی ہوں گے پڑھے بھی ہوں گے، مرزا کی جدّت طبع یہاں بھی بازی لے گئی،

"بھائی فضلو جن کو میر کاظم علی بھی کہتے ہیں، اور ہم نے احتشام الدولہ خطاب دیا ہے وہ تین پاؤ کھجوریں اور تین کالوٹا اور دوست کی سیاں لے کر بھٹیارے کے ٹٹو پر سوار ہو کر الور روانہ ہوئے" (اردوئے معلیٰ حصہ دوم ص۲۵)

"احتشام الدولہ بھائی فضلو میر کاظم علی بہادر کیا جانے کتاب کس کو کہتے ہیں"۔ (اردوئے معلیٰ حصہ اول ص۲۵۱)

حرفِ آخر یہ کہ

"اور یہ اُلو کا پٹھا قتیل مغفوتکدہ و شفقکدہ و نشترکدہ اور ہمہ عالم و ہمہ جا کو غلط کہتا ہے"۔ (اردوئے معلیٰ حصہ دوم ص۲)

(ماخذ (۱) اردوئے معلیٰ حصہ اوّل و دوم ۱۹۱۴ء (۲) خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہرؔ طبع سوم ۱۹۶۲ء (۳) قتیل اور غالب از سید اسد علی انوری فریدآبادی طبع اول ۱۹۳۹ (۴) ماہنامہ نقوش لاہور جنوری ۱۹۶۲ء)

شیخ محمد اکرام ایم، اے

عرفانیات غالب

انسان جب کسی چیز کی خواہش کرتا ہے اور اسے نہیں پاتا تو اس کی مایوسی قدرتی امر ہے خواہ یہ ناکامی خواہشات کی فراوانی سے ہو یا نامساعد اتفاقات سے، لیکن زندگی میں مسلسل اضطرار اور بے چینی نبہ نہیں سکتی، عام طور پر مایوس اور ناکام لوگ اپنی ناکامیوں کو قضا و قدر کے سر پر ڈال کر سمجھ لیتے ہیں کہ یہ مقدر کا قصور ہے۔ مرزا کی غمزدہ طبیعت نے بھی ایک طرح کا سکون اور توازن حاصل کر لیا تھا لیکن رسمی طور پر قسمت کو ملزم قرار دے کر نہیں بلکہ اس نگاہ ژرف بیں کی مدد سے جو ان کی اپنی ناکامیوں سے آگاہ تھی۔ تو دوسروں کی ناکامیاں اور مایوسیاں بھی اس سے پنہاں نہ تھیں۔ انسان جب یہ دیکھتا ہے کہ زمانے کے ترکش میں ہزاروں تیر ہیں۔ ایک سے ایک زہریلا اور ان سے کوئی محفوظ نہیں تو طبیعت میں ایک طرح کا سکون آجاتا ہے۔ غالب کے کئی اشعار میں اس خیال کا اظہار ہے۔

تابش دہلوی

قصیدہ

بہ بارگاہ حضرت غالبؒ در زمین غالبؒ

جب طلسمِ فکرِ بازی گر کھلا — چشمِ حیرت پر عجب منظر کھلا
حسنِ پنہانی سے تا حدِ نظر — بابِ نظّارہ ہے سرتاسر کھلا
دشت و در میں سیم و زر کی سی نمود — یم بہ یم اِک مخزنِ گوہر کھلا
ہے بصارت خیرگی ساری فضا — ذرّہ ذرّہ ہے مہِ وخاور کھلا
اِس طرح چلتی ہے بادِ برشگال — ہر طرف ہے نغمگی کا در کھلا
اِس طرح آتی ہے پھولوں کی شمیم — ہر نفس ہے طبلۂ عنبر کھلا
مستیٔ موسم سے مشکل ہے یہ فرق — گُل کھِلا شبنم سے یا ساغر کھلا
کس لئے یہ بارشِ جود و سخا — کیوں درِ انعام ہے ہم پر کھلا
کیوں ملا ہے ہدیہ لطف و عطا — کس لئے دستِ کرم پرور کھلا
ہم نے لطفِ خاص کی دیکھی جو فال — "غالب" اک نامِ سخن گستر کھلا
یہ اسی کے نام کی تاثیر ہے — فیض کا دروازہ جو کھُل کر کھلا
جشنِ صد سالہ کو اس کے دیکھ کر — سب فریبِ فرِّ اسکندر کھلا
وہ اسد اللہ خاں غالب کہ ہے — "جو دلی پوشیدہ اور کافر کھلا"
جس کے دیواں کے تمام اوراق میں — باغِ معنی کا پڑا ہے در کھلا
کعبۂ فکرِ جمیل ایک ایک نظم — نثر میں بتخانۂ آزر کھلا

فرشِ پا انداز جس کے مہ فلک — جس پہ ہے ہر رازِ ہفت اختر کھلا
تا ثریا ہے رسا جس کا خیال — فکر پر جس کے در ہے در کھلا
جس کا دل ہے کاشفِ الہام و غیب — جس پہ ہے جبریل کا شہپر کھلا
فیض سے اس کے غزل ایسی سناؤں — سب کہیں اک گنجِ سیم و زر کھلا

غزل

بندِ غم مشکل سے مشکل تر کھلا — ہم سے جب کوئی پری پیکر کھلا
مل گئی وحشی کو سودا سے نجات — در کھلا دیوار میں یا سر کھلا
جاں ستانی کے نئے انداز ہیں — ہاتھ میں غمزے کے ہے خنجر کھلا
میری وحشت نے نکالے جب سے پاؤں — ایک صحرا صحن کے اندر کھلا
دیکھنے میں وہ نگاہِ لطف تھی — کس سے پوچھیں زخمِ دل کیونکر کھلا
کوئی جادہ نہ منزل ہے کوئی — سب فریبِ راہی و رہبر کھلا
ہے قیامت اس کی مژگاں کا خیال — رکھدیا ہے دل میں اک نشتر کھلا
یہ زلیخائی کہ یوسف کے لئے — مصر کا بازار ہے گھر گھر کھلا

نا امیدی سے بندھی "تابش" امید
ابرِ غم دل پر بہت گھر کر کھلا

پھر ہوا اسکی ثنا خوانی کا شوق — پھر مسِ فکر کا جوہر کھلا
اس پہ ہر رمزِ نہفتہ واشگاف — اس سے ہر عقدہ کھلا بہتر کھلا
اس کی ہر تخئیل جنت آفریں — ذہن اس کا صورتِ کوثر کھلا
ہر دقیقہ کس قدر جدت طراز — ہر لطیفہ کتنا کیف آور کھلا
ہر اشارہ داستاں در داستاں — ہر کنائے میں ہے اک دفتر کھلا
خامشی میں اس کی واعقدِ خرد — اس کی باتوں سے دلِ مضطر کھلا
خوشہ چیں ہم بھی اسی خرمن کے ہیں — ہے اسی کے فیض کا لنگر کھلا

اہلِ دل کی فیض یابی کے لئے
رکھیو یارب اسکو تا محشر کھلا

پرنسپل میمن عبدالمجید سندھی ایم اے
اسلامیہ کالج ، سکھر

غالب کے ہمعصر

سندھ کے اردو شعرا

اکبر کے زمانے میں سندھ مغلوں کے قبضہ میں آیا اور مغلوں کی طرف سے سندھ میں گورنر آتے رہے۔ ان کے ساتھ کچھ دوسرے لوگ بھی آتے رہے جن میں کچھ ایسے شعرا بھی تھے جو قدیم اردو میں شعر کہتے تھے ۔ اس طرح یہاں فارسی شاعری کے ساتھ اردو شعر گوئی کا بھی رواج ہوا اور سندھی شعرا بھی قدیم اردو میں شعر کہنے لگے۔ یہ رواج آہستہ آہستہ پھیلتا گیا۔ چنانچہ کلہوڑوں اور ٹالپوروں کے زمانے میں سندھ میں بہت سے اردو شعرا کے نام ملتے ہیں جن میں مندرجہ ذیل کے نام قابل ذکر ہیں ۔

"میر علی شیر قانع (۱۷۲۷ء — ۱۷۸۸ء) منشی پرسرام مشتری (وفات اٹھارھویں صدی کا آخر) سید ثابت علی شاہ (المتوفی ۱۸۱۰ء) شاہ پیر بن روحل سچل سرمست (۱۷۳۹ء - ۱۸۲۹ء) ، سید ضیاء الدین ضیا ٹھٹوی (اٹھارویں صدی) نواب ولی محمد خان ولی لغاری (المتوفی ۱۸۱۱ء) "

خود ٹالپوروں میں سے بھی کچھ حضرات سندھی اور فارسی کے ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ میر مراد علی خان علی (وفات ۱۸۳۳ء) ، میر نصیر خان (۱۸۴۴ء) اور میر صوبیدار خان (۱۸۴۵ء) کا اردو کلام بھی ملا ہے ان کی شاعری کا زمانہ غالب کی شاعری کے زمانہ سے پہلے کا ہے یہ غالب کی ابتدائی زندگی کا زمانہ تھا اور ان لوگوں کا بڑھاپا۔ ٹالپوروں کے کتب خانوں سے فارسی دواوین کے ساتھ اردو شعرا کے دیوان بھی دستیاب ہوئے ہیں[۱]۔

غالب کے زمانے میں سندھ میں اردو شاعری کا اچھا خاصہ رواج معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانہ کے سندھ کے اردو شعرا کے

---

[۱] - ٹالپور حاکموں کے علمی کارنامے ۔ مرزا گل حسن احسن کربلائی ماہنامہ " نئی زندگی فروری ۱۹۵۴ء ص ۱۲ ۔

ہم تین دور مقرر کر سکتے ہیں ایک وہ دور جو غالب کی ابتدائی زندگی کا دور ہے ؛ دوسرا غالب کے قریب قریب ہم عصر شعرا کا دور ہے اور تیسرا وہ دور جب غالب کا بڑھاپا تھا اور یہاں کے شعرا کی جوانی کا زمانہ تھا۔

(پہلا دور)

۱۔ میر مراد علی خاں علی :- سندھ میں ٹالپور حکومت میر فتح علی خاں نے ۱۷۸۲ء میں قائم کی، جن کی وفات کے بعد میر غلام علی خاں ۱۸۰۲ء میں تخت نشین ہوئے۔ ان کے بعد میر کرم علی خاں ۱۸۱۲ء میں اور میر مراد علی خاں علی ۱۸۲۸ء میں سندھ کے حکمراں بنے۔

میر مراد علی خاں کا لقب "سرکار بہادر" اور تخلص علی تھا۔ اس حکمراں کو فارسی شاعری سے خاص دلچسپی تھی ان کا فارسی کا مکمل دیوان موجود ہے۔ فارسی کے علاوہ ان کا کچھ اردو کلام بھی ملتا ہے۔ ۶ جمادی الثانی ۱۲۴۹ء مطابق ۱۸۳۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اردو غزل سے کچھ اشعار ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں (۱)

مجھ پر ہے احسان گرانبار صنم کا
میں کیا کہوں میں تو ہوں خریدار صنم کا
نکلا جو کبھی مہر مبین ابر سیہ سے
یاد آیا مجھے چہرۂ گلنار صنم کا
کیا مرد کو نسبت قد موزوں سے کوئی نے
وہ خود ہے گرویدۂ رفتار صنم کا
ہے عرض علی کا تری سرکار میں مولا
اب دکھلاؤ جلدی مجھے دیدار صنم کا

۲۔ میر نصیر خاں :- میر مراد علی خاں کے بعد میر نور محمد خاں اور ان کے بعد ۱۸۴۱ء میر نصیر خاں تخت نشین ہوئے۔ میر نصیر خاں میر مراد علی خاں کے فرزند تھے۔ ۱۴ محرم ۱۲۱۹ھ میں حیدرآباد کے قلعے میں ان کی ولادت ہوئی سندھ فتح کرنے کے بعد انگریزوں نے ان کو ۱۷ فروری ۱۸۴۳ء کو نظر بند کیا اور سندھ سے جلاوطن کر کے، بمبئی، پونہ، ساسور اور کلکتہ میں نظر بند رکھا۔

میر نصیر خاں بہت بڑے علم دوست تھے۔ ان کے زمانے میں حیدرآباد میں باکمال علما اور بلند پایہ شعرا کی بڑی تعداد موجود تھی۔ خود بھی شاعر تھے اور جعفری تخلص کرتے تھے، فارسی کے علاوہ سندھی، اردو اور سرائیکی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کی

---

(۱) "میر مراد علی خاں کا علمی شوق" مرزا گل حسن احسن کربلائی، نئی زندگی، نومبر ۱۹۵۴ء

مندرجہ ذیل تصنیفات معلوم ہوئی ہیں۔

(۱) دیوان فارسی ۱۲۳۳ھ (۲) مثنوی مرزا و صاحبان (فارسی) ۱۲۲۵ھ، نقاش میر حسین شیرازی (۳) مختار نامہ تقفی ۱۲۴۱ھ، نقاش میر حسن شیرازی (۴) سفر نامہ جعفری (نظم میں) ۱۲۶۰ھ (۵) دیوان جعفری اردو ۱۲۶۱ھ (۶) خطوط جعفری (فارسی) [1]

کلکتہ کے قید خانہ میں، ربیع الثانی ۱۲۶۱ھ کو میر صاحب نے وفات پائی۔ میر صاحب نے اردو دیوان سا سور ادر کلکتے کی قید کے زمانے میں تصنیف کیا اور اس میں ان کے قید کے زمانے کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی ملتی ہے میر صاحب نے قید کی تکالیف کا ذکر بھی کیا ہے اور سندھ واپس پہنچنے اور دوبارہ تخت حاصل کرنے کی دعائیں بھی مانگی ہیں۔ دیوان میں ۱۲۲ غزلیں، ۸ مسدس، اور ۳ مخمس ہیں۔ ان کے علاوہ اس میں ۲۰ فارسی غزلیات اور ایک فارسی مخمس بھی شامل ہے۔ ایک اردو غزل نمونہ کے طور پر درج کی جاتی ہے

میرا سینہ تو ہے گنج سعادت عشق جاناں کا
بسر ہے بہر سجدہ شکر کرتا ہوں میں سبحاں کا

پڑا ہوں بستر غم پر نہیں گر پلو چھینے والا
ترا دیدار چارہ ہے دل بیمار ہجراں کا

کروں تعریف قد کی یا کروں زلف پریشاں کی
زباں سے کچھ بیاں ہوتا نہیں اس شاہ خوباں کا

ہوئی ہیں شرمگیں آنکھوں سے تیری چشم آہو بھی
خجل ہوتا ہے تیری رخ سے رخ خورشید تاباں کا

دعائے جعفری صبح و مسا گر ہے تو بس یہ ہے
کہ روضہ دیکھ لوں میں یا خدا شاہ خراساں کا

۳۔ **میر صوبیدار خان**:۔ میر نور محمد خان نے میر صوبیدار خان کو بھی حکومت کے کاروبار میں شامل کیا تھا۔ ان کا لقب حشمت مدار" اور تخلص میر تھا۔ ۹ محرم ۱۲۱۷ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔ میر صاحب کو انگریزوں نے کلکتہ میں قید رکھا تھا جہاں ۱۴ رجب ۱۲۶۲ھ کو ان کی وفات ہوئی کہ میر صاحب کو علم و ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ خود بھی شاعر اور صاحب تصنیف و تالیف تھے۔ ان کی مندرجہ ذیل تصنیفات معلوم ہوئی ہیں۔ (۱) دیوان میر فارسی ۱۲۴۰ھ (۲) فتح نامہ سندھ فارسی

---

[1] میر نصیر خان کا علمی شوق۔ مرزا حسن احسن کربلائی "نئی زندگی" دسمبر ۱۹۵۴ء [2] نئی زندگی، نومبر ۱۹۵۴ء

۱۲۴۴ھ (۳) سیف الملوک منظوم فارسی ۱۲۴۷ھ (۴) خسرو شیریں منظوم فارسی ۱۲۵۱ھ (۵) قصہ ماہ مشتری منظوم فارسی ۱۲۵۲ھ (۶) جدائی نامہ سندھ منظوم فارسی ۱۲۶۰ھ ان کے علاوہ آپ کا اردو اور سندھی کلام بھی ملتا ہے، ذیل میں ان کے ایک اردو غزل سے کچھ اشعار نقل کئے جاتے ہیں[1]

اے دل ہے سنی تو نے تو اخبار محبت　　کیوں مجھ کو پسند آ گیا آزار محبت
کیوں آیا نہ اب تک وہ کوئی اس سے یہ پوچھے
ہے اب تو کوئی دم کا یہ بیمار محبت
شیریں سخن ختم ہوئی تیری لبوں پر
بے مثل ہیں یہ لعل شکر بار محبت
دعوائے محبت سے کانٹوں میں الجھنا
کیوں مدعی بنتا ہے گراں بار محبت

۴۔ **سید غلام علی گوآ ہاشمی** :۔ ٹالپوروں کے زمانہ میں بڑی عزت اور احترام سے رہتے تھے۔ میر حسن علی کے دربار سے وظیفہ ملتا تھا۔ عالم، فاضل اور شاعر تھے اور آخوند روشن احمدی اور آخوند روشن حیدر آبادی کے شاگرد تھے اردو میں بھی شعر کہتے تھے لیکن کوئی نمونہ نہیں مل سکا ہے[2]

۵۔ **فتح سندھی** :۔ ٹالپوروں کے آخری دور سے تعلق رکھتے ہیں، سندھی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کا کچھ اردو کلام بھی ملتا ہے۔ ایک بیت نمونہ کے طور پر نقل کیا جاتا ہے۔

خدا باقی دگر فاکی لقلے باغ میں جانا
سمجھ سن بات ہو سیانا پکڑلے زبانی[3]

۶۔ **بہادر سندھی** :۔ یہ بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ سندھی زبان میں ان کی کافیاں ملتی ہیں۔ کچھ اردو کلام بھی ملتا ہے، ایک شعر نقل کیا جاتا ہے۔

آتی نظر ہر کی کرتے بہادر اوپر
پان کا بیڑا صنم تم نے کھلایا نہیں[4]

پان کے استعمال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے ہندوستان کے اردو شعرا کا کلام پڑھا تھا اور اس سے متاثر ہو کر اس نے "پان کا بیڑا" استعمال کیا ہے، کیونکہ سندھ میں پان نہیں کھایا جاتا تھا۔ البتہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ تالپور

---

(۱) "نئی زندگی" نومبر ۱۹۵۴ء (۲) (۳) (۴) سندھ کے اردو شعرا، سید حسام الدین راشدی "نئی زندگی" مئی ۱۹۵۲ء

پان استعمال کرتا تھا۔

۷۔ **ابراہیم شاہ صوفی:۔** یہ بھی اسی زمانہ کے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

جیسے دن سوں سجن بچھڑیا میرے دل تب سے ہے جل جل
وداع کی آگ بجلی جوں ابرچشماں جوں باراں ہے

۸۔ **مخدوم عبدالکریم:۔** مخدوم غلام حیدر ٹھٹوی کے فرزند تھے اور ۱۸۵۵ء میں ان کی وفات ہوئی۔ اردو کے اچھے شاعر تھے، لیکن ان کے اردو کلام کا نمونہ مل نہیں سکا[۱]

(دوسرا دور)

۱۔ **خلیفہ گل محمد ہالائی:۔** سندھی شاعری میں "دیوان گل" پہلا مکمل دیوان ہے، اس وجہ سے خلیفہ گل ہالائی کو سندھی ادب میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ خلیفہ صاحب ہالا کے ایک علمی خاندان میں ۱۸۱۱ء میں تولد ہوئے۔ عالم، فاضل اور پرہیزگار پیر علی گوہر شاہ اصغر کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اسی لئے خلیفہ کہلاتے تھے۔ آخر عمر میں حج کے ارادے سے بمبئی گئے، وہاں سنہ ۱۲۷۵ھ میں اپنا سندھی دیوان لیتھو میں شائع کروایا۔ اس کے بعد عربستان گئے۔ جہاں اسی سال ان کا انتقال ہوا ان کے کچھ اردو قطعات سندھی دیوان کے پہلے نسخے میں ملتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر ایک قطعہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے[۲]

جب کھلا دیوان گل بولن لگے
گل پہ بلبل زاغ تھا اور چمن
طبع طوطی گل کہا تاریخ یوں
خوب خوش بے رنگ تھا داغ بن

۲۔ **عثمان فقیر:۔** لاڑکانہ ضلع کے ایک گاؤں جامڑہ سانگی میں ۱۷۷۸ء میں تولد ہوئے اور ۱۸۷۰ء میں وفات پائی۔ فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد صوفیوں کی صحبت میں رہے۔ خواجہ عبدالحیٔ نقشبندی (نوشہرہ فیروز) کے مرید تھے۔ بہت سے طالبوں نے ان سے فیض حاصل کیا خود میر علی مراد خان ان کے مداحوں میں سے تھا اور ان کے کلام پر عاشق تھا۔ سندھی زبان کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ صوفی ان کا کلام ایک تارہ پر بڑے سوز سے گاتے ہیں۔ ان کا کچھ اردو کلام بھی ملتا ہے جس میں ہندی الفاظ زیادہ ہیں اور ہندی شاعری کی علامتیں رام کرشن وغیرہ بھی ملتی ہیں یہاں ایک کافی نقل کی جاتی ہے[۳]

---

[۱] سندھ کے اردو شعراء۔ سید حسام الدین راشدی۔ نئی زندگی، مئی ۱۹۵۲ء

[۲] خلیفہ گل محمد ہالائی۔ میمن عبدالمجید سندھی، اردو نامہ، شمارہ ۲۵، ص ۴۵

[۳] تذکرہ لطفی، جلد سوم، لطف اللہ بدوی، ۵۲-۱۹۵۳ء ص ۲۷۷، ۲۷۸

کہنا راما راما ہر میں　　ہرنا مان رام نام بن کون
۱۔ پانچ تنت کا پنڈ بنایا　　اس میں آ[۱]ئی کھٹا کر آیا
ہری کرشن ہوسا مان
۲۔ جوئی[۲] لڑے سا[۳]ئی چوڑے　　دیکھیں دیکھیں ہردے کھولے
اہے[۴] نہ جھوٹے جا مان
۳۔ لکھ چوراسی جون[۵] ہمارے　　ایکائی میں ایکو پا دی
تعنز[۶] نکو اسلامان
۴۔ عثمان گرو کے سنگ[۷] لگے　　بھولے کے سب بھول بھگے[۸]
آپ ہویا آتمان

۳۔ غلام حسین افضل سبز پوش ٹھٹوی :۔ فارسی کے بلند پایہ شاعر و ادیب تھے۔ اردو کے بھی شاعر تھے، لیکن ان کا اردو کلام مل نہیں سکا ہے۔ شروع میں افضل اور آخر عمر میں استر تخلص کرتے تھے۔ ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء میں وفات پائی ان کی تصنیفات میں تنبیہہ المعاندین، مثنوی نان ونمک، نظم لوزرد زار اور انشائے افضل کے نام ملتے ہیں[۹]

۴۔ قادر بخش بیدل ۰۔ ان کا شمار سندھ کے عظیم شعرا میں ہوتا ہے۔ لیکن وہ فارسی، عربی، سرائیکی، اردو اور ہندی کے بھی بلند پایہ شاعر تھے۔ اُن کی ولادت روہڑی میں ۱۸۱۴ء میں ہوئی ۱۶ ذوالقعد ۱۲۸۹ھ کو وفات پائی، بہت بڑے عالم اور فاضل تھے۔ عربی اور فارسی پر ان کو کامل عبور تھا۔ نظم ونثر میں ان کی ۱۸ تصانیف ملتی ہیں۔ پیر پاگارو پیر علی گوہر شاہ اصغر کو انہوں نے پڑھایا تھا، خاص طور پر مثنوی مولانا روم کا درس دیا تھا

اردو میں ان کا مکمل دیوان موجود ہے جو اب تک شائع نہیں ہو سکا ہے۔ ان کے اردو کلام میں حسن وعشق کا ذکر بھی ہے اور تصوف کے مسائل کی شرح بھی ملتی ہے۔ زبان کے لحاظ سے ان کا اردو کلام قدیم اردو کی ترجمانی کرتا ہے" سوں اور سیں "کا استعمال اس طرح ملتا ہے جس طرح ولی دکھنی کے کلام میں ملتا ہے۔ اس زمانہ میں اردو نے نیا روپ اختیار کیا تھا۔ لیکن بیدل کی اردو شاعری اس سے متاثر نہیں تھی۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

جب سوں زاہد نے سنی اس رخ پر نور کی بات
کھل گئی اس سیں تیرے شوق سوں خود کی بات

---

[۱] وہی [۲] جسے ہی [۳] اسے وہی [۴] دیکھ وہ [۵] آواگون [۶] نہیں [۷] صحبت میں رہے [۸] شکوک دور ہوئے
[۹] سندھ کے اردو شعرا۔ سید حسام الدین راشدی، نئی زندگی، مئی ۱۹۵۲ء

دوئی کے وہم میں تبدیل تیرا دل گر ہوا فارغ ظہورا ذات مطلق کا جہاں چاہیں وہاں ہوگا

حیران ہو کر قد تمہارے کو کیا کہوں خوباں کہوں کہ سرو کہ نخلِ وفا کہوں

تیری حسن کی دیکھ تجلی اے رشکِ حور سورج کہوں کہ چاند کہ نورِ خدا کہوں

مشکین زلف تیرے گرائے غیرتِ ختن مارسیہ کہوں کہ کمندِ دغا کہوں

مرتا ہوں تیرے ناز کا آغاز ہے ہنوز صوفی کفن یہ ناوکِ انداز اور ہے

بالیقیں عاشق و معشوق حقیقت میں ہیں ایک لوگ کہتے ہیں عبث ناظر و منظور کی بات

آج گلشن میں چلو دیکھو کہ جیرچا اور ہے باغ میں گل رخ کے آنے سے تماشا اور ہے

نکہتِ سنبل و بنفشہ سے معطر ہیں دماغ عطر بیزی شاخ آن زلفِ چلیپا اور ہے

ڈہی ہے مرغ وہی ہے آشیاں ہا ہوتی وہی ہے مین تنفس لا الٰہ الا ہو

۵۔ صورت :۔ حیدرآباد کے ہندو تھے۔ ان کی ولادت تقریباً ۱۸۳۲ء میں ہوئی، مروجہ فارسی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازمت اختیار نہیں کی، حالانکہ والی ریاست خیرپور میر علی مراد خاں تالپور کی طرف سے ملازمت کی پیشکش ہوئی تھی کیونکہ ان پر گرونانک کی تعلیم کا اثر تھا اور دنیا سے لاتعلق رہنا چاہتے تھے۔ ان کے گرو مسند بھائی کشن تھے، شادی کی تھی اور اولاد بھی ہوئی تھی لیکن دنیا کے تعلقات میں الجھے نہیں نہ صرف یہ بلکہ جو وراثت میں ملا تھا وہ بھی لٹاتے رہتے تھے۔ بھائی رامداس کو ان سے بڑی عقیدت تھی جس نے "ٹڈومن" نامی نہر پر ان کے لئے ایک جھونپڑی بنوائی جس میں وہ رہنے لگے اور وہاں موسیقی کی محفلیں ہونے لگیں۔ کچھ دن کراچی جاکر ایک مندر میں بھی رہے، ۱۸۷۷ء میں ان کی وفات ہوئی[۱]

بچپن سے دیوان بہار سنگھ سے ان کو بڑی محبت تھی۔ اپنے کلام میں بھی اپنے نام کے ساتھ بہار کا نام بھی رکھا۔ یعنی تخلص ہی "صورت بہار" ہوگیا ہے۔ ان کے کلام کے مجموعے کا نام بھی "دیوان صورت بہار" ہے۔ یہ دیوان تو صحیح معنی میں نہیں، لیکن اس میں غزلیں ضرور ہیں۔ غزلوں کے علاوہ اس میں بھجن، قصیدے، ابیات، رباعی اور کافی کی کافی تعداد موجود ہے۔ ایک فارسی مثنوی بھی ہے، زیادہ کلام اردو میں ہے، کچھ سندھی اور فارسی میں بھی ہے۔

دیوان صورت بہار ۱۸۸۶ء میں مطبع "دیا دلو" کراچی میں ترددی ۱۸۸۶ء میں پہلی مرتبہ چھپا۔ یہ دیوان صورت سنگھ کے ایک عزیز دیوان لیکھراج نے لاہور جاکر کتابت کروا کر کراچی سے آکر لیتھو پریس سے چھپوایا۔ دیوان کے آخر میں، منشی کھیم سنگھ کی نظم (ص ۲۵۸، ۳۵۹) ہے جس میں دیوان کی تعریف ہے۔ اس کے آخر میں "اختتام کتاب" کے نام سے فارسی عبارت ہے۔ اس کے بعد موسیقی کی تعلیم پر "راگ مالا" کے نام سے ایک مختصر سا گوا مع مضمون ہے

---

[۱] دیوان صورت بہار، سندھی رسم الخط ۱۹۳۵ء، ص ۱۷

وہ بھی اردو ہی میں ہے آخر میں اردو میں نوٹ ہے جس میں پریس کا نام اور طبع کا سال دکھایا گیا ہے، اس کے بعد یہ دیوان سندھی رسم الخط میں حیدرآباد سے بہار سنگھ کے پوتے حشمت رائے نے شائع کیا۔ اس میں فارسی مثنوی کے ساتھ اس کا منظوم سندھی ترجمہ بھی ہے جو کسی دوسرے کا کیا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ حواشی میں مشکل الفاظ کی شرح بھی ہے۔

صورت نے اپنا کلام موسیقی کی راگنیوں پر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہندی الفاظ بھی کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں۔ علاوہ بھی ہندی شاعری کی ہی ملتی ہیں۔ اس کے باوجود کچھ اردو غزلیں بھی ہیں۔ نمونہ کے طور پر غزلوں کے کچھ ابیات نقل کئے جاتے ہیں۔

صورت بہار جیسا کہیں یار نہ دیکھا
بلبل دل میری ایسا گلزار نہ دیکھا
دل لوٹ کے دلبر نے میری دل کو کیا شاد
بیدل نے بیتی ایسا کبھی دلدار نہ دیکھا

یار دیکھ تو کیسے یار فراموش کیا — یا فراموش کیا پھر دل جوش کیا
کیا کروں کس سے کہوں حال پریشاں کی دل — جو کیا خوب کیا یار ہمیں خاموش کیا

کھلا گلاب گلگوں میں بہار آیا ہے[1]
مچا کے غلغل بلبل ہزار آیا ہے
ہزار عاشق دل بیقرار آتے ہیں
چرا کہ موسم وقت نثار آیا ہے
ہر ایک گل میں اس گلعذار کی خوشبو
ہر ایک جان میں جاندار آسمایا ہے
چلو تو ساقی گلفام میں قدح پیویں
صراحی ساتھ لے مئی خوشگوار آیا ہے
بہار صورت صورت بہار حق نے کہا
رہیں وصال میں ہر دم خدا ملایا ہے

(تیسرا دور)

۱۔ **محمد محسن بیکس**:۔ حضرت قادر بخش بیدل کے فرزند تھے۔ ۲۸ جمادی الثانی ۱۲۷۵ (۲ فروری ۱۸۵۹ء) میں ان کی ولادت

---

[1] سندھی میں بہار مذکر استعمال ہوتا ہے، اس لئے صورت نے بھی مذکر استعمال کیا ہے۔

ہوئی ۵ رمضان ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۲ء) میں وفات پائی۔ سندھی زبان کے پانچ بڑے شعرا میں ان کا نام آتا ہے۔ فارسی اور اردو میں بھی ان کا کچھ کلام ملتا ہے۔ ان کے کلام میں سوز وگداز کی دل گداز تصویر ملتی ہے۔ فراق کا ذکر بڑا پُر اثر میں ملتا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

دیکھے گی جب فراق دل اسی دروازہ دلبر
کرے گی سجدہ اور پڑیں گی میں ہوں زخمی پیا تیسرا
اگر چاہے سجن میرا کہ اٹھ بیٹھے یہ مردہ عاشق
ہزار دل شکر کرا دھوں، دیکھوں بیت اللہ دیوں پھیرا

جو سی پڑھتی سکھی[1] کھول دیکھو دلدار کب آوے — کتاباں کھول کر کہنا نظر دلدار کب آوے
بکیں جس کا اصل بردا اسی کوں ردرح پیاڈرنڈا[2] — اسی کے چرنیں سر دھرنداریں اطوار کب آوے

۲۔ **قاضی غلام علی** :- قاضی غلام علی جعفری طیاری (المتوفی ۱۸۸۵ء) یحیٰ جعفر کے فرزند تھے۔ اردو میں شعر کہتے تھے، لیکن ان کا کلام نہیں مل سکا۔

۳۔ **مخدوم ابراہیم خلیل ٹھٹوی** : بڑے عالم، فاضل اور اچھے شاعر تھے۔ پہلے مسکین تخلص کرتے تھے، بعد میں خلیل کرنے لگے۔ اپنے والد مخدوم عبدالکریم اور پیرزادی شاکرانی سے تعلیم حاصل کی۔ فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ سندھ کے آخری دور کے فارسی شعرا کا تذکرہ بھی لکھا ہے جو تکملہ مقالات الشعرا کے نام سے موجود ہے، جس میں ۱۷۰۰ء سے ۱۸۸۸ء تک کے فارسی شعرا کا ذکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ناسخ اور آتش کے دیوان بھی پڑھے تھے اور اردو میں شعر بھی کہتے تھے، لیکن ان کے اردو کلام کا کوئی نمونہ نہیں ملا۔

۴۔ **پیر پاگارو پیر حزب اللہ شاہ راشدی** :- ۱۸ شوال ۱۲۵۸ھ کو تولد ہوئے اور ۲۴ محرم ۱۳۰۸ھ (۱۸۹۰ء) کو اس دار فانی سے رخصت ہوئے[3]۔ ان کے والد بزرگوار کا نام پیر علی گوہر شاہ اصغر تھا جو عالم اور فاضل ہونے کے ساتھ سندھی زبان کے بلند پایہ شاعر تھے۔ پیر حزب اللہ شاہ خود بھی عالم اور فاضل تھے اور عالموں اور شاعروں کی سرپرستی بھی فرماتے تھے ان کو مطالعے اور کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ سخاوت میں ان کا نام مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ نقاشی سے بھی دلچسپی تھی اور اچھے خوشنویس بھی تھے۔ شعروشاعری سے گہرا لگاؤ تھا۔ مسکین تخلص کرتے تھے۔ ایران اور ہندوستان کے علما اور شعرا بھی ان کی محفل میں آتے رہتے تھے۔ فارسی میں ان کا کافی کلام ہے، کچھ اردو میں بھی ملتا ہے نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

آتا ہے چمن میں بت گلفام ہمارا — ساقی بخدا بھر دے مجھے جام ہمارا

---

[1] سکھی: جلدی [2] پیاڈرنڈا: ڈر رہا ہے [3] تذکرہ لطفی جلد سوم، لطف اللہ بدوی، ص ۱۷۷ اور ۱۸۳

گر میں نہ کیا اس بت طناز کو سجدہ　　　　آئیگا کسی کام یہ اسلام ہمارا[۱]

۵۔ جیرت سنگھ :۔ قنبر ضلع لاڑکانہ میں ۱۸۴۰ء میں جنم لیا اور ۱۸۹۹ء میں فوت ہوئے۔ وحدانیت کی تعلیم بالا کے مشہور گورو ولایت رائے سے حاصل کی۔ ان کے کلام میں وحدانیت کا رنگ ملتا ہے۔ سندھی میں ان کی کافیاں اور بھجن ملتے ہیں ہندی اور اردو میں بھی ان کا کچھ کلام ملتا ہے۔ نمونہ کلام

فرحت آئی دل میری کو　　　　دور ہوئے سب دکھ سنتاپ
بھری تیری وسر گئے سب　　　　ایک رہ دیت رہیو ہے آپ
آب حیات پیا جب پیالا　　　　وسر گیا سنسار
رس چکھی میں ہو یا دیوانا　　　　اچرج لیلا اپار

۶۔ شاہ نصیر :۔ شاہ نصیرالدین نقشبندی، لز شہر دفیروز کے نقشبندی صوفی تھے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت مجدد الف ثانی سے ملتا ہے۔ ان کے والد بزرگوار کا نام عبدالحی تھا۔ عالم فاضل اور صوفی تھے، بہت سے طالب ان کے فیض سے مستفیض ہوئے زندگی کا زیادہ حصہ سیر و سفر میں گذرا۔ سندھ سے باہر سرہند، اجمیر، بمبئی، قندھار اور بلوچستان تک بھی گئے ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء کے قریب فوت ہوئے۔ سندھی زبان کے بہت بڑے شاعر تھے ان کی فارسی شاعری سے خالص ایرانی رنگ نمایاں ہوتا ہے اردو شاعری میں استادانہ رنگ ہے۔ سندھ میں بہت سے شعرائے اردو میں شاعری کی ہے۔ لیکن شاہ نصیر کی اردو شاعری زیادہ صاف اور زبان و بیان کے اعتبار سے بہت بہتر ہے۔ نمونہ کلام۔

پنجۂ مرجان سے اس کے جب پیا میں جام نے　　　　اڑ گیا دل سے میرے جو خیال مرجانے کا تھا
قامت سے تیرے سرو خراماں ہے حیران　　　　لعلوں سے تیرے لعل بدخشاں ہے حیران
مرجانا بھی مرجان سے بیجان رہی ہے　　　　بنجر کی ثنا دیکھ کر سلطاں ہے حیران
روتا ہوں تیرے ہجر سے شب روز لے دلبر　　　　آنکھوں سے میرے قلزم عماں ہے حیران
طوطی تو اک بات شکر لب سے سنائی　　　　سکوت طرح طوطی خوش خواں ہے حیران
نالہ جو کروں ہجر میں شب روز نصیرا　　　　افغاں سے میرے رعد پریشاں ہے حیران

اختتام :۔ یہاں ہم نے صد سالہ سندھ کی اردو شاعری کے نمونے پیش کئے ہیں۔ یہ وہ صدی ہے جو اردو شاعری میں بڑی اہمیت رکھتی ہے اس میں غالب جیسے عظیم شاعر کا دور رہا۔ اس صدی میں اردو شاعری نے ایک نیا رنگ اختیار کیا لیکن سندھ میں اسوقت جو اردو شاعری کا انداز تھا وہ قدیم تھا سندھ کی اسوقت کی اردو شاعری میں بھی وہی پرانا دلی دکنی کا رنگ ملتا ہے نہ صرف یہ بلکہ ہندی شاعری کا اثر بھی نظر آتا ہے اور ہندی الفاظ بھی بہت سے شعرا کے کلام میں ملتے ہیں کچھ شعرا کے یہاں سندھی شاعری کا رنگ بھی نظر آتا ہے اور سندھی الفاظ بھی مستعمل نظر آتے ہیں اس سے واضح ہو گیا کہ سندھ کی اردو شاعری کا اپنا مزاج تھا اپنا اسلوب لہجہ تھا اور اپنا انداز بیان تھا اس میں حسن و عشق سے تصوف کا رنگ زیادہ ہے۔

---

[۱] سندھ کے اردو شعرا، سید حسام الدین راشدی، نئی زندگی مئی ۱۹۵۱ء (ص ۵) جیرت

مُلّا واحدی دہلوی

غالب کے دیکھنے والے

جنہیں میں نے دیکھا

دیکھا تو میں نے مرزا اسداللہ خاں غالب کے بے شمار دیکھنے والوں کو ہے۔ میری ولادت سے اُنیس سال ہی پہلے مرزا صاحب کا انتقال ہوا تھا۔ میرے اچھی طرح ہوش سنبھالنے بلکہ رسالہ نظام المشائخ نکالنے تک مرزا صاحب کے دیکھنے والے نہ جانے کتنے بوڑھے اور جوان میں زندہ تھے۔ اُن میں سے یہاں چند حضرات کا ذکر کرتا ہوں جنھیں ناظرین جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں۔ ایسے نام گنوانے سے کیا فائدہ جو گمنام ہیں۔ ویسے تو مختصر بات یہ ہے کہ دلّی کی مجھ سے پہلی نسل کے ہر آدمی نے مرزا صاحب کو دیکھا تھا۔

چند حضرات کا ذکر بھی اتنا کروں گا جتنا انھیں براہِ راست جانتا ہوں۔ دوسروں کی لکھی ہوئی اور شائع شدہ تحریروں سے مدد نہیں لوں گا اور مضمون کو طول نہیں دوں گا۔

میرن صاحب

میری خالہ نورجہاں بیگم، جن کا نسبتاً کم رنگ بھگ سو برس کی عمر میں انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد انتقال ہوا ہے، اُس خاندان کی بہو تھیں، جس کے میرن صاحب ایک فرد تھے۔ میں بچپن میں خالہ اماں کو بھائی میرن بھائی میرن کہتے سنتا تھا تو تعجب کرتا تھا کہ میرن عجیب نام ہے۔ پھر میرن صاحب کے نواسے سید رؤف علی کے ساتھ اینگلو عربک ہائی اسکول میں پڑھنے کا موقع ملا تو پتہ چلا کہ خالہ اماں کے بھائی میرن وہ میرن صاحب ہیں جنھیں غالب تا حیات زبانِ اُردو حیات بخش گئے ہیں۔ غالب جن کے خطوط پڑھا کرتے تھے اور جو غالب کا شعر پڑھنا گناہ سمجھتے تھے۔ لیکن یہ پھر بھی معلوم نہ کیا کہ میرن نام تھا یا عرفؔ[۱]۔

بہرحال میرن صاحب کو میں نے دیکھا۔ اوسط قد کے حسین بوڑھے تھے۔ حالات سے زیادہ واقف نہیں ہوں، ہاں

---

[۱] میر نصیر علی نام تھا (ق)

میرن صاحب کا ٹھہر ٹھہر کر بات کرنے کا انداز اس وقت بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ بڑی پیاری زبان بولتے تھے۔ ٹھیٹھ دلی والے تھے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے میرن صاحب پر اپنی کتاب "چند ہمعصر" میں طویل مضمون لکھا ہے۔ وہ عبدالرؤف بیرسٹر کو میرن صاحب کا داماد لکھ گئے ہیں۔ صحیح نام رؤف علی تھا، اور رؤف علی میرن صاحب کے داماد نہیں نواسے تھے، رؤف علی کے والد داماد تھے۔ میں نے رؤف علی کے والد اور نانا (میرن صاحب) دونوں کو دیکھا ہے۔

رؤف علی، آصف علی اور عبدالمجید (فرزند خان بہادر مولوی عبدالاحد، مالک مطبع مجتبائی) تینوں میرے ہم جماعت تھے اور تینوں ایک ساتھ بیرسٹری پڑھنے گئے تھے۔ رؤف علی بیرسٹری ہی کے ہو کر رہے۔ دلی کے ممتاز بیرسٹر تھے۔ آصف علی نے بیرسٹری بھی کی اور لیڈری بھی کی۔ عبدالمجید کرنل عبدالمجید بنے اور محکمۂ ڈاک کی ڈائرکٹر جنرلی تک پہنچے۔ کرنل عبدالمجید کراچی میں ہیں۔

نواب طالب ۔ نواب سعیدالدین احمد خاں جو نواب احمد سعید خاں کے نام سے مشہور تھے) نواب ضیاءالدین احمد نیر درخشاں کے بیٹے تھے اور نواب سر امیرالدین احمد والیٔ ریاست لوہارو کے چچا۔

اگر میرے حقیقی پھوپھا، آغا سید احمد شاہ (جاگیردار و نواب سردھنہ ضلع میرٹھ) کی بہن، بادشاہ بیگم نواب طالب سے منسوب تھیں، لیکن میں نے نواب طالب کو بس دیکھا ہے۔ میری اور اُن کی عمر میں باپ بیٹے کا تفاوت تھا۔ کبھی حاضر خدمت ہونے کی ہمت نہیں ہوئی۔ صاحب جمال اور صاحب جلال رئیس تھے۔ کسی سے جھونک نہ کھاتے تھے۔ شریف خانی اطبا کا طوطی بولتا تھا مگر نواب طالب انھیں خاطر میں نہ لاتے تھے۔

گھوڑے پر سواری دلی میں صرف دو رئیسوں کی نکلتی تھی۔ ایک لالہ چھنا مل کے چھوٹے بیٹے لالہ شیو پرشاد کی، دوسرے نواب احمد سعید خاں طالب کی۔ چوکڑی (یعنی چار گھوڑوں کی بگھی) میں نکلنے والے ایک صاحب ضرور تھے، گھوڑے پر نکلنے والا اور کوئی نہیں تھا۔ نواب طالب شہسوار تھے۔

نواب طالب کی بھانجی ڈاکٹر کرنل زیڈ احمد (غالباً ضیاءالدین احمد) سے بیاہی گئیں، جو صوبہ آسام کے باشندے تھے اور جن کے بیٹے فخرالدین احمد سالہا سال آسام کے وزیر رہے۔ آجکل بھارت کے مرکزی وزیر ہیں۔ فخرالدین احمد کی ایک بہن پاکستان کے سابق گورنر نواب مشتاق احمد گرمانی کی اہلیہ ہیں۔ اور دوسری بہن حمیدہ سلطانہ دلی کی ممتاز سوشل ورکر ہیں۔ انھیں مضمون نویسی کا بھی شوق ہے۔ میرے اور مسٹر فصیح الدین احمد ایم اے کے ماہنامہ ادیب میں حمیدہ سلطانہ کے مضامین چھپا کرتے تھے۔ حمیدہ سلطانہ ایک دفعہ کراچی تشریف لائی تھیں تو میرے ہاں بھی آئی تھیں۔

نواب طالب مرزا غالب کے شاگرد بھی تھے اور عزیز بھی۔

منشی ذکاءاللہ شمس العلماء منشی محمد ذکاءاللہ، شمس العلماء مولوی نذیر احمد، شمس العلماء مولوی ضیاءالدین، شمس العلماء

ولوی محمد حسین آزاد، شمس العلماء مولوی الطاف حسین حالی، رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب، مولوی سیف الحق ادیب، لالہ ٹھاکر داس خاں صاحب مولوی سید احمد، سب مجھ سے اتنے بڑے تھے کہ شبہ ہی نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے غالب کو نہ دیکھا ہوگا۔ کئی تو اُن میں غالب کے تلامذہ تھے۔ میں نے اِن سب کو دیکھا۔ بعض کو قریب سے، بعض کو دور سے۔

شمس العلماء خان بہادر منشی ذکاء اللہ کا مردانہ مکان اسی سڑک پر تھا جس پر میری رہائش تھی اور میرا دفتر رسائل و اخبارات تھا۔ منشی صاحب میرے لکھنے پڑھنے کے شوق کی وجہ سے مجھے عزیز رکھتے تھے۔ آخری پرچہ میرا "نظام المشائخ" ہی تھا جس کو منشی صاحب نے "دلّی کے منہدم معابد و مقابر" کے عنوان سے مسلسل مضامین عنایت فرمائے۔ میں نے ان سے پابندیٔ اوقات و باضابطگی سیکھی۔ منشی صاحب کی باضابطگی اور با اصولی کا یہ عالم تھا کہ مڈل کلاس (آٹھویں جماعت) کے ریاضی کے پرچے پنجاب یونیورسٹی نے انھیں دیکھنے بھیجے۔ اُس زمانہ میں مڈل کا امتحان بھی یونیورسٹی لیتی تھی۔ میں نے مڈل کا امتحان ۱۹۰۲ء میں یونیورسٹی کو دیا تھا۔ خیر جس سال کا میں واقعہ لکھ رہا ہوں اس سال منشی صاحب کے چھوٹے بیٹے فرحت اللہ نے امتحان دیا تھا۔ فرحت اللہ بڑے تیز تھے۔ پرچوں کا بکس آیا تو فرحت اللہ نے بکس توڑ اپنا پرچہ بدل دیا اور بکس صفائی سے بند کردیا۔ منشی صاحب نے جو فرحت اللہ کے سارے جواب صحیح دیکھے تو وہ کھٹکے اور بیٹے سے پوچھا کہ تم نے پرچہ بدلا ہے۔ بیٹے نے اقرار کیا۔ منشی صاحب نے بیٹے کو تین سال تک امتحان میں نہ بیٹھنے کی سزا دلوادی۔ منشی صاحب کے ایک بیٹے مولوی عنایت اللہ بی اے صاحبِ تصنیفات تھے اور ناظم دارالترجمہ ریاست حیدرآباد دکن، اور دوسرے بیٹے مسٹر رضاء اللہ بی اے ای ریاست بہاولپور کے اسٹیٹ انجینئر تھے، تیسرے بیٹے نکالے جانے کے بعد کیا پڑھتے، پھر اسکول کالج کا نام نہیں لیا۔ مشہور صاحبِ طرز ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ نے اِن اپنے ہمنام کو شوخی و شرارت میں اپنا استاد بتایا ہے۔

منشی ذکاء اللہ کے زنانہ اور مردانہ مکانوں میں مشکل سے دس منٹ کا فاصلہ تھا۔ لیکن منشی صاحب ایک مکان سے دوسرے مکان جاتے تھے تو پورا لباس پہن کر جاتے تھے۔

وقت کی پابندی منشی ذکاء اللہ کی ضرب المثل تھی۔ روزانہ شام کے ٹھیک چار بجے ٹاؤن ہال لائبریری جایا کرتے تھے، پیدل راستے اور ایک رفتار سے۔ سرسید احمد خاں کا مکان راستے میں پڑتا تھا۔ سرسید کے بڑے بیٹے سید حامد گھڑی لے کر منتظر رہتے تھے اور منشی صاحب کو دکھا کر گھڑی مِلانے لگتے تھے۔ یہ گویا دونوں کی ٹھٹول تھی۔

منشی ذکاء اللہ کا سرسید احمد خاں کے لفٹیننٹوں میں شمار تھا۔ مگر منشی صاحب نے سرسید کی لباس اور مذہبی تجدد میں پیروی نہیں کی۔ لباس اور مذہبی تجدد میں سرسید کے بیشتر ساتھی سرسید کے برعکس تھے۔ منشی ذکاء اللہ انگرکھا یا اچکن شیروانی پہنا اور جُبّہ اور دیسی جوتی پہنتے تھے۔ اور سر پر عمامہ باندھتے تھے۔ جاڑے میں روئی دار پاجامہ ہوتا تھا۔

چھیاسی ستاسی سال کی عمر پائی۔ فیملی ڈاکٹر حکیم حیدر حسین نے اُن کے مرض الموت میں کہا تھا، منشی صاحب کے جملہ اعضائے رئیسہ قابلِ اطمینان کام کر رہے ہیں لیکن عمر کا کیا علاج کیا جائے، عمر موت کو بلا رہی ہے۔

مرض الموت میں منشی ذکاء اللہ علی الصباح چوبیس گھنٹوں کی کیفیت قلمبند فرما لیتے تھے۔ وہی ڈاکٹر کو پڑھوا دیتے۔ وہ ملاقات کرنے والوں کے آگے سرکا دیتے۔ ایک دفعہ مجھ سے فرمایا کہ آج تمام کتابوں اور تمام مضامین کا حساب لگایا تھا۔ میں نے عمر بھر میں اندازاً دو لاکھ صفحے فلسکیپ سائز کے لکھے ہیں۔

ایک بوڑھا بارہ تیرہ برس کی اپاہج اور سڑن بیٹی کو پشت پر لٹکائے ہمارے مکان کے آگے سے اکثر گزرا کرتا تھا۔ ایک دن منشی صاحب کہنے لگے۔ اسے دیکھ لو۔ یہ بڑا آدمی ہے اور بڑا انسان ہے۔ تم آئندہ بڑے آدمی تو دیکھو گے، بڑے انسان نہیں دیکھو گے۔ یہ بوڑھا بارہ تیرہ سال سے اس اپاہج اور سڑن بیٹی کو اٹھائے پھر رہا ہے۔ گو، موت اور مال کے دریا بیٹھ بہتے ہیں، مگر یہ نہیں اکتاتا۔ اللہ کا خوف ہو، یا بیٹی کی محبت یا مری ہوئی بیوی سے وفاداری ہو، ہر صورت میں اس بوڑھے کے اندر بڑی پاکیزہ روح ہے

<u>مولوی نذیر احمد</u> شمس العلما خان بہادر مولوی نذیر احمد ایل۔ ایل۔ ڈی المعروف بہ ڈپٹی نذیر احمد سرکار انگریزی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ریاست حیدرآباد دکن نے کہیں اونچی چڑھا دیا مگر ڈپٹی گری ایسی چمٹی تھی کہ آخری سانس تک ڈپٹی کہلائے۔

مجھے ڈپٹی صاحب کے ہاں جانے کے مواقع میسر نہیں آئے۔ دیکھا بارہا۔ ان کی کتابیں ہی نہیں پڑھیں، تقریریں بھی سنیں۔ بس ایک بار خواجہ حسن نظامی کے ہمرکاب شرف نیاز حاصل کیا تھا، خواجہ صاحب نے پوچھا، حضرت! پردے کے متعلق کیا رائے ہے؟ بولے، کس کے پردے کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ، لڑکوں کے متعلق یا لڑکیوں کے متعلق؟ میری رائے میں آجکل لڑکوں کو بھی پردہ کرانا چاہئے۔

میرے اور ڈپٹی نذیر احمد کے مکانوں میں ڈھائی تین میل کا فاصلہ تھا۔ اس لئے ڈپٹی صاحب کی صحبت سے فیض یاب نہ ہو سکا جسٹس سر عبدالرحمٰن اور جسٹس کے استاد شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن (پرنسپل سینٹ سٹیفنز کالج) ڈپٹی صاحب کے خاص شاگردوں میں تھے اور مرزا فرحت اللہ بیگ بھی۔

ڈپٹی نذیر احمد اپنے زمانے کے بہترین مقرر تھے۔ سر سید احمد خاں کا جلسہ ان کی تقریر سے چمک اٹھتا تھا۔ تحریر تو ڈپٹی صاحب کی آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ڈپٹی صاحب کی کتابیں ابھی موجود ہیں۔

<u>مولوی ضیاء الدین</u> شمس العلماء خان بہادر مولوی ضیاء الدین ایل۔ ایل۔ ڈی بھی صاحب تصانیف تھے۔ ڈپٹی کلکٹر تھے اور ڈپٹی ضیاء الدین کہلاتے تھے۔ زندگی میں ڈپٹی نذیر احمد کے ہم پایہ مانے جاتے تھے۔ انتقال نے فراموش کر دیا۔

میں نے ڈپٹی ضیاء الدین کو دیکھا مگر میرا ان کا سابقہ نہیں پڑا۔ حالانکہ وہ دور نہیں تھے، زیر جامع مسجد رہٹ کے کوچے میں رہتے تھے۔ ڈپٹی ضیاء الدین کے ایک بیٹے پر ذہبیہ مرزا محمد سعید کے بہنوئی تھے۔ انھوں نے فقہ حنفی پر ہزار بارہ سو

صفحے کی کتاب لکھی تھی، اس کے سلسلے میں ان کا میرے ہاں آنا جانا رہا۔ باپ کی طرح ذی علم تھے۔ پنجاب یونیورسٹی انھیں ممتحن بناتی تھی۔ مجھے دیکھیے کہ ان کالہ اور ان کی معرکۃ الآرا کتاب کا نام بھول گیا۔ کتاب کے مولانا محمد علی جوہر مداح تھے۔

مولانا آزاد شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد نے چونکہ لاہور کی سکونت اختیار کرلی تھی، انھیں ایک دفعہ دیکھ سکا جب بیٹی کی موت سے ان کا دماغ ماؤف ہوگیا تھا اور وہ لاہور سے پیدل منشی ذکاءاللہ سے ملاقات کرنے دلّی پہنچے تھے۔ مولانا آزاد کے پوتوں آغا محمد طاہر اور آغا محمد اشرف سے میرا کافی اخلاص تھا۔ یہ پوتے میرے دوست میر محمد حسین کے بھانجے تھے۔ تیسرے پوتے آغا محمد باقر بھی میرے پاس آچکے ہیں، اور آغا طاہر سے بڑے پوتے سے بھی ملاقات تھی۔ ان کا نام یاد نہیں آرہا۔

مولانا حالی کیا شانِ پروردگار ہے، زندگی میں جو رتبہ ذوق کو حاصل رہا وہ غالب کو نصیب نہیں ہوا۔ غالب یاروں کے یار تھے۔ ہر بار ذوق امیر اور رئیس کی محفل میں صدارت کرتے ملتے ہیں اور ذوق کہیں نظر نہیں آتے، لیکن ابوظفر بہادر شاہ کا استاد ہونا ذوق کا پلڑا جھکا دیتا تھا۔ غالب ذوق سے ٹکراتے تھے، مگر بالآخر انھیں کہنا پڑتا تھا ؎

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال

یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

آج اردو کا دشمن بھارت غالب کو اپنا رہا ہے اور ساری دنیا سے انھیں عظیم شاعر منوا رہا ہے، لیکن وہی بھارت ذوق کی قبر پر پبلک کے لئے پاخانہ بنوا رہا ہے۔ نہ جانے سچ ہے، نہ جانے جھوٹ، خبر پڑھی تھی، تردید نہیں پڑھی۔ ممکن ہے مبالغہ ہو تاہم اتنا تو ماننا ہی ہوگا کہ آج غالب ہی غالب ہیں۔ ذوق کی پرستش ہے نہ مومن کی، ارے صاحب! میرؔ کو ماند کردیا، جن کی بابت غالب نے خود فرمایا ہے ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

مجھ سے پہلی نسل کے دلی والوں کو مومن کا کلام جتنا ازبر تھا اُتنا غالب اور ذوق کا کلام ازبر نہیں تھا۔

پھر دوسری شان اللہ تعالیٰ کی اور دیکھئے، صاحبِ اولاد مومن کا کوئی نام لیوا باقی نہیں رہا۔ مومن کے پوتے عبدالوہاب میرے ساتھ پڑھتے تھے، وہ بھی جوان مرگئے، لاولد غالب سے سب رشتہ جوڑتے ہیں۔

له ان کا نام منورالدین تھا۔ غالب نے مولوی امین الدین پر ازالہ حیثیت عرفی کا جو مقدمہ کیا تھا اس میں مولوی امین الدین کی طرف سے مولوی ضیاءالدین گواہ تھے۔ ان کے نام غالب کے دو خط بھی ہیں (ق)

سب سے زیادہ اچنبھا اور مزے دار اچنبھا اس پر ہے کہ ملا ماتپ ذوق نے رنگین مزاج داغ جانشین پایا، اور رند مشرب غالب کو انتہائی ثقہ حالی عطا ہوئے۔ مولانا حالی کی صورت اور چال ڈھال پر ثقاہت برستی تھی۔

شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کی میں طالب علمی کے دور میں اکثر زیارت کرتا تھا۔ وہ دلی میں مولوی عبدالاحد کے ہاں ٹھہرتے تھے۔ مجھے ہمیشہ منشی کرم اللہ خاں المعروف بہ ننھے خاں (رئیس) کے گھر محلہ مٹیا محل جاتے ہوئے محلہ چوڑی والان میں جوتے والوں کی گلی کے قریب ملتے تھے۔ میں اینگلو عربک ہائی اسکول جاتا ہوتا تھا۔ میری عمر اس وقت سترہ اٹھارہ برس کی تھی۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا کہ سلام کرلوں اور سلام کا جواب لے کر مگن ہوجاؤں۔

مولانا حالی کے بیٹے خواجہ سجاد حسین اپنے دوست مسٹر رضا اللہ ابن منشی ذکاء اللہ سے ملنے آتے تھے تو مسٹر رضا اللہ انھیں میرے ہاں بھی لاتے تھے۔ رضا اللہ میرے بھی دوست تھے۔ مولانا حالی کے پوتے داماد دں، آنریبل خواجہ غلام الثقلین (میرٹھ۔ یو۔ پی کونسل) اور خواجہ غلام السبطین (مینجر ہندوستانی دواخانہ دہلی) سے خاصی یاد اللہ رہی۔ خواجہ غلام الثقلین نے مجھی بھیا احسان الحق کی شرکت میں ایک ماہوار رسالہ "عصر جدید" ۱۹۱۰ء نکالا تھا۔ بھیا میرٹھ کے رئیس تھے، خواجہ غلام الثقلین میرٹھ کے نمایاں ایڈووکیٹ۔

مولانا حالی مرزا غالب کے ایسے شاگرد تھے کہ مرزا صاحب نے ان سے فرمایا تھا کہ "میں لوگوں کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا، لیکن تمہاری نسبت میرا خیال ہے کہ تم اگر شعر نہیں کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کروگے۔"

پیارے لال آشوب رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب کو میں نے دور سے دیکھا ہے۔ آشوب لالہ سری رام ایم۔ اے مصنف خمخانۂ جاوید کے چچا تھے۔ آشوب بھی ایم۔ اے تھے اور غالب کے عقیدتمند کرنل ہالرائڈ (یا میجر ملر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب) کے مزاج میں انھیں دخل تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، مرزا عبدالغنی ارشد، مولوی الٰہ جان اور مرزا بیگ بیدل کو پیارے لال آشوب ہی نے دلی سے لاہور بلایا تھا۔ اور محکمہ تعلیم میں لگایا تھا۔ پیارے لال آشوب ڈائرکٹر کے ہیڈ کلرک تھے، آخر میں انسپکٹر آف اسکولز ہوگئے تھے۔ وہ پہلے ہندوستانی انسپکٹر آف اسکولز تھے۔ کیسا مبارک زمانہ تھا۔ ہندو نے ہندوئیت اور مسلمانیت نہیں دیکھی، اہلیت دیکھی، سیاست کا کھلا ہر کم بخت نے زمانہ بدل ڈالا۔

سیف الحق ادیب مولوی سیف الحق ادیب شیخ عبدالحق محدث کی اولاد میں تھے اور غالب کے شاگرد تھے۔ شیخ عبدالحق محدث کی اولاد ۱۹۴۷ء تک میرے مکان کے نزدیک گلی مفتی والان میں یکجا رہتی تھی۔ لیکن مولوی سیف الحق ادیب کے بڑے بھائی خان بہادر مولوی انوار الحق، میر منشی ریذیڈنسی راجپوتانہ بالکل میرے مکان سے متصل مکان میں آبسے تھے۔ مولوی انوار الحق نے میری حقیقی چچی کی بیوہ بھاوج سے نکاح ثانی کرلیا تھا۔ ان کی عورتوں کا ہمارے ہاں اور ہماری عورتوں کا اُن کے ہاں چھتوں چھتوں آنا جانا تھا۔ اپنے زینے سے چڑھیں اور دوسرے کے زینے سے اتر گئیں۔ چچی کی بیوہ بھاوج سے مولوی انوار الحق کی دو لڑکیاں ہوئیں۔ ایک

رئیس الدین سابق ڈپٹی سکریٹری مرکزی وزارت صحت پاکستان کی والدہ، دوسری اسلام الحق فرزند سیف الحق ادیب کی بیوی، دونوں لڑکیاں میری چھوٹی بہن گیتی آرا بیگم کی سہیلیاں تھیں۔ اسلام الحق سجاد حیدر یلدرم کے ساتھ انگریزی حکومت میں فارن آفس کے اعلیٰ عہدہ دار تھے

مولوی سیف الحق ادیب کو میں نے خواب سا دیکھا ہے۔ ان کی عمر بہت کم ہوتی۔ مرے ہیں تو میں پانچ برس کا تھا لیکن پانچ برس کی باتیں مجھے بے شمار یاد ہیں۔ آجکل کی باتیں بھول جاتا ہوں۔ ۱۹۴۷ء سے حافظہ بگڑ رہا ہے۔

مولوی سیف الحق ادیب کے دوسرے بیٹے انعام الحق کرکٹ کے کھلاڑی تھے۔ دلی میں جہاں اب ایڈورڈ پارک ہے، وہاں انعام الحق کی کلب کھیلتی تھی۔ میرے عزیز خواجہ فضل احمد بھی اُس کلب کے ممبر تھے، میں ان کے ساتھ جاتا تھا۔ میرے ہم سن مولوی شمس الاسلام (سابق ڈپٹی پرنسپل الفارمیشن بیورو، پاکستان) انعام الحق کے ساتھ آتے تھے۔ ہم دونوں کا کام یہ تھا کہ گیند باؤنڈری سے باہر جا گرے تو بھاگ کر اٹھا لائیں۔ ہم دونوں تیرہ تیرہ چودہ چودہ برس کے تھے۔

شیخ عبدالحق محدث کی اولاد میں شان الحق حقی کراچی میں ہیں اور شریف الحسن استنبول (ٹرکی) میں، سفارتخانہ پاکستان کے پریس اٹیچی کی حیثیت سے۔ میرے بچپن کے ساتھی قاضی لطیف الحق حقی راولپنڈی میں ہیں۔

اسمٰعیل میرٹھی میرٹھ کے ایک پرانے سے مکان کی لمبی ڈیوڑھی میں ایک تخت بچھا ہوا تھا اور دو چار مونڈھے پڑے تھے، جب مولانا اسمٰعیل میرٹھی سے میری اور خواجہ حسن نظامی کی ملاقات ہوئی۔ خواجہ صاحب بعد میں بھی ملتے رہے۔ میں دوبارہ نہیں ملا۔

ٹھاکرداس لالہ ٹھاکر داس میرے مخلص لالہ شمبھو ناتھ، مالک دلی پرنٹنگ ورکس کے والد تھے۔ دلی پرنٹنگ ورکس کی بنیاد لالہ ٹھاکر داس نے ڈالی تھی وہ علمی آدمی تھے۔ مدتوں فالنز اردو انگریزی ڈکشنری کی تیاری میں مولوی سید احمد، مولف فرہنگ آصفیہ کی شل شریک رہے، مولوی سید احمد ساتھ ساتھ فرہنگ آصفیہ مرتب کرتے جاتے تھے، لالہ ٹھاکر داس نے پریس قائم کر کے علم و ادب کی خدمت انجام دی۔ لالہ ٹھاکر داس کے پوتے اور لالہ شمبھو ناتھ کے بیٹے لالہ شام ناتھ بھارت کے مرکزی نائب وزیر اطلاعات و نشریات تھے۔ حال میں انتقال کیا ہے۔ میرا دادا سے لے کر پوتے تک سے سابقہ رہا۔ میں اس خاندان کی وضع داری کا مداح ہوں۔

مولوی سید احمد خان صاحب مولوی سید احمد اپنی اردو لغات فرہنگ آصفیہ کی وجہ سے زندۂ جاوید ہیں۔ مولوی سید احمد شمس العلما مولوی سید احمد، امام جامع مسجد کے پہلے خسر تھے، مولوی سید حمید موجودہ امام کے نانا۔ مولوی سید احمد غیر معمولی سلیقے کے آدمی تھے۔ خط خراب تھا، لیکن کاغذ بڑھیا استعمال کر کے بدخطی دبا لیتے تھے۔ اچھا پہنے اور خاص طور سے اچھا کھانے

کا شوق تھا۔ اپنی گھوڑا گاڑی تھی۔ اُس کی دونوں طرف کی نشستیں ڈھکنے دار تھیں۔ گویا صندوق۔ ایک صندوق میں منشی محمد دین خوشنویس دلی پرنٹنگ ورکس کے مسودے اور پروف رکھتے تھے اور دوسرے میں برف کی سلّی، لیمنڈ کی بوتلیں اور موسم کے پھل، بند گاڑی تھی، جسے پالکی گاڑی کہا جاتا تھا، بھوک پیاس محسوس ہوتی تھی تو اسے راستے میں مارتے نہیں تھے اُڑا لیتے تھے۔

منشی محمد دین خوشنویس میرے مکان کے سامنے والی گلی میں رہتے تھے، مولوی سید احمد انھیں کام دینے یا لینے آتے تھے تو میرے پاس بھی ضرور آتے تھے۔ میرے رسالہ نظام المشائخ میں ان کے مضامین چھپتے تھے۔

حکیم عبدالمجید خاں :۔ اوپر جتنے حضرات کا ذکر کیا گیا ہے انھیں غالب کا ہمعصر بلغیر شک و شبہ کے کہا جاسکتا ہے۔ ان حضرات نے پختہ عمروں میں غالب کو دیکھا تھا۔ ہاں میں سر سید احمد خاں کو تو چھوڑ ہی گیا۔ سرسید احمد خاں اُسی محلّے کے رہنے والے تھے جس کا میں رہنے والا تھا۔ سید صاحب علی گڑھ کالج کی مصروفیتوں کے باوجود دلّی کے پھیرے لگایا کرتے تھے۔ سید احمد صاحب غالب کے قریباً ہمعصر تھے[۱] سید صاحب کے انتقال کے وقت میں گیارہ برس کا تھا۔

خیر اب میں جن حضرات کا ذکر کرتا ہوں، انھوں نے غالب کو بچپن، لڑکپن اور نوجوانی میں دیکھا تھا۔ نواب سراج الدین احمد خاں سائل فخریہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے غالب نے گود میں کھلایا ہے ؎

غالب میرے دادا تھے، میں غالب کا پوتا ہوں

حکیم عبدالمجید خاں، حکیم واصل خاں، حکیم اجمل خاں، حکیم رضی الدین، نواب سراج الدین، میر ناصر علی، مولانا راسخ بیخود دہلوی اور ناصر نذیر فراق، نظام کے تمام نواب سائل سے کسی نہ کسی قدر بڑے تھے۔ بعض یقیناً اور بعض میرے اندازے کے مطابق، کسی نے غالب کو پانچ چھ برس کی عمر میں دیکھا، کسی نے دس گیارہ برس کی عمر میں اور کسی نے پندرہ اور بیس کے درمیان۔ خاندانِ لوہارو پانچ چھ برس کی عمر میں قطعی دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ان تمام حضرات کو خوب دیکھا ہے۔ حکیم عبدالمجید خاں البتہ میری کم عمری میں انتقال کر گئے تھے۔ عبدالمجید خاں کی جھلک یاد ہے۔ اُن کے چابیں پر تورہ بندی ہوتی تھی اور بڑی سینی کے سائز کی باقرخانیاں بنی تھیں، ہمارے ہاں بھی حصہ آیا تھا۔ ویسی باقرخانی پھر نہیں کھائی۔

حکیم واصل خاں :۔ حکیم عبدالمجید خاں کے دو چھوٹے بھائی تھے۔ حکیم محمد واصل خاں اور حکیم محمد اجمل خاں حکیم واصل خاں سے میرا طبیب اور مریض کا تعلق رہا۔ میں ان سے علاج کراتا تھا۔

حکیم اجمل خاں[۲] :۔ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں کانگریس کی شرکت سے قبل حاذق الملک تھے۔ حاذق الملک کا خطاب

---

[۱] سرسید احمد خاں، غالب سے بیس سال چھوٹے تھے (ق) [۲] پیدائش ۱۸۶۸ء انتقال ۱۹۲۷ء (ق)

حکیم عبدالمجید خاں نے حکومت سے اِس شرط کے ساتھ لیا تھا کہ یہ خطاب میرے خاندان کے علاوہ اور دں کو نہیں دیا جائے گا۔ حکیم عبدالمجید خاں حاذق الملک اول تھے، حکیم اجمل خاں حاذق الملک ثانی۔

حکیم اجمل خاں کی بیوی، یعنی حکیم جمیل خاں کی والدہ میرے عزیز خواجہ فضل احمد خاں کی رشتے کی بہن تھیں۔ حکیم جمیل خاں کی بیٹی خواجہ فضل احمد خاں کے بھتیجے محمود احمد خاں، ریجنل الکشن کمشنر، مغربی پاکستان کی اہلیہ ہیں۔ میری بھی بھتیجی بہو ہوئیں۔ لیکن میرا حکیم اجمل خاں سے الگ معاملہ رہا۔ انھوں نے ۱۹۱۲ء میں نظام المشائخ کی کامیابی کے پیشِ نظر مجھے ہفتہ وار اخبار طبیب نکالنے کو کہا۔ حکومت سے سفارش کی کہ اُسے ضمانت جمع کرنے کی زحمت نہ دے۔ اُسے آل انڈیا ویدک اینڈ طبی کانفرنس کا آرگن بنا لیا۔ میں ۱۹۱۳ء میں حکیم صاحب سے قریباً روز ملتا تھا۔ میں نے ان سے زندگی کا برتنا سیکھا۔ خواجہ حسن نظامی نے میری بالارادہ تربیت کی۔ حکیم اجمل خاں نے بے ارادہ تربیت فرمائی۔ تین شخص ہیں، جنھیں میں اپنا تربیت دہندہ مانتا ہوں۔ نمبر ایک خواجہ حسن نظامی، نمبر دو منشی ذکاء اللہ، نمبر تین حکیم اجمل خاں۔ میرے والد کا انتقال میری کم سنی میں ہو گیا تھا۔

حکیم اجمل خاں کا خطاب "مسیح الملک" خواجہ حسن نظامی نے تجویز کیا تھا، جسے حکیم صاحب نے قبول کر لیا اور پورے ملک نے بھی خطابِ حاذق الملک لوگ بھول گئے۔ حکیم صاحب نے خطاب حاذق الملک واپس کر دیا تھا۔

حکیم رضی الدین :۔ شفاء الملک حکیم رضی الدین دلی میں حکیم اجمل خاں کے مقابلے کے طبیب اور رئیس تھے۔ ذہین اور دانشمند میں خواجہ حسن نظامی کے ساتھ اُن کے ہاں جایا کرتا تھا۔ ان کے والد حکیم ظہیر الدین، حکیم محمود خاں والد حکیم اجمل خاں کے ہمعصر تھے۔ مگر میرے زمانے تک حیات تھے۔ میں نے انھیں دیکھا نہیں[1]

نواب سر امیر الدین :۔ ہز ہائی نس نواب سر امیر الدین احمد فرخ مرزا کے۔ سی۔ ایم۔ جی، تھے تو لوہارو جیسی چھوٹی ریاست کے والی وحکمراں لیکن ان کا اثر ورسوخ حکومت میں بڑی بڑی ریاستوں سے زیادہ تھا۔ بڑے بڑے راجاؤں اور نوابوں سے بڑھیا خطابات انھیں ملے ہوئے تھے۔ توپوں کی سلامی کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ غیر معمولی سُوجھ بوجھ کے شُستہ اور شائستہ رئیس تھے۔ عمر کافی تھی، اس لئے بڑے بڑے نواب چچا اور ماموں کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

مُسلم لیگ کے قیام سے پہلے ایک وفد سر آغا خاں محمد شاہ کو وائسرائے کے پاس شملہ لے جانا تھا۔ آغا خاں بیمار پڑ گئے۔ مسلمان لیڈروں نے اُن کی جگہ نواب سر امیر الدین کو اپنا لیڈر بنایا اور وہ وفد لے گئے۔

نواب رضا علی ریاست رام پور کی گدی پر بیٹھے اور اُن کا پہلا دربار ہوا تو خواجہ حسن نظامی کو بھی مدعو کیا گیا -

---

[1] پیدائش ۱۸۶۷-۶۸ء انتقال ۱۹۱۶ء (ن)

خواجہ صاحب رام پور پہنچے تو پتہ چلا کہ دربار کے وقت درباری لباس پہننا ضروری ہے۔ نواب سرامیر الدین اور خواجہ صاحب کا کمرہ برابر تھا۔ خواجہ صاحب نے نواب صاحب سے کہا، آپ نے دیکھا ہوگا، میں نظام دکن کے دربار میں اپنی فقیرانہ وردی میں جاتا ہوں۔ نواب صاحب نے فرمایا، میں یہاں بھی آپ کو مستثنیٰ کرا دوں گا چنانچہ مستثنیٰ کرا دیا۔

نواب سرامیر الدین کے بیٹے جمیل الدین عالی پاکستان کی انجمن ترقی اردو اور رائٹرز گلڈ کے جنرل سکریٹری اور سکریٹری جنرل ہیں۔

مولوی سید احمد :- شمس العلما مولوی سید احمد[1]، امام جامع مسجد، دہلی بھی دوسرے نواب سرامیر الدین تھے، والیان لوہارو میں نواب سرامیر الدین اپنے پیش روؤں سے پیش پیش رہے، اسی طرح مولوی سید احمد نے جیسی کامیاب زندگی بسر کی ویسی زندگی پہلے کے امامانِ جامع مسجد نے شاید ہی بسر کی ہو۔ انگریز حکام پر وہ حکومت کرتے تھے۔ مجھے ایک کام لینے کا اُن سے اتفاق ہوا، اُن میں امام صاحب کی حکومت آنکھوں سے دیکھی۔

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی ۱۹۱۲ میں نظر بند ہوئے ہیں تو چونکہ خواجہ حسن نظامی بھی مسجد کانپور کے قضیے کے باعث علی برادران، مولانا ابوالکلام اور مولوی ظفر علی خاں کے قدم بہ قدم چل رہے تھے، افواہ پھیل گئی کہ اگلی باری حسن نظامی اور واحدی کی ہے امام صاحب نے ایک دن میرے عزیز خواجہ فضل احمد خاں سے کہا کہ بھئی! یہ تمہارا واحدی ناحق مارا جا رہا ہے، اُسے تو سیاست سے مطلق تعلق نہیں ہے۔ خواجہ فضل احمد نے امام صاحب کی گفتگو مجھے سنائی اور مشورہ دیا کہ تم امام صاحب کو لے کر چیف کمشنر کے پاس جاؤ۔ اور اپنا پیچھا چھڑاؤ۔ میں نے سوچا چیف کمشنر سے تنہا کیوں نہ مل لوں۔ میں تنہا پہنچ گیا۔ ملاقاتیوں کا کمرہ ملاقاتیوں سے بھر چکا تھا۔ دو کرسیاں خالی تھیں ایک پر بیٹھ گیا اور غور کرنے لگا کہ پچاس ساٹھ رائے بہادروں اور خاں بہادروں کے بعد ملاقات کا وقت ختم ہو جائے گا اور میں بے نیل مرام واپس ہوں گا۔ اتنے میں امام صاحب آتے دکھائی دئے۔ میرے برابر کی خالی کرسی پر تشریف فرما ہو کر انھوں نے مجھ سے دریافت کیا، تم تو حکام سے بھاگتے ہو، تم یہاں کیسے؟ میں نے وجہ حاضری بیان کر دی اور کہا کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کو آج میری مدد کے واسطے بھیجا ہے۔ آپ مجھے ملوا دیجئے۔ امام صاحب سب سے آخر میں آئے تھے، مگر سب سے پہلے بلائے گئے۔ اور پانچ منٹ کے اندر اندر میرا نام پکارا گیا اور میں امام صاحب کے طفیل امرا و روسا کو پیچھے چھوڑ چیف کمشنر کے کمرے میں جا پہنچا۔ چیف کمشنر سر مالکم ہیلی تھے۔ جو ترقی کر کے صوبہ پنجاب کے گورنر رہے اور پھر صوبہ یو۔پی کے گورنر۔ گورنریوں سے ریٹائرڈ ہوئے تو لارڈ بنائے گئے۔ لارڈ ہیلی کہلائے۔

امام صاحب نے ان ہیلی صاحب سے اس قدر ڈانٹ ڈانٹ کر باتیں کیں کہ میں حیران رہ گیا۔ جو کام کرنے آئے تھے اسے تو بھول گئے، بار بار جواب طلب کرتے تھے کہ واحدی کو بے بنیاد کیوں شامل کیا جا رہا ہے۔ کوئی قصور تو معلوم ہو۔ بتائیے کوئی قصور

---

[1] پیدائش ۱۸۶۵ء وفات ستمبر ۱۹۴۷ء (ق)

المتقر ہیلی صاحب کو مجھ سے ایسا برتاؤ کرنے پر مجبور کر دیا کہ میرا ایمان سرکنے لگا۔

امام صاحب نے دلی کے سینکڑوں مسلمانوں کو اعلیٰ اعلیٰ عہدے دلوائے۔ سفارش کرنا وہ عبادت سمجھتے تھے۔ وائسرائے کے ہاں انھیں "پرائیویٹ انٹری" کی اجازت تھی، لیکن مسلمانوں کی خاطر امام صاحب تھانیداروں کے حضور بھی جا کھڑے ہوتے تھے۔ جوشیلے مسلمان تھے۔ آخر عمر میں اُن کا میرا ستی مجلس اوقاف دہلی میں اور قبرستان کمیٹی دہلی میں ساتھ رہا۔

-:-

میر ناصر علی[1] :- خان بہادر میر ناصر علی محکمۂ نمک میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ پنشن ہو گئی تو ماہنامہ صلائے عام نکالا اور علم و فضل اور انشا پردازی کی دھاک بٹھا دی۔ دلی کا پہلا چیف کمشنر سر مالکم ہیلی تھا، دوسرا سر جان تھامسن۔ تھامسن کو مشرقی علوم و فنون سے بے حد دلچسپی تھی۔ اس کا میر ناصر علی سے خاصا یارانہ ہو گیا تھا۔ علم دوستی اور انشا پردازی کے سبب تھامسن خواجہ حسن نظامی کی بھی قدر کرتا تھا اور مولانا راشد الخیری سے بھی ملاقات کا خواہشمند تھا لیکن مولانا راشد الخیری نے اس کی خواہش پوری نہیں کی۔ میں مولانا راشد الخیری کے ساتھ جا کر میر ناصر علی سے ملا ہوں۔

میر ناصر علی کے پوتے انصار ناصری پاکستان ریڈیو میں کہیں اسٹیشن ڈائرکٹر ہیں، یا ممکن ہے اس سے اونچے ہوں۔

-:-

مولانا راسخ[2] :- میں ۱۹۰۳ء میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اُس وقت سے میں نے اخبار "وطن" لاہور، اخبار "وکیل" امرتسر اور "پیسہ اخبار" لاہور میں الٹا سیدھا لکھنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن یہ الحمد للہ میرا ریکارڈ ہے کہ میری الٹی سیدھی تحریریں شائع ضرور ہو جاتی تھیں۔ کسی اخبار یا رسالے نے کبھی میری حوصلہ شکنی نہیں کی۔ مجھے ۱۹۰۳ء ہی میں کچھ دن شاعری کا شوق بھی رہا تھا۔ خادم تخلص رکھ لیا تھا۔ مولانا عبد الرحمٰن راسخ کے ایک شاگرد، محمد مرزا مشتاق میرے پڑوسی تھے۔ میں غزل کہتا اور انھیں دے دیتا۔ مشتاق صاحب غزل کی نوک پلک درست کر کے راسخ صاحب کے ماہوار گلدستہ "مذاقِ سخن" میں چھپوا دیتے تھے۔ یوں مجھے مولانا راسخ کے نام کا علم ہوا۔ یہ مولانا راسخ کی رندمشربی کا دور تھا۔ اُس دور میں راسخ صاحب اِس قسم کے شعر کہہ جاتے تھے ؎

چاوڑی قاف ہے یا خلدِ بریں ہے راسخ
غول حوروں کے یا پریوں کے پرے رہتے ہیں

مولانا راسخ کے والد مولوی محمد حسین فقیر دلی کے ممتاز عالم اور واعظ تھے۔ مولوی محمد حسین کے تین بیٹوں کی مولویت میں دھوم تھی۔ فقیر تخلص سے ظاہر ہے کہ مولوی محمد حسین خود شاعر تھے۔ مگر مناجاتیں اور نعتیں لکھتے تھے، چاوڑی کو خلدِ بریں نہیں بتاتے تھے۔ چاوڑی طوائفوں کا بازار تھا۔

---

[1] پیدائش ۱۸۴۷ء انتقال ۱۹۳۳ء (دق) [2] پیدائش ۱۲۸۵ھ انتقال ۱۳۲۵ھ (دق)

خیراللہ نے تفسیر کیا اور راسخ صاحب نے جوانی ختم ہوتے ہی دینی کتابیں سنبھالیں اور درس نظامی جھٹ پٹ ختم کر ڈالا اور وعظ کہنے میں باپ اور بھائیوں سے بازی لے گئے۔ شاعری سے اب یہ کام لیا کہ مثنوی مولانا روم کا منظوم ترجمہ کر دیا۔

مولانا احمد سعید جس مسجد میں وعظ کہا کرتے تھے وہ مولانا راسخ کے وعظ کے واسطے اُن کے معتقدوں نے تعمیر کرائی تھی۔ مولانا احمد سعید تقریر میں مولانا راسخ کے متبع تھے۔ مولانا احمد سعید کی گل افشانی سے مولانا راسخ کے وعظ کی کیفیت اور بہار کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ مولانا راسخ کا قال بالکل حال تھا۔ شاعری کا دور طویل رہا اور قال وحال کا قلیل، لیکن یہ دور حسنات سے پُر تھا۔ مولانا راسخ کا انجام زمین پر بخیر ہوا۔ توقع ہے آسمان پر بھی نوازے گئے ہونگے۔

-:-

استاد بیخود[1] :۔ منشی وحیدالدین بیخود، جو استاد بیخود کہلاتے تھے، انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد دس برس زندہ رہے، انھوں نے ننلو کے لگ بھگ عمر پائی۔ بیخود صاحب کے انتقال کی خبر مجھے مولانا احمد سعید کے خط سے معلوم ہوئی تھی۔ میں نے مولانا احمد سعید کو لکھا کہ ہمارا آخری مرثام گر گیا۔ موّام کہتے ہیں ان ڈھیموں کو جو زمین کی کھدائی کرنے والے رہنے دیتے ہیں کہ ان سے ناپ لو کہ کتنی مٹی کھودی ہے۔ بیخود صاحب ان لوگوں میں تھے جنھیں دیکھ کر سمجھا جاتا تھا کہ دلّی کی تہذیب کیا تھی اور دلّی کا تمدن کیا تھا۔

بیخود صاحب مجھ پر بزرگانہ شفقت فرماتے تھے۔ خصوصًا جب میں نے اور مسٹر فصیح الدین نے ماہنامہ ادیب جاری کیا تو ادیب میں میرے مضامین پڑھ کر میرا دل بڑھاتے تھے۔

-:-

نواب تاباں[2] :۔ نواب سراج الدین احمد خاں سائل کے بڑے بھائی نواب شجاع الدین احمد خاں بھی شاعر تھے۔ تاباں اُن کا تخلص تھا۔ سائل اور تاباں دونوں سے حکیم اجمل خاں کی دوستی تھی۔ دونوں حکیم صاحب کی نجی صحبت کے حاضر باش تھے تاباں کو گالیاں تصنیف کرنے اور گالیاں دینے کی عادت پڑ گئی تھی۔ تاباں شطرنج کے بھی دھتیا تھے۔ کوئی کھیلنے کو نہ ملتا تو ایک مسلمان ڈولی اٹھانے والا کہار تھا، اسے طلب کر لیتے وہ مشّاق شاطر تھا۔ تاباں صاحب اُس کے ساتھ کھیلتے اور اُس پر گالیوں کی بوچھاڑ کرتے۔ کہار غریب گالیاں خاموشی سے سنتا رہتا تھا۔ ایک دن آخر غصّہ آگیا۔ فرمایا "الّو کے پٹھے! تو مجھے گالی کیوں نہیں دیتا۔ میں تیرے باوا کا نوکر ہوں جو میں ہی گالیاں دیئے جاؤں۔" یہ بھی دلّی کا ایک نمونہ تھے۔ ملاحظہ کیجئے نواب تاباں کی گالی میں کتنا انوکھاپن اور کتنی شیرینی اور غربا نوازی تھی۔

حکیم اجمل خاں نواب تاباں کی اِس عادت سے لطف لیا کرتے تھے۔ حکیم صاحب کوئی ایسا قصّہ چھیڑتے کہ نواب تاباں

---

[1] ۔ پیدائش ۱۸۶۳ء انتقال ۱۹۵۵ء بیخود نے دیوان غالب کی شرح مراۃ الغالب کے نام سے لکھی ہے (ق)

[2] ۔ پیدائش ۱۸۶۱ء انتقال ۱۹۲۸ء (ق)

نواب سائل پر برسنے لگتے۔ نواب سائل بس اتنا جواب دیتے کہ بھائی صاحب! یہ خیال رکھیے کہ میری والدہ آپ کی بھی والدہ تھیں،
نواب تاباں کی اس عادت کے ڈر سے میں نے ان کے ہاں جانے کی جرأت کبھی نہیں کی۔ دور سے دیکھا۔

—— :•: ——

نواب سائل[1] :- نواب سراج الدین احمد خاں سائل کے مکان اور میرے مکان کے درمیان ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ تھا مجھے ان کے ہاں حاضر ہونے کی عمر بھر میں ایک مرتبہ توفیق ہوئی۔ وہ بھی مولوی ظفر علی خاں کے کہنے سے۔ مولوی ظفر علی خاں میرے مہمان تھے۔ انھوں نے سائل صاحب سے ملنے کی خواہش کی۔ انھیں لے کر میں نواب سائل کے ہاں گیا تھا۔ اُس دن سے سائل صاحب کا معمول ہو گیا کہ میری طرف کسی کے گھر آتے تو مجھ سے ملے بغیر نہ جاتے۔ اپنی بدتمیزی اور ان کی وضع داری آج محسوس کرتا ہوں۔ اس وضع کو نواب سائل نے اتنا نبھایا کہ انتقال سے کئی سال قبل ٹانگوں نے جواب دے دیا تھا۔ رکشا میں پھرتے تھے، مگر میرے گھر کے آگے سے گزرتے تو رکشا رُکوا لیتے تھے اور مجھے بلا کر خیریت پوچھتے تھے۔

سائل صاحب مرزا داغ استاد نظامِ دکن کے داماد تھے اور جانشین داغ تسلیم کئے جاتے تھے۔ اس پر بیخود صاحب سائل صاحب سے خفا رہتے تھے۔ اوّل تو اس مشاعرے میں جاتے ہی نہیں تھے، جس میں سائل صاحب ہوتے تھے، اور اگر جاتے تو سائل صاحب سے فرماتے، "نشتر لایا ہوں نشتر"۔ سائل صاحب بھاری بھرکم اور بُردبار نواب زادے تھے، اُن کا جواب ہوتا "بھائی صاحب! اللہ تعالیٰ نے آپ کو شعر گوئی کا اہل بنایا ہے"۔ سائل صاحب کی آواز بڑی رسیلی تھی۔ وجیہہ انسان تھے، لانبا قد، مناسب جسم، خوبصورت ناک نقشہ، سرخ و سفید رنگ۔ لحن سے پڑھتے تھے اور محفل پر چھا جاتے تھے۔ میں نے سائل صاحب کی کالی داڑھی بھی دیکھی اور سفید داڑھی بھی۔ اور سب کی داڑھیاں میرے زمانے میں سفید تھیں۔

بیخود صاحب کا دعوےٰ تھا کہ سالہا سال استاد داغ کی جوتیاں سیدھی کی ہیں، جانشین میں ہوں۔ اس کے ثبوت میں داغ کے خطوط پیش کرتے تھے۔

—— :•: ——

ناصر نذیر فراقؔ[2] :- خواجہ میرزا ناصر نذیر فراقؔ خواجہ میر درد کے پوتے پر پوتے تھے۔ بارہ دری میر درد میں رہتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کے بڑے بھائی خواجہ حسن علی نظامی سے میر ناصر نذیر کا ملنا جلنا تھا۔ خواجہ حسن نظامی میر صاحب سے خُردانہ پیش آتے تھے۔ میرزا ناصر نذیر فراق نے نظام المشائخ میں لاتعداد مضامین لکھے۔ نثر اور نظم دونوں پر حاوی تھے۔ ہم محلہ ہونے کی وجہ سے میرے ہاں تشریف لاتے رہتے تھے۔ اور دلی کی پرانی باتیں سناتے رہتے تھے۔ یاد نہیں ٹوپی کیسی ہوتی تھی اور جوتی کیسی۔ البتہ اچکن یاد ہے۔ اچکن میں سونے کے زنجیروں دار بٹن لگاتے تھے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے اچکن شیروانی سے مختلف چیز تھی۔

—— :•: ——

ابھی غالب کو دیکھنے والے نمایاں لوگ کافی باقی ہیں، لیکن دلی سے باہر والے انھیں پہچانتے نہیں، مثلاً نواب لوہارو

---

[1] پیدائش ۱۸۶۴ء انتقال ۱۹۴۵ء (ق) [2] پیدائش ۱۸۶۵ء وفات ۱۹۳۳ء (ق)

کے چھوٹے بھائی مولوی ضمیر مرزا (جدِّ عالم دین) یا حاجی عبدالغفار (جن کا دلی اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں عظیم الشان کاروبار تھا اور جو دلی کے اہم شخص تھے) یا خواجہ شہاب الدین (ہیڈ ماسٹر اینگلو عربک ہائی اسکول، میرے اور میرے زمانے کے کل ممتاز مسلمانوں کے استاد) یا میر جمال الدین (ایئر مارشل محمد اصغر خاں کے دادا یا خسر)۔

غالب کے جن دیکھنے والوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں ہے۔ میں دیکھنے والوں کا دیکھنے والا خود پا بہ رکاب ہوں۔ ؎

ختم ہی سمجھو زندگی کے دن
کچھ ورق اور رہیں فسانے کے

مرزا غالب قیدِ فرنگ میں[1]

(از حضرت ملّا واحدی دہلوی)

مسٹر آصف علی کا جو فقرہ میں نے آپ کو سنایا تھا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ دلی کی مسجد فتحپوری کے بالکل قریب ہندوؤں نے ایک دھرم سالہ بنا رکھا ہے، جہاں ہندو مسافر مفت قیام کر سکتے ہیں۔ دھرم سالے کے اخراجات کے لئے دھرم سالے ہی میں کچھ کمرے اور کچھ دکانیں ہیں، جنھیں کرائے پر اٹھا دیا جاتا ہے۔ دھرم سالے کی دو چھتی اور دو چھتی کا کمرہ دلی کی کانگریس کمیٹی کے پاس تھا۔ دو چھتی کے اوپر کھڑے ہو کر مسٹر آصف علی نے کانگریس کمیٹی کے ممبروں کو مخاطب کیا۔ دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی۔ گورنمنٹ نے پکڑ لیا کہ تم نے مسافروں کے سامنے تقریر کی ہے، اور کوتوالی کی حوالات میں بند کر دیا، کیونکہ دھرم سالہ کوتوالی کے علاقہ میں ہے۔ حوالات وہی تھی جس میں کبھی مرزا غالب بھی رہے تھے۔ یہ مسٹر آصف علی کی پہلی گرفتاری تھی۔ مسٹر آصف علی نے کہا کہ تقریر کے مخاطب عوام نہیں تھے صرف کانگریس کمیٹی کے گنے چنے منتظم ممبر تھے۔ مسٹر آصف علی کو دھرم سالہ لے جایا گیا اور مسافروں کو اکٹھا کر کے دو چھتی پر سے دوبارہ تقریر کرائی گئی۔ آواز مسافروں تک نہیں جا رہی تھی۔ مسٹر آصف علی چھوڑ دیئے گئے اور گھر واپس آ گئے۔ اُن کے گھر سے پہلے راستے میں میرا گھر تھا۔ وہ میرے ہاں تھوڑی دیر رکے اور باتوں باتوں میں انھوں نے فخریہ کہا کہ "حضرت غالب والی حوالات میں رہنے کی سعادت حاصل کر لی"۔

---

[1] مکتوب بنام قادری

محمد سجاد ساجد ایم، اے

مرزا تفتہ

(خطوط غالب کے آئینے میں)

مرزا تفتہ کی شخصیت اردو ادب میں گمنام نہیں اگرچہ بہت ہی کم تذکروں اور تاریخوں میں ان کا نام اور نمونہ کلام ملتا ہے۔ اگر غالب کے خطوط اگر شائع نہ ہوئے ہوتے تو تفتہ نیز دیگر محسنان اردو کے نام سے ہم ناآشنا ہی رہتے۔ بہرحال غالب کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا نام منشی ہرگوپال تھا اور تفتہ تخلص۔ وہ مرزا غالب کے نہایت ہی خاص شاگردوں میں تھے۔ مرزا غالب ان کو اپنی اولاد سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے اور ان کی ذہانت اور خداداد صلاحیت کی بہت ہی قدر کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو مرزا کے اس قدر قریب کر دیا تھا کہ غالب ان کو "مرزا" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ وہ "غیر مسلم" تھے۔

یوں بھی مرزا غالب کے تعلقات ہندوؤں سے اچھے خاصے تھے۔ علاوہ مرزا تفتہ کے جواہر سنگھ جوہر اور شیونرائن شاگرد رشید تھے۔ ہیرا سنگھ معتقد وحاشیہ نشین تھے۔ منشی نول کشور سے اچھے خاصے تعلقات تھے۔ انہوں نے مرزا کا کلیات فارسی چھاپا۔ "قاطع برہان" کے مشہور مقدمے میں دیبی پرشاد نے غالب کے وکالت نامہ پر بطور گواہ دستخط کئے اور عدالت میں چار گواہوں میں سے دو گواہ ماسٹر پیارے لال آشوب اور حکم چند ولد رام دیال ہندو تھے۔

شاید ہی کوئی شاگرد غالب کو اتنا عزیز ہو جتنا کہ تفتہ تھے۔ غالب اپنے دوست کو لکھتے ہیں "واللہ تفتہ کو میں اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں اور مجھ کو ناز ہے کہ مجھ کو خدا نے ایسا قابل فرزند عطا کیا ہے۔"

مرزا تفتہ کا قیام لوہارو اور آگرہ میں بھی رہا لیکن مسکن سکندر آباد تھا جہاں وہ قانون گو تھے وہ دلی بھی آنا چاہتے تھے لیکن غالب نے روک دیا وہ کھاتے پیتے آدمی تھے۔ آمدنی خاصی تھی۔ کچھ پس ماندہ بھی بنک میں جمع تھا۔ قانون گوئی سے انکو اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی شعر و شاعری سے۔ ان کی تحریر جادو مثال ہوا کرتی تھی۔ اس فن میں ان کو بڑا ملکہ تھا۔ غالب کی سحر طرازی پر ساری دنیا سر دھنتی ہے حالانکہ انہوں نے اس فن میں تفتہ کے صاحب کمال ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ وہ اپنے ایک خط مورخہ ۱۸ جون ۱۸۵۲ء

میں لکھتے ہیں۔" کاشانۂ دل کے ماہِ دو ہفتہ، منشی ہرگوپال تفتہ، تحریر میں کیا کیا سحر طرازیاں کرتے ہیں۔ اب ضرور آپڑا ہے کہ ہم بھی جواب اسی انداز سے لکھیں۔"

یہ خط کسی اردو خط ہی کے جواب میں ہوگا جس سے صاف ظاہر ہے کہ فارسی کے علاوہ اردو پر بھی تفتہ کو عبور حاصل تھا۔ تحریر میں بذلہ سنجی اور بزم زدوں کو ہنسانے والی بات ہوتی تھی۔

غزل میں اتنی مہارت نہ تھی جتنی قصیدہ گوئی میں۔ غالب خود قائل تھے۔ دوشنبہ ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء کے خط میں غالب ہدیہ تحسین و خراجِ آفرین اس طرح پیش کرتے ہیں "میاں مرزا تفتہ ہزار آفرین، کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے۔ واہ واہ چشم بد دور تسلسلِ معنی، سلاستِ الفاظ۔ ایک مصرع میں تم کو محمد اسحاق شوکت بخاری سے لو آر دہو لیے ہے۔ یہ بھی محل فخر و شرف ہے جہاں شوکت پہنچا وہاں تم پہنچے"۔ تفتہ نے مثنویاں میں بھی طبع آزمائی کی اور مرثیئے بھی لکھے۔ وہ بہت زیادہ کہتے تھے۔ ان کی زود نویسی سے کبھی کبھی مرزا اکتا جاتے تھے۔

"صاحب" دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا۔ کیوں روپیہ خراب کرتے ہو اور کیوں چھپواتے ہو؟ اور اگر یونہی جی چاہتا ہے تو ابھی کہے جاؤ۔ آگے چل کر دیکھ لینا۔ اب یہ دیوان چھپوا کر تیسرے دیوان کی فکر میں پڑو گے۔ تم تو دو چار برس میں ایک دیوان اور کہو گے میں کہاں تک دیباچہ لکھا کروں گا۔"

غالب کے آخری دور میں تفتہ کی مشق پختہ ہوگئی تھی، رنگ نکھر گیا تھا اور رطب و یابس سے کلام پاک ہوگیا تھا۔ چنانچہ غالب لکھتے ہیں "اور اگر خواہی نخواہی تمہارا عقیدہ یہی ہے کہ اصلاح ضروری ہے تو میری جان میرے بعد کیا کروگے۔ میں چراغ دم سحر و آفتاب سرکوہ ہوں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ۴ ار رجب۔ نجات کا طالب غالب"۔

ڈپٹی کلکٹر جناب رنگیسن صاحب نے ایک تذکرہ شعراء ہند انگریزی زبان میں لکھنے کا انتظام کیا۔ غالب کے شاگردوں میں مرزا تفتہ کو فارسی اشعار کہنے میں ممتاز درجہ دیا ہے۔ انہوں نے تمام عمر فارسی میں لکھا اور چار دیوان چھوڑے۔ گلستان کی تضمین کی اور ایک مثنوی بلستان لکھی۔

مرزا تفتہ اپنے استاد کی خوشنودی کو بڑی اہمیت دیتے تھے، ورنہ نازک مزاج غالب کو منانا بھی خوب جانتے تھے۔ حق کے لئے عزیز دوستوں سے بھی شکر لے لیتے تھے حالانکہ ایسا کرنے میں ان کو بسا اوقات بلا وجہ زحمت ہوتی باوجودیکہ ہندو تھے مگر تعصب نام کو نہ تھا۔ ان کے دوستوں میں مسلمان زیادہ تھے۔ جن میں منشی نبی بخش حقیر، میر مکرم حسین، مرزا حاتم علی مہر اور منشی قمر الدین خان کے نام قابل ذکر ہیں۔

جہاں ہم خطوطِ غالب کو اس لئے اہمیت دیتے ہیں کہ ان کی وجہ سے اردو ادب میں ایک بہت بڑا خلا پر ہو گیا ہے وہاں ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ان خطوط کی اشاعت کی تحریک منشی شیو نرائن سے مرزا تفتہ نے بہت زور دے کر کی۔

مرزا غالب نے ۱۶ نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں شیو نرائن آرام کی درخواست کو نامنظور کرتے ہوئے لکھا تھا" اردو رقعات بھی جو آپ چھاپا چاہتے ہیں یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا نہ ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر دل لگا کر لکھا ہوگا۔ ورنہ تحریر

سرسری ہے۔ ان کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔" لیکن یہی مرزا غالب تفتہ کی درخواست کو ٹال نہ سکے: "رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔ اور اگر تمہاری اسی میں خوشی ہے تو مجھ سے نہ پوچھو۔ تم کو اختیار ہے۔" تفتہ کا اردو ادب پر بہت بڑا احسان ہے کیونکہ انہوں نے سب سے زیادہ خطوط اکٹھے کیے۔ اگر ان کے پاس سے خطوط نہ ملتے اور وہ ان کے چھاپے جانے کی سعی نہیں کرتے تو اردو ادب کا کتنا نقصان ہوتا۔

منشی ہرگوپال تفتہ کے باپ کا نام موتی لال تھا۔ تفتہ نے ابتدائی تعلیم گھر پر پائی۔ مدتوں محکمہ بندوبست میں قانون گو رہے کچھ دنوں ریاست جے پور میں ملازمت کی۔ تفتہ ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء میں انتقال ہوا۔ مولوی ممتاز احمد تھانوی نے تاریخ وفات کہی ہے۔

سال نقلش بادل زار از خرد
من شنیدم "بے سر و پا شعر و سخن"
۱ + ۱۲۹۵ = ۱۲۹۶ھ

رضا علی وحشت

غالب مرحوم کی یاد میں

ظہوری ہو کر طالب تیرے دل کا راز کیا سمجھے
ادا دانی کو تیری عرفی شیراز کیا سمجھے
حزیں یہ شکوۂ فکر چمن پرداز کیا سمجھے
تری ترکیب کیا جانے ترے انداز کیا سمجھے
ہوا ہے رشک افزائے عجم ہندوستاں تجھ سے
بنی یہ سرزمیں دل کی گویا اصفہاں تجھ سے
عبارت تیری کیا اک زمزمۂ تضمین ہے گویا
کلام جانفزا اعجاز کی تقریر ہے گویا
سخن تیرا ہے کیا اک درد کی تصویر ہے گویا
جو تیرا نالہ ہے وہ نالہ کی تاثیر ہے گویا
حکایت ہے ترے لب پر غم جانسوز ہجراں کی
اڑائی تیرے خامے نے ادا دلہائے نالاں کی

حکیم محمود احمد برکاتی

حکیم غلام نجف خاں

غالب کے ایک شاگرد

عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں اور ان کے خاندان دانش علم و حکمت سے، مجھے اور میرے بزرگوں کو نیازمندی کی نسبت خصوصی ہے۔ اس لیے برسوں سے حکیم صاحب کے سوانح کی جمع و ترتیب کو اپنے فرائض میں شمار کر رہا ہوں۔ مگر اور کونسا فرض ادا ہو سکا جو یہ ہوتا۔ اب جو سید الطاف علی صاحب بریلوی یادِ غالب کے سلسلے میں "العلم" کی بزم آرائی کے لیے کمربستہ ہوئے اور ازرہِ مخلص نوازی مجھے بھی دعوتِ شرکت دی تو حکیم صاحب کے تذکرہ کے جذبے نے انگڑائی لی اور حکیم صاحب اور غالب کے روابط کی بنا پر میں نے بزمِ غالب میں ذکرِ نجف کا جواز پیدا کر لیا۔

مہلت کی قلت اور فراغت کے فقدان کے ہاتھوں تلاش و تحقیق تو ممکن نہ ہو سکی بس اپنی یادداشتوں اور چند اقتباسات کے سہارے ایک خاکہ پیش کر رہا ہوں۔ آپ کی معلومات میں اضافہ کے لیے نہیں اپنے ضمیر کی تسلی کے لیے! ہو سکتا ہے کبھی بسط و تفصیل کی حسرت نکالنے کا موقعہ بھی فلکِ ناہنجار دے گذرے!

حکیم صاحب کے کمالات و فضائل اور ان کے فنی مقام و مرتبت پر گفتگو کرنے کے لیے یہ وقت موزوں نظر نہ آیا۔ چرخ نیلوفری کی کسی ایسی گردش کی آس لگا رکھی ہے جب ہمیں اپنے شعراء کی طرح اپنے اطبا کی یاد منانے کی توفیق بھی ارزانی ہوگی۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالٰی عنہ کی نسل میں اور حضرت فرید الدین گنج شکر کے اخلاف میں مغل دربار کے مشہور امیر شیخ فرید جو اخلاص خاں، احتشام خاں کے خطابات سے یاد کیے جاتے ہیں اور جو بدایوں کے قریب شیخوپور نامی مشہد قلعہ اور آبادی کے بانی تھے۔ [1] انہی نواب فرید کی پانچویں پشت میں شیخوپور کے ایک بزرگ حافظ مسیح الدین ذرو تی تھے۔ جن کی شادی سنہ ۱۸۰۵ء میں مریم النساء بیگم

عـ۱ "نواب فرید" از سلطان حمید رحمٰن

بنت سید غلام علی لکھنوی سے ہوئی تھی۔ ان مسیح و مریم کے صلب و بطن سے ۲۴ شعبان ۱۲۲۴ھ م ۵ اکتوبر سنہ ۱۸۰۹ء کو وہ سپوت عصر پیدا ہوا جس کا نام حکیم غلام نجف خاں ہے۔ غلام نجف خاں نے مروجہ علوم کی تحصیل مولوی مردان علی بدایونی وغیرہ سے کی اور اس کے بعد[1] طب کی تحصیل کے لئے دہلی کا سفر کیا، جہاں حکیم صاحب کے ماموں سید علی صاحب مقیم تھے، سید علی صاحب کمپنی کی طرف سے تحصیلدار تھے اور بعد میں گورنر کے میر منشی ہو گئے تھے[2]۔ دہلی میں حکیم صاحب نے مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے دادا حکیم صادق علی خاں ف ۱۸۴۹ء سے علوم طبیہ کی تحصیل کی[3]۔

درسی و کتابی تحصیل کے بعد مزید حصول کمال اور عملی تربیت کے لئے حکیم احسن اللہ خاں کے مطب میں نسخہ نویسی کرنے لگے جس کا سلسلہ سنہ ۱۸۳۷ء/۱۲۵۲ھ تک جاری رہا۔

اس طرح حکیم صاحب کا ایک سلسلۂ اسناد طب یوں ہوگا۔ حکیم غلام نجف خاں از حکیم صادق علی خاں از حکیم شریف خاں از حکیم اکمل خاں از معتمد الملک حکیم علوی خاں از حکیم محمد ہادی علوی شیرازی از حکیم مرزا محمد تقی موسوی از اطباء خوز و طبرستان از اطباء حران از ابو الطب بقراط۔

اور دوسرا سلسلہ اسناد یوں ہوگا حکیم غلام نجف خاں از حکیم احسن اللہ خاں از والدخود حکیم عزیز اللہ خاں از والدخود حکیم عبا واللہ خاں از والد خود نظام الدولہ معین الملک حکیم محمد رحمت اللہ خاں۔

حکیم احسن اللہ خاں نے اپنے والد کے علاوہ حکیم ذکاء اللہ خاں سے بھی استفادہ کیا تھا اس لئے ایک سلسلہ کا اسناد یوں ہوگا ہے حکیم غلام نجف خاں از حکیم احسن اللہ خاں از حکیم ذکاء اللہ خاں از والدخود حکیم اسحق خاں از والدخود حکیم اسماعیل خاں بقاخاں "اصغر" از والاخود حکیم بقاخاں اعظم از والدخود حکیم عبدالسلام خاں از والدخود حکیم حبیب اللہ خاں از والدخود حکیم ارشد خاں از والدخود حکیم مسیحا خان۔"

سنہ ۱۸۴۳ء میں حکیم احسن اللہ خاں سے افادہ اور استفادہ کے علاوہ ایک اور "نسبت" بھی ہوگئی۔ یعنی حکیم احسن اللہ خاں کی بہن سے حکیم صاحب کا عقد ہوگیا۔ خاندانی روایت یہ ہے کہ یہ عقد والد کی مرضی کے علی الرغم ہوا تھا۔

سنہ ۱۸۴۳ء میں حکیم صاحب کے والد حافظ مسیح الدین شیخوپورہ میں انتقال فرما گئے۔

---

[1] سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں ۵ سال کی عمر میں حکیم صاحب کا دہلی آنا بتایا ہے۔ مگر حکیم صاحب کی بہن کے پوتے وحید احمد مسعود کو اس پر اصرار ہے کہ حکیم صاحب جوان ہو کر دہلی آئے تھے۔ چنانچہ یہاں ہم نے انہی کی روایت قبول کی ہے۔ مضمون میں آئندہ بھی بہت سے سنین ولادت و وفات وحید احمد صاحب ہی کی روایت سے تحریر کریں گے۔ وحید احمد صاحب نے از راہ کرم اپنے خاندانی بیاضوں سے بہت سے اسماء و سنین و واقعات ہمیں وقتاً فوقتاً نقل کر کے ارسال فرمائے۔

[2] سرسید، تذکرۂ اہل دہلی۔ [3] سرسید، تذکرۂ اہل دہلی

سنہ ۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہونے کے بعد بہادر شاہ نے حکیم صاحب کو "عضدالدولہ خاں بہادر" کا خطاب دیا اور کچھ عرصہ کے بعد وہ کمپنی کی طرف سے طبیب شہر کی حیثیت سے مامور کئے گئے۔ ۱۸۴۷ء میں حکیم ظہیرالدین کی ولادت ہوئی۔

غدر میں (یا غدر سے کچھ پہلے احتیاطاً) دہلی سے وطن کے لئے روانہ ہو گئے تھے، غالباً مہرولی، دوجانہ اور لوہارو ہوتے ہوئے شیخوپورہ پہنچے تھے۔ اور تقریباً ۲ سال وہاں رہ کر دہلی لوٹ آئے۔

سنہ ۱۸۵۸ء میں حکیم صاحب کی والدہ کا انتقال ہوا۔ ۱۸ دسمبر سنہ ۱۸۶۵ء کو حکیم صاحب کے صاحبزادہ حکیم ظہیرالدین خاں کی پہلی شادی اور سنہ ۱۸۷۴ء میں دوسری شادی ہوئی۔

نقوش قلم

سنہ ۱۸۸۹ء میں ۸۰ سال کی عمر میں رحلت فرما گئے، منصبی فرائض اور رجوع خلق کی کثرت کے سبب شاید حکیم صاحب کو قلم برداری کی فرصت میسر نہیں آئی اور وہ تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ نہ فرما سکے، میرے علم میں حکیم صاحب کی صرف چند تحریریں ہیں، جن کا تذکرہ امید ہے کہ ارباب فن اور غالبیات کے محققین کے لئے دلچسپی کا موجب ہوگا۔

ان میں سے پہلی تحریر حکیم صاحب کا رسالہ نزہت العاشقین ہے، یہ رسالہ باد فرنگ (آتشک) کے معمولات و تجربات کا ایک بیش قیمت اور گراں ارز مجموعہ ہے، حکیم صاحب کی حیات ہی میں سنہ ۱۲۷۷ھ (م ۱۸۶۰ء) میں مطبع ہاشمی میرٹھ سے شائع ہوا تھا، ضخامت ۸۰ صفحات قطعۂ تاریخ طباعت حکیم سکھانند راقم نے لکھا ہے۔ جس کا ایک شعر یہ ہے۔

غلام نجف خاں بکلک متیں
نوشت ایں رسالہ چو نقش نگیں

"آتشک" کے ناموں میں سے باد فرنگ کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں

وباد فرنگ از جہت آں کہ ابتدائے ظہور آں از فرنگ بودہ یا از نواح آں برائے آں کہ مدار او شاں بیشتر برا غذیۂ غلیظ کریہہ سوداویہ است مانند گوشت گاؤ و خنزیر و مرغابی و امثال آں و شرب شراب و کم توجہی تنظیف بدن بغسل وغیرہ۔

میرے کتب خانہ میں اس رسالہ کا جو مخطوطہ ہے وہ میرے پر دادا مولوی حکیم سید دائم علی خاں بہادر بہاری ثم ٹونکی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، سید صاحب، حکیم غلام نجف خاں کے خواجہ تاش یعنی حکیم احسن اللہ خاں کے شاگرد تھے، حکیم احسن اللہ خاں نے بھی انہیں اپنی بیاض خاص عنایت فرمائی تھی جو میرے پاس ہے اور حکیم غلام نجف خاں صاحب اپنے مجربات عطا فرمایا کرتے تھے، دوسری چیز رسالہ "ماء الجبن" ہے یہ ایک مختصر فارسی رسالہ ہے جو ماء الجبن کے استعمال کرانے کی ترکیب، اس کی تیاری

؎ سرسید آثار الصنادید

ظرف اور اس کے ساتھ استعمال ہونے والے مرکبات کے نسخوں (اجزا) پر مشتمل ہے۔

یہ رسالہ حکیم غلام نجف خاں کے شاگرد اور میرے جد مولینا سید برکات احمد (۱۹۲۸ء) کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔

تیسری چیز رسالہ "علاج عنین" ہے یہ بھی فارسی زبان میں ہے، اس رسالہ کی فنی اور تاریخی اہمیت اس کی ابتدائی سطور سے واضح ہوگی۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم دستور علاج عنین و از کار رفتہ و مخلوق و مغلم و پیران مایوس العلاج، نیز حقیر ہیچمداں غلام نجف نمودہ از جناب استاذی برادر صاحب قبلہ عمدۃ الحکما معتمد الملک حاذق الزماں حکیم محمد احسن اللہ خاں بہادر بہمیں عنوان می فرمودند، فی زماننا چند کس را معالجہ فرمودند بحالت گردیدند و خاصۃً شاہ دہلی بہادر شاہ بادشاہ را بہ ہمیں نسق علاج فرمودند فائدہ عظیم بخشید از تربیتِ سفوف"

اس رسالہ کے ناقل مولینا برکات احمد آخر میں لکھتے ہیں۔

"می گوید عبد مسکین برکات احمد عفا عنہ کہ ایں رسالہ از استاذی مولائی حکیم محمد غلام نجف خاں مدظلہم بہ من مسکین رسید بارہا حضرت موصوف و حضرت استاذ الاستاذ قدس سرہٗ بایں روش علاج فرمودند واکثر نجات یافتند۔"

چوتھی چیز حکیم صاحب کی وہ یادداشتیں ہیں جو حکیم صاحب نے نسخہ نویسی کی مشق کے دوران حکیم احسن اللہ خاں کے مطب میں قلم بند کی تھیں، بعض خاص خاص امراض کے لئے حکیم احسن اللہ نے جو نسخہ پہلے روز تجویز کیا اور پھر اس میں بعد میں عوارض کی شدت و خفت کے لحاظ سے جو تبدیلیاں کیں ان کی روداد فنی اہمیت کے ساتھ اس لحاظ سے تاریخی بھی ہے کہ بعض حکایات مطب کو حکیم صاحب نے بتعیین تاریخ و یوم درج کیا ہے مثلاً اس سے حکیم صاحب کے عہد تلمذ و تربیت کا علم ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب سنہ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء تک حکیم احسن اللہ خاں کے پاس مطب کرتے رہے تھے، اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء کے موسم خریف میں حمائے غیر خریفی "پھیل رہا تھا۔ اور عام طور پر علاج سے مختلف پیچیدگیاں پیدا ہو رہی تھیں، بالآخر حکیم احسن اللہ خاں نے جو طرز معالجہ اختراع کیا اس سے کامیابی ہوئی، اس سال یکم شعبان کو خود حکیم غلام نجف خاں بھی بخار میں مبتلا ہو گئے تھے۔ بخار اور اس کے عوارض نے ۱۵ رمضان تک طول کھینچا تھا۔ اس پورے عرصہ میں جو جو ادویہ و اغذیہ و تدابیر استعمال کی گئیں اور حکیم احسن اللہ خاں نے ہر مرحلہ پر جو جو تبدیلیاں اپنی تجویز میں کیں ان کی مفصل و مکمل روداد کئی صفحات میں درج کی ہے۔

اس تحریر کے آخر میں مولینا سید برکات احمد لکھتے ہیں۔

"نسخجات کہ جناب مولائی و استاذی حکیم محمد غلام نجف خاں صاحب مرحوم در ایام تعلم از حضرت احترام الدولہ عمدۃ الحکما معتمد الملک حاذق الزماں حکیم محمد احسن اللہ خاں صاحب بہادر مرحوم بہ تعیین تاریخ معہ تفصیل حال مریض جمع فرمودند ما

اسی قسم کی ایک اور تحریر ہے جس کا آغاز حکیم صاحب نے اس طرح کیا ہے

"کیفیت بعض امراض و علاج آں کہ جناب استاذی احترام الدولہ عمدۃ الحکما معتمد الملک حاذق الزماں حکیم محمد احسن اللہ خاں بہادر غفر اللہ اکر دہ بر و من فقیر علاج فرمودند فقیر حاضر باش مطب آں حضرت بود و نسخہ بطریق امور کامانہ می نوشت و الطاف و عنایات حضرت ممدوح برکماں بود و ہست بنابر یادگاری و مددگاری بتحریر آوردم"

اس کے بعد تو مریضوں کے امراض اور ان کے لئے مجوزہ ادویہ کی تفصیل درج کی ہے۔

اس کے بعد مولینا برکات احمد نے حکیم غلام نجف خاں کا زبانی بیان کیا ہوا ایک واقعہ اپنے الفاظ میں درج کیا ہے مولینا لکھتے ہیں کہ حکیم صاحب نے فرمایا کہ مجھ سے ایک شخص نے بیان کیا کہ میں نے سم الفار (سنکھیا) کھالیا تھا جس سے یہ اور یہ شکایات پیدا ہوگئی تھیں، ایک روز ایک درویش نے فلاں دوا بتائی جس کے استعمال سے زہر کے تمام اثرات رفع ہوگئے۔

پھر مولینا نے حکیم صاحب کے مطب میں اپنی نسخہ نویسی کے عہد کا ایک واقعہ درج کیا ہے کہ ایک روز ایک شخص حضرت کے مطب میں آیا اور بتایا کہ کسی شخص نے چار آدمیوں کو دودھ میں کوئی زہر ملا کر پلا دیا ہے جس سے ان کو قے اور دست لگے ہوئے ہیں، حضرت اس کے ساتھ تشریف لے گئے۔ مریضوں کو دیکھا تو اگرچہ وہ مایوس کن حالت میں تھے مگر یہ نسخہ لکھ کر دیا جس کے پلانے سے زہر کے اثرات رفع ہوگئے۔

سرسید سے روابط

سرسید احمد خاں اور حکیم صاحب کے خاندانوں میں دیرینہ اور پرخلوص تعلقات تھے سنہ ۱۸۴۲ء میں حکیم صاحب کے استاد اور نسبتی بھائی حکیم احسن اللہ خاں کی سعی و سفارش سے سرسید کو جواد الدولہ عارف جنگ کا خطاب ملا تھا، سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں (ف ۱۸۴۵ء) مالک و مدیر سید الاخبار سے حکیم غلام نجف خاں کے روابط خلت و اخوت تھے اور سرسید ان کو "بڑے بھائی کے برابر" سمجھتے تھے سرسید سیرت فریدیہ میں لکھتے ہیں۔ "سید محمد خاں کے انتقال کے بعد جب میں دہلی میں منصف ہو کر آیا تو اس طرح حکیم غلام نجف خاں سے ملا کرتا تھا۔ ہفتہ میں دو دو روز ان کے پاس جاتا تھا اور وہ بھی وقت معین پر میرے پاس آتے تھے اتفاقاً حکیم غلام نجف خاں کچھ ناراض ہوگئے، میں بدستور ان کے پاس جاتا رہا اور ملتا رہا مگر انہوں نے آنا چھوڑ دیا۔ بہت دنوں تک میں نے اس کا کچھ خیال نہ کیا آخر میں نے بھی ان کے ہاں جانا آنا بہت کم کر دیا۔ ایک دفعہ میری والدہ نے مجھ سے کہا کہ میں سمجھتی ہوں کہ تم اب حکیم غلام نجف خاں کے پاس بہت کم جاتے ہو اس کا کیا سبب ہے؟ میں نے جو بات تھی وہ کہی"۔ اس پر والدہ نے سرسید کو نصیحت کی اور وضع داری کے وہ آداب بتائے جو کل تک ہمارے یہاں رائج تھے اور آج ان کا چلن ختم ہوگیا ہے، سنہ ۱۸۴۶ء میں جب سرسید نے آثار الصنادید لکھی تو اس میں دوسرے خاصان دہلی کے ساتھ حکیم غلام نجف خاں کا ذکر خیر بھی مناسب اور مداحانہ رنگ میں کیا۔ مولینا حالی نے حیات جاوید[1] میں لکھا ہے کہ سرسید

۱؎ اس وقت حیات جاوید سامنے نہیں ہے، مطلب یہی تھا۔

جب ۱۸۶۹ء میں انگلستان جانے لگے تو حکیم صاحب نے ان کے نام ایک خط میں اپنے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ آپ یورپ سے متاثر تو نہیں ہو جائیں گے؟ سرسید کو حکیم صاحب کے اس خدشہ سے بہت دکھ پہنچا تھا جس کا اظہار ان کے خط میں لہجے سے ہوتا ہے مثلاً ۔ میں یقینی سمجھتا ہوں کہ آپ کے خیالات وہی قدیم پرانے دقیانوسی ہندوستانیوں کے سے ہیں حال کے زمانے کی جو باتیں ہیں نہ وہ ذہن میں آتی ہیں نہ پسند ہوتی ہیں " ۔ پھر اپنی صفائی میں کہتے ہیں ۔ میں جیسا کہ خود اپنی تحقیق سے دین اسلام کو حق سمجھتا ہوں اس قدر یقین آپ کے شہر کے بڑے بڑے لمبی داڑھی والوں کو اور ہزاروں دانے والی تسبیح والوں کو اور جو مکہ مدینہ سے پیرو مرشد کا جبہ و دستار لے کر آتے ہیں ان کو بھی نہیں ہے والسلام" (ص ۳۷/۳۸ مکتوبات سرسید)

حکیم غلام نجف خاں اور غالب

مرزا غالب کا سن ولادت ۱۷۹۷ء ہے اور حکیم کا ۱۸۰۹ء غالب ۱۵، ۱۶ سال کی عمر میں آگرے سے دہلی منتقل ہو گئے تھے اور حکیم صاحب شیخوپور سے ۵ سال کی عمر میں، اس طرح دونوں کا ورود دہلی کم و بیش ایک ہی زمانے میں ہوا تھا ۔ حکیم صاحب غالب سے ۱۲ سال چھوٹے تھے یہ فرق زیادہ اور طرفین کی دوستی اور بے تکلفی میں چنداں مانع نہیں ہے مگر حکیم صاحب اور غالب کے تعلقات دوستانہ نہیں، خوردانہ و بزرگانہ بلکہ باپ بیٹے جیسے تھے، اس کا سبب میرے خیال میں ایک تو یہ ہے کہ غالب صاحب حکیم صاحب کے استاد حکیم احسن اللہ خاں کے ہم سن اور دوست تھے، دوسرے شاید حکیم صاحب نے غالب سے فارسی وغیرہ کی تعلیم بھی حاصل کی تھی اور ممکن ہے حکیم صاحب کو کبھی کبھار شعر کہہ لینے کا بھی ذوق ہو اور جیسا کہ مرزا محمد عسکری نے لکھا ہے ۔

"فن شعر میں ان (غالب) سے مشورے کرتے تھے" (ص ۳۲۹ ادبی خطوط غالب)

جس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ غالب اگرچہ دوسروں کے خطوط میں انہیں" دوست صادق الولا" لکھتے ہیں لیکن خود ان کے نام کے خطوط میں غالب کا انداز تخاطب بزرگانہ، استادانہ اور پدرانہ ہے، اپنی اہلیہ کو حکیم صاحب کی ماں "والدہ" اور "استانی" لکھتے ہیں، خود حکیم صاحب کی زبانی لکھتے ہیں کہ تم مجھے باپ اور استاد کہتے ہو" خطوں ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی اہلیہ سے حکیم صاحب کا پردہ بھی نہیں تھا ۔

ایک ہی شہر میں رہنے کی وجہ سے کبھی کبھی رقعوں کے تبادلہ کے سوا باقاعدہ مراسلت کی ضرورت نہیں ہوتی. غدر میں جب حکیم صاحب شیخوپور چلے گئے تھے یا جب غالب رام پور جاتے تھے تو مراسلت ہوتی تھی اور دیے معلی میں حکیم صاحب کے نام غالب کے ۲۳ خطوط ہیں، جو حکیم صاحب کی غالب سے نیازمندی اور غالب کی حکیم صاحب سے بزرگانہ شفقت اور طرفین کے بے تکلف روابط کے آئینہ دار ہیں ۔

حکیم صاحب غدر میں دہلی سے چلے ہیں، وطن کا عزم ہے مگر راستوں کے مخدوش ہونے کی وجہ سے منزلیں کرنی پڑی ہیں اور ابھی دو جانے میں ہیں غالب کو معلوم ہوتا ہے تو لکھتے ہیں ۔

میری جان! کہ ابھی تک دو جانے میں ہو؟

غالب رام پور گئے ہوئے تھے، حکیم صاحب نے کہیں استانی کے اضطراب کو دیکھ کر لکھ دیا کہ آپ اپنے گھر خط جلد جلد لکھا کیجیے اس پر غالب لکھتے ہیں۔

"یہ تم کیا لکھتے ہو کہ گھر میں خط جلد جلد لکھا کرو کیا تم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ جاؤ اور پڑھ کر سناؤ۔ ۔ ۔ ۔ تم میرا یہ خط لفافہ میں لے جاؤ اور حرف بحرف پڑھ سناؤ"

رام پور ہی سے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"تم کو میرے کھانے کی طرف سے تشویش ہے خدا کی قسم میں یہاں خوش اور تندرست ہوں"

ایکبار غالب نے حکیم صاحب کے صاحبزادہ حکیم ظہیر الدین خاں کو خط لکھا، حکیم صاحب نے وہ کھول لیا[1] اور غالب کو لکھ بھی دیا اس پر لکھتے ہیں۔

ظہیر الدین کا خط تم نے کیوں کھولا؟ وہ مغلوب الغضب ہے تم پر خفا ہوگا۔"

ایک بار حکیم صاحب کا ہیرا سنگھ نامی کوئی خفقانی مریض، حکیم صاحب کا علاج ترک کر کے چلا گیا، اس نے دوبارہ رجوع کرنا چاہا تو حکیم صاحب نے ٹال دیا وہ غالب کے پاس پہنچا اور یہ دلچسپ سفارش نامہ لکھوایا۔

اگر تم نے مجھے بنایا ہے یعنی استاد اور باپ کہتے ہو اگر یہ امر از روئے تمسخر ہے تو خیر اور اگر از روئے اعتقاد ہے تو میری عرض مانو اور ہیرا سنگھ کی تقصیر معاف کرو، بھائی! انصاف کرو اس نے اگر حکیم احسن اللہ خاں سے رجوع کی وہ تمہارے بھائی بھی ہیں اور تم کو ان سے استفادہ بھی ہے اگر حکیم محمود خاں کے پاس گیا ان کے باپ سے تم کو نسبت تلمذ کی ہے ابتدا میں ان سے پڑھے ہو پس یہ غریب سوائے تمہارے اگر گیا تو تمہارے ہی علاقے میں گیا وہ بھی گھبرا کر از خفقان تنگ آکر اب جو حاضر ہوتا ہے تو لازم ہے کہ اس پر بہ نسبت سابق کے زیادہ توجہ فرماؤ اور بدل اس کا معالجہ کرو"

غالب کی حکیم صاحب سے محبت، یگانگی اور اپنایت کا سب سے زیادہ بھرپور مظہر وہ خط ہے جس میں انہیں غصہ آگیا ہے اور اس غصہ میں انہیں لڑکا تک لکھ گئے ہیں حالانکہ وہ اس وقت ۴۷، ۴۸ سال کے تھے (خط کو منشی مہیش پرشاد اور مہر صاحب مارچ سنہ ۱۸۵۸ء کا فرض کرتے ہیں) قصہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا شہاب الدین خاں ثاقب غالب کے دیوان مطبوعہ کی کاتب سے نقل کروا رہے تھے کسی صفحہ پر غالب کی غزل کے حاشیے میں اس زمین میں کسی دوسرے شاعر کے اشعار بھی کسی نے ہاتھ سے لکھ دیئے تھے مرزا شہاب الدین نے رفع اشتباہ کیلئے خود غالب سے خط لکھ کر پوچھ لینا مناسب جانا کہ کیا یہ اشعار بھی آپ ہی کے ہیں؟ بس اس پر غالب بپھر گئے، لکھتے ہیں،

بھائی شہاب الدین خاں واسطے خدا کے تم نے اور حکیم غلام نجف خاں نے میرے دیوان کا کیا حال کر دیا ہے؟

---

[1] کسی کا، چاہے وہ بیٹا یا باپ ہی کیوں نہ ہو خط کھول لینا بہت بڑا اخلاقی جرم ہے تعجب ہے کہ غالب نے بھی اس اخلاقی پہلو کو واضح کرنے کے بجائے صرف بیٹے کی خفگی کا اندیشہ ظاہر کیا ہے۔

یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں خدا جانے کس ولد الزنا نے داخل کر دیئے ہیں دیوان تو چھاپے کا ہے متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں اگر حاشیے میں ہوں تو میرے نہیں ہیں۔۔۔۔۔۔۔

ایک تو لڑکے میاں غلام نجف اور دوسرے تم۔ میری کم بختی بڑھاپے میں آئی کہ میرا کلام تمہارے ہاتھ پڑا "

خط کے مکتوب الیہ شہاب الدین خاں، نیر کے صاحبزادہ اور سراج الدین احمد خاں سائل کے والد تھے انہی شہاب الدین خاں کو کو ایک رباعی میں بھی ڈانٹا ہے۔

رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے
ثاقب حرکت کی ہے یہ بیجا تم نے
حاجی کلو کو دے کے بے وجہ جواب
غالب کا پکا دیا کلیجا تم نے

مرزا شہاب الدین کے علاوہ علائی اور مولوی عزیز الدین وغیرہ کے خطوط میں بھی حکیم صاحب کا ذکر ملتا ہے۔

حکیم ظہیر الدین احمد خاں

حکیم غلام نجف خاں کے فرزند رحیم احمد مسعود صاحب کی اپنی خاندانی بیاض سے حکیم ظہیر الدین احمد خاں کا سن ولادت ۱۸۴۶ء ہے مگر مجھے اس میں تامل ہے۔ حکیم غلام نجف خاں کی شادی سنہ ۱۸۳۴ء میں ہوئی تھی اور صرف دو اولادیں ہوئیں ایک لڑکی رحمت النسا بیگم جن کی شادی تفضل حسین خاں سے ہوئی تھی رحمت النسا کا سن ولادت اور سن ازدواج کا تو علم نہیں ہو سکا مگر غالب کے ایک خط بنام حکیم غلام نجف خاں (۲۶ دسمبر ۱۸۵۷ء) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کے ایک لڑکی بھی ہو چکی تھی[۱]۔ اس لئے رحمت النسا بیگم کی عمر تقریباً ۲۰ سال فرض کریں تو ۱۸۳۷ء ان کا سن ولادت ہوگا ظہیر الدین احمد اگر بہن سے بڑے نہیں چھوٹے بھی تھے تو زیادہ سے زیادہ سنہ ۱۸۴۰ء ان کا سن ولادت ہونا چاہئے۔ ان کو بہادر شاہ نے منیر الدولہ کا خطاب دیا تھا۔ ظہیر الدین احمد خاں کی پہلی شادی عظیم اللہ خاں دہلوی کی دختر سے ۶ دسمبر سنہ ۶۵ء میں ہوئی جن سے صرف ایک فرزند حکیم رضی الدین خاں ہوئے، دوسری شادی ربیع الاول ۱۲۹۱ھ (اپریل ۱۸۷۴ء) سید مہربان شاہ منصف دہلوی سے ہوئی جن سے ریاض الدین پیدا ہوئے۔

حکیم ظہیر الدین خاں اپنے خاندانی مشغلہ طبابت کے علاوہ سماجی زندگی میں دلچسپی لیتے تھے چنانچہ وہ حکومت برطانیہ کیطرف سے آنریری مجسٹریٹ درجہ دوم بنائے گئے تھے۔ اس کے علاوہ میونسپل بورڈ کے ممبر بھی تھے۔ تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔

---

[۱] جنوری سنہ ۱۸۵۸ء میں اس لڑکی کا انتقال ہو گیا۔ یہ اطلاع غالب کے ایک خط (۱۹ جنوری سنہ ۱۸۵۸ء) سے حاصل ہوئی ہے۔ غالب لکھتے ہیں: "لڑکی کا حال معلوم ہوا حق تعالی اس کی ماں کو صبر دے اور زندہ رکھے میں (تو) یوں سمجھتا ہوں کہ یہ بچہ کر کی قسمت والی تھی" (جو یہ حالات دیکھنے کے لئے دنیا میں نہ رہی)

غالب، ظہیر الدین احمد خاں کو بھی پوتے کی طرح چاہتے تھے، ظہیر الدین خاں بھی غالب کے یہاں کثرت سے آتے جاتے تھے ایک بار ان کے حقیقی چچا نجم الدین حیدر نے انہیں ایک توپ کا کھلونا بھیجا، تو ان کی طرف سے غالب نے اس کے شکریہ کا ایک دلچسپ خط تحریر کیا جو عود ہندی میں شامل ہے، خود ظہیر الدین خاں کے نام ایک خط (۲ر نومبر ۶۵ء) لکھا ہے

اقبال نشان حکیم ظہیر الدین احمد خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے، کہو میاں تمہارا مزاج کیسا ہے اور تمہارے بھائی (یعنی) مرزا تفضل حسین کیسے ہیں اگر ملو تو میری دعا کہنا اور مزاج کی خبر پوچھنا اور اپنے والد ماجد کو میری دعا کہنا اور کہنا تمہارا خط میرے خط کے جواب میں تھا اس صورت میں اور کوئی جائے جواب طلب نہ تھی سنو میاں ظہیر الدین تم اپنی دادی کے پاس ابھی چلے جاؤ اور ان سے میری اور دونوں لڑکوں کی خیر و عافیت کہو اور پوچھو کہ شہاب الدین خاں نے اکتوبر کے مہینے کی تنخواہ بچاس روپے پہنچا دیئے یا نہیں کیدار ناتھ ڈیوڑھی پر آ کر جعفر بیگ، وفادار وغیرہ کی تنخواہ بانٹ گیا یا نہیں اچھا میرا بیٹا یہ دونوں باتیں اپنی دادی سے پوچھ کر جلد مجھ کو لکھیو، دیر نہ کیجیو، خط کے جواب کا طالب غالب، پنجشنبہ ۲ر نومبر ۱۸۶۵ء

مگر غالب نے ظہیر الدین خاں کے نام یہ ایک ہی خط نہیں اور بھی متعدد خط لکھے تھے مگر وہ شاید ضائع ہو گئے۔ مثلاً یکم اپریل ۱۸۶۵ء کو حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں، "پہلے ظہیر الدین کا خط آیا پڑھتے ہی اس کا جواب لکھ دکھا دوسرے دن ڈاک میں بھجوایا" اس کے علاوہ حکیم غلام نجف خاں کے نام متعدد خطوط کے آخر میں حکیم ظہیر الدین خاں کے نام مستقل خطوط ہیں۔

مثلاً ۱۱ر جنوری ۱۸۶۳ء کے خط کے آخر میں لکھتے ہیں کیوں ظہیر الدین کیا میں اس لائق نہ تھا کہ تو ایک خط مجھ کو الگ لکھتا یا اپنے باپ کے خط میں اپنے ہاتھ سے بندگی لکھتا۔ حکیم غلام نجف خاں خط لکھنے بیٹھے تیری طرف سے) بندگی لکھ دی تیرے فرشتوں کو خبر نہیں۔ اس بندگی کے آنے کی مجھے کیا خوشی ہو؟"

یکم اپریل ۱۸۶۵ء حکیم ظہیر الدین خاں کو دعا! بیٹا دیکھو اس وقت مجھ میں دم نہیں دعا پر قناعت کر تیرے خط کا جواب جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں بھیج چکا ہوں جھوٹے پر لعنت تو بھی کہہ بیش باد"

۱۲ر اکتوبر ۱۸۶۵ء ظہیر الدین خاں بہادر کو دعا پہنچے یہ خط لے کر تم اپنی دادی صاحبہ کے پاس جاؤ اور یہ خط پڑھ کر سناؤ اور ان سے کہہ دو کہ وہ بات جو میں نے تم سے کہی تھی وہ غلط ہے اس کی کچھ اصل نہیں ہے! باقی خیر و عافیت"

حکیم ظہیر الدین خاں کے ایک صاحبزادے ریاض الدین تو نو عمری ہی میں انتقال کر گئے دوسرے صاحبزادہ حکیم رضی الدین خاں تھے وہی ان کے علوم کے وارث اور ان کی واحد جسمانی یادگار تھے۔ ۱۸۶۷ء یا ۶۸ میں پیدا ہوئے علوم مروجہ کی تعلیم کن اساتذہ سے پائی اس کا علم نہ ہو سکا، طب کے اسرار و غوامض کی تعلیم یقیناً اپنے یگانۂ عصر آباء و جد سے حاصل کی ہوگی۔ مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکی بھی مرحوم کے اساتذہ میں تھے۔ مولانا جب علوم طبیہ کی تحصیل کے لئے حکیم غلام نجف خاں کے پاس مقیم تھے تو حکیم صاحب نے مولانا کے حسن کردار اور اخلاق، و فضل و کمال کو دیکھ کر اپنے پوتے رضی الدین خاں کی تعلیم مولانا کے سپرد کی تھی (رموز الاطبا جلد اول ص۳۳)

حکیم رضی الدین خاں اپنے عہد کے نامور، نیک نام، فاضل و عظیم المرتبت طبیب و معالج تھے۔ برطانوی حکومت کی طرف سے انہیں خان بہادر کا خطاب ملا تھا اس کے علاوہ خطاب شفاء الملک پہلی بار حکیم رضی الدین خاں کو دیا گیا تھا۔ وہ دہلی کے آنریری مجسٹریٹ بھی رہے، سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہتے تھے۔ دہلی میں مشہور گھنٹہ گھر حکیم صاحب ہی کی سعی سے تعمیر ہوا تھا، سنہ ۱۹۱۱ء کے دربار تاج پوشی کی نمائش میں حکیم صاحب نے مغل سلاطین کے وہ فرمان جو ان کے پاس محفوظ تھے نمائش میں رکھے تھے (نواب فریدیہ از سلطان حیدر جوش ص۱۴۸)

شفاء الملک حکیم رضی الدین اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں ہم عصر و ہم عمر ہی نہیں باہم حریف بھی تھے، طب و سیاست دونوں میدانوں میں ان بزرگوں کے معرکے رہتے تھے مگر تعلقات و اشراف کی چشمکوں اور اختلافات کے بھی کچھ آداب ہوتے تھے، کچھ حدود ہوتی تھیں، ایک خاص انداز ہوتا تھا، ایک معیار ہوتا تھا۔ ملا واحدی صاحب لکھتے ہیں، حکیم اجمل خاں کا مقابلہ دو صاحبوں نے کیا۔ حکیم اجمل خاں کا کیا حکیم اجمل خاں کی پارٹی کا۔ ایک صاحب تو حکیم ہی تھے اور خاندانی اور بلند مرتبہ حکیم رضی الدین خاں اور دوسرے امراؤ مرزا حیرت یہ بھی شرفائے شہر میں تھے، دونوں بے انتہا ذہین تھے، حکیم رضی الدین خاں اپنے تئیں حکیم اجمل خاں سے نیچا نہیں رہنے دینا چاہتے تھے حکیم رضی الدین خاں کا حکیم اجمل خاں سے مقابلہ بس اتنا تھا کہ حکیم رضی الدین خاں کے ہم جلیس حکیم اجمل خاں کے یہاں نہیں جاتے تھے اور حکیم اجمل خاں کے ہم جلیس حکیم رضی الدین خاں کے یہاں نہیں آتے تھے (میرے زمانے کی دلی ص۶۶)

مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے علی گڈھ کالج کے مسلم یونیورسٹی بنانے کی تحریک کے سلسلے میں دہلی میں ۵ مارچ ۱۹۱۱ء کو جلسۂ عام منعقد کیا، سیرت اجملؒ میں لکھا ہے کہ شفاء الملک بھی جلسے میں شریک مگر چند کچھ زیادہ نہ ہو سکا۔ جلسہ کی کامیابی میں جو چیز حائل تھی وہ حکیم صاحب اور شفاء الملک حکیم رضی الدین مرحوم کے اختلافات تھے۔

ہم نے دانستہ اس قسم کی تفصیلات سے گریز کیا ہے کیونکہ اب نہ مسیح الملک ہیں نہ شفاء الملک ہیں اور نہ ان ہنگاموں میں حصہ لینے والے افراد باقی ہیں،،

اب یہ سن لیجئے کہ سیرت اجمل، مسیح الملک حکیم محمد جمیل خاں کی زیر نگرانی ہندوستانی دواخانہ دہلی کی طرف سے شائع ہوئی ہوئی تھی، الحمد للہ ان بزرگوں کی ثقاہت و شرافت کا پیکر ان کے اخلاف کرام بھی ہیں جو تلخیوں کی یاد کو بھلا دینا چاہتے ہیں،

حکیم رضی الدین کو خدمت خلق اللہ کی زیادہ مہلت عطا نہیں کی گئی وہ صرف ۴۸ سال کی عمر میں ہیضہ میں مبتلا ہو کر ۱۹۱۶ء میں رحلت فرما گئے، حکیم رضی الدین خاں کی نرینہ اولاد میں صرف حکیم ناصر الدین احمد خاں عرف چنو میاں تھے۔ جو اپنے عہد میں دہلی کے معروف بلند پایہ طبیب تھے۔ اپنے اسلاف کرام کے علوئے ظرف، حسن کردار، بزرگی اور فضل و کمال کا مظہر تھے۔ آن بان کے آدمی تھے۔ وضع داری ورثہ میں ملی تھی، سن ۱۹۳۰ء میں میرے والد مرحوم علامہ حکیم سید محمد احمد کے وصال کی خبر سنی تو تعزیت کے لئے ٹونک تشریف لے گئے، سن ۵۱ء میں آل انڈیا طبی کانفرنس کے اجلاس دہلی کے موقعہ پر ہمدرد دواخانہ کی دعوت میں صف اول میں وزراء و مشاہیر کے ساتھ بیٹھے تھے، مجھ پر کہ آخری صفوں میں ایک گوشے میں دبکا بیٹھا تھا نظر پڑ گئی، سب کو نظر انداز کر کے

میرے پاس تشریف لے آتے اور التفات و کرم کے مظاہرے فرماتے کہ مجھ شرمیلے اور اخفا شعار کو پسینے آ گئے۔

دہلی میں بڑی شان سے مطب کرتے تھے۔ قومی و ملی خدمات کے لئے بھی وقت نکال لیا کرتے تھے ایک عرصہ تک نظام دکن کے طبیب کی حیثیت سے دکن میں رہے سقوطِ دکن کے بعد پھر دہلی کو شرفِ اقامت بخشا تھا۔ آخر میں صدر جمہوریہ ہند کے معالج یونانی کے سرکاری منصب کو زینت بخشی مگر چند ہی روز بعد اس دنیا میں اپنے محاسن و محامد کی صرف یادیں چھوڑ کر چل بسے۔

۱۸۹۳ء میں یہاں آئے تھے۔ سنہ ۱۹۵۸ء میں وہاں چلے گئے،

ان کے عظیم المرتبت باپ کے یگانۂ روزگار حریف مسیح الملک حکیم اجمل خاں کا شعر ہے۔

بس ایک ذات حضرتِ شیدا کی ہے یہاں
دہلی سے رفتہ رفتہ سب اہلِ ہنر گئے

پس آورد

سنہ ۱۸۴۹ء میں مرزا غالب کی فارسی کتاب "پنج آہنگ" مطبع سلطانی دہلی میں حکیم صاحب (معتمد الدولہ حکیم غلام نجف خاں بہادر) کے اہتمام سے شائع ہوئی تھی (مالک رام، غالب کی فارسی تصانیف، غالب نمبر نگار کراچی) حکیم صاحب کی طرف سے اس کا منظوم اشتہار شائع ہوا تھا۔ یہ ۲۳ شعروں کی ایک مثنوی ہے جس کا اکیسواں شعر یہ ہے۔

میں جو ہوں درپئے حصولِ شرف نام عاصی کا ہے غلام نجف

، مولینا غلام رسول مہر نے اپنے مرتبہ دیوانِ غالب (غلام علی اینڈ سنز لاہور سنہ ۱۹۶۷ء) میں اسے کلام غالب میں منسوب کر کے شائع کر دیا ہے۔

خواجہ محمد شفیع دہلوی کے پاس غالب کے دیوانِ اردو کا جو قلمی نسخہ ہے اس کے آخر میں وہ خط بھی ہے جو غالب نے حکیم ظہیر الدین خاں کی طرف سے ان کے چچا ڈپٹی نجم الدین حیدر کو لکھا تھا۔ اس خط اور عود ہندی کے مطبوعہ خط میں چند لفظی اختلافات کے علاوہ یہ اضافہ بھی ہے کہ خط کے آخر میں ظہیر الدین خاں کے نام یہ خط بھی ہے۔

" میاں ظہیر الدین! ہم نے مسودہ لکھ کر بھیج دیا ہے تم اس کو اپنے آبا سے پڑھ لو اور اس کی نقل کرا کر اپنے چچا جان کو بھیج دو"

(اکبر علی خاں، "کچھ غالب کے بارے میں" غالب نمبر فروغ اردو لکھنؤ)

مولوی رضی الدین بسمل بدایونی نے اپنی کتاب کنز التاریخ (تالیف سنہ ۱۹۰۲ء طباعت سنہ ۱۹۰۷ء) میں لکھتے ہیں۔

" ۱۱ مئی سنہ ۱۸۵۷ء کو (دس یا پندرہ روز بعد) ایک اور واقعہ پیش آیا حکیم محمد احسن اللہ خاں وزیر ابوظفر بہادر شاہ

پر تلنگوں کو شبہ اس امر کا ہوا کہ یہ انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں۔ دفعتہً فوج باغیوں کی ان کے مکان پر چڑھ آئی حکیم صاحب اس سے پہلے قلعہ کو جا چکے تھے ان کا محل سرا جو دہلی میں ایک اعلیٰ درجہ کا مکان تھا اور عمدہ اسباب فرش و فروش سے آراستہ اس میں تلنگوں نے اپنی مداخلت کی، ہمارے دوست حکیم ظہیر الدین خاں صاحب نے جو ہمارے ہم عمر ہیں بمعیت خدام کے مستورات کو زنان خانہ سے بالاخانہ کی راہ سے ہمسایوں کے مکان میں اتار دیا اور خود بھی چلے گئے حکیم غلام نجف خاں صاحب پدر حکیم ظہیر الدین صاحب و زیر موصوف کے بہنوئی تھے یہ صاحب باہر دیوان خانے میں حکیم صاحب کے رہتے تھے اور ہمارے خاندان کے ایک شیخ صاحب بھی وہیں مقیم تھے۔ جب بلوائی اندر مکانات حکیم صاحب کے آئے ان کی ہمراہی میں شہر کے لیڑے بھی تھے اس وقت ایک لیڑے نے ان سے یہ کہا کہ اگر تلنگوں کو یہ معلوم ہوا کہ تم حکیم صاحب کے رشتہ دار ہو تو فوراً قتل کر ڈالیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم لوگوں کے ساتھ تم بھی کچھ اسباب مثل حقہ وغیرہ کے لے لو تاکہ تلنگے تم کو ہمارے ساتھی سمجھیں چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا کسی نے قالین بغل میں دبایا کسی نے حقہ ہاتھ میں لیا اور بھاگ کے باہر نکل آئے۔ اب تلنگوں نے تمام اثاث البیت حکیم صاحب کا لوٹ لیا اور تمام شیشے کے آلات کو توڑ ڈالا اور مکان کو برباد کیا اور حکیم صاحب کی جان بسفارش ابوظفر بہادر شاہ کے بچی"

ص ۳۱۳ تا ص ۳۱۴ حاشیہ

مولوی رضی الدین کے اس بیان سے حسب ذیل امور واضح ہوتے ہیں۔

(۱) حکیم غلام نجف خاں اپنے برادر نسبتی حکیم احسن اللہ خاں کے ساتھ رہتے تھے اور غدر کے ہنگامے سے متاثر ہوئے تھے۔

(۲) حکیم ظہیر الدین خاں کو مولف کتاب نے اپنا ہم عمر لکھا ہے اور اپنی تاریخ پیدائش ایک جگہ ۱۸۴۶ء بتائی ہے۔ گویا حکیم ظہیر الدین خاں کا بھی سن ولادت تقریباً یہی ہے۔

(۳) سنہ ۱۹۰۲ء تالیف کتاب تک حکیم ظہیر الدین خاں بقید حیات تھے۔

دیویندر پرشاد سکسینہ بدایونی

منشی بالمکند بے صبر

"تلمیذ غالب"

ہندوؤں نے اردو ادب کی جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اس کا سلسلہ اردو کے جنم دن سے آج تک چلا آیا ہے کایستھوں کو اس باب میں خاص امتیاز حاصل رہا ہے، منشی جوالا پرشاد برقؔ، نوبت رائے نظرؔ، دوارکا پرشاد افقؔ، ہرگوپال تفتہؔ، بالمکند بے صبرؔ، شیام موہن لال جگرؔ بریلوی، اور بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی کی نسل معنوی آج تک بدستور سرگرم کار ہے۔ اس مقالہ میں مرزا غالبؔ کے ایک شاگرد بے صبرؔ کے حالات پیش کئے جاتے ہیں۔

اُتر پردیش کے ضلع بلند شہر میں ایک چھوٹا سا قصبہ سکندرآباد ہے اس میں ایک زمانہ سے زیادہ تر کایستھ آباد رہتے اور یہاں کے کایستھوں میں علم و ادب کا چرچا تھا۔ منشی ہرگوپال تفتہ اور منشی بالمکند بے صبر جیسے اساتذۂ سخن کی جنم بھومی ہونے کا فخر اسی قصبہ کو حاصل ہے۔

بالمکند بے صبر سکندرآبادی :۔ بالمکند نام بے صبرؔ تخلص منشی کاہن سنگھ کے بیٹے تھے۔ سنہ ۱۸۳۱ء میں بمقام سکندرآباد ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے، وہاں کے ایک متمول بھٹناگر کایستھ خاندان سے آپ کا تعلق تھا۔ بے صبر کے بزرگ، دُگال صوبہ پنجاب کو خیرباد کہہ کر سکندرآباد ضلع بلند شہر میں آباد ہو گئے تھے یہ خاندان دولت امارت اور وجاہت میں سارے ہندوستان میں مشہور تھا۔ بے صبرؔ بچپن اور جوانی تک سکندرآباد میں رہے انہوں نے ابتدائی تعلیم فارسی اور اردو کی اپنے والد سے حاصل کی۔ پندرہ سال کی عمر میں عربی، فارسی اور اردو میں کمال حاصل کیا۔ ابتدا میں اپنے ماموں مرزا ہرگوپال تفتہ کو کلام دکھایا اور علم عروض بھی حضرت تفتہ سے ہی پڑھا اور تفتہ ہی کے ایما سے مرزا غالب کی شاگردی اختیار کی۔ بے صبرؔ نے اپنے کلیات میں غالبؔ اور تفتہ دونوں ہی کی شان میں قصیدے لکھے ہیں۔ مرزا غالبؔ اور بے صبرؔ کے تعلقات کا اندازہ اردوئے معلیٰ کے خطوط سے کیا جاسکتا ہے۔ سترہ سال کی عمر میں بے صبرؔ نے محکمۂ بندوبست میں ملازمت اختیار کی اور کچھ عرصہ بعد کلکٹری سہارنپور

میں ملازم ہو گئے۔ اور ۱۸۶۴ء میں پنشن لے کر خانہ نشین ہو گئے اور شنکر جی مہاراج کی بھگتی میں بالکل رنگ گئے۔ شنکر جی پر انہوں نے ایک مسدس لکھا ہے، شیومت کے پجاری اب بھی منشی بنواری لال شعلہ کی بزم بندرابن کی طرح مندروں میں بڑی عقیدت سے اس کا روزانہ پاٹھ کیا کرتے ہیں۔ آخری عمر میں اپنے دو بیٹوں کا غم سہا، جس کی وجہ سے بینائی نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ ۷۵ سال کی عمر طویل پا کر ۱۳ فروری ۱۸۸۵ء میں یہ جامع کمالات خادمِ ادب شیوراتری میں اس دارِ ناپائدار سے کوچ کر گیا۔ بے تبر نے محلہ مندق شہر میرٹھ میں ایک عالی شان مکان بنوایا تھا اور اسی مکان ہی میں ان کی وفات ہوئی۔ یہ مکان ان کے وارث اور پوتے جناب بابو گردھر سروپ کے قبضے میں ہے۔ بے صبر کا حلقہ تلامذہ بہت وسیع تھا۔ ان کے شاگردوں میں منشی بنواری لال شعلہ منشی شنکر سرپ ساقی اور حضرت عباس سہارنپوری کا شمار اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے۔

مالک رام صاحب نے "تلامذۂ غالب" میں تفتہ سے مشورۂ سخن کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ بے صبر نے تفتہ سے کبھی مشورۂ سخن نہیں کیا۔ تفتہ بے صبر کے ماموں تھے۔ ابتدا میں بے صبر نے اُن ہی کو کلام دکھایا اور تفتہ ہی کے ایما سے غالب کی شاگردی اختیار کی۔ میں نے بے صبر کی یادگار منشی گردھر سروپ سے اس سلسلے میں تحقیقات کی اُن کا بیان ہے کہ بے صبر نے ابتدا میں پانچ سات سال اپنے ماموں مرزا ہرگوپال تفتہ سے مشورۂ سخن کیا۔ مالک رام صاحب نے تلامذۂ غالب میں بے صبر کی تاریخ وفات بغیر کسی حوالے کے ۱۸۹۰ء لکھ دی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ بے صبر کے صاحبزادے بابو برہما سروپ نے بے صبر کی وفات پر ایک مضمون "بھٹناگر سماچار" میں لکھا تھا اس میں تحریر فرمایا ہے۔

"۷۵ سال کی عمر میں ۱۳ فروری ۱۸۸۵ء مطابق ۱۳۰۲ھ شیوراتری کو بمقام میرٹھ رحلت فرمائی"

بے صبر کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱- دیوان عام اردو (غیر مطبوعہ) یہ دیوان غزلیات، رباعیات اور قطعات پر مشتمل ہے

۲- دیوان خاص اردو (غیر مطبوعہ) یہ بے صبر کی غزلیات کا مجموعہ ہے۔

۳- دیوان فارسی (غیر مطبوعہ) منشی دین پرشاد بشاش نے تذکرہ آثار الشعرائے ہند میں اس کا ذکر کیا ہے

۴- دیوان قصائد اردو (غیر مطبوعہ) یہ ۴۲ قصائد ترکیب بند اور ترجیع بند کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں ایک قصیدہ "ہندوستان" کے عنوان سے ہے اس کے سلسلے میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی غالب اور بے صبر پر مقالہ لکھتے ہوئے اردوئے معلیٰ غالب نمبر ۱۹۶۲ء میں رقمطراز ہیں۔

"مخطوط کلیات بے صبر کا یہ تعارف نا تمام رہے گا اگر اس کے پہلے قصیدے کا ذکر نہ کیا جائے جو ہندوستان کی تعریف میں ہے اور جس کو میرے خیال میں اردو کی وطنی شاعری میں اولیت کا رتبہ حاصل ہونا چاہئے اس لئے کہ اس میں وطن کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ شعرا کے ماقبل سے مختلف اور نیا ہے"

۵- مثنوی لختِ جگر "یہ مثنوی ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی اس کا ایک نسخہ میرے کتب خانے میں محفوظ ہے

۶۔ مثنوی : جگر مشق ۔ یہ مثنوی ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی اس کا ایک نسخہ میں نے حضرت مدرث بیریمیٹی مرحوم کے یہاں دیکھا تھا۔

۷۔ سراپا سخن : یہ کتاب فروری ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی بے صبر نے اس کتاب میں اپنے دو بیٹوں منشی ہر سروپ اور منشی بنی سروپ کا سراپا اور نوحہ لکھا ہے۔

۸۔ رسالہ بدیع البدائع : یہ معرکتہ الآرا تصنیف ۱۸۸۱ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر مطبع دبیر ہند بلند شہر سے شائع ہوئی علم معنی اور صنائع و بدائع پر اردو میں سب سے پہلی کتاب منشی دیبی پرشاد سحر کی ہے اس کے بعد بدیع البدائع کا نمبر آتا ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بے صبر نے جملہ امثال اپنے ہی کلام سے پیش کی ہیں

۹۔ گلستان نثر اردو (غیر مطبوعہ) یہ کتاب شیخ سعدی شیرازی کے طرز پر لکھی گئی ہے یہ کتاب پانچ ابواب پر منقسم ہے اس کی عبارت میں بڑی سلاست اور روانی ہے۔

۱۰۔ رسالہ ادب البنات اردو نثر (غیر مطبوعہ) اس کتاب کا دیباچہ بے صبر نے خود لکھا ہے۔

مرزا غالب کے شاگردوں میں تفتہ، بے صبر اور مجروح نے جتنا ہم نشینی اور اصلاح کا فیض مرزا سے اٹھایا تھا اتنا شاید کسی اور شاگرد کے حصہ میں بہ حیثیت مجموعی نہ آیا ہوگا۔ تفتہ اور بے صبر خاک پاک سکندر آباد کے روشن ذرے تھے جو شہرت کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور اپنے کمال سے دنیائے شاعری کو منور کر دیا منشی دیبی پرشاد بشاش تذکرہ آثار الشعرائے ہند کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"ہندوؤں میں بہت سے ایسے شعرا ہیں کہ جن کے کلام کو ہندو مسلمان دونوں پسند کرتے ہیں۔ بھلا ایسا کون ہے جو بے صبر، جوہر، فرحت وغیرہ کے اشعار کی داد نہ دے۔"

محمد سلیم صدیقی نے لکھنؤ یونیورسٹی کے میگزین بابت ۲۹ - ۱۹۲۸ میں ہندوؤں کی اردو خدمات کے بارے میں ایک مقالہ لکھا ہے اس میں بے صبر کے متعلق (صفحہ ۱۹) پر لکھتے ہیں۔

"سخن سنجی و سخن طرازی سے بے صبر کو خداداد لگاؤ تھا کلام فصاحت و بلاغت کا دریا تھا۔ صنائع و بدائع کے یہ ناخدا تھے، معنی و محاورات روزمرہ کنایہ اشارہ تلاش و بندش الفاظ قابل دید ہے۔"

بے صبر کے فرزند شری بر جا سروپ کی رائے ملاحظہ فرمائیے۔

"اُن کا کلام فصاحت و بلاغت صنائع بدائع معنی و محاورہ جو چلہ بول چال روزمرہ کنایہ و اشارہ تلاش و بندش قابل ملاحظہ ہے کیونکہ پچپن برس کی مشق سخن ہے اور حضرت غالب کے شاگرد رشید ہیں اور مرزا غالب اور مرزا تفتہ کے بعد حضرت بے صبر کا دم غنیمت ہے۔"

بے صبر کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

ہر طرف سے ابروئے عاشق کا وہ پردار ہے ۔۔۔ تیر بہ تیر اور تلوار بہ تلوار ہے

پاس آیئے ذرا نہ مقام ہراس ہے　　خدمت میں آپ کی مجھے کچھ التماس ہے
بیلے قراری ہی بے قراری ہے　　کہ زمین زلزلہ میں ساری ہے
دھار آنکھوں سے میری جاری ہے　　کوئی طوفاں ہے یا کہ زاری ہے
جز تجھ بغیر شیشہ و جام شراب ہے　　اپنا دلِ پر آتش و چشم پر آب ہے
دم ناصح ہے بند اک شور وحشت سے زمانے میں　　سنے ہے کون طوطی کی صدا نقار خانے میں
کچھ بن آتی نہیں بے صبر و بہ قول جرات　　قید عصمت میں ہے وہ جن کے گرفتار ہیں ہم
ہائے افسوس کس آفت میں گرفتار ہیں ہم　　موت آتی نہیں اور زیست سے بیزار ہیں ہم

بے صبر نے مرزا غالب کی وفات پہ اردو اور فارسی میں کئی تاریخیں کہی ہیں اردو کا قطعہ ملاحظہ فرمایئے۔

اسد اللہ خاں وہ غالب آہ　　جس سے اہل کلام تھے مغلوب
جب سدھارے سوئے خلد ہوئے　　سخن ان کے الم میں سینہ کوب
اس سپہر سخن کے اختر کا　　مجھکو سال غروب تھا مطلوب
کہا میں نے از سر حسرت　　ہوا حیف آفتاب ہند غروب

۱۸۶۹ء = ۱۸۶۱

بے صبر کو اپنے استاد مرزا غالب سے والہانہ عقیدت تھی وہ ایک قصیدے میں مرزا غالب کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔

جس کا غالب ہے تخلص اسد اللہ ہے نام　　یہ تو ہے کفر جو کہئے کہ ہے یزداں میرا
پیر ہے ہادی مرا رہبر میرا استاد مرا　　قبلہ ہے کعبہ ہے دیں میرا ہے ایماں میرا
مجکو گویا ہے حدیث اس کا جو اردو ہے کلام　　فارسی کا وہ دیوان ہے قرآن میرا
انوری ہے وہی اور وہی مرا خاقانی ہے　　آگرہ ہند ہے اور دلی ہے شروان میرا
فاریاب اس کا ہے گھر کوچہ ہے اس کا ساوج　　ہے ظہیر اپنا وہی اور وہی سلمان میرا
دیر عرفی و ثنائی پہ جبیں سا نہیں میں　　کعبہ شیراز ہے نے قبلہ صفاہاں میرا

نام پر کالہ آتش ہے قصیدے کا مرے
کہ وہ بے صبر ہے سوز دلِ سوزاں میرا

رخشاں ابدالی - کراچی

صوفی منیری تلمیذِ حضرت غالب

برصغیر کا وہ خطہ جو کبھی مگدھ دیس کہا جاتا تھا اور جو کبھی بنگال کا تابع مہمل رہا اور کبھی اڑیسہ اس کا جزو بن کر وہ بہار و اڑیسہ کہلایا اور جو اب ریاست بہار کہا جاتا ہے۔ جس کا دار السلطنت کبھی پاٹلی پترا یا اور کبھی عظیم آباد اور اب پٹنہ ہے۔ اور جس کو اردو کی تاریخ ادب میں عظیم آباد کہا جاتا ہے۔ جس کو حضرت غالب (جن کی صد سالہ برسی کی تقریب سے رسالہ کی یہ اشاعت خصوصی ادارہ "العلم" قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہے اور راقم بھی یہ مقالہ آپ کے پیش نظر کر رہا ہے) "رنگیں[لہ] تر از فضائے چمن" سمجھتے ہیں۔ جو بیدل کی "پٹنہ نگری"[ٹہ] کی جنم بھومی، حضرت عشق[تہ] کا وطن ثانی، جوشش کا مسقط راس، شاد کا دیس اور آخر عظیم آبادی کا وطن تھا۔ جو اردو کا تیسرا مرکز سمجھا گیا۔ وہ خطۂ بہار ہمیشہ سے مردم خیز، ارباب علم و فن کا گہوارہ اور اہل کمال کا مخزن رہا ہے۔

طبقۂ شاہان و ملوک میں شیر شاہ سوری اسی کی خاک سے اٹھا اور طبقۂ صوفیا میں حضرت مخدوم[سہ] شرف الدین بہاری کی بت

لہ حضرت غالب فرماتے ہیں ؎

گفتمش چوں بود عظیم آباد — گفت رنگیں تر از فضائے چمن
گفتمش سبب خوش باشد — گفت خوشتر بیا شد از سوہن

(سوہن یعنی دریائے سون جو اضلاع عظیم آباد اور شاہ آباد آرہ کے درمیان واقع ہے)

ٹہ سرا و رحیب کوئی نہیں تو دشمن اپن کیس — پٹنہ نگری چھوڑ دہن بیدل چلے بدیس

تہ - آپ حضرت مخدوم یحیی منیری علیہ الرحمہ کے فرزند تھے۔ منیر شریف مولد اور سال ولادت ۶۶۱ھ اور بہار شریف مسکن اور وہیں آپکی درگاہ اور خانقاہ ہے۔ سال وفات ۷۸۲ھ ہے اور عمر شریف ۱۲۱ سال ہوئی تھی آپ خانوادہ فردوسیہ کے بزرگ تھے۔ علامہ شرف الدین توامہ بخاری دہلوی صاحب رسالہ منظومہ فقہیہ "نام حق" سے سنار گاؤں (اب واقع شرقی پاکستان) میں جا کر باقاعدہ تحصیل علوم دینیہ کر کے فراغت حاصل کی۔ اور حضرت خواجہ نجیب الدین فردوسی دہلوی سے بیعت کی اور اجازت و خلافت حاصل کی۔ "مکتوب صدی

اسی سرزمین سے ہے۔ علاء میں مُسلّم و مُسَلّم مصنف ملا محب اللہ بہاری کے نام کا جزو "بہاری" توکثرتِ اشتہار سے محتاجِ بیان نہیں ملا یحییٰ بہاری کہ اول میں منطقی تھے اور آخر میں صوفی، اسی خاک کی پیداوار تھے۔ مرزا بیدل جن کے تتبع و تقلید پر غالب کو فخر تھا اور راسخ جو میر کی تربیت کے فیض سے مدعی ہیں کہ انکے "شاگرد بھی صاحب دیوان ہوئے" اور جو فرماتے ہیں کہ

ہیں میر گذشتہ کے بدل حضرت راسخ
اب انکو سلامت رکھے اللہ تعالیٰ

اسی گلستان کے گلِ ہمیشہ بہار ہیں۔

بہا سی دنیا یہاں کے مظہر الحق۔ تحریک مسجد کانپور اور تحریک خلافت کے لیڈر۔ مولینا ابوالمحاسن محمد سجادؒ۔ سر علی امام کو فراموش نہیں کرسکتی۔ اطبا میں حکیم عبدالحمید پریشان اپنی مثال آپ تھے

مسلمانوں کی آمد وہاں محمد بن بختیار خلجی کی فتوحات کے پہلے ہی سے ہوئی۔ چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) میں قصبہ منیر میں مجاہدین کا بابرکت قدم آیا اور ان کی جانبازانہ پیش قدمی نے کفرستان منیر کو کہ اب حضرت منیر اور منیر شریف کھا قلمرو اسلام میں شامل کیا۔ (۵۷۶ھ دین محمد شاہ نوری) اور اسکے بعد بہار میں مسلمان زیادہ آنے لگے۔ حضرت امام محمد تاج فقیہؒ فاتح منیر، منیر کو فتح کر کے خود تو مراجعت فرمائے وطن ہوئے اور ان کی صالح اولاد یہاں مقیم ہوئی۔ آل اولاد میں بڑی بڑی شخصیتوں والے اور بڑی عظمتوں والے اہل اللہ اور اولیاء اللہ ہوئے۔ رحمہم اللہ۔

برصغیر میں اللہ کے ان نیک بندوں نے جہاں اصلاً اللہ تعالیٰ کا نام بلند کرنے اور اللہ کے دین کو پھیلانے اور نخلِ اسلام کو اس سرزمین میں بارآور کرنے میں زندگیاں گزاریں، وہیں یہ حقیقت ہے کہ ضمناً انھوں نے اس نئی زبان کو پروان چڑھانے میں، جو دو اجنبی قوموں کی ابتدائی افہام و تفہیم کی کوششوں کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھی بڑا کام کیا ہے۔ جس کے لئے اردو زبان و ادب اور محبانِ اردو انکے ہمیشہ ممنونِ احسان رہینگے۔

ہند و پاک کے جس جس علاقہ میں یہ پاک نفس اہل اللہ اقامت گزیں رہے وہاں انکے باطنی اور روحانی فیوض و برکات کے ساتھ ساتھ اردو زبان بھی انکے لسانِ فیض ترجمان کے جواہر پاروں سے اپنی جھولیاں بھرتی رہی۔

اردو کے نشو و نما، فروغ اور ترقی کی داستان میں جہاں تاریخ زبان اردو میں ہندوستان کے صوفیائے کرام، خواجہ بندہ نواز

---

۱ دوصدی "شرح آداب المریدین" "ملفوظ" "معدن المعانی" علاوہ دیگر کتب آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔

ل "کتاب کا پورا نام سلک الثریّا ہے

۲ تاریخ مگدھ مولفہ فصیح الدین بلخی عظیم آبادی (یکے از مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔ طبع ۱۹۲۴ء صفحہ ۹۵)

۳ وسیلۂ شرف، مولفہ شاہ فرزند علی صوفی منیری تلمیذ حضرت غالب طبع پٹنہ صفحہ ۴۸ -

گیسو دراز (گلبرگہ دکن)۔ دلی۔ میرزا جان جاناں مظہر خواجہ میر درد دہلوی وامثالہم کے نام ادب سے لئے جاتے ہیں۔ دہیں بہار کے مخدوم الملک مخدوم جہاں حضرت شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری علیہ الرحمہ (۶۶۱ھ ۔ ۷۸۲ھ) کا نام نامی بھی لیا جاتا ہے۔ نہ صرف حضرت کے ہندی دوہے فال نامے، نیتری نسخے، افسوں اور جھاڑ پھونک بطور ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں بلکہ ارباب تحقیق[1] نے آپ کے ملفوظات مبارک کے ایک مجموعہ معدن المعانی " میں جس کی زبان فارسی ہے ہندی الفاظ جات بھی پر سانہ کرے " اور دلیس بھلا پردور " کی نشاندہی بھی کی ہے ۔

اردو زبان ہی پر ان بزرگوں کے احسان نہیں بلکہ خود شاعری کا سرمایہ بھی انکے بار منت سے خم ہے ۔

فارسی شاعری کو اگر مولانائے روم، عطار، سعدی، جامی، ابو سعید ابوالخیر، سرمد وامثالہم نے آب و رنگ دیا ہے تو اردو شاعری کا دلی، مظہر جان جاں، درد وامثالہم نے اعتبار بڑھایا ہے

اور جب ہم خطۂ بہار پر نظر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں نے اپنے شغل ذکر، مراقبۂ فکر، ریاضت و مجاہدہ، تعلیم، تلقین اور تدریس و ارشاد کے ساتھ ساتھ شعر و سخن سے خصوصی رابطہ رکھا ہے ۔

تاریخ و تذکرۂ شعرائے بہار پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ ہر دور میں بہاری شعرا کا جزو غالب، وہاں کے صوفیوں پر مشتمل رہا ہے، گفتگو صرف اردو کے باب میں نہیں ہے، بلکہ فارسی اور اردو دونوں سے متعلق ہے ۔

حضرت مولینا مظفر شمس بلخی برہان۔ حضرت حسین نوشۂ توحید، حضرت اشرف رکن، مرزا بیدل، حضرت شاہ ابوالحسن فرد پھلواروی۔ حضرت نصر پھلواروی، حضرت ہ پاس۔ شاہ عماد پھلواروی۔ راسخ عظیم آبادی۔ حضرت عشق عظیم آبادی۔ شاہ الفت حسین فریاد شاہ غلام مرتضیٰ جنون۔ میر شمس الدین فنا۔ حضرت شاہ امیر الدین وجد و ظلوم۔ حضرت شاہ امین احمد ثبات و شوق بہاری، حضرت مولنا سعید حسرت عظیم آبادی۔ حضرت مولینا اشرف علی عارف نو آبادی۔ حاجی نذر الرحمن حفیظ عظیم آبادی۔ شاہ باقر علی باقر گیاوی تلمیذ غالب شاہ اکبر دانا پوری تلمیذ وحید الہ آبادی۔ حافظ شاہ محمد شفیع بہاری۔ یہ سب بادۂ تصوف کے جرعہ کش تھے۔ ان میں ابتدائی دو حضرات تو مخدوم کے اجل خلفا میں ہیں۔ اور ان میں سے حضرات فرد و نصر پھلواروی۔ وجد و ثبات بہاری۔ عارف نو آبادی اور اکبر دانا پوری رحمۃ اللہ علیہم نہ صرف ارباب تصوف ہی تھے۔ بلکہ اپنے عہد میں اپنی خانقاہوں کے سجادہ نشین حضرات تھے۔ ان کے علاوہ جوشش عظیم آبادی وغیرہ کی شاعری پر تصوف کا خاصا رنگ چڑھا ہوا تھا اور اردو شاعری پر تصوف کا اثر انداز ہونا معلوم و مشہور ہی ہے۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ بہار کے مختلف خانوادہائے تصوف میں شعر و سخن کا مذاق قدیم عہد سے اور آج بھی بدستور قائم ہے ۔

حضرت مخدوم کی نگری بہار شریف کی خانقاہ مخدوم الملک کے علاوہ اس قصبہ کی دوسری خانقاہوں میں۔ پھلواری شریف۔ منیر شریف ۔ داناپور۔ دیورہ ضلع گیا۔ درگاہ شاہ ارزاں پٹنہ۔ تکیہ عشق پٹنہ ۔ رام ساگر گیا وغیرہ (کہ یہاں اجمالی تذکرہ

---

[1] " نقوش سلیمانی " از علامہ سیلمان ندوی صفحہ ۳۰ - ۲۹

مقصود ہے نہ کہ مکمل احاطہ و حصا کی بہت سی خانقاہوں میں قابل ذکر شعرا ہوئے ہیں اور ہیں ۔ اور اس زمرہ میں سجادہ نشین حضرات بھی ہیں ۔ اکثر خانقاہوں میں عرس کا تمتہ یا ضمیمہ مشاعرہ ہوا کرتا ہے۔ اگر اہل دل کے لئے سماع و مجلس کی کشش ہے تو ادب دوستوں کے لئے شعر و سخن کا چسکا بھی ہے اس طرح یہ بے تکلف اور بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ بہار میں خانقاہیں خدمت اردو کا ادارہ رہی ہیں ۔

حضرت صوفی منیری نے حضرت غالب کو اپنا کلام بہ غرض اصلاح پیش کرتے ہوئے اپنے عریضہ میں یہ بھی لکھا تھا کہ

"...... ایں طائفۂ صوفیا را رضوان اللہ علیہم بے بحث موزونی و ناموزونی اشعر گوئی شعار آمدہ و تا ایں دم تلمذ ہر یگان از آباء و اجداد خود کہ بزور ربحت شاں سایہ مگن بودند شدہ ......"

یہ خود ہمارے دعوی کی ایک دلیل ہے ۔

ایک طرف بہار میں زبان کے صوفی شعرا اردو کو پروان چڑھا رہے تھے اور ان کی مشکور مساعی سے یہاں ایک ادبی فضا قائم ہوگئی تھی تو دوسری طرف دلی کے عہد انتشار اور لکھنؤ کی محفل ادب کی برہمی کے بعد اساتذہ سخن مرشد آباد کا رخ کرنے پر مجبور ہوگئے اور وہاں ان کا اجتماع ہونے لگا۔ کچھ عظیم آباد آئے نیز عظیم آباد کے سر راہ ہونے کے باعث بہت سے شعرائے نامدار با وقار تو یہیں مقیم ہوگئے اور جو یہاں مقیم نہیں ہوئے وہ بھی قریب ہی تھے۔ اس طرح یہاں بھی اردو شعر و ادب کی خاص صالح اور سازگار فضا قائم ہوگئی ۔ ادب کا چرچا ہوا اور شعر و سخن کی مجلسیں گرم ہونے لگیں اور عظیم آباد تیسرا مرکز زبان مان لیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں مستند و معروف اساتذہ سے تلمذ کا فخر رکھنے والے شعرائے نامی گزرے ہیں ۔ مثلاً غلام علی راسخ عظیم آبادی جنہیں میر سے نسبت شاگردی

لہ جناب منظر علیم انصاری ردولوی سفیر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس و انجمن ترقی اردو وغیرہ نے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کی خاطر میں ۱۹۱۸ء میں صوبہ بہار کا دورہ کیا تھا اور وہ قصبہ اسلام پور ضلع پٹنہ میں میلن عرس کے موقع پر ۱۳ محرم کو تشریف لائے تھے۔ ان کا سفرنامہ "ظہری" مرتبہ محمد حلیم صاحب انصاری (ناظم دینیات مسلم ہوسٹل الہ آباد) بھی شائع ہوا ہے ۔ سال طبع درج نہیں (ان کی وفات کے بعد) غالباً ۲۵-۱۹۲۳ء میں چھپا ہے۔ اس میں تحریر فرماتے ہیں :-

اسلام پور ۔ ضلع پٹنہ ۔ کاکو سے اسلام پور آیا .... ۹ بجے رات کو یہاں پہنچا۔ محرم کی ۱۳ تاریخ ہے اور عرس ہو رہا ہے صاحب مزار سید شاہ ولایت علی سید علی ہمدانی جامع اوراد فتحیہ کی اولاد میں سے تھے ۔ موجودہ سجادہ نشین شاہ محمد عبدالقادر صاحب ہیں۔ آدمی ذی علم اور روشن خیال اور خوش خلق ہیں ..... ۱۵ محرم کو مجلس مشاعرہ ترتیب پائی ۔ یہ عرس کا تتمہ تھا مصرعہ طرح تھا ع

کہیں بیمار محبت کی دوا ہوتی ہے

مجھ پر بھی غزل کہنے کا زور ڈالا گیا۔ چنانچہ پاس خاطر کے سوا چارہ نہ دیکھا اور یہ غزل سنائی ..... " (صفحہ ۱۴۳ تا صفحہ ۱۴۶) راقم لکھتا ہے کہ اسی مشاعرے کے آغاز میں جو ۹ بجے دن کو شروع ہوا تھا انصاری صاحب نے مقاصد انجمن پر تقریر فرمائی تھی اور انجمن ترقی اردو کا تعارف کرایا تھا۔

شاگرد کی۔

~~
راسخ کو ہے میر سے تلمذ ۔۔۔ یہ فیض ہے ان کی تربیت کا

حضرات مظہرؔ، ضیاؔ، فغاںؔ کے تلامذہ بھی یہاں ہیں۔ عظیم آبادی شاعر منگل سین الفت نے جرأت کی شاگردی سے سند اعتبار حاصل کیا۔ دورِ آخر میں داغؔ و امیرؔ سے اکتسابِ فن کرنے والوں کی جماعت بھی کثیر رہی ہے۔

جب حضرت غالبؔ کا عہد آیا تو ارادت کا رخ انکی جانب پھرنا بھی یقینی تھا۔ چنانچہ حضرت صفیرؔ بلگرامی کا نام نامی تو مشہور ہی ہے۔ اسی طرح حضرت صوفی منیری بھی تلامذۂ غالب میں معروف ہیں۔ انکے علاوہ خواجہ فخرالدین حسین سخنؔ دہلوی صاحب افسانۂ سروشِ سخن اگرچہ دہلوی تھے، مگر انھوں نے خاص شہر پٹنہ کو اپنا وطن ثانی بنایا۔ تلامذہ غالب میں ہیں۔ غالبؔ کے تیسرے مشہور صاحب دیوان، بلند پایہ شاگرد جناب سید شاہ باقر حسین ابن جناب شاہ وارث علی آشکی (ولادت ۱۲۴۷ھ / ۱۸۳۱ء۔ وفات ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء) ساکن چاکن پیر جگہ ضلع گیا ہیں، جو فارسی کے شاعر تھے ان کا ضخیم دیوان فارسی شائع ہو چکا ہے۔

سید محمد شیر آشیرؔ تخلص متوطن قصبہ بہار شریف ضلع پٹنہ۔ سید شاہ کرامت حسین کرامتؔ ساکن قصبہ بہار شریف ضلع پٹنہ۔ جناب شیخ احمد علی صاحب کیفیؔ قصبہ بہار شریف، صاحب توپی ثمنوی" اور مولوی فرزند علی آخگرؔ عظیم آبادی۔ مہاراج آروی خلیل و فیق (اگرچہ نسخے تلمیذ غالب ہونے میں جناب مالک رام کو تذبذب ہے مگر تاہم شامل تلامذہ کر لیا ہے۔ تلامذۂ غالب ص۱۰۱ و ص۱۰۲) محمد علی خاں ثانی مونگیری۔ انور علی شاہ عظیم آبادی۔ یہ سب حضرت غالب کے بہاری تلامذہ ہیں۔

اسی طرح نگارستی ۵۳ء میں جناب فصیح الدین بلخی عظیم آبادی نے اپنے مقالہ "صوبہ بہار میں غالب کی مقبولیت" میں کرمؔ تخلص اکرام الملک کرم علی خاں بہادر شیر جنگ نبیرہ معظم علی خاں بہادر کاٹی (قوم افغان) قصبہ بہار شریف (پہاڑی پر) کے متعلق لکھا ہے کہ:-

"یہ ہر کام میں بادشاہ کی پیروی کو باعث فخر سمجھتے تھے اس لئے گمان ہوتا ہے کہ جب ظفر نے غالب سے اصلاح لینا شروع کی تو انھوں نے بھی اپنا کلام غالب کو دکھایا ہوگا...... کرم کا سنِ وفات صحیح طور پر معلوم نہیں لیکن... بڑی عمر پاکر انتقال کیا" الخ۔ اور ان کا ایک شعر دیا ہے وہ سن لیجئے ~~

بے کرم میکشوں کو میکدہ مثل حرم ۔۔۔ طاق ابروئے صنم انکے لئے محراب ہے

حضرت صوفی منیری

حضرت غالب کے ان تلامذہ میں ایک قابل ذکر شخصیت بہاری صوفیائے کرام کے ایک ممتاز و باشرف خانوادۂ منیر شریف کے ایک رکنِ رکین، متاخرین میں نمونۂ اولین "صوفی صافی شاعر و ادیب صاحب تصانیف و تالیف کثیرہ حضرت سید شاہ ابو محمد جلیل الدین حسین عرف شاہ فرزند علی صوفی منیری کی محترم ہستی بھی گذری ہے۔ ان کا تذکرہ اس وقت مقصود ہے۔

حضرت سید علیم الدین گیسو دراز دانشمند نیشاپوری (ہمعصر و مرید و مجاز حضرت مخدوم شرف الدین بہاری علیہ الرحمۃ)

کے بڑے صاحبزادے حضرت سید محمد کی شادی ولیۂ باکمال بی بی ابدال بنت حضرت بدرالدین بدر عالم صاحب مزار چھوٹی درگاہ بہار شریف سے ہوئی اور اسی نسبت نسبی سے بی بی ابدال کی اولاد ابدالی کہی جاتی ہے۔ حضرت صوفی انھیں کی اولاد میں تھے اسی لئے آپ ابدالی بھی کہے جاتے ہیں۔ حضرت صوفی سید شاہ محمد علی ابن شاہ احمد علی کے فرزند اصغر تھے۔ یہ خاندان موضع شریف آباد پارکھو (متصل موضع پن پن) ضلع پٹنہ کے ممتاز سادات کرام کا تھا۔ منیر شریف کے خاندان مشائخ میں آپ کی ننہال تھی اور حضرت شاہ لطف علی فردوسی منیری المتخلص بہ کرسی[1] آپ کے نانا تھے۔ آپ کا نانہالی رشتۂ نسب حضرت مخدوم شاہ خلیل الدین برادر حضرت مخدوم شرف الدین منیری بہاری علیہ الرحمتہ کے واسطہ سے حضرت امام محمد تاج فقیہ علیہ الرحمۃ فاتح منیر شریف سے ملتا ہے۔ آپ نے اپنے برادر اکبر و پیر و مرشد حضرت شاہ اولاد علی زاہدی فردوسی کی معیت میں اپنے نانہال منیر شریف میں سکونت اختیار کرلی۔

حضرت صوفی کی تاریخ ولادت ۹ رشوال ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۸ء اور ۲ ذیقعدہ ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۱ء تاریخ وفات ہے۔
آپ کی شادی قصبہ اسلام پور ضلع پٹنہ میں حضرت سید شاہ ولایت علی قادری منعمی ابوالعلائی (۱۲۱۶ھ تا ۱۳۰۳ھ) جن کی تربت اور خانقاہ اسلام پور میں ہے اور ۱۳ محرم کو ہر سال عرس ہوتا ہے اور جو اپنی دادیہال سے حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی صاحب "اوراد فتحیہ" و کتب کثیرہ کی اولاد میں اور نانہال سے بلخی تھے۔ ان کی چھوٹی صاحبزادی سے ہوئی۔ یہیں آپ کی وفات ہوئی اور یہیں آپ کا مزار ہے۔ دو لڑکیاں اور تین صاحبزادے جناب مولوی سید شاہ محمد عبدالقادر سجادہ خانقاہ اسلام پور ضلع پٹنہ (مصنف

---

[1] حضرت ابوالفرح قمرالدین حسین عرف شاہ لطف علی "محبوب رسول" قدس سرہ ابن شاہ محمود بن شاہ محمد مکی مرید و خلیفہ اپنے برادر بزرگ شاہ مبارک حسین عرف شاہ دھومن منیری کے تھے۔ تاریخ وفات ۱۶ رشوال ۱۲۵۶ھ روز شنبہ ہے آپ کا تخلص کرسی تھا۔ آپ کے پندنامہ کے چند اشعار (جس کے ہر شعر میں حرف قاف سے شروع ہونے اور ردیف مہملہ پر اختتام کا التزام) نقل کئے جاتے ہیں۔

قطع کن آز را طمع بگسار — تا شوی بادشاہ ہفت دیار
قانعاں را ہر آنچہ داد خدا — کس نیابد دریں دیار اے یار
قاف تا قاف در جہاں گردی — خس نیابد دریں دیار اے سیار
قسمت خود بخود رسد بر تو — چند پوئی دمے بشکر گزار
قد خود خم مکن بہر دو نان — بہر نانے بہ کوچہ و بازار
قہر بر نفس کن کہ ماند باز — از تلاش دراہم و دینار

قول کرسی اگر کنی در گوش
روزیت چارہ می رسد ناچار

کتاب "انوارِ ولایت"، اور جناب مولینا حکیم حاجی سید شاہ محمد عمرؒ صاحب عامر اور جناب مولوی سید شاہ سید علیؒ صاحب کامل صاحبزادگان ہوئے۔ آپ کے ان فرزندوں کی سکونت اسلام پور اپنی ننہال میں رہی۔ اور ایک دوسرے بطن سے جناب شاہ اسد اللہ منیری ہوئے جن کا قیام منیر شریف میں رہا۔ حضرت صوفی کی اولاد اسلام پور اور منیر شریف میں سکونت پذیر ہے اور اب کچھ کا قیام (پاکستان) اور پاکستان کے مختلف مقامات میں ہے۔

آپ نے فارسی، عربی کی تعلیم کے بعد کثرت مطالعہ وکتب بینی سے عربی وفارسی میں جید استعداد پیدا کی۔ آپ فردوسی سلسلہ کے اہل طریقت میں تھے۔ تصوف وسلوک میں آپ کا مقام اعلیٰ تھا اور ریاضت ومجاہدہ میں آپ کی حیثیت ارفع تھی۔ اور ممتاز اقران تھے۔ آپ کی ضخیم تصنیف "مصطلحات المتصوفین" آپ کی تصوف میں اعلیٰ دستگاہ کا ثبوت ہے۔ باایں ہمہ استغنا و انکسار، فروتنی وتواضع اور عزلت گزینی آپ کی فطرت تھی۔

حروف بے حد پاکیزہ تھے اور یہ شاید آپ کی وراثت ہی کا اثر ہے کہ آپ کے خاندان میں آپ کی اولاد میں خوش خطی عام ہے حضرت مخدومؒ اور اس سلسلہ کی کتابوں کی نقل وکتابت کا شغل، تصنیف وتالیف کے علاوہ تا عمر رہا۔ چنانچہ خانقاہ اسلام پور کے کتب خانہ قادریہ اور منیر شریف میں آپ کے گھرانے میں اور آپ کے خاندان میں آپ کے مخطوطات بکثرت ہیں جن میں کا ایک نفیس نسخہ آپ کا مکتوبہ "شرح آداب المریدین" مصنفہ حضرت مخدوم شرف الدین بہاری علیہ الرحمۃ کا کتب خانہ قادریہ اسلام پور کی زینت ہے۔

شاعری میں حضرت غالب دہلوی سے تلمذ اختیار کیا، اصلاح کلام کے لئے حضرت غالب پر نظر انتخاب دلی کے تعلق سے پڑی کہ دلی موصوف کے فیوضِ باطنی کا اصل سرچشمہ تھی اس لئے کمالِ ظاہری کے انتساب کا انتساب بھی یہیں سے قائم ہے۔ چنانچہ اصلاح کے لئے کلام ارسال کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"چون فیضِ باطن درین خاندان از ہمان بقعۂ متبرکہ دہلی انی از حضرت خواجۂ خواجگان عرش آستانی حضرت خواجہ نجیب الدین فردوسی قدس سرہٗ مبذول شدہ خواستم بحکم آنکہ در سے گیر محکم گیر، با ستانۂ دیگر جبہہ سایم، ہرچہ از ظاہر و باطن کمی رسد از ہمان جا رد دیار باشد"

شاگرد (صوفی) کی آستانۂ دہوار شیخ سے ارادت کا حال تو آپ دیکھ چکے اب استاد (حضرت غالب) کی عقیدتمندی بھی ملاحظہ فرمائے جناب صوفی چونکہ خانوادہ سیادت سے تعلق رکھتے تھے اس لئے مرزا صاحب نے اپنے نامۂ نامی میں تحریر فرمایا۔

"...... حضرت پیر ومرشد کی خدمت میں فقیر غالب کی بندگی قبول ہو۔ اپنے ابو الآبار کے بوڑھے غلام کو آپ نے اتنا کیوں بڑھایا کہ وہ بیچارہ شرم سے پانی پانی ہوا جاتا ہے۔ کافی تھا اوراقِ اشعار کا بھیج دینا اور حکم اصلاح کی اجازت دینی۔ میری مدح آپ کے غلاموں کو موجب ننگ وعار اور میرے آبا و اجداد کو ذریعۂ عز وافتخار......"

اصلاح مسؤدہ میں تعبیرِ مدحیہ کے عنوان پر یہ رباعی لکھی ہے ؎

این دیدہ کہ کحل اثمدے می خواہد — غالب از در تو مددے می خواہد
عنوان تبارکیب صوفی — از مہر سلیمان مددے می خواہد

مدحیہ قصیدہ کا ایک شعر ہے :

فلک جناب اسد اللہ خان والاقدر — بصدر مرتبہ مسند نشین جاہ و جلال

یہاں حضرت غالب نے اسد اللہ خاں کو خط کشیدہ کر دیا ہے (اسد اللہ خاں) اور سامنے حاشیہ پر لکھا ہے: "علی کا غلام، تمہارا خانہ زاد" اور جہاں قصیدہ مدحیہ شروع ہوا ہے وہاں حاشیہ کے اوپر "الامر فوق الادب" لکھ دیا ہے :

یہ اصلاح شدہ اجزا آج بھی خانوادہ صوفی میں بفضلہ محفوظ ہے اور ادارہ تحقیقات اردو" پٹنہ کی نمائش علمی و ادبی منعقدہ ۱۹۵۵ء میں شائقین ادب کی زیارت کے لئے رکھا گیا۔ مشتمل ہے نامۂ صوفی پر جو استدعائے تلمذ کے لئے ۲۲ر ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ کو لکھا گیا استاد کی مدح میں فارسی قصیدہ ہے جس میں بڑے لطیف انداز میں اصلاح کی درخواست کی گئی ہے اور اردو کی تین مثنویوں لوار الحمد جو شمائل نبوی میں ہے اور مثنوی کشش عشق و روشن عشق اور چند رباعیات مدحیہ پر۔

لوار الحمد کی دو اشاعت ہو چکی ہیں۔ "کشش عشق" و "روشن عشق" یہ دونوں مثنویاں انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کے سہ ماہی رسالہ "اردو" کی اشاعت جولائی ۱۹۵ء و اکتوبر ۱۹۵ء میں راقم کے قلم سے لکھے ہوئے حالات صوفی کے ساتھ شائع ہو چکی ہیں۔ قصیدہ مدحیہ مقالہ "رشحات صوفی منیری" کے ذیل میں رسالہ اردو جنوری ۵۲ء میں اور کلام صوفی پر حضرت غالب کی اصلاحیں راقم ہی کے قلم سے رسالہ "مخزن" لاہور کی اشاعت جولائی ۵ء میں اور مثنوی لوار الحمد پر غالب کی اصلاحیں راقم کے حوالہ سے جناب مہیش پرشاد صاحب پروفیسر ہندو یونیورسٹی بنارس کے قلم سے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے رسالہ "ہندستانی" الہ آباد میں شائع ہو چکی ہیں۔

حضرت غالب نے اصلاح کے ساتھ جواباً جو نامہ نامی بھیجا تھا اس کی نقل رسالہ "معارف" اعظم گڈھ (نومبر ۱۹۲۰ء) میں چھپ چکی ہے اور حضرت رسا ہمدانی گیاوی کی مرتبہ "نادر خطوط غالب" طبع لکھنؤ ۱۹۳۹ء اور مولانا غلام رسول مہر کی کتاب "خطوط غالب" میں شریک اشاعت ہے۔ "خطوط غالب" (مہر) کا طبع دوم میرے پیش نظر رہا ہے اس میں حالات میں تسامح سے حضرت صوفی کے عرف شاہ فرزند علی کے علاوہ جلیل الدین حسین کے بجائے منیر الدین نام درج ہے اور "منیر کی خانقاہ کے سجادہ نشین" بتایا ہے جو صحیح نہیں بلکہ منیر کے پیرزادے لکھنا چاہئے تھا۔

حضرت غالب نے اپنے گرامی نامہ میں کلام صوفی کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے :-

"...... دو ایک جگہ املا کی صورت بدل گئی، کہیں مصرعہ کی جگہ مصرعہ بدل گیا... بے غائلہ تکلف دلکش کلام آپ کا معجز نظام ہے۔ لفظ عمدہ ترکیب اچھی، معنی بلند......"

(معارف اعظم گڈھ نومبر ۱۹۲۰ء)

صاحب تذکرہ خمخانۂ جاوید نے آپ کے متعلق لکھا ہے۔

"...... مرزا غالب سے تلمذ تھا...... صاحب تصانیف کثیر تھے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور خوب کہتے تھے"

(خمخانۂ جاوید۔ جلد پنجم۔ ص ۳۴۶ تا ۳۴۸۔ طبع ۱۹۴۰ء)

مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب" مدیر سچ و صدق لکھنؤ کی رائے انکی شاعری کے متعلق یہ ہے۔

"...... شاگرد غالب، صوفی منیری، جن کے کلام پر اصلاحیں ہیں، خود بھی بڑے خوش گو نظر آتے ہیں اور ان دو شعروں میں تو اپنا رنگ انھوں نے بالکل غالب ہی سے ملا دیا ہے ۔

حسرت دید بس نکل جائے　　　دل کی دل سے ہوس نکل جائے
جی دیا ہم نے مدعا نہ ملا　　　خوں بہا اور خوں بہا نہ ملا

(رسالہ "مخزن" لاہور ستمبر ۵۰ء صفحہ ۳۰۳)

آپ کی تصانیف، اردو فارسی نثر و نظم میں مطبوعہ و غیر مطبوعہ، علاوہ دیوان کے متعدد ہیں، چند کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ فارسی میں سرود مستان، نثر میں افسانہ۔ مطبوعہ نول کشور، خمخانہ (غیر مطبوعہ) اور اردو نظم میں "عروۃ الوثقیٰ" عقائد اہلسنت میں ایک قصیدہ، مطبوعہ مطبع حنفیہ پٹنہ ۱۳۱۸ھ ـــ اور "خط راست"، اردو نثر میں ایک ارادت مند کے شکوک مذہبی کے جواب میں ہے۔ کتب مطبوعہ اردو نثر میں "راحت روح" ہے۔ اس کے متعلق سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

"راحت روح" سہل و رواں، مقفیٰ و مسجع و رنگین اردو عبارت میں بطور افسانہ تصوف پر ایک بہترین تصنیف، ان سے (یعنی حضرت شاہ فرزند علی صوفی منیری سے) یادگار ہے،،

("معارف" نومبر ۱۹۲۰ء)

اس کتاب کا تازہ ترین نسخہ (مولوی سید شاہ) محمد طیب ابدالی ایم۔ اے (اب ڈاکٹر پٹنہ یونیورسٹی) نے جو حضرت صوفی منیری کے چھوٹے فرزند کے پوتے ہیں۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے حصول کے سلسلہ میں ایڈٹ کر کے غالباً ۱۹۶۵ء میں شائع کیا ہے (مطبع اسرار کریمی الہ آباد) اور یہ رانچی یونیورسٹی کے ایم اے نصاب میں داخل ہو گئی ہے۔

آپ کی مشہور کتاب "وسیلۂ شرف و ذریعۂ دولت" حضرت مخدوم اور بزرگان سلسلہ کے حالات میں ہے۔ یہ بیحد مقبول ہے۔ سابق میں اس کے دو ایڈیشن پٹنہ سے شائع ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں اس کا ایک ایڈیشن چاٹگام (پاکستان) میں شائع ہوا اور اب بار چہارم طیب ابدالی صاحب نے ایڈٹ کر کے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا ہے (مطبع سیلی برقی پریس الہ آباد) یہ حضرت مخدوم کے معتبر حالات پر مشتمل ہے اور حالات مخدوم میں اس کا ماخذ حضرت مخدوم شاہ شعیب شیخپوری علیہ الرحمتہ کی کتاب "مناقب الاصفیا" اور بزرگان سلسلہ کی اہم تصانیف ہیں اس لئے وسیلۂ شرف اپنے باب میں مستند و معتبر ہے۔ اور متعدد کتب کا ماخذ ہے۔ یہ ۱۳۱۱ھ کی تالیف ہے اور اس کی پہلی اشاعت (مطبع پٹنہ) ۱۳۱۳ھ میں مصنف کی حیات میں ہوئی۔

نمونۂ کلام صوفی منیری

فارسی

خواہم از رنجِ خودی و زغمِ جاں برخیزم — کہ من از خاکِ درِ پیرِ مغاں برخیزم
پا بہ گل ماندہ ام از وہم وجودِ بے بود — خوشتر آں وقت کزیں ہرزہ گماں برخیزم
بر سرِ طور بر آیم اہنم از دستِ عصا — خلع نعلین کنم وز دو جہاں برخیزم
طاقت آمد چو رسیدی بہ عیادت ورنہ — کے ز بسترِ منِ بے تاب و تواں برخیزم
پردہ از رخ بکشا، عالمِ خویشم بنما — تا بہ دارفتگی از کون و مکاں برخیزم
"لن ترانی"، ز سرِ ناز چو گفتی مردم — در قیامت "ارنی" نعرہ زناں برخیزم

صوفی ایں مصرعہ ہر بار بہ حسرت خواند
خواہم از رنجِ خودی و زغمِ جاں برخیزم

در سینۂ دلِ طپاں نگنجد — رازم بہ درون از آں نگنجد
از قیدِ وجود ہر کہ وارست — در دائرۂ جہاں نگنجد
بگزر ز خیالِ خود کہ بیچوں — در بتکدۂ گماں نگنجد
عشق آمد و حکمِ عقل برخاست — یک ملک و دو حکمراں نگنجد
برعکسِ خودش نگاہِ صوفی — چوں سایہ کہ درمیاں نگنجد

چوں شمع ز شعلہ زدہ ام گل بسرِ خویش — گل چیدہ ام از گلشنِ سوزِ جگرِ خویش
من بادشہِ کشورِ دل سوختہ گانم — چوں شمع کنم شعلۂ دل تاجِ سرِ خویش

دو شعر ایک چہار وزنی غزل کے (۱) فاعلاتن فاعلاتن فاعلات (۲) فاعلاتن فعلاتن فعلات (۳) مفتعلن مفتعلن فاعلات (۴) فاعلاتن مفاعلن فعلات۔ بہ تخفیف واشباع۔ ملاحظہ ہوں۔

اے خمِ ابروے تو رشکِ ہلال — وے رخِ نیکوے تو بدرِ کمال
کاکلِ ہندوے تو شامِ فراق — عارضِ دلجوے تو صبحِ وصال

ایک مثنوی سے چند شعر۔

اے برتر از آنچہ داند کس — خود را تو نئی آنکہ دانی و بس
اینجاست شہِ سریرِ لولاک — سر بردہ بہ جیبِ ما عرفناک
در یافتنِ تو کارِ ما نیست — جز در زدنش گدائیِ ما نیست

ایمان بہ پیمبر تو آریم   تصدیق بہ آنچہ دید داریم
ما ملت احمدی گزینیم   از چشم محمدی بہ بینیم
روشن کن دیدہ ہا ظہورش   بینائی ما بود ز نورش
او دید و بہ مدعا رسیدیم   چون دیدۂ ماست او بہ دیدیم
دانندۂ او توئی الٰہی !   بینائے کمال او کماہی
باید پے دید مصطفائی   آئینۂ بینش خدائی
بادا صلوات حق بر روحش   وز غیب بہر زمان فتوحش
بر عترت و آل با وقارش   بر جملہ صحابۂ کبارش

کلام اردو

ہے نطق ساز اس کے نواہائے راز کا   کہتے ہیں جسکو لفظ وہ پردہ ہے ساز کا
دل نے مجھے دریائے پُرآشوب میں ڈالا   اب جو ہو سو توکلتُ علی اللہ تعالیٰ
بنا ہے ٹوٹ کر پھر خانۂ دل   خدا کا گھر ہے اب بُت خانہ اپنا
دستِ ظلمِ نفس سے فریاد ہے میرا کلام   کاغذی ہے جامہ میرے شاہدِ اعمال کا
صیاد ہوں میں باغ سے دور اور شکستہ پر   نَے لالہ زار داغ سے دور اور شکستہ پر
کیا کیا کہوں، نہ پوچھ مرا حال ہم صفیرو   رشتہ بپا، فراغ سے دور اور شکستہ پر
بجلی ہی بس گرا دے فلک! مجھ پہ اب کہ ہوں   پروانہ سان چراغ سے دور اور شکستہ پر
مٹ کر مثالِ طائرِ رنگ اُڑ چلوں کہ ہے   پَر کی ہوس دماغ سے دور اور شکستہ پر
طائرِ رنگ ہوں اُڑنا مرا، مٹ جانا ہے   لوگ ہستی جسے کہتے ہیں قفس ہے ہم کو
سر عتبۂ وفا سے جدا عمر بھر نہ ہو   بارِ گراں ادا ہو جو گردن پہ سر نہ ہو
لاکھوں دنیا میں ہیں زُہد اور عبادت والے   کہیں دو چار ہی نکلیں گے محبت والے
اپنی طاعت پہ ہوں مغرور نہ طاعت والے   اُن سے اچھے ہیں گنہگار ندامت والے
باتیں اچھی ہیں، بُرائی ہے تو بس اتنی ہے   نیک اپنے کو سمجھتے ہیں نصیحت والے
خشتِ خُم خانقہ شیخ میں جا کر رکھدو   کہ تیمم کریں پندارِ طہارت والے
سب مزے کھوتی ہے اللہ ہی یاد آتا ہے   مرتے ہی راہ ہے بھولیں نہ طریقت والے

بیخودی راہ ہے، زاہد نہیں واقف صوفی
پیر میخانہ سے اس مسئلہ میں فتوا لے

حاصل ہے میرے رشک کا حرماں کہیں جسے
سایہ ہے وہ مرا شبِ ہجراں کہیں جسے

اے رشکِ مہر! جلوہ ترا ہے نگاہ سوز
پردہ ترا ہے عارضِ تاباں کہیں جسے

غش آپکو نہ آئے تو لاؤں حضور میں
وہ آئنہ کہ دیدۂ حیراں کہیں جسے

مجھکو کہ مدتوں پہ قفس سے رہا ہوا
"صبحِ وطن" ہے "شامِ غریباں" کہیں جسے

ہر اک اشارہ ہے سببِ انقلابِ دہر
گردش ہے چشمِ یار کی، دوراں کہیں جسے

خوش ہوں جنوں سے یُں کہ وہ کرتے ہیں اختلاط
ہے صبحِ عید، چاکِ گریباں کہیں جسے

سعیِ طلب میں سرمہ کروں چشمِ شوق کا
وہ اک کفِ غبارِ بیاباں کہیں جسے

خوگر ہوں مشکلوں کا امیدِ وصال میں
دشوار مجھ پہ ہے وہی آساں کہیں جسے

مغرورِ نسلِ شیخ نہ ہو بیٹھوں اے جنوں
آیا ہے ہاتھ پوس کو داماں کہیں جسے

کر غرقِ بحرِ عفو کہ کافی نہیں مجھے
حمامِ گرم، آتشِ سوزاں کہیں جسے

وہ غم سرشت ہوں کہ ہے عشرت کدہ مرا
اس سے پرے کہ روضۂ رضواں کہیں جسے

صوفی! بتائے منزلِ جاناں کی راہ کون
اب چپ ہے وہ جرسِ دلِ نالاں کہیں جسے

یوسفستاں ہوا ہے خانۂ دل
اس میں تو حسب سے جلوہ انگن ہے

ہے یہ روضۂ منیر کا فردوس
صوفی! اب ہم کو فکرِ مردن ہے

ہمارے سرمہ کو لائی وہ خاکِ در کہ نہیں
صبا! ترا ہوا اُس کوچہ میں گزر کہ نہیں

الٰہی! اس کو ہماری ہوئی خبر کہ نہیں
ہمارے نالہ نے دیکھا رُخِ اثر کہ نہیں

ہوئی ہے دیر بہت، راہ تو نہ بھول گیا
الٰہی خیر ہے آئیگا نامہ بر کہ نہیں

دل میں ہے سوزِ الم آہ و فغاں ہو کہ نہیں
گھر میں جب آگ لگی کیئے، دھواں ہو کہ نہیں

برہمن دیر بناتا ہے، تو زاہد مسجد
سدِ رہ کیئے یہ دیوار و مکاں ہو کہ نہیں

مست رکھتی ہے مجھے گردشِ چشمِ ساقی
ساغرِ بادہ برابر ہے رواں ہو کہ نہیں

مستیِ اہلِ خرابات ہے ان میں صوفی!
ترے اشعار پہ دل وجد کناں ہو کہ نہیں

اور ہی رنگ فصل گل لائی شیخ کی اب کے سال بن آئی
نہ رہی سر پہ منت مطرب طائروں کی ہے نغمہ آرائی
دل پژمردہ زندہ ہوتے ہیں ہے دم باد میں مسیحائی
ساغر گل سے شیخ و رند ہیں مست باد کرتی ہے بادہ پیمائی
شعر غالب سنا کے شیخ نے آج بادہ نوشوں سے توبہ کروائی
"ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے باد پیمائی"

ہم نے صوفی! مذاق سے اپنے
داد اپنے کلام کی پائی

مثنوی "انوار الحمد" سے نعت کے تین شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

فخر عالم، مہر تاج رسل خواجۂ کون و مکاں فخر کل
قرۂ باصرۂ عین حضور اوّلین موجد دریائے ظہور
نور حق، جلوۂ رب، شان اِلٰہ ہے تو بندہ مگر اللہ اللہ

اس آخری شعر پر مسودۂ اصلاحی میں حضرت غالب نے دو صاد (ص ص) بنا کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

معراج کے بیان میں فرماتے ہیں ؎

شب معراج فلک سے گزرا سرحد ملک ملک سے گزرا
جلوۂ شاہد دلجو دیکھا بے حجاب رخ نیکو دیکھا
کئے بے واسطہ خالق سے کلام کیسا جبریل، کہاں کا پیغام
درمیاں پردۂ آواز نہ تھا نغمے دلکش تھے، مگر ساز نہ تھا
طے ہوئی راہ یہ یکدم اس کی آمد و رفت تھی توام اس کی

حضرت غالب کی مدح میں یہ دو رباعیاں ہیں ؎

ہیں شعر کے معرکہ میں صف در غالب ہاتھ اُن کے جتنے کھیت ہیں سب پر غالب
اس نام کا پاس ہے خدا کو صوفی! پھر ہوں اسد اللہ نہ کیوں کر غالب

سب تیغ زباں سے انہیں پہچانتے ہیں غالب وہ ہیں سب اہل سخن جانتے ہیں
یہ شیر خدا کے نام کی ہے برکت لوہا اسد اللہ کا سب مانتے ہیں

حضرت غالب کے سرِ دیوان غزل کی تضمین کی ہے اس مخمس سے صرف دو شعروں کی تضمین ملاحظہ ہو ؎

داد خواہ آیا ہے ہر مضمون خطِ تقدیر کا — وحشتِ ہستی میں حرفوں سے بندھا زنجیر کا
ہے سدا گردش میں پرکار آسمانِ پیر کا — "نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

وعدۂ دیدار کل ہے، ناشکیبائی نہ پوچھ — ہے شبِ فرقت پہاڑ اور میں ہوں سودائی نہ پوچھ
یہ جو کٹ جائے تو جانوں ورنہ اے بھائی نہ پوچھ — "کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا"

"قطعہ تاریخ وفات حضرت غالب"

حضرت صوفی کو تاریخ گوئی میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ آپ کا کہا ہوا ۵ شعروں کا ایک قطعہ تاریخ جس سے ۳۰ طریقے سے مادۂ تاریخ سنہ ۱۳۰۲ھ مستخرج ہوتا ہے رسالہ "اردو" کراچی میں شائع شدہ آپ کے متعلق مقالہ میں مذکور ہو چکا ہے اس لئے بوجہ طوالت قلم انداز ہوتا ہے۔ البتہ حضرت غالب کی وفات کا قطعہ تاریخ جو آپ نے لکھا ہے، موقع کی مناسبت سے پیشِ ناظرین ہے ؎

یگانہ شاعرِ رشکِ ظہوری و عرفی۔ — سخن پناہ اسد اللہ خاں تمام ہوا
یہ اس کا مصرعہ مشہور سالِ فصلی کا — ہے خود گواہ اسد اللہ خاں تمام ہوا ؎
۱۲۷۵
بڑھا کے رکن لکھا میں نے سالِ ہجری یوں — کہ آج آہ اسد اللہ خاں تمام
۱۲۸۵ھ

تلامذۂ صوفی منیری:۔ شاعری میں آپ کے چند تلامذہ ممتاز اور قابلِ ذکر ہیں۔ اُن میں سے ایک حکیم شاہ احتشام الدین حیدر مشرقی منیری مرحوم ہیں۔ آپ کے برادر خالہ زاد شاہ خلیل الدین احمد جوشؔ منیری کے فرزند تھے۔ سنہ ۱۲۸۳ھ سال ولادت ہے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے پُرگو اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ بانکی پور پٹنہ کے مشہور ظریف اخبار "پنچ" (۱۸۸۵ء سنہ ۱۹۱۰ء) میں مضامین لکھتے تھے۔ پہلے معانی تخلص کرتے تھے، پھر مشرقی تخلص کرنے لگے۔ ۸ شوال سنہ ۱۳۴۳ھ آپ کی تاریخ وفات ہے۔ اردو فارسی کے علاوہ عربی زبان میں بھی ساکت نہ تھے۔ تمام اصناف شاعری میں

لہ تذکرہ خمخانہ جاوید سری رام جلد دوم ص ۲۸۵، ۲۸۶ اور مولوی حکیم احمد اللہ ندوی کے تذکرہ مسلم شعرائے بہار حصہ اول ص ۲۲۱، ۲۲۳ اور تذکرہ [illegible] میں جوشؔ منیری کے حالات شائع ہوئے ہیں۔ اور راقم کا مضمون "حضرت جوشؔ منیری" پندرہ روزہ زبان کراچی ۱۵ اپریل ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا ہے۔

؎ حضرت غالب کا شعر ہے ؎ — اسد اللہ خاں تمام ہوا — اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

اردو فارسی میں طبع آزمائی کی ہے۔ واقعۂ منیر ایک فارسی مثنوی میں نظم کیا ہے۔ صنائع و بدائع کے وافر نمونے آپ کے کلام میں ملتے ہیں۔ دو دیوان فارسی و اردو غیر مطبوعہ آپ سے یادگار ہیں اور اردو فارسی کا نامرتب کلام دونوں دیوانوں کے علاوہ ہے جو بمقدار ایک دیوان کے ہے۔ آپ کے کلام کا انتخاب راقم کے قلم سے "مہر نیمروز" کراچی ماہ جنوری ۱۹۶۱ء میں اور آپ کے حالات و حالات تلامذہ میں راقم کا مقالہ "تبرکات حضرت مشرقی منیری" اور "چند تلامذہ مشرقی منیری" پھلواری شریف پٹنہ (بہار) کے ماہنامہ المجیب" ماہ جولائی ۸۰ء و دسمبر ۸۰ء و نومبر ۸۰ء میں شائع ہوا ہے۔ "تذکرہ مسلم شعرائے بہار حصہ چہارم (ص۱۷۰ تا ۱۸۱) میں بھی آپ کا ترجمہ داخل ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

ہر سانس تری اے دلِ حسرت سے بھری کیوں ہے — خشکی ہے لبوں پر کیوں، آنکھوں میں تری کیوں ہے
کس آئینہ طلعت نے صورت تجھے دکھلادی — ہے کس لئے یہ حیرت، یہ بے خبری کیوں ہے
پہلو میں نہیں بیٹھا گر تیرِ نظر کوئی — آنکھوں سے ٹپکتا پھر اخونِ جگری کیوں ہے
یہ مان لیا ہیں نے ہاں تجھکو نہیں سودا — ہے نازِ شب کیا آہِ سحری کیوں ہے
جیب و دستِ جنوں میرا گھو ارسلامت ہے — پھر میرے گریباں میں یہ بخیہ گری کیوں ہے
اے مشرقی رسوائی تو نے نہ اگر توبہ — دامن پہ ترے اچھا پھرنے کی تری کیوں ہے

کم خود تو کفر و دین کے پردوں ہیں جا چھپے — جھگڑا غضب کا گبر و مسلماں ہیں رہ گیا

ہم نے مانا کہ ہے حق لیسَ کَمِثلِہٖ شَیئٌ — بارے کیسا ہے اکبھی منہ تو دکھا تو ہم کو

کیا مزا ہو کہ علی الرغمِ حسبانِ زہاد — صفِ مژگاں سے الٹ دے صفِ محشر کوئی

شوخی بھی شکلِ شعلۂ فانوس ہے عیاں — گو ہے پڑا نقابِ حیا سر سے پاؤں تک

حضرت عطا بہاری

:- سید شاہ عطا کریم عطا بہاری (قصبہ بہار شریف محلہ مرادپور) ابن میر لیاقت حسین صاحب کی تاریخ ولادت انکی ۱۳ صفر ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۶ء اور ۹ صفر ۱۳۵۱ھ (م ۱۴ جون ۱۹۳۲ء) ہے اردو شاعری میں حضرت تسلیم لکھنوی کے تلمیذ تھے۔ حضرت صوفی منیری سے بھی فارسی کلام پر اصلاح لی اس لئے یہاں تذکرہ کیا گیا۔ ایک ضخیم اردو کلیات جو تمام اصناف سخن غزلیات، قصائد، قطعات و رباعیات و مسدس و مخمس پر حاوی ہے اور ایک

دیوانِ اردو جس میں تقریباً تمام ردیفوں کا التزام ہے اور پندنامۂ عطار کا منظوم اردو ترجمہ "خضر طریق" مطبوعہ آپ سے یادگار ہے کلیات و دیوان غیر مطبوعہ ہیں اور کتب خانہ قادریہ اسلام پور ضلع پٹنہ میں محفوظ ہیں۔ یحییٰ علی صاحب علیؔ، بہاری اور سید محی الدین ارمانؔ، حنفی، صفی پوری نے (علاوہ راقم کے لئے نامعلوم تلامذہ کے) آپ سے تلمذ کا شرف حاصل کیا۔ نمونہ کلام کے لئے ایک غزل کے چند اشعار پیشکش ہیں ؎

رُخ سے پردہ ہٹا دیا کس نے — سینہ ایمن بنا دیا کس نے
جال پھیلا کے زلفِ مشکیں کا — پھر بلا میں پھنسا دیا کس نے
مرنے والے پر آفریں کر کے — مرتے مرتے جِلا دیا کس نے
چھو کے زلفوں کو، اے نسیم سحر — سر یا فتنہ جگا دیا کس نے
اے عطا! کچھ کہا نہیں جاتا — کیا بتاؤں رُلا دیا کس نے

حضرت عامر اسلام پوری

اسی طرح حضرت صوفی منیری کے خلف اوسط جناب مولانا حکیم حاجی سید شاہ محمد عامر اسلام پوری عامرؔ نے آپ سے اصلاح لی۔ ان کا سالِ ولادت ۱۲۹۱ھ اور سالِ وفات ۱۳۳۸ھ ہے ؎

المدد جوشِ جنوں! کیا دیر ہے — ہاتھ اپنا پڑ چکا زنجیر پر
کہئے لاؤں ایک کیا سو جوئے شیر — کیا ہے حیرت ایک جوئے شیر پر

اب تو سمجھے خطا نہیں دل کی — آئینہ دیکھ کے ہو حیراں کیوں

حضرت عرفاں اسلام پوری

مولوی شاہ اکرام الدین احمد عرفاں مرحوم رئیس اسلام پور ضلع پٹنہ آپ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ حاجی شاہ معین الدین احمد شیخپوروی (شیخپورہ ضلع مونگیر) کے خلف اکبر اور ضلع پٹنہ صوبہ بہار کے مشہور رئیس و زمیندار چودھری محمد ظہور الحق صاحب کے نواسے تھے۔ ۱۲۹۱ھ آپ کا سالِ پیدائش ہے۔ اور ۸۲ سال کی عمر میں دسمبر ۱۹۵۳ء (مطابق ۱۳۷۳ھ) میں آپ کا انتقال ہوا۔

عربی کی تعلیم تربیت بتکمیل اپنے وقت کے جیّد اور مجمع الاسناد عالم اجلّ استاذی حضرت مولانا حکیم سید شاہ محمد رفیق صاحب متوطن موضع شہباز پور علاقہ پُن پُن ضلع پٹنہ ثم اسلام پوری سے حاصل کی۔ فارسی کی اعلیٰ تعلیم حضرت صوفیؔ سے پائی خطاطی کی باقاعدہ مہارت حاصل کی اور اعلیٰ درجہ کے خوش نویس تھے۔ آپ کی رقم کردہ ایک وصلی کا عکس "گیا کے رسالہ ندیم" کے بہار نمبر" ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا، موسیقی اور شہسواری اور فنونِ سپہ گری و بنوٹ میں بھی استادانہ مقام حاصل تھا۔ آپ کے لطف و اکرام اور جود و سخا کا شہرہ تھا سیر چشم اور اولوالعزم تھے، مذہبیت اور دینداری کا جذبہ لیئے اندر بلغایت رکھتے تھے۔ اور باوجود ریاست متعلیٰ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور آخر عمر میں تو راہِ فقر کے سالک ہی ہو گئے تھے۔

رحمۃ اللہ۔ آپ ایک کہنہ مشق استاد تھے۔ دیوان آپ کا مرتب ہے۔ فارسی میں بھی فکر فرماتے مگر کم۔ رجحان تغزل کی طرف تھا اور داغ کا انداز مرغوب تھا۔ تصوف سے دلی لگاؤ تھا اس لئے اس کی جھلکیاں کلام میں ملتی ہیں۔ آپ کے فیض تربیت نے آپ کے تلامذہ[¹] کو (گو ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں) روشناس ادب بنایا اور ان کی سخنورانہ صلاحیت کو چمکایا اور حق یہ ہے کہ یہ آپ کی بڑی خدمت زبان و ادب ہے۔

نمونۂ کلام کے لئے ایک غزل ہدیۂ ناظرین ہے ؎

دل جنون گداز محبت ہی سہی — عقل سودائی وحشت ہی سہی
جو ملے دوست سے اک نعمت ہے — اس کے ناوک کی جراحت ہی سہی
دل تری یاد سے خوش رکھتا ہوں — شب غم کاہش و زحمت ہی سہی
عشق کی راہ میں ہمدم! دل زار — ہدف تیر ملامت ہی سہی
سہی سہہ لیتے ہیں اہل ہمت — غم ہی، رنج و مصیبت ہی سہی
عشق صادق ہو تو کچھ بات نہیں — دوستی کا ریشہ قت ہی سہی
تھی یہی اس کی مشیت، کیا غم — نامرادی مری قسمت ہی سہی
یہ بھی ہو جائیگی اک آن میں طے — دور منزل کی مسافت ہی سہی
کوئی سنتا نہیں، کس سے کہئے — مختصر غم کی حکایت ہی سہی
کچھ تو مل جائے گی لذت دل کو — نیچی نظروں سے اشارات ہی سہی
دل افسردہ کو کیا بخشے سرور — قدح بادۂ عشرت ہی سہی

کوچۂ یار نہ چھوٹے عرفاں
گر وہ ہو کوچۂ آفت ہی سہی

---

¹۔ آپ کے تلامذہ میں عملی شطاری، بہر متصل اسلام پور ضلع پٹنہ، حضرت عرفان کے ہمشیر زاد تاباں مرحوم خلف اصغر حضرت عرفاں جن کا دالد [illegible] صاحب اولاد ہیں۔ راقم کم سواد نشان ابدالی، حکیم شاہ محمد ابدالی شاقب اسلام پوری حضرت بیدل ابدالی اور حضرت شاہ محمد ابو البرکات [illegible] سجادہ نشین خانقاہ اسلام پور اور حضرت کامل خلف اصغر حضرت صوفی اور سجادہ نور احمد خان صاحب مرحوم۔ طالب رئیس اسلام پور برادر زادہ حضرت عرفاں اور جناب مولوی ہارون صاحب زمیندار موضع لوہنڈہ ضلع پٹنہ تھے ماسوا میں ان میں سے اکثر کے حالات "تذکرہ مسلم شعرائے بہار" مولفہ مولانا احمد اللہ ندوی۔ طبع کراچی کے مختلف حصص میں آچکے ہیں

محمد ایوب قادری ایم اے

مرزا غالب سے معاصرین کی ادبی چھیڑ چھاڑ

مرزا غالب کلکتہ میں تقریباً پونے دو سال مقیم رہے، وہاں کی آب و ہوا، سبزہ زار وغیرہ ان کو خوب پسند آئے مگر مدرسہ عالیہ کلکتہ کی ادبی انجمن کے تحت منعقدہ مشاعروں سے جو ادبی ہنگامہ آرائی ہوئی، اس کا سلسلہ غالب کی آئندہ چالیس سالہ زندگی تک جاری رہا اور اس کا نقطہ عروج قاطع برہان کی ترتیب تھی جو انہوں نے ۱۸۵۷ء کے عزلت گزینی کے زمانے میں انجام دی، در قاطع برہان اور برہان قاطع کی تائید و تردید کا یہ سلسلہ ان کی زندگی کے آخر دم تک جاری رہا۔

فارسی شعر و ادب کا ذوق غالب کو مبداء فیاض نے بخشا تھا انہوں نے قدیم شعرائے فارسی کا کلام بغور پڑھا فارسی زبان و ادب کی باریکیوں اور غوامض کو ذہن نشین کیا، ذہانت، نکتہ آفرینی اور میلان طبع نے سونے پر سہاگے کا کام کیا مرزا غالب برصغیر پاک و ہند کے فارسی شاعروں اور ادیبوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کلکتہ کی ادبی ہنگامہ آرائیوں نے اس اختلاف کو نفرت میں بدل دیا۔ کلکتہ میں مدرسہ عالیہ کی ادبی انجمن کے تحت جو مشاعرے ہوئے وہاں غالب کے مندرجہ ذیل اشعار

جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشم　　　　ہمچو موئے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

شور اشکے بہ فشار بن مژگان دارم　　　　طعنہ بر بے سرو سامانی طوفاں زدہ

خاص طور سے زیر بحث آئے[1] اور معترضین اجتہاد قتیل کو سند میں لائے اور ان میں اکثریت قتیل کے حامیوں کی تھی مخالفین میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے دو مدرس مولوی عبدالقادر[2] اور مفتی کبیر احمد[3] کے نام بھی لئے جاتے ہیں[4]۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے

---

[1] غلام رسول مہر، غالب (لاہور ۱۹۴۴ء) ص ۱۱۵-۱۱۷، محمد اکرام شیخ، غالب نامہ (لاہور ۱۹۳۶ء) ص ۱۴۱، مالک رام، ذکر غالب (دہلی ۱۹۶۴ء) ص ۷۷

[2] مولوی عبدالقادر (کلکتوی) کو شیخ محمد اکرام نے مولوی عبدالقادر رام پوری (ف ۱۸۴۹ء) سمجھ لیا جو صحیح نہیں (ملاحظہ ہو محمد اکرام شیخ ص ۱۴۱)

[3] مالک رام کا خیال ہے کہ یہ احمد کبیر رامپوری (ف ۱۲۷۹ھ) تھے، مالک رام ص ۷۸۔ [4] نگار رامپور فروری ۱۹۶۳ء ص ۱۰۴ بحوالہ مالک رام ص ۷۸

مولوی وجاہت علی لکھنوی دجاہت شاگرد قتیل اور احمد علی گوپاموی وغیرہ کا بھی نام لیا ہے[۱]۔ بعض لوگوں نے مرزا غالب کا سب سے بڑا حریف مرزا امان علی خاں غالب عظیم آبادی کو بتایا ہے[۲] جو قتیل کے شاگرد تھے[۳]۔ تعجب ہے کہ مرزا غالب کے یہاں یا دوسرے ہم عصر مآخذ میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔

مرزا غالب کی طرف سے مدافعت کرنے والے نواب علی اکبر خاں طباطبائی، محمد محسن[۴] اور کفایت خاں (سفیر والئی ہرات) اور مولوی عبدالکریم وغیرہ تھے۔

مرزا غالب نے محسوس کیا کہ اگر یہ ادبی ہنگامہ برپا رہا تو ان کے مقصد کو نقصان پہنچے گا۔ لہٰذا انہوں نے صلح و صفائی کی بنیاد ڈالی اور ایک مثنوی "باد مخالف" کے نام سے لکھ کر اس ہنگامے کو عارضی طور سے ختم کر دیا مگر ان کے دل میں جو گرہ پڑ گئی وہ باقی رہی اور آتشِ انتقام نے ان کو بے چین رکھا۔

برہانِ قاطع اور قاطع برہان کی تردید و تائید میں جس قدر لکھا گیا ہے اس پر مختلف حضرات نے شرح و بسط سے روشنی ڈالی ہے اور اس موضوع پر خاصا مواد مہیا ہو گیا ہے۔ یہاں ہم چند ایسے واقعات کی نشاندہی کرتے ہیں جن میں ان کے ہم عصروں کے ساتھ مرزا غالب کی ادبی چھیڑ چھاڑ کا سراغ ملتا ہے۔

(۱)
امیر حسن خاں بسمل

کلکتہ انگریزی حکومت کا صدر مقام اور گورنر جنرل کا مستقر تھا۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں اور حکومتوں کے سفارتی نمائندے اور وکلا مستقل طور سے وہاں رہتے تھے شاہ اودھ غازی الدین حیدر (ف ۱۸۲۷ء) کی طرف سے ۱۲۴۱ھ میں مفتی خلیل الدین کا کوروی ان ۱۲۸۱ھ اس عہدے پر مقرر ہوئے۔ جب ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء میں شاہ نصیر الدین سریر آرائے حکومت ہوئے تو مفتی خلیل الدین کی جگہ عاشق علی خاں کاکوروی سفارت کے منصب پر فائز ہوئے ان کا تقرر ۱۲ رجب ۱۲۴۳ھ کو عمل میں آیا ان کے متعلق شاہ تراب علی قلندر لکھتے ہیں[۵]

---

[۱] ابوالکلام آزاد، نقش آزاد (مرتبہ غلام رسول مہر) (کتاب منزل لاہور ۱۹۵۹ء) ص ۲۷۹

[۲] حمید احمد خاں پروفیسر، غالب کا کلکتہ (ماہ نو کراچی، جنوری فروری ۱۹۶۹ء) ص ۵۵، دفا راشدی، غالب اور بنگال (ماہ نو کراچی، جنوری فروری ۱۹۶۹ء) ص ۷۵

[۳] ۔ مرزا امان علی خاں نام، غالب تخلص، وطن عظیم آباد، مرزا قتیل کے شاگرد تھے، فارسی میں شعر کہتے تھے، ہندو مذہب چھوڑ کر مشرف بہ اسلام ہوئے ایک مدت تک ڈپٹی کلکٹر رہے، آخر میں کلکتہ میں سکونت اختیار کر لی تھی ملاحظہ ہو احمد اللہ ندوی حکیم مسلم شعرائے بہار (حصہ سوم) (کراچی ۱۹۶۸ء) ص ۱۷۷۔　[۴] غلام رسول مہر نے ان کا نام محمد حسن لکھا ہے (غلام رسول مہر) ص ۱۱۶

[۵] تراب علی قلندر، کشف المتواری فی حال نظام الدین القاری (مرتبہ امجد علی علوی) (مطبع اصح المطابع لکھنؤ ۱۳۱۸ھ) ص ۱۳۱

"عاشق علی خاں بہادر . . . از حضور بادشاہ اودھ بدرجہ اعلیٰ رسیدہ مستغنی روزگار شد مرد فہیدہ و سنجیدہ و متدین است در عہد دولت و اقتدار خود کسے را رنجیدہ نشدہ بلکہ حسب حال بایگانہ و بیگانہ خود خدمتہائے شائستہ کردہ می کند از بد دیگر نعیبہ در دے شرارت درین آخر عمر بنہایت مزاج مائل بتصوف ست"[1]

امیر عاشق علی خاں صاحب تصانیف تھے ذخیرۃ العقبیٰ فی فضائل ائمۃ الہدیٰ (مطبوعہ) اور (۲) کلمۃ الحق (۳) نقد دل (غیر مطبوعہ) ان سے یادگار ہیں۔

۱۰ رمضان المبارک ۱۲۵۶ھ مطابق ۲ر نومبر ۱۸۴۰ء کو ان کا انتقال ہوا[1]

مرزا غالب اور عاشق علی خاں سے نہ صرف تعارف تھا بلکہ مہر و وفا کے تعلقات تھے[2] ہمارا یہ خیال ہے کہ جب مرزا کلکتے پہنچے ہوں گے تو انہوں نے سرکاری اہل کاران اور ان مسلم زعماء سے ضرور تعلقات قائم کئے ہوں گے جو سرکاری دفاتر اور خاص طور سے گورنر جنرل کے دفاتر میں اعلیٰ مناصب پر فائز تھے تاکہ ان کو اپنے مقصد کے حصول میں مدد مل سکے۔ عاشق علی خاں کے علاوہ کاکوری کے دو دوسرے مشاہیر مفتی خلیل الدین خاں (م ۱۲۳۸ھ)[3] اور مولوی مسیح الدین کاکوروی (ف ۱۲۹۹ھ)[4] سے بھی غالب کے تعلقات تھے اول الذکر کے نام تو ان کا ایک خط پنج آہنگ میں شامل ہے جس میں انہوں نے اپنے مقدمے کے بعض نکات کی وضاحت کی ہے۔

عاشق علی خاں کے ساتھ تعلقات قائم ہونے کے بعد ان کے نامور فرزند امیر حسن خاں بسمل سے بھی مرزا غالب کے تعلقات قائم ہوگئے۔ بسمل عربی و فارسی میں کامل استعداد رکھتے تھے اور "سرآمد سخن سنجان روزگار" سمجھے جاتے تھے۔ شیخ غلام مینا ساحر کاکوروی[5] کے شاگرد تھے مولف صبح گلشن لکھتے ہیں[6]

"منشی امیر حسن خاں مرحوم ابن منشی عاشق علی خاں مغفور کاکوروی کہ از ممتازان عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ ملک اودھ است، جامع صفات لاتحصٰی ولاتعد شاگرد رشید غلام مینا ساحر کاکوروی است دردستگاہش

---

[1] محمد علی حیدر، تذکرہ مشاہیر کاکوری (لکھنؤ ۱۹۲۷ء) ص ۲۳۱

[2] غالب، مرزا اسد اللہ خاں، کلیات نثر غالب (لکھنؤ ۱۸۷۵ء) ص ۲۰۷

[3] حالات کے لئے دیکھئے محمد علی حیدر ص ۱۴۶ - ۱۵۱

[4] ایضاً ص ۲۹۹ - ۳۰۳

[5] شیخ فضل حق عرف غلام مینا ساحر، ابن شیخ فضل امام، شاہ عبدالعزیز دہلوی و شاہ غلام علی دہلوی کی خدمت میں اکتساب فیض کیا۔ شاعری میں مصحفی سے تلمذ تھا۔ اپنے زمانے کے نامور استاد تھے۔ ۲۳ ذی قعدہ ۱۲۵۰ھ کو وفات پائی ملاحظہ ہو محمد علی حیدر ص ۳۰۸ - ۳۱۵، صبا، محمد مظفر حسین، روز روشن (بھوپال ۱۲۹۷ھ) ص ۲۰۸، تراب علی، ۱۴۲

[6] علی حسن خاں، صبح گلشن (بھوپال ۱۲۹۵ء) ص ۹۴

در نظر دفارسی قوی است "

مؤلف مشاہیر کاکوروی لکھتے ہیں[1]

"قادر الکلام شاعر تھے اور شاعری اور نثاری دونوں میں سرآمد سخن سنجان روزگار سمجھے جاتے تھے ..... مرزا نوشہ غالب مرحوم کے معاصر تھے ایک بار ان سے چشمک بھی ہو گئی تھی "

مؤلف مشاہیر کاکوری اس سلسلے میں رقم طراز ہیں[2] کہ امیر حسن خاں بسمل نے شاعرانہ تعلی میں مندرجہ ذیل شعر کہا۔

جملہ زاغ اند شاعران جہاں　　　لیک یک طوطی شکر خا من

کسی نے مرزا غالب کو یہ شعر سنایا تو انہوں نے جواب میں کہا۔

لاجرم می سزد کہ نکتہ دراں　　　نام بسمل نہند ہیرا من

طوطی کی رعایت سے ہیرا من (طوطا) لائے ہیں۔

چشمک کے اس واقعے کے زمانے کا تعین دشوار ہے اندازہ ایسا ہوتا ہے کہ یہ واقعہ قیام کلکتہ کا نہیں ہے ورنہ کہیں نہ کہیں کوئی ذکر یا اشارہ ضرور ملتا، ہمارا خیال ہے بسمل کی طرف سے فارسی گویان ہند قتیل و واقف وغیرہ کی ہم نوائی و تائید کو دخل ہوگا کیونکہ مؤلف مشاہیر کاکوری لکھتے ہیں[3]

"ان (بسمل) کی تصنیفات سے ایک نسخہ پنج گلبن ہے جو غالب کے پنج آہنگ کا جواب ہے یہ ۱۲۶۰ھ میں تصنیف ہوئی بہت عمدہ کتاب ہے "

امیر حسن بسمل سے مرزا غالب کے ایسے تعلقات تھے کہ اس نوک جھوک کے باوجود تجدید تعلقات کے لئے مرزا غالب ہی نے پہل کی انہوں نے نواب مظفر حسین خاں کو ایک مکتوب میں لکھا[4]

"چوں بکلکتہ رسیدہ اند چہ خوش باشد کہ دلنوازی و کارسازی را اساس استوار نہند ولا ابالی خرام عرصہ سخنوری یوسف کنعان معنی گستری بقلم غالیہ سائی و بہ نفس عطر فشاں شیوا زباں روشن دلان امیر حسن خاں بسمل را بامن آشتی دہند زنگار آئینہ گراں نشیں نیست کہ کف بزدودن تواں سترد و خورشدلی درمیانہ ہم روئے نتواں نمود .... یزداں داند کہ آں گفتار کہ ازاں سو بہ بیہدہ لائی وازیں سو در تلافی بمیاں آمدنہ پسندیدہ ام و دانم کہ دانا نہ پسندد "

---

[1] محمد علی حیدر ص ۱۵
[2] ایضاً
[3] ایضاً ص ۵۲
[4] غالب مرزا اسد اللہ خاں ص ۲۰۶ - ۲۰۷

بسمل کے والد سے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے مرزا غالب لکھتے ہیں [1]

"مہر و وفائے من با منشی عاشق علی خاں مغفور آں می خواہد کہ تا امیر حسن خاں را از جان دوست تر ندارم خود را از حق گزاراں نشمارم۔ ندانم ایں جواں مرد تند خو ناساز گارمنش را چہ در سر افتاد کہ با من کہ پیر غم زدہ گوشہ نشینم بدیں بے مہری افتاد

فرد　　خوش آنکہ معذرتی صرف بر ستم گردد　　بداں معاملہ او بیدماغ و من بے دل

با آنکہ عذر را از آں سوی بایست و مارا جز مہر و محبت آئین نیست، امید کہ آزادگی و مردی دریغ ندارند و از گزشتہ درگزشتہ خوئے خود و خطائے دوستاں درگزارند"

غالب نے یہ خط عاشق علی خاں کے انتقال ۱۸۴۱ء کے بعد لکھا۔ ایک خط میں امیر حسن خاں کو لکھتے ہیں [2]

"امید کہ ازیں پس بہ بند مہر بندہ وفادار و لغز سخن ہوا دار انگارند و یقین پندارند کہ فلانی را با دل یکی و زبان و دلش ہر دو با ماست"

اس خط میں غالب نے مولوی مسیح الدین خاں کا کورزی کو آداب بھی لکھا ہے۔

امیر حسن خاں بسمل نے اس خط کا جواب دیا اور خط کے عنوان پر یہ شعر لکھا [3]۔

اے شمع شرح داغ مپرس از دلم خموش　　سوز دلے کہ گوش بریں داستاں دہد

اس کے بعد غالب نے ایک اور خط لکھا جس کا آغاز اس طرح کیا ہے [4]

"خاقانی پایہ صاحبا وخسروی سرمایہ مطاعا نامہ نامی نام آور چوں دولت دلخواہ کہ ناگاہ رسد ہم ناگاہ رسید و ہم دلخواہ آمد ہمانا داد اندازہ شناسی، شکیب دادند و مرد انتظار پیش از انتظار فرستادند، زہے مشکبار نامہ بہار کار نامہ

فرد　　از روئے نگار دلکشا تر　　وز باد بہار جانفزا تر

بدیں ارزش اگر خود را نازم و بدیں شادی اگر بخت را ستایم ہم من بنازش ارزم و ہم بخت بستائش آنکہ دریں نامہ خود را بہ سخن ستودہ اند گوئی با من از مہر ہم زبان بودہ اند"

آخر میں غالب لکھتے ہیں [5]

---

[1] غالب، مرزا اسد اللہ خاں ص ۲۰۷

[2] ایضاً ص ۲۰۹

[3] محمد علی حیدر ص ۵۲

[4] غالب ص ۲۰۹　[5] غالب ص ۲۰۹

بتوام زندہ وناديدہ سراپائے ترا ‌ ‌ ‌ گمنام زسراپائے تو کاں جانِ منست
شرط اسلام بود ورزش ایمان بالغیب ‌ ‌ ‌ اے تو غائب ز نظر مہرِ تو ایمانِ منست

لف تذکرہ مشاہیر کاکوری لکھتے ہیں کہ مرزا غالب نے مندرجہ ذیل رباعی بھی ان کو لکھ کر بھیجی تھی [1]

گر پرورش مہر بتاں دل بودے ‌ ‌ ‌ در دہر شیوع مہر مشکل بودے
در صدق ز جملہ رسائل بودے ‌ ‌ ‌ بسم اللہ آں رسالہ بسمل بودے

پنج گلبن کے علاوہ جس کا ذکر اوپر ہوچکا ہے میزان المعانی بھی ہے اور فارسی دیوان بھی ان سے یادگار ہے، تذکرہ مشاہیر کاکوری میں بسمل کے فارسی کلام کا نمونہ شامل ہے [2]

امیر حسن خاں بسمل ۲۷ رمضان ۱۲۶۳ھ مطابق ۸ ستمبر ۱۸۴۷ء کو کلکتہ میں فوت ہوئے اور سیالدہ اسٹیشن کے قریب تدفین عمل میں آئی [3]

(۲)
خلیفہ احمد علی احمد

خلیفہ شیخ احمد علی نام، احمد تخلص، باپ کا نام شیخ نادر علی تھا۔ تقریباً انیسویں صدی عیسوی کے پہلے عشرے میں پیدا ہوئے [4] فارسی کی تحصیل رام پور کے مشہور اساتذہ مولوی عنبر شاہ خاں آشفتہ (۱۲۲۹) اور کبیر خاں تسلیم (وفات ۱۲۵۱ھ) سے پائی اور دیگر علوم متداولہ کی تحصیل رامپور کے دوسرے علماء سے کی۔ فارسی زبان و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ حافظ احمد علی خاں شوق رامپوری لکھتے ہیں [5]

" خلیفہ (احمد علی) کہا کرتے تھے کہ فارسی کے لطف نے عربی چھڑا دی "

مولانا عرشی رقمطراز ہیں [6]

" ادبیات فارسی کے ذوق نے خلیفہ صاحب کو عربی علوم کے لطائف کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا اور

---

[1] محمد علی حیدر ص ۵۲۲ مرزا کی یہ رباعی ان کی کلیات میں بھی ہے۔ [2] ایضاً ص ۵۳۴-۵۵ [3] ایضاً ص ۵۵۴

[4] حافظ احمد علی خاں شوق نے خلیفہ احمد علی کا انتقال نوے سال کی عمر میں ۱۳۰۹ھ میں لکھا ہے (تذکرہ کاملان رام پور، دہلی ۱۹۲۹ء ص ۲۴۳) اسی بنا پر مولانا عرشی نے ان کا سال پیدائش ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۵ء قرار دیا ہے (مکاتیب غالب، رامپور ۱۹۴۹ء ص ۱۱۴) مگر منشی امیر احمد مینائی نے اپنے تذکرہ "انتخاب یادگار" کی تدوین (۱۲۹۰ھ) کے وقت ان کی عمر پینسٹھ سال بتائی ہے (امیر مینائی انتخاب یادگار، لکھنؤ ۱۲۹۷ھ ص ۹۲) اس طرح ان کا سال پیدائش ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء قرار پاتا ہے۔ [5] ملاحظہ ہو امیر مینائی ص ۹۴-۵، احمد علی خاں شوق ص ۲۷۱-۲۷۸ [6] ملاحظہ ہو امیر مینائی ص ۹۵ و احمد علی خاں شوق ۳۲۸-۳۲۹ [7] احمد علی خاں شوق ص ۲۴۲

[8] عرشی، امتیاز علی ص ۱۱۴

ان کی ساری عمر شیراز و شیروان ہی کے مرغزاروں میں گزر گئی "۔

خلیفہ احمد علی کی وجہ سے رام پور میں فارسی زبان و ادب کو خوب ترقی ہوئی رام پور میں ان کے سینکڑوں نامور شاگرد موجود تھے، نواب یوسف علی خان (ف ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۵ء) اور نواب کلب علی خاں (ف ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۷ء) بھی ان کے حلقۂ تلمذ سے وابستہ تھے خلیفہ صاحب نہایت نیک اور سادہ مزاج آدمی تھے۔ درسی کتابوں کے پڑھانے میں بے مثل و بے نظیر تھے۔ منشی امیر احمد مینائی لکھتے ہیں [1]

"فارسی کے استاد ہیں بڑے ذی استعداد ہیں جملہ کتب درسیہ فارسی پر عبور ہے نام نامی ان کا دور تک مشہور ہے .... سینکڑوں آدمی ان سے مستفید ہیں۔

کبھی کبھی فارسی میں شعر بھی کہتے تھے منشی امیر احمد مینائی نے بطور نمونہ تین شعر انتخاب یادگار میں نقل کئے ہیں ۹ رمضان ۱۳۰۹ھ مطابق ۲۸ اپریل ۱۸۹۲ء بروز پنجشنبہ انتقال ہوا [2]

جب مرزا غالب رام پور آئے تو خلیفہ احمد علی سے بھی ملاقات ہوئی خلیفہ صاحب نے عرفی کے کلام پر نکتہ چینی کی اور مندرجہ ذیل دو شعر زیر بحث آئے [3]

ساکتم ایں نغمہ تا در نیم شب   ہمرۂ مرغ سحر خواں می زنم
شاہدی کو کہ یک نفس گوشی   بدل درد پرور انداز د۔

خلیفہ صاحب نے نصف شب کو مرغ سحر خواں کے ہم آواز ہونے اور دوسرے شعر میں گوش انداختن کی ترکیب پر اعتراض کیا۔ یہ گفتگو پہلی نشست میں ناتمام رہی اور طے پایا کہ خلیفہ صاحب رات کو آ کر گفتگو کریں گے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب کسی وجہ سے پہنچ نہ سکے لہذا غالب نے اپنے دلائل ایک خط میں لکھ کر بھیج دئے جس کا ایک حصہ نقل کیا جاتا ہے [4]

"ہر چند "سحر" اور "صبح" بطریق مجاز بعد نصف شب سے صبح تک مستعمل ہے۔ طعام آخر شب کو "سحری" اور "سحر گہی" کہتے ہیں اور مرغانِ خوش آواز کہ بلبل بھی ان میں ہے، اکثر پہر سوا پہر رات سے بولتے ہیں، نصف شب کو مرغ سحر خواں کا ہم آواز ہونا محل اعتراض نہیں ہے۔

"گوش کا استعمال "انداختن" کے ساتھ اگر شعرائے ہند کے کلام میں آیا ہوتا تو ہم اس کی سند اہل زبان کے کلام سے ڈھونڈتے، جب وہ خود عرفی نے لکھا ہے تو ہم سند اور کہاں سے لائیں ؟ قواعد زبان فارسی کا ماخذ تو ان

---

[1] امیر مینائی ص ۹ ۔ [2] احمد علی خاں شوق ص ۲۴۲
[3] عرشی (مکاتیب غالب) ص ۱۱۴ [4] ایضاً ص ۱۱۵
[5] احمد علی خاں شوق ص ۲۴۲
[6] عرشی ص ۱۱۵

حضرات کا کلام ہے جب ہم انہیں کے قول پر اعتراض کریں گے تو اس اعتراض کے واسطے قاعدہ کہاں سے لائینگے"۔
حافظ احمد علی خاں شوق لکھتے ہیں کہ مندرجہ ذیل شعر بھی خلیفہ احمد علی رام پوری اور مرزا غالب کے درمیان وجہ نزاع رہا[1]

منکہ باشم عقلِ کل را ناوک انداز ادب مرغ توصیف تو از اوجِ بیاں انداختہ

مولانا عرشی لکھتے ہیں کہ مرزا غالب کے خط میں تو اس کا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے اس کی صرف یہی تاویل ہو سکتی ہے کہ مذکورہ بالا دو شعروں کے ساتھ یہ شعر بھی زیر بحث آیا ہو[2]۔

(۳)

مولوی علی بخش شرر

مولوی علی بخش شرر بن سلطان بخش ۱۲۳۲ھ میں بدایوں میں پیدا ہوئے خاندان بخوش کے نامور رکن اور مشہور عالم تھے شہید حریت مولانا فیض احمد بدایونی[3] کے شاگرد اور مولوی عبد المجید بدایونی (ف ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۶ء) کے مرید با اخلاص تھے انگریزی سرکار کی طرف سے صدر الصدور رہے تصنیف و تالیف کا بھی مشغلہ رکھتے تھے۔ سرسید احمد خاں کے سخت مخالف تھے ان کے رد میں کئی رسالے لکھے "شہاب ثاقب" اور "تائید الاسلام" اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں ان کے علاوہ "تنقیح المسائل" اور "برق خاطف" بھی ان کی تصانیف ہیں ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء میں ان کا انتقال ہوا "سید الحاج در بہشت رسیدہ" سے تاریخ انتقال نکلتی ہے[4]۔

شرر کو شعر و شاعری کا ذوق تھا لکھنوی اساتذہ کے رنگ میں کہتے تھے لیکن اپنے مرشد کے ایما پر عشقیہ شاعری ترک کر کے نعت کہنے لگے۔ ان کا دیوان اسعد الاخبار آگرہ سے ۱۲۶۹ھ میں شائع ہو چکا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے مضمون میں ایک قلمی مجموعہ سے اقتباس دیا ہے شاعری کے متعلق پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں[5]۔

"کلام کا عام رنگ اس زمانے کا سا ہے یعنی ناسخ کی رعایت لفظی، ذوق کے محاورے، جرأت کی معاملہ بندی شاہ نصیر کی مشکل ردیفیں، سب کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے اشعار صاف اور سادے ہیں اور ان میں تغزل کی جھلک بھی نظر آتی ہے"۔

---

[1] احمد علی خاں شوق ص ۲۴۲

[2] عرشی ص ۱۱۵

[3] حالات کے لئے دیکھئے محمد ایوب قادری، مولانا فیض احمد بدایونی، (پاک اکیڈمی، کراچی ۱۹۵۷ء) [4] ملاحظہ ہو، رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند، اردو ترجمہ محمد ایوب قادری) کراچی ۱۹۶۱ء ص ۲۴۴، ضیاء القادری، محمد یعقوب اکمل التاریخ حصہ اول بدایوں ۱۹۱۵ء ص ۲۲، سرور آل احمد نئے اور پرانے چراغ (کراچی ۱۹۵۱ء) ص ۱۱۴ - ۱۳۷، علی احمد محمود اللہ قاضی، عین الانسان (وکٹوریہ پریس بدایوں) ص ۴۷، ۴۸، سری رام لالہ خم خانہ جاوید جلد چہارم (دہلی ۱۹۲۶ء) ص ۴۹۸ [5] سرور، آل احمد ص ۱۲۷

مرزا غالب سے تعلقات کے سلسلے میں مولوی محمد یعقوب ضیاء القادری لکھتے ہیں [1]

"مرزا غالب سے ہمیشہ شاعری میں چھیڑ چھاڑ رہی"

پروفیسر آل احمد سرور اس سلسلے میں رقمطراز ہیں [2]

"یہ بات قابل غور ہے کہ اکثر غزلوں پر ہم طرح غزلیں ملتی ہیں مصنف اکمل التاریخ نے لکھا ہے کہ مرزا غالب سے ہمیشہ شاعری میں چھیڑ چھاڑ رہی اس کا کوئی اور ثبوت نہیں مل سکتا لیکن مگر غالب کی غزلوں سے یہ بہت پھیکی ہیں ان میں ذوق کا رنگ زیادہ ہے"

مؤلف اکمل التاریخ ضیاء القادری [illegible] نوے سال کے پیٹے میں ہیں ہم [illegible] میں اس اجمال کی تشریح [illegible] نے فرمایا [3]

"نوے سال کو پہنچ چکا ہوں حواس مختل ہو گئے ہیں دکھائی اور سنائی نہیں دیتا۔ حافظہ کا ساتھ چھوڑ چکا ہے۔ اکمل التاریخ کو چھپے ہوئے تیس سال کے قریب ہو گئے۔ اب کوئی تفصیل یاد نہیں [illegible] لکھتے [illegible] مدرسہ قادریہ کا سارا [illegible] میرے سامنے تھا مولوی علی بخش مرحوم [illegible] کے خاندان کے ذخائر [illegible] رسائی تھی کچھ قلمی مواد مولوی حامد بخش مرحوم اور مولوی سراج الحق صاحب کے یہاں کا بھی تھا۔ اس [illegible] میں کہیں یہ بات لکھی تھی کہ مرزا غالب اور مولوی علی بخش شرر سے شعر و شاعری میں چشمک اور چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ میں نے متعدد غزلیں غالب کی زمین میں ان کے دیوان میں دیکھی تھیں ان کا مطبوعہ دیوان میرے سامنے رہا تھا"

غرض اس چھیڑ چھاڑ کی نوعیت اور تفصیل کا سراغ نہیں ملتا مگر یہ حقیقت ہے کہ مولوی علی بخش شرر خود کو غالب کا مدمقابل سمجھتے تھے اور ان کے جواب میں ہم ردیف و ہم قافیہ غزلیں لکھتے تھے۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں [4]

"عشقیہ دیوان کے علاوہ آپ (شرر) کے چار نعتیہ دیوان بھی ہیں مگر یہ انہوں نے اپنے بھتیجے مولوی حامد بخش کے نام سے چھپوا دیے ہیں اور اس میں حامد تخلص رکھا ہے۔ یہ نئی بات نہیں ہے اور بھی بہت سی مثالیں اس قسم کی ملتی ہیں۔ نعت میں یہ رنگ زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے اور بعض بعض اشعار محسن کاکوروی

---

[1] ضیاء القادری ۶۶۴

[2] سرور، آل احمد ص ۱۲۶

[3] مکتوب ضیاء القادری بنام راقم ۳، فروری ۱۹۶۹ء

[4] سرور آل احمد ۱۳۰۴

کے پائے کے ہیں''

نعتیہ دیوان "گلزار نظم حامد" مطبوعہ مطبع نسیم سحر بدایوں ۱۳۰۱ھ ہمارے پیش نظر ہے۔ اس میں اکثر غزلیں غالب کی غزلوں کے جواب میں ہم ردیف و ہم قافیہ لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک واقعہ اور قابل ذکر ہے۔ جس سے اس چھیڑ چھاڑ کے خیال کو اور تقویت پہنچتی ہے، مرزا غالب کلکتے گئے تو مولوی کرم حسین بلگرامی نے اپنے ہاتھ پر چکنی ڈلی رکھ کر کچھ اشعار کہنے کی فرمائش کی جس پر مرزا غالب نے ایک دلچسپ قطعہ کہا جس کا پہلا شعر ہے

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی — زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے

اسی زمین میں مولوی علی بخش شرر بدایونی نے ایک پیچوان کی رسید لکھی ہے جو درج ذیل ہے[1]

پیچواں حقہ عنایت جو کیا حضرت نے — جگر و دل میں یہ جھگڑا ہے اسے کیا کہئے
تہ عرش معلی کے مشابہ سمجھئے — اور لطافت میں مہ دہر سے مانا کہئے
برج سے دل کے گرد حقے کی دیجئے تشبیہ — روشنی میں بھی اسے عقد ثریا کہئے
سر ز گردن سے پری زاد کے نسبت دیجئے — زاہدوں کا دل پر نور و مصفا کہئے
کان سے زہرہ کے بجلی سے مگر ٹوٹ پڑی — یا نئی وضع کا تابندہ ستارا کہئے
باغ فردوس کا اس کو اگر گل شبو سمجھئے — یا نئی نقرۂ جنت کی ہے شہنا کہئے
کوزہ ہائے لب کوثر کے مشابہ سمجھئے — وضع میں اس کو نہ کیوں شیشۂ صہبا کہئے
آب حیواں کے یہ بھرنے کی سراہی ہے مگر — حضرت خضر کی تسبیح کا شمسا کہئے
اور اس نیچے کی تشبیہ میں لکھئے رگ جاں — حلقۂ زلف حسینانِ خود آرا کہئے
حقے کو کہئے اگر ماہ شب چار دہم — نیچے کو دیکھتے ہی چاند کا ہالا کہئے
مار کنڈلی میں لئے بیٹھا ہے مہرہ اپنا — ہے بجا گر اسے دم دار ستارا کہئے
گوہر گوش حسیناں جو کہا حقے کو — حلقہ نیچے کا نہ کیوں کان کا بالا کہئے
سارے نیچے پہ جو ہے کام یہ زر دوزی کا — کہکشاں سے بھی نہ کیوں رتبے میں اعلا کہئے
دور پہ اس کے تو گردوں بھی بلا گرداں ہے — کہئے گر قوس قزح تو بھی نہ بیجا کہئے
خم کو نیچے کے ہے محراب حرم سے تشبیہ — خم ابروئے ستمگرانِ خود آرا کہئے
حلقے میں نیچے کے چمکے ہے جو دُرِ درخشی — چاہِ نخشب میں مگر چاند کا جلوا کہئے

---

[1] غالب، مرزا اسد اللہ خاں، دیوان غالب اردو (نسخۂ عرشی) (علی گڑھ ۱۹۵۸ء) ص ۲۲۲ - ۲۲۳

حلقۂ زلف میں ہے روئے حسیناں کی چمک — یا کہ قندیل لبِ محرابِ حرم کا کہیے
ہے مناسب اسے سمجھے جو شہابِ ثاقب — یا رُخِ جاں سے ملا قلبِ مجلّا کہیے
نَے کو دیکھو تو ہے اک زاہدِ لاغر کی مثال — ذکرِ حق کو نہ کیوں اس کا وظیفا کہیے
یا اسے قدِ حسیناں کے مشابہ سمجھے — غیرتِ سرو خجلت دِہ طوبا کہیے
آتشِ گل سے جو اُس نَے پہ چمکتی ہے چلم — ساتھ موسیٰ کے ضیائے یدِ بیضا کہیے
طورِ حقّے کو تشبیہ چمک میں دیکھیے — پھر چلم اس کی نہ کیوں برقِ تجلا کہیے
ایک نیرے پہ ہے خورشیدِ قیامت چمکا — سرد پر یا کہ بہارِ گلِ لالہ کہیے
گر اس نَے کو سمجھتے ہیں کہ ہے نار پرست — کیوں نہ پھر حقّے کو ناقوسِ کلیسا کہیے
دار کی شکل ہے نَے حق کہے ہے حق حق — مثلِ منصور نہ کیوں حقّے کا رتبا کہیے
دم میں دم آئے ہے، جو شخص ہوا اس کا ہمدم — دم کو اس کے مگر انفاسِ مسیحا کہیے
گوشِ غلماں کا تو آویزہ یہ حقّہ ہے اثر — نیچے کو رشک دہ گیسوئے حورا کہیے

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی

غالب کی خطوط نگاری

اردو خطوط نگاری میں جو روش غالب نے اختیار کی وہ اپنا جواب نہیں رکھتی مانا کہ ان سے پہلے بھی اردو خطوط کے نمونے دستیاب ہوتے ہیں لیکن غالب نے یہ نغمہ اس نَے میں چھیڑا کہ اس کے سامنے سب آوازیں دب کر رہ گئیں، بعد میں آنے والوں نے بھی ان کی تقلید کرنی چاہی مگر غالب کی کل غالب، حیرت اس پر ہوتی ہے کہ فارسی کے زبردست شاعر اور انشاپرداز ہونے اور اردو شاعری میں مشکل پسندی کے خوگر ہونے کے باوجود انہوں نے اردو خطوط میں وہ طرز برتا جس کو سہل ممتنع کہا جائے تو بے جا نہیں، سچ تو یہ ہے کہ سادگی اور شوخی کا ایسا امتزاج اور کہیں نہیں ملتا۔ ان کے خطوط کیا ہیں۔ انہوں نے زندگی کے صدر رنگ جلووں کو جیسا دیکھا اور محسوس کیا ہے اپنی اعلیٰ فن کاری سے ہو بہو ان کی تصویر کھینچ دی ہے "

اشاریۂ غالب

"غالب کو ہمارے ادب میں اتنی اہمیت حاصل ہے، کہ شیفتہ، آزاد، حالی سے لیکر آج تک اس کثرت سے ہمارے اہلِ قلم نے اس مقبول موضوع پر طبع آزمائی کی ہے کہ اردو ادب کے گوناگوں رجحانات اور بالخصوص ہمارے فنِ تنقید کے ارتقاء کا پورا اندازہ اُن کتب کے مطالعے سے ہو سکتا ہے جو غالب کے متعلق لکھی گئیں، — فقط اس "ادبِ غالب" (غالبیات) سے ہم اپنے عام فنِ تنقید کی بلندی (یا پستی)، عمق اور سطحیت، واقعیت اور جذباتیت بشدت ناپ سکتے ہیں" (شیخ محمد اکرام، حکیم فرزانہ، ص ۲۰)

ادھر — میں کئی برس سے "ادبِ غالب" کا توضیحی اشاریہ مرتب کرنے میں الجھا ہوا ہوں۔ "اشاریۂ غالب" کے نام سے یہ کام تین جلدوں میں پیش ہوگا۔ جلد اوّل صدسالہ جشنِ غالب کے موقع پر مجلس یادگارِ غالب، پنجاب یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی ہے۔ تقریباً ۲۰۰ صفحات پر مشتمل یہ جلد، غالب کی تصانیف کی اوّلین اشاعتوں، مطبوعات و مرتباتِ مابعد، غالب کی معدوم تصانیف، اُن کی متفرق اور منتشر نگارشات اور تراجمِ غالب کے تعارف پر مبنی ہے۔ بقیہ دو جلدیں بھی اسی "موسم" میں آگے پیچھے غالب دوستوں کی نذر ہوں گی۔

پچھلے سوا سو برس میں غالب پر جو کچھ لکھا گیا ہے، یہ کتابیں ایک جامع اشاریے کی شکل میں اس کا تعارف کرائیں گی۔ اس اشاریے میں غالب پر لکھی ہوئی جزوی و کلّی تصانیف اور اخبارات و رسائل میں غالب کی سیرت و شخصیت، اُن کے فکر و فن، عہد، احباب اور تلامذہ سے متعلق مضامین نثر و نظم کے حوالے ابجدی ترتیب سے باعتبارِ مصنّف اور باعتبارِ موضوع ضروری صراحتوں کے ساتھ درج ہوں گے۔

میری انتہائی کوشش یہ ہے کہ "اشاریۂ غالب" ہر لحاظ سے مکمل اور جامع ہو اور "غالبیات" پر بنیادی کتابِ حوالہ کا کام دے اور یہ کام اہلِ نظر بزرگوں کی توجہ اور مشورے کے بغیر ممکن نہیں۔ "ادبِ غالب" کے ماہرین اور متخصّصین میں سے مجھے بعض اکابر کے تعاون کی سعادت حاصل ہے۔ دوسرے اور بہت سے بزرگوں کی رہبری و رہنمائی کا ملتجی اور متمنّی ہوں

غالب سے متعلق مواد کی نشاندہی کے بعد کی ایک کڑی منزل، اس کی فراہمی ہے۔ اس ضمن میں علمی خیر اندیشی کے طور پر اہلِ قلم بزرگوں اور غالب دوستوں سے عموماً اور اخبارات و رسائل کے مدیر اور ناشر صاحبان سے خصوصاً درخواست ہے کہ وہ راقم الحروف کی اعانت فرمائیں۔ کتابوں، رسائل کے خاص نمبروں اور تراشوں وغیرہ کی یہ فراہمی اہلِ کرم کی صوابدید پر ہے، بطور عاریت ہو یا بہ قیمت اور یا بصورتِ عطیہ — میں ہر طور لطف و کرم کے لئے شکر گزار ہوں اور احسان مند رہوں گا۔ فقط سید معین الرحمٰن

● میرا پتہ یہ ہے: مکان نمبر ۱۸ گلی نمبر ۹، قلعہ لچھمن سنگھ، راوی روڈ، لاہور

محمد سخاوت مرزا۔ بی اے ایل ایل بی

پیروانِ بیدل و غالب دکن میں

نام و نسب :- مرزا اسد اللہ خاں المتخلص بہ غالب کا مولد آگرہ ہے۔ سنہ ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت بھی وہیں پائی۔ عبداللہ بیگ خاں ان کے والد ماجد ریاست الور میں فوجی عہدیدار تھے۔ نصر اللہ بیگ خاں اکبر آباد کے صوبیدار تھے ننھیال کا تعلق آگرہ کے ممتاز خاندان سے تھا۔ غلام حسین خاں اکبر آبادی اُن کے نانا تھے۔ غالب کا قیام آگرہ میں تقریباً انیس سال تک رہا۔ وہیں شاعری کی ابتدا ہوئی اور عنفوان شباب تک آگرہ میں رہے جب ان کی آگرہ کی تمام جائداد ختم ہوگئی تو دہلی میں آخر دم تک قیام رہا اور سنہ ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ باوجود اہل کمال ہونے کے طلب معاش میں پریشان رہے، اپنے ایک شعر میں اشارہ کیا ہے کہ میری قدر مرنے کے بعد ہوگی۔ اگر غالب یورپ میں پیدا ہوتا تو نہ معلوم زندگی ہی میں اس کی کیا شخصیت اور مرتبہ ہوتا۔ سونے میں تلتا۔ مولانا حالی تلمیذ غالب نے ایک طویل مرثیہ لکھا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

؎ رشکِ عرفیؔ و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

بلکہ بیدل کا مایۂ ناز پیرو چل بسا۔

شاعری :- یوں تو غالب نے شعرائے متقدمین فارسی و اردو، ظہوری، نظیری، عرفی وغیرہ اور اردو میں، سودا، میر، خواجہ میر درد، ناسخ کی پیروی کی ہے۔ مگر غالب کا خود اپنا رنگ بھی ہے جو مرزا بیدل کے کلام سے متاثر ہے فلسفہ، تصوف، نفسیات، اخلاق، عشق و محبت سب کچھ ہے اور اس میں بڑی نکتہ آفرینی، دقت پسندی نیز قنوطیت رجائیت بھی ہے جو عین فطرت انسانی ہے۔ تشبیہات و استعارے بقول بجنوری تصویر نظم کے بوقلموں الوان ہیں۔ مثلاً خانہ زادِ زلف زنجیر رسوائی، خود داری ساحل، گزرگاہِ خیال، دامنِ خیال، محشرِ خیال، صحرا دستگاہ، دریائے بیتابی، شرارِ جستہ وغیرہ۔

بعض اشعار یہ ہیں۔ بلندی حوصلہ ملاحظہ ہو ؎

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

؎ غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

رنج و غم لذت سے گر خالی نہیں
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے

بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن
غمِ ہستی کا علاج نہیں ۔ غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

نادر تشبیہیں بہت سی ہیں، صرف ایک شعر بخوفِ طوالت درج ہے۔

ہے برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے بالِ یک تپیدن پر

غرض غالب کے طرزِ کلام پر بیسیوں تبصرہ لکھے گئے ہیں جو مخفی نہیں۔ ہم یہاں مرزا بیدل اور غالب کے کلام کے تاثرات اور ان کی طرح میں جو شعراء دکن نے غزلیں کہی ہیں اور غالب کے تلامذہ کے متعلق جو دکن کے تذکروں میں ذکر ہے ایک نظر ڈالتے ہیں جو غالباً ایک نئی چیز ہوگی۔ ضمناً بعض شعراء شمالی ہند کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

تذکرے :۔

۱۔ جامع الاشعار مطبوعہ مدراس :۔

غالب کے کلام کی شہرت مدراس میں بھی تھی۔ ایک انگریز ارنلڈ ایڈورڈ سیل ریپ، ڈپٹی منتظم مدرسہ ہارس وگھرے ذکشن، فیلو آف مدراس یونیورسٹی و ممتحن عربی، فارسی، اردو، طلبائے یونیورسٹی نے حسب ایمائے جناب ایچ، بی گریک صاحب بہادر ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم ممالک مدراس ایک کتاب بکمال تحقیق و تفتیش اساتذۂ اردو کا کلام فصاحت انجام سے تالیف کی اور ڈائرکٹر صاحب معتشم الیہ نے مڈل اسکول کے امتحان کے لئے اسے مقرر کیا حسب منشاء دفعہ ۱۹ ایکٹ ۲۵ سنہ ۱۸۶۷ء رجسٹر ہو کر دفعہ سیوم مطبع نظام لمطابع سے یہ کتاب جامع الاشعار کے نام سے ۱۱ مارچ ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں سترہ شعراء باکمال کا حال اور انتخاب کلام ہے۔ مثلاً۔ آتش، امیر، مظفر علی خاں امیرحسن، امانت، حیدر گویا موی درد خواجہ میر دہلوی، ذوق، رند، غالب۔ گویا غالب کی وفات سے ۲۷ سال بعد یہ تیسرا اڈیشن شائع ہوا تھا (مخزونہ کتب خانہ آصفیہ)

۲۔ دوسرا مشہور تذکرہ یادگار ضیغم مؤلفہ عبداللہ خاں ضیغم

لکھنوی، ثم حیدرآبادی، تالیف ۱۲۹۸ھ / ۱۳۲۴ء ہے۔ اس تذکرہ میں ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کے نسخہ میں مرزا غالب کے چالیس شاگردوں کا ذکر ہے جن میں حیدرآباد سے متعلقین میں سیف الحق ادیب بیدل سہارنپوری، ذکا مدراسی، عاقل دہلوی شامل ہیں۔ یہ تذکرہ ضیغم مسٹر مالک رام کی کتاب تلامذہ غالب کا ماخذ ہے۔ قمرالدین راقم تلمیذ غالب کا تفصیلی مضمون رسالہ اردو سنہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا ہے۔

بسمل غلام بسم اللہ بریلوی تلمیذ غالب کا ایک شعر یہ ہے۔

طرحِ غالب ۔ شب و نورا تک سے گردوں کفِ سیلاب تھا
دورہ چشم کو اک حلقۂ گرداب تھا۔

محمود، تلمیذ غالب تفصیلاً پرتاب گڑھ ۔

ہوتی ہے الفت دل دختِ رز سے اے ساقی
شراب خانے میں جاتے نہیں مغاں کے لئے

۳۔ شرح دیوان غالب از علامہ نوری حیدرآبادی

علامہ جلال الدین نوری حیدرآبادی پروفیسر عربی نظام کالج حیدرآباد دکن دیوان مرزا غالب دہلوی کی بعض شرحیں حیدرآباد میں بھی لکھی گئی ہیں جن میں علامہ نظم طباطبائی کی بہت مشہور ہے۔ نوری نے بھی ایک شرح دیوان غالب کی لکھی تھی۔ علامہ بڑے فاضل شخص تھے۔ اہل زبان ممدوح کی تحقیق پر سر دھنتے تھے۔ مگر آپ نمود و نمائش بالکل پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ اپنی زندگی میں شرح غالب کے چھپوانے کی اجازت نہیں دی۔ مولوی ابو محمد عمر یافعی نے جو بڑے علم دوست فرد تھے۔ اس کو سنہ ۱۳۴۱ھ میں اپنے اہتمام سے چھپوایا تھا۔ علامہ کا انتقال سنہ ۱۳۳۳ھ میں ہوا۔ یافعی مرحوم کا بیان ہے کہ اگر حقیقی معنوں میں نہ

کو غالبیت کے رنگ میں دیکھنا چاہیں تو لوگ اس شرح کو پڑھیں اور سمجھیں۔ بخوف طوالت ایک بیت کی شرح درج ذیل ہے۔

پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا۔

زخم پر نمک چھڑکنا: جب کسی زخم پر نمک چھڑکتے ہیں تو زخم پھٹ جاتا ہے اور ٹیسیں دونی ہو جاتی ہے، اس لئے زخم پر نمک چھڑکنا ایسے محل پر بولتے ہیں جب کوئی شخص دکھ اور ایذا میں ایذا دیتا ہو اور صدمے پہ صدمے پہنچاتا ہو۔

غالب: غیر جھڑکے ہے زخم دل پہ نمک شورِ الفت میں کچھ مزا نہ رہا

"اس سے معلوم ہوا کہ زخم دل پر نمک چھڑکنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ عشق بڑھ گیا اور محبت زیادہ ہو گئی، مقصود یہ ہے کہ درد دونا ہو گیا، صدمے پر صدمہ پہنچایا گیا اور ٹیسیں زیادہ ہو گئیں۔ "آپ" ناصح کی طرف اشارہ کیا ہے۔ عام روزمرہ میں اس لفظ کا استعمال تعظیم کے لئے ہوتا ہے، مگر یہاں تعظیم کے لئے نہیں ہوا۔ مصنف نے استعارہ تہکمیہ سے کام لیا ہے، تعظیم کا لفظ تحقیر کے لئے استعمال کیا ہے اور تشنیع ناصح کے لئے ایک عمدہ صورت نکالی، اور اب دوسری دلیل اس امر پر قائم ہوتی ہے کہ شعر میں درد کی فراوانی بتائی ہے۔ نہ عشق و محبت کی طغیانی اس لئے کہ تشنیع اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جب مقصود یہ ہو کہ نصیحت سے تکلیف اور بڑھ گئی۔ اور اگر یہ مقصود ہو کہ نصیحت سے عشق اور زیادہ ہو گیا تو کسی صورت سے تشنیع صحیح نہیں ہو سکتی کہ ترقی عشق کے لئے جو شخص وسیلہ ہو گیا ہو، عاشقانِ صادق کے پاس لائق تحسین ہے نہ قابل نفرین۔ المعنیٰ خنجر عشق کا وار جب کسی پر چلتا ہے تو گہرا گھاؤ دل میں پڑتا ہے اور عقل کا نشہ نہیں لگا رہتا، کان بہرے ہو جاتے ہیں، اور دوست کی کوئی برائی نہیں سنتے، آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں، اور یار میں کوئی خرابی نہیں دیکھتیں کہ حبک الشیء یعمی و یصم، اس لئے ناصحوں کی نصیحت زہر لگ کر جان کے لئے روگ ہو جاتی ہے، اور دل کے لئے بجوگ۔ خود زخم کی ٹیس دو چند مصیبت ہے کہ الاماں، جب ایسے زخم پر نمک پاشی ہوتی ہے تو درد دونا ہو جاتا ہے اور نئی آفت ٹوٹ پڑتی ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب ناصح نے نصیحت کا شور مچایا تو نصیحت نے وہی تاثیر دکھائی جو زخم پر نمک چھڑکنے سے پیدا ہوتی ہے۔ نصیحت کیا تھی گویا ایک طرح کا نمک تھا جو ناصح نے زخم پہ چھڑکا، اس لئے زخم دل اور پھٹ گیا، بھرنے کے بدلے ہرا ہو گیا، ٹیسیں اور بڑھ گئیں، نئی آفت کا سامنا ہو گیا اور مصیبت پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی۔ پندِ ناصح نے ہم کو تو یہ نقصان پہنچایا۔ اب اگر خود ناصح کو اس نقصان سے کچھ فائدہ پہنچتا تو بھی ایک بات تھی مگر اسے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا، اس لئے آپ سے یعنی حضرت ناصح سے کوئی پوچھے کہ تم نے اپنی نصیحت سے ہم کو ایذا دے کر کیا مزہ پایا اور کون سا فائدہ اٹھایا۔ جب دردمند عشق کو نصیحت سے نقصان پہنچتا ہے، اور ناصح کے لئے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا تو پھر ترک عشق کی امید بے حاصل ہے، اور حضرت ناصح کی بکواس لاطائل۔ یہ ہیں معنی اس شعر کے اور "وثوق صراحت" (شرح عبدالعلی والہ) کے ضمیمے میں لکھا ہے کہ اس شعر کا حاصل یہ ہے کہ ناصحوں کی نصیحت سے بجائے عشق کم ہونے کے عوض زیادہ ہو جاتی ہے، مرزا نے اسی مضمون کو تمثیل میں بیان کیا ہے۔ عاشقوں کی عادت ہے کہ نصیحت سننے سے نفرت ظاہر کرتے ہیں اور فاضل طباطبائی لکھتے ہیں، مصنف نے مزہ کو قافیہ کیا اور ہائے مختفی کو الف سے بدلا، اردو کہنے والے اس طرح کے

قافیے کو جائز سمجھتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ قافیے میں حروفِ ملفوظ کا اعتبار ہے جب یہ (ہ) ملفوظ نہیں بلکہ زبر کے اشباع سے الف پیدا ہوتا ہے تو پھر نون ملفوظ ہے، ایسے حرف روی قرار دینے سے اسی طرح سے فوراً اور دشمن کا قافیہ ہو جاتا ہے۔ گو رسم الخط اس کے خلاف ہے لیکن فارسی والے مزہ اور دوا کا قافیہ نہیں کرتے، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ ہائے مختفی اور کبھی حرف روی (حرف اصلی جس پر قافیہ کا مدار ہوتا ہے) ہونے کے قابل نہیں جانتے۔" (رسالہ مکتبہ جلد نمبر ۱۹۳۹ء حیدرآباد)

بعض اخبار دہلی :-

قرآن السعدین جلد ۳ جولائی نومبر ۱۸۴۷ء دہلی۔ ہفتہ وار میں غالب کا ایک ترکیب بند شائع ہوا تھا جس کے آخری بند کا ایک شعر یہ ہے

دل دو ستے کہ مرا بود فرو ماند ز کار
شب و روزے کہ مرا بود بسر آمد گوئی
بہرہٴ اہلِ جہاں چوں ز جہاں درد و غمست
بہرہٴ من ز جہاں بیشتر آمد گوئی

یہ پورا ترکیب بند ایک کتاب یوسف ہندی قید فرنگ میں۔ مؤلفہ محسن بن ستیر حیدرآبادی میں شائع ہوا ہے۔

دہلی اردو اخبار مورخہ ۲ جنوری تا دسمبر ۱۸۵۲ء جلد ۱۳ میں لکھا ہے کہ ۲ اگست ۱۸۵۲ء ایک مشاعرہ مرزا نور الدین بہادر شاہی نبیرہ ظل سبحانی نے کیا تھا۔ اس مشاعرہ میں غالب نے اپنی مشہور غزل پڑھی تھی جس کا مطلع یہ ہے

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں۔

(فہرست ادارہ ادبیات جلد ۵ حیدرآباد)

بیدل اور شعراء فارسی دکن :-

ہندوستان کے شعراء فارسی نے مشہور شعراء فارسی مثلاً ظہوری نظیری، امیر خسرو، امیر حسن سجزی، مرزا جلال اسیر، غنی کشمیری، مرزا صائب، ناصر علی سرہندی اور بیدل وغیرہ کی تتبع کی ہے اس لئے کہ اس زمانہ میں نصاب تعلیم ہی میں ان شعراء کا کلام داخل تھا۔ مرزا غالب تو کیا اس دور کے شعراء نے کم و بیش اتباع کیا مگر بارہویں صدی ہجری میں مرزا بیدل کے کلام کی بڑی شہرت اور مقبولیت رہی۔ کیونکہ بیدل کا کلام زیادہ تر فلسفہ، تصوف، نفسیات پر مشتمل تھا اور اسی طرز کی وجہ سے دقت پسندی اور پیچیدہ مضامین کا شاعری میں بڑا اثر تھا۔ صوفی مشرب شعراء جیسے مغربی، عراقی، احمد جام، مولانا روم، شمس تبریز کا کلام وحدۃ الوجود اور حقائق توحید پر مشتمل ہے، اور ایسے شعراء کی بھی ہندوستان میں کمی نہیں رہی۔ مرزا عبدالقادر بیدل، عظیم آبادی ثم دہلوی وفات ۱۱۳۳ھ کے کلام دلپذیر کی تمام ہندوستان میں شہرت تھی۔ دکن اور جنوبی ہند کے شعراء بھی بیدل کے کلام سے متاثر تھے۔

دکن میں مرزا بیدل کے شاگرد رشید نظام الملک آصفجاہ اول متوفی ۱۱۶۱ھ جو آصف اور شاکر تخلص کرتے تھے۔ جن کے ضخیم دو دواوین حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکے ہیں۔ اور تذکرہ شعراء دکن میں ان کا کافی انتخاب موجود ہے۔ فرماتے ہیں۔

گذشت آں دم رموز حق شنود ۔ کہ بغرباد بینوا برسی
می کند سیر لوح و کرسی و عرش ۔ آنکہ گردید خاک پائے ہمہ

بطرح بیدل۔

اے آنکہ تو مظہر خدائی ۔ کہ دور روی بچشم ما ئی
اے موئے میان رو کجائی ۔ ہوس نہ، مگر صدائی

نیز جرأت میر محمد ہاشم المخاطب بہ موسوی خاں اورنگ آبادی ۱۱۸۸ھ تلمذ رنے دلی میں بیدل اور عبدالجلیل بلگرامی سے استفادہ کیا تھا جن کا ایک شعر یہ ہے

قرب شہاں چو کہ تنک مایہ می شود ۔ با آفتاب ماہ چو ہمسایہ می شود

اعتیاز میر محسن مدراسی وفات ۱۱۹۰ھ انشاء پردازی اور شاعری

میں بیدل کی طرزِ خاص کا معتقد تھا جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

گرد را دماغ آلان را سواد دیدہ شد
تا خرابِ نازِ چشمِ سرمہ سا گردیدہ ام

عاقل خاں، رازی، امرائے عالمگیری سے تھا صوفی مشرب اور زندہ دل تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بیدل نے رازی (مرید حضرت راز الٰہی برہانپوری) سے تصوف کے نکات حاصل کئے۔ رازی، بیدل کے کلام کی تعریف کرتے تو بیدل تسلیم بجا لاتا تھا۔ بیدل نے رازی کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا تھا جس کے ہر مصرعہ سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ مثلاً ؎

مجمعِ استاد بے شیرازہ ماند ۔ حیدری تمیاہ عاقل خاں نماند
۱۱۰۸ھ

رازی ؎ تا زلفِ ترا دیدم در دستِ صبا پیچاں
می پیچم دمی کاہم چوں رشتہ بتاب اندر

لالہ سکھراج سبقت۔ لکھنوی اسد خاں وزیر عالمگیر کا ملازم تھا بیدل کے منظورِ نظر شاگرد تھے۔ دس ہزار ابیات کا دیوان چھوڑا۔ دوسرے مشہور شعرائے فارسی کے علاوہ بیدل اور غالب کے رنگ میں کہنے والوں میں حیدرآباد میں مولانا منشی امداد علی تھانوی بھی تھے۔

بیدل ؎ شورِ جنوں در قفا باہمہ ہنگامہ برآ
یک دو نفس نالہ شو از دلِ دیوانہ برآ
آنکہ ایں پردہ کشود اینجا نیست
تو نگاہ دیدۂ بسمل مژہ داکن دبہ کفن درآ

علوی ؎ مشتاق ٹھوکروں کی ہے اک خلق زیرِ خاک
لے یار سوئے گورِ غریباں کبھی تو آ۔

زین العابدین خاں، دیوان تخلص داماد علی دوست خاں نواب عماس (۱۱۴۶ھ) فارسی کے جید شاعر اور صاحب تصنیف تھے ان کا ایک رسالہ الموسوم بہ "حل مستزاد مرزا بیدل" انڈیا آفس لندن میں ہے (فہرست مرتبہ ایتھے)۔ مضمون راقم اورنٹیل کالج میگزین لاہور)

حشمت محتشم علی خاں، متوفی ۱۱۶۳ھ۔ از امرائے عالمگیری، بیدل، اور آناد بلگرامی کے ہم جلیس تھے۔

؎ آئینہ بیزم دلکشائے تو رسد لے جاں نگاہ
ہم شانہ بزلف مشکسائے تو برسد ما را چہ گناہ

حیا، لالہ شیو رام داس اکبرآبادی (ف ۱۱۴۴ھ) ملازم اسد خاں امرائے عالمگیری، تلمیذ بیدل، ایک نثر بھی بطرز چہار عنصر الموسوم بہ گلگشت بہار ارم کا ذکر آتا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے۔ ؎

از فیضِ بہار ست چمن پیکرِ طاؤس
بلبل عجبے نیست برآرد پرِ طاؤس

(نتائج الافکار قدرت گوپاموی)

مولانا رفیع الدین قندھاری (دکن) وفات ۱۲۴۱ھ معاصر آزاد بلگرامی و تلمیذ مولانا قمر الدین اورنگ آبادی نے اپنے تذکرہ شعراء الموسوم بہ تذکرہ نوبہار تالیف (۱۲۱۶ھ) میں مرزا بیدل کا ذکر کیا ہے، اور بحر کامل و بحر متدارک میں جسکو رکض الخیل اور صوت الناقوس بھی کہتے ہیں جس کی بنا رسولہ ارکان پر ہے۔ حسب ذیل شعر نقل کیا ہے۔ ؎

چہ بود سر جملہ غلط سبقاں دو علم و عمل لبِ نانہ زدن
ز غرور دلائل بخبری ہمہ تیرِ خطا بہ نشانہ زدن

ایک بزرگ شاہ اعظم بیجاپوری معاصر قربی دہلوی متوفی ۱۱۸۲ھ نے اسی بحر میں ایک خاص صنعت برمبنی بطور مخمس کہا تھا جس کا ایک بند یہ ہے ؎

رنگ رانی ہگ گلفام ہوئی ۔ مدماتی سے آشام ہوئی
گل نرگس نرگیں جام ہوئی ۔ من جیون کوں آرام ہوئی
یک درس میں کئے کام ہوئے

اس موہت کی بلہاری ہوں جس دیکھت سدھ بدھ ہاری ہوں
ان کی طرز میں مولانا قربی موصوف نے بھی اس طرح میں بہ منیم کہا ہے

غالب سے قبل شعرائے مدراس کا طرز اور الفاظ سازی

عمدۃ الامرا نواب آرکاٹ متخلص بہ ممتاز (مدراس) ولادت ۱۱۷۱ھ جلوس ۱۲۱۰/۱۲۱۶ھ۔ ولد نواب محمد علی والاجاہ گوپاموی۔ اردو کے اچھے شاعر تھے معاصرین میں فضل علی ممتاز تلمیذ سودا۔ اور مرزا علی بخت اظفری تلمیذ میر جو مدراس آگئے تھے۔

بہ طرز مصحفی غالب سے قبل ؎

صحبت نہ سرکشوں سے میں اس باغ میں رکھوں
ہوں تو میں گل ولے گل شاخ خمیدہ ہوں
مانند جام و شیشہ میں اس میکدے کے بیچ
ممتاز گر نہوں ہوں گے آبدیدہ ہوں

؎ اسلام کے لئے آباد کیا خانہ کعبہ۔ لے شوخ بت خانہ بشکلہ ادہر آ۔

فارسی ترکیبیں غالب سے نصف صدی پہلے ؎

تجویز ہمارے گریہ کو ظالم پرجوش ہے۔ ہر قطرہ اپنے اشک کا دریا بدوش ہے
لے مرغ دل نہ خال کے دانے پر کر نگاہ۔ زلفوں سے یار دام محبت بدوش ہے
بلبل ہے نغمہ سنج گل غنچہ خوش دماغ۔ گلشن میں کیا بہار کا جوش و خروش ہے۔
ہے چشم آئینہ کا ہنر عیب دیکھنا۔ ممتاز اپنی آنکھ بہت عیب پوش ہے
آنکھوں کو تری دیکھ کے پُر کیفیت مدام۔ ساغر میں مے نہیں عرق انفعال ہے

علامہ باقر آگاہ مدراسی متوفی ۱۲۲۰ھ۔ غالب سے قبل ؎

ہماری ہمرہی سے لگا پہلو تہی کرنے
غلط سمجھے تھے ہم اوس کو یقیں مہرباں اپنا
سمایا دل میں میرے یار و میں اوس میں سمایا ہوں
پھر اس کو ڈھونڈتا ہوں کیا کہوں نادیباں اپنا

شاہ کمال بخاری معروفات ۱۲۴۴ھ) (گنٹور مدراس)

؎ رشک گلشن ہے چمن تجھ حسن کی زیبندگی
غیرت گل ہے تمہارے غنچہ لب کی خندگی
شرم سے گلتا ہے ہر شب ماہ لے خورشید رو
دیکھ کر تجھ دستہ روز افروز کی رخشندگی
یک بیابان صید ہوں وحشی دلاں لے من ہرن
زلف سے اپنے کرے تو جب کمند افگندگی

بہ طرز قاآنی۔ ؎

مژہ یہ تیری، نگہ یہ تیری، ضمیر تیرا، نظیر تیرا
ہے تیر پرّاں، ہے تیغ براں، ہے گنج مخفی، جہاں میں عنقا

؎ ہے جمال خوبرویوں کا نہایت یہ کمال
جو دکھا دیں لحظہ بہ لحظہ اپنا کچھ اور طور

بقول غالب ؎۔ آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز

کمال ؎ حسن تیرا ہوا دبدبے فزوں
طرفہ ضعف ترے ادب میں ہے۔

یہ شعر تو غالب سے بھی اچھا ہے۔ (رسالہ اردو ۱۹۵۲ء مضمون راقم)

تمکین کاظمی مرحوم نے "ہندوستانی ادب اور فلسفہ و نفسیات" کے عنوان ایک مضمون مرزا سودا کی ایک نایاب مثنوی کے متعلق رسالہ ہندوستانی ادب جنوری ۱۹۳۵ء میں شائع کیا تھا اور یہ ظاہر کیا تھا کہ سودا ہی وہ پہلے ہندوستانی کے شاعر ہیں جنہوں نے ہندوستانی زبان میں فلسفہ، ہیئت اور نفسیات پر خامہ فرسائی کی ہے ۱۷۶۶ء میں مرزا سودا نے یہ مثنوی لکھی۔ مثلاً ؎

روشنی ہے سبب حس بصر۔ چشم بینا میں ہے یہ تار نظر
دوسری صوت و صدا کی حرکت۔ جو ہے در اصل ہوا کی حرکت

مگر اس سے قبل مرزا غالب کے دیوان میں بیسیوں اشعار ایسے ملتے ہیں جو نفسیات اور فلسفہ پر مشتمل ہیں۔ مثلاً ؎

غالب ؎ دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

اور مرزا غالب سے بھی نصف صدی قبل حضرت شاہ کمال بخاری کا دیوان

(مدراس) (وفات ۱۸۰۹ء) نے اس قسم کی غزلیں کہی ہیں۔ فرماتے ہیں

؎ وصف ہے ہر حس بشر کی ذات کا و مُدرک اپنی کل محسوسات کا
سمع جوں ادراک مسموعات ہے، یافت یعنی گوناگوں اصوات کا
معنی حسن بصر ہے دیدہ ور مدرس ہے الوان اور ہیئات کا
حس شم کا صدق ہے خوش شام، فہم ہے اقسام مشموات کا
حسن منظور سے کب ہووے نظر میں تاثیر
قوت ذوق نظر نوبت نظر سے ہو اگر
لمس مختلط ہے بہ کلیت خود از گلشن
خبر خبر، عبر اثر و جز نظر و ذوق نظر

غرض شاہ کمال نے کرڑپہ مدراس جیسے دو صدر انہ مقام میں اردو کے کایا پلٹ دی، اور اس میں سنجیدہ مضامین داخل کئے جو غالب اور مرزا رسوا سے سالہا سال قبل کی بات ہے۔ (رسالہ ہندوستانی ادب جنوری ۱۹۵۹ء۔ ص ۲۹ (مضمون راقم)

شاہ ولی الحال قادری کرنولی متوفی (۱۲۱۲ھ) غالب کا سن ولادت بھی ۱۲۱۲ھ ہے

خدا کو خدا سوں جو ہم دیکھتے ہیں / دو عالم کو زیر قدم دیکھتے ہیں
وہی لشکر نفس کے سو ہیں گے قاتل / جو تیغ نگاہ کو علم دیکھتے ہیں
جو کوئی ذات کا ہم وصفت کے ہیں محرم / وہی غیر کا سر قلم دیکھتے ہیں

غالب نے اسی بحر و طرح میں غزل کہی تھی ؎
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں۔

(رسالہ اردو ۱۹۵۹ء)

سید محمد شاہ میر کرڑپوی (مدراس) وفات ۱۱۸۶ھ

ذات کو ہر شے کے تئیں ہے انقلاب / اور صفت کو انفعال و انسلاب
ذات کو ہر دم تلبس ہے ولیک / صورت ہر وصف سے ہے کامیاب
اور صفت کو صورت افعال سے / ہے تلبس ہر زماں، بے ارتیاب
ذات کو ہر شے کے یوں ہے قطع و کش / اسکو کہتے ہیں تجدد ذو لباب
گر نہ یوں ہوئے ذات کیونکر ہو بدیع / ہے بدعت کا یہ سلا حساب
نافی غیر مثبت حق ہے۔ بے گماں لا الٰہ الا ہو

(نوائے ادب بمبئی جولائی ۱۹۵۳ء)

سلطان محی الدین، سالک کرڑپوی ثم حیدرآبادی (متوفی (دیوان سالک ۱۲۸۵ھ) معاصر غالب۔

جانتے ہیں رنگ سب پھر رنگ تم لاوینگے کیا
(لائنگے)
منہ دکھائے بارہا پھر ہم سے شرمائیں گے کیا
تم وہی خلوت میں تھے جلوت میں بھی ہیں تو وہی۔
فرقت و وصلت میں وہ صورت نئی لادیں گے کیا

جس کو نہیں کشود ہے، قلب کی سیر پاوے کیوں
مرتبۂ مثال کو ہاتھ میں اپنے لاوے کیوں
تن کو سمجھ مثال تو، اور نہ کر خیال تو۔
خطروں کو سب نکال تو ورنہ یہ حال آئے کیوں

(نوائے ادب اپریل ۱۹۶۰ء)

اختر، نواب عبداللطیف خاں مدراسی۔ معاصر نظام حیدرآباد آصف جاہ ششم۔

طرح غالب۔ ؎

کیسے ہو تم، دم آخر یہ سوال اچھا ہے
جانئے جائیے بیمار کا حال اچھا ہے
پائے نازک سے تو ملتا ہے میرے دل کو کوئی
ہائے مجھ سے اسی ناشاد کا حال اچھا ہے
مرغ دل ہوتے ہیں لاکھوں کے اسیر گیسو
میرے صیاد کے کندھے پہ یہ جال اچھا ہے

(تذکرہ شعرائے مدراس مرتبہ راقم قلمی)

خان عالم خاں، فاسق مدراسی متوفی ۱۲۷۱ھ معاصر غالب ؎

زمانے کے ہاتھوں جو غم دیکھتے ہیں ۔ تو آکر تمھارے قدم دیکھتے ہیں
ڈبوئے کے دل کو مرے بحرِ غم میں ۔ کہے ہے کہ اب اس کا دم دیکھتے ہیں
ترے سلام زلف اور ہیم دہن سے، الم کے مضارع یہ لم دیکھتے ہیں

(رسالہ ہندوستانی ادب جولائی ۱۹۶۲ء)

پرتو، رؤف احمد خاں (مدراسی) سنہ ۱۲۷۸ھ / ۱۳۲۷ھ جو

معاصر داغ دہلوی، مدراس کے جید شاعر تھے۔ دس ہزار اشعار کا کلیات موجود ہے اور طبع ہو چکا ہے، ڈرامے اور مثنویاں بھی لکھی ہیں (اردو ادب شمارہ ۵ ۱۹۶۳ء) مضمون راقم۔ پرتو ناسخ کے پیرو تھے۔

سوداؔ، اسیرؔ، آتشؔ و غالبؔ تو ہیں پرتوؔ
شائق نہیں ناسخ کے سوا اور کسی کا

غالب کی طرح میں بھی بعض غزلیں کہی ہیں۔ غالب ؎

"ہم بھی کر بیٹھیں تھے غالب پیش دستی ایک دن۔"

ہاتھ میرے کر رہیں گے پیش دستی ایک دن
دونوں آنکھوں میں لیے گی دل کی لیتی ہچکیاں

سر اٹھایا جس نے وہ پامال ہوتا ہے ضرور
ہر بلندی کے لئے لازم ہے پستی ایک دن

حق پرستی سے ہو کر طوا دل تمہارا شیخ جی
بزم ہستی میں کریں جب مے پرستی ایکدن

؎ روؤں فراق یار میں کب تک جگر کہیں،
غالب ؎ جی میں ہے پھونک ڈالوں دل نوحہ گر کو میں

پرتو ؎ یہاں فراق میں بھی ہے خیال خانۂ دل
وہ اپنی سیر میں ہم ان کے گھر کو دیکھتے ہیں

غالب ؎ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں ۔

جب سے وہ آنکھیں میری آنکھوں سے پنہاں ہو گئیں
نقش بکر صفو دل پر نمایاں ہو گئیں ۔

تو وہ رشک لعبت چیں ہے کہ تیرے حسن کو
دیکھتے ہی پتلیاں آنکھوں کی قرباں ہو گئیں

غالب ؎ تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

بر طرح غالب ؎

ہائے غضب کی بات ہے آنکھ نہ تو دکھا کر یوں
(از روئے نگاہِ لطف، یار کبھی ملا کر یوں

پرسش تیغ کی جو بات تھی نظر ہی لا نہیں
اپنے دہاں زخم نے کھل کے یہ کہہ دیا کہ یوں

معرکہ ہائے حسن و عشق تھا یہ چشم بیقرار
آج دکھا چکی مجھے اس کی ہر اک ادا کر یوں

شبہ ہوا جو کبک کو حسن خرام ناز میں
چل کے تمہاری چال نے سر کے بتا دیا کہ یوں

پر کوئے جلتی ہے شمع دیکھ کے اس سمن کے پانوں
جل کر ہے ہیں آگ بولا لگن کے پانوں

مغموم، محمد اسمٰعیل، مدراسی (دکنی میمن) (سنہ ۱۲۷۵ھ / ۱۳۴۸ھ)

(اردو ادب شمارہ ۱ ۱۹۶۲ء)

طرز غالب ؎

شعلہ برق ہے حسن اس بت لاثانی کا
کھینچے تصویر تو جل جائے قلم مانی کا۔

(کلیات مغموم مطبوعہ)

تسنیم، محی الدین حسین خاں، قرابت دار نواب کرناٹک

داغ دہلوی سے خط و کتابت تھی، تلمیذ کوثر خیرآبادی۔

فصاحت لکھنوی ــ

طرح غالب سے بعض اچھی غزلیں کہی ہیں۔ ــ

تیر کے پر جب کہ لے ناوک فگن دیں گے ہوا
زخم سوزان قلب کے ٹھنڈے نہ ہو جائیں گے کیا
دور میں چرخ دنی کے کب ہے نعمت کی امید
غم نہ کھائیں گے اگر اب ہم تو پھر کھائیں گے کیا
ہمسر تھے رخ سے پھول کیا دیکھے ان کو کیوں
گلشن میں بلبلوں کا بھلا کیا قصور تھا۔

بہار۔ منشی سید علی قادر مدراسی تلمیذ شریف مدراسی و امیر مینائی ــ

طرح غالب ــ آتی ہے بوئے محبت آج دود شمع سے

جل بجھا شاید کوئی پروانہ اس محفل میں ہے
یہ تری نیچی نگاہیں کہہ رہی ہیں صاف صاف
حد سے بڑھ کر وصل کا ارماں ترے دل میں ہے

(شعرائے مدراس مرتبہ راقم طبع غیر مطبوعہ)

شاہ مقبل میسوری (سید فقیر محی الدین) متوفی (۱۳۴۲ھ) بعمر ۸۶ سال

طرح غالب ــ نہ بگڑتی اپنی قسمت تو بن آتے کام سارے

کوئی اپنا یار ہوتا کوئی دستیار ہوتا
کوئی شعلہ دل نہ ہوتا نہ کوئی شرار ہوتا
یہ طپش اسے نہ ہوتی نہ یہ بیقرار ہوتا۔

چاک ہے پیراہن عریانی تن کا مرے
زخم دامن دار قاتل تیری تیغ تیز کا
آہ سوزاں بان ہے انلے انار آتشیں
ایک اک داغ دل اپنا پھول ہے گلریز کا
خندہ اس کا مثل مینا بادہ خواروں کو رلائے
گر بنے ساغر ہماری خاک درد آمیز کا

مہندی سے لال دیکھ کے اس فتنہ گر کے پاؤں
کہتے ہیں سیم ساق یہ ہیں سرخ زر کے پاؤں
آئینہ زانو ہیں تو یہ رانیں ہیں سیم کی
ہیرے کی پنڈلیاں ہیں تری اور زر کے پاؤں

(نوائے ادب جنوری و اپریل ۱۹۵۵ء)

بر طرح غالب، علوی، تھانوی ثم حیدر آبادی وفات ۱۳۱۹ھ)

علوی ــ ظہور میں بطون و بطون عین ظہور
یہ اعتبار فقط ہیں سب این و آں کے لئے

ــ اک عمر سے جگر کو جو کچھ التہاب تھا
یہ سب فتور شورش چشم پر آب تھا
اک عمر دیکھا ہم نے تماشائے نقش عکس
دل آفتاب تھا تو جگر ماہتاب تھا
دل مبتلائے فکر عذاب و ثواب تھا
یہ گیسوئے خیال کا سب پیچ و تاب تھا

ــ دم مارتے کیا قصہ شبیر کے آگے
تدبیر نہیں چلتی ہے تقدیر کے آگے
ہیں ہم چلے ہاں یار اخدنگ نگہ شوخ
میں خاک کا تودہ ہوں تیرے تیر کے آگے
رکھا ہے قلم ہاتھ سے نقاش ازل نے
اے حسن کی پتلی تری تصویر کے آگے

ــ ہر قطرۂ سرشک میں ہے عکس روئے یار
پتلی بھی میری آنکھ کی آئینہ ساز ہے

ــ جو ہم میں کچھ نہیں، اور ہم نہیں تو سب کچھ ہے
بس ایک نکتہ ہے کافی یہ نکتہ داں کے لئے

ــ وہ غمزۂ نگہ چشم نیم وا کہوں، ہے نیچے مرے لیک قلب نیماں کے لئے

سمجھ کے ہاتھ بڑھا سوئے خوان عشق لئے دل کے گھلا دھرا ہے یہاں زہر میہماں کیلئے

علوی — نہ ہوئی پھر کسی عاشق پہ جفا میرے بعد

بن گئے دست ستم دست دعا میرے بعد

(دواوین علوی قلمی ملکہ ریاض)

اخگر، علامہ مرزا قاسم علی بیگ (سنہ ۱۲۹۰/۱۳۷۵ھ)

حیدرآباد کے بڑے فاضل تھے فارسی و اردو کے جید شاعر تھے

ذکا مدراسی اور عاقل دہلوی تلامذۂ غالب کے معاصر تھے، ذکا کے بعض لطائف و مزاحیہ طنزیہ اشعار مجھے سناتے تھے، فرمایا کہ ذکا نے ایک طوائف خورشید جان کی ہجو کہی تھی۔

ذکا — حالۃ الحطب لو دآن خانہ سوز خلق

فی جیدہا چو لشود حبل مّسد

عبدالرزاق معتمد مالگزاری کی جو پست قد تھے، ذکا سے بڑی نوک جھونک رہتی تھی، سخت ہجو کہی —

اے معتمد مالگزاری چہ کس ہستی۔ خفاش سیہ روزی و خورشید پرستی

بابا، بہ بلنداں نتواں بود معارض۔ دستت نرسد جز بسر خایہ کی پستی

ہر بادہ فروشی بدرت نان ترہ دید۔ در دل لک تو دلاستی و این ہمہ مستی

فرمایا کہ عاقل دہلوی تلمیذ غالب تو اپنے کو شعراء کا پیغمبر کہا کرتے تھے۔

عاقل میں پیمبر ہوں گروہ شعراء کا۔

اپنی یہ غزل اکبرآباد کے ایک مشاعرہ میں بھیجی تھی (مطبع تحفۂ سخن آگرہ سنہ ۱۲۷۰ھ)

ان کی استادانہ بندش پر اکثر شعراء خیال کرتے تھے کہ یہ تو کلام استاد معلوم ہوتا ہے۔ عاقل نے اس پر ایک رباعی کہی تھی جو یہ ہے۔ —

عاقل پہ ہے خاص فیض عام استاد۔ شاگرد کے نام سے ہے نام استاد

اصلاح فیض سے سخن عاقل کا ۔ نادان سمجھتے ہیں کلام استاد

(تزک محبوبیہ حصہ شعراء)

غرض اخگر نے بھی غالب کے رنگ میں بعض غزلیں کہی ہیں۔ ایک غزل یہ ہے

غالب — کہتے ہیں نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا

دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا

اخگر — کوئی ہم سے یہ پوچھے بےخودی میں کیا پایا

زیست کی ملی لذت، وصل کا مزہ پایا

دل کی آرزو دل میں رہ گئی ہوس بنکر

کھو کے اس کو پہلو سے، خوب مدعا پایا

ہم نہ کہتے تھے دل سے، ہے جفا شعار اوس کا

پھر کوئی شکایت کیا جس نے جو کیا پایا۔

کیا ہوا کہ واعظ کو آج صحن مسجد میں ۔

ہوش اڑا ہوا دیکھا، دل گیا ہوا پایا ۔

عقل کا ہے کیا امکان منزل تجسس میں

اوس کو جسقدر ڈھونڈا کچھ نہ کسیقدر پایا

ظلم کی گئی شوخی، رحم آگیا اوس کو

در پہ اپنے اخگر کو یوں جو پھر پڑا پایا۔

(اردو ادب علیگڑھ شمارہ ۲ سنہ ۱۹۶۷ء)

حبیب اللہ ذکا مدراسی ثم حیدرآبادی (سنہ ۱۲۴۴/۱۲۹۱ھ)

غالب کے مشہور شاگرد تھے۔ ان کی تصنیف خاش و خماش پر غالب نے تقریظ لکھی تھی، ہجوگوئی میں بھی ان کو بڑا ملکہ تھا۔ جس کا ذکر ہم علامہ اخگر حیدرآبادی کے ضمن میں کرچکے ہیں۔

ذکا پہلے حضرت فیض کے شاگرد تھے چنانچہ کہتے ہیں۔

— فیض کو جس نے نہیں مانا ذکا کے بات تو یہ ہے وہ سخنور نہیں

آخر جناب فیض کا شاگرد ہوا ذکا! آتش کو اپنی گرمیٔ غزل سے جلاؤں میں

ان کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ جناب فیض نے بامداد ذکا اور قیام حیدرآباد تحقیق محاورات زبان اردو کی ایک کتاب دستور الشعراء الموسوم بہ جواہر الامثال، اساتذہ کے دواوین پیش نظر رکھکر معہ اسناد و نظائر کے ساتھ ۱۲۷

میں تالیف کی تھی۔ نصیر الدین نقش تلمیذ میر شمس الدین فیض کی ذکا کے متعلق یہ رائے ہے۔

"طوطی بلند پرواز از چمن معانی و بلبل نغمہ پرداز از گلشن شیوا بیانی سالہاست کہ پا، بدایرۂ شاعری نہادہ۔ دراوایل حال بطرز سخن سخنان مشہور و فصیح سخن می گفت دراواخر سند از مطبوع اسد اللہ خاں غالب دہلوی پسند کردہ، دقت آفرینی ہا کرد، اشعار سابق را حذف و ساقط کرد قدر قلیل ازاں در سفینۂ ابیات انتخاب زدہ و درزبان پارسی استفادہ طرز ابداع، خان موصوف دستگاہ بلند بہم رسانیدہ، غزلش چوں غزل نظیری بے نظیر، قصیدہ اش چوں قصیدہ عرفی دلپذیر، مضامین شعری را کما ینبغی می فہمید، و بجمیع نکات ولطائف بادی النظر پے میبرد بالجملہ بحثہ سنجی و نغز گفتارے بود کہ مثلش کمتر مری شد و بہ کلام فارسی علام امام شہید رسالۂ اعتراضات نوشتہ نزد خان موصوف فرستاد، بسیار پسند افتاد در ۱۲۹۱ھ بجوار رحمت پیوست ایں اشعار یادگار اوست

چشم گریاں سے تماشا دیکھا۔ کل کا دشت آج کا دریا دیکھا

کس پر پیرزادے رو کش مہ کامل نہوا، نہوا کہ تیرے چہرہ کے مقابل نہ ہوا

(تذکرہ ماہ و سال الاذکار، قلمی، رسالہ اردو جنوری ۱۹۵۸ء)

بیکل سہارنپوری ۱۲۵۹ھ ثم حیدرآبادی، تلمیذ غالب ؎

تیغ بھی جان لیتی میری ہی کہ رک رک کے چلی۔

تیر بھی میرا مقدر تھا کہ سیدھا نہ ہوا

عاقل دہلوی شاگرد غالب و مرزا قادر بخش صابر وارد حیدرآباد دکن اکثر امرا اور اعزہ شاگرد تھے۔ دو ایک شعر یہ ہیں ؎

اک ہاتھ میں تیغ ایک میں دامن ہے قبا کا

آنا کوئی دیکھے ستم ہوش ربا کا

آندھی میں رکھا کاغذ تصویر جلا کر

اس شکل سے ظالم نے اڑایا میرا خاکا

عرشی فضل رب تاجپوری، کلام فارسی فردوسی و انوری، خاقانی کا مقابلہ کرتا تھا۔ کلام نہایت ادق تھا) غالب کے معاصر تھے

خیمہ چوں در ہوا موکب ابر بہار شد زلف بنفشہ کشاد سلسلۂ مشکبار

۔ آشفتہ (جھلکے چند) تلمیذ عاقل، دہلوی۔ حافظ عبدالرزاق، زہد حیدرآبادی تلمیذ عاقل۔ شوق، غلام محمد حیدرآبادی تلمیذ عاقل دہلوی ؎

طرح غالب سے بدر کامل تو ہوا عارض تاباں نہ ہوا۔

ماہ نو گھٹ کے ہوا بڑھ کے جاناں نہ ہوا

برتر، نادر علی شاگرد رابط دہلوی تلمیذ غالب ؎

تصور رشک کا ہے اس دل بیتاب و بدظن میں

مرے پہلو میں وہ ہیں اور میں ہوں بزم دشمن میں

احمد خاں، شیفتہ اکبرآبادی ثم حیدرآبادی تلمیذ امیر اکبرآبادی احمد خاں شیفتہ، غالب کے معاصر تھے، مرزا طہر، مرزا ماہ، شیو نرائن مرزا آفتہ بھی ان کے معاصرین میں شامل ہیں۔ غدر سے قبل حیدرآباد دکن آگئے تھے ان کے اعزہ میں مرزا رضا بیگ، مرزا خرم بیگ، اور مرزا خنجر بیگ غالب کے والد ماجد عبداللہ بیگ خاں و نصر اللہ بیگ خاں جو فوج کے صوبیدار میجر تھے۔ ان کے معاصر تھے، مرزا کے والد ماجد راجہ الور کے پاس ملازم تھے تو مرزا خرم بیگ راجہ کوٹہ بوندی کی فوج کے صوبیدار فوج تھے بڑے بہادر اور جری سپہ سالاروں میں گزرے ہیں۔

شیفتہ اردو اور فارسی کے جید شاعر، اور سالار جنگ اول وزیر حیدرآباد دکن کے مصاحب اور ان کے لڑکوں کے اتالیق رہے اور حیدرآباد ہی میں تقریباً ۶۰-۶۵ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ زیادہ تر ناسخ و آتش کے پیرو تھے غالب کی طرح میں بعض غزلیں کہی ہیں۔ ؎

بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا۔

شیفتہ ۔ عارض پہ خط ہے خط پہ ہے جلوہ نگاہ کا
دو بجلیوں کی جاں ہے یہ سبزہ گیاہ کا

طرح غالب ۔ بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

شیفتہ نے اس طرح میں دو غزلہ کہا ۔

یوسف بکے، مجنوں ہوا رسوا مرے آگے
کیا کیا نہ ہوا طرفہ تماشا مرے آگے

ہر نالہ مرے سامنے ہے صور کی آواز
ہر گوشہ قیامت کا ہے صحرا میرے آگے

دھو ہاتھ جہاں سے جو طلب ہے دُرِ مقصود
کرتا ہے صدا شورِ یدِ دریا میرے آگے

اے شیفتہ اس فکر پہ استادی کا دعویٰ
مطلع پڑھو ایک اور تو اچھا میرے آگے

مطلق ہے مقید کا تماشا مرے آگے
کیا برق سے کم ہے یدِ بیضا میرے آگے

سرِ شمع کا کٹنا ہے مرے سامنے ایک کھیل
پروانے کا جلنا ہے تماشا میرے آگے

آنکھوں میں میرے اشک ہے رحمت کا تیرے جوش
گوہر لئے موجود ہے دریا میرے آگے

کھلا نہ آج تلک دل کی آرزو کیا ہے
یہ چاہتا ہے کسے اس کی جستجو کیا ہے

شیفتہ ۔ عجیب حال کیا جذبہ محبت نے
خبر نہیں ہے کہ میں کیا ہوں اور تو کیا ہے

غالب ۔ ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
نہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

حبِ حال غالب سے صدرت کو بات روشن ہوئی ہے گوہر سے
گرہ میں نقد نہ ہووے تو آبرو کیا ہے

شیفتہ ۔ بلند ہر بن مو سے ہے خوں کا فوارہ
نہ اتنا جوش پہ جب ہو تو پھر لہو کیا ہے

غالب ۔ رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

(ہندوستانی ادب حیدر آباد ۱۹۲۶ء)

دکن و جنوبی ہند کی تصانیف میں غالب ۔ سالک، مرزا قربان علی بیگ حیدر آبادی تلمیذ غالب محتاج تعارف نہیں، صاحبِ دیوان تھے ۔ طرح غالب ۔

اعتبارِ نگہ ناز ہے کیا کیا اُن کو
قتل کو آتے ہیں، اور ہاتھ میں شمشیر نہیں

سالک نے حیدر آباد کے مشہور صدر مدرس دار العلوم مولوی حاجی غلام زین العابدین کی ایک تصنیف انشاء مفیض (مجموعہ رقعات موسومہ احباب) مطبوعہ ۱۲۹۳ھ پر ایک نصیح و بلیغ تقریظ لکھی تھی۔ جس کا مختصر اقتباس درج ہے ۔

قطعہ وقت است کہ در چشم بصیرت آید
وقت است کہ چوں غنچہ دلم بکشاید
وقت است کہ گلدستہ چشمت آرند
کز دیدن او سواد من افزاید

زہے بہار گلستان سخن کہ اگر بفرض محال ابدی بہشت و فردوسِ خرمی و تازگی خویش را از خویش زائل نماید و کوکب ریزی شے و سموم خیزی بہمن کار سازند باغ ہمہ داغ گردد ..... این چنیں مجموعۂ دلپذیر ایں دشوار چگونہ نباشد کہ حکیمۂ قلم بدیع رقم جناب مولوی حاجی غلام زین العابدین مرحوم و مغفور است، آنکہ اگر با اعتبار عرفی سلطان قلمرو معنی خوانمش دا است

؎ زوزِلہ ربائے نثرِ والا ۔ بوالفضل و ظہوری و جلالا
روفیض پذیرِ علم آفاق ۔ وہب و طبریؔ و ابن اسحاق ..... الخ

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سالک کے تعلقات علماء و شعرائے حیدرآباد سے پُرخلوص تھے۔ اس انشاء کا تاریخی مادّہ "مستحضر" جو سالک نے لکھا ہے۔ انشائے معنی شارے ۱۲۹۳ھ

راجہ اکبر آبادی :- مخمس بر غزل معروف دہلوی

داغِ فرقت سے بغل میں دل نہاں ہے سر بسر
جب سے تم یہاں سے گئے ہو یہ مکاں ہے سر بسر

کہہ نہیں سکتا خموشی سے زباں ہے سر بسر ۔ شکلِ مجلس یہ گھر اپنا مہرباں ہے سر بسر
کچھ نہ مژگاں ہی سے چشمِ ناتواں ہے سر بسر ۔ داغِ فرقت سے بغل میں دل نہاں ہے سر بسر
جب سے تم یہاں سے گئے ہو یہ مکاں ہے سر بسر

گر لکھے اس پر غزل یہ تاب لا سکتا ہے کون ۔ ایک راجہ کی طرح مصرعہ لگا سکتا ہے کون
فی الحقیقت اس طرف کو آنکھ اٹھا سکتا ہے بھلا ۔ اس کا اے معروف اب مضموں چرا سکتا ہے کون
یہ غزل نزدیک فہم شاعراں ہے سر بسر

(دیوان راجہ اکبر آبادی نوادرات کتب خانہ)

معروف، الٰہی بخش دہلوی وفات ۱۲۴۲ھ نے غالب کی غزل پر ایک مخمس کہا تھا۔ غالب کا مطلع یہ ہے۔ ؎

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک ۔ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

(دیوان معروف قلمی سالار جنگ)

بزم اکبر آبادی، مرزا عاشق حسین تلمیذ منیر
بطرح غالب ؎ چاندنی دھوپ رخِ یار کے پرتو سے ہوئی
ماہِ کامل نے صدا دی یہ کمال اچھا ہے
خاکساری نے دکھائی چمنِ خلد کی سیر
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

(دیوان بزم مطبوعہ)

مرزا نظام شاہ لبیب تیموری ۱۳۴۶ھ دہلوی ثم حیدرآبادی

بطرح غالب ؎ درد حاصلِ دل ہے درد کو تو کب پایا۔
درد کا تصور بھی ہم نے دلربا پایا
اضطرار و خود داری، تشنگی و سرشاری
کشمکش میں دل اپنا ہم نے مبتلا پایا

(آتش خنداں مطبوعہ کراچی)

اختر، صادق خاں، بنگالی ثم لکھنوی شاگرد مرزا قتیل۔ مثنوی باد مخالف میں غالب نے قتیل پر چوٹ کی ہے، جس کا جواب اختر نے اس شعر میں دیا ہے ؎

آنکہ طے کرد ایں موافقت را گر چہ شناسد قتیل وواقف را

باوجود اس کے غالب کی طرح میں بھی ایک غزل میری نظر سے گزری تھی رنگ لکھنؤ اور دہلی کے شعرائے معاصرین کا ہے۔ ؎

نہیں پروانہ ساں کچھ حال محتاجِ بیاں اپنا
برنگِ شمع ہے سوزِ نہاں لب پر عیاں اپنا
خرابآبادِ ہستی پُرخطر تھا اس لئے ہم نے
عدم کے دشت میں جا کر اتارا کارواں اپنا

سید مصطفٰے علی بریلوی
بی کام۔ ایل ایل بی

غالب کا ایک پرستار —— عرشؔ بریلوی

اعتماد الدین احمد عرشؔ فاروقی (۱۹۰۵ء - ۲۹) بریلی کے ایک مشہور خاندان کے فرد تھے۔ صرف چوبیس سال کی عمر پائی۔ اس مختصر وقفہ میں دُنیا کے سیکڑوں سرد و گرم دیکھے۔ سخت غربت و افلاس نے اس پھول کو کِھلنے سے پہلے ہی مرجھا دیا۔ رباعیات عرشؔ فاروقی کے دیباچہ میں سیّد الطاف علی بریلوی نے عرشؔ کی علمیت کے بارے میں کہا ہے :-

> چونکہ طلب علم کی تشنہ کامی ہنوز باقی تھی اور فطرۃً پڑھنے لکھنے اور اس میں کمال حاصل کرنے کا حد درجہ ولولہ اور جوش تھا اس لئے مذہبی و تاریخی اور ادبی لٹریچر کا اس قدر مطالعہ کیا کہ بلامبالغہ تا زیست کتابوں کا کیڑا بنے رہے۔ مضمون نگاری اور شعر و سخن سے فطری مناسبت اور قدرتی ذوق تھا۔ علاوہ بریں قُدرت نے بہترین حافظہ اور قابل رشک ذہانت بھی عطا کی تھی۔

شاعرانہ حیثیت اکابر کی نظر میں

عرشؔ فاروقی اتنی تھوڑی عمر میں اللہ کو پیارے ہوگئے کہ صحیح معنوں میں زندگی کا آغاز ہی ہوا تھا اس لئے اُن کی شاعرانہ حیثیت کے تعیّن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم اُن کا کلام جو تین ہزار سے زاید اشعار پر مشتمل سید الطاف علی صاحب کے پاس محفوظ ہے اس سے ہم کو عرشؔ کی موزونیت طبع، جودت اور جدّت کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے نیز بعض اکابر کے عرشؔ اور کلام عرشؔ

کے متعلق ارشادات بھی خاصی روشنی ڈالتے ہیں۔ جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا جا چکا ہے عرشؔ زندگی کی ابتدائی بہاریں گزار رہے تھے کہ موت کے چنگل میں پھنس گئے اس لئے وہ اپنے واسطے کوئی راہ متعین نہیں کر سکے تاہم اُن کے کلام کے مطالعہ کے بعد مجموعی طور پر صاف ظاہر ہوتا کہ وہ غالبؔ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ہم ذیل میں اکابر وقت کی آراء پیش کرنے کے بعد عرشؔ کے کلام کا وہ انتخاب پیش کرتے ہیں جن میں غالبؔ کا رنگ نمایاں ہے۔

مولوی سلیم پانی پتی فرماتے تھے :۔

"خدا اس لڑکے کی عمر دراز کرے یہ اُفق عالم پر آفتاب بنکر چمکے گا"

نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی عرشؔ کی کتاب "رباعیاتِ عرشؔ فاروقی" کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"عرشؔ فاروقی مرحوم کے کلام میں آمد، جودت اور جدّت ہے، سلاست کے ساتھ مضمون آفرینی ہے۔ عام سطح سے پایۂ کلام بہت بلند ہے اتنی کم عمری کے لحاظ سے تعجب آفریں ہے۔ افسوس مرحوم کی جوانی کو نظر لگ گئی،

ابو الکمال مولوی عبد الودود مرحوم ؔدرد بریلوی خلافت کمیٹی کے مشہور لیڈر اور اسلامیہ انٹر کالج بریلی کے بانی تھے، وہ عرشؔ کی ذہانت کے قائل تھے۔ شاگرد جگرؔ حضرت ساجد علی رازؔ مرادآبادی نے کلام عرشؔ کا مسودہ ملاحظہ فرمانے کے بعد حسب ذیل شعر تحریر فرمایا :۔

اُف جواں مرگیاں محبت کی
ہائے کس کس کا سوگوار ہوں میں

۸ نومبر ۱۹۴۰ء

بہ رنگِ غالبؔ

(عرشؔ فاروقی مرحوم)

بندگی کا بھی حق ادا نہ ہوا — خیر گذری کہ میں خدا نہ ہوا
جو ترا بندۂ رضا نہ ہوا — عشق کا اس سے حق ادا نہ ہوا
لطف کی اس سے کیا توقع ہے — جور تک جس سے برملا نہ ہوا
سجدۂ رہگزر تو کرتا ہوں — اور جو اس کا نقشِ پا نہ ہوا
لوگ کرتے ہیں عشق میں سب کچھ — ہم سے کچھ صبر کے سوا نہ ہوا

آنکھ کھولی تو آشیانے میں   میں قفس سے کبھی جدا نہ ہوا
ہائے مجبوریاں محبت کی   مجھ کو احساسِ مدعا نہ ہوا
تھی جو تقدیر میں کشاکشِ غم   کششِ حسن کا بہانہ ہوا
حسن کا اعتبار اور بڑھا   میں جو شرمندۂ وفا نہ ہوا
عشق کے لطف کو وہ کیا جانے   اس بلا میں جو مبتلا نہ ہوا
اُن نگاہوں کو یاد کرتا ہوں   تیر جن کا کبھی خطا نہ ہوا
محتسب میکدہ میں آیا تھا   آج بھی عرشؔ پارسا نہ ہوا
عرشؔ سے حسن کے یہ غزل حسرتؔ   پیشِ غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

لوٹتا کیوں نہیں عدم سے کوئی   کچھ کسی کی خبر نہیں آتی
تند نظروں سے دیکھتے ہیں وہ   خیر اپنی نظر نہیں آتی
بیخودی میں ہوں میں ہر منزل   اور منزل نظر نہیں آتی
عرشؔ میں یہ بڑی خرابی ہے   طرزِ کسبِ ہنر نہیں آتی

اعتبارِ دوا کیا میں نے   چارہ ساز یہ کیا کیا میں نے
دل کو وقفِ رضا کیا میں نے   عشق کا حق ادا کیا میں نے
جان تم پر نثار کر دیتا   دل دیا یہ بُرا کیا میں نے
اے میری اشک ریز امیدو   جاؤ تم کو رہا کیا میں نے
سطوتِ حسن بھی نہ روک سکی   نالۂ برملا کیا میں نے
ہر قدم پر رہِ محبت میں   سجدۂ نقشِ پا کیا میں نے
غلبۂ عشق بھی عجب شئے ہے   حسن کو خود نما کیا میں نے
عرشؔ میکش ضرور ہوں لیکن   کوئی روزہ قضا کیا میں نے

جفا و ظلم و ستم آپ کیا نہیں کرتے   مگر علاجِ دلِ مبتلا نہیں کرتے
نہ ہوتی خواہشِ فرطِ ستم اگر ہم کو   تو آزمائشِ جور و جفا نہیں کرتے

بُرا بھلا تو وہ کہتے ہیں روز ہی لیکن　　تشفیٔ دلِ غمگین ذرا نہیں کرتے
نہیں جہان میں ہم سا بھی خوگرِ تسلیم　　مگر شکوۂ ستم ناروا نہیں کرتے
تمہاری طرح جو تم پر ستم کوئی کرتا　　تم اس سے شکوۂ بیداد کیا نہیں کرتے
بڑھاؤ ربط نہ ابنائے روزگار سے عرشؔ　　مثالِ زیست کبھی یہ وفا نہیں کرتے

رہروِ جادۂ فنا ہوں میں　　آپ ہی اپنا رہ نما ہوں میں
شارحِ حرفِ مدعا ہوں میں　　تجھ سے تقدیر آزما ہوں میں
دوسروں کا تو ذکر ہی کیا ہے　　آپ اپنے سے جب جدا ہوں میں
کس کی یہ تاب کس کی طاقت ہے　　کون یہ کہہ سکے خدا ہوں میں
حاجتِ شرح کچھ نہیں مجھکو　　ہمہ تن اپنا مدعا ہوں میں
کبھی مقصود تک پہنچ نہ سکا　　جانے کس شخص کی دُعا ہوں میں
کیوں مٹاتا ہے اے فلک مجھکو　　جانے کس کس کا مدعا ہوں میں
دہرِ ناپائیدار میں آکر،　　ایک تماشہ سا بن گیا ہوں میں
زندگی کیا ہے ایک دھوکا ہے　　اور اس پر مٹا ہوا ہوں میں

جرم کرنے سے مدعا یہ ہے　　اس کی رحمت کو دیکھتا ہوں میں
مجھ سے تاب مقابلہ کس کو　　پیروِ طرزِ میرزا ہوں میں
عرشؔ عبرت سرائے دُنیا میں　　جانے کیوں نوحہ کر رہا ہوں میں

اک شورشِ خیال دلِ بے خبر میں ہے　　جلوہ کسی کا جب سے ہماری نظر میں ہے
مستیٔ زمانۂ پیری بھی ہے غضب　　لیکن شراب لذتِ خوابِ سحر میں ہے
موسیٰ نہیں کہ تابِ تجلّی نہ لاسکیں　　اندازۂ جمال ہماری نظر میں ہے

حفیظ ہوشیارپوری

تنہائی کی وادی میں

(غالب اور اختر شیرانی کے ساتھ)

اب سے کوئی بتیس برس کی بات ہے اختر شیرانی مرحوم کے ساتھ ایک صحبت میں غالب کے یہ مشہور شعر زیر بحث آئے ۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

میرے اور اختر شیرانی مرحوم کے درمیان یہ طے پایا کہ وہ ان اشعار میں اضافہ کریں، اس طور پر کہ تنہائی کے مختلف مدارج اور اس کی کیفیتیں بیان ہو جائیں۔ اس کے بعد ان تمام اشعار کو میں مخمس کی صورت میں تضمین کر دوں۔ مرحوم نے اس زمین میں آٹھ شعر کہے۔ غالب کے تین شعر شامل کرنے کے بعد کل گیارہ شعروں کو اسطرح ترتیب دیا گیا کہ پہلا، دوسرا اور دسواں شعر غالب کا اور باقی اشعار اختر شیرانی مرحوم کے تھے۔ غالب اور اختر شیرانی کی یہ ملی جلی غزل "رومان" میں شائع ہوئی عنوان تھا "تنہائی کی وادی میں غالب کے ساتھ" اس پوری غزل پر میری تضمین جو ۸ ستمبر ۱۹۳۶ء کو شملہ میں لکھی گئی "رومان" بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۷ء کے پرچے میں شائع ہوئی (ح ۔ ہ)

کاش اب اندیشۂ سود و زیاں کوئی نہ ہو دوستوں کا لطف، جورِ دشمناں کوئی نہ ہو
سرزمیں ایسی ہو جس پر آسماں کوئی نہ ہو رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

زندگی کو کیوں پریشاں تر بنایا چاہیئے فکرِ ہستی کو نہ دردِ سر بنایا چاہیئے
دل کو ویرانے کا ہی خوگر بنایا چاہیئے بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

نکتہ چیں ذوقِ جنوں پر ہو نہ دنیائے دنی اپنے بیگانے نہ ہم پر کر سکیں طعنہ زنی

خوفِ تنہائی سے گرچہ اپنی جاں پر ہو بنی   اہلِ عالم ہوں نہ ربطِ دوستی و دشمنی
مہرباں کوئی نہ ہو نامہرباں کوئی نہ ہو

عشق کو دل میں نہاں رکھنے کا یارا چاہیئے   جوشِ غم کو ضبطِ پیہم کا سہارا چاہیئے
اب یہ طرزِ بود و باش اپنی خدارا چاہیئے   دامنِ صحرا میں چل کر یوں گزارا چاہیئے
سر میں ہو بیتاب سودا آستاں کوئی نہ ہو

حرفِ باطل ہو سراسر شکوۂ جور و جفا   دفترِ پارینہ ہو افسانۂ مہر و وفا
آشنا کے نام تک سے کان ہوں ناآشنا   ابنِ آدم کے اثر تک سے ہو بیگانہ فضا
مرد و زن کوئی نہ ہو، پیر و جواں کوئی نہ ہو

کارفرما ہو شرر بن کر نہ سوزِ عاشقی   پھونک ڈالے صورتِ اخگر نہ سوزِ عاشقی
روح و تن میں ہو خلش پرور نہ سوزِ عاشقی   زخمہ زن ہو بربطِ دل پر نہ سوزِ عاشقی
کوئی دلدادہ نہ ہو اور دلستاں کوئی نہ ہو

سب سے بے پروا، خوشی سے رنجِ تنہائی سہیں   کوئی ہمدم ہو نہ دل کی بات ہم جس سے کہیں
پونچھنے والا نہ ہو اور دمبدم آنسو بہیں   اپنی فریادوں کی لے میں رات دن کھوئے رہیں
ہم نوا کوئی نہ ہو ہم داستاں کوئی نہ ہو

حُسن سے بیگانہ تر کر دے ہو ذوقِ جستجو   اِس طرح ہم چھوڑ کر جائیں جہانِ رنگ و بُو
گونج اُٹھے یہ "نالۂ موزوں" فضا میں چار سو   دل میں پیدا ہی نہ ہو اوّل تو دردِ آرزو
ہو تو اُس کی بےکسی کا رازداں کوئی نہ ہو

عشق کی تیرہ نصیبی پر نہ ہو گریاں کوئی   شوق کی دیوانگی پر بھی نہ ہو خنداں کوئی
رہیئے گر چُپ تو نہ ہو اِس بات پر حیراں کوئی   روئیے تو ہو نہ اپنے حال کا پُرساں کوئی
اور اگر فریاد کیجئے ہم زباں کوئی نہ ہو

کاش اپنی بےبسی کا ہو نہ کوئی رازدار   نالۂ "یارب" سے بھی آئے ہمارے دل کو عار
مُبتلائے غم ہو جاں، کوئی نہ ہو پر غمگسار   پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو"

زندگی میں آشنا لب جن کے شکوؤں سے رہے   مر کے بھی احساں اُٹھائیں کیوں ہم اُن احباب کے
ذکر مت کر لوحِ تربت کا حفیظِ زار سے   "اختر اس تنہائی کی وادی میں اپنے واسطے
جب بنے تربت تو تربت کا نشاں کوئی نہ ہو"

مسلم ضیائی ایم، اے

تذکرہ مظہر العجائب اور مرزا غالب

تذکرہ مظہر العجائب ایک نادر تذکرہ تھا جو ۱۸۶۴ء کے بعد لیکن قریبی زمانے میں ترتیب دیا گیا تھا۔ اس میں دو ہزار شعراء کے حالات تھے اور غالباً اس کی تالیف میں غالب نے شروع ہی سے دلچسپی لی اور بعد میں بھی دلچسپی لیتے رہے چنانچہ اسی سلسلہ میں مرزا تفتہ کو اپنے خط مورخہ ۹ دسمبر ۱۸۶۴ء میں لکھا ہے کہ۔

"کمشنر و ڈپٹی کمشنر وغیرہ حکام شہر سے ترک ملاقات ہے مگر ڈپٹی کلکٹر شہر سے کہ وہ مہتمم خزانہ ہے، ہر مہینے میں ایکبار ملنا ضروری ہے اگر نہ ملوں تو مختار کو تنخواہ نہ ملے۔ ڈکرد ر صاحب ڈپٹی کلکٹر چھ مہینے کی رخصت پر پہاڑ پر گئے۔ ان کی جگہ رنگین صاحب مقرر ہوئے ان سے ناچار ملنا پڑا وہ تذکرہ شعرائے ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں مجھ سے انھوں نے مدد چاہی میں نے سات کتابیں بھائی ضیاء الدین خاں سے مستعار لیکر ان کے پاس بھیجدیں۔ پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ جن شعرا کو تو اچھی طرح جانتا ہے ان کا حال لکھ بھیج۔

میں نے سولہ آدمی لکھ بھیجے بقید اس کے کہ اب موجود ہیں اس سواد کی صورت یہ ہے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر رئیس لوہارو۔ فارسی و اردو دونوں ــــ میں شعر کہتے ہیں۔ فارسی میں نیر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے ہیں اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد ــ نواب مصطفےٰ خان بہادر تعلقہ دار جہانگیر آباد۔ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں۔ اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد[2]

---

[1] ۔ مومن خاں کا انتقال ۱۸۵۲ء میں ہو چکا تھا اس لئے "دکھاتے ہیں" نہ ہونا چاہئے تھا۔

[2] ۔ غالب نے سولہ میں سے تین شاگردوں کے نام لکھے ہیں۔ معلوم نہیں باقی تیرہ کون تھے۔

ظاہراً بعد اس فہرست کے بھیجنے کے انھوں نے کچھ اپنے منشی سے تم کو لکھوایا ہوگا مجھ کو اس حال سے کچھ اطلاع نہیں۔ تمہارے خط کی رو سے میں نے اطلاع پائی۔ اب میں مولوی مظہر الحق، ان کے منشی کو بلواؤں گا اور سب حال معلوم کروں گا۱؎ اصل یہ ہے کہ تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے۔ اشعار ہندی اور فارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائیگا صرف شاعر کا اور اس کے استاد کا نام اور شاعر کے مسکن اور وطن کا نام مع تخلص درج ہوگا۔

خدا کرے کچھ تم کو فائدہ ہو جائے ورنہ بظاہر سوائے درج ہونے نام کے اور کسی بات کا احتمال نہیں ہے۔.... رینگن صاحب اب عدالت خفیفہ کے جج ہوگئے۔ ڈکرو در صاحب بہادر پہاڑ سے آگئے اور اپنا کام کرنے لگے۔ رینگن صاحب شہر سے بارہ کوس پر جا رہے ہیں مینھ برسنے کا موسم، بڑھاپے کا عالم، جانا دشوار اور پھر کوئی مطلب نکلتا ہوا نظر نہیں آتا۔ بہر حال مولوی مظہر الحق پرسوں یکشنبہ کے دن یہاں آئیں گے حال معلوم کرکے، اگر میرا جانا یا لکھنا تمہاری فلاح کا موجب ہوگا، تو ضرور جاؤں گا،،۲؎

اس خط کے چند ہی روز بعد غالب نے ۱۲؍ دسمبر ۱۹۶۴ء کو ایک اور خط لکھا اس عرصہ میں مولوی مظہر الحق سے ملاقات اور گفتگو ہو چکی تھی اس لئے تفتہ کو اطلاع دیتے ہیں۔

،،یکشنبہ کو مولوی مظہر الحق آئے تھے ان سے تمہارا حال معلوم ہوا پہلا خط تم کو ان کے بھائی الزار الحق۳؎ نے بموجب حکم رینگن صاحب کے لکھا تھا۔ دونوں دیوان تمہارے اور گلشن عشق اور ایک تذکرہ (؟) یہ چار کتابیں تمہاری بھیجی ہوئی ان کو پہنچیں۔ صاحب تم سے بہت خوش اور تمہارے معتقد ہیں کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں اتنا بڑا شاعر کوئی اور ہندوستان میں نہ ہوگا کہ جو پچاس ہزار بیت کا مالک ہو۴؎۔،،

اس عرصہ میں غالباً مرزا تفتہ کا جواب آگیا تھا اور انہوں نے مزید کچھ باتیں دریافت کی تھیں۔ اس لئے غالب نے ۱۲؍ فروری ۱۹۶۵ء کے خط میں لکھا۔

،، مرزا تفتہ ،،

کیا فرماتے ہو ہے کہ رینگن صاحب، کہاں رینگن صاحب پنجشنبہ کے دن ۱۹ جنوری کو پنجاب گئے۔ ملتان یا پشاور کے ضلع میں کہیں حاکم ہوئے ہیں اپنی ناتوانی کے سبب ان کی تودیع کو نہیں گیا۔ الزار الحق گھاٹ پر

۱؎ - ان کا نام مظہر حق۔ اور میرے خیال میں تاریخی تھا جس سے ۱۲۵۳ھ نکلتے ہیں۔ غالب نے تین مقامات پر ان کا نام مظہر الحق لکھا ہے۔ دیوان ظہور میں صرف ایک مقام پر نظم میں مظہر الحق ورنہ ہر جگہ مظہر حق ہی ہے۔ ۲؎ خطوط غالب صفحہ ۲۰۷ - ۲۰۸ -
۳؎ الزار الحق مظہر حق کے ممکن ہے رشتے کے بھائی ہوں۔ سگے بھائی قطعاً نہ تھے۔ دیوان ظہور میں الزار الحق کے دو بچوں کی تاریخ پیدائش پر قطعات ہیں ۴؎ خطوط غالب صفحہ ۲۰۸ -

نوکر ہیں پندرہ روپیہ مشاہرہ پاتے ہیں"
غالب کی یہ تحریریں اس فہرست شعراء سے متعلق ہیں جو رنگن نے تیار کروائی تھی اور غالباً ویسی ہی تھی جیسی اسپرنگر کی فہرست شعراء اردو ہے۔ لیکن رنگن کو جو حالات دیئے ظاہر ہے غالب نے قدرے تفصیل سے لکھے ہوں گے۔

ان حالات کو سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو اورنگ آباد دکن جولائی ۱۹۲۸ء میں اس نوٹ کے ساتھ شائع کیا تھا کہ انھیں یہ تحریر سید انتخاب عالم مارہروی مرحوم سے حاصل ہوئی تھی انھوں نے نیر راجستھان" جلد ۲ نمبر ۵ کا وہ مطبوعہ ورق بھی بھیجا تھا جس میں تذکرہ مظہر العجائب کا اشتہار شائع ہوا تھا اور اغلب ہے کہ یہ حالات مرزا صاحب نے اسی تذکرہ کے لئے تحریر کئے ہوں۔

رسالہ اردو کے علاوہ احوال غالب میں بھی غالب کے خود نوشت حالات" کے تحت اظہار الحق ملک نے اس تحریر کا عکس دوبارہ شائع کیا ہے اگرچہ اس کے حاشیے کی بعض تحریریں مثلاً تاریخ پیدائش اور دن کو نقل کرتے ہوئے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

غالب کی اس تحریر سے حسب ذیل باتوں کا علم ہوتا ہے۔

- غالب نے اپنا سالِ ولادت حسب معمول ۱۲۱۲ھ اور روز انچے کے مانند یوم پیدائش یکشنبہ لکھا ہے جسے بڑی اہمیت حاصل ہے[۱]
- ان کے دادا توقان بیگ کا نام اس ترجمے میں ہے بادشاہ کا دیوانی میں لاہور کے دربار میں شریک نہ ہونے پر افسوس۔
- ۱۸۵۵ء میں آخری قصیدہ لارڈ ڈالہوزی کی معرفت وکٹوریا کو بھیجا گیا تھا۔
- ۱۸۵۶ء میں یا اس سے پہلے ولایت سے تین خط بے واسطہ حکومت ہند ولایت سے غالب کے پاس آئے تھے۔
- غالب نے اس وقت اپنی عمر ستر سال بتائی ہے اس لحاظ سے ۱۲۱۲ + ۷۰ = ۱۲۸۲ھ تحریر معلوم ہوتا ہے۔
- اس میں غالب نے ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے گذرے ہوئے واقعات مصلحتاً نظر انداز کر دیے۔
- اس کے آخر میں "نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ" تو ہے لیکن مہر نہیں جب غالب کی عموماً اس قسم کی ایسی تحریروں پر ثبت کرتے تھے

مضمون کے ساتھ مولوی صاحب نے نیر راجستھان کا اشتہار بھی شائع کر دیا تھا جس سے حسب ذیل حالات کا علم ہوتا ہے۔

- شعرائے فارسی کا یہ تذکرہ دہلی میں کئی سال سے تالیف ہو رہا تھا۔
- اس کے مولف مولوی مظہر الحق فرزند مولوی ظہور علی ظہور دہلوی تھے۔
- یہ تذکرہ ۱۲۸۰ھ میں مکمل ہو چکا تھا۔ تقاریظ و تواریخ نجم الدولہ (غالب) بہادر، مولانا نظامی[۲] اور مولوی محمد ظہور علی ظہور نے لکھی تھیں جن سے ۱۲۸۱ھ نکلتا ہے۔
- تذکرہ پر نظر ثانی کی گئی یعنی دوبارہ لکھا گیا۔ اس میں قریب دو ہزار شعرائے فارسی کا ترجمہ تھا اور اشعار کی کوئی حد نہیں تھی حالات بڑی تلاش اور تجسس سے بہت صحیح ایک سو جلد کتب تواریخ سے جمع کئے گئے تھے۔

---

[۱] غالب کی تاریخ ولادت، سنہ اور یوم پیدائش کے لئے دیکھئے اردو نامہ۔ کراچی جنوری ۱۹۶۸ء [۲] حاشیہ اگلے صفحے پر

و۔ ان کتابوں کی فہرست اخباروں میں شائع کی گئی تھی۔
و۔ اس تذکرہ کے بانی ریٹی گن صاحب بہادر سابق جج دہلی تھے۔
و۔ ریٹیگن نے چھ سو شاعروں کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا اور خبر ہے کہ ولایت میں چھپوایا ہے۔
و۔ صاحب کمشنر دہلی (ہملٹن۔ ص) نواب محمد ضیاء الدین خاں بہادر رئیس لوہارو، نواب اسداللہ خاں بہادر اور دیگر رؤسا نے اپنی کتب سے مدد دی۔
و۔ مولوی محمد انوار الحق میر منشی ایجنٹی ماروار نے چار سو سے زیادہ شعرا کے حالات کا اضافہ کیا [۱]
و۔ منشی درگا پرشاد مدرس اول ریاضی تعلیم المعلمین۔ دہلی نے بھی ہر طرح کی مدد دی۔
و۔ چونکہ شعراء سے بمبئی، کلکتہ و ممالک وسط ہند کے فارسی کلام اور حالات سے آگہی نہ ہوئی اس لئے اشتہار دیا جاتا ہے کہ جمیع شعرائے فارسی اپنا مفصل حال مع تقریظ و تاریخ و اشعار مؤلف کے پاس بھیجدیں
و۔ متوقعہ مطبوعہ تذکرے کی قیمت تین روپیے علاوہ محصول ڈاک مقرر کی گئی تھی اور منظر الحق کا پتہ۔ محلہ بہرام خاں دہلی تھا۔
و۔ اہل مطابع سے درخواست کی گئی تھی کہ اس اشتہار کو اپنے اخبار میں درج فرمائیں۔

اس سلسلے میں سعیدہ ادھمی صاحبہ نے اپنے مضمون میں مولوی احتشام الدین مرحوم کی وہ تحریر آج کل دہلی میں شائع کی ہے جو نسخۂ حمیدیہ مکلوکہ پروفیسر احتشام حسین کے حاشیے پر انہی کے قلم سے درج ہے۔

اس تحریر سے حسب ذیل باتیں نظر کے سامنے آتی ہیں۔

:۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت سے بہت پہلے اپنا مقدمہ لکھا تھا۔
:۔ یہ مقدمہ پنسل سے لکھا ہوا اور کٹا پھٹا ان کے پاس تھا جسے انھوں نے خود اپنی زبان سے مولوی احتشام الدین کو سنایا تھا۔
:۔ مولوی احتشام الدین نے غالب کے قلم سے لکھے ہوئے مختصر حالات نسخۂ حمیدیہ کے ساتھ شائع کرنے کے لئے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو دیئے تھے۔
:۔ یہ تذکرہ مسٹر ہملٹن ڈپٹی کمشنر دہلی نے تذکرہ شعرائے فارسی کے لئے ان کے والد (مولوی انوار الحق) سے لکھوایا تھا۔

بجنوری کے انتقال (۱۹۱۸ء) کے بعد نسخۂ حمیدیہ شائع ہوا (اواخر ۱۹۲۱ء) تو غالب کی یہ تحریر اس کے ساتھ نہ تھی بھوپال میں اس تحریر کو تلاش کیا گیا تو پتہ نہ چلا۔ آخر مولوی احتشام الدین کو حیدرآباد آ کر معلوم ہوا کہ وہ احوال غالب مولوی عبدالحق کے

---

[۱] یہ مولانا نظامی منشی نظام الدین غالباً علاحسین فدا کے استاد اور بڑے بھائی تھے جنکی تقریظ اور قطعات دیوان فدا (نول کشور لکھنؤ ۱۲۸۶ھ) کے آغاز میں درج ہیں انھوں نے ۱۲۸۲ھ میں وفات پائی قطعہ تاریخ وفات دیوان فدا کے صفحہ ۲۷۰ پر درج ہے۔ انھیں نظامی نے دیوان فدا ترتیب دیا تھا [۳] اس طرح مولوی انوار الحق بھی تذکرہ کی تدوین میں شامل ہو گئے تھے۔ غالب نے تقریظ میں سولہ سو شاعروں کی تعداد لکھی ہے۔

پاس موجود ہے۔ انتظار ہے کہ کب شائع ہوتا ہے۔

سعیدہ ادھمی صاحبہ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ غالب کی یہ خود نوشت "تذکرہ مظہر العجائب" کے لئے نہیں بلکہ کسی اور تذکرے کے لئے لکھی تھی۔ کیونکہ یہ حالات اول تو مولوی احتشام الدین نے ڈاکٹر بجنوری کو دیئے تھے دوسرے جو حالات جولائی ۱۹۲۸ء کے رسالہ اردو میں شائع ہوئے وہ مولوی صاحب کو افتخار عالم مارہروی مرحوم سے ملے تھے۔

مولوی احتشام الدین نے اپنی تحریر میں مسٹر ہملٹن ڈپٹی کمشنر دہلی لکھا تھا۔ سعیدہ ادھمی نے اسکو غلط تصور کر کے ہنگٹن لکھا اور بخیال خود تصحیح کر دی۔ لیکن حقیقت میں مولوی عبدالحق اور مولوی احتشام الدین صاحبان نے ایک ہی تحریر کا حوالہ دیا ہے جو رسالہ اردو اور احوال غالب میں شائع ہوئی ہے۔

تفتہ کے نام غالب کے اردو خطوں میں مظہر الحق اور انوار الحق دونوں کا ذکر ملتا ہے۔ اپنی تقریظ میں غالب نے مظہر الحق اور سولہ سو شاعروں کا تذکرہ کیا ہے۔ مظہر الحق اور انوار الحق کے تعلقات ہمیں معلوم ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اگرچہ سگے بھائی نہ تھے لیکن قریبی قرابت رکھتے تھے۔ مظہر الحق کے انتقال پر یہ تحریر (خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ انوار الحق نے تذکرہ میں چار سو شعراء کے حالات کا اضافہ کیا تھا) انوار الحق اور ان کے بعد احتشام الدین تک پہنچی۔ اس لئے غالب نے رنگین کے لئے جو حالات لکھے تھے۔ وہی حالات تھے جو مولوی احتشام الدین نے ڈاکٹر بجنوری مرحوم کو دئے اور ان کے انتقال پر کسی طرح افتخار عالم مارہروی کے ہاتھ لگ گئے جنھوں نے مولوی عبدالحق کو اشاعت کے لئے حوالے کر دیا۔ اس سلسلہ میں ایک بات البتہ قدرے الجھن میں ڈالنے والی ہے وہ یہ کہ نسخہ حمیدیہ مملوکہ احتشام حسین پر بقول سعیدہ ادھمی مولوی احتشام الدین کی تحریر مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۳۶ء میں لکھا ہے کہ "مولوی عبدالحق کے پاس وہ احوال غالب خود انکے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے۔ الحمد للہ کہ ابھی تک ضائع نہیں ہوا مگر انتظار ہے کہ کب شائع ہوتا ہے۔

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ان دونوں بزرگوں کے تعلقات خوشگوار نہ تھے ور نہ مولوی احتشام الدین "انتظار ہے کہ کب شائع ہوتا ہے" کے الفاظ نہ لکھتے۔ ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نظر سے رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۸ء نہیں گذرا تھا جس کے باعث ۱۹۳۶ء میں انھیں اس کی اشاعت کا انتظار تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی تحریر ۱۹۲۶ء کی ہو ۱۹۳۶ء کی نہ ہو لیکن اس کی تصدیق اصل تحریر ہی دیکھ کر کی جا سکتی ہے۔

اس سلسلے میں خوش قسمتی سے مجھے اپنے دوست ابن حسن قیصر صاحب سے دیوان ظہیر دہلوی مل گیا (مطبوعہ ۱۳۰۰ھ) ظہیر ذوق کے شاگرد اور مظہر الحق۔ مظہر کے والد تھے۔ انھیں دربار ظفر سے شمس الشعرا کا خطاب ملا تھا دیوان کے صفحہ ۲۱۲ پر مظہر الحق کے سلسلے میں ان کے بھائی محمد ذوالفقار حسین منی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مظہر الحق محمد ظہیر علی ظہیر کے دوسرے فرزند تھے۔

" مظہر الحق جنھوں نے علم عربی و فارسی و انگریزی و ریاضی و علم ہیئت اور نظم و نثر وغیرہ میں کامل دستگاہ حاصل کی تھی اور صاحب تصانیف ہو گزرے ہیں ان کی تصانیف میں سے تذکرہ شعرائے فارسی کا ہے۔ سولہ سو سے زیادہ شاعروں کا تاریخی حال اس میں درج ہے [1]

---

[1] اس کی تائید غالب کی تقریظ سے ہوتی ہے۔ کلیات نثر غالب صفحہ ۹۵

یہی ذوالفقار حسین غنی اطلاع دیتے ہیں کہ مسٹر ٹیگن بہادر نے جو بزمانہ سابق دہلی کے جج اور مولوی صاحب ممدوح کے شاگرد تھے بہ کمال کوشش گراں بہا کتب اطراف و جوانب سے طلب فرمائیں اور مسٹر ہملٹن صاحب بہادر کمشنر دہلی نے مولوی صاحب کو اپنے کتب خانے سے بڑی مدد دی اور جناب نواب اسداللہ خاں غالب نے کہ آپ کا از بس التفات اپنے تلمیذ پر تھا یعنی مولف تذکرہ پر تھا۔ آخر تک بقلم خاص تذکرہ مذکور کی عبارت میں اصلاح فرمائی اور اس تذکرہ کا ترجمہ جج صاحب موصوف نے بزبان انگریزی انگلینڈ ارسال کیا وہاں سے کئی ہزار روپیہ انعام ملا مگر جج صاحب بہادر نے حضرت مولف کو زر نقد سے کچھ نہ دیا۔

اس تذکرے کی تقریظیں مرزا غالب اور مولانا نظامی مراد آبادی و حضرت ظہور و دیگر فضلائے دہلی و مسٹر ہملٹن صاحب کمشنر دہلی نے بزبان فارسی تحریر فرمائی ہیں۔

غنی کا یہ بھی بیان ہے کہ

"یہ تذکرہ بوجہ بے سروسامانی طبع نہ ہو سکا اور یونہی بستے میں بندھا ہوا رکھا ہے۔ حضرت مولف نے اس تذکرے میں ساقی نامہ کی تعریف میں اپنے دل و دماغ پر وہ زور دیا ہے کہ لفظ لفظ پر عروس معانی جلوہ گر ہیں تین چار کتابیں جن میں تاریخی اور علمی حالات اور ایک کتاب تعلیم نسواں کی بابت تصنیف فرمائی ہے ان سب کتابوں کی تصنیف کے صلے میں صاحب ڈائرکٹر بہادر ممالک مغربی و شمالی نے براہ قدر شناسی و قدر افزائی مولف مرحوم کو بہت کچھ انعام و اکرام الطاف فرمایا اور چٹھیوں میں حضرت مولف کے فضل و کمال کی از حد تعریف و توصیف اور اپنی خوشنودی مزاج ظاہر فرمائی تھی"[۲]

ان کتابوں کے علاوہ مظہر الحق نے ایک کتاب علم ہیئت میں کچھ کتب انگریزی سے ترجمہ اور کچھ تحقیقات سے لکھ کر مسٹر رابرٹ ڈپٹی کمشنر ضلع گوڑ گانواں کے خدمت میں پیش کی تھی جس کے باعث مسٹر رابرٹ ان پر بہت مہربان تھے خوش قسمتی سے تذکرہ مظہر العجائب پر غالب کی تقریظ ان کی کلیات نثر میں موجود ہے جس میں مظہر حق کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"تا درالای پایہ فروزندہ اختر سپہر بینش و برومند نخل ریاض دانش سیاح دشت سخن و سباح بحر معنی دانائی زبان فارسی و لسان عربی و آموزگار گفتار انگریزی اور درا از ان راہ نام نبردہ ام کہ آں خود خانہ زاد ان دست بیدار دلی روشن روان مولوی مظہر الحق صاحب طال بقاہ و قد رسیدم ...... گزیدہ اشعار از گیتی زاد روشش صاحب سخن ور گرد آوردہ و تذکرہ ترتیب دادہ"[۳]

مولوی مظہر الحق کے حالات کے متعلق غالب کی اس تحریر اور اس تصدیق کے علاوہ صرف اسی قدر معلوم ہو سکا ہے کہ وہ ابتدا میں نواب کے ہاں ۱۸۵۷ء سے پہلے ملازم ہوئے۔ ۱۸۶۴ء میں ٹیگن کے منشی تھے اس کے بعد ڈپٹی کمشنر گوڑگانواں کے پاس ملازم رہے۔

انھوں نے کثرت سے غزلیں اور قصائد لکھے تھے آخر وقت میں زبان برج میں لکھنے کا شوق ہوا تھا اس زبان میں ہولیاں اور ٹھمریاں کثرت سے لکھی تھیں یہ خوب لکھتے تھے اور بقول غنی، اس زبان میں معرفت کے مضامین بڑے درد انگیز لکھے ہیں۔ زبان سنسکرت کی صرف و نحو اور اس سے متعلق چیزوں میں خوب ملکہ تھا۔ مزاج میں بڑی فروتنی تھی چنانچہ جن لوگوں نے زیادتیاں کیں مظہر الحق نے انھیں بھی معاف کر دیا اور کبھی انتقام نہ لیا[۴]۔

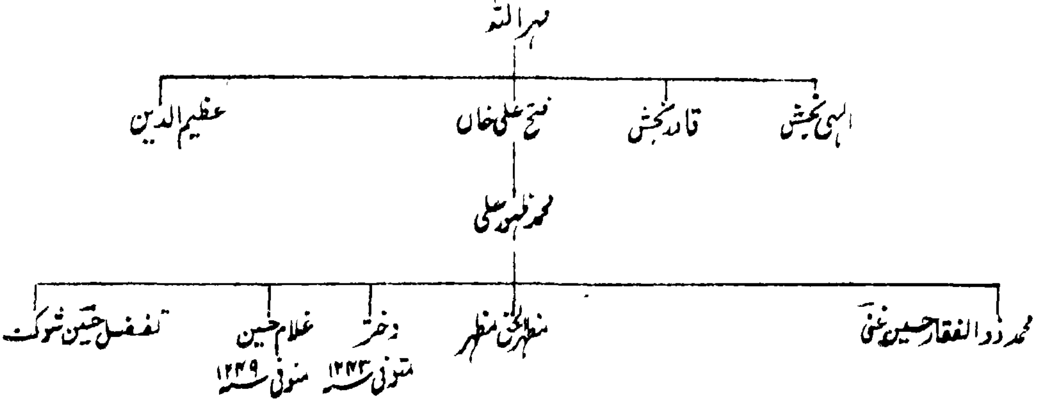
---

[۱] معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر ہملٹن ڈپٹی کمشنر سے کمشنر دہلی ہو گئے تھے۔ [۲] کلیات نظم فارسی صفحہ ۹۵ [۳] میرے خیال میں ان کا نام مظہر حق تاریخی ہے جس سے ۱۲۵۳ھ نکلتے ہیں [۴] دیوان ظہور صفحہ ۲۱۳

چونکہ ان کے والد ظہور دہلوی کا تعلق ہمیشہ انگریزی حکومت سے رہا تھا۔ دہلی کے اکثر تھانوں پر متعین اور بہت سے انگریز افسروں کے استاد رہے تھے۔ اس لئے مظہر الحق پر انگریز عہدیدار خصوصاً ان کی اپنی علمی قابلیت کے باعث بہت مہربان رہتے تھے۔

ان کے چھوٹے بھائی تفضل حسین پلول میں اور یہ خود پالوری میں تحصیلدار رہے (۱۲۸۶ھ) آخری زمانے میں اپنی کثیر مصروفیات کے باوجود، جو بندوبست میں ملازمت کے باعث تھیں انھوں نے منصفی کا امتحان پاس کیا تو چیف کمشنر دہلی نے اپنے پاس بلا لیا تاکہ کسی اچھے عہدے پر مامور کرے لیکن اسی زمانے میں ان کا بارہ سالہ لڑکا گھوڑے کی لات سے زخمی ہو کر مر گیا جس کے صدمے سے پورے دو مہینے بعد مظہر الحق بھی اس کے غم میں انتقال کر گئے۔

ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی سے ملتا ہے ہندوستان میں ان کے ایک بزرگ کریم الدین کو بابر نے لادی الحق کا خطاب دیا تھا



ظہور نے اپنے خاندان سے متعلق ایک مثنوی لکھی ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

تین بخشے مجھکو حق نے نور عین ۔۔۔ ذوالفقار و ہم تفضل با حسین
مظہر الحق ہے مرا اوسط پسر ۔۔۔ ہیں یہ تینوں صاحب علم و ہنر
پور اوسط ہے جو با اقبال و جاہ ۔۔۔ اسکو انگریزی میں بھی ہے دستگاہ
وہ محمد ذوالفقار با حسین ۔۔۔ ایک ہے فرزند اس کا نور عین
نام اس کا ہے تفرا در سپہر حسن ۔۔۔ دیجیو حق اس کو عادات حسن
ہے تفضل جو مرا لخت جگر ۔۔۔ لطف خالق سے ہیں اس کے دو پسر
اولیں برجیس بخت و خوش لقا ۔۔۔ اور ثریا بخت ہے وہ دوسرا[1]
یا الٰہی یہ مرے نور بصر ۔۔۔ وہ نبیرے اور یہ تینوں پسر
صاحب اعزاز و اقبال ہوں ۔۔۔ زندہ عالم میں ہزاروں سال ہوں

---

[1] ایک کا برجیس تخلص تھا اور دوسرے کا ثریا۔

دیوان ظہور سے معلوم ہوتا ہے کہ منظہر الحق کے بڑے بھائی محمد ذوالفقار حسین غنی ۱۲۴۶ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ منظہر الحق کی تاریخ وفات نہیں معلوم ہو سکی البتہ اتنا یقینی ہے کہ ان کا انتقال ۱۲۸۶ھ اور ۱۳۰۰ھ کے درمیان ہوا ان کی شادی پر ظہور نے جو قطعہ کہا تھا اس سے ۱۲۷۵ھ نکلتے ہیں۔

بگرد بد یک جا۔ مہ و مشتری
۱۲۷۵

ظہور ان کی انگریزی، فارسی، عربی، سنسکرت، ہیئت اور دیگر علوم میں لیاقت سے خوش تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں

مرحبا فرزند نور العین و ہم لخت جگر　　　باد مقبول خداوند زمین و آسمان
می نمایم این دعا بہر تو ہر صبح و مسا　　　باد مقبول خداوند زمین و آسمان

ان کی ایمانداری کا ایک واقعہ ذوالفقار حسین غنی نے لکھا ہے کہ سلطنت آسٹریا کے نوٹ رقمی بارہ کرور روپیہ انھیں دستیاب ہوئے تھے انھوں نے بغیر کوئی رسید لئے یہ نوٹ آلیور ڈپٹی کمشنر گوڑگانو کے حوالے کر دیے۔ اس واقعہ کی کیفیت اخباروں میں شائع ہوئی تھی۔ لیکن منظہر الحق کو کوئی انعام وغیرہ نہیں دیا گیا۔

انھیں دیگر علوم کے علاوہ شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ غالب نے انھیں سیاح دشت سخن اور سیاح بحر معنی لکھا ہے لیکن ان کا کلام اگرچہ دیوان ظہور کی اشاعت تک بھائیوں کے پاس محفوظ تھا لیکن معلوم نہیں کہ تذکرہ مظاہر العجائب کے مانند غالب نے شروع سے آخر تک نظر ثانی کی اور اس پر تقریظ لکھی تھی اب کہاں ہے تلف ہو گیا یا گوشۂ گمنامی میں محفوظ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی دست برد زمانہ کا شکار ہو گیا۔ صرف ایک قطعہ حاصل ہوا ہے۔ اور وہ بھی ظہور کی ایک مثنوی کے ساتھ۔ یہ مثنوی ظہور نے ۱۲۷۰ھ میں لکھی تھی اس میں ایک ملائے مکار کے حالات لکھے گئے ہیں جو کوہاٹ کا رہنے والا تھا اور جس کے حالات اخبار کوہ نور میں شائع ہوئے تھے اس کے ساتھ منظہر الحق کا قطعہ یہ تھا۔

چو این نادر حکایت گشت منظوم　　　زہے دلچسپ و رنگین و پر اعجاز
نمود فکر تاریخش چو منظہر　　　نوشتم۔ داستان عبرت اعجاز

کاش منظہر الحق کا یہ تذکرہ اور النوادر الحق کا ضمیمہ جس میں مجموعی طور پر دو ہزار شاعروں کے حالات اور کلام درج تھا تلف نہ ہوا ہوتا۔

مولانا امتیاز علی عرشی (رامپور)

نسخۂ حمیدیہ اور بجنوری !!

نومبر ۹۶۸ء میں پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کو نسخۂ حمیدیہ کی ایک کاپی ملی تھی جو محمد انوار الدین دہلوی کی ملک رہ چکی تھی، اس کاپی کے اندر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے مقدمہ کے ... نسخہ کا ایک نوٹ مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۲۷ء درج ہے اس کے ضروری حصے یہ ہیں [1]

"یہ غلط ہے کہ بجنوری مرحوم نے یہ دیباچہ غالب کے نسخۂ دیوان مسودہ کی دستیابی سے پہلے لکھا تھا۔ نہیں بلکہ دستیاب ہونے پر اُن کو مکمل کلام غالب کے شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا اور یہ مقدمہ اس ارادہ کی پیروی میں لکھا گیا۔ اس کے لکھنے کے بعد وہ ایک بار علیگڑھ آئے اور راقم کے پاس دو ایک روز مہمان رہے۔ یہ مقدمہ پنسل سے لکھا ہوا کٹھا ان کے پاس موجود تھا، اور انھوں نے خود اپنی زبان سے اس کو پڑھ کر سنایا، اور طباعت کے متعلق مشورے کئے۔

اس نوٹ پر پروفیسر احتشام حسین صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا ضروری حصہ یہ ہے۔

"غالب شناسوں کے لئے اس عبارت میں بہت سا دلچسپ مواد ہے ..... اس سے خود مفتی انوار الحق کے اس بیان کی تکذیب ہوتی ہے کہ ڈاکٹر بجنوری نے مقدمہ متداول نسخوں کو سامنے رکھ کر لکھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ممکن ہے مرحوم اس تبصرہ پر نظر ثانی کرتے، کیونکہ ابھی تک انھوں نے اس مضمون کو ختم نہیں کیا تھا۔ اور قرین قیاس ہے کہ اس میں اور کچھ رد و بدل ہوتا، کیونکہ جو کچھ لکھا گیا تھا وہ مروّجہ اور مطبوعہ دیوان کے متعلق تھا، اور اب ایک سو برس کے قلمی دیوان میں غالب کا غیر مطبوعہ اور قلمزدہ کلام مل جانے سے میدان سخن فراغ ہو گیا تھا ....

[1] اس تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ہماری زبان علی گڈھ بابتہ یکم مارچ ۱۹۶۱ء باب مراسلات مئی ۱۹۶۱ء

لیکن افسوس کہ ان کی مرگِ بے ہنگام نے بہت عجلت کی . . . .

مفتی انوار الحق نے یہ بھی لکھا ہے کہ بجنوری نے انجمن ترقی اردو ہند کے لئے دیوان غالب اردو کا نیا ایڈیشن تیار کرنا منظور کیا تھا یہ مقدمہ اسی کے لئے لکھا گیا تھا

مولوی احتشام الدین دہلوی قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ مقدمہ نسخۂ دیوان معدوم کے دستیاب ہونے کے بعد لکھا گیا۔ اور خود بجنوری نے انہیں مقدمہ کا مسودہ دکھایا۔

یہ معمولی سا مسئلہ کہ بجنوری نے یہ مقدمہ کس دیوان کو سامنے رکھ کر لکھا اس لئے یہ معمہ بن جاتا ہے کہ ان کے مقدمہ میں نسخہ حمیدیہ کے مخصوص اشعار کے حوالے نہیں ملے۔ مگر مولوی احتشام الدین کو اصرار ہے کہ بجنوری نے اسے سامنے رکھا تھا۔ . . . .

ان دونوں بزرگوں کی تحریریں پڑھ کر حسب ذیل سوال پیدا ہوتے ہیں

(۱) کیا انجمن ترقی اردو نے بجنوری سے دیوان غالب مرتب کر دینے کی فرمائش کی تھی؟۔

(۲) کیا بجنوری نے اس نسخے کے لئے کوئی مقدمہ بھی لکھا تھا؟۔

(۳) محاسنِ کلام غالب کے نام سے دیوان غالب پر بجنوری کا جو تبصرہ انجمن ترقی اردو نے پہلے اپنے رسالہ اردو بابتہ ماہ جنوری ۱۹۲۱ء میں اور پھر اسی سال علی گڑھ سے کتابی شکل میں شائع کیا تھا، کیا وہ یہی مقدمہ ہے جو انجمن کے مجوزہ ایڈیشن کیلئے لکھا گیا تھا۔؟

(۴) کیا بجنوری نے یہ مقدمہ لکھتے وقت صرف متداول دیوان ہی کو سامنے رکھا تھا؟

(۵) کیا نسخۂ بھوپال جو نسخۂ حمیدیہ مطبوعہ کی اصل ہے۔ بجنوری کی زندگی میں دستیاب ہو گیا تھا؟۔

(۶) کیا بجنوری نے اس نسخے پر کچھ کام کرنا شروع کر دیا تھا جو ان کی موت کے باعث نامکمل رہ گیا؟۔

(۷) اس کام کی نوعیت کیا تھی؟۔

پہلا سوال۔ اس سوال کا حل مولوی عبدالحق صاحب کے اس نوٹ میں موجود ہے جو انہوں نے محاسنِ کلام غالب مطبوعہ ۱۹۲۱ء پر بطور پیش لفظ لکھا تھا۔ وہ فرماتے ہیں۔

انجمن ترقی اردو کا ایک مدت سے ارادہ تھا کہ مرزا غالب کے اردو دیوان کا ایک نفیس صحیح جدید ایڈیشن طبع کرے۔ چنانچہ بڑی کوشش و تحقیق سے یہ دیوان مرتب کیا گیا۔

میری درخواست پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے اس کے لئے بطور مقدمہ کے غالب کے کلام پر تبصرہ لکھنا شروع کیا۔

"اس اثنا میں اتفاق سے بھوپال کے سرکاری کتب خانہ میں مرزا صاحب کے قدیم دیوان کا مکمل النسخہ نکل آیا، جس میں وہ تمام نظمیں رباعیتیں جو بعد میں خارج کر دی گئی تھیں علمی لحاظ سے یہ ایک بڑی نعمت اور بیش بہا خزانہ تھا۔

" مرحوم نے انجمن کے لئے اسے ترتیب دینا شروع کیا۔

لیکن افسوس اجل نے اتنی مہلت نہ دی کہ اس کی تکمیل ہو جاتی اور یہ ہونہار نوجوان جو علم و اخلاق کا پتلا تھا بے وقت اس دنیا سے

کو پسند کر گیا

یہ مضمون جوش و بیان، جدت فکر اور بلندی خیالات کے لحاظ سے اردو زبان میں بالکل ایک نئی چیز ہے مرحوم کی یادگاروں میں سب سے اول رسالہ اردو میں شائع ہوا تھا اور اب مستقل کتاب کی شکل میں چھاپا جاتا ہے"

اس پیش لفظ سے یہ امر تو بصراحت معلوم ہو جاتا ہے کہ انجمن نے ایک نیا نسخہ تیار کرایا تھا مگر اسے کس نے مرتب کیا تھا۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ہاں اس پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش بجنوری مرحوم سے ضرور کی گئی تھی۔ جو انہوں نے پوری بھی کر دی تھی۔

اس سلسلے میں مفتی انوار الحق صاحب نے نسخۂ حمیدیہ کے دیباچے میں لکھا ہے۔

"جب انجمن ترقی اردو نے دیوان غالب اردو کی ایک نئی اشاعت کا ارادہ کیا تو نظر انتخاب مرحوم ہی پر پڑی اور انہوں نے بھی اس مشکور اور ادبی خدمت کو بطیب خاطر قبول کیا اور اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ اس کام کیلئے ان سے زیادہ موزوں کوئی شخص نہ تھا۔ مرحوم نے بڑے اہتمام سے اس کے سرانجام کا قصد کیا۔ سب سے پہلے دیوان غالب کے مختلف اور متداول نسخے بہم پہنچا کر نہایت احتیاط سے اس کی تصحیح کی اور اسکے ساتھ ہی غالب کی شاعری پر ایک ضخیم اور بسیط تبصرہ لکھنا شروع کیا۔"

اس بیان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ترتیب و تصحیح دیوان کی خدمت بجنوری ہی کے ذمے عائد کی گئی تھی اور انہوں نے اسے نہایت حسن سے انجام دیا تھا یعنی پہلے دیوان کے متداول نسخے اکھٹے کئے گئے تھے اور ان کی مدد سے ایک صحیح نسخہ تیار کیا تھا۔

یہ بات مفتی صاحب کو کیسے معلوم ہوئی خود بجنوری مرحوم کی زبانی یا کسی اور ذریعے سے اس کا انہوں نے ذکر نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کا بیان صحیح ہو اور مولوی عبدالحق صاحب نے کسی وجہ سے اس کی صراحت مناسب نہ خیال کی ہو۔ اب تو ہم یہی بتا سکتے ہیں کہ انجمن کیلئے انہوں نے بجنوری مرحوم سے دیوان مرتب کرایا تھا یا نہیں، اور وہ نسخہ جو بقول انوار الحق مرتب ہو چکا تھا کہاں گیا [1]

دوسرا اور تیسرا سوال:۔ مولوی صاحب کے پیش لفظ اور مفتی صاحب کے بیان محولہ بالا سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ بجنوری نے دیوان غالب پر تبصرہ لکھا تھا اور وہ تبصرہ وہی ہے جو محاسن کلام غالب کے نام سے انجمن نے چھاپا۔ اور اس کے بعد نسخہ حمیدیہ میں بھی شامل کر لیا گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ بجنوری جس زمانے میں یہ مقدمہ لکھ رہے تھے اپنے دوستوں سے بھی اس کا ذکر کرتے تھے مولانا احتشام الدین نے بصراحت کہا کہ مرحوم نے علی گڑھ میں انہیں اس کا کٹا پھٹا مسودہ پڑھ کر سنایا تھا ان کے ماسوا ڈاکٹر سید محمود صاحب نے بھی اپنے مقدمہ دیوان غالب (نظامی ایڈیشن طبع سوم ۱۹۲۰ء) میں بجنوری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

اس نئے دور میں مغربی تعلیم نے ہندوستان میں ایک ایسا نوجوان پیدا کیا تھا جس نے مرزا غالب کی عظمت حقیقی معنوں میں پہچانی

---

[1] حال ہی میں ایک ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ یہ دیوان مولوی عبدالحق مرحوم نے سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم سے مرتب کرایا تھا ممکن ہے انجمن ترقی اردو پاکستان کے کتب خانے میں یہ اب بھی موجود ہو۔ [2] یہ مضمون مولوی عبدالحق مرحوم کی زندگی میں لکھا گیا تھا

تھی اور جو غالبؔ کے کلام کو ایسے حسن معانی کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کرنے والا تھا جس سے فلسفی اور صوفی، شاعر اور سائنسداں سب متحیّر رہ جاتے۔

"آہ، عبدالرحمٰن! عمر نے تیرے ساتھ وفا نہ کی، اور تو ملک اور قوم کی یہ عظیم الشان خدمت انجام نہ دے سکا۔

غالبؔ نے ایسے ہی موقعہ کے لئے اور شاید تیرے ہی واسطے یہ کہا ہو۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف   کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

یہ نوجوان فلسفی جو شاعرانہ تخیل سے بھی بہرہ ور تھا۔ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوان غالبؔ"

ان لفظوں سے مترشح ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ عبارت لکھتے وقت بجنوری کے تبصرہ لکھنے سے واقف تھے۔ موصوف نے یہ مقدمہ ۸ر اکتوبر ۱۹۱۹ء کو ختم کیا تھا اور اس تاریخ تک محاسن کلام غالب رسالہ اردو میں بھی شائع نہ ہوا تھا جو موصوف اسے مطبوعہ شکل میں پڑھ کر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے، اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ انہوں نے بھی اس تبصرے کا ذکر یا تو خود ہی بجنوری مرحوم سے سنا ہوگا، یا ان کے اور اپنے مشترک دوست کی زبانی جانا ہوگا چونکہ آخری پیراگراف میں "الہامی دو کتابیں ہیں" والی بات کو "کہا کرتا تھا" سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس مقدمے کے اہم حالات سے براہ راست واقفیت رکھتے تھے۔

چوتھا سوال۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ "جی ہاں" بجنوری نے اپنا تبصرہ صرف متداول دیوان غالبؔ ہی کو سامنے رکھ کر لکھا تھا۔

۱۔ پہلی دلیل تو وہ ہے جس . . . کی طرف پروفیسر احتشام صاحب نے ان لفظوں سے اشارہ کیا ہے کہ "ان کے مقدمے میں نسخۂ حمیدیہ کے مخصوص اشعار کے حوالے نہیں ملتے۔" واقعہ یہ ہے کہ بجنوری جیسا شخص تبصرہ لکھتے وقت نسخۂ حمیدیہ کو پا گیا ہوتا تو نا ممکن تھا کہ وہ مرزا صاحب کے منسوخ الہام کی فلک پیمائی پر زمین آسمان کے قلابے نہ ملا دیتا۔ لہٰذا قلمزد اشعار پر مقدمے میں ایک ادنیٰ سا اشارہ بھی نہ کرنا بتاتا ہے کہ وہ اس نسخے کی دستیابی سے پہلے اپنا تبصرہ مکمل کر چکے تھے۔ اور مفتی صاحب نے بجا لکھا ہے کہ۔

ممکن ہے کہ مرحوم اس تبصرے پر نظر ثانی کرتے، کیونکہ ابھی تک انہوں نے اسے ختم نہیں کیا تھا اور قرین قیاس ہے کہ اس میں کچھ رد بدل ہوتا کیونکہ جو کچھ لکھا گیا تھا وہ مروجہ اور مطبوعہ دیوان کے متعلق تھا۔ اور اب ایک سو برس کے قلمی دیوان میں غالبؔ کا غیر مطبوعہ اور قلمزد کلام مل جانے سے میدان سخن فراخ ہو گیا تھا۔ مقابلے کیلئے نئے نئے مضمون ہاتھ آ گئے تھے اور مرحوم کی نکتہ رس اور دقیقہ سنجی کیلئے نہایت وسیع جولانگاہ مہیا ہو گیا تھا" (ص ۲۹)

۲۔ دوسری دلیل جو اس بحث کو بالکل ختم کر دیتی ہے یہ ہے کہ بجنوری نے اپنے تبصرے میں دیوان غالبؔ کی غزلوں اور ان کے اشعار کی تعداد بتائی ہے۔ فرماتے ہیں:-

"غالب کا دیوان علاوہ قصائد و رباعیات ۱۰۵ غزلوں سے جن میں ایک ہزار چار سو چھپن اشعار ہیں، زیادہ نہیں۔ (صفحہ ۳۸)

یہ تصریح صرف نسخۂ حمیدیہ کے ساتھ شائع شدہ مقدمۂ بجنوری میں ہوتی تو شبہ کیا جا سکتا تھا کہ مفتی صاحب نے اپنی طرف سے اس کا اضافہ کر دیا ہے۔ لیکن حسنِ اتفاق سے یہ پوری عبارت **محاسن کلامِ غالب** مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۲۱ء کے صفحہ ۵ پر بھی موجود ہے چونکہ یہ تعداد نہ نسخۂ بھوپال کی غزلوں اور اُنکے اشعار کی ہے، نہ نسخۂ حمیدیہ کی غزلوں اور ان کے اشعار کی، بلکہ مرزا صاحب کے دیوان متداول کی غزلوں اور ان کے شعروں کی ہے، اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بجنوری نے اپنے تبصرے میں صرف دیوان متداول ہی کو استعمال کیا تھا۔ نیز انکے دلائل کے پیش نظر:۔

(۱) مولوی احتشام الدین دہلوی کا یہ بیان محل نظر قرار پائے گا" کہ یہ غلط ہے کہ بجنوری مرحوم نے یہ دیباچہ غالب کے نسخۂ دیوان معدوم کی دستیابی سے پہلے لکھا تھا۔ نہیں، بلکہ دستیاب ہونے پر ان کو مکمل کلام غالب کے شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا اور یہ مقدمہ اس ارادے کی پیروی میں لکھا گیا۔" اور

(۲) اس کے برخلاف مفتی صاحب کا بجنوری کے مذکورہ بالا بیان پر حاشیہ صحیح مانا جائے گا: "چونکہ یہ مقدمہ جدید قلمی نسخے کے ملنے سے پہلے لکھا جا چکا تھا، اس سبب سے اس تعداد میں صرف قدیم مطبوعہ دیوان کے شعر شمار کئے گئے ہیں (صفحہ ۳۸ کا حاشیہ ع۱)

پانچواں سوال:۔ جہاں تک مفتی کا تعلق ہے۔ انہوں نے کہیں اس کا اظہار نہیں کیا کہ نسخۂ بھوپال بجنوری کی زندگی میں دستیاب ہوا۔ بلکہ ان کی عبارتوں سے اس کے خلاف مترشح ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی یہ عبارتیں قابل غور ہیں

(۱) غالب کے انتقال کے پورے پچاس برس بعد اس صحیفے کو دنیا میں رونما کیا جو پوری ایک صدی سے گوشۂ خفا میں پڑا ہوا تھا اور جس کے وجود کا کسی کو سان و گمان بھی نہ تھا۔ (تمہید ص۲)

(۲) اب ایک سو برس کے قلمی دیوان میں غالب کا غیر مطبوعہ اور قلمزدہ کلام مل جانے سے میدانِ سخن فراخ ہو گیا تھا۔ تمہید ص۲۹

غالب کا انتقال ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ہوا تھا ان کے انتقال کے پورے پچاس برس بعد نسخۂ بھوپال کے نکلنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ۱۵ فروری ۱۹۱۹ء کے لگ بھگ یہ نسخۂ دستیاب ہوا تھا اور ایک صدی تک گوشۂ خفا میں پڑے رہنے کے بعد دیوان کے منظر عام پر آنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ اپنی تاریخ کتابت یکم نومبر ۱۸۲۱ کے سو برس بعد یعنی نومبر ۱۹۲۱ء میں دستیاب ہوا تھا۔

ان دونوں تاریخوں کے تضاد کے باوجود یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ کم از کم فروری ۱۹۱۹ء سے پہلے دیوان نہیں ملا تھا چونکہ بجنوری مرحوم نے معارف ماہ نومبر ۱۹۱۸ء کے شذرات کے مطابق[1]، نومبر ۱۹۱۸ کو بھوپال میں انتقال کیا تھا۔ اس لئے اس سے یہ بھی ترشح ہو گیا کہ ان کے انتقال کے بعد یہ نسخہ ملا تھا۔ لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے اوّلاً اس لئے کہ مولوی عبدالحق صاحب نے صراحت کی ہے کہ نہ صرف بجنوری کی حیات میں یہ نسخہ مل چکا تھا۔ بلکہ انہوں نے انجمن کیلئے اس پر کام بھی شروع کر دیا تھا۔ دوسرے اس بنا پر کہ

---

[1] یہ دونوں اطلاعات مختار الدین احمد صاحب آرزو کے بہم پہنچا فرمائی ہیں ۔

کہ معارف ستمبر ۱۹۴۸ء کے شذرات میں اس نسخے کے ذکر کے ساتھ یہ اطلاع بھی دی گئی ہے[۲] کہ آج کل یہ بجنوری کے زیر مطالعہ ہے۔ عنقریب تالیف مکمل منظر عام پر آنے والے ہیں۔

ان شہادتوں کے بعد کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ اس دعوی کی صحت میں کہ نسخہ بھوپال بجنوری کی زندگی میں نکل آیا تھا اور انہوں نے اس پر کام بھی شروع کر دیا تھا۔

چھٹا سوال:۔ مذکورہ بالا بیان سے اس سوال کا جواب بھی بآسانی دیا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بجنوری نے اس نسخے پر کام شروع کر دیا تھا مگر ان کی موت نے اسے ناتمام رکھا۔

ساتواں سوال:۔ چونکہ مولوی عبدالحق صاحب اور سید سلیمان ندوی صاحب دونوں نے ان کے کام کی نوعیت پر مطلق روشنی نہیں ڈالی۔ اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے متن کی ترتیب کا کیا ڈول رکھا تھا۔ ممکن ہے مفتی صاحب نے جس طرح مرتب کیا ہے یہی ان کا نقشہ ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اور طرح پر کام کرنا چاہتے ہوں، اور ان کا کیا ہوا کام ضائع ہو گیا ہو۔

یہاں سوئے ظن سے کام لینے والا کہہ سکتا ہے کہ مفتی صاحب نے جو کام اپنے نام سے شائع کیا ہے یہ سب یا اس کا بڑا حصہ بجنوری کا انجام دیا ہوا تھا۔ لیکن پہلے تو انھوں نے بجنوری کا تذکرہ جس محبت اور افسوس کے ساتھ کیا ہے اس کا تقاضہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ ان کے کام کو چھپا جاتے۔ دوسرے نواب حمید اللہ خاں کے تعلقات بجنوری سے بہت گہرے تھے، وہ خود انھیں اس دیوان سے بھی دلچسپی تھی، چنانچہ ان کا پیش لفظ بھی دیوان کے شروع میں موجود ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ بجنوری کے کام سے جو بھوپال ہی میں کیا جا رہا تھا، وہ ناواقف رہتے اور یہ بھی ناممکن تھا کہ ان کے علم میں سب کچھ ہوتے ہوئے مفتی صاحب جرأت کر کے نواب صاحب کے دوست کے کام کو اپنا کہہ کر پیش کر دیتے۔ اس طرح یہ بھی ناقابل یقین ہے کہ اپنے پیش لفظ میں نواب صاحب ڈاکٹر بجنوری کے کام کی داد نہ دیتے۔

اِن باتوں کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیئے کہ مولوی عبدالحق صاحب کی فرمائش پر یہ کام ہو رہا تھا اس لیے ان کا اس کام کی تفصیل سے بھی واقف ہونا ضروری تھا۔ اگر یہ سب کام جو مفتی صاحب نے شائع کیا ہے بجنوری کا ہوتا تو ناممکن تھا کہ مولوی صاحب خاموش رہ جاتے اور مفتی صاحب کا پردہ چاک نہ کر دیتے۔

---

[۲] یہ دونوں اطلاعات مختار الدین احمد صاحب آرزو نے مہیا فرمائی ہیں۔

غالب کی تضمین قدسی کی نعتیہ غزل پر ★

کیستم تا بخروش آورد م بے ادبی   قدسیاں پیش تو در موقف حاجت طلبی
رفتہ از خویش بدیں زمزمۂ زیر لبی   مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

اے کہ روئے تو دہد روشنی ایمانم   کافرم گر نکنم مہر میرش خوانم
صورت خویش کشید است مصور دانم   من بیدل بجمال تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

اے گل تازہ کہ زیب چمنی آدم را   باعث رابطۂ جان و تنی آدم را
کردہ دریوزۂ فیض تو غنی آدم را   نسبتے نیست بذات تو بنی آدم را
برتر از عالم و آدم تو چہ عالی نسبی

اے لبت را بسوئے خلق ز خالق پیغام   روح را لطف کلام تو کند شیریں کام
ابر فیضی کہ بود از اثر رحمت عام   نخل بستان مدینہ ز تو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بشیریں رطبی

وصف رخش تو اگر در دل ادراک گذشت   نہ ہمیں است کہ از دائرۂ خاک گذشت
ہمچو آں شعلہ کہ گرم از خس و خاشاک گذشت   شب معراج عروج تو ز افلاک گذشت
بمقامے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی

چہ کنم چارہ کہ پیوند بخجالت گسلم   من کہ جز چشمۂ حیواں نبود آب و گلم
من کہ چوں مہر درخشاں بدمد نور دلم   نسبت خود بسگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بسگ کوئے تو شد بے ادبی

دل ز غم مردہ و غم بردہ ز ما صبر و ثبات   ساریٔ کن و بنمائی بما راہ نجات
داد سوز جگر ما کہ دہد نیل و فرات؟   ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آب حیات
رحم فرما کہ ز حد می گزرد تشنہ لبی

غالب غمزدہ را نیست دریں غمزدگی   جز بامید ولائے تو تمنائے بہی
از تب و تاب دل سوختہ غافل نشوی   سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پے درماں طلبی

محمد عالم مختار حق

دیوانِ غالب کے مختلف ایڈیشن

دیوانِ غالب کے جو ایڈیشن غالب مرحوم کی زندگی میں شائع ہوئے ان کی پانچ اشاعتوں کا سراغ محققین نے لگایا ہے جن کی کیفیت مختصراً درج ذیل ہے۔

۱۔ سید المطابع۔ دہلی، ۱۲۵۷ھ = ۱۸۴۱ء

۲۔ مطبع دار السلام۔ دہلی ۱۲۶۳ھ = ۱۸۴۷ء

۳۔ مطبع احمدی۔ دہلی ۱۲۷۸ھ = ۱۸۶۱ء

۴۔ مطبع نظامی۔ کانپور ۱۲۷۸ھ = ۱۸۶۲ء

۵۔ مطبع مفید خلائق آگرہ ۱۲۸۰ھ = ۱۸۶۳ء

غالب کی وفات ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ہوئی اور ان کے دیوان کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۱ء میں چھپا۔ اس لحاظ سے ان کی وفات تک ۲۸ برسوں میں صرف پانچ مرتبہ دیوان زیور طبع سے آراستہ ہو سکا۔ آج ان کی وفات کو ایک سو برس پورے ہوتے ہیں۔ اس مدت میں غالب پر جتنا کام ہوا وہ اردو کے کسی دوسرے ادیب اور شاعر کو نصیب نہ ہو سکا۔ والہ حیدرآبادی نے اردو دیوانِ غالب کی شرح سب سے پہلے لکھی جس کا نام "وثوق صراحت" (مطبوعہ، ۱۸۹۰ء) ہے۔ اس کے بعد سے لے کر اب تک بیسیوں شرحیں لکھی جا چکی ہیں جن میں قابل ذکر شارحین کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

حسرت موہانی، شوکت میرٹھی، آغا باقر، سہا مجددی، بیخود دہلوی، نظم طباطبائی، نظامی بدایونی، جوش ملیسانی، عبد الباری آسی، یوسف سلیم چشتی، سعید، شہاب الدین مصطفیٰ اور عبد الرشید علوی، بعض نے آسان اور سریع الفہم اشعار سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف پیچیدہ اشعار کو شرح کے لئے منتخب کیا، جیسے نیاز فتحپوری، بیخود موہانی اور ماثر لکھنوی وغیرہ

جہاں تک دیوان کی طباعت کا تعلق ہے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے تمام شعرا کے دواوین، کلیات اور مجموعہ ہائے کلام میں سب سے زیادہ قبولیت اور اشاعت دیوانِ غالب کے حصّہ میں آئی۔ پاک و ہند میں شاید ہی کوئی ایسا گھرانا ہو جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہو اور وہاں دیوانِ غالب موجود نہ ہو۔ عوام اور خواص دونوں طبقے کلام غالب سے حد درجہ متاثر ہوئے یہاں تک کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن مرحوم بجنوری نے ہندوستان کی صرف دو الہامی کتابیں قرار دیں۔ ایک مقدس وید اور دوسری "دیوان غالب"۔ اس سے لگاؤ اور عقیدت کا تقاضا ہی تھا کہ گزشتہ صدی میں سیکڑوں ایڈیشن نکلے اور ہزاروں کی تعداد میں اس کی طباعت ہوئی۔ پاک و ہند کے ناشر شہیر منشی نولکشور نے جہاں کم سے کم قیمت رکھ کر اس کی اشاعت میں فراخ دلی و حوصلگی کا ثبوت دیا وہاں دیگر ناشرین نے بھی حسب استطاعت اس کی اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور دیوان کے اس قدر اچھے بُرے، سادہ و مصور، صحیح و غلط، گراں و ارزاں، خورد و کلاں نسخے شائع کئے کہ ان کا حصر مشکل ہے، ان میں سے بعض ایسے دیدہ زیب، پُر تکلف، مصور اور نفاست کے مرقع ہیں کہ انھیں دنیا کی بعض کتابوں کی اعلیٰ طباعتوں کے مقابلے میں فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ جیسے مرقع چغتائی، سردار جعفری کا ہندی اردو والا اڈیشن، برلن ایڈیشن اور تاج کمپنی ایڈیشن بقول مظفر علی سید صاحب "دیوان غالب کو دلہن کی طرح سجا کر شائع کرنا پاک و ہند کے اردو ناشروں کی روایت بن چکا ہے" غالب کے قدر دانوں اور مداحوں نے مرزا سے عقیدت مندی کے جوش میں اعلیٰ سے اعلیٰ ایڈیشن کبھی گراں سے گراں تر قیمت میں خریدنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ ایسے ایڈیشن بازار میں آتے ہی عنقا ہو گئے اور اب کسی بھی قیمت پر دستیاب نہیں ہوتے۔

مقالہ ہذا میں ان عام اشاعتوں کی فہرست مرتب کرنا مطلوب نہیں بلکہ ارباب ذوق کو ان اہم ایڈیشنوں سے متعارف کرانا مقصود ہے جو اپنی اپنی جگہ الگ اہمیت اور منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ جیسے نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ نظامی، طاہر ایڈیشن، نسخۂ عرشی مالک رام، سردار جعفری، مولینا غلام رسول مہر اور پرتھوی چندر وغیرہ۔

دیوان غالب کی مزید خاص طباعتوں کا بھی علم ہوا جیسے نسخۂ بیدل (شاہ جہانپوری)، اجمل خاں، مرغوب ایجنسی وغیرہ ـــــــــــ مگر میں اپنی سعی و تلاش کے باوجود ان تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔ ادھر وقت کی کمی بھی مزید تگ و دو کرنے میں قدم قدم پر دامن کشاں رہی۔ جہاں تک لائبریریوں سے استفادہ کا تعلق ہے میں نے پبلک لائبریریوں لاہور اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری بھی کھنگالیں مگر سوائے بھرتی کے دو چار ایڈیشنوں کے کسی نادر یا اہم نسخہ کی موجودگی کا علم نہ ہو سکا یہی لاہور کی مشہور ترین لائبریریاں ہیں۔ البتہ اس بات پر مفتخر ہوں کہ مجھے محترمی و مکرمی جناب مولانا غلام رسول صاحب مہر مدظلہ کی رفاقت بفضل اللہ حاصل ہے اور یہ درحقیقت "ذرہ خاکم دلے با مہر دارم دوستی" ہی کا صدقہ ہے کہ آپ کی ذاتی لائبریری ایسی مایوس کن فضا میں بھی میرے لئے خضر راہ ثابت ہوئی اور میں اپنے مضمون کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامران ہوا۔ خوانندگان کرام پر واضح رہے کہ اگر اس مقالہ کے مطالعہ سے ان کی معلومات میں اضافہ ہو تو اس کے لئے شکریہ کے مستحق براہ راست مولانا مہر صاحب ہیں۔ ہاں قارئین کرام کی نظر اگر کسی خامی پر پڑے تو اسے میرے اخذ و استنباط کی کمی پر محمول فرماتے ہوئے وَالعَافِینَ عَنِ النَّاس کا ثبوت فراہم فرمائیں

اب ان مختصر تمہیدی جملوں کے بعد آیئے اور دیوانِ غالب کی داستانِ طباعت سماعت فرمایئے۔ بسم اللہ مجریہا

۱۸۸۷ء (۱۳۰۴ھ)

دیوانِ غالب اردو

ناشر:۔ منشی نولکشور

پریس:۔ مطبع منشی نولکشور۔ کانپور۔ پریس

ضخامت:۔ ۱۰۴ صفحات

اس ایڈیشن کا ذکر سرِ فہرست اس لئے کرنا پڑا کہ یہ ناشرِ مشہور منشی نولکشور کے مطبع کانپور کا پہلا ایڈیشن ہے۔ اس میں مرزا غالب کا فارسی دیباچہ بھی شامل ہے۔ غزلوں پر نمبر لگائے گئے ہیں جو ۲۳۷ تک پہنچتے ہیں۔ اس کے بعد قصائد، پھر قطعات و رباعیات شامل کی گئی ہیں۔ آخر میں منشی بھگوان دیال عامل ایجنٹ مطبع منشی نولکشور کے دو قطعات تاریخ درج ہیں جن سے تاریخ ۱۳۰۴ھ برآمد ہوتی ہے۔ دونوں قطعات کے مادہ ہائے تاریخ یہ ہیں۔

۱۔ دلربا ہیں نکلے ۲۔ "نقیں دیوانِ غالب" آمد

۱۳۰۴ھ ۱۳۰۴ھ

دیوانِ سفید کاغذ پر چھاپا گیا ہے۔ کتابت و طباعت دونوں گوارا ہیں۔ جیسا کہ تمہید میں عرض کیا جاچکا ہے مطبع نولکشور کے بے شمار ایڈیشنوں کا حساب ممکن نہیں۔

۱۹۱۹ء

دیوانِ غالب (پاکٹ اڈیشن)

مرتبہ:۔ خان بہادر شیخ عبدالقادر۔ بیرسٹر ایٹ لا

ناشر:۔ مرتب

پریس:۔ گلزار محمدی اسٹیم پریس۔ لاہور

ضخامت:۔ ۳۵۲ صفحات

دیباچے کے چھ صفحات طباعت دیوان کی سرگزشت کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔ پھر سولہ صفحات تک "غالب دہلوی" کے عنوان سے سوانحِ حیات قلمبند کئے گئے ہیں۔ سرگزشت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں شیخ صاحب دہلی میں تھے۔ دیوانِ غالب کا ایک نسخہ درست کر کے علی گڑھ میں منشی علی محمد خوشنویس کو کتابت کے لئے بھیج دیا۔ ساتھ ہی فرمائش کر دی کہ اسے اپنے اہتمام میں علی گڑھ ہی میں چھپوائیں۔ نصف سے زیادہ حصّہ وہاں چھپ چکا تھا کہ بعض ایسے موانع پیش آئے جن کی وجہ سے آئندہ کتابت اور طباعت رک گئی۔ شیخ صاحب دہلی سے لاہور منتقل ہو گئے۔ پھر انھیں لائل پور میں سرکاری وکیل مقرر کر دیا گیا لہٰذا یہ کام ادھورا پڑا رہا تاآنکہ انھوں نے اپنے ایک عزیز کی معاونت سے باقی حصّہ کی کتابت و طباعت مکمل کی۔ دیوان پر ایک سرسری نظر

ڈالیں تو کتابت، طباعت اور کاغذ کے واضح فرق سے بھی نمایاں رہتا ہے کہ دیوان دو جگہ لکھا اور چھاپا گیا۔ دیوان کے صفحہ اول پر مرزا غالب مرحوم مغفور کی ایک صحیح اور مستند عکسی تصویر بھی جو لالہ سری رام مؤلف "خمخانۂ جاوید" کے عم بزرگوار رائے بہادر پیارے لال کو غالب نے عطا کی تھی اور لالہ صاحب کے توسط سے شیخ صاحب کو حاصل ہوئی۔ یہ غالباً مرزا کی پہلی تصویر ہے جو کیمرے کے ذریعے سے لی گئی۔ اس کے نیچے خط شکستہ میں یہ شعر تحریر ہے

غالبؔ نام آورم نام و نشانم مپرس
ہم اسد اللّہیم و ہم اسد اللّہیم

۱۹۲۱

دیوان غالب جدید، معروف بہ نسخۂ حمیدیہ

مقدمہ :- جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن مرحوم بجنوری

مرتبہ :- مفتی محمد انوار الحق ایم اے، ڈائریکٹر تعلیمات ریاست بھوپال فرزند ارجمند مولانا مفتی عبداللہ ٹونکی

سرنامہ :- نوابزادہ کرنل محمد حمید اللہ خاں صاحب چیف سیکرٹری ریاست بھوپال جن کے اسم گرامی سے یہ نسخہ منسوب ہے۔

پریس :- مفید عام اسٹیم پریس، آگرہ

ضخامت :- ۳۴۲ صفحات

سرنامے میں غالب کے اس ابتدائی کلام کو اہل وطن کی خدمت میں پیش کرنے پر فخر کا اظہار کیا گیا ہے پھر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا وہ معروف و مشہور اور مبسوط مقدمہ ہے جس میں غالب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے اور دیوان غالب کو الہامی کتاب کہہ کر خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے (اس مقدمہ کو اس زمانے میں انجمن ترقی اردو نے "محاسن کلام غالب" کے نام سے الگ کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا) دیباچے میں کہا گیا ہے کہ غالب نے اپنے احباب کے مشورے سے اپنے کلام کا بہت سا حصہ قلمزد کر دیا تھا جبکہ محترم مولانا مہر صاحب کے خیال کے مطابق مرزا نے تمیز رنگ دبا ہونے کے بعد خود ہی شعروں کا انتخاب کیا اور اس میں کسی کے مشورہ کو دخل نہیں۔ خوش قسمتی سے اصل دیوان کا ایک نسخہ کتب خانہ حمیدیہ بھوپال میں محفوظ رہ گیا جو ۱۲۳۷ھ میں نواب غوث محمد خاں کے صاحبزادے میاں فوجدار محمد خاں کے لئے لکھا گیا۔ مروجہ دیوان میں جتنی کچھ بھی غزلیں ہیں وہ سب اس نسخہ میں مکمل موجود ہیں اور جو اشعار متفرق طور پر تلاش کر کے دیوان میں بڑھائے گئے تھے وہ بھی سب کے سب اس میں پائے جاتے ہیں۔ ناشر نے اس نسخہ کو جا بجا اصلاحوں اور حواشی پر نئے کلام کے اضافوں کی بنا پر غالب کے مطالعہ میں رہنے پر بھی استدلال کیا ہے۔ تمہید میں ایک مقام پر ردیف وار قلمی اور مطبوعہ دیوانوں کی غزلوں اور شعروں کی تعداد کا ایک نقشہ پیش کیا ہے جس میں دکھایا ہے کہ قلمی دیوان میں غزلیات و اشعار کی تعداد علی الترتیب ۲۷۵، ۱۸۸۳ ہے جب کہ مطبوعہ دیوان

یہی تعداد بالترتیب ۲۳۰، ۱۴۰۰ ہے۔ ابتدا فارسی قصیدہ سے ہوتی ہے جسے تبرکاً شامل دیوان رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد تین قصیدے اردو کے ہیں۔ ترتیب میں جن امور کو مدنظر رکھا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ متن میں اول قلمی نسخہ کی غزل بجنسہٖ نقل کر دی ہے اور اس میں جو شعر مروجہ دیوان میں موجود ہیں ان کے ساتھ "م" لکھ دیا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ اشعار دونوں نسخوں میں مشترک ہیں۔

۲۔ پھر جو قلمی شعر دیوان کی کتابت (۱۲۳۷ھ) کے بعد کہے گئے اور اب مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں ان کو لکھا گیا ہے۔

۳۔ جن مصرعوں میں کوئی خفیف سی لفظی ترمیم ہوئی ہے وہاں ان مصرعوں کو اوپر نیچے لکھ کر سامنے ایک قوس میں دوسرا مصرعہ لکھ دیا ہے۔ اس التزام کے ساتھ کہ اوپر کا مصرعہ قلمی دیوان کا اور نیچے کا مروجہ دیوان کا۔

۴۔ ہر طرح غزلوں کے بعد اس ردیف کی قلمی نسخہ کی وہ غزلیں لکھ دی گئی ہیں جو بالکل نئی ہیں یعنی جن کا کوئی شعر مروجہ دیوان میں موجود نہیں۔

۵۔ پھر مروجہ دیوان کی وہ غزلیں جو ۱۲۳۷ھ کے بعد بڑھائی گئیں اور جن کا کوئی شعر قلمی نسخہ میں موجود نہیں۔

یہ کلام غالب کی بالکل اوائل عمر کا کہا ہوا ہے یعنی جب یہ نسخہ لکھا گیا اس وقت غالب کی عمر صرف پچیس سال کی تھی (کچھ کلام پچیس برس کی عمر کے بعد کا بھی اس میں شامل ہے جس پر بحث کا یہ مناسب مقام نہیں) اس کلام کی بجنسہٖ اشاعت ایک ادبی خدمت اور قومی فریضہ جان کر کی گئی ہے۔ غالب کی شاعری کے ارتقائی مدارج کے سراغ کے لئے اس نسخے کو پیش نظر رکھے بغیر کماحقہ آگاہ نہیں ہو سکتے۔

دیوان میں مرزا غالب کی وہ شبیہ بھی شامل کی گئی ہے جس میں مرزا غالبؔ قصیدہ پڑھتے ہوئے دکھائے گئے ہیں یہ تصویر غالباً لال قلعہ دہلی سے حاصل کی گئی۔

۱۹۲۳ء

دیوانِ غالبؔ

(سلسلۂ آصفیہ نمبر ۱)

مرتبہ:۔ نظامی بدایونی (نظام الدین حسین نظامی)

ناشر:۔ نظامی پریس بدایوں

پریس:۔ نظامی پریس بدایوں

ضخامت:۔ ۱۴۰ صفحات

ابتدا میں مرزا غالبؔ کی خود نوشتہ سوانح عمری مرزا کے مکتوبات اور دیگر تحریرات سے منتخب کر کے نہایت سلیقہ مندی سے ترتیب دی گئی ہے۔ آخر میں مشکل الفاظ کی ایک فرہنگ بھی طلبہ اور عام قارئین کے استفادہ کے لئے اضافہ کی گئی ہے۔ ابتدا میں

میں غالب کے ایک خط کا عکس اور مرزا کی تصویر کی شمولیت کا ذکر کیا گیا ہے مگر ہمارے پیش نظر پنجاب پبلک لائبریری کا جو نسخہ ہے (۵۱۱،۴۴ ھ) اس میں سے غالب کی تصویر غائب کر دی گئی ہے اور نسخہ کی حالت بھی بڑی قابل رحم ہے۔ دیباچے کے پڑھنے سے مترشح ہوتا ہے کہ نظامی نے پہلی مرتبہ ۱۹۱۵ء میں دیوان غالب کو سر راس مسعود کی تحریک پر خاص اہتمام سے بھرپور صحت اور نفیس کاغذ پر ۲۰×۲۶/۸ کی بالکل نئی تقطیع پر چھاپنے کی جدت کی۔ پھر ۱۹۱۸ء اور ۲۱-۱۹۲۰ء میں دیوان کو شرح کے ساتھ شائع کیا۔

متن غالب، رامپور کے قلمی نسخہ سے مقابلہ کرنے کے بعد پیش کیا گیا۔ تیسرے اڈیشن میں ڈاکٹر سید محمود (پٹنہ) کا طویل فاضلانہ مقدمہ شامل ہے

ترتیب غزل وار ترتیب دی گئی ہے نہ کہ بلحاظ حروف تہجی

۱۹۲۵ء (۱۳۴۳)

دیوان غالب (ٹائپ)

بفرمائش مرزا عبدالغفار خاں افغانی

ناشر، مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

پریس و شرکت کاویانی، برلن (جرمنی)

ضخامت و ۲۷۶ صفحات

غالب کا دیباچہ بزبان فارسی اس دیوان میں شامل رکھا گیا ہے، ہر صنف سخن یعنی غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، سہرہ، مثنوی وغیرہ کے آخر میں تین تین ستارے ختم کلام کی علامت کے طور پر بنائے گئے ہیں۔

• ـ تخلص کے لئے بالالتزام سرخ روشنائی استعمال کی گئی ہے۔

• ـ یائے معروف اور مجہول کی ایک ہی شکل ہے (ی)، رکھی گئی ہے البتہ دونوں میں تمیز کے لئے یائے معروف کے نیچے دو نقطے استعمال کئے گئے ہیں۔

آخر میں چند صفحے "بیاض" لکھ کر سادہ چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ شاید اس لئے کہ شائقین وقتاً فوقتاً غالب کے معلوم ہونے والے کلام کا اضافہ کرتے رہیں۔ جیسے ہمارے محترم حاجی دین محمد صاحب (الکرم، مکان ۵۶ کوٹ عبداللہ شاہ، مزنگ لاہور) کے مملوکہ نسخہ پر غالب کا غیر مطبوعہ کلام "تکیہ" درج ہے جس کا مطلع ہے ؎

شب فراق میں مونس گیا ہے بن تکیہ ہوا ہے موجب آرام جان و تن تکیہ

(نسخہ عرشی میں فراق کی جگہ وصال ہے)

حاجی صاحب کو غالب کا یہ کلام ۱۹۳۵ء میں منشی عبدالرحیم ہوشیارپوری نے عنایت فرمایا تھا۔

• ـ شروع میں غالب کی ایک رنگین تصویر (نسخہ نظامی) دی گئی ہے۔

• ـ تمام دیوان کو سرخ روشنائی کے خوبصورت حاشیہ سے مزین کیا گیا ہے۔

• ــ اتنا صاف ستھرا ٹائپ ہونے کے باوجود مطالعہ تکلف سے خالی نہیں۔
• ــ دیوان پرخوبصورت سنہری بیلدار جلد ہے جس کی حفاظت کے لئے گتے کے ڈبے کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔

۳۷-۱۹۳۶ء (۱۳۵۵ھ)

دیوانِ غالب (عکسی ایڈیشن)

مرتبہ :- آغا محمد طاہر نبیرۂ مولانا محمد حسین آزادؔ

ناشر - آزاد بک ڈپو کوچہ چیلاں - دہلی

پریس - لیبل آرٹ پریس - دہلی

ضخامت - ۱۲۷ صفحات -

دیباچہ میں کہا گیا ہے کہ مرزا غالب کے اردو کلام کا مجموعہ کافی ضخیم تھا جو احباب کے مشورے سے انتخاب ہو کر شائع ہوا۔ انتخاب کرنے والوں میں مرتب دیوان کے پرنانا سید ذوالفقار الدین حیدر موسوی المعروف نواب حسین مرزا صاحب ناظر قلعہ معلی بھی شامل تھے انھوں نے منتخب کلام کا ایک صحیح نسخہ اپنے قلم سے لکھ کر مرزا کو دیا تھا۔ مرزا نے پڑھ کر دستخط اور مہر سے مزین کر کے بطور یادگار جناب مرزا کو واپس کر دیا تھا۔ یہ دیوان اسی نسخہ کو مدنظر رکھ کر درست کر کے شائع کیا گیا ہے۔ بقول مرتب مروجہ دیوان میں بار بار چھپتے چھپتے بہت کچھ تبدیلیاں ہو گئی ہیں اور اکثر اشعار چھوٹ گئے ہیں مگر یہ بہت مکمل اور مستند نسخہ ہے۔" حالانکہ حقائق کی بنا پر اس داستان کے لئے کوئی بھی قابل توجہ وجہ نہیں ملتی۔ ابتدا میں مرزا غالب کے مختصر حالات زندگی قلمبند کئے گئے ہیں۔ آخر میں قلمی دیوان کے آخری صفحہ کا عکس دیا گیا ہے جس پر غالب کے دستخط اور مہر ثبت ہے۔ نسخہ نظامی والی تصویر غالب اور مرقد غالب کا فوٹو بھی شامل دیوان ہیں۔

۱۹۳۷ء (بحوالہ روزنامہ امروز مورخہ ۳۰ ۱۲/۶۸)

دیوانِ غالب (مصور)

مرقع چغتائی۔

مرتبہ - محمد عبدالرحمٰن چغتائی

ناشر - جہانگیر بک کلب چابک سواراں - لاہور

پریس - اورینٹل آرٹ پرنٹنگ ورکس - لاہور

تعارف - ڈاکٹر جے ایچ کزنز ڈی لٹ (Dr. James H. Cousins. D.Litt) } بزبان انگریزی

پیش لفظ :- ڈاکٹر سر محمد اقبال

ضخامت : ۱۱۸ صفحات (صفحات نمبر ندارد)

کتاب کا افتتاح تبرکاً "حدیث نبوی " قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انما الاعمال بالنیات" سے کیا ہے۔ دوسرا صفحہ نواب میر عثمان علی

بہادر آصف جاہ سابع خسرو دکن سے انتساب کے لیے مخصوص ہے۔ اگلے صفحہ پر چغتائی صاحب کے قلم سے مختصر سی تقریظ ہے جس میں بیان کیا ہے کہ یہ مرقع شائع کرنے سے میرا مقصد محض اس ایشیائی تہذیب کی روح کو قالب پذیر کرنا ہے جس کا بہترین علمبردار خود مرزا غالب تھا۔ امید کرتا ہوں کہ اس مرقع کی اشاعت ان نقوش کو جو اب مدہم پڑتے جاتے ہیں، ایک نئی زندگی دینے میں مدد دے گی۔

اس سے آئندہ صفحے سے "سخنہائے گفتنی" کے عنوان سے اپنی تصنیف "فنون اور جمالیات" کے طویل اقتباسات دیئے ہیں۔ "سخنہائے گفتنی" میں فن مصوری کے تاریخی ارتقا پر سیر حاصل بحث کی ہے اور مختلف ممالک میں اس فن کے نشو و نما اور ارتقا پر وہاں کے مخصوص حالات کے اثرات کا تجزیہ اور برصغیر پاک و ہند میں فن مصوری کے زوال اور پھر مغلوں کے عہد میں اس فن کے احیاء کی سرگزشت بیان کرنے کے بعد دیگر ممالک میں اس فن کی کوششوں کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

راقم الحروف کی معلومات اس فن کے متعلق چونکہ صفر کے برابر ہیں لہٰذا خاتمہ پر مصور ہی کے الفاظ کو دہرا کر اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کرتا ہوں" محاسن کا معیار در اصل جگر مصور ہی کی شخصیت ہے۔ تصویر ظاہری منظر کی شبیہہ نہیں بلکہ مصور کے اپنے ذہن کی ترجمان ہوتی ہے اور مصور خود وادیٔ جنوں کے پر پیچ راستوں میں سے قیس عامری کی طرح جیب و دامن کی آلائشوں کو دور کرتا ہوا آپ ہی تن تنہا منزل کی طرف جا رہا ہوتا ہے۔ اُف لیلیٰ کیسی عمیق نظر نقاد تھی کہ اس نے قیس کو مجنوں کے جامہ میں پہچان لیا اور اپنے آپ کو اس وحشت کے اٹھائے ہوئے غبار میں گم کر دیا۔

دم چیست؟ پیام است، شنیدی؟ نشنیدی
در خاک تو یک جلوۂ عام است ندیدی
دیدن دگر آموز، شنیدن دگر آموز"

بقول شخصے دیوان غالب کی اس سے بہتر شرح ممکن نہ تھی۔ رنگوں اور خطوط کے ذریعے چغتائی نے غالب کے خیالات اور طرز فکر کی ترجمانی کی ہے۔

مروجہ دیوان کے خاتمے پر ایک انتخاب بھی ضم کر دیا گیا ہے۔ دیوان میں مشمولہ تصویروں کی کل تعداد ۳۳ ہے جن میں سے ۶ سادہ اور ۲۷ رنگین ہیں جو سب کی سب متن کے خاتمہ پر یکجا لگا دی گئی ہیں۔ ہر تصویر کے ساتھ ایک سادہ کاغذ لگایا گیا ہے جس کے سنٹر میں ایک پھول ہے اوپر انگریزی میں تصویر کا عنوان اور نیچے تصویر کے متعلق مصرعہ یا شعر دیا گیا ہے۔ مرقع کی جلد بڑی موزوں ہے جس پر سنہری حاشیہ لگایا گیا ہے اور درمیان میں ایک پھول سا بنا کر کتاب کا نام سنہری حروف میں ہی مرتسم کیا گیا ہے۔

دیوان غالب کو مصور کرنے کی یہ پہلی کوشش تھی جس میں مصور بدرجۂ اتم کامیاب ہوئے اور اس مرقع کے طفیل ان کا شمار پاک و ہند کے چوٹی کے مصوروں میں ہونے لگا۔

مرقع کی کتابت وغیرہ ۱۹۲۸ء میں مکمل ہو گئی تھی مگر تصویریں جرمنی میں چھپوانے کے سبب طباعت میں تاخیر ہو گئی۔

۱۹۳۸ء

(عکسی رنگین)

تاج کمپنی لمیٹڈ ۔ لاہور

تعارف ۔ عنایت اللہ ایڈ منیجنگ ایجنٹس تاج کمپنی لاہور

ضخامت ۔ ۳۱۲ صفحات ۔ سرورق ہشت رنگا

دیوان غالب کے یوں تو بیسیوں ایڈیشن ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں لیکن تاج کمپنی نے اس ایڈیشن کو اپنے مخصوص و انفرادی رنگ و انداز میں ایک عمل یادگار کے طور پر پیش کیا ہے۔ بقول ناشر غالب کی محبوبیت اور ہر دلعزیزی کے پیش نظر دیوان کو پوری صحت و خوشنمائی کے ساتھ چھ مختلف قسموں میں یک رنگا طباعت سے لے کر ہشت رنگا طباعت تک اور آرٹ پیپر سے لے کر بہترین پرنٹنگ پیپر تک نیز رنگین جلد سے لے کر اعلیٰ جلد تک کے نمونے موجود ہیں البتہ تقطیع دو قسم پر ہے کلاں و خورد

یہ دیوان جن امتیازی خصائص کی وجہ سے دوسروں سے متمیز ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں ۔

۱۔ دیوان کی صحت لفظی میں محنت و کاوش کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا ۔

۲ ۔ طباعتی دلآویزیاں پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش دسعی بروئے کار لائی گئی ہے ۔

۳ ۔ املائی قواعد و علامات کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے ۔

۴ ۔ خوشخطی کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے ۔

۵ ۔ طباعت صاف ستھرے اور عکسی رنگین بلاکوں سے عمل میں آئی ہے ۔

۶ ۔ بہترین ، چکنا اور سفید کاغذ استعمال میں لایا گیا ہے ۔

۷ ۔ موزوں تقطیع اور خوشنما جلد طبع مذکور کے ظاہری محاسن میں مزید اضافہ کا موجب بنی ہے

۸ ۔ تمام تر ان اشعار اور قطعات پر مشتمل ہے جو دواوین مروجہ میں نہیں پائے جاتے ۔

دیوان اتنا پیارا، دل افروز اور باصرہ نواز ہے کہ اسے چھوتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہاتھ لگانے سے میلا نہ ہو جائے ۔ دیوان غالب کے ایڈیشنوں میں حسن و جمال کے لحاظ سے یہ دیوان سَرّ الناظرین کی صحیح تفسیر پیش کرتا ہے ۔

۱۹۳۸

درس غالب

مرتبہ :۔ پیرزادہ ابراہیم حنیف

ناشر :۔ شیخ محمد علی پروپرائٹر مظفر بکڈپو ۔ اندرون لوہاری گیٹ لاہور ۔

پریس :۔ حجازی پریس ۔ لاہور

ضخامت :- ۲۰۰ صفحات

دیباچے میں گلہ کیا گیا ہے کہ رائج الوقت نسخوں کی بنیاد بالعموم کسی مستند اور صحیح ترین نسخہ پر نہیں ہے اس نقص کے باعث ایک ایسے مستند درسی طرز کے دیوانِ غالب کی ضرورت عام طور پر محسوس ہو رہی تھی جو زیادہ سے زیادہ وثوق کے ساتھ مرزا کے اصلی الفاظ سے روشناس کرا سکے۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر درسِ غالب کو مرتب کیا گیا ہے جس کے دو اہم ماخذ قرار دیئے گئے ہیں۔

۱۔ دیوان مطبوعہ ۱۸۴۷ء مطبع دارالسلام دہلی حوض قاضی (غالب کی زندگی میں چھپنے والے دیوان کا دوسرا ایڈیشن)

۲۔ بعد کے کلام کے لئے دوسرے عام مروج نسخوں سے بھی انتخاب کیا گیا ہے۔

بہرحال درسِ غالب مرزا کے قدیم و جدید اردو کلام کا مکمل مجموعہ ہے جس میں طلبہ اور اساتذہ کی سہولت کے پیشِ نظر۔

۱۔ ردیفوں کو درجہ وار حروف تہجی کے ماتحت منظم بنا دیا ہے اس طرح کہ ردیف "ا" کے تمام اشعار خواہ کسی صنف سخن کے ہوں یکجا جمع ہو گئے ہیں۔

۲۔ طرز کتابت میں سررشتۂ تعلیم کے سسٹم کو اپنایا گیا ہے یعنی جملہ ہائے معترضہ خطوط وحدانی میں لئے ہیں اور استفہام، تعجب حیرت، افسوس اور مسرت وغیرہ کے موقعوں پر مناسب علامات لگا دی گئی ہیں۔

۳۔ یائے معروف و مجہول کی کتابت میں امتیاز قائم کیا گیا ہے۔

۴۔ ترکیب وصفی، ترکیب اضافی، اعلام، دیگر صرفی نحوی ترکیبوں پر ترکیب وصفی و ترکیب اضافی کے نشانات لگا کر باقی مضمون سے متمیز کیا گیا ہے۔

۱۸۴۷ والا مطبوعہ دیوان نواب ضیاءالدین احمد نیر نے ۱۸۳۸ء میں مرتب و مدون کر لیا تھا گو طباعت ۱۸۴۷ء تک بوجوہ ملتوی رہی اور ۱۸۳۸ء ہی میں اس پر خاتمہ دیوان بھی تحریر کر دیا تھا۔ اس سن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے درسِ غالب صد سالہ یادگاری علمی ارمغان کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

۱۹۴۲

انتخابِ غالب (ٹائپ)

مرزا اسد اللہ خاں غالب

تصحیح : امتیاز علی عرشی

ناشر:۔ کتاب خانہ ریاست رامپور (یو۔پی)

پریس:۔ مطبعہ قیمہ ۲۹ شارع محمد علی بمبئی ۳

ضخامت:۔ ۳۴۴ صفحات

یہ انتخابِ غالب کے فارسی و اردو کلام پر مشتمل ہے جسے خود انھوں نے نواب کلب علی خاں بہادر، خلد آشیاں

والیِ رامپور کی فرمائش پر ۱۸۶۶ میں مرتب کیا۔ نواب صاحب نے اساتذۂ اردو و فارسی کے منتخب اشعار کی ایک بیاض ترتیب دینے کے سلسلے میں مرزا غالب سے اپنے کلام کا انتخاب بھیجنے کی فرمائش کی تھی جسے انھوں نے لبیک کہتے ہوئے پورا کر دیا۔ یہ کتاب اپنی معنویت کے علاوہ ظاہری حیثیت سے بھی حسن و نفاست کا مرقع ہے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس فن مذاق کے ساتھ آج تک اردو میں کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی (معارف) شروع میں تقریب ہے جسے بشیر حسین زیدی صاحب نے تلمبند کیا اور اس میں انتخاب غالب کو گوشۂ خمول سے منصۂ شہود پر لانے کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد مصحح نے اس انتخاب پر ایک عالمانہ و فاضلانہ دیباچہ رقم فرمایا ہے اور اس انتخاب کے بارے میں تمام جزئی تفصیلات مہیا فرما دی ہیں۔ اس میں انھوں نے ریختہ کی ایجاد و ترقی اور غالب کا اس میں حصہ اور انتخاب کلام پر بحث کی ہے جس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مرزا نے تمام اصناف سخن سے دامنِ انتخاب کو بھرا ہے اور فارسی اور اردو کے بالترتیب ۱۰۹۷ و ۸۴۸ شعروں کو انتخاب کیا ہے۔ بعد ازاں مرتب شہیر نے مرزا کی شاعری پر پُر مغز تبصرہ فرمایا ہے اور دیباچہ ختم کرتے کرتے فارسی و اردو کے ۴۲ شعروں کا ایک انتخاب خود بھی دے دیا ہے یہ اشعار ان کے خیال میں غالب سے انتخاب کے وقت نظرانداز ہو گئے تھے۔ پھر کتاب کا اصل متن شروع ہوتا ہے جس میں پہلے انتخابِ فارسی کو جگہ دی ہے اور بعد میں انتخابِ اردو کو، متن کے اختتام پر "شرحِ غالب" کے عنوان سے فارسی و اردو کلام کی غالب ہی کے کلام سے شرح پیش کی گئی ہے۔ پھر اختلافِ نسخ فارسی و اردو اور اشاریہ دے کر کتاب کو ختم کر دیا ہے۔ طباعت میں جو معدودے چند غلطیاں رہ گئی تھیں ان کی تصحیح کے لئے آخر میں ایک کاغذ چسپاں کر دیا گیا ہے۔

۱۹۵۰ء (بقول ناشر)

دیوانِ غالب (ٹائپ)

ناشر:۔ گوشۂ ادب چوک انارکلی۔ لاہور

پریس:۔ انشاء پریس اردو بازار۔ لاہور

ضخامت:۔ ۲۲۵ صفحات

دیوان کے ابتدا و انتہا میں ناشر کی طرف سے کسی قسم کی تحریر اضافہ نہیں کی گئی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ دیوان ہذا کی ترتیب میں کون سے عوامل کار فرما تھے۔ نظر بظاہر یہ عام مروجہ دیوان ہی کی ایک حسین پیشکش معلوم ہوتی ہے اور اس کا حسنِ طباعت اور دلفریب "گیٹ اَپ" ہی اس دیوان کو مخصوص ایڈیشنوں میں شامل کرنے کا موجب ہوا۔ کاش ناشرین سن طباعت اور محرکاتِ طباعت پر ایک مختصر سا نوٹ اس میں شامل کر دیتے تو اس کی تاریخی حیثیت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ گرد پوش پر نسخہ نظامی والی تصویرِ غالب طبع کی گئی ہے۔

۱۹۵۷ء

دیوانِ غالب

مرتبہ:۔ مالک رام

ناشر:۔ آزاد کتاب گھر۔ کلاں محل۔ دہلی

پریس:۔ یونین پرنٹنگ پریس۔ دہلی

ضخامت:۔ ۳۵۹ صفحات

مبسوط مقدمہ میں غالب کی شاعری کی ابتدا، دیوانِ غالب کی تدوین اور غالب کی زندگی میں طبع ہونے والے پانچ معلوم ایڈیشنوں کی داستانِ ترتیب پر تفصیلاً گفتگو کی گئی ہے۔ اپنے مرتبہ دیوان کی ترتیب کے سلسلے میں جن ماخذ کو بنیاد بنایا گیا ہے ان کا مختصر خاکہ درج ذیل ہے۔

۱۔ مطبع نظامی کانپور کا ایڈیشن جو غالب کی زندگی میں چوتھی بار ۱۸۶۲ء ۱۲۷۸ھ میں شائع ہوا۔

۲۔ غالب کی زندگی میں مطبع مفید الخلائق آگرہ سے ۱۸۶۳ء میں شائع ہونے والا پانچواں ایڈیشن۔

۳۔ انشائے غالب کا قلمی نسخہ

۴۔ اردوئے معلیٰ

۵۔ انتخاب غالب۔ مرتبہ عرشی رامپوری مطبوعہ ۱۹۴۳ء بمبئی

۶۔ دیوانِ غالب جدید۔ معروف بہ نسخہ حمیدیہ۔ بھوپال ۱۹۲۱ء

۷۔ نادراتِ غالب مرتبہ آفاق حسین آفاق دہلوی۔ کراچی ۱۹۴۹ء

۸۔ گلستانِ سخن۔ دہلی ۱۸۶۳ء

تتمہ میں غالب کا ایسا کلام جمع کیا گیا ہے جو ۱۸۶۲ء کے مطبع نظامی کانپور کے ایڈیشن میں شامل نہیں تھا مگر اس کے بعد مختلف ماخذ سے جمع ہوا۔ نسخہ حمیدیہ سے تقریباً تین سو شعروں کا ایک انتخاب بھی بطور ضمیمہ شامل کر دیا گیا ہے۔ البتہ ایسے اشعار سے جو مرزا نے بطور تفنن طبع بعض مواقع پر کہے تھے صرف نظر کی گئی ہے۔ حواشی میں اختلاف نسخ کی نشاندہی کی گئی ہے۔

غالب کے لکھے ہوئے فارسی دیباچہ دیوان کو شامل کیا گیا ہے۔

مرزا غالب کا عکس تحریر عطیہ رضا لائبریری رامپور بھی زیب دہ دیوان ہے۔

غالب کی قلعہ معلیٰ والی تصویر ابتدائے دیوان میں شامل کی گئی ہے۔

دیوان کی کتابت اور طباعت دونوں دیدہ زیب ہیں۔

بقول مدیر مجلہ "برہان" دیوانِ غالب کا کوئی ایڈیشن اس وقت تک اتنا صحیح، جامع اور معلومات افزا شائع نہیں ہوا۔

"۱۹۵۸"

دیوان غالب (کتاب نگر ایڈیشن)

مرتبہ:۔ پروفیسر سید احتشام حسین

ناشر:۔ کتاب نگر۔ دین دیال روڈ۔ لکھنؤ

پریس:۔ تنظیم پریس۔ لکھنؤ

ضخامت:۔ ۱۷۶ صفحات

"دوزِ در" پیش نامہ کا عنوان ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ دیوان پر تعارف لکھنے کا حق اچھے اچھے اداشناسانِ غالب ادا کر چکے ہیں اور اس "دریئے دل آرام" کو شاطگی کی حاجت نہیں ہے۔ اگر شاطگی ضروری ہو تو وہ اتنی ہی ہے کہ اسے صحت کے ساتھ حسین اور دلکش انداز میں شائع کیا جائے۔ یہ تسلیم کر لینے کے باوجود بھی مرتب نے ۸ صفحات پیش لفظ کی نذر کر دیئے ہیں اور غالب کے فن شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بتایا ہے کہ عمر کے درمیانی حصے میں غالب نے اردو کے بجائے فارسی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا اور پھر اردو کی جانب دوبارہ اس وقت متوجہ ہوئے جب انھیں بہادر شاہ ظفر کا قرب حاصل ہوا۔ پھر دیوان غالب کے بعض خاص ایڈیشنوں اور شروحِ کلام کے اسماگنانے کے بعد غالب شناسوں کا تعارف کرایا ہے۔

دیوانِ غالب کا یہ ایڈیشن مطبع نظامی کانپور کے تقریباً ایک صدی پرانے اس ایڈیشن (۱۸۶۲) پر مبنی ہے جس کی تصحیح خود غالب نے کی۔ یہ ایڈیشن انگوری رنگ کے کاغذ پر چھاپا گیا ہے جس کی کتابت اور طباعت دونوں گوارا ہیں۔

۱۹۵۸ء

دیوانِ غالب (ٹائپ)

ہندی و اردو میں

مرتبہ:۔ سردار جعفری

ناشر:۔ ہندوستانی بک ٹرسٹ ۳ ساے نانہ بلڈنگ بمبئی ۱۲ (ٹرسٹ کی اولین پیشکش)

پریس:۔ ادبی پرنٹنگ پریس بمبئی ۸

ضخامت:۔ ۴۷۱ صفحات

ابتداً مختصر طور پر غالب کے حالاتِ زندگی اس قدر تحریر ہیں۔

نام:۔ اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ

تخلص، اسد، غالب خطاب۔ نجم الدولہ دبیر الملک

پیدائش آگرہ، ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء وفات۔ دہلی ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء

مدفن :۔ خاندان لوہارو کا قبرستان، سلطان جی چونسٹھ کھمبہ۔ نظام الدین۔ دہلی

بعد ازیں طویل دیباچے کا آغاز ہوتا ہے جس کے ساتھ ساتھ ہی یعنی دائیں صفحہ پر ہندی میں ترجمہ چلتا ہے۔ اس طویل دیباچے میں مرتب نے غالب کے حالات زندگی نہایت تیکھے و دلکش انداز میں پیش کئے ہیں جو مرتب کی انفرادی حیثیت کی غمازی کرتے ہیں اس سے متبادر ہوتا ہے کہ غالب کی ذہانت، طباعی اور سخنوری کا ملکہ پیدائشی تھا۔ وہ مزاج کے لحاظ سے ایرانی، مذہبی عقائد کے لحاظ سے عربی اور تہذیب و تربیت کے لحاظ سے ہندوستانی تھا۔ جس کی عمر کا سب سے بڑا دانتہ افلاس قرار دیا ہے جس نے غالب کو ہمیشہ بے چین اور بے قرار رکھا۔

آگے چل کر بتایا ہے کہ زندگی نے غالب کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا اور ہمیشہ اس کی روح میں ریگزار ہی انڈیلے لیکن غالب کی روح نے زندگی کو لالہ زار بخشے۔ اس کی طبیعت کی یہ فیاضی اردو زبان وادب کو مالا مال کر گئی۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے غم اتنے دلآویز ہیں۔ ان میں جو بھرپور نشاط کی کیفیت ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملے گی وہ دراصل نشاط غم کا شاعر ہے یعنی وہ بلاؤں سے دست و گریباں ہو کر سامانِ عبرت حاصل کرتا ہے۔

مرتب نے غالب کے فنِ شاعری عنوانیانہ روش، تصورِ عشق اور سماجی ارتقاء کے تصور ایسے موضوعات پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اور اسے وحدت الوجود کا قائل بھی ثابت کیا ہے۔

بقول ڈاکٹر انصاری دیوان میں سردار جعفری کا شاعرانہ دیباچہ جس میں غالب سے متعلق ہر موضوع کو چھیڑا گیا ہے اور غالب کی شاعرانہ صفات کی بھرپور داد دی ہے، نہ ہوتا تو یہ ایڈیشن شوقیہ آرائش کی چیز تھی۔

پیش نظر ایڈیشن کے لئے مالک رام صاحب کے مرتب کئے ہوئے دیوان کو استعمال کیا ہے جس کا متن مطبع نظامی کانپور کے ایڈیشن ۱۸۶۲ء پر مبنی ہے اور جس کی تصحیح خود مرزا غالب نے کی تھی۔ البتہ مرتب نے اعراب کے سلسلے میں مالک رام صاحب سے کہیں کہیں اختلاف کیا ہے مگر ان کے مقرر کردہ علامات اوقاف کو بدستور برقرار رکھا ہے۔ اس کے علاوہ عام طور سے بول چال کے تلفظ کو اصل فارسی یا عربی تلفظ بھی لکھ دیا ہے اور آخر میں ناگری رسم الخط پر بحث کی گئی ہے جس میں ناگری لکھاوٹ کے نقائص، اصلاحات، اضافوں اور تبدیلیوں کی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ تاکہ ناگری لکھاوٹ اردو آوازوں کو ادا کرنے پر کما حقہ قادر ہو سکے۔

اس دیوان کی تہذیب اور اسے حسین وجمیل شکل میں پیش کرنے کی خدمت مس سیار نے انجام دی ہے مغنی صاحب نے غزلوں کو دیوناگری میں منتقل کیا ہے اور پریم سروپ شرما نے ہندی فرہنگ مرتب کرنے میں معاونت کی ہے۔ یہ فرہنگ الگ جلد میں ۸۲ صفحات پر شائع کیا گیا ہے۔

سارے دیوان میں طاق صفحہ پر متن اور جفت صفحہ پر ہندی ترجمہ دینے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ البتہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس اہتمام سے مستثنا رہی ہے۔ متن کے ابتدائی دو صفحے نہایت خوبصورت اور چہار رنگی بیل سے مزین ہیں۔ متن کے آخر میں ضمیمہ

اور ایک صفحہ لطور بیاض خالی رکھا گیا ہے۔ نستعلیق خط، کاغذ نفیس، حاشیہ کشادہ اور جلد پر سنہری ڈائی کتاب کی زیب و زینت میں اضافے کا سبب ہوئی ہے۔ سرورق اس کتاب کے موقلم کا شاہکار ہے جس نے مکاتیب غالب (رامپور پہلا ایڈیشن) کے سرورق کی نقل کی ہے۔

۱۹۵۸ء

دیوانِ غالب اردو (رامپور)

نسخۂ عرشی

ترتیب و تحشیہ: امتیاز علی خاں عرشی، ناظم رضا لائبریری رامپور

ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

مطبع: [illegible] پرنٹنگ ورکس، رامپور

ضخامت: [illegible] صفحات

تقریب ... [illegible] ... صاحب نے دیوان کا تذکرہ بلیغ الفاظ میں تعارف کرایا ہے۔ عرشی صاحب کو اس عظیم کارنامے پر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ عرشی صاحب کا دیباچہ ۱۲۰ صفحات کو محیط ہے جس میں انھوں نے دیوان کی ترتیب کے سلسلے کی تمام جزئیات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ ابتدا میں غالب کے حالاتِ زندگی اور شاعری پر بحث غالب ہی کے کلام نظم و نثر سے مرتب کی گئی ہے۔ اس ایڈیشن کی تیاری میں دیوان کے جن قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے مدد لی گئی ہے ان کی مختصر کیفیت بالترتیب یوں ہے۔

ا۔ قلمی نسخے

۱۔ نسخہ بھوپال ۱۸۲۱ء ۱۲۳۷ھ

۲۔ نسخہ شیرانی ۱۸۲۶ء ۱۲۴۲ھ

۳۔ گلِ رعنا (انتخاب) ۱۸۲۹ء ۱۲۴۵ھ

۴۔ نسخۂ رامپور ۱۸۳۳ء ۱۲۴۸ھ

۵۔ نسخۂ لاہور ۱۸۵۲ء ۱۲۶۸ھ

۶۔ نسخۂ رامپور جدید ۱۸۵۵ء ۱۲۷۱ھ

۷۔ انتخابِ غالب ۱۸۶۶ء ۱۲۸۳ھ

ب۔ مطبوعہ نسخے

۱۔ سید المطابع دہلی ۱۸۴۱ء ۱۲۵۷ھ

---

[1] ایک مصدقہ اطلاع کے مطابق مجلس ترقی ادب لاہور اس نسخے کو جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے مقدمے اور محترم گوہر نوشاہی صاحب کی ترتیب و حواشی کے ساتھ غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر بطور یادگار شائع کر رہی ہے۔

۲- مطبع دار السلام حوض قاضی دہلی	۱۸۴۷ء	۱۲۶۳ھ	
۳- مطبع احمدی۔ شاہدرہ دہلی	۱۸۶۱ء	۱۲۷۸ھ	
۴- مطبع نظامی کانپور	۱۸۶۲ء	[illegible]	
۵- مطبع مفید خلائق۔ آگرہ	۱۸۶۳ء	۱۲۸۰ھ	
۶- نسخہ حمیدیہ	۱۹۲۸ء	۱۳۴۷ھ	(طبع ۱۹۲۱ بحوالہ نذر عرشی)
۷- لطیف ایڈیشن	۱۹۲۸ء	۱۳۴۷ھ	

مرزا اسد اللہ خاں تخلص بہ اسد و غالب کے تمام اردو کلام کو تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور اس مبسوط دیوان کو مختلف اعتبارات کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

حصہ اول:۔ گنجینۂ معنی۔ اس حصہ میں وہ تمام اشعار مندرج ہیں جو نسخہ حمیدیہ اور نسخہ شیرانی میں تو موجود تھے مگر ۱۲۴۷ کے مرتب کئے ہوئے دیوان سے مرزا نے خارج کر دیئے تھے۔

حصہ دوم:۔ نوائے سروش:۔ یہ حصہ اس کلام پر مشتمل ہے جو مرزا صاحب نے اپنی زندگی میں چھپوا کر تقسیم کیا اور جو عام طور پر "دیوانِ غالب" کے نام سے متداول اور مشہور ہے۔

حصہ سوم:۔ یادگارِ نالہ: اس جز میں وہ کلام رکھا گیا ہے جو دیوانِ غالب کے کسی نسخے کے متن میں تو نہ تھا لیکن بعض نسخوں کے حاشیوں پر یا خاتمے پر۔ یا مرزا کے خطوں میں، یا ان کے نام سے دوسروں کی بیاضوں میں پایا گیا اور وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل میں اشاعت پذیر ہوا۔

"شرحِ غالب" اس عنوان کے تحت اشعار کی وہ تمام تشریحیں جمع کی گئی ہیں جو مرزا نے اپنے خطوں میں احباب کے استفسار پر تحریر کی تھیں۔

فہرست اشعار [illegible] تمام مستقل چھوٹی بڑی نظموں کا پتا ان کے پہلے کے ذریعے سے دیا گیا ہے۔

اشارے تین ہیں۔ پہلا [illegible] دوسرا اضافات کو ظاہر کرتا ہے اور تیسرے میں کتب و رسائل مذکور ہوئے ہیں [illegible]

اس نسخے میں چار [illegible] تصویر [illegible] والی، دوسری غالب کی خیالی تصویر جو ملک کے نامور مصور جناب [illegible] بہت خوبصورت شاہکار ہے۔ گرد پوش کا ڈیزائن بھی چغتائی [illegible] تیار کردہ ہے۔ تیسری تصویر شیرانی [illegible] رامپور (جدید) کے ایک صفحہ کی۔

املا اور رسم الخط میں موجودہ اصول اور مرزا صاحب کی پسندیدگی دونوں کا لحاظ کیا گیا ہے۔ علامتِ اضافت کا استعمال اور اکثر لفظوں پر اعراب کے استعمال نے قاری کو تشریح کے قریب کر دیا ہے

غالب کا کلام پیشتر ازیں اتنے مواد کے ساتھ یکجا شائع نہیں ہوا۔ اس ضخیم دیوان کو دیکھ کر مولانا مہر صاحب کو "دیوان غالب" کی بجائے اسے "کلیات غالب" سے موسوم کرنا پڑا۔ عرشی صاحب نے دیوان کی تدوین نو میں ایک عمر گذاری ہے اور ایک ایک لفظ کا مقابلہ کر کے اس کی موزوں ترین صورت پیش کی ہے۔

"غالب کے اردو کلام کے لاتعداد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ قابل ذکر ایڈیشنوں میں سب سے آخر لیکن سرفہرست جناب امتیاز علی عرشی کا وہ نسخہ ہے جو انجمن ترقی اردو (ہند) نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا ہے۔ غالبیات کے سلسلہ میں یہ نسخہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں غالب کا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام اور مختلف نسخوں کے اختلافات نہایت جانفشانی سے جمع کئے گئے ہیں" (اردوئے معلی ط ۱)

اس کتاب پر مولانا عرشی صاحب کو ۱۹۶۱ میں ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے اول انعام سے نوازا گیا (مدیر عرشی)

۱۹۶۵

دیوانِ غالب بالتصویر (ٹائپ)

مظفر علی سید

مصور:۔ حنیف رامے

ناشر:۔ نیا ادارہ۔ لاہور

مطبع:۔ سپرا آرٹ پریس۔ لاہور

ضخامت:۔ ۳۲۰ صفحات

جناب مظفر علی سید نے مولانا محمد حسین آزاد کے بیان انتخاب دیوان کے متعلق "حرف اول" سے ابتدا کی ہے اور "گل رعنا" و "طاہر ایڈیشن"، مختصر خامہ بھائی کے بعد لکھا ہے کہ جناب امتیاز علی عرشی اور جناب مالک رام کی سعی و تلاش سے کلام غالب کا خاصا بڑا حصہ مرتب ہو چکا ہے لہٰذا اس امر کی ضرورت تھی کہ عام پڑھنے والوں کے لئے غالب کے تمام حاصل کردہ کلام کو سامنے رکھ کر ایک نیا انتخاب ترتیب دیا جائے جس میں نئے ذوق کی وسیع النظری بھی ہو اور غالب کے ساتھ انصاف۔ [illegible] کی کوشش کی ہے۔

ترتیب کے لحاظ سے اس دیوان کو [illegible] حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

حصہ اول میں دیوان مروج [illegible] اس وجہ سے کہ غالب کا [illegible] الگ [illegible] اور [illegible] کی تلاش میں [illegible] ذہنی دقت نہ ہو۔ اس حصہ کے شروع میں [illegible] غالب مرحوم کا فارسی میں دیباچہ اور [illegible] فارسی نواب ضیاء الدین احمد خاں [illegible] لگا دیا گیا ہے۔

حصہ دوم "رنگ بیدل" پر مشتمل ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ غالب نے اپنے کلام میں سے زیادہ اشعار [illegible] وجہ سے

منتخب نہ کئے کہ جس عمر میں انتخاب ہوا وہ بیدل سے منحرف کیا بیزار ہو چکے تھے۔ غالب کے اس دور کے انتخاب میں بیسیوں شعر ایسے ہیں جو اس انحراف و بیزاری کی نذر ہوگئے (دیباچہ نگار کا اشارہ غالباً نسخہ حمیدیہ کی طرف ہے)۔ بہرحال اس حصہ میں ایسے اشعار جو غالب کی زندگی، نظریہ فن اور نظریہ حیات کی غمازی کرتے ہیں، منتخب کئے گئے ہیں۔

تیسرا حصہ "حرف آخر" جس میں اس کلام کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو متفرق خطوط، تذکروں اور دیگر ذرائع سے حاصل ہوا۔

متن کی صحت کے لئے محترم امتیاز علی صاحب عرشی رامپوری کے مرتبہ دیوان غالب کو بنیادی طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ترتیب کا خاص اہتمام کیا گیا ہے جس سے مطالعہ میں آسانی پیدا ہو گئی ہے۔

اس پر حنیف رامے کی تجریدی تصویروں نے اس کتاب کے بانکپن کو دوبالا کر دیا ہے۔ راقم اس آرٹ سے نا آشنا ہے اس سبب کچھ رائے پیش نہیں کر سکتا تاہم رامے صاحب نے خود ان الفاظ میں اپنے آرٹ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے۔

"غالب کا انداز بیان ستواں ہے کہ جہاں دس لفظوں سے کام چل سکتا ہے وہاں یہ تو ممکن ہے کہ اس نے نو استعمال کئے ہوں لیکن وہ گیارہ نہیں کرتا۔ الفاظ کے اس استعمال میں اس کفایت شعاری نے مجھے ترغیب دی کہ میں بھی کم سے کم رنگوں میں ان معانی کی صورتیں ترتیب دوں جو غالب کے اشعار میں موجزن ہیں اور لفظوں کی کسی ہوئی کھال میں سے خون کی مانند جھلکتے ہیں" (رسالہ "کتاب" ستمبر ۶۶ء)

نیشنل بک سنٹر نے اس کتاب کو ۱۹۶۵ء کی خوبصورت ترین کتاب قرار دینے کے ساتھ ساتھ اس کی تصویروں کو بھی اولین انعام کا مستحق گردان کر انعام دینے کا اعلان کیا۔ بقول حنیف رامے صاحب، انعام صرف اعلان ہی تک محدود رہا۔ ادائیگی کی نوبت آج تک نہیں آئی۔ شاید عدم ادائیگی کا سبب ۱۹۶۵ء کے ہنگامی حالات ہوں۔ بہرحال ٹائپ، دیدہ زیب طباعت، موزوں جلد کی عمدگی، حنیف رامے کی مصوری ایسی چیزیں ہیں جنہوں نے کتاب کی صوری حیثیت کو نظر نواز اور دلفریب بنا دیا ہے۔

۱۹۶۶ء

کلیات غالب (اردو)

مرتبہ:۔ خان اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی

ناشر:۔ مکتبہ کارواں کچہری روڈ۔ لاہور

مطبع:۔ کارواں پریس۔ لاہور

ضخامت:۔ ۴۷۲ صفحات

فہرست کی ترتیب میں بڑے حسن ذوق کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ غزل، قصیدہ یا رباعی وغیرہ کی تلاش میں سہولت بہم پہنچانے کی خاطر ہر صنف شعر کا پہلا مصرعہ یا شعر دیا گیا ہے۔ پیش لفظ میں مرتب نے تصریح کی ہے کہ "کلیات غالب میں "نسخہ جدید" کی ترتیب کو بجنسہٖ برقرار رکھا گیا ہے اور جو غزلیں، قطعات، نظمیں اور رباعیات نسخہ جدید میں موجود نہیں تھیں انھیں دوسرے نسخوں سے نقل کر کے آخر میں ضم کر دیا گیا ہے۔ بعض اشعار کی شان نزول اور دوسری معلومات اخذ دانتی سے ہیں درج کر دی گئی ہیں۔ البتہ مرتب کا یہ لکھنا کہ دیوان غالب پہلی مرتبہ ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا صریحاً غلط ہے کیونکہ پہلی اشاعت ۱۸۴۱ء میں ہوئی تھی۔

مقدمہ میں یوسف جمال انصاری صاحب نے تفصیلاً غالب کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی ہے۔ غالب کے دور کا پس منظر، غالب کی شخصیت کا اثر ان کے فن پر، غالب فکر و فن کے آئینہ میں اور غالب کا اسلوب بیان جیسے عنوانات پر متعدد ذیلی عنوانات قائم کر کے تفصیل سے قارئین کو اپنے خیالات سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ ذیلی عنوانات بجائے خود اپنی جگہ پر مستقل مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے غالب اور تصوف، غالب اور رجعیت، غالب کی تشبیہات، غالب کی انانیت، غالب کی شاعری کے تین دور، غالب کا نظریۂ فن، کلام غالب کی فکر انگیزی، کلام غالب کی تہذیبی قدر و قیمت، غالب کا مذہب، غالب اور ہنگامہ، غالب اور جمالیات، غالب اور مرثیہ، غالب اور مطالعۂ فطرت، لفظی اور معنوی دقت پسندی، رمزیت، خیال کی عریانی کیفیت، کلام غالب کا تجزیہ وغیرہم۔

کتاب میں دو تصاویر ہیں۔ مرزا غالب اور کتبہ مرزا غالب جن کے بعد متن دیوان کی ابتدا ہوتی ہے۔ کتاب میں غالب کی کوئی تصویر شامل نہیں۔ البتہ اس کمی کو گرد پوش پر غالب کی تصویر چھاپ کر پورا کر دیا گیا ہے۔

۱۹۶۶ء

مرقع غالب

لالہ پرکھشی چندر

ناشر:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ و لکشمی بک اسٹور، نئی دہلی

پریس:۔ لکشمی پرنٹنگ ورکس۔ دہلی

ضخامت:۔ ۱۹۲ صفحات

مرقع غالب کی ترتیب میں جن امور کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ جن اشعار کی تشریح مرزا نے اپنے خطوط میں کی ہے ان اشعار کے حاشیوں میں خطوط سے تشریحات درج کر دی گئی ہیں تاکہ اشعار کا مفہوم شاعر کے نقطۂ نگاہ سے واضح ہو جائے۔

۲۔ غزلوں کے وہ اشعار جن میں کوئی تلمیح پائی جاتی ہے، اس کی تشریح حاشیہ میں کر دی گئی ہے۔

۳۔ مرزا نے اپنے بعض اشعار خطوط میں استعمال کئے ہیں ان ہی اشعار کے تحت خطوط کے متعلقہ حصے بھی شامل کر دیئے گئے ہیں تاکہ شعروں سے لطف اندوزی کے ساتھ ساتھ انشا پردازی سے بھی حظ اٹھایا جاسکے۔

۴۔ اشعار و فردیات کا حال اور کچھ حصہ تاریخ نامہ کا بھی درج کر دیا ہے جس سے پتہ چل سکے کہ وہ کب اور کس موقع پر کہے گئے۔

۵۔ بعض اہم تصاویر بھی زیب مرقع ہیں جو مرزا غالب کی جائے پیدائش، مقامات رہائش، دلی، آگرہ، رامپور اور مدفن سے متعلق ہیں۔

۶۔ مرزا غالب کی سوانح حیات انہی کے خطوط سے اخذ کر کے مرتب کی گئی ہے

۷۔ سب سے اہم اور دلچسپ غالب کے منتخب خطوط کے عکس ہیں جو انھوں نے بعض اشعار کی تشریح میں تحریر فرمائے

"مرقع غالب" دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں دیوانِ غالب اردو اور حصہ دوم میں مرزا کے اِن خطوط کے عکس شامل ہیں جو انھوں نے والیانِ ریاست رامپور، نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کو وقتاً فوقتاً ارسال کئے۔ دونوں کی تصاویر بھی مرقع کے اسی حصہ میں شامل ہیں۔

مختصر یہ کہ متن کے ساتھ مفید حواشی کا اضافہ خود غالب کی تحریروں سے خوبصورت کتابت، دیدہ زیب طباعت احسن ترتیب ایسی خوبیوں نے اس نسخہ کو فی الواقع اسم بامسمیٰ بنا دیا ہے جسے بجا طور پر بطور تحفہ پیش کیا جاسکتا ہے۔

مرقع ہذا کو مرتب نے اپنے فرزند دلبند پرکاش جی کے نام سے معنون کیا ہے۔ جن کی نوٹو گرافی نے مکتوبات مرزا اور مرقع غالب کو مرصع کیا۔

ابتدا میں غالب کی رنگین شبیہ (نسخہ نظامی) چھاپی گئی ہے۔

۱۹۶۷ء

دیوانِ غالب (عکسی)

ناشر:- شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز۔ ادبی مارکیٹ چوک انارکلی۔ لاہور

پریس:- علمی پرنٹنگ پریس۔ لاہور

ضخامت:- ۴۰۳ صفحات

مقدمہ بڑا پُر مغز، ادبی، علمی اور تاریخی حیثیت کے علاوہ گوناگوں خوبیوں کا مرقع ہے جس میں غالب کے سوانح حیات جامع مگر مختصر طور پر قلمبند کرنے کے علاوہ غالب کی شاعری پر بڑی مفید باتیں سپرد قلم کی گئی ہیں۔ قرائن سے ثابت کیا گیا ہے کہ غالب نے ابتدائے سن تمیزی سے جب کہ ان کی عمر دس پندرہ برس کی تھی شعر کہنا شروع کر دیئے تھے۔ جہاں تک انتقادی حیثیت کا تعلق ہے مرتب علام نے بعض ان افسانوں کی جو تاریخی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، تردید کی ہے۔ جیسے

۱۔ نواب حسام الدین حیدر والا افسانہ جس میں غالب کا کلام میر تقی میر کو دکھانے کا ذکر ہے۔

۲۔ احباب کے مشورہ سے دیوان کے انتخاب کے متعلق مولانا محمد حسین آزاد کی بیان داستان ۔

زاں بعد دیوان کی سرگزشت کے سلسلہ میں غالب کی زندگی میں چھپنے والے مختلف ایڈیشنوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور بتایا ہے کہ دیوانِ غالب کو جو ہر دلعزیزی حاصل ہوئی وہ اردو نظم کے شاید ہی کسی مجموعہ کے حصے میں آئی ہو۔ اس دیوان کی ترتیب میں جن امور پر بطور خاص توجہ صرف کی گئی ان کا مختصر ذکر درج ذیل ہے ۔

۱۔ متن کی صحت کا تا حد امکان پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے ۔

۲۔ بیشتر اشعار پر علامات اوقاف صحیح مقامات پر لگا دیئے ہیں جس سے اشعار کا مطالعہ سہل اور عسیر الفہم ہو گیا ہے ۔

۳۔ ایسے الفاظ جو تلفظ کی غلطی سے کچھ کے کچھ بن جاتے ہیں ان پر اعراب لگا دیئے ہیں تاکہ شعر کی حقیقی حیثیت زائل نہ ہو ۔

۴۔ مروجہ دیوان کے علاوہ مختلف مقامات پر چھپے ہوئے اشعار اکٹھا کر کے بطور ضمیمہ ۱ شامل کر دیئے گئے ہیں ۔

۵۔ نسخہ حمیدیہ سے سہل اور واضح اشعار کا ایک انتخاب بھی بطور ضمیمہ ۲ ملحق کر دیا گیا ہے ۔

۶۔ دو مثنویاں (قادر نامہ اور اشتہار تیغ آہنگ) ضمیمہ ۳ کے تحت آخر میں شامل کی گئی ہیں ۔

۷۔ غزلیات و قصائد کی تاریخوں کی مستند ماخذ کی بنا پر تعیین کر دی گئی ہے ۔

۸۔ املا میں بعض الفاظ قدیم تحریر کے مطابق جوں کے توں قائم رکھے گئے ہیں البتہ بعض میں خفیف سی ترمیم ناگزیر سمجھی گئی جس کی مثالوں سے وضاحت کی گئی ہے ۔

۹۔ متداول ترتیب میں رد و بدل نہیں کیا گیا ۔

۱۰۔ حواشی میں حوالوں کی نشاندہی، اختلاف نسخ کا ذکر، املا کے بارے میں تصریحات اور تاریخوں کے تعیین کے علاوہ بڑی مفید معلومات کا ذخیرہ کیا گیا ہے ۔

مختصر یہ کہ حسن کتابت و طباعت کے لحاظ سے اتنا صحیح و واضح دیوان شاید پہلی مرتبہ منصہ شہود پر جلوہ افروز ہوا ہے۔ بلاشک کے حسین گرد پوش نے جس پر غالب کی تصویر مرتسم ہے، اس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں ۔

۵۶۷۔ (بار چہارم)

نقش چغتائی ۔ دیوان غالب (مصور)

محمد عبد الرحمن چغتائی

ناشر:۔ ایوان اشاعت راوی روڈ۔ لاہور

پریس:۔ پرنٹو (Printo) راوی روڈ۔ لاہور

ضخامت:۔ ۱۹۲ صفحات (مع تصاویر)

"اپنے محسن کے نام" کے عنوان سے کتاب کا انتساب اس طرح کیا گیا ہے :-

" استاد بہزاد جب بھی اپنا کوئی شاہکار حسین مرزا کے نام منسوب کرتا تو سمجھتا اسے دوام حاصل ہو گیا ہے میں اپنی کوشش کو محترم جسٹس ایس اے رحمن کے نام معنون کرتا ہوں ۔ اس لئے بھی کہ ان کی علم دوستی اور آرٹ نوازی نے میری کسی آرزو کو ٹھیس نہیں لگنے دی "

اس انتساب کے بعد " آرٹ " کے عنوان سے دیباچہ شروع ہوتا ہے جو کسی مغربی نقاد کے حسنِ عقیدت کا اردو ترجمہ ہے اس میں اس مغربی نقاد نے چغتائی کے فن کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے علاوہ چغتائی پر ایرانی مصوری سے متاثر ہونے کے طعن پر بعض نقادوں کا جواب دیا ہے اور چغتائی کے ایرانی النسل ہونے کے سبب ایرانی مصوری سے اس کا اثر پذیر ہونا ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ چغتائی کی بات بالکل مختلف ہے ۔ اس کے دم سے ایرانی مصوری از سر نو زندہ ہو گئی ہے اُس مصوری میں اور اِس مصوری میں فرق ہے تو صرف اتنا جو چغتائی کی عظیم شخصیت اور صدیوں کی آمد و شد کی وجہ سے لازمی تھا ۔

کتاب دبیز کاغذ پر خوبصورت طباعت اور حسن اہتمام سے شائع کی گئی ہے جس میں مختلف اشعار کی توضیح کرنے والی ۱۲ تصاویر بھی شامل ہیں ۔ کتاب مرقع چغتائی کی کتابت کا چربہ ہے ۔ کتاب کی جلد تصویر آہو سے مزین ہے ۔

۹۶۸

سرودِ غالب

مرتبہ :- یوسف بخاری دہلوی

ناشر :- شیخ مبارک علی تاجر و ناشر کتب اندرون لوہاری دروازہ ۔ لاہور

پریس :- عملی پرنٹنگ پریس ۔ لاہور

ضخامت :- ۲۰۸ صفحات

مرتب نے " حرفِ چند " میں اس دیوان کی نئی ترتیب پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ دیوانِ غالب کے جملہ اشعار کو ان کے مرکزی خیال کے مطابق ایسے جامع عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے جو قرین قیاس اور ممکن ہو سکتے ہیں یعنی دیوان کے اشعار کو با عتبار موضوع مندرجہ ذیل عنوانات پر تقسیم کیا گیا ہے ۔

موجِ عرفان ، شمعِ ہدایت ، سوز و ساز ، حریمِ ناز ، روداد غم ، رنگ لب ، در حدیثِ دیگراں ۔ تشنگی اور وسعت

پھر ان عنوانات کے تحت ۷۰ ذیلی عنوانات قائم کئے گئے ہیں جن پر سارے دیوانِ غالب کو سمو دیا گیا ہے ۔ البتہ غزلوں کے درمیان آنے والے تہنیتی اور مدحیہ اشعار اور جملہ قصائد کو ممدوح کے رسم کی وضاحت کے ساتھ تہنیت اور مدح کے عنوانات کے ذیل الگ الگ درج کیا ہے ۔ مثنویات ، قطعات اور رباعیات کے متعلق بھی کم و بیش یہی التزام کیا گیا ہے ۔

اشعارِ غالب کی عبارت ، الفاظ کی صحت اور اعراب کیلئے نسخہ عرشی کو استعمال کیا گیا ہے ۔ البتہ یائے معروف و یائے مجہول کی املا میں نسخہ عرشی کا اتباع نہیں کیا گیا ۔ طاہر ایڈیشن سے بھی بعض الفاظ کے سلسلے میں استفادہ کیا گیا ہے ۔ اور جن الفاظ کا

نسخۂ عرشی سے اختلاف پایا گیا۔ حواشی میں اس کی تشریح کر دی گئی ہے جس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ عرشی صاحب نے اپنے نسخے کی ترتیب میں جہاں دیگر مطبوعہ وخطی نسخوں سے استفادہ کیا وہاں طاہر ایڈیشن ان کی نظر سے اوجھل رہا۔ اس لحاظ سے نسخہ طاہر کی اہمیت تاریخی وعلمی اعتبار سے بڑھ جاتی ہے۔

مرتب قابل ستائش ہیں کہ انہوں نے دیوان کو ایک نئے ڈھنگ میں ترتیب دیا البتہ قاری اس نسخہ کے ہوتے ہوئے بھی دیوان کی ضرورت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا کیونکہ قاری کو شعر ترتیب وار ردیف میں نہیں ملے گا۔

کتاب کا مقدمہ وخاتمہ جناب سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے قلمبند کر کے اپنے فاضل ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے کتاب کے گرد پوش کا ڈیزائن فضل کریم آرٹسٹ نے تیار کیا ہے۔

۱۹۶۹

دیوانِ غالب (اردو)

مکتبہ میری لائبریری۔ لاہور

پاکستان ٹائمز پریس لاہور

ضخامت: ۱۵۲ صفحات

یہ ایڈیشن آفسٹ طباعت سے پیپر بیک (کاغذی جلد) کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ جس میں مندرجہ ذیل امور کے اضافے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔

۱۔ مولانا حسرت موہانی کے انتخابِ سخن کی تجدید اشاعت کے سلسلے کو نشان "ح" کے ذریعہ دکھایا گیا ہے (البتہ چند اشعار جو مروجہ دیوان میں نہ تھے نشان زد نہ ہو سکے)

۲۔ جن اشعار کو مصور مشرق جناب عبدالرحمن چغتائی نے "مرقع چغتائی" میں مختلف رنگوں کی تصویروں کے ذریعہ پیش کیا ہے نشان "م۔ چ" کے ذریعہ دکھایا گیا ہے۔ (البتہ ایک شعر اس دیوان میں موجود نہیں)

۳۔ جن اشعار کو مصور مشرق جناب عبدالرحمن چغتائی نے "نقش چغتائی" میں یک رنگی تصویروں میں پیش کیا ہے نشان "ن۔ چ" کے ذریعہ دکھایا گیا ہے۔

۴۔ جن اشعار کو ملک کے جواں سال مصور جناب محمد حنیف رامے نے اپنے موقلم کے اظہار کا ذریعہ بنایا ان کو نشان "ر" سے دکھایا گیا ہے۔

۵۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اردو ادب کے نقادوں نے جن الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کیا اس کا انتخاب ملک حسن اختر صاحب نے مرتب کر کے ادب کے طالب علموں کے افادہ کی خاطر شامل کر دیا ہے۔

۶۔ دیوان کے اشعار کی گنتی ردیف وار ۱۸۰۱ تک پہنچتی ہے

"استاد بہزاد جب بھی اپنا کوئی شاہکار حسین مرزا کے نام منسوب کرتا تو سمجھتا اسے دوام حاصل ہو گیا ہے میں اپنی کوشش کو محترم جسٹس ایس اے رحمٰن کے نام معنون کرتا ہوں۔ اس لئے بھی کہ ان کی علم دوستی اور آرٹ نوازی نے میری کسی قدر زو کو ٹھیس نہیں لگنے دی۔"

اس انتساب کے بعد "آرٹ" کے عنوان سے دیباچہ شروع ہوتا ہے جو کسی مغربی نقاد کے حسن عقیدت کا اردو ترجمہ ہے اس میں اس مغربی نقاد نے چغتائی کے فن کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے علاوہ چغتائی پر ایرانی مصوری سے متاثر ہونے کے طعن پر بعض نقادوں کا جواب دیا ہے اور چغتائی کے ایرانی النسل ہونے کے سبب ایرانی مصوری سے اس کا اثر پذیر ہونا ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ چغتائی کی بات بالکل مختلف ہے۔ اس کے دم سے ایرانی مصوری از سر نو زندہ ہو گئی ہے ان مصوروں میں اور اس مصور میں فرق ہے تو صرف اتنا جو چغتائی کی عظیم شخصیت اور صدیوں کی آمد ... کی وجہ سے لازمی تھا۔

کتاب دبیز کاغذ پر خوبصورت طباعت اور حسن اہتمام سے شائع کی گئی ہے جس میں مختلف اشعار کی توضیح کرنے والی ۱۲ تصاویر بھی شامل ہیں۔ کتاب مرقع چغتائی کی کتابت کا نمونہ ہے۔ کتاب کی جلد تصویر آہو سے مزین ہے۔

۹۱۸

مرزا غالب

مرتبہ:۔ یوسف بخاری دہلوی

ناشر:۔ شیخ مبارک علی تاجر و ناشر کتب اندرون لوہاری دروازہ۔ لاہور

پریس:۔ عملی پرنٹنگ پریس۔ لاہور

ضخامت:۔ ۲۰۸ صفحات

مرتب نے "حرفِ چند" میں اس دیوان کی نئی ترتیب پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ دیوان غالب کے جملہ اشعار کو ان کے مرکزی خیال کے مطابق ایسے جامع عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے جو قرین قیاس اور ممکن ہو سکتے ہیں یعنی دیوان کے اشعار کو باعتبار موضوع مندرجہ ذیل عنوانات پر تقسیم کیا گیا ہے۔

موجِ عرفان، شمع ہدایت، سوز و ساز، حیرت نازہ، ... در حدیثِ دیگران۔ ... اور وسعت پھر ان عنوانات کے تحت ۷۰ ذیلی عنوانات قائم کئے گئے ہیں جن ... پورے دیوانِ غالب کو سمو دیا گیا ہے۔ البتہ غزلوں کے درمیان آنے والے تہنیتی اور مدحیہ اشعار اور جملہ قصائد کو مدوح کے رتبہ کی وضاحت کے ساتھ تہنیت اور مدح کے عنوانات کے ذیل الگ الگ درج کیا ہے۔ مثنویات، قطعات اور رباعیات کے متعلق بھی کم و بیش یہی التزام کیا گیا ہے۔

اشعارِ غالب کی عبارت اور الفاظ کی صحت اور اعراب کیلئے نسخہ عرشی کو استعمال کیا گیا ہے۔ البتہ یائے معروف و یائے مجہول کی املا میں نسخہ عرشی کا اتباع نہیں کیا گیا۔ طاہر ایڈیشن سے بھی بعض الفاظ کے سلسلے میں استفادہ کیا گیا ہے۔ اور جن الفاظ کا

نسخہ عرشی سے اختلاف پایا گیا حواشی میں اس کی تشریح کر دی گئی ہے جس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ عرشی صاحب نے اپنے نسخے کی ترتیب میں جہاں دیگر مطبوعہ و خطی نسخوں سے استفادہ کیا وہاں طاہر ایڈیشن ان کی نظر سے اوجھل رہا۔ اس لحاظ سے نسخہ طاہر کی اہمیت تاریخی و علمی اعتبار سے بڑھ جاتی ہے۔

مرتب قابل ستائش ہیں کہ انہوں نے دیوان کو ایک نئے ڈھنگ میں ترتیب دیا البتہ قاری اس نسخہ کے ہوتے ہوئے بھی دیوان کی ضرورت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا کیونکہ قاری کو شعر ترتیب وار ردیف میں نہیں ملے گا۔

کتاب کا مقدمہ و خاتمہ جناب سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے قلمبند کر کے اپنے فاضل ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے کتاب کے گرد و پوش کا ڈیزائن فضل کریم آرٹسٹ نے تیار کیا ہے۔

۱۹۶۶

دیوانِ غالب (اردو)
مکتبہ میری لائبریری۔ لاہور
پاکستان ٹائمز پریس لاہور
ضخامت : ۱۵۲ صفحات

یہ ایڈیشن آفسٹ طباعت سے پیپر بیک (کاغذی جلد) کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ جس میں مندرجہ ذیل امور کے اضافے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔

۱۔ مولینا حسرت موہانی کے انتخابِ سخن کی تجدید اشاعت کے سلسلے کو نشان "ح" کے ذریعہ دکھایا گیا ہے (البتہ چند اشعار جو مروجہ دیوان میں نہ تھے نشان زد نہ ہو سکے)

۲۔ جن اشعار کو مصورِ مشرق جناب عبدالرحمٰن چغتائی نے "مرقع چغتائی" میں مختلف رنگوں کی تصویروں کے ذریعہ پیش کیا ہے نشان "م۔چ" کے ذریعہ دکھایا گیا ہے۔ (البتہ ایک شعر اس دیوان میں موجود نہیں)

۳۔ جن اشعار کو مصورِ مشرق جناب عبدالرحمٰن چغتائی نے "نقش چغتائی" میں یک رنگی تصویروں میں پیش کیا ہے نشان "ن۔چ" کے ذریعہ دکھایا گیا ہے۔

۴۔ جن اشعار کو ملک کے جوان سال مصور حنیف رامے نے اپنے موقلم کے اظہار کا ذریعہ بنایا ان کو نشان "ر" سے دکھایا گیا ہے۔

۵۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اردو ادب کے نقادوں نے جن الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کیا اس کا انتخاب ملک حسن اختر صاحب نے مرتب کر کے ادب کے طالب علموں کے افادہ کی خاطر شامل کر دیا ہے۔

۶۔ دیوان کے اشعار کی گنتی ردیف وار ۱۸۰۱ تک پہنچتی ہے

۷۔ دیباچہ فارسی میں غالب کے قلم سے اور خاتمہ فارسی میں نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر کے قلم سے شامل کیا گیا ہے۔

۸۔ دیوانِ غالب کا یہ نسخہ غالب کے اپنے انتخاب دیوان ریختہ کے مطابق ہے جو اشعار بعد کے نسخوں میں شامل ہو کر مروجہ دیوان کا حصہ بن گئے تھے انہیں آخر میں بعنوان "ضمیمہ اضافے" درج کر دیا ہے۔

۹۔ تلفظ و اعراب میں مولینا امتیاز علی عرشی رامپوری کے "عرشی ایڈیشن" سے مدد لی گئی ہے۔

اس اہتمام و احتیاط کے باوجود بعض مقامات نظر میں کھٹکتے ہیں۔ جیسے

(۱) غالب کی تاریخ ولادت ۱۷۹۷ء کی بجائے ۱۷۹۶ء بتائی گئی ہے (۲) خاتمہ نواب ضیاء الدین احمد خاں کی بجائے غالب سے منسوب کر دیا گیا ہے (۳) عبدالرحمٰن بجنوری کے مشہور فقرہ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں" میں لفظ "الہامی" کو "مقدس" میں تبدیل کر دیا گیا ہے

اضافات

نسخہ حمیدیہ کے آخر میں

ایک مصدقہ اطلاع کے مطابق نسخہ حمیدیہ کو پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے نئے سرے سے ترتیب دیا ہے جسے مجلس ترقی ادب لاہور غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر بطور یادگار شائع کر رہی ہے۔

طاہر ایڈیشن کے آخر میں

قومی کتاب مرکز پاکستان لاہور کے مجلہ "کتاب" کے شمارہ برائے فروری ۱۹۶۹ء میں یہ دیوان مکمل شائع کر دیا گیا ہے جس کی تمہید میں محترم جناب گوہر نوشاہی صاحب نے دیوان غالب کے مطبوعہ و خطی نسخوں کی نشاندہی کی ہے اور نسخہ طاہر کی خصوصیات اور اسکی انفرادی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔

انتخاب غالب کے آخر میں

بعض اہل علم حضرات نے غالب کے دیوان کے انتخابات بھی شائع فرما کر اپنے حسن ذوق کا ثبوت فراہم کیا ہے جیسے جناب جلیل قدوائی، پروفیسر ممتاز حسین اور نیاز فتحپوری وغیرہ، مگر ان انتخابات کے تعارف سے عمداً صرفِ نظر کیا گیا۔

مگر یہ انتخاب چونکہ غالب کا اپنا کیا ہوا ہے اور اسے تبرک کی حیثیت حاصل ہے اس لئے اسکی شمولیت ناگزیر سمجھی گئی۔ یہاں اس بات کی بھی وضاحت کر دی جائے کہ غالب نے اپنے اردو اور فارسی کلام کا ایک اور انتخاب بھی مولوی سراج الدین احمد کی درخواست پر مرتب کیا تھا جس کا نام "گلِ رعنا" رکھا جو غالباً آج تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ البتہ اس کے تین خطی نسخوں کا علم ہو سکا جن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) نسخہ مملوکہ مولانا حسرت موہانی مرحوم (صرف ایک حصہ) بحوالہ خطوط غالب مرتبہ مہر طبع جدید (۲) نسخہ مملوکہ جناب مالک رام صاحب (قدرے کرم خوردہ) بحوالہ نذر ذاکر (۳) نسخہ مملوکہ حکیم محمد نبی خاں سوید صاحب (بحوالہ "رسالہ کتاب" فروری ۱۹۶۹ء)

پروفیسر سید معین الرحمٰن ایم۔اے
ایف۔سی۔کالج۔لاہور

غالب کی چند معدوم تحریریں

"بارہ برس کی عمر سے کاغذ، نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔
باسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے ہے"

(از اسد اللہ، نگاشتہ بست و سوم فروری سنہ ۱۸۵۷ء)

قدر بلگرامی کے نام۔ اس خط کے بعد غالب بارہ برس اور جیئے اور یہ زمانہ بھی شیوۂ قدیم کی ورزش میں گذرا۔ ساٹھ برس سے متجاوز اپنی ادبی زندگی کے طویل دورمیں انھوں نے بہت کچھ لکھا، طبیعت کی اپچ سے بھی اور فرمائش پر بھی ـــــ آج، کہ جب آلِ احمد سرور کے بقول غالب کی تحریر کا ایک ایک لفظ اہلِ نظر کی آنکھ کا سرمہ ہے، یہ جان کر بہت ملال ہوتا ہے کہ غالب کی بعض تصنیفات تک پردۂ خفا میں ہیں ـــ اس موقع پر غالب کی چند ایسی تحریروں کا "ماتم" مقصود ہے جن کا جہاں تہاں محض ذکر ملتا ہے لیکن جو تا حال دستیاب نہیں ہو سکی ہیں۔

۱۔ رسالۂ در "آئینِ بیجا ی بانک" (فارسی) ترجمہ از ہندی (اردو) بفارسی برائی نواب ٹونک،
زمانۂ تالیف: ماقبل ۱۰/ مارچ ۱۸۴۵ء

غالب کی آخری ادبی یادگار "باغِ دودر"[۱] سے ایک بڑی نادر اطلاع یہ ملتی ہے کہ غالب نے بانک کے داؤ پیچ پر بھی

---

[۱] "باغ دودر" غالب کے نظم و نثرِ فارسی کا آخری مجموعہ۔ سال تالیف ۱۲۸۳ھ (مطابق ۱۶ رمئی ۱۸۶۶ء تا ۴ رمئی ۱۸۶۷ء) طبع اول بہ دستخط مصنف بطرز قلمی نسخہ، مملوکہ سید وزیر الحسن عابدی، "یونیورسٹی اورینٹل کالج میگزین لاہور" شمارہ ۵ اگست ۱۹۷۰ء (ص۱ ـ ۹۲) و اگست ۱۹۷۱ء (ص ۹۳ - ۱۱۸)

ایک مختصر کتاب تالیف کی، یہ ایک اردو رسالے کا فارسی ترجمہ ہے جسے غالب نے نواب صاحب، ٹونک، نواب وزیر محمد خاں کی خوشنودیٔ مزاج کے خیال سے ترتیب دیا۔ یہ رسالہ تاحال دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔ اس اطلاع کا واحد ماخذ "باغِ دودر" میں شامل غالب کا ایک خط ہے جو اگست ۱۹۶۱ء میں منظر عام پر آیا اور ایک اندازے کے مطابق ۱۸۶۵ء کی پہلی تماہی میں کسی وقت لکھا گیا۔

"باغِ دودر" کے دوسرے حصے "منثورات" میں مختلف اصحاب کے نام غالب کے ساٹھ خط بھی شامل ہیں جو بیسویں میں ہیں۔ تفضل حسین خاں خیر آبادی کے نام ہے، غالب نے اپنی اس تالیف کا ذکر ان کلمات[۱۵] میں کیا ہے۔

"..... شاید آپ بھی جلد ہی آگرے سے ٹونک روانہ ہونے والے ہوں اور وہاں پہنچ کر یہ عریضہ جو طالع یار خاں[۱۶] کو دے رہا ہوں، آپ کی نظر سے گزرے۔ اس دفعہ طالع یار خاں نے جس سے میرے دیرینہ مراسم ہیں مجھ سے ایک بڑے مشکل کام کی فرمائش کی۔ بانک کے داؤ پیچ پر ایک مختصر ہندی رسالے کا فارسی میں ترجمہ کرنے کو کہا اور یہ مشورہ دیا کہ اس خدمت کی انجام دہی نواب معلی القاب (نواب صاحب، ٹونک، نواب وزیر محمد خاں) کی خوشنودیٔ مزاج کا سبب ہو گی۔ میں چونکہ اُن کے خوانِ جود و کرم کا زلہ خوار ہوں اور سپاسِ نعمت مجھ پر فرض ہے، میں نے اس مشکل کام کے لئے قلم اٹھایا اور ایک رسالہ دیباچے اور خاتمے پر مشتمل ترتیب دے کر انھیں کو دے دیا اور ایک عرضداشت بھی لکھ کر ساتھ کر دی تاکہ اس وسیلے سے یہ آرزو بر آئے کہ نواب صاحب کی توقیع میرے نام صادر ہو۔ دیباچے کے مضمون کی داد پہلے آپ سے اور پھر منشی مولوی ظہیر الدین علی سے چاہتا ہوں کہ ممدوح کا ذکر کن الفاظ میں کیا ہے اور فن بانک کی تعریف کس انداز سے کی ہے اور اس کے ساتھ دیباچے اور رسالے کی عبارت میں اسلوبِ بیان کی جدت کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ بیان کا خاص اسلوب برابر قائم رہا ہے۔ بایں ہمہ جانتا ہوں کہ اپنی جادو بیانی پر فخر اس وقت

---

۱۵ غالب کا اصل خط فارسی میں ہے۔ یہاں اسکی "ہو بہو ترجمہ" وزیر الحسن عابدی صاحب کے "تحقیق نامہ باغِ دودر" مطبوعہ جولائی ۱۹۶۸ء سے پیش کی جا رہی ہے۔

۱۶ طالع یار خاں کے کوائف میں دیکھئے مضمون سید جمیل الدین مطبوعہ نوائے ادب، بمبئی جولائی ۱۹۵۵ء

کرسکتا ہوں اور مجھے اپنی کاوش کی داد، اس وقت ملے گی کہ بندگان
نواب صاحب سلطان نشان میرے اندازِ بیان کو پسند فرمائیں گے [1]

تفضل حسین خاں خیرآبادی کے نام باعتبارِ ترتیب یہ غالب کا دوسرا خط ہے اور اس پر کوئی تاریخ ثبت نہیں ——

تفضل حسین خاں [illegible] کے نام لکھے ہوئے باعتبارِ ترتیب تیسرے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب ٹونک نے غالب کی اس عرضداشت [illegible] "[illegible] بانگ" کے ساتھ بھیجی گئی تھی، کوئی جواب نہیں دیا۔ غالب نے اسے شدت سے محسوس کیا اور بہت [illegible]

[illegible] کی تاریخ درج ہے جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے [illegible] بانگ کے [illegible] [illegible] ۱۸۶۵ء سے کچھ پہلے [illegible] غالب کا [illegible] [illegible] سرکاری [illegible] کتب خانہ میں محفوظ ہے لیکن دریافت [illegible] نایاب ہو چکا ہے

۶۔ قصہ کہانی کی کتاب (اردو)

• فی بطن شاعر یہ مانہ: دسمبر ۱۸۵۸ء

غالب کے خطوں میں ایک اور کتاب کا ذکر بھی آیا ہے لیکن کہیں اس کا سراغ نہیں ملتا اور قیاس کہتا ہے کہ یہ لکھی نہیں گئی، محض تجویز کی حد تک رہ گئی۔ غالب سے اس کی فرمائش، ہنری اسٹورٹ ریڈ [2] نے کی تھی، فرمائش یہ تھی کہ وہ اردو نثر میں ایک مستقل کتاب لکھ دیں۔ منشی شیو نرائن آرام [3] کے نام ۱۱ دسمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب نے اوّل اوّل، اس فرمائش کا ذکر

---

[1] تحقیق نامہ باغِ دودر، ص ۵۱-۵۲ ، یہ خط کی برگشتگی دیدنی ہے۔ اس سے غالب کی افتادِ مزاج پر روشنی پڑتی ہے اور ان کی خودنگری و خودداری کی بڑی تیکھی اور منہ بولتی تصویر سامنے آتی ہے۔ رجوع کیجئے، تحقیق نامہ باغِ دودر، ص ۵۲ - ۵۵

[2] ہنری اسٹورٹ ریڈ، ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن صوبہ شمال مغربی کا ذکر غالب کے خطوں میں، سب سے پہلے مرزا تفتہ کے نام ۲۷ نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں آیا ہے۔

'ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب ممالک مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے مصاحب ہیں۔ ان کے دنوں میں ایک ملاقات میری ان کی ہوئی تھی'

گارسان دتاسی نے، اپنے خطبات میں ریڈ کا ذکر اکثر کیا ہے خصوصیت سے دیکھئے بارہواں خطبہ ۲ دسمبر ۱۸۶۱ء ص ۳۰۵، ۳۰۹۔

[3] منشی شیو نرائن آرام (۱۸۴۳ء - ۱۸۹۹ء) غالب کے شاگرد، مطبع مفید خلائق، آگرہ کے مالک اور مہتمم۔ شیو نرائن اور غالب کے بزرگوں کے باہم مراسم بھی رہے تھے اس لئے غالب انھیں مثل "فرزند دلبند" عزیز رکھتے تھے۔

ان لفظوں میں کیا ہے:

"جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو میں ابھی خط نہیں لکھ سکتا۔ ان کی
فرمائش ہے: "اردو کی نثر ..." وہ انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں
مگر بھائی غور کرو، اردو میں اپنے قلم کا زور صرف کروں گا؟ اور اس عبارت
میں معانی نازک کیوں کر بھروں گا؟ ابھی تو یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں؟
کون سی بات، کونسی کہانی، کونسا مضمون تحریر کروں اور کیا تدبیر
کروں؟ تمہاری رائے میں کچھ آئے تو مجھ کو بتاؤ....."

چار روز بعد ہی، ۱۵ دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں اپنے اس خط کے جواب کا تقاضا کرتے ہوئے غالب لکھتے ہیں:

"بھائی، یہ بات تو کچھ نہیں کہ تم خط کا جواب نہیں لکھتے۔ خیر، دیر سے
لکھو، اگر شتاب نہیں لکھتے۔ تمہارا خط آیا، اس کے دوسرے دن
میں نے جواب بھجوایا، حالانکہ اس میں جواب طلب باتیں تھیں۔ یعنی ....
ریڈ صاحب کے باب میں میں نے یہ لکھا تھا کہ جب کچھ اردو کی نثر، اُن
کے واسطے لکھ لوں گا تو "دستنبو"[1] کی خریداری کی خواہش کروں گا[2] معہذا تم سے
صلاح پوچھی تھی کہ کس حکایت اور کس روایت کو فارسی سے اردو کروں۔ تم نے
اس بات کا جواب نہ لکھا....."

---

[1] فارسی قدیم میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے حالات سے متعلق غالب کی ایک اہم تصنیف، طبع اول، مطبع مفید خلائق آگرہ نومبر ۱۸۵۸ء۔ تفصیلی تعارف کے لئے رجوع کیجئے راقم الحروف کی کتاب: "اشاریۂ غالب" جلد اوّل ص ۵۵ تا ۵۸) مطبوعہ مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۹ء

[2] شیو نرائن کو "دستنبو" کے ناشر تھے، اس بات کی فکر میں تھے کہ کتاب پڑی نہ رہ جائے، نکل جائے۔ یہاں خریداری کی خواہش سے مراد ہے کہ ریڈ صاحب اپنے محکمے یعنی مدارس وغیرہ "دستنبو" کی کچھ جلدوں کی اکٹھی خریداری کا انتظام کر دیں، نہ یہ کہ وہ "اپنے لئے" ایک نسخہ خریدیں! اُن کے ذاتی ملاحظہ کے لئے تو شیو نرائن اور غالب دونوں، الگ الگ، آگے پیچھے، "دستنبو" کا ایک ایک نسخہ ہدیہ کر چکے تھے۔ مرزا تفتہ کے نام ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں غالب لکھتے ہیں کہ ہنری اسٹورٹ ریڈ کو۔

"ایک کتاب، سادہ ..... بھیجی تھی۔ کل ان کا خط مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا
بہت تعریف لکھتے تھے اور ہاں بھئی، ایک تماشا اور ہے: وہ مجھ کو لکھتے تھے کہ "دستنبو"
پہلے اس سے کہ تم بھیجو، مطبع مفید خلائق نے ہمارے پاس بھیجی ہے اور ہم اس کو دیکھ
رہے ہیں اور خوش ہو رہے تھے کہ تمہارا خط مع کتاب کے پہنچا۔"

اس یاد دہانی کے تین روز بعد، منشی شیو نرائن کا خط آگیا۔ اسی روز ۱۸؍ دسمبر ۱۸۵۸ء کو غالب نے اس کا جواب تحریر کیا:

"برخوردار، آج اس وقت تمہارا خط آیا۔ دل خوش ہوا۔۔۔۔جناب
ریڈ صاحب، صاحبی کرتے ہیں۔ میں اُردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا
ہوں۔ تین بیعنے میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے؟ بہت ہو گا کر
میرا اُردو، بہ نسبت اوروں کے فصیح ہو گا۔ خیر، بہرحال کچھ کروں گا اور
اُردو میں اپنا زور قلم دکھاؤں گا۔"

مراسلت کے اس اسلوب سے خیال ہوتا ہے کہ اُردو نثر میں قصے کہانی کی کتاب تالیف کرنے کی یہ فرمائش منشی شیو نرائن کے توسط سے بھی کی گئی ہو گی، جنھوں نے اسی زمانے میں "دستنبو" کا ایک نسخہ اس کے چھپتے ہی اپنے مطبع مفید خلائق کی طرف سے، ہنری اسٹوسٹ ریڈ کی نذر کیا تھا، بہرحال، کتاب اور اس کے مجوزہ، ریڈ صاحب کا ذکر یا اشارہ غالب کے ہاں، قریب بعد کے صرف ایک خط میں اور آیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالب اُردو نثر میں قصہ کہانی کی کتاب، ترتیب دینے کا وقت نہیں نکال سکے ــــــ یا، زیادہ صحیح یہ کہ ذہنی طور پر وہ اس کے لئے آمادہ ہی نہ ہو پائے۔ ۴۔ جنوری ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں وہ ضمناً اسٹورٹ ریڈ کا ذکر کرنے کے بعد، منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں کہ:

"میاں اُردو کیا لکھوں؟ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اُردو کی فرمائش ہو؟
خیر، ہوئی۔ اب میں کہانیاں قصے کہاں ڈھونڈتا پھروں؟ کتاب، نام
کو میرے پاس نہیں ــــ پنشن مل جائے، حواس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ
کروں۔ پیٹ پڑیں، روٹیاں تو سبھی گلاں موٹیاں ــــ"

اس کے بعد اس مجوزہ کتاب کا ذکر یا سراغ، غالب کے کسی اور خط میں نہیں ملتا۔ انھوں نے پنشن، مل جانے پر، اس کتاب کی "فکر" کو موقوف رکھا تھا۔ پنشن کی اجرائی، اس ارادے کے پورے ایک سال، چار ماہ بعد، بہت کھکھیڑیں اٹھانے پر، کہیں ۴۔ مئی ۱۸۶۰ء کو عمل میں آسکی [۵۱] لیکن "حواس ٹھکانے" ہو جانے اور "پیٹ پڑیں روٹیاں" والی شرط پھر بھی پوری نہ ہو پائی اس لئے کہ پنشن کا زر مجتمعہ ـــ سالہ، یک مشت ملنے پر، بہت ضروری قرض ادا کرنے کے بعد (جسے غالب نے "ادائے حقوق" کہا ہے)، چار سو روپے، ان کے ذمے باقی رہے اور ان کے پاس صرف ستاسی روپے گیارہ آنے بچے [۵۲] ـــــ اور یہ بھی، بہت رگڑ جھگڑ کر اور بعد

---

[۵۱] دیکھئے ششم مئی ۱۸۶۰ء کا ایک خط بنام مجروح، خطوط غالب، مرتبہ مالک رام، ۱۹۶۲ء، ص ۲۲۴۔

[۵۲] خطوط غالب، ص ۱۰۷

بچے، ورنہ ان کا قرض خواہ اور مختار کار خزانہ سے لے آیا تھا اور اپنا حساب صاف کرلئے بغیر اس کی ہوا نک دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ اسی زمانے میں مجروح کو لکھتے ہیں:

"..... خزانے سے روپیہ آگیا ہے۔ میں نے آنکھوں سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں
بات رہ گئی، پت رہ گئی۔ حاسدوں کا منہ آگئی۔ دوست شاد ہوگئے۔
میں جیسا ننگا تھا ویسا ہی ننگا ہوں اور ایسا ہی رہوں گا....."

دوسرے یہ کہ اردو نثر لکھنے کی [illegible] ڈیڑھ برس پہلے کی فرمائش کا انجام [illegible] اور [illegible] کی فرمائش جسے وہ اپنے منصب سے [illegible] فروتر خیال کرتے تھے —

[illegible] یونیورسٹی لائبریری [illegible] "منتخبات اردو" [illegible] نام [illegible] نولکشور لکھنؤ [illegible]

[illegible] کے سرورق کی عبارت یہ ہے:

"منتخبات اردو — کلکتہ یونیورسٹی کے داخلے کے امتحان کے واسطے [illegible]
یونیورسٹی کے جناب وائس چانسلر صاحب بہادر [illegible]
کے ارشاد کے مطابق ہدایت اور اعانت جناب [illegible] اسٹورٹ ریڈ صاحب
بہادر، ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ممالک مغربی [illegible] مولوی محمد کریم بخش سے
میر منشی محکمہ مذکور نے تالیف کی —"

قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ریڈ صاحب نے، غالب سے ایسی نصابی کتاب کی تالیف، یا اس کے لئے، کسی ایک قصے کی تالیف کی فرمائش کی ہوگی۔

۳- اردو زبان کے ظہور کا حال

- **زمانۂ تالیف:** ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۶ء

ماخذ: تذکرہ جلوۂ خضر (حصہ اول) از سید صفیر بلگرامی

مطبوعہ نور الانوار، آرہ ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء

غالب کے عزیز دوست، صاحب عالم مارہروی (۱۷۹۶ء — ۱۸۷۳ء) کے نواسے، صفیر بلگرامی[۵۲]، ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۴ء میں مرزا کے شاگرد ہوئے اور دو سال بعد مئی ۱۸۶۶ء میں ایک طویل سفر کرکے، مرزا غالب کی خدمت میں پہنچے اور بہت دن تک ان کے پاس

---

۵۱ تفصیل کیلئے دیکھئے: مضمون، ملک احمد نواز، مطبوعہ قومی زبان، کراچی جنوری ۱۹۶۹ء ص ۱۸-۲۲

۵۲ صفیر، سید فرزند احمد بلگرامی: ۹- اپریل ۱۸۳۴ء (۲۸ ذی قعدہ ۱۲۴۹ھ) کو اپنی ننھیال مارہرہ (ضلع ایٹہ) میں پیدا ہوئے۔
(بقیہ صفحہ ۵۷۷ پر)

مقیم رہے۔ اپنی ملاقات کا حال انہوں نے "جلوۂ خضر" میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس روداد سے غالب کی ایک تصنیف۔ اردو زبان کی ابتدا اور اس کے نشو و نما کی مختصر تاریخ کی نشاندہی ہوتی ہے:

"مجھ سے اور حضرت غالب علیہ الرحمت سے ایک مرتبہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان کے بارے میں گفتگو ہوئی اور سبب اس کا یہ ہوا کہ ان دنوں حضرت اپنے رسالے کا مسودہ، اُردو زبان کی تحقیق میں کاتب سے لکھوا رہے تھے، جو میں نے اس کے صاف شدہ اجزا ہاتھ میں لے لئے، حضرت نے دیکھ کر فرمایا، ہاں اس کو دیکھو، یہ ایک چیز میں نے ان دنوں بہ فرمائش ڈائرکٹر صاحب[1] لکھی ہے

اس میں اردو کی مختصر تاریخ اور کچھ قواعد تھے۔ کوئی پانچ چھ جزو کا رسالہ تھا۔ جناب ڈائرکٹر صاحب نے مولف ذخیرۂ خضر، صفیر بلگرامی کے نانا صاحب حضرت عالم کو بھی خط لکھا تھا کہ زبان اُردو کی تاریخ اور قواعد میں کوئی کتاب لکھ کر بھیج دیجئے۔ چنانچہ حضرت نے اس کا اہتمام میرے سپرد کیا تھا۔

بقیہ حاشیہ ص۵۷۶: نظم و نثر پر یکساں حادی تھے اور اس میں شک نہیں کہ بدرجہ غایت قادر الکلام تھے۔ متعدد مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف ان کی یادگار ہیں۔ بروز شنبہ، ۱۱ مئی ۱۸۸۹ء (۱۲ رمضان ۱۳۰۶ھ) کی دوپہر کو پٹنہ میں انتقال کیا [illegible]
[illegible]

[1] مراد، ڈائرکٹر میتھیو کیمپسن سے ہے جو بڑے علم دوست اور معارف پرور شخص تھے۔ اردو و فارسی کا بھی ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ان کے بارے میں کہا تھا کہ تعلیم کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کے گویا ہارون الرشید اور منصور تھے اور ہنود کے بکرماجیت اور بھوج"۔ کیمپسن مارچ ۱۸۷۶ء کے وسط میں اپنے عہدۂ ڈائرکٹری سررشتۂ تعلیم اضلاع شمال و مغرب سے رخصت فرلو پر تشریف لے گئے۔ دیکھئے (اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڈھ، مورخہ ۱۷ مارچ ۱۸۷۶ء ص۵)

[2] ڈائرکٹر ایم کیمپسن کا اصل خط، ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے احسن مارہروی مرحوم کے اخلاف کے یہاں دیکھا اور اسے اپنی قیمتی تالیف "احوال غالب" (۱۹۵۳ء) میں نقل کر دیا ہے (ص ۷۵-۷۶) اس خط سے بعض متعلقہ امور پر روشنی پڑتی ہے۔" اور قیاس غالب ہے کہ مرزا غالب کو بھی اسی خط کی نقل بھیجی گئی ہوگی۔ اس لئے یہاں پورا خط درج کیا جاتا ہے"

عنایت فرمائے دوستاں سید صاحب عالم معانی دام مارہرہ زاد عنایتکم
بعد اظہار شوق و مراسم عرضیہ کے واضح رائے محبت پیرائے ہو، چونکہ اکثر

(باقی صفحہ ۵۷۸ پر)

تحریریں نے اس کا مسودہ درست کرکے بھیج دیا تھا، پھر خدا جانے کیا ہوا۔ اس طرح حضرت غالب کو بھی لکھا تھا۔ وہ اسی رسالے کو لکھوا رہے تھے، الغرض، اسی رسالے کو پڑھنے میں کچھ دہلی و لکھنؤ کی زبان کا ذکر آگیا۔ ..."

(صفیر بلگرامی، جلوۂ خضر جلد اول ص۲۳۵-۲۳۶، در ذکر مومن)

خود غالب کے ایک خط بنام خواجہ غلام غوث بے خبر[۱۰] سے، اس کی توثیق ہوتی ہے کہ غالب نے میتھیو کیمپسن کی فرمائش پر

بقیہ حاشیہ ص۵۷۷: اوصاف جمیلہ و محامدِ نبیلہ آپ کی درباب واقفیتِ تاریخ و زبان دانی و دیگر فضائل و کمال کے گوش زد این جانب کے ہوئے، اس لئے آپ کو براہِ دوستانہ اس امر کی تکلیف دی جاتی ہے کہ اگر آپ کو حال مفصّل ایجادِ زبان اُردو معلوم ہو تو اس کی کیفیت .... تحریر کرکے مجھے ممنون کیجئے اور اس تحقیقات سے وہ دریافت حال زبانِ مسطور مطلوب ہے کہ جس سے حال زمانۂ ابتدائے اجرائے اردو اور نیز تصریح اس امر کی کہ کس عہد سے زبان مذکور، داخلِ نوشت و خواند اہل ہند ہوئی معلوم ہو جائے۔ اور کن کن استادوں نے زبان مذکور میں ابتدا شعر و سخن یا نثر کے مضامین لکھنے شروع کئے اور کتنے محاوراتِ قدیم، اب تبدیل ہو گئے اور اس تبدیلی سے اس زبان میں آیا شستگی و رنگینی آئی یا کسی طرح کا نقص پیدا ہوا اور اگر کلام اُن استاتذۂ قدیم کے یاد ہوں یا کسی تذکرے میں آپ کی نظر سے گزرے ہوں تو بطور مشتے نمونہ از خروارے، سلک تحریر فرما کر ممنون کریں اور جو کوئی کتاب حاوی ان امور کی مل سکے، اس کو بطور عاریت یا بہ قیمت، جیسا مناسب ہو (عطا) فرمائیں نہایت موجب احسان مندی ہوگا اور چونکہ جس کتاب کا اس جانب کو قصدِ تالیف ہے اور جس کی امداد کے لئے آپ کو تکلیف دی گئی ہے اس میں حال شعراء وغیرہ کا بقید نام و مسکن و زمانہ لکھا جائے گا، آپ جو کیفیت ان استادوں کی تحریر فرمائیں تو اس میں امورِ صدر کا ضرور لحاظ رہے۔ فقط

المرقوم ۲۷- جون ۱۸۶۶ء — رقیمۃ الشوق.

کیمپ کوہ منصوری — ایم. کیمپسن

[۱۰] بے خبر ۱۸۲۵ء (۱۲۴۰ھ) نیپال میں پیدا ہوئے۔ چار برس کے تھے کہ جب انکے والد نقل مکان کرکے ہندوستان آئے اور بنارس میں (بقیہ ص۵۷۹ پر)

اردو زبان کے ظہور کا حال لکھا تھا۔ دو شنبہ ۲۳ جولائی ۱۸۶۶ء[^1] کے ایک خط میں غالب لکھتے ہیں:

"جناب کیپٹن صاحب بہادر افسر مدارس مغرب و شمال کا باوجود عدم تعارف، خط مجکو آیا۔ کچھ اردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا۔ اس کا جواب لکھ بھیجا۔ نظم و نثر اردو کی طلب کی تھی، مجموعہ نظم بھیج دیا۔ نثر کے باب میں.... یہ لکھا کر..... مجموعہ چھپا پاجاتا ہے۔ بعد انطباع و حصول اطلاع..... منگاکر بھیج دوں گا ––"

لیکن ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کا خیال ہے کہ:

"غالب نے اُردو زبان کی تحقیق میں کوئی رسالہ پانچ چھ جزو کا لکھا تھا یہ محلِ نظر ہے۔ صفیر کے علاوہ اس رسالے کا ذکر کسی نے نہیں کیا۔ خود غالب کی تحریروں میں اس کا پتہ نہیں۔ اس قدر اہم موضوع پر اُن کی کوئی تصنیف ہوتی تو معاصرین بھی اس کا ذکر ضرور کرتے اور وہ کتاب اسقدر جلد فنا بھی نہ ہو جاتی۔ خود غالب کے ایک خط –––– (مذکورۃ الصدر، بنام، خواجہ غلام غوث بے خبر) سے اس کے خلاف مترشح ہے....

قابلِ غور امر یہ ہے کہ غالب، کسی کتاب کی تصنیف کا ذکر نہیں کرتے "خط مجکو آیا.... اس کا جواب لکھ بھیجا" سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بس اس کے جواب میں ایک خط لکھ دیا۔ ممکن ہے وہ خط کچھ طویل ہو لیکن پوری کتاب لکھی ہو، قرینِ قیاس نہیں "

(احوال غالب، صہ ۷۴-۷۵)

بقیہ حاشیہ ص ۵۷۸: سکونت اختیار کی چنانچہ بے خبر کی نشوونما اور تعلیم و تربیت اسی شہر میں ہوئی۔ اردو سے کم اور فارسی سے زیادہ شغف تھا۔ فارسی نظم و نثر کا ایک مجموعہ خونبابۂ جگر کے نام سے اور اردو خطوط فغان بے خبر کے نام سے ان کی زندگی میں چھپے بقیہ کلام نظم و نثر ان کی وفات کے بعد اُن کے ایک عزیز نے ۱۹۰۶ء میں شائع کیا۔ ۸، شوال ۱۳۲۲ھ، ۲۶ دسمبر ۱۹۰۴ء کو الہ آباد میں انتقال فرمایا، وہیں دائرہ شاہ محمدی میں دفن ہوئے۔ (مالک رام تلامذۂ غالب، صہ ۱۹۳)

[^1]: مرتضیٰ حسین فاضل، عود ہندی، طبع مجلس لاہور، صہ ۳۲۲

غالب کے خط سے "ص ف" تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بس "کپتان کے جواب میں ایک خط لکھ دیا" ہو۔ کپتان کے استفسار تفصیل طلب تھے۔ ان کے جواب "پانچ چھ جزو" سے کم میں سما بھی کیا سکتے تھے۔ غالب نے بالصراحت، اگر مذکورہ خط میں "کتاب یا رسالے" کا لفظ استعمال نہیں کیا، تو اس کے لازماً یہ معنی نہیں کہ انہوں نے، اس موضوع پر استفسارات کے جواب کی فرمائش میں کوئی کتاب یا رسالہ تصنیف بھی نہ کیا ہو، الا یہ کہ واقعی خارجاً کسی معتبر ذریعے سے اس کی تردید ہوتی ہو۔ اس کا بار ثبوت ابھی باقی ہے جبکہ اس کے بالعکس ایک معاصر عینی شہادت موجود ہے۔ اس لئے یہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں کہ غالب نے اردو زبان کی ابتدا اور اس کی نشو و نما کی مختصر تاریخ مع اضافہ قواعد اردو لکھی ــــ وہ کہیں نہ کہیں ضرور پڑی ہوگی، اگر دست برد زمانہ کے ہاتھوں تباہ و برباد نہیں ہو چکی ــــ

۴۔ ناتمام اُردو قصہ

● تالیف: فروری ۱۸۶۹ء

ماخذ: یادگار غالب، حالی، ۱۸۹۷ء

"یادگار غالب" میں حالی نے غالب کی "نثر اردو" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"مرزا کی اردو نثر میں، زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں ..... اس کے سوا، چند اجزا ایک ناتمام قصے کے بھی ہیں جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا"

لیکن حالی کی اس نشاندہی اور شہادت کے باوجود مجھے اس میں تامل ہے کہ غالب نے مرنے سے "چند روز پہلے" کوئی اردو قصہ لکھنا شروع کیا ہوگا۔ اس لئے دوسری طرف خود حالی ہی کے بقول:

"مرنے سے چند روز پہلے بیہوشی طاری ہو گئی تھی۔ پہر پہر، دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لئے افاقہ ہو جاتا، پھر بے ہوش ہو جاتے تھے"

●

"..... مرنے سے کئی برس پہلے چلنا پھرنا بالکل موقوف ہو گیا تھا اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے، غذا کچھ نہ رہی تھی۔ چھ چھ، سات سات دن میں، اجابت ہوتی تھی ....."

●

"آخر عمر میں موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے ..... بہت سی باتیں اور حکایتیں ان سے منقول ہیں، جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ

آخر عمر میں مرنے کے کتنے آرزومند تھے۔

●

"جس روز انتقال ہوا، اس سے شاید ایک روز پہلے میں ان کی عیادت کو گیا تھا۔ اس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا اور نواب علاء الدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا، لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا:

"میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو، ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔"

●

مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر وردِ زبان رہتا تھا:

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

● ● ●

"آخیر عمر اور مرض الموت کی حالت" کے تحت، حالی کے بیانات مظہر ہیں کہ آخر، غالب کی حالت اتنی خستہ و خراب ہو چکی تھی کہ خطوط وغیرہ تک کا جواب، وہ خود نہیں لکھ پاتے تھے، دوسروں سے لکھواتے تھے۔ ایسے میں یہ بات، گو حالی ہی کی کہی ہوئی ہے جی کو نہیں لگتی کہ غالب نے کوئی قصد، مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ اس موقف کو حالی سے مقدم ایک نادر و معاصر ماخذ سے بھی تقویت پہنچتی ہے۔ میری مراد میر مہدی مجروح کے ایک مضمون سے ہے جو غالب کے انتقال کے فوراً بعد ۱۷ فروری ۱۸۶۹ء کے اکمل الاخبار، دہلی میں شائع ہوا اور جسے غالب کے بعد غالب کے حالات میں پہلا مضمون خیال کرنا چاہیے۔ مجروح لکھتے ہیں کہ:

"جناب مرحوم دو تین مہینے صاحبِ فراش رہے۔ ضعف و نقاہت کے صدمے سہے، آٹھ دن انتقال سے پہلے کھانا پینا ترک فرمایا، اس دنیائے فانی سے بالکل دل اٹھایا۔[۱]"

۱۔ اکمل الاخبار، دہلی جلد ۴ نمبر ۷، مطبوعہ ۱۷ فروری ۱۸۶۹ء صفحہ ۵۵

ایسے میں کہ وہ مدتیں مہینے صاحبِ فراش رہے، ضعف و نقاہت کے صدمے سہے، آٹھ دن، انتقال سے پہلے، کھانا پینا تک ترک ہوا، اس دنیائے فانی سے بالکل دل اٹھ گیا، باور نہیں آتا کہ انھوں نے کیوں کر "مرنے سے چند روز پہلے" کسی قصے کی تصنیف کا ڈول ڈالا ہوگا — اور خصوصیت سے اس صورت میں تو اور بھی کہ اس "مبینہ" "ناتمام اردو قصے کے اجزا" کہیں دستیاب نہیں ہوتے۔

یہاں ایک شبے کا اظہار کر دینا بے محل نہ ہوگا: ہو سکتا ہے کہ حالی نے "چند برس" لکھا ہو اور سہو کتابت سے یہ "چند روز" ہو گیا ہو! یا "چند برس" کی جگہ روانی میں حالی ہی کے قلم سے "چند روز" نکل گیا ہو، گو اس سے مقصود یہ نہ ہو — اگر، حالی کی اس عبارت: "مرنے سے چند روز پہلے" کو "چند برس" مان لیا جائے تو اس صورت میں حالی کا اشارہ اس قصے کی طرف ہو سکتا ہے، ہنری اسٹورٹ ریڈ کے حوالے سے جس کا ذکر غالب نے ۸ دسمبر ۱۸۵۸ء کے اپنے بعض مکاتیب موسومہ شیو نرائن میں کیا ہے۔ لیکن یہ محض تاویل ہوگی۔ اس لئے کہ ریڈ کی فرمائش پر غالب نے اپنے انتقال سے کوئی دس گیارہ برس پہلے "قصہ کہانی" لکھنے کے چکر میں پڑے تھے دس گیارہ برس کی اچھی خاصی مدت کے لئے حالی کا "چند برس" لکھنا بھی بجائے خود محل نظر آتا ہے۔

یہاں تک غالب کی جن چار تحریروں کا ذکر ہوا، وہ ضخامت کے اعتبار سے کتاب کے حجم کی رہی ہوں گی۔ ان چار تصانیف کے علاوہ غالب کے خطوں میں اُن کی بعض دیگر مختصر نگارشات کا ذکر بھی ملتا ہے جو اب معدوم ہیں اور قیاس کہتا ہے کہ ورق دو ورق کے پھیلاؤ سے زیادہ کی نہ ہوں گی۔ اس فرصت میں ایسی صرف دو تحریروں کا ذکر کیا جاتا ہے:۔

۱۔ **سنینِ فارسیہ کا حال ۱۸۶۰ء**:۔ "سنینِ فارسیہ" کے بارے میں خلیفہ احمد علی صاحب[۱] احمد رامپوری کے نام ایک خط میں جو جنوری سے مارچ ۱۸۶۰ء تک کے دوران میں کسی وقت لکھا گیا، غالب کہتے ہیں:۔

"۔۔۔۔ فقیر شب کو آپ کا منتظر رہا۔ آپ تشریف نہ لائے۔ ناچار تقریر کو تحریر کا پیرایہ دے کر، آپ کی جناب میں بھیجتا ہوں[۲]۔ سنینِ فارسیہ کا حال

۱؎ "خلیفہ شیخ احمد علی احمد تخلص، والد شیخ نادر علی تقریباً ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۵ء) میں پیدا ہوئے۔ رامپور کے اکثر فارسی ادب کے علماء کا سلسلہ اُن تک منتہی ہوتا ہے۔ نواب خلد آشیاں اور نواب عرش آشیاں طاب ثراہما کی اُستادی کا بھی شرف حاصل تھا۔ خلیفہ صاحب نے جمعرات کے دن ۲۹ رمضان ۱۳۰۹ھ (۲۸ اپریل ۱۸۹۲ء) کو ۹۰ سال کی عمر میں اپنے مکان واقع محلہ بنگلہ آزاد خاں (رامپور) میں انتقال کیا۔ اُن کی فارسی نظم و نثر کا ایک چھوٹا سا مجموعہ کتاب خانہ عالیہ رامپور میں محفوظ ہے" (عرشی، مکاتیبِ غالب، ص ۱۱۳)

۲؎ "میرزا غالب رامپور تشریف لائے اور خلیفہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو موخر الذکر نے اثنائے گفتگو میں عرفی کے کلام پر نکتہ چینی کی۔۔۔۔ میرزا صاحب نے عرفی کی حمایت کی لیکن اُس وقت بحث ناتمام رہی اور یہ طے پایا کہ خلیفہ صاحب شب کو آ کر گفتگو کریں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس وقت رات کو تشریف نہ لیجا سکے۔ اس لئے میرزا صاحب نے اپنے دلائل لکھ کر اُن کی خدمت میں بھیج دیئے"
(عرشی مکاتیب غالب ص ۱۱۳)

بسبیلِ اجمال ایک دو ورقہ پر مندرج ہے۔ بنظرِ اصلاح مشاہدہ ہو۔"
(مکاتیبِ غالب، مرتبہ عرشی ص ۱۱۴)

غالب کے اس خط کی بابت اور سنینِ فارسیہ سے متعلق اُن کی نگارش کے بارے میں امتیاز علی خاں صاحب عرشی فرماتے ہیں :-

"میرزا صاحب کا یہ خط مولوی عبدالحکیم خاں صاحب مدرسِ فارسی، مدرسۂ عالیہ رامپور سے مبلغ ۲۵ روپے میں خریدا گیا تھا۔ خیال تھا کہ سنینِ فارسی کی کیفیت پر مشتمل دو ورقہ بھی موصوف الذکر بزرگ کے پاس ہوگا لیکن باوجود تلاش دستیاب نہ ہوسکا۔" (حواشی مکاتیبِ غالب، ص ۱۸۰)

۲۔ سولہ شعراء کے تراجم، ۱۸۶۴ء :- غالب نے ریٹیگن صاحب، قائم مقام ڈپٹی کلکٹر شہر دہلی کی فرمائش پر اپنے سولہ واقف حال ہمعصر شعراء کا مختصر حال قلمبند کیا تھا اور جس طور پر قلم بند کیا تھا۔ اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ساری تفصیل ایک دو ورق ہی میں آگئی ہوگی۔ یہ نگارش اب معدوم ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کے نام غالب کے ایک خط روز جمعہ ۹ دسمبر ۱۸۶۴ء سے اِس کا سُراغ ملتا ہے۔ غالب لکھتے ہیں کہ بیماری و ناتوانی کے باعث :

کمشنر و ڈپٹی کمشنر وغیرہ حکامِ شہر سے ترکِ ملاقات ہے۔ مگر ڈپٹی کلکٹر شہر سے، کہ وہ مہتمم خزانہ ہے، ہر مہینے میں ایک بار ملنا ضرور ہے۔ اگر نہ ملوں تو مختارِ کار کو تنخواہ نہ ملے۔ ڈکر ودر صاحب ڈپٹی کلکٹر چھ مہینے کی رخصت لیکر پہاڑ پر گئے۔ اُن کی جگہ ریٹیگن صاحب مقرر ہوئے[۱]۔ اُن سے ناچار ملنا

---

[۱] اپنے اسی خط مورخہ ۹ دسمبر ۱۸۶۴ء کے آخر میں غالب لکھتے ہیں کہ :-

"ریٹیگن صاحب، اب عدالتِ خفیفہ کے جج ہو گئے۔ ڈکر ودر صاحب پہاڑ سے آ گئے، اپنا کام کرنے لگے۔ ریٹیگن صاحب، شہر سے باہر دو کوس کے فاصلے پر جا رہے۔"

تفتہ ہی کے نام ۱۲ فروری ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں غالب اطلاع دیتے ہیں کہ :-

"ریٹیگن صاحب بہ پنجشنبے کے دن ۱۹ جنوری سنہ حال کو..... پنجاب کو گئے ملتان یا پشاور کے ضلع میں کہیں کے حاکم ہونے ہیں۔ میں اپنی ناتوانی کے سبب اُن کی ملاقات تو دریغ کو نہیں گیا۔"

ریٹیگن صاحب لاہور میں بھی حاکم رہے چنانچہ ریٹیگن روڈ، اُن ہی کے نام سے منسوب ہے۔

پڑا. وہ، تذکرہ شعرائے ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں[1]. مجھ سے بھی اُنھوں نے مدد چاہی. میں نے سات کتابیں بھائی ضیاء الدین احمد خاں صاحب سے مستعار لیکر اُن کے پاس بھیجدیں. پھر اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ جن شعراء کو تو اچھی طرح جانتا ہے، اُن کا حال لکھ بھیج. میں نے سولہ آدمی لکھ بھیجے، بقید اس کے، کہ اب زندہ موجود ہیں اور اس سواد کی صورت یہ ہے:-

نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر، رئیس لوہارو: فارسی اور اُردو، دونوں میں شعر کہتے ہیں. فارسی میں نیّر اور اُردو میں رخشاں تخلص کرتے ہیں. اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد.

●

نواب مصطفےٰ خاں بہادر، علاقہ دار جہانگیر آباد: اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں. اُردو میں مومن خاں کو اپنا کلام دکھاتے تھے.

●

منشی ہرگوپال، معزز قانون گو سکندرآباد کے: فارسی شعر کہتے ہیں. تفتہ تخلص کرتے ہیں. اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد.

●

اصل یہ ہے کہ تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے. اشعار ہندی اور فارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائے گا. صرف شاعر کا اور اُس کے اُستاد کا نام اور شاعر کے مسکن و موطن کا نام مع تخلص درج ہوگا.

غرض اِس انداز پر غالب نے سولہ شاعروں کا حال لکھا. تین کے کوائف بطور نمونہ غالب نے مذکورہ خط میں درج کئے. یہ خط ہو گئے. بقیہ تیرہ کے اسماء و احوال کی کیفیت کسی اور ذریعے سے معلوم نہیں ہوتی لیکن غالب قیاس یہ ہے کہ بقیہ تیرہ اصحاب غالب ہی کے شاگرد ہوں گے اور اُن کے حال میں بھی محض نام، تخلص، اُستاد کے نام اور مسکن و موطن کی صراحت ہوگی.

---

[1] تذکرۃ الشعراء کے تعارف میں رجوع کیجئے مضمون "غالب کی خود نوشت سوانح عمری کا ایک ورق" متعارفہ:-

(۱) مولوی عبدالحق، رسالہ اُردو، اورنگ آباد جولائی ۱۹۲۸ء ص ۳۲۷ - ۳۲۹

(۲) اظہار الحق ملک، احوال غالب (آرزو) علی گڑھ ۱۹۵۳ء ص ۲۴ - ۲۸

(۳) سعیدہ ادبی، آج کل، دہلی فروری ۱۹۵۵ء ص ۷ - ۱۲

سیّد مصطفیٰ علی بریلوی
بی کام ایل ایل بی

کتابیاتِ غالب

کانفرنس کے کتبخانے میں

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ اُن چند خوش نصیب اشخاص میں سے ہیں جن کی شہرت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ ہزاروں مقالے کتابیں یادداشتیں مجموعۂ خطوط، تشریحات، کلام شائع ہونے کے باوصف تشنگانِ علم غالب سے متعلق خوب سے خوب تر مواد پیش کرنے میں دن رات مشغول ہیں۔ بعض علمی رسالے "مقالہ نما" بھی مرتب کرتے ہیں جس سے بلند پایہ مقالہ جات کے متعلق آسانی کے ساتھ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں انجمن ترقی اردو کے رسالہ "قومی زبان"، نگار کراچی، بُرہان دہلی، "المعارف" لاہور کو خاصی شُہرت حاصل ہے۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی لائبریری میں بھی بعض رسائل علمی کا ایک محدود مُجلد ذخیرہ موجود ہے اس ذخیرہ علمی میں غالب سے متعلق شائع شدہ مضامین کی مختصر یادداشت درج ذیل ہے۔ اس کے علاوہ اُن کتابوں کی فہرست بھی ذیل میں درج کی جاتی ہے جو کانفرنس کی مجلس منتظمہ کے بزرگ اور سیکریٹری سرسید گرلز کالج جناب مولوی عظمت اللہ ایڈوکیٹ اور جناب محمد ایوب قادری کے ذاتی کتبخانوں کی زینت ہیں۔ اس فہرست میں سے کچھ کتابیں کتبخانہ کانفرنس میں بھی موجود ہیں۔

نمبر شمار		ماہ	سن	
۱	ماہنامہ نگار لکھنؤ	جنوری	۱۹۲۸ء	"مومن نمبر"، موازنہ مومن اور غالب از مولانا عبدالباری آسی
۲	〃 〃 〃	مارچ	۱۹۵۰ء	اشارات، غالب کے مطالعہ کے لئے از خیر بہوروی
۳	〃 〃 〃	ستمبر	〃	غالب اور مفتی محمد عباس از مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی
۴	〃 〃 〃	〃	۱۹۵۱ء	غالب اور ٹونک از جوہر ٹونکی مرحوم
۵	〃 〃 〃	اپریل	۱۹۵۳ء	مرزا غالب نقاد کی حیثیت سے از نیاز فتحپوری
۶	〃 〃 〃	مارچ	۱۹۵۴ء	تبصرہ احوال غالب از مختار الدین آرزو

۷	" " "	نومبر	۱۹۵۵ء	غالب کی مثنوی نگاری از نیاز فتحپوری
۸	" " "	دسمبر	"	اقبال اور غالب از فرمان فتحپوری
۹	" " "	مئی	۱۹۵۶ء	غالب اور تقلید از میر محمد عظیم
۱۰	" " "	ستمبر تا دسمبر	"	مشکلات از نیاز فتحپوری
۱۱	" " "	مارچ	۱۹۵۴ء	غالب اور میرٹھ از شوکت سبزواری
۱۲	" " "	جون	۱۹۵۷ء	مشکلات غالب، از سید احتشام احمد ندوی
۱۳	نقوش لاہور	سالنامہ	۱۹۶۳ء	غالب کے غیر مطبوعہ خطوط از نثار احمد فاروقی
۱۴	علیگڑھ میگزین	غالب نمبر	۱۹۴۸-۴۹ء	غالب کی عظمت از پروفیسر آل احمد سرور، مرزا غالب از مالک رام ایم اے۔ غالب کی خاندانی پنشن از غلام رسول مہر، غالب کا مقدمہ از مہر دہلی سوسائٹی اور مرزا غالب از ڈاکٹر عبدالستار، غالب کا ایک فرضی استاد از قاضی عبدالودود، امراؤ بیگم از پروفیسر حمید احمد خاں، باقر علی خاں کامل از مس حمیدہ سلطان، نوادر غالب از مختار الدین آرزو، غالب کی شعر گوئی از امتیاز علی خاں عرشی، لطائف غیبی اور غالب از عبدالمجید سالک، برہان قاطع کا تصفیہ از مولوی مہیش پرشاد، غالب کی شخصیت از پروفیسر شوکت سبزواری، غالب کے خطوط از مفتون احمد ایم اے علیگ، غالب کا الہام شعر و ادب از عبدالمالک آروی، کیا غالب کا کلام الہامی ہے از مس شہناز ہاشمی، غالب بحیثیت محقق از قاضی عبدالودود، غالب کی عشقیہ شاعری از پروفیسر عبادت بریلوی، مآثر غالب از قاضی عبدالودود
۱۵	معارف اعظم گڑھ	فروری	۱۹۵۹ء	غالب پر سکہ کا الزام اور اس کی حقیقت از جناب مالک رام
۱۶	" "	اپریل	۱۹۵۸ء	غالب کا سکہ از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی
۱۷	" "	نومبر	"	غالب کا سکہ شعر از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (بہادر شاہ ظفر کو غالب نے سکہ کے واسطے شعر پیش کیا تھا)
۱۸	" "	ستمبر	۱۹۵۹ء	غالب سے منسوب دوسرا سکہ اور اس کی حقیقت از مالک رام

۱۹	۰ ۰	نومبر	۱۹۶۳ء	موازنۂ اقبال و غالب از پروفیسر عبدالمغنی
۲۱	″ ۰	جنوری	۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۱ء	"غالب نما" از نثار احمد فاروقی
۲۲	سب رس حیدرآباد	ستمبر تا اکتوبر	۱۹۵۰ء	"غالب کا قیام آگرہ" از پروفیسر خواجہ محمد حامد
۲۳	نوائے ادب بمبئی			دستنبو کا ایک خاص نسخہ از سید جمیل الدین (قسط وار)
۲۴	معارف علی گڑھ	ستمبر	۱۹۴۴ء	غالب نے اردو خط و کتابت کب سے شروع کی۔
۲۵	″ ″	مارچ	۱۹۴۳ء	مفتی صدرالدین آزردہ از مفتی انتظام اللہ شہابی
۲۶	ماہ نو کراچی	فروری	۱۹۶۲ء	غالب کے فارسی خطوط از قاضی عبدالودود، غالب کون ہے از سید قدرت نقوی غالب کا تصور عشق از حمیدہ سلطان، لخت لخت از عابد رضا بیدار (مرزا غالب کی زندگی کے واقعات)

ذخیرہ مولوی عظمت اللہ دہلوی

۱۔ دیوان غالب۔ مرتبہ سردار جعفری
۲۔ دیوان غالب کی ہندی فرہنگ
۳۔ دیوان غالب مصور (مرقع چغتائی)
۴۔ دیوان غالب (تاج کمپنی لمیٹڈ، کراچی)
۵۔ خطوط غالب از غلام رسول مہر (دو حصص)
۶۔ انتخاب غالب بتصحیح امتیاز علی عرشی
۷۔ یادگار غالب مرتبہ مولانا حالی
۸۔ مکاتیب غالب از امتیاز علی عرشی
۹۔ غالب از غلام رسول مہر
۱۰۔ عود ہندی
۱۱۔ نقش چغتائی۔ دیوان غالب مصور
۱۲۔ روح کلام غالب المعروف بہ تفسیر کلام غالب
۱۳۔ مرقع غالب
۱۴۔ ماہنامہ "تحریک" دہلی غالب نمبر
۱۸۔ نقد غالب مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد
۱۹۔ مرزا نوشہ از عشرت رحمانی
۲۰۔ اردوئے معلی غالب نمبر
۲۱۔ افکار غالب از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
۲۲۔ ترجمان غالب از سید شہاب الدین مصطفی (عثمانیہ)
۲۳۔ دیوان غالب مع شرح از جوش ملسیانی
۲۴۔ احوال غالب از ڈاکٹر مختار الدین احمد
۲۵۔ دیوان غالب مرتبہ مالک رام
۲۶۔ کلام غالب نسخۂ قدوائی ۱۹۶۰ء از جلیل احمد قدوائی۔
۲۷۔ فرہنگ غالب مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی
۲۸۔ دیوان غالب از آغا محمد طاہر
۲۹۔ روح غالب شرح دیوان غالب از ابو نعیم مولانا عبدالحکیم خاں نشتر جالندھری
۳۰۔ دیوان غالب از مکتبہ جدید۔ میری لائبریری تھا

۱۵۔ "نگار" لکھنؤ غالب نمبر
۱۶۔ غالب کی نادر تحریریں مرتبہ خلیق انجم
۱۷۔ غالب کا ابتدائی دور از ڈاکٹر خورشید الاسلام
۳۱۔ شرح دیوان اردوئے غالب نظم طباطبائی
۳۲۔ مطالعۂ غالب از اثر لکھنوی
۳۳۔ غالب نامہ۔ آثار غالب از شیخ محمد اکرم آئی، سی، ایس
۳۴۔ نادرات غالب از آفاق حسین آفاق
۳۵۔ مراۃ الغالب شرح حضرت بیخود دہلوی
۳۶۔ تلامذۂ غالب از مالک رام
۳۷۔ مکمل شرح کلام غالب از مولوی عبدالباری آسی
۳۸۔ جان غالب از انعام اللہ خاں ناصر
۳۹۔ نادر نامۂ غالب۔ مکتبہ نیا راہی
۴۰۔ غالب فیروز سنز
۴۱۔ شرح دیوان غالب از پروفیسر یوسف سلیم چشتی
۴۲۔ بیان غالب شرح دیوان غالب از آغا محمد باقر
۴۳۔ دیوان غالب از پروفیسر ملک محمد عنایت اللہ
۴۴۔ ذکر غالب مکتبہ جامعہ دہلی
۴۵۔ سرگزشت غالب از آغا ئے رازی
۴۶۔ حیات غالب آغا بیدار بخت خاں
۴۷۔ ادبی خطوط غالب از مرزا عسکری۔ بی اے۔
۴۸۔ دیوان غالب اردو مطبع شوکت کا دیاتی برلن
۴۹۔ دیوان غالب نیو تاج آفس دہلی

(50) Ghalib, The man and his verse. by P. L. Lakhanpal.
(51) Ghalib – His Life and Persian Poetry by Dr. A. C. S. Gilani.

ذخیرہ محمد ایوب قادری

۱۔ دیوان غالب (جدید) نسخۂ حمیدیہ
مرتبہ مفتی محمد انوار الحق (آگرہ ۱۹۲۱ء)
۲۔ دیوان غالب۔ مرتبہ آغا طاہر، آزاد بک ڈپو دہلی ۱۹۳۶ء
۳۔ دیوان غالب (تاج کمپنی لاہور ــــــ)
۴۔ دیوان غالب مع شرح از عبدالرشید علوی بی اے
(مقدمہ غلام رسول مہر) حق برادرز لاہور ۱۹۴۰ء)
۵۔ سرود غالب مرتبہ یوسف بخاری (دہلوی)
(شیخ مبارک علی، لاہور ۱۹۶۸ء)
۶۔ کلیات نثر غالب (اردو) مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی
(مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۷ء)
۸۔ کلیات غالب فارسی (نظم)
(مطبع نول کشور ۱۹۲۵ء)
۹۔ کلیات نظم فارسی (جلد دوم) مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل
(مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۷ء)
۱۰۔ کلیات نظم فارسی (جلد اول)
مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل
(مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۷ء)
۱۱۔ باغ دودر (مرتبہ وزیر الحسن عابدی)
اورینٹل کالج میگزین ۱۹۶۰-۶۱ء
۱۲۔ نادر نامہ غالب (جے۔ ایس سنت سنگھ اینڈ سنز دہلی

کلیات نثر غالب (فارسی)
(نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۵ء)
۱۴۔ اُردو ئے معلّیٰ (مکمل) مرزا اسداللہ خاں غالب
(مطبع مجیدی کانپور ۱۹۲۲ء)
۱۵۔ اُردوئے معلّیٰ (ہر دو حصہ) مع فرہنگ
مرتبہ حافظ احمد (شیخ ظفر محمد تاجران کتب لاہور)
۱۶۔ عودِ ہندی۔ اسداللہ خاں غالب (طبع لاہور)
۱۷۔ خطوط غالب حصہ اوّل۔ مرتبہ مولانا غلام رسول مہر
کتاب منزل لاہور ۱۹۵۱ء
۱۸۔ خطوط غالب حصہ دوم (مرتبہ مولانا غلام رسول مہر)
(کتاب منزل لاہور ۱۹۵۱ء)
۱۹۔ مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی
(رامپور ۱۹۴۹ء)
۲۰۔ نادرات غالب: مرتبہ آفاق حسین آفاق،
(ادارہ نادرات کراچی ۱۹۴۹ء)
۲۱۔ ادبی خطوط غالب: مرتبہ مرزا محمد عسکری
مبارک بکڈپو کراچی ۱۹۵۰ء
۲۲۔ متفرقات غالب:۔ مرتبہ مسعود حسن رضوی
ہندوستانی پریس رامپور ۱۹۴۷ء
۲۳۔ غالب کی نادر تحریریں: خلیق انجم
مکتبہ شاہراہ دہلی ۱۹۶۱ء
۲۴۔ شرح دیوان غالب، شوکت میرٹھی ماہرالسنہ شرقیہ
(مطبوعہ ۱۸۹۹ء)
۲۵۔ شرح اُردو دیوان غالب، علی حیدر طباطبائی
(انوار بکڈپو، کراچی ۱۹۵۰ء)
۲۶۔ شرح دیوان غالب حسرت موہانی (مطبوعہ)

۱۳۔ اُردوئے معلّیٰ۔ اسداللہ خاں غالب
اکمل المطابع دہلی ۱۸۹۹ء
۲۷۔ مراۃ الغالب (شرح دیوان غالب) وحیدالدین بیخود
(آزاد بکڈپو دہلی ۱۹۴۴ء)
۲۸۔ شرح دیوان غالب: یوسف تسلیم چشتی
عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور ۱۹۵۹ء)
۲۹۔ انتخاب غالب: مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی
(رامپور ۱۹۴۲ء)
۳۰۔ ارمغان غالب: مرتبہ شیخ محمد اکرام
(تاج آفس بمبئی)
۳۱۔ انتخاب غالب: پروفیسر ممتاز حسین
(اُردو اکیڈیمی سندھ، کراچی ۱۹۵۳ء
۳۲۔ کلام غالب (نسخہ قدوائی) مرتبہ جلیل قدوائی
(ادارہ نگارش و مطبوعات، کراچی ۱۹۶۰ء)
۳۳۔ انتخاب کلام غالب از ماہر القادری
(فاران کراچی فروری ۱۹۶۹ء)
۳۴۔ یادگار غالب: خواجہ الطاف حسین حالی
(شیخ مبارک علی لاہور ۱۹۳۲ء)
۳۵۔ غالب از غلام رسول مہر
(طبع لاہور ۱۹۴۴ء)
۳۶۔ ذکر غالب از مالک رام
مکتبہ جامعہ لمٹیڈ دہلی ستمبر ۱۹۶۲ء
۳۷۔ غالب نامہ از شیخ محمد اکرام
چوتھا ایڈیشن، تاج آفس بمبئی،
۳۸۔ حکیم فرزانہ
شیخ محمد اکرام (فیروز سنز لاہور ۱۹۵۰ء)

۳۹۔ غالب ـ فکر و فن: ڈاکٹر شوکت سبزواری
انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۶۰ء

۴۰۔ تلامذہ غالب: مالک رام
(مرکز تصنیف و تالیف نکودر ۱۹۵۷ء)

۴۱۔ نکات غالب: نظام الدین حسین نظامی بدایونی
نظامی پریس بدایوں ۱۹۵۹ء

۴۲۔ محاسن کلام غالب: ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری
انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۵۹ء۔

۴۳۔ غالب: ڈاکٹر عبداللطیف
(ترجمہ معین الدین قریشی) (حیدرآباد دکن ۱۹۳۲ء)

۴۴۔ نقش آزاد: مرتبہ غلام رسول مہر
(دوسرا ایڈیشن کتاب منزل لاہور۔ جولائی ۱۹۵۹ء)

۴۵۔ مقام غالب: محمد موسیٰ خاں کلیم
ادارہ، نئی تحریریں، پٹنہ ۱۹۶۵ء)

۴۶۔ تجزیہ کلام غالب: رفیع الدین بلخی
آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۵-۶۶ء)

۴۷۔ جہانِ غالب: کوثر چاندپوری
(مکتبہ کائنات لاہور ۱۹۶۶ء)

۴۸۔ سرگزشت غالب: آقائے رازی
فرمان علی بکسیلر، لاہور

۴۹۔ غالب تاریخ کے آئینہ میں اور دوسرے مضامین
نظیر حسنین زیدی مسعود اکیڈیمی کراچی ۱۹۶۳ء)

۵۰۔ محاورات غالب: نرتیش کمار شاد
کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۶۲ء

۵۱۔ غالب اور کچھ جائزے: وقار ردمانی اوصاف احمد
اردو فارسی سوسائٹی لکھنؤ یونیورسٹی ۱۹۶۶ء

۵۲۔ یاد غالب: مرتبہ اطہر حسین زیدی
انجمن اردو، کراچی یونیورسٹی ۱۹۶۰ء

۵۳۔ میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام:
ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی
(ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن ۱۹۵۷ء)

۵۴۔ صفیر بلبل: فرزند احمد صفیر بلگرامی
مطبع حیدری (عظیم المطابع) عظیم آباد ۱۲۸۰ھ)

۵۵۔ خاش و خاشاک: حبیب اللہ خاں ذکا
مطبع اخبار آصفی حیدرآباد دکن ۱۳۱۴ھ

۵۶۔ دیوان معروف: الٰہی بخش معروف (نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۵ء)

۵۷۔ مرزا غالب کی شوخیاں اور شوخ نگاریاں:
از عبدالباری آسی (نگار لکھنؤ جنوری ۱۹۳۲ء

۵۸۔ علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۱۹۴۸-۴۹ء
مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین آرزو

۵۹۔ آج کل غالب نمبر (دہلی فروری ۱۹۵۲ء)

۶۰۔ صحیفہ غالب نمبر (حصہ اول) مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی
(مجلس ترقی ادب لاہور جنوری ۱۹۶۹ء)

۶۱۔ آہنگ غالب نمبر: کراچی ۲۲ جنوری ۱۹۶۹ء

۶۲۔ ماہ نو غالب نمبر:
(جنوری و فروری ۱۹۶۹ء کراچی)

۶۳۔ ہمدرد صحت (غالب نمبر) (کراچی فروری ۱۹۶۹ء)

۶۴۔ کتاب ماہنامہ فروری ۱۹۶۹ء
(غالب کا مکمل دیوان۔ طاہر ایڈیشن
(لاہور ۱۹۶۹ء)

پروفیسر محمد حامد الدین خاں ایم اے

غالب کے بارے میں چند سخن ہائے ناگفتنی

غالب پرستی کے سب سے بڑے مناد ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری مرحوم نے دیوان غالب کے متعلق جو انتہائی عقیدت مندانہ لیکن حقیقت سے آنا ہی بعید فتویٰ صادر فرمایا تھا اس کو سنکر جو لوگ ناک بھوں چڑھالیتے ہیں بلکہ منہ لٹکالیتے ہیں وہ بھی اس حقیقت سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے کہ غالب ایک عظیم شاعر اور مستند ادیب تھے جس نے اردو شاعری کو ایک نیا آہنگ بخشا۔ اسکو ایسی فرسودہ اور گھسے پٹے اسلوب و انداز نگارش کے تنگ نائے سے نکال کر وسعت و رفعت کا خلعت بخشا اور زبان کو سلاست و متانت، نزہت خیال، حسن بیان، شگفتگی و تازگی نیز سہل ممتنع اور دشوار پسندی کے حسین امتزاج سے مزین کرکے اس میں غیر معمولی کشش اور جاذبیت پیدا کردی۔ ظرافت، حقائق نگاری اور تصوف و فلسفہ جیسے مشکل اور عمیق مضامین کے اظہار کی قدرت پیدا کردی۔ اس کے علاوہ اردو نثر میں ایک خاص طرز نگارش کی بنا ڈالی جس کے موجد بھی وہی ہوئے اور خاتمہ بھی انہی پر ہوا۔ حقائق نگاری، مکالمہ نویسی، ایجاز و اختصار کی گوناگوں خوبیوں نے اس بے مایہ نثر کو مرصع کردیا اور اس کی وسعت و ترقی کے امکانات غالب کی بدولت روشن ہو گئے۔ اردو کے ارتقا اور اس کی وسعت پذیری اور مقبولیت عامہ میں غالب کو وہی منفرد اور ممتاز حیثیت حاصل ہے جو انگریزی زبان کی ترقی اور پھیلاؤ میں شیکسپیئر کو نصیب ہوئی۔ فطرت انسانی اور نفسیات انسانی کے رموز و حقائق کے مطالعہ اور آگہی میں بھی وہ شکسپیر سے پیچھے نہیں ہیں۔

ان کے خطوط کو آج بھی نہایت ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے اور ہر شخص ان کے مخصوص انداز بیان، شوخی، سادگی اور کمال مکالمہ نگاری کا قائل ہوجاتا ہے۔ ان خطوط کی سب سے بڑی اہمیت اور افادیت ہمارے قومی ادب میں یہ ہے کہ اردو نثر کی موجودہ ترقی یافتہ شکل کی داغ بیل ان ہی سے پڑی۔ سرسید احمد خاں کی نثر نگاری جو بجائے خود اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے نقش ثانی سمجھی جاتی ہے۔ فارسی شعر و ادب میں ان کا جو مقام ہے اور اس زبان سے ان کو طبعاً جو مناسبت اور شغف تھا اس کے متعلق وہ خود فرماتے ہیں کہ: ؏ "فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ"

کلکتہ کی ادبی ہنگامہ آرائیاں اور فارسی اساتذہ باستثنائے حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے کمالات علم و فضل کو قابل اعتنا نہ سمجھنا

اس بات کی دلیل ہے کہ غالب کو قدیم وجدید فارسی پر کیسی ماہرانہ قدرت حاصل تھی۔

غالب کی مقبولیت اور ان کی نظم ونثر کی شہرت ان کی زندگی میں ہی شروع ہوگئی تھی۔ ان کے ادبی خوشہ چینوں کی تعداد سرعت سے بڑھنے لگی تھی، خود قلعۂ معلیٰ کے آخری شاہ شطرنج بادشاہ ظفران کے درباری امراء، رؤسا ان کے حلقۂ تلمذ سے وابستہ ہوگئے تھے۔ غالب کی شاعری کا چرچا دہلی سے نکل کر دکن، بنگال، یوپی اور بہار تک ان کی حین حیات میں پہنچ چکا تھا لیکن ان کی کما حقہ قدردانی اور ان کے فن وفکر کی عظمت کا اعتراف ان کے انتقال کے بعد شروع ہوا اور آج سو سال گذر جانے کے بعد بھی غالب نوازی میں کوئی کمی نہیں بلکہ روز بروز ترقی ہو رہی ہے۔ ان کے نظم ونثر کے شہہ پاروں پر بڑے انہماک و دلچسپی کے ساتھ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کسی قدر جذباتی اور روایاتی عقیدتمندی کی رو میں تحقیق و تجزیہ کا عمل جاری ہے۔ غالب مرحوم اس معاملہ میں بڑے خوش قسمت ہیں کہ بہت سے دوسرے خداوندان سخن کے برخلاف ان کو اس پوری صدی کے ہر حصے میں مخلص کام کرنے والوں کی ایک جماعت ملتی رہی ہے جس نے ان کے فن وادب پر بڑی جستجو اور کاوش کرکے ان کا ایک خاص مقام دنیائے ادب میں متعین کر دیا ہے۔ شاعر کے ذہنی ارتقا کا کوئی گوشہ ان کی صبر آزما کوشش سے بچا نہیں۔ ان کے اردو کلام کی تشریح اور ان کے اشعار کو مختلف معیار سے جانچنے میں بڑی بڑی موشگافیاں کی گئی ہیں یہاں تک کہ ان کے بعض اشعار کو شاعر کی پرواز تخیل سے ماوری معنی اور مطالب سے ملبوس کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بایں ہمہ ان ادبی اور انتقادی کوششوں کے افادی اور تحقیقاتی نتائج سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اردو زبان کو اس سے بیش بہا فائدے پہنچ رہے ہیں۔ غالب پسندوں کا حلقہ جس قدر وسیع ہو رہا ہے اسی قدر غالب کی زندگی اور ان کے ادب پر سیر حاصل اعلیٰ پایہ کی تصانیف میں بھی اضافہ ہو رہا ہے جو بجائے خود اردو کے فروغ کے لئے ایک نیک شگون ہے۔

صدسالہ یادگار کی تقریبات نے دیگر ملکوں سے کچھ کم مگر پھر بھی بڑی حد تک ہمارے ملک کے دانشوروں اور غالب سے دلچسپی رکھنے والے ادیبوں کو غالب کے گہرے مطالعہ پر آمادہ کیا ہے اور ان کی مساعی جمیلہ کے طفیل میں بہت سے نئے حالات سامنے آئے ہیں جن سے غالب کی نظم ونثر کے متعلق بعض غلط فہمیوں کے ازالہ میں اور بہت سی گتھیوں کے سلجھانے میں مدد مل سکتی ہے اسی سلسلہ میں ایک قابل احترام ڈاکٹریٹ یافتہ بزرگ نے غالب کے دیوان کے صفحات پر انگلی رکھ کر ان سے فال نکالنے کا دلچسپ سلسلہ شروع کرنے کی بھی اطلاع دی ہے اور ان کی طرف سے اس کو مقبولیت عام کی سند دلانے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے۔ فارسی کے انحطاط کے ساتھ دیوان حافظ کا مطالعہ قریب قریب ختم ہو چکا ہے لیکن ہمارا معاشرہ اس سائنسی اور اٹمی دور میں بھی فال اور شگون سے اپنی قسمتوں کا فیصلہ کرنے اور اپنی تمناؤں کی آسودگی حاصل کرنے کے توہمات میں بری طرح مبتلا ہے اس لئے ہمیں ضرورت تھی کہ دیوان حافظ کا کوئی نعم البدل اردو میں مل جائے خدا کرے دیوان غالب کے متعلق یہ سعی مشکور ہو۔ عرصہ ہوا ڈاکٹر بجنوری نے غالب کو الہامی شاعر اور ان کے دیوان کو پوری عقیدت کے ساتھ الہامی کتاب ثابت کرنے کی کوشش کی تھی اس لئے دیوان غالب کی تقدیس عوام میں کچھ بعید از قیاس نہیں ہے لیکن اس سلسلہ میں یہ بات ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ ڈاکٹر بجنوری

کے تبصرہ پر متشککین کی طرف سے یہ اظہار خیال ہو رہا ہے کہ "سخت اندیشہ ہے کہ غالب ادبی انجمنوں سے گذر کر "عرس مبارک" کی محفل سماع تک نہ جا پہنچیں۔ اور لوگ غالب کا احوال واقعی سننے کے بجائے اپنا حال غم سنانے کے لئے مزار اقدس پر حاضری نہ دینے لگیں۔[1] بہرحال ہر کسے فکر ہر کس بقدر ہمت اوست"

غالب کی مقبولیت، ہر دل عزیزی اور ان کے فن کی عظمت میں جو غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے اس کا ایک دل خوش کن اور تابناک پہلو یہ نظر آرہا ہے کہ پاکستان کے باہر غیر ممالک میں بھی سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر اس میں پوری دل چسپی کا اظہار کیا گیا ہے اور اس سلسلہ کی تقریبات میں بے دریغ وقت اور سرمایہ صرف کیا جارہا ہے۔ سطحی نظر سے دیکھا جائے تو ہمیں یہ زیب دیتا ہے کہ ہماری قومی زبان کے ایک شاعر کی قدردانی پر ہم فخر و مسرت سے اپنا سر بلند کریں اور ان ممالک کی کوششوں کے لئے ہم ان کے سپاس گزار ہوں۔ کاش غالب کے مداحین اس خاص معاملہ پر خصوصی توجہ فرماکر بعض شکوک و شبہات جو عوام کے اور بالخصوص اس طبقے کے لوگوں میں پیدا ہوسکتے ہیں جو خالص اسلامی اور پاکستانی نصب العین کی فضا اور فہم و ذہانت کے ماحول میں پرورش پا رہے ہیں کے ذہنوں میں پیدا ہوسکتے ہیں۔

غالب کی صد سالہ برسی کے ہنگاموں میں سب سے زیادہ دل چسپی بھارت، روس، چند اور کمیونسٹ ملک اور برطانیہ لے رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے ان ملکوں کی شاندار کوششوں کے سامنے ہماری کوشش ماند پڑ جاتی ہیں۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ ایک طرف تو بھارت کی اردو دشمنی، مسلم کشی اور مسلمانوں کے دینی نظریات کو مٹانے والی مہم دو دو ہمارے سامنے ہے۔ ہندی مسلمانوں کے متعلق وہاں ایک خاص سوچے سمجھے ہوئے منصوبہ پر عمل ہو رہا ہے حکومت کے اشارے پر تشدد پسند فرقہ پسند جماعتیں اور مسلح گروہ مسلمانوں کو تخویف و ترہیب کے ذریعہ شکستہ دل بنا رہے ہیں اور موقع موقع پر بلوؤں کشت و خون اور خونریزی کے ذریعہ ان کو تباہ کر رہے ہیں اور ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر رہے ہیں حکومتی فرقہ یعنی کانگریس اس کوشش میں سرگرداں ہے کہ اقتصادی دباؤ، تعلیمی حکمت عملی اور ثقافتی پروپیگنڈے کے بل پر اسلام کے صاف اور ستھرے اعصاب پر بے دینی، استخفاف شریعت اور غیر اسلامی طریقوں کی جو تہہ چڑھ رہی ہے اس کو زیادہ دبیز کرنے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ مسلمانوں کے حقیقی نصب العین کو بے حس کردیا جائے اور مسلمانوں کے اخلاقی ڈھانچے میں بے دینی کے جراثیم آسانی سے داخل ہوجائیں۔ اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ غالب کے کلام کو جس میں اس قسم کے نظریات کافی ملتے ہیں اور جن کے ذریعہ یاس و قنوطیت، مذہب سے اعراض، اعتقاد کی ناپختگی، عالم ملکوت اور ملکوتیاں کا تمسخر، وحدت الوجود کے پردہ میں ہندوؤں کے عقیدۂ "مایا" اور بہت سی اسی قسم کی چیزیں جو کفر و الحاد کے خیالات کی پرورش کرتے ہیں۔ بھارتی ارباب حل و عقد اپنے مکروہ اغراض کا ذریعہ تو نہیں بنا رہے ہیں۔ یہی اندیشہ کمیونسٹ اور سامراجی حکومتوں سے بھی ہوسکتا ہے۔ یہودیوں کی اسلام مخالفت تو آج کی نہیں ہے۔ یہ تو چراغ مصطفوی کے روشن ہونے کے وقت سے ہی آج تک جاری ہے اور اب تو نقطۂ عروج پر پہنچ چکی ہے

---

[1] اخبار حریت ادبی گزٹ ماہ اپریل ۲۵ سنہ ۱۹۶۹ء

عیسائیوں کی مخالفت نے جنگ ہائے صلیبی کے وقت سے زور پکڑا۔ کمیونسٹوں کا یہ پختہ یقین ہے کہ ان کی تحریک کو اگر کسی سے خطرہ ہے تو وہ اسلام ہے۔ ان سب کا مدعا یہ ہے کہ دنیا کے کسی حصہ میں بالخصوص اسلام کے نئے خداداد ملک میں اسلام [illegible] اقتدار نہ ہو جائیں کہ وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے سینہ سپر ہو سکیں۔ اور ان میں قومی بیداری اور [illegible] پیدا کر دیں۔ کمیونزم کا فروغ عوام کے احساس کمتری۔ افلاس اور انتہائے یاس و نا اُمیدی کی فضا میں ہوتا ہے۔ غالب کے نظریات حیات کچھ اسی قسم کا ماحول اسلامی معاشرہ میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اب اگر کمیونسٹ ان کے ان نظریات سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں تو ہمیں اس پر تعجب کیوں ہو۔

ایک خاص نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ غالب پرستی کی اس شدت میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اُردو کے وہ بلند شعراء جو اسلامی نظریات و افکار کو پیش کرتے ہیں کہیں پس پشت تو نہیں ڈال دیئے جائیں گے۔ یا خود بخود وہ کسی پس منظر میں ڈال دیئے جائیں۔ بھارت کا تو اصلی منشا یہی ہے کہ اسلام پسند شعراء کا حیات آفریں پیغام اور ان کی ولولہ انگیز شاعری کسی طرح مسلمانوں کے قلب در وح کو تڑپانے اور گرمانے سے باز رہے اس لئے کہ جبتک مسلمانوں میں دینی حرارت پیدا کرنے والا کوئی عقیدہ یا مسلک باقی ہے بھارت کی لادینیت کا پروگرام بار آور نہیں ہو سکتا۔ اگر اس پروپیگنڈے کا کوئی اثر پاکستان میں بھی ہو گیا یا حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ مسلمان نوجوانوں نے ان شعراء کے اسلام پرور اور ملت ساز پیغامات سے روگردانی شروع کر دی تو ہمارے اصلی نصب العین کی جڑ کٹ کر رہ جائے گی۔

ان چند جملوں سے غالب مرحوم کی نہ تو تنقیص مقصود ہے اور نہ ان کے اعلیٰ ادبی کمالات سے انکار ہے لیکن اس موقع پر علامہ اقبال کے ایک وقیع اور اہم ارشاد کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے مرقع چغتائی پر علامہ نے ایک مقدمہ "ادب یا فن کے متعلق" تحریر فرمایا ہے اس میں لکھتے ہیں

> "کسی قوم یا معاشرہ کی روحانی صحت مندی کا دار و مدار اس کے شعراء اور ادیبوں کے صحیح وجدان پر منحصر ہے۔ لیکن وجدان کسی کے اپنے اختیار کی چیز نہیں ہے۔ یہ انسان کو بغیر مانگے ہوئے اور بلا اظہار تمنا ودیعت ہوتا ہے اگر کسی رجعت پسند قنوطی ادیب کو یہ نعمت حاصل ہو جائے اور ساتھ ہی "قبول خاطر و حُسن سخن" کی خداداد دولت بھی اس کے دامن میں سمٹ کر آ جائے تو وہ اپنے نغموں یا خیالی مرقعوں سے قوم کو مسحور کر کے ان کو ایسی ہلاکت و تباہی میں مبتلا کر دیگا کہ رسوائے عالم اٹیلا اور چنگیز خاں کی افواج قاہرہ کی ہلاکت خیزیاں بھی اس کے سامنے ماند پڑ جائیں گی۔۔۔۔ ادیب کا یہ فرض ہے کہ پیش پا افتادہ خرابیوں کا مقابلہ اس پختہ نیت اور عزم صمیم کے ساتھ کرے کہ ان خرابیوں کا سد باب کر کے پسندیدہ اور مفید اخلاقی اقدار کے لئے راستہ صاف ہو جائے۔ ان ہی عوامل سے قوم اور معاشرہ

(باقی صفحہ ۶۲۹ پر)

نقد و نظر

ثناء الحق صدیقی ایم اے
محمد ایوب قادری ایم اے
ابوسلمان شاہجہانپوری

ماہنامہ کتاب لاہور فروری سنہ ۱۹۶۹ء

یہ شمارہ خصوصیت سے غالبیات کے لئے وقف ہے۔ اس میں چند دوسرے مضامین کے بعد جو ۴۸ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں باقی ۴۴ صفحے حیات غالب اور کلام غالب کے لئے مخصوص ہیں۔ پہلے دو صفحوں کا ایک مضمون "حیات غالب سنین کے آئینہ میں" گوہر نوشاہی کا لکھا ہوا ہے جس میں غالب کی زندگی کے تمام ضروری اور اہم سنین دیدیئے گئے ہیں۔ بعدہٗ تمہید و تعارف کے عنوان سے ایک اور مضمون بھی گوہر نوشاہی کا مرتبہ ہے جس میں دیوان غالب کے مختلف نسخوں سے بحث کی گئی ہے۔ پھر پورا دیوان غالب ردیف وار نقل کیا گیا ہے جو نسخہ طاہر کے ۱۹۲۳ء کے ایڈیشن کے مطابق ہے اور اس کے شروع میں آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد دہلوی کا اُن کے دیوان کے طبع اول کا دیباچہ ہے۔ اگرچہ کاغذ ردی استعمال کیا گیا ہے تاہم کتابت طباعت اور صحت و حسنِ ترتیب نے اس کمی کی پوری طرح تلافی کردی ہے۔ مرزا غالب کی ایک تصویر سرورق پر دی گئی ہے جو رنگین ہے۔ دوسری غالبیات کے شروع میں ہے ان تمام خوبیوں کو سامنے رکھکر کہا جاسکتا ہے کہ غالب کی صدسالہ برسی پر یہ ایک نادر تحفہ ہے جو ادارہ "کتاب" لاہور کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔

سرودِ غالب

شیخ مبارک علی تاجر و ناشر کتب لاہور نے غالب کی صدسالہ برسی کے موقع پر اس عظیم شاعر کے کلام کو ملک کے نامور اہل قلم جناب یوسف بخاری صاحب سے ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کراکر شائع کیا ہے۔ کلام کی ترتیب سے پہلے مرتب موصوف نے حرف چند کے عنوان سے ایک تعارف لکھا ہے جس میں ترتیب و تدوین کلام پر روشنی ڈالی ہے اس کے بعد کلام کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے ان حصوں کے عنوانات ترتیب وار یہ ہیں۔ (۱) موج عرفاں (۲) شمع ہدایت (۳) سوز و ساز (۴) حریم ناز (۵) روداد غم (۶) رنگ و بو (۷) در حدیث دیگراں

ان سات حصوں میں مختلف مضمونوں کے اشعار کو ردیف وار الگ الگ ذیلی عنوانات کے تحت جمع کر دیا گیا ہے

اس کام میں مرتب نے جس دیدہ وری اور عرق ریزی کا مظاہرہ کیا ہے اُس کی تعریف نہ کرنا صریحی نا انصافی ہوگی۔ یہ ضرور ہے کہ کچھ اشعار مناسب عنوانات کے تحت شامل نہیں ہو سکے لیکن جب یہ دیکھا جائے کہ اس کام میں مرتب کی رہبری کے لئے ذوق سلیم کے علاوہ کوئی اور معیار نہیں تھا تو پھر اس چیز کو کوتاہی پر محمول کرنے کے لئے کوئی جواز نہیں رہتا۔ بحیثیت مجموعی کلام غالب کو اس طرح ترتیب دینے کا یہ کام نہایت مفید ہے اور جو لوگ زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں غالب کے خیالات کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں اُن کے لئے یہ ایک اچھا آئینہ ہے۔

کتاب پر مقدمہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے لکھا ہے۔ آخر میں انھیں کے قلم سے "خاتمہ" اور "روشنی اور وسعت" کے عنوانات کے تحت دو اور چیزیں زیب قرطاس ہوئی ہیں۔ آخری عنوان میں سات ذیلی عنوانات شامل کئے گئے ہیں جن میں صرف وہ اشعار دیئے گئے ہیں جو (۱) آئینہ (۲) روزن و شعاع (۳) صحرا اور بیابان (۴) ساحل اور طوفان (۵) ... (۶) ... اور (۷) فریاد سے متعلق ہیں۔ اس ترتیب کو مکمل اور جامع نہیں کہا جا سکتا۔

صحیفہ لاہور (غالب نمبر)
جنوری ۱۹۶۹ء

تقریباً پانچسو صفحات کا یہ نمبر نہ صرف ضخامت کے اعتبار سے بھاری بھرکم ہے بلکہ مضامین کے لحاظ سے بھی نہایت وقیع ہے طرفہ بات یہ ہے کہ اتنی ضخامت کے باوجود یہ نمبر مکمل نہیں بلکہ اُس کا محض حصہ اول ہے اس کا حصہ دوم ماہ اپریل میں شائع ہوگا۔ غالب نمبر کے اس حصہ میں بھی اس مایۂ ناز شاعر کی حیات کے مختلف پہلوؤں اور اُس کے فکر و فن پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے اس میں کل ۲۶ مضامین شامل ہیں جن میں غالب کی شخصیت اور اُس کی نظم و نثر کی بیشمار خصوصیات اور خوبیاں بیان کر دی گئی ہیں. پہلو غالب اور قاطع القاطع پر دو مضامین نہایت معلوماتی ہیں۔ ایک مضمون قنوطی ابر گہر بار پر ہے لکھنے والوں میں برصغیر کے بہترین ادیب اور نقاد شامل ہیں۔ اُن کے ناموں کی فہرست درج ذیل ہے۔

(۱) ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی (۲) آغا محمد باقر (۳) ڈاکٹر حکم چند نیر (۴) اکبر علی خاں (۵) کسریٰ منہاس (۶) ڈاکٹر عبدالسلام عبدالرشید (۷) عتیق صدیقی (۸) مرتضیٰ حسین فاضل (۹) نجم الاسلام (۱۰) ڈاکٹر عندلیب شادانی (۱۱) سید قدرت نقوی (۱۲) ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (۱۳) قاضی عبدالودود (۱۴) ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (۱۵) ڈاکٹر عبدالغنی (۱۶) محمد متور (۱۷) اسلوب احمد انصاری (۱۸) اختر اقبال کمال (۱۹) جیلانی کامران (۲۰) ڈاکٹر وزیر آغا (۲۱) انور سدید (۲۲) نظیر صدیقی (۲۳) مولانا غلام رسول مہر (۲۴) زیتون عمر (۲۵) صوفی لے کیو نیاز (۲۶) ڈاکٹر آغا افتخار حسین

مجموعی طور پر صحیفہ کا یہ نمبر ملک کے دوسرے رسالوں اور مجلوں کے غالب نمبر میں نہایت نمایاں ہے۔

ماہنامہ "فاران" کراچی
فروری ۱۹۶۹ء

اگرچہ یہ شمارہ غالب نمبر نہیں ہے تاہم مدیر محترم جناب مولانا ماہر القادری صاحب نے انتخاب کلام غالب کے عنوان کے تحت مرزا غالب کے اردو دیوان کے تقریباً سوا چار سو منتخب اشعار دے کر اس شمارہ کو غالبیات کے سلسلہ کی ایک کڑی بنا دیا ہے۔ یہ انتخاب ۲۰×۳۰ کے سائز کے

رسالے کے ۲۷، ۲۸ صفحات پر محتوی ہے اور ایک ایسے ادیب اور شاعر کی تعریبہ کا نتیجہ ہے جس کی [illegible] ہی کے ہر مکتب فکر و خیال کے لوگ مداح و معترف ہیں اور جو برصغیر کا ایک کہنہ مشق [illegible] شاعر بھی ہے، ایک اچھا ادیب اور نثر نگار بھی ہے اور جس کی تنقیدی نظر نہایت گہری اور متوازن ہے۔ ایسی صورت میں اس انتخاب پر کسی [illegible] تنقید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم تبصرہ نگار اظہار رائے کے اپنے پیدائشی حق کو کام میں لا کر چند [illegible] کی جرأت کرتا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ بعض ایسے اشعار اس انتخاب میں آ گئے ہیں جو تبصرہ نگار کے نزدیک معمولی اور سطحی ہیں مثلاً

خامے نے پائی طبیعت سے مدد — بادباں کے اُٹھتے ہی لنگر کھلا

دوم بعض ایسے اشعار جن کو لائق احترام مرتب نے اُن کی بعض کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے ترک کر دیا ہے تبصرہ نگار کے نزدیک اپنے مضمون اور طرز ادا کی جدت کی وجہ سے اس قابل تھے کہ اُن کو انتخاب میں شامل کیا جاتا جیسے

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک — بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل
جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی — لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی
دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

بہرحال یہ محض مذاق کا اختلاف ہے اور اس لئے اس کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی مجموعی طور پر حضرت ماہر القادری صاحب کی یہ سعی نہ صرف مشکور بلکہ قابل صد داد و تحسین ہے۔

ہمدرد صحت ڈائجسٹ کراچی
فروری ۱۹۶۹ء

بنیادی طور پر ماہنامہ ہمدرد صحت کا یہ شمارہ بھی غالب نمبر نہیں ہے لیکن چونکہ اس شمارہ کا کافی بڑا حصہ غالب سے متعلق مضامین اور نظموں کے لئے وقف کیا گیا ہے اس لئے اس کو بھی غالبیات کے ذیل میں لانا چاہیئے جو دو نظمیں اس شمارہ میں شامل ہیں وہ اپنے رنگ و آہنگ کے اعتبار سے نہایت دلکش اور مضمون کے لحاظ سے حقیقت کی ترجمان ہیں۔ غالب سے متعلق مضمونوں کی تعداد اگرچہ محض تین ہے لیکن اُن کے موضوعات نہایت نادر اور اچھوتے ہیں۔ پہلا مضمون غالب کی ابتدائی شاعری کا نفسیاتی پس منظر مسلم ضیائی صاحب نے دوسرا مضمون غالب اور طب قدیم حکیم محمود احمد صاحب برکاتی نے اور تیسرا مضمون "نجات کا طالب غالب" عشرت رحمانی صاحب نے تحریر کیا ہے۔ تینوں مضمون نگار کسی تعریف و تعارف کے محتاج نہیں [illegible] صاحب تو ملک کے اُن معروف ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے غالب کی حیات اور شاعری کو اپنی [illegible] کا مرکز بنا لیا ہے۔ حکیم محمود احمد صاحب برکاتی ایک کامیاب طبیب اور ایک فاضل صاحب قلم ہونے کی وجہ سے اس موضوع پر لکھنے کے لئے بہترین شخص ہیں۔ عشرت رحمانی بھی اپنی ادبی اور علمی سرگرمیوں کی بنا پر [illegible] کے علمی و ادبی حلقوں میں [illegible] معروف و متعارف ہیں۔

مسٹر بادلول

نظموں اور مضمونوں کے علاوہ اس شمارہ کے سرورق پر مرزا غالب کا ایک خوبصورت اور رنگین فوٹو دیا گیا ہے جس نے سرورق کو کافی دیدہ زیب بنا دیا ہے۔ دو تصویریں رسالہ کے اندر ہیں ایک غالب کے مکان کی اور دوسری اُن کے مزار کی۔

ہمدرد صحت کے ادارہ نے یہ طے کیا ہے کہ آئندہ ایک سال تک ہر مہینہ غالب سے متعلق ایک مضمون دیا جایا کرے گا۔ اسی منصوبہ کے مطابق مارچ کے پرچہ میں محمد ایوب قادری صاحب کا مضمون "غالب اور سر سید احمد خاں" شامل ہے یہ مضمون کافی معلوماتی ہے۔

پندرہ روزہ "آہنگ" ۲۲ جنوری ۱۹۶۹ء

ریڈیو پاکستان کراچی کے اس ترجمان میں یکم سے ۱۵ فروری تک کے پروگرام کے علاوہ آٹھ نئے مضمون، ایک غزل (غالب کی زمین میں) اور آہنگ کے پچھلے شماروں کے مضامین کا کچھ انتخاب دیا گیا ہے۔ اداریہ کے بعد مضامین اس ترتیب سے پیش کئے گئے ہیں، (۱) مرزا غالب اور اُن کے خطوط (صوفی غلام مصطفیٰ تبسم) (۲) غالب اور فن کے نئے تقاضے (مختار صدیقی) (۳) غزل (غالب کی زمین میں) (حفیظ ہوشیارپوری) (۴) غالب کا شہر آرزو (ناصر کاظمی) (۵) آشوب آگہی" غالب" (ممتاز حسین) (۶) غالب — انداز بیان اور شخصیت (علی سجاد مہر) (۷) اسد اللہ خاں غالب (مرزا عابد عباس) (۸) غالب کی بذلہ سنجیاں (ڈاکٹر اسلم فرخی) (۹) گنجینۂ معنی انیجیسر (سید عابد رضوی) (۱۰) غالب (آہنگ کے مطبوعہ مضامین سے انتخاب از ڈاکٹر شوکت سبزواری، حامد حسن قادری، ڈاکٹر اختر مسعود رضوی، سید وقار عظیم، انعام الحق کوثر مقصود دیر وغیرہ۔

سرورق پر مرزا کا وہ فوٹو شائع کیا گیا ہے جس میں وہ مسند پر گاؤ تکیہ سے لگے ہوئے بیٹھے ہیں اور حیوان سے شوق فرما رہے ہیں۔ ایک جدت یہ کی گئی ہے کہ سرورق پر ہی مرزا کے اردو اور فارسی کے سو منتخب اشعار مختلف زاویوں سے دئے گئے ہیں جن سے سرورق میں بھی ایک گونہ ندرت پیدا ہو گئی ہے اور غالب کی صد سالہ برسی کی مناسبت سے سو اشعار کا ایک عمدہ انتخاب بھی پیش ہو گیا ہے۔

سفینۂ مشرق

۱۶ فروری ۱۹۶۹ء کا شمارہ غالب نمبر ہے۔ اس میں غالب کی حیات اور شاعری سے متعلق مضامین کے علاوہ عمل چغتائی کے بھی کئی اعلیٰ نمونے ہیں، حقیقتاً چغتائی آرٹ کے ان نمونوں کی شمولیت نے اس پرچے کے غالب نمبر کو ایک منفرد مقام عطا کر دیا ہے سرورق پر غالب کا فوٹو ہے۔ مضامین کی ترتیب یہ ہے (۱) آیئے غالب کی باتیں سنیں (ڈاکٹر عبدالسلام خورشید) (۲) ہیں دوزخ کا ایندھن بنوں گا (شریف الحسن عثمانی) (۳) کہتی ہے تجھکو خلق خدا غائبانہ کیا (۴) جھوٹی باتیں (نصیر الور) (۵) غالب کی گمشدہ غزل مل گئی (ڈاکٹر حکم چند نیّر) (۶) مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے (۷) غالب کے اشعار میں اُن کی محبوبہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ (حمیدہ سلطان) (۸) ان کا پہلا دیوان بھوپال کیسے پہنچا (نادم سیتاپوری) (۹) مرقع چغتائی دنیا بھر کے عجائب گھروں کی زینت بن گیا (عبدالرحمٰن چغتائی)

(۱۰) اگر آم نہ ہوتے تو غالب بھی نہ ہوتے (مولانا خیر سودوی) (۱۱) کولمبس نے امریکہ اور حالی نے غالب کی نئی دنیا کا پتہ لگایا (عبدالرحمٰن بجنوری) (۱۲) غالب فہمی اب غلط فہمی بن گئی ہے (حامد اللہ افسر) (۱۳) پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے (محمد حسین شمس کاکوردی) (۱۴) موجِ خوں نے غالب کے دل میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا کیا (خواجہ احمد فاروقی) (۱۵) جب غالب اور میر سے مشترکہ اعلامیے جاری کئے گئے (مولوی م ن)

چغتائی آرٹ کے جو نمونے دیئے گئے ہیں اُن سے مندرجہ ذیل اشعار کی [illegible] ہوتی ہے۔

(۱) بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے
(۲) بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب — آنکھ کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا
(۳) مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو — اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے
(۴) واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال — یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا
(۵) غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ — ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع
(۶) ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت — عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں

آخری صفحہ پر دیوان غالب مطبوعہ مطبع دارالسلام کے صفحہ ۲۷ کا عکس اور پانچ اور فوٹو ہیں۔

"ستارۂ مشرق" کے علاوہ ۸ / فروری کے مشرق میں طلباء کے صفحہ پر بھی تمام مضامین غالب سے متعلق دے کر اس "شاعرِ نغز گو نے و خوش گفتار" کو پوری طرح خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔

معارف اعظم گڑھ فروری ۱۹۶۹ء برصغیر کے اس علمی ادبی مجلّہ نے بھی اُردو اور فارسی کے اِس مایۂ ناز شاعر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنے اِس شمارے کو تقریباً اسی کے ذکرِ جمیل کے لئے وقف کر دیا ہے اور اگرچہ اس کو غالب نمبر کا نام نہیں دیا گیا اور بظاہر اس شمارے میں محض دو ہی مضمون شامل ہیں تاہم ان دو مضمونوں کی بدولت ہی کیفیت اور معیار کے اعتبار سے یہ رسالہ کسی سے نہ صرف پیچھے نہیں رہا۔ بلکہ برصغیر کے اکثر رسالوں کو اِس دوڑ میں بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ غالب پر جو دو مضامین اِس پرچہ میں شامل کئے گئے ہیں ان میں پہلا مضمون غالب ۱۹۶۹ء۔ ۱۸۶۹ء (مدح و قدح کی روشنی میں) جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے نجتہ کار قلم کی تراوش ہے۔ یہ مضمون رسالہ کے ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں لائق مضمون نگار نے مختلف تذکرہ نگاروں اور غالب پر لکھنے والوں کی آرا کو نہایت سلیقہ سے یک جا کر دیا ہے۔ مقالہ نگار کا نام ہی مضمون کی عمدگی اور کامیابی کا ضامن ہے۔ دوسرا مضمون بریلی میں غالب کے تلامذہ (ایک تذکرہ) جناب ڈاکٹر سید لطیف حسین صاحب ادیب نے تحریر فرمایا ہے۔ اس میں موصوف نے بریلی کے چھ شاعروں کی حیات اور شاعری کا مختصر جائزہ لیا ہے۔ اِن شعراء کے نام اور تخلص یہ ہیں (۱) مفتی سلطان حسن خاں احسن (ف ۱۸۶۶ء) (۲) غلام بسم اللہ بسمل (ف ۱۸۹۵ء) (۳) قاضی عبدالجمیل جنون (ف ۱۸۹۰ء) (۴) مفتی سید احمد خاں سعید (ف ۱۸۵۸ء) (۵) محمد حسین صاحب

(ف سنہ ۱۸۵۸ء) اور (۶) قاضی عبد الرحمٰن وحشی یہ مضمون بھی ۸۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور مضمون نگار کی تلاش و کاوش کی پوری طرح شہادت دے رہا ہے۔

ہما (اردو ڈائجسٹ) دہلی
غالب نمبر مارچ ۱۹۶۹ء

اپنے ظاہری حسن و خوبی کے علاوہ غالب کے فکر و فن سے متعلق مضامین کے لحاظ سے بھی یہ شمارہ خاصہ کی چیز ہے۔ اس پرچے کے ۲۳۶ صفحات میں سے ۱۴۰ صفحے غالبیات سے متعلق ہیں۔ اس حصہ کا اصل عنوان غالب نامہ ہے جس کے تحت مضامین کو کئی ذیلی عنوانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ مضامین میں کافی تنوع ہے اور تقریباً ہر شخص کی دل چسپی کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ جہاں تک کتابت، طباعت، اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کا تعلق ہے وہ یقیناً اراکین ادارہ کے حسن مذاق اور جمالیاتی حس کی پوری طرح ترجمان ہے۔ البتہ ایک چیز بُری طرح کھٹکتی ہے وہ ذیلی عنوان "تذکرہ اردو ادیبوں کا" جس کے تحت اُن شعرا اور ادیبوں کا مختصر تذکرہ اور البم دیا گیا ہے جو غالب سے پہلے اور بعد میں ہوئے یا اُن میں سے بعض اب بھی زندہ ہیں۔ یہ پیشکش اگرچہ نہایت اچھوتی اور قارئین کے لئے نایاب ارمغان کی حیثیت رکھتی ہے لیکن غالب نامہ کے ساتھ کچھ بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہے اس کو بھی اگر حصہ ڈائجسٹ میں رکھ دیا جاتا تو تقسیم نہایت منصفانہ ہوتی۔ یہ بات بھی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ صف اول کے بہت سے شاعر اور ادیب اس فہرست میں نظر نہیں آتے، مثلاً مرزا جانجاناں مظہر اور اُن کے تلامذہ یقین، بیان وغیرہ، میر سوز، میر محمدی بیدار، جرأت، دبیر نسیم دہلوی، رشید احمد صدیقی، نیاز فتحپوری اور بہت سے اہل فن کار اور صاحب کمال حضرات جن کے نام بخوف طوالت چھوڑ دیئے گئے ہیں۔

بہر حال مجموعی طور پر یہ "غالب نمبر" ایک اچھا تحفہ ہے۔

مطالعہ (پٹنہ)
جنوری۔ فروری ۱۹۶۹ء

بہار اُردو آرٹس سرکل کا ترجمان ہے۔ اس کے نگراں برصغیر کے مشہور تنقید نگار اور اہل قلم پروفیسر کلیم الدین احمد ہیں۔ ادارہ کے دیگر اراکین ڈاکٹر کلیم عاجز، ڈاکٹر محمد صدیق، ڈاکٹر خالد رشید صبا اور ڈاکٹر ممتاز احمد ہیں۔

مطالعہ کے اس شمارہ کا بیشتر حصہ غالبیات کے لئے وقف ہے یعنی ۹۶ صفحات میں سے ۶۰ صفحوں پر غالب سے متعلق مضامین ہیں۔ ان تمام مضامین کو فکر و نظر کے عنوان کے تحت دیا گیا ہے۔ مضامین کی ترتیب یہ ہے (۱) غالب اور مہر (قاضی عبد الودود) (۲) غالب (کلیم الدین احمد) (۳) ادبی تاریخ اور تنقید (پروفیسر اسلوب احمد انصاری) (۴) غالب کی غزل گوئی کے پانچ دور (قاضی عبد الودود) (۵) غالب کے پسندیدہ اشعار خود اُن کی نظر میں (عطا کاکوی) (۶) آفتاب ایک آرک ٹائپ، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن (۷) غالب کے بہاری شاگرد (ڈاکٹر خالد رشید صبا) (۸) سد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے (یاران نکتہ داں)

تعداد کے اعتبار سے مضامین زیادہ نہیں لیکن کیفیت کے اعتبار سے مواد نہایت بلند پایہ ہیں لکھنے والے سب ہی چوٹی کے ہیں اور جملہ نگارشات تحقیقی اور معیاری ہیں۔ خصوصاً قاضی عبدالودود صاحب کے دونوں مضمون اور کلیم الدین احمد صاحب کا مضمون غالب" جس میں اُن کی تنقید کا مخصوص انداز نمایاں ہے۔ "منا آپ کے پسندیدہ اشعار خود اُن کی نظر میں" ایک اچھوتا عنوان ہے۔ اور یہ مضمون لکھ کر صاحب مضمون نے دوسروں کے لئے موقعہ فراہم کر دیا ہے۔ کہ وہ اپنے ذوق شعری کو جانچنے کے لئے اس کو معیار بنائیں۔ اس کے علاوہ اِن اشعار سے خود شاعر کے ذوق کا بھی پتہ چل جاتا ہے اور اِس سے اُس کے کلام کی روح کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ صد جلوہ روبرو ہے جو مژگان اُٹھائیے" ایک خاصہ کی چیز ہے مختلف ادیبوں نے مرزا کے دس، دس پسندیدہ اشعار دے کر ایک اچھا گلدستہ قارئین کے لئے مرتب کر دیا ہے

ماہنامہ الشجاع کراچی
غالب نمبر ۱۹۶۹ء

یہ شمارہ جس کی ضخامت ۲۰×۳۰ کے تقریباً دو سو صفحات ہے کلیتاً غالبیات سے متعلق ہے التماس میں ناشر نے صحیح کہا ہے کہ "اس کی ضخامت تو زیادہ نہیں لیکن متنوع مضامین نظم و نثر کے اعتبار سے یہ شمارہ یقیناً آپ کو پسند آئے گا" تمام مضامین کو آٹھ مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ جن کی ترتیب یہ ہے (۱) اسد کا قصہ طولانی ہے لیکن مختصر یہ ہے اِس عنوان کے تحت ۳ مضامین ہیں جو آٹھ صفحات پر پھیلے ہیں (۲) شاعر تو وہ اچھا ہے پر بدنام بہت ہے۔ اس حصے میں ۶ مضامین ہیں جو تقریباً سب مزاحیہ ہیں ۲۴ صفحات، (۳) زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے۔ ۳ منظومات ہیں جن میں غالب کو نذر عقیدت پیش کی گئی ہے ۲ صفحات۔ (۴) زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب۔ اس عنوان کے تحت صرف ایک تمثیل ہے جس کا عنوان "عہدِ غالب ہے" اس تمثیل میں چار مناظر ہیں۔ جو ۱۳ صفحات کو گھیرے ہوئے ہیں۔ (۵) ہے مخشر خیال کہ غالب کہیں جسے۔ اس میں جو مضامین دیئے گئے ہیں ان میں تنقید، تبصرہ، جائزہ وغیرہ سب ہی چیزیں آ گئی ہیں۔ مضامین کی تعداد ۱۱ اور صفحات ۴۵ ہیں۔ یہ حصہ کیفیت اور کمیت دونوں کے اعتبار سے اعلیٰ معیار کا ہے لکھنے والوں میں آل احمد سرور پروفیسر احتشام حسین، کوثر چاند پوری، ڈاکٹر صحیح حسن جیسے مشہور اہلِ قلم شامل ہیں۔ (۶) گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے۔ اس میں غالب کے کلام کا انتخاب (از شاہد عشقی) غالب کے دو قطعے۔ ایک تضمین ایک فارسی قطعہ اور اُس کا ترجمہ شامل ہیں۔ صفحات کی تعداد ۱۲ ہے (۷) غالب کا ہے انداز بیاں اور ۲۰ شعراء کی غزلیں ہیں۔ جو غالب کی بحروں میں کہی گئی ہیں۔ یہ غزلیں دس صفحات گھیرے ہوئے ہیں۔ (۸) صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ اس عنوان کے تحت ایک مضمون دستنبو (مالک رام) ایک قصیدہ فارسی (در مدح ملکہ وکٹوریہ) اور دستنبو کا ترجمہ شامل ہیں۔ صفحات کی تعداد ۲۷ ہے۔

مضامین اور نظموں کے ساتھ ساتھ تصویروں کا معیار بھی اچھا ہے۔ سرورق کی تصویر سے جو فیروز آرٹسٹ نے تیار کی ہے اِس شعر کی تشریح ہوتی ہے ؎

اسد کی طرح میری بھی بغیر از صبح رخسار
ہوئی شام جوانی اے دلِ حسرت نصیب آخر

رسالہ کے اندر آرٹ پیپر پر ۹ فوٹو مرزا غالب کے اور ایک اُن کے مقبرہ کا ہے اُن کے علاوہ دو صفحات "مرزا غالب کی خود نوشتہ سوانح عمری کا ایک ورق" کا عکس دیا گیا ہے۔ جو "شیدائے غالب" ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کو سید افتخار عالم نے دیا تھا۔ اور اب بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم کی ایک مختصر تحریر کے ساتھ الشجاع میں شائع ہوا ہے۔

حرّیت۔ ادبی گزٹ ۱۵ فروری ۱۹۶۹ء

کراچی کے مشہور روزنامہ حرّیت کے ہفت روزہ ایڈیشن کا یہ پرچہ غالب نمبر ہے۔ اس میں مرزا کی حیات اور شاعری سے متعلق کل آٹھ مضامین، کچھ منتخب اشعار، مرزا کی تحریر کے تین فوٹو اور مرزا سے متعلق متعدد تصویریں شامل ہیں۔ مضامین کی ترتیب یہ ہے۔

(۱) وہ اپنے معاصرین پر فوقیت رکھتے تھے (نیاز جالندھری) (۲) غالب کی زندگی میں اُن کے پسر متبنّی کی شادی نہیں ہوسکی (۳) غالب کے بعد اُن کی بیوہ اُمراؤ بیگم نے پنشن لینے اور کچہری میں حاضر ہونے سے انکار کردیا (۴) غالب نے اُردو شاعری کو فلسفہ کی موشگافیاں عطا کیں (رشید طلعت) (۵) میں غالب سے کئی بار مل چکا ہوں (مالک رام) (۶) ہم غالب کی صدسالہ برسی کیوں منارہے ہیں (ممتاز دانش) (۷) بے خبر کو غالب کی اُردو نثر نگاری پر تقدم کا شرف حاصل ہے (سید مرتضیٰ حسین بلگرامی) (۸) واقعات و لطائف (ابراہیم قریشی)

یوں تو سب ہی مضامین اچھے ہیں مگر دوسرے اور تیسرے مضمونوں کا مواد بہت سے قارئین کے لئے بالکل نیا ہے ان کو پڑھ کر طبیعت پر بہت اثر ہوتا ہے۔ اور مرزا کی زندگی بے انتہا حسرتناک معلوم ہونے لگتی ہے پانچواں مضمون جو برصغیر کے مایۂ ناز اہل قلم جناب مالک رام صاحب نے تقریباً بیس سال پہلے لکھا تھا اور ابتداً علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں اور پھر احوال غالب میں چھپا تھا کافی پرانا ہونے کے باوصف آج بھی دل کشی اور تازگی لئے ہوئے ہے منتخب اشعار کو "دستۂ گل" کے عنوان کے تحت ایک جگہ کردیا گیا ہے۔ یہ انتخاب تمامتر غالب کے غیر معروف کلام سے کیا گیا ہے۔

تحریر کے تین فوٹوؤں میں سے پہلا "مرزا غالب کے خود نوشت حالات زندگی کا عکس" ہے دوسری تحریر معین الدولہ ذوالفقار الدین حیدر خاں عرف حسین مرزا اور تیسری مرزا یوسف علی خاں عزیز کے نام مکتوبات ہیں غالب کا بڑا فوٹو سرورق پر ہے۔ دو اور تصویریں بعض مضامین کے ساتھ دی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ مرزا کے مکان۔ مقبرہ وغیرہ کے بھی کئی نایاب فوٹو شامل ہیں۔

سرورق کے آخری صفحہ پر پاکستان کے مایۂ ناز فنکار "زیدی" کے تیار کئے ہوئے پانچ کارٹون دیئے گئے ہیں جو غالب کے بعض اشعار اور مصرعوں کو سامنے رکھ کر بنائے گئے ہیں۔ ان کارٹونوں نے مرزا کے اِن شعروں اور مصرعوں کا لطف دوبالا کردیا ہے۔

ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی ۲۶ فروری ۱۹۶۹ء

اگرچہ یہ پرچہ غالب نمبر ہونے کا دعویدار نہیں ہے تاہم اس کے کچھ مضامین جو مختلف صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں غالب سے متعلق ہیں۔ سرورق کے دوسرے صفحہ پر غالب کا فوٹو اور اس کے نیچے اُن کی مشہور غزل۔ "ذکر اُس پری وش کا ......" درج ہے۔ پھر صفحہ دس پر ڈاکٹر شمل کا مضمون مع حالات مضمون نگار دیا گیا ہے۔ یہ مضمون جس کا عنوان ——— "غالب کا تخیل اقبال کے ہاں عملی تشکل اختیار کر لیتا ہے"

اس لئے قابل قدر ہے کہ ایک غیر ملکی خاتون کے قلم کی تراوش ہے صفحات ۱۴ اور ۱۵ پر دو مضمون جن کے عنوانات "غالب جو اپنی موت کے ۱۰۰ سال بعد بھی زندہ ہے" اور "غالب کی ازدواجی زندگی" ہیں بالترتیب مرزا ادیب اور عظیم قادری صدف نے تحریر کئے ہیں۔ صفحہ ۱۸ پر مختلف ادیبوں اور شاعروں کے ۱۱ پسندیدہ اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ صفحہ ۲۴ پر نور الصباح بیگم کا مضمون "رامپور اور غالب" (یہ رامپور ہے۔ دار السرور ہے) اور صفحہ ۲۸ پر چار ادیبوں کے نام مکتوبات ہیں جو مرزا غالب کے مخصوص طرز میں اُن ہی کی طرف سے لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان کے علاوہ بچوں کے صفحہ پر بھی ایک مضمون "چچا غالب" کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے جس کے ساتھ مرزا کی ایک چھوٹی سی تصویر بھی ہے۔

اقبال ریویو (مجلہ اقبال اکادمی پاکستان) جنوری ۱۹۶۹ء

اس شمارے میں غالب کی حیات اور شاعری سے متعلق دو مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون۔ "غالب کی داستانِ محبت" مسلم ضیاء صاحب نے لکھا ہے اور دوسرا مضمون "غالب کی مثنوی درد و داغ" محمد عبد اللہ صاحب قریشی نے تحریر فرمایا ہے۔ مسلم ضیائی صاحب نے مرزا کی زندگی کی اس داستانِ رنگین کو منظر عام پر لا کر نہ صرف عوام کو ایک ایسی حقیقت سے آگاہ کیا ہے جس پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا تھا، بلکہ بالواسطہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ مرزا کے ابتدائی کلام میں "سوزِ عشق" اور "سازِ محبت" کی کارفرمائی اسی داستانِ رنگین کی وجہ سے ہے۔ تائید میں خطوط غالب سے کچھ عبارتیں اور اُن کے فارسی اور اُردو اشعار بھی پیش کئے ہیں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ بعض غزلیں اور اشعار اس مخصوص واقعہ پر کیسے چسپاں کر دیئے گئے جبکہ اُس سے کوئی اشارہ یا قرینہ موجود نہیں ہے مثلاً مرزا کی یہ مشہور غزل

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد

محمد عبد اللہ صاحب قریشی صاحب نے اپنے مضمون میں مرزا کی ایک فارسی مثنوی "درد و داغ" کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ "مثنوی تسلسل خیال حسن ترتیب، فنی خوبیوں، واقعہ نگاری اور افسانے کی دلچسپی کے لحاظ سے ایک عجیب چیز ہے"۔ اپنے اس دعویٰ کی تائید میں مناسب اشعار پیش کئے ہیں۔ دراصل یہ مثنوی اس مصرع کی تفسیر ہے

ع چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو

اس شمارے کے یہ دونوں مضمون غالبیات میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

نقوش (اشاعت خصوصی) فروری، مارچ ۱۹۶۹ء

اس شمارے کے سرورق پر مرزا غالب کا رنگین فوٹو دیا گیا ہے اور دائیں جانب حاشیہ پر "عظمت غالب اور غربت" کے عنوان سے وہ قصیدہ درج کیا گیا ہے جس کا پہلا شعر ہے ؎

اے شہنشاہِ آسمان اورنگ — اے جہاندارِ آفتاب آثار

اور جس میں بادشاہ سے تنخواہ ماہ بماہ دیئے جانے کی درخواست کی گئی ہے۔

رسالہ کے اندر دو مضامین غالب سے متعلق ہیں (۱) کچھ غالب کی زبانی کچھ اپنی غلط بیانی (ممتاز حسین)۔
(۲) غالب خطوط کے آئینہ میں (حاجی عدیل)

پہلے مضمون میں ایک اچھوتے انداز سے غالب کے حالاتِ زندگی بیان کئے گئے ہیں اور دوسرے مضمون میں مرزا کے خطوط سے اقتباسات دے کر ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دونوں مضمون ہلکے پھلکے اور دلچسپ و معلومات افزا ہیں۔

ماہنامہ "فیضان" لائلپور جنوری و فروری ۱۹۶۹ء

سرورق پر وہ تصویر ہے جس میں مرزا کو خط لکھتا ہوا دکھایا گیا ہے پرچے میں غالب سے متعلق کل دو مضمون شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ قطعات، نظمیں اور غزلیں ہیں۔ ایک قطعہ تاریخ صد سالہ ہے جس میں مرزا کی سو سالہ برسی کے پانچ مادے دیئے ہیں۔ جن میں سے دو عیسوی سنہ کے مطابق ہیں اور تین ہجری سنہ کے اعتبار سے۔ مضامین کے عنوانات ہیں، (۱) غالب ایک مطالعہ (۲) نکاتِ غالب۔ پہلے مضمون کے لکھنے والے رفعت ہاشمی ہیں اور دوسرے مضمون کو جمیل رامپوری نے مرتب کیا ہے۔ پہلے مضمون میں اول سے آخر تک تسلسل ہے اور نہایت مختصر الفاظ میں مرزا کے اردو کلام کا جائزہ لینے اور اردو شعراء میں مرزا کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن دوسرا مضمون مسلسل نہیں ہے بلکہ مختلف عنوانات کے تحت مرزا کی حالت اور شاعری کے بعض گوشے اجاگر کئے گئے ہیں۔

ان مضمونوں کے بعد دو قطعے ہیں ایک کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا اور دوسرا شگفتہ کا۔ اسی صفحہ پر حالی کی نظم کے کچھ اشعار دیئے گئے ہیں جن میں آخری شعر ہے ؎

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت — خاک کو آسماں سے کیا نسبت

اگلے صفحہ پر حافظ محمد ابراہیم حافظ لائلپوری کا قطعہ تاریخ صد سالہ ہے جس کے عنوان "بحد عقیدت شہنشاہِ سخن (= غالب) سے بھی = عیسوی سنہ کے لحاظ سے سو سالہ برسی کی تاریخ نکلتی ہے۔ پھر حکیم نذیر احمد محرم کا قطعہ ہے بعنوان "نذر غالب" کے عنوان سے دو غزلیں یاور رامپوری اور رشاد عارفی مرحوم کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک غزل حکیم نذیر احمد محرم کی اور ایک نظم بعنوان "غالب" ساقی جاوید کی ہے۔

"ستارہ" کراچی فروری ۱۹۶۹ء

جامعہ ملیہ کراچی کے بچوں اور بچیوں کا ماہنامہ ہے۔ اس کو دیکھ کر جامعہ ملیہ دہلی کے ماہنامہ پیامِ تعلیم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

یہ بات یقیناً مسرت آگیں ہے کہ اس رسالہ نے بھی خاص اہتمام سے مرزا غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، حالانکہ کلامِ غالب میں بچوں کے معیار اور ان کی دلچسپی کی چیزیں نکال لینا مشکل ہے۔ تاہم غالب سے متعلق جتنے مضامین اس شمارہ میں شامل کئے گئے ہیں وہ سب بچوں کے معیار کے ہیں اور ان کو دلچسپ اور معلوماتی بنانے کی نہایت کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ سرورق پر گاؤتکیہ سے لگے اور حقہ کی نے ہاتھ میں لئے مرزا غالب بیٹھے ہیں۔ اداریہ میں جناب عبدالواحد صاحب سندھی (مدیر) نے اس عظیم شاعر کا تعارف کرایا ہے۔ پھر تین نظمیں ہیں پہلی مولانا حالی کی، دوسری محشر بدایونی کی اور تیسری محمد مظہر عزفانی کی۔ اس کے بعد غالب سے متعلق پانچ مضامین ہیں جن کی ترتیب یہ ہے (۱) پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟ (ادارہ) (۲) غالب اور ان کا بچپن (مسلم ضیائی) (۳) نکاتِ غالب (حکیم رضا خاں) (۴) بارے غالب کا کچھ بیاں ہو جائے (اخلاق اختر حمیدی) اور (۵) مرزا غالب کے حکیمانہ لطیفے (عزیز احمد)۔

ان سب مضمونوں میں غالب کی حیات سے بحث کی گئی ہے خصوصاً پہلے مضمون میں سوانحِ غالب کو جس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے وہ بچوں کے لئے نہایت مفید اور واضح ہونے کے ساتھ ساتھ کافی دلچسپ ہے اور دوسرا مضمون اپنے موضوع کے اعتبار سے اس جماعت کے لئے بہت مناسب ہے جس کے لئے وہ لکھا گیا ہے۔ باقی مضامین لطائف و حکایات کی شکل میں ہونے کی وجہ سے بیحد موزوں ہیں۔

یادگارِ غالب ۱۹۶۹ء کراچی

مرزا اسد اللہ خاں غالب کی صد سالہ برسی پر پاکستان اسٹوڈنٹس گلڈ کی جانب سے ہدیۂ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ یقیناً یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ طلباء کی برادری میں بھی ایک طبقہ ایسا موجود ہے جو علمی و ادبی مسائل سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اگر نونہالانِ وطن کی ذہنی تربیت صحیح خطوط پر کی جائے تو ان میں ایک بڑا طبقہ ایسا پیدا ہو سکتا ہے جو ہماری علمی و ادبی روایات کو نہ صرف قائم رکھ سکتا ہے بلکہ ان میں صحت مند عناصر کا اضافہ کر سکتا ہے۔ بہرحال طلباء نے اس سلسلہ میں جو کاوشیں کی ہیں اور اس گلدستہ کو سجانے کے لئے جو پھول اور کلیاں فراہم کی ہیں ان کے رنگ و بو سے لطف اندوز ہونے کے لئے ان خیابانوں پر ایک نظر ڈالئے جہاں سے یہ حاصل کی گئی ہیں۔ ترتیب یہ ہے:

(۱) غالب زنداں میں (زبیدہ اسد بخاری) (۲) پیامِ غالب (پروفیسر احمد) (۳) غالب در پیچۂ خامہ نوائے سروش ہے (مولانا غلام رسول مہر) (۴) غالب اقبال کی نظر میں نظم (علامہ اقبال) (۵) اندیشیاں اور نظم (نیس احمد جعفری) (۶) مرزا غالب کی انفرادیت (صوفی غلام مصطفیٰ تبسم) (۷) "غالب اور عظمت" (سید محمد تقی) انداز بیان اور (سید عابد علی عابد) (۹) ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا (ڈاکٹر عبادت بریلوی) (۱۰) نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں غالب (مولینا

محمد حسین آزاد) (۱۱) غزل (سراج الدین ظفر) (۱۲) غزل (راغب مراد آبادی) (۱۳) قصیدہ بہ بارگاہِ حضرت غالب دہلوی (تابش دہلوی)

ان کے علاوہ بعض نہایت عمدہ شگوفے طلباء نے خود تیار کئے ہیں اور ان کی نکہت ایسی خوش آئند ہے کہ مشامِ جان کو معطر کر دیتی ہے۔ مثال کے لئے ایک شگوفہ "غالب خطوط کے آئینہ میں" (امیر حسین چمن) پیش کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ غزلیں بھی خاصہ کی چیز ہیں جو فروری ۶۹ء میں منعقد ہونے والے انعامی مقابلہ میں بہترین سمجھی گئیں اور ان پر گلڈ کی جانب سے انعامات دیئے گئے۔ اس مقابلہ کے لئے غالب کا مشہور مصرع ؏

؏ کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

بطور مصرع دیا گیا تھا۔

شروع میں گزارش احوال (اداریہ) اور حرف آغاز (سید عزیز حسن) کے بعد غالد اطہر نے "کچھ اپنے بارے میں" کے زیر عنوان گلڈ کا تعارف کرایا ہے اور اس کی سرگرمیوں کا اجمالی تذکرہ کیا ہے۔

طلبا کا یہ ہدیہ یقیناً قابل قدر ہے۔ اور اس کو غالب کی خدمت میں پیش کرنے والے بالخصوص امیر حسین چمن اور غالد اطہر تحسین و تبریک کے مستحق ہیں۔

"جام نو" کراچی فروری ۱۹۶۹ء تعمیری ادب اور اسلامی اقدار کے اس نمائندہ دکارشمارہ اگرچہ غالب نمبر نہیں ہے تاہم اس کا تقریباً ایک تہائی حصہ غالبیات کے لئے وقف کرکے اس عظیم شاعر کو نذرانہ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اس میں بعض عنوانات بڑے اچھوتے ہیں جیسے غالب اور عوارض (خطوط کے آئینہ میں) اور غالب کی بلنک ورس۔ غالب سے متعلق مضامین اور نظموں کی ترتیب یہ ہے۔

(۱) غالب بحیثیت نثر نگار (محمود الرحمٰن) (۲) تضمین غالب (صبا اکبر آبادی) (۳) غالب اور عوارض (مناظر عاشق ہرگانوی (۴) نذر غالب (قدوس صدیقی) (۵) غالب کی بلنک ورس (عنبر چغتائی) (۶) غزل (محسن احسان) (۷) ذکر غالب (زرخشاں ابدالی) (۸) نذر غالب (سعیدہ ناز۔ شاہ سلطانہ ناز) (۸) ہدیہ عقیدت (ذہیر کنجاہی) (۹) نذر حضرت غالب (ریحانہ فن)

"ماہ نو" کراچی
جنوری، فروری ۱۹۶۹ء
غالب کی صد سالہ برسی پر خصوصی اشاعت

جہازی سائز کا ۳۰۰ صفحات سے زیادہ پر مشتمل یہ غالب نمبر اپنی دیرینہ روایات کو قائم رکھے ہوئے منظر عام پر آیا ہے۔ ظاہری اور باطنی خوبیوں سے مالا مال ہے سرورق سادہ لیکن نہایت دیدہ زیب ہے۔ کاغذ سفید اور کتابت و طباعت معیاری ہیں۔ ان ظاہری محاسن سے گزر کر جب نگاہ اس کے مشمولات پر پڑتی ہے تو اس میں بھی یہ برصغیر کے صف اول کے غالب نمبروں میں دکھائی دیتا ہے۔ اس میں دو طرح کے مضامین شامل ہیں ایک تو وہ مضامین جو وقتاً فوقتاً اس مجلہ کے مختلف شماروں میں نکلتے رہے ہیں۔ دوسرے وہ مضامین جو خاص اسی شمارے کے لئے لکھے گئے ہیں پچھلے مضامین

کو اس نمبر میں شامل کرلینا دو لحاظ سے مفید ہے اول یہ کہ اس طرح غالبؔ سے متعلق تمام مواد ایک جگہ جمع ہوگیا ہے اور شائقین بہت سے شمارے دیکھنے کی زحمت سے بچ گئے ہیں دوسرے یہ کہ یہ مضامین فرمائش پر نہیں لکھے گئے تھے بلکہ مضمون نگاروں کے بے انتہا غور وخوض کا نتیجہ اور اُن کے حقیقی خیالات اور رجحانات کے ترجمان ہیں۔ اس لئے قدرتی طور پر زیادہ وزنی اور کافی وقیع ہیں۔ جو مضمون اور مقالات خاص اسی شمارے کے لئے لکھے گئے ہیں وہ سب بھی مشہور اہل قلم حضرات نے لکھے ہیں اس لئے نہایت دلچسپ اور قیمتی معلومات کے حامل ہیں۔ تمام مضامین کو حسب ذیل عنوانات کے تحت جمع کیا گیا ہے۔

(۱) حیات وشخصیت (۲) تلامذۂ غالبؔ (۳) فکر وفن (۴) فارسی شاعری (۵) خطوط (۶) نقد ونظر (۷) نظم (۸) مزاح۔

سرِورق کی تصویر کے علاوہ خود غالبؔ کے، اُن کی تحریروں کے اور اُن کے تلامذہ کے کئی فوٹو بھی شامل ہیں غرض غالب سے متعلق اچھا مواد یکجا ہوگیا ہے۔

افکار کراچی، غالب نمبر
فروری، مارچ ۱۹۶۹ء

یہ نمبر تقریباً سوا تین سو صفحات کا ہے۔ سرِورق سادہ مگر جاذب نظر ہے کاغذ نیوز پرنٹ مگر کتابت وطباعت معیاری ہیں ضخامت اور مضامین کے لحاظ سے یہ شمارہ برصغیر کے صف اول کے رسالوں میں شامل کئے جانے کے قابل ہے۔ اشاریہ کے علاوہ اس میں تقریباً چالیس مضامین ونظومات شامل ہیں جن میں سے اکثر مضمونوں کے لکھنے والے ہند وپاکستان کے مشہور اہل قلم حضرات ہیں۔ شروع میں واقعاتِ غالبؔ کو "تماشائے گلشن" کے عنوان کے تحت سنہ وار نہایت تفصیل سے مرتب کر دیا گیا ہے اگرچہ اور بھی کئی رسالوں میں یہ تاریخی ترتیب قائم کی گئی ہے۔ لیکن جتنا اہتمام افکار کے اس شمارہ میں کیا گیا ہے۔ اُتنا کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتا۔ اس میں ایک جدت یہ کی گئی ہے کہ ہر سنہ کے آگے اُس کتاب کا حوالہ مع صفحے کے دیا گیا ہے جس کی بنیاد پر وہ سنہ لکھا گیا ہے۔ ان کتابوں میں خصوصیت سے (۱) غالبؔ از غلام رسول مہر (۲) ذکر غالبؔ از مالک رام (۳) نسخۂ عرشی (۴) غالبؔ از شیخ محمد اکرام اور (۵) کلیات نثر فارسی شامل ہیں۔ اس طویل اشاریہ کے بیچ بیچ میں اور بھی بہت سی قیمتی معلومات دی گئی ہیں

باقی مضامین کو حسب ذیل عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔

(۱) متاعِ خانہ (نادر ونایاب تحریریں) (۲) اعتبارِ نغمہ (نذر غالبؔ طرحی غزلیں) (۳) گوشۂ بساط (نئے مضامین) (۴) زبانِ سپاس (منظوم خراج عقیدت) (۵) محشرِ خیال (منتخب مضامین) (۶) دستنبو (مستند اُردو ترجمہ مع فارسی اشعار) (۷) دلفریبیٔ عنوان (ادبی خبرنامہ)

اِن مضامین اور منظومات میں دو مضمون نئے اور اچھوتے ہیں (۱) ذکر غالبؔ کچھ نئے حالات (از مالک رام) (۲) غالبؔ کی ایک نئی تحریر (از مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی)

آخر میں دو چیزیں شامل کر کے اس شمارہ کو چار چاند لگا دیئے گئے ہیں ایک محاسنِ کلام غالب از ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری دوسرا دستنبو کا اُردو ترجمہ۔ یہ ترجمہ اگرچہ زیادہ دلچسپ نہیں تاہم مستند ہے۔ ان کے علاوہ میرزا یگانہ چنگیزی کا مکتوب "غالب شکن" اور رشید احمد صدیقی کا مختصر مضمون بعنوان "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا" بھی گرانقدر تحریریں ہیں۔

نگار پاکستان (کراچی)
غالب نمبر
جنوری فروری ۱۹۶۹ء

برصغیر کے ادبی ماہناموں میں نگار کی جو حیثیت رہی ہے وہ کسی اُردو جاننے والے اور ادب اُردو کے شیدائی سے پوشیدہ نہیں۔ نگار پاکستان اُسی قدیم خادم اُردو نگار لکھنؤ کا ایک دوسرا روپ ہے جو اُس نے پاکستان میں آکر اختیار کر لیا ہے۔ یہاں بھی اس رسالے نے اپنے معیار کو گرنے نہیں دیا۔ جب سے جاری ہوا ہے نہایت آب و تاب اور باقاعدگی سے نکل رہا ہے

برصغیر کے دیگر رسالوں کی طرح نگار پاکستان نے بھی "غالب نمبر" نکال کر اس عظیم شاعر کو خراج عقیدت پیش کیا ہے لیکن جس طرح اس رسالہ کا معیار عام طور پر دوسرے تمام ادبی رسالوں سے بلند ہے اُسی طرح اس کا غالب نمبر بھی دوسرے مجلوں کے غالب نمبر سے گوئے سبقت لے گیا ہے اگرچہ نہ تو اس نمبر کی ضخامت بہت زیادہ ہے اور نہ مضامین کی تعداد اشتہارات کے علاوہ کل ۱۶۰ صفحات ہیں اور مضامین، ملاحظات کو الگ کر کے کل ۱۸ ہیں۔ لیکن سب مضمون معیاری اور مضمون نگار سب کے سب ملک کے مشہور اہل قلم ہیں۔ ان تمام مضمونوں کو تین بڑے عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے

(۱) زندگی و شخصیت اس میں کل تین مضمون شامل ہیں۔ غالب کی زندگی (از مالک رام) غالب کا معیار شعر و سخن (از مولانا عرشی) اور غالب کی شخصیت (از ڈاکٹر شوکت سبزواری)

(۲) فکر و فن ـ اس حصہ میں حسب ذیل بارہ مضامین شامل کئے گئے ہیں۔

غالب کی شاعرانہ خصوصیت (نیاز فتحپوری)۔ غالب، مومن، ذوق (حامد حسن قادری) غالب بحیثیت نقاد (مولانا مہر) غالب پھر اس دنیا میں (فراق گورکھپوری) غالب ہمہ رنگ (مجنون گورکھپوری) غالب کا ذہنی ارتقاء (آل احمد سرور) غالب کی بت شکنی (احتشام حسین)۔ غالب اور تقلید میر (محمد عظیم فیروز آبادی) غالب کا فلسفہ (ابو محمد سحر) غالب کے کلام میں استفہام (فرمان فتحپوری) غالب کا اسلوب (خلیل صدیقی) اور غالب کے اسلوب سخن کا ایک اہم پہلو (فرمان فتحپوری)

(۳) نقش ہائے رنگ رنگ ـ اس عنوان کے تحت بھی تین مضمون رکھے گئے ہیں۔

فارسی غزل گو شعراء میں غالب کا مرتبہ (نیاز فتحپوری) غالب کی فارسی شاعری (برہم ناتھ دت) اور غالب و فغانی (انعام الحق کوثر)

جامعہ ـــــ غالب نمبر
فروری و مارچ ۱۹۶۹ء

جامعہ ملیہ دہلی کے اس ترجمان کی مجلس ادارت میں پروفیسر محمد مجیب اور ڈاکٹر سید عابد حسین جیسی مایۂ ناز ہستیاں شامل ہیں۔ ان دونوں کی موجودگی ہی غالب نمبر کے اعلیٰ معیار ہونے کی ضامن ہے، اس شمارے کی ضخامت زیادہ نہیں یعنی محض دو سو صفحات ہیں۔ مضامین

کی تعداد بھی صرف ۹ ہے لیکن مضمونوں کا معیار اتنا بلند ہے کہ غالب کو نذرِ عقیدت پیش کرنے والوں میں یہ تمام سب سے آگے کی صف میں دکھائی دیتا ہے

نذرات کے فوراً بعد ایک نظم دی گئی ہے جو بغیر عنوان کی ہے۔ لائق مدیر نے نظم کا عنوان قائم کرنے اور اس کی صنف متعین کرنے کی ذمہ داری قارئین پر ڈال دی ہے۔ ضیاء الحسن فاروقی صاحب نہ صرف رسالہ کے مدیر ہیں بلکہ مضامین میں بھی کمیت کے اعتبار سے سب سے وقیع حصہ اُن ہی کا ہے۔ کیفیت کے لحاظ سے بھی اُن کے دونوں مضمون گرانمایہ ہیں۔ پروفیسر محمد مجیب کا مضمون "ایک مترجم کی سرگزشت" اور ڈاکٹر سید عابد حسین کا مضمون "بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے" اپنی جدت اور تازگی کے اعتبار سے لائق تحسین ہیں۔ برصغیر کے مایۂ ناز شاعر آنش صدیقی نے غالب کو نذرانہ عقیدت نظم کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ اُن کی یہ نظم جس کا عنوان غالب ہے اپنے رنگ و آہنگ، خلوص جذبات اور جدت و طرز ادا کے اعتبار سے خاصہ کی چیز ہے۔ (ثناء الحق)

غالب ڈائری ۱۹۶۹ء غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ کراچی نے یہ ڈائری شائع کی ہے اس میں صادقین نے غالب کے اشعار کو اساس بنا کر متعدد تصاویر بنائی ہیں۔ غالب کے کلام کا انتخاب بھی شامل ہے۔ کاغذ، طباعت نہایت اعلیٰ ہے۔

(۱) اس ڈائری میں صادقین صاحب کا فن بظاہر اپنے نوعی تکملے کی آخری حد پر پہنچ گیا ہے۔ پھر بھی مزید ترقی کا امکان باقی ہے۔ اس لئے کہ نقطۂ عروج کی حد معیّن نہیں ہے ذہن کی قوت بھی بے حد و پایاں ہے۔

(۲) یہ نقوش غالب کے اشعار کے مرقعے سہی یا نہ سہی مگر کسی نہ کسی نوع مخلوق کے ذہن کے نیا ... ہیں ... اور بھیانک پن اگر کسی حسن کا نام ہے تو اس حسن میں فی الوقت عدیم المثال ہیں۔ بہت ممکن ہے مرزا یوسف کے خوابوں کی تعبیریں ہوں۔

(۳) بچھو اور کنکھجورے، رات کے وقت، مستی کے جوش میں جب رقص فرماتے ہیں، تو ریگ زار پر ایسے ہی نقوش بن جاتے ہیں۔ ان سے ڈرنا آفاقیت کی تکذیب ہے۔

(۴) لکھنے سے پہلے۔ صادقین صاحب "موئے قلم" کا فرق اگر معلوم کر لیتے۔ تو اتنی قیمتی تالیف میں یہ نقص کیوں رہ جاتا۔ "موقلم" نقاش کے برش کا نام ہے اور "موئے قلم" کوئی چیز نہیں۔ اس لئے کہ قلم کے کسی حصے پر بال نہیں ہوتے۔ بالِ طاؤس زشت کہلاتا ہے نہ کہ "درشت" یہ لفظ لہجے کی خشونت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

(۵) صادقین صاحب نے خود ہی اپنی عظمت کا ڈھول پیٹا ہے کاش اُن ہی کی نئی منزلت کا کوئی ... انکشاف کرتا، تو اس میں، اتنا ہی وزن ہوتا، جتنی اس ... میں بلند آہنگی ہے اور اس اخوت تلبیس سے ... اخلاق کے مشک و عنبر کی مہک بھی آتی۔

(۶) یونائیٹڈ بینک کے دریا دل ڈائرکٹر صاحبان، تہنیت کے مستحق ہیں کہ ان حضرات کی سخاوت نے غالب کے نام پر تھیلی کا منہ کھول کر زرِ کثیر لٹا دیا۔ ادب عالیہ کی محبت اسی عمل کا نام ہے خدا جزائے خیر دے

وہ داد و دید گرانمایہ شرط ہے ہمدم
وگرنہ مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے
(مخمور اکبر آبادی)

صبحِ امید بمبئی صبحِ امید کا جولائی ۱۹۶۸ء کا یہ شمارہ اگرچہ غالب نمبر نہیں ہے مگر اس میں کئی مضمون غالب پر شامل ہیں۔ غالب کا فلسفہ حیات (پروفیسر نظام الدین) غالب کا فلسفہ غم، غالب کی جمہوریت پسندی (اعجاز سیمابی) غالب کا پہلا تذکرہ نگار (سجاد باقر رضوی) غالب آئینہ ایام میں (علی رضا حسینی) خاص طور سے قابل ذکر ہیں، طباعت و کتابت گوارا ہے۔ اس کے ایڈیٹر عبدالحمید بوہرے ہیں۔ اور یہ رسالہ کماٹی پورہ بمبئی ۸ سے شائع ہوتا ہے۔

نونہال کراچی ادارہ مطبوعات ہمدرد کا بچوں کا پرچہ نونہال، فروری ۱۹۶۹ء اگرچہ غالب نمبر نہیں ہے مگر اس میں بھی غالب پر کئی مضمون شامل ہیں، نام ان کا تابندہ رہے گا، (نظم شاعر لکھنوی) غالب کون ہے (وحیدہ نسیم)، بچوں کا غالب (مسلم ضیائی) غالب کے لطیفے (ادارہ) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مسلم ضیائی نے اپنے مضمون میں قادر نامہ (غالب) کو مکمل سمیٹ لیا ہے۔

غالب سووینیر لکھنؤ ادارہ فروغ اردو نے صد سالہ جشن غالب کے موقع پر رسالہ فروغ اردو، غالب کی رسم افتتاح کے موقع پر یہ سووینیر شائع کیا ہے۔ افتتاح رسم کے فرائض جناب کے۔ کے شاہ وزیر اطلاعات و نشریات حکومت ہند نے انجام دیئے یہ تقریب ۸ دسمبر ۱۹۶۸ء کو منعقد ہوئی۔ اس میں غالب سے متعلق بعض دلچسپ مضامین اطلاعات اور بیانات شامل ہیں۔

گلفشاں، غالب نمبر لاہور لاہور کا پندرہ روزہ "گلفشاں" کا یہ غالب نمبر ہے جس میں غالب کی زندگی اور فن پر بلقیس اختر، مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، ڈاکٹر سید عبداللہ، علی عباس جلالپوری، عشرت رحمانی، ڈاکٹر مسیح الزمان، علی حیدر ملک، رضا ہمدانی، ڈاکٹر وزیر آغا، آغا سہیل، احمد ندیم قاسمی، جیسے معروف و مشہور ادیبوں اور دانشوروں کے مضامین شامل ہیں، نظم کا حصہ بھی خاصا جاندار ہے کہ ہر صاحب قلم کی تصویر التزام کے ساتھ شامل کی ہے۔ اس خاص نمبر کی قیمت ۲ روپیہ ہے۔

کلیاتِ غالب (اردو) مرتبہ خان اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی، سائز $\frac{22\times18}{8}$، صفحات ۲۰۸
قیمت دس روپیہ، کتابت، طباعت و کاغذ گوارا،
ناشر: مکتبہ کارواں۔ کچہری روڈ، لاہور

غالب کے دیوان کے متعدد ایڈیشن شائع ہوتے رہے ہیں۔ نسخہ حمیدیہ اس سلسلے کی خاص کڑی تھی، آخر میں مولانا

امتیاز علی عرشی نے غالب کا مکمل اور صحیح تر نسخہ شائع کیا تھا جس کا حصول پاکستان میں ناممکن تھا، نظیر لدھیانوی صاحب نے غالب کا اردو کلام یکجا مرتب کرکے شائع کر دیا ہے۔ یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ نسخۂ عرشی ان کے پیش نظر رہا ہے شروع میں یوسف جمال انصاری صاحب نے ایک طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں غالب کی زندگی فن اور شاعری کا جائزہ لیا ہے

غالب اور آہنگ غالب مرتبہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، $\frac{22 \times 18}{8}$ صفحات ۳۲، کاغذ کتابت، طباعت، نہایت اعلیٰ قیمت پندرہ روپے، ناشر: غالب اکیڈمی، نئی دہلی ۱۳

ڈاکٹر یوسف حسین خاں، اردو حلقوں میں جانی پہچانی شخصیت ہیں ان کی متعدد کتابیں اردو غزل اور روح اقبال ادبی حلقوں میں خاصی مقبول رہی ہیں، ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب، غالب صدی کے موقعے پر غالب اکیڈمی کی طرف سے نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں "انھوں نے غالب کی شخصیت اور شاعری کو بالکل انوکھے انداز میں تحریر کیا ہے۔ اس کتاب سے ہماری زبان کے تنقیدی ادب میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔"

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے پہلے دو باب حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور آخری تین باب میں فاضل مؤلف نے غالب کے فن اور شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔

فروغ اردو۔ غالب نمبر لکھنؤ سائز $\frac{22 \times 18}{4}$ صفحات ۸۳۲، ناشر: کل ہند ادارہ فروغ اردو لکھنؤ

لکھنؤ کے مشہور علمی و ادبی ادارے "کل ہند فروغ اردو" کا یہ ضخیم غالب نمبر اپنے دامن میں بہت سے علمی و تحقیقی مضمون سمیٹے ہوئے ہے۔ جن کے عنوان، احوال، تنقید، تحقیق، فارسی، مزاحیہ، مکتوبات و منظومات پر مشتمل ہیں ان مضامین کے تحت پاک و ہند کے نامور اور معروف ادباء و محققین نے نہایت جاندار اور تحقیقی مضمون لکھے ہیں۔

اس کتاب کو محمد حسین شمس پھلوی اور سید انصار حسین رضوی نے مرتب کیا ہے (محمد ایوب قادری)

نقوش (غالب نمبر) فروری ۱۹۶۹ء

نقوش کا غالب نمبر قدرے تاخیر سے منصۂ شہود پر آیا لیکن اس نے ایک ہی نظر میں اپنی روایتی ضخامت سے اکثر لوگوں کو سہما دیا۔ نقوش کو خصوصی نمبر نکالنے میں برصغیر کے رسالوں میں قائد کی سی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اگر آخر کے چند اشتہارات اور مطبوعات ادارہ فروغ اردو کی فہرست کو خارج کر دیا جائے تو بھی صفحات کی تعداد ۸۴۰ رہ جاتی ہے جو برصغیر کے کسی بھی ماہانہ یا سہ ماہی رسالہ کے لئے قابل رشک ہے۔

ضخامت سے نظر ہٹا کر جب اس کے مشمولات کو دیکھا جائے تو اس میں بھی یہ اس موقعہ پر شائع ہونے والے مختلف رسالوں کے نمبروں میں سے کسی سے فروتر نہیں معلوم ہوتا۔ غالب کی زندگی اور شاعری و نثر نگاری کے تمام ہی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مضمون نگاروں کی طویل فہرست میں اگرچہ تقریباً سب ہی پاک و ہند کے اچھے ادیب اور اہل قلم حضرات

دکھائی دیتے ہیں تاہم نمونے کے طور پر صرف چند کے نام پیش کئے جاتے ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر گیان چند، مسلم ضیائی، ڈاکٹر اختر اورینوی، ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر شمحمد حسن، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، مولانا امتیاز علی عرشی، مالک رام، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر خلیق انجم، محمد ایوب قادری، ڈاکٹر سید عبداللہ، محمد عتیق صدیقی، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، کوثر چاندپوری، سید وقار عظیم، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، عبدالرحمٰن چغتائی۔

فہرست طویل ہوتی جارہی ہے اس لئے تبصرہ نگار گھبرا کر یہیں پر ختم کئے دیتا ہے جب لکھنے والوں کے ناموں کی فہرست مرتب کرنے ہی کا یارا نہیں رہا تو پھر مضامین کی فہرست دینا کس طرح ممکن ہے۔ صرف اتنا کہ کر اس طولانی داستان کو ختم کیا جاتا ہے کہ جو مضامین اس نمبر میں شامل کئے گئے ہیں وہ نہ صرف رٹے پٹے عنوانات پر نہیں ہیں بلکہ بعض عنوانات تو ایسے ہیں جن تک ہر شخص کا دھیان بھی نہیں پہنچ سکتا اور وہ صرف ان ہی لوگوں کا حصہ ہیں جن کو غالب کے کلام کا مسلسل مطالعہ کرتے کرتے اس کے مزاج تخیل کا ایک آدھ پہلو مل جائے۔ اس صنف کے مضامین کے لئے صرف ایک مثال کافی ہے۔ غالب ایک گونگا شاعر (از بیگانہ چنگیزی)

مضامین کی اس طویل فہرست میں سے کئی نہایت اچھوتے ہیں۔ ان پر انفرادی طور سے تبصرہ کرنا تو ممکن نہیں۔ صرف عنوانات دیدینا کافی تھے۔ البتہ وہ یہ ہیں۔

غالب اور ریاض خیرآبادی۔ غالب کے ناشنیدہ اشعار۔ غالب کے رد کردہ اشعار۔ غالب اور غیاث اللغات۔ غالب اور ناسخ، غالب کے بارے میں معاصر اخبارات کی رائے، غالب کے بعد اُن پر پہلا مضمون

نقوش کا یہ نمبر مجموعی طور پر صف اول کے غالب نمبروں میں ہے۔ اور اس میں اس شاعر نغز گو دلنوش گفتار کو صحیح معنوں میں خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے (ثناءالحق)

تحریک دہلی یہ مارچ ١٩٦٩ء کی اشاعت ہے اس میں محمود سعیدی کا دستنبو کا اردو ترجمہ شامل ہے، مولانا غلام رسول مہر کے دو مضمون ان کی مشہور کتاب "غالب" سے ماخوذ ہیں۔ شروع میں گوپال متل (ایڈیٹر) کا ایک مضمون غالب نمبروں کے سلسلے میں شامل ہے یہ نہایت دلچسپ مضمون ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ غالب کو آج کل بعض لوگ کس طرح اپنے ذاتی اور سیاسی اغراض کے لئے استعمال کر رہے ہیں اور ان کے کلام کی کیسی کیسی تاویلیں کی جارہی ہیں۔ متل صاحب کا ایک مضمون غالب مجتہد یا مقلد کے عنوان سے شامل ہے۔

قندیل لاہور یہ فروری ١٩٦٩ء کا شمارہ ہے۔ لاہور کے ہفت روزہ قندیل نے غالب نمبر نکالنے کا اہتمام کیا ہے اس نمبر میں غالب کی شخصیت، سوانح، فکر و فن اور ان کے فلسفہ و تصورات پر بارہ مضمون شامل ہیں لکھنے والوں میں ایک دو کے سوا تمام نوجوان ادیب شامل ہیں یہ مضامین مفید اور خاصی معلومات پر مشتمل ہیں۔ لکھنے والوں کی محنت، لگن، ادبی

ذوق اور غالب سے متعلق منظومات کا حصہ بھی خاصا وقیع ہے۔ تنقیدت نے ان کی تحریروں میں ایک خاص دلکشی پیدا کر دی ہے۔ ندر غالب کے سوالات سے ... یہ نمبر اپنے تمام مضامین نظم و نثر کے لحاظ سے قابل مطالعہ اور ایک یادگار نمبر ہے۔

آجکل دہلی اشاعت فروری ۱۹۶۹ء۔ خیال تھا کہ سویں برس کے موقع پر آجکل دہلی کا نمبر سب سے زیادہ وقیع نکلے گا مگر وہ امید پوری نہ ہوئی بہرحال اس نمبر میں کئی مضمون نہایت عمدہ ہیں اور ان کی تیاری میں محنت کی گئی ہے مگر پھر بھی وہ آج کل کے علمی معیار کے مطابق نہیں ہیں اور اس نمبر سے ان کی روایت آگے نہیں بڑھی۔ چند نثر میں نو مضمون ہیں اور لکھنے والے ہیں، مسعود حسین خاں، عبدالقوی دسنوی، ضیاء احمد بدایونی، یوسف سلیم چشتی، حسن خاں، شمیم حنفی، سلیم اختر اور منظور الحسن برکاتی، ایڈیٹر کی کوشش بہرحال قابل ستائش ہے جو کچھ ہے مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

کوہستان لاہور اشاعت ۱۶ فروری ۱۹۶۹ء اس اشاعت میں خبروں کے ساتھ ساتھ غالب سے متعلق چار مضامین بھی شامل ہیں جو آغا محمد باقر، مالک رام، فرخ جلالی اور جگدیش بدایونی نے لکھے ہیں جن کے عنوانات بالترتیب یہ ہیں، غالب کے حالات آب حیات کے مسودے پر ایک نظر، مختار الملک سے غالب کے تعلقات، مدہوش بدایونی کے نام غالب کا ایک نایاب خط غالب اور تصوف چاروں مضمون نہایت عمدہ اور قابل مطالعہ ہیں۔

امروز لاہور اشاعت ۱۶ فروری ۱۹۶۹ء روزنامہ امروز کی ہفت روزہ اشاعت ہے جو غالب کے ذکر خیر کے لئے وقف ہے۔ وجاہت حسین سونی پتی، ناظر حسن زیدی، ابوالاعجاز صدیقی، احمد ندیم قاسمی، وجاہت علی سندیلوی، شمیم انجم، نصیر احمد خاں، ظہیر احمد صدیقی، عبدالقدوس نقوی، عباد اللہ فاروقی اور معراج نیر کے مضامین اس میں شامل ہیں۔ اور غالب سے متعلق کئی تصاویر بھی ہیں۔ دو ڈھائی صفحات پر غالب کے اشعار کا انتخاب پیش کیا گیا ہے اس نمبر کے زیادہ تر مضامین اگرچہ مطبوعہ ہیں مگر اس کے باوجود ایک مفید علمی خدمت ہے۔

علم و فن دہلی یہ اپریل ۱۹۶۹ء کی اشاعت ہے اور یہ نمبر چند نمایاں خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں ہندوستان کے ممتاز دانشوروں کے مقالات کے علاوہ انگلستان، اٹلی، چیکوسلواکیہ اور امریکہ کے مشہور مستشرقین کے انٹرویو بھی شامل ہیں۔ اس سالہ میں دوسری چیز غالب پر سمینار کی روداد ہیں جسے ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے مرتب کیا ہے اس میں ہندوستان کے ممتاز معروف ادیبوں، محققوں اور نقادوں نے حصہ لیا ہے ان میں قاضی عبدالودود، پروفیسر آل احمد سرور، رشید احمد صدیقی، یوسف حسین خاں، غلام السیدین، مالک رام، عبداللطیف اعظمی، کوثر چاندپوری، مختار الدین آرزو، آنند نرائن ملا خود عابد رضا بیدار شامل ہیں یہ بات چیت بہت سے علمی مقالوں سے بھاری ہے۔ مذاکرے میں روزنامہ نگار کا حصہ خاصا وقیع ہے جشن غالب سے متعلق منظومات کے سپاس نامے بھی شامل ہیں جو تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ منفردات میں بعض مقالات بھی خاص توجہ کے مستحق ہیں جو علمی طور سے مفید ہیں ...

(ابو سلمان)

سہ ماہی اُردو کراچی
جنوری، فروری، مارچ ۱۹۶۹ء

غالب کی صدسالہ برسی کے موقعہ پر بہت سے ایسے رسالوں اور اخباروں نے بھی غالب نمبر نکال ڈالے جن کا ادب سے بالواسطہ یا نہایت کمزور تعلق ہے۔ ایسی صورت میں اُن رسالوں اور مجلوں کے لئے جو اُردو زبان و ادب کے خالص خدمت گزار سمجھے جاتے ہیں اور بھی ضروری ہوگیا کہ وہ اِس شاعر خوش گفتار اور ادیب شہیر کو کچھ اس انداز سے خراجِ عقیدت پیش کریں کہ اُن کی امتیازی حیثیت قائم رہے۔ ہمارا اشارہ خصوصیت سے صحیفہ، نقوش، نگار، افکار اور اُردو کی طرف ہے۔ اِن ادبی رسالوں نے اِس فرض کی ادائیگی شایانِ شان طریقہ پر کی اور بعض نہایت اچھوتی اور درجۂ اوّل کی چیزیں پیش کیں۔

رسالہ اُردو کراچی جس کا مقصد وحید ہی زبانِ اُردو کے ادب اور شاعری کی خدمت کرنا ہے موجودہ غالب نمبر نکال کر اپنے مقصد کے حصول میں بھی بڑی حد تک کامیاب ہوا۔ اُردو کا غالب نمبر کمیت اور کیفیت دونوں ہی اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ ۴۰۰ صفحات کا یہ خصوصی نمبر اپنے دامن میں غالب کے فکر و فن اور حیات و شاعری سے متعلق نہایت اعلیٰ درجے کے مضامین سمیٹے ہوئے ہے۔ اداریہ (حرفے چند) کے علاوہ اس میں برصغیر کے چوٹی کے اہلِ قلم حضرات کے اٹھائیس ۲۸ مضمون شامل ہیں۔ جن میں موضوعات کا تنوع اور جدت و تحقیق کے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ مضمون نگاروں میں اکثر وہ حضرات دکھائی دیتے ہیں جو غالبیات کے اختصاصی ہونے کی وجہ سے دوسرے رسالوں میں بھی موجود ہیں جیسے مولانا غلام رسول مہر، مسلم ضیائی، امتیاز علی عرشی، نادم سیتاپوری، پروفیسر ممتاز حسین، قاضی عبدالودود، مخمور اکبرآبادی وغیرہ، اِن مضمون نگاروں کے نام تو کئی اور رسالوں میں بھی دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کے جو مضامین اس شمارے میں شامل ہیں وہ کسی اور جگہ نظر نہیں آتے۔ اُنھوں نے اور اُن کے علاوہ اور کئی مضمون نگاروں نے اِس عظیم شاعر کی حیات و شاعری کے بعض بہت ہی عجیب پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ اکثر مضامین نہایت تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ اور برصغیر پاک و ہند کے اُردو زبان و ادب کے اِس پُرانے نقیب کے شایانِ شان ہیں۔

صورت ظاہری میں بھی اُردو کا یہ شمارہ کافی دلکش اور دیدہ زیب ہے۔ سفید کاغذ نہایت عمدہ ٹائپ میں چھپا ہے۔ سرورق سادہ مگر بیحد خوشنما ہے۔ اس پر مرزا کا وہ فوٹو دیا گیا ہے جس میں وہ گاؤ تکیہ سے لگے بیٹھے ہیں اور بیچوان سے شوق فرما رہے ہیں۔ پرچہ کے اندر مراۃ الاشباہ کے سرورق اور اُس کے بعد کے صفحہ نیز سہ ماہی اُردو کے غالب نمبر کے بعض صفحات کے فوٹو شامل ہیں۔

ماہنامہ "قومی زبان" کراچی
بیادِ غالب
فروری ۱۹۶۹ء

غالب کی صدسالہ برسی کے سلسلہ میں انجمن ترقی اُردو کی جانب سے یہ دوسری پیش کش ہے۔ اِس موقعہ پر پیش ہونے والے نمبروں میں سہ ماہی مجلّہ "اُردو" کا غالب نمبر ہی اپنے مشمولات کے اعتبار سے کافی بھاری بھرکم تھا اس کے فوراً بعد ہی انجمن نے ماہنامہ "قومی زبان" کا غالب نمبر نکال کر برصغیر کے تقریباً تمام ادبی اداروں پر اپنی فوقیت

کو ایک مسلّم حقیقت بنا دیا ہے۔ اگرچہ قومی زبان کے اس نمبر کا معیار اتنا بلند نہیں ہے جتنا "سہ ماہی اُردو" کے غالب نمبر کا ہے اور ایسا ہونا ممکن بھی نہیں تھا۔ اس لئے کہ ادارہ کی بیشتر توجہ گیسوئے "اُردو" کی تزئین و زینت پر مرکوز رہی۔ تاہم اس پیشکش کو بھی غیر وقیع سمجھکر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی زبان" کا یہ خصوصی شمارہ بھی اپنے دامن میں غالبیات سے متعلق کافی مواد سمیٹے ہوئے ہے۔

اِس نمبر کی ضخامت سوا سو صفحات سے زیادہ ہے۔ صدر انجمن جناب اختر حسین صاحب کے افتتاحی مضمون" بیادِ غالب" کو شامل کرتے ہوئے کل مضامین ۱۲ ہیں" بیادِ غالب" کے بعد مضامین اور مضمون نگاروں کی ترتیب یہ ہے (۲) حافظ و غالب از ڈاکٹر ریاض الحسن (۳) غالب و اقبال — از مخمور اکبر آبادی (۴) دیوان غالب، نسخہ مالک رام۔ از محمد انصار اللہ نظر (۵) جدید شرح دیوان غالب (سیماب اکبر آبادی) — از اعجاز صدیقی (۶) غالب کے بہاری تلامذہ اور ارادت مند۔ از رخشاں ابدالی (۷) فکر غالب میں ہندوستانی عنصر — از ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری (۸) غالب کا اخلاقی تخیل — از ڈاکٹر فاطمہ شجاعت (۹) غالب کی اُردو نثر کے چند نادر نمونے — از میر ناصر علی دہلوی (۱۰) یونیورسٹیوں میں غالب پر تحقیقی کام — از ابو سلمان شاہجہانپوری (۱۱) اشاریہ غالب — از ابو سلمان شاہ جہانپوری (۱۲) غالب تذکروں میں — از ضمیر نیازی۔

عنوانات کو دیکھکر ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ غالب کے فکر و فن پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعض مضامین دوسرے عظیم شعراء سے غالب کا مقابلہ کر کے اس کے کلام کی خصوصیات کو نمایاں کیا گیا ہے بعض میں اس کے فکر و تخیل کا جائزہ لیکر کلام میں مختلف عناصر کی نشان دہی کی گئی ہے اور بعض میں اس کے تلامذہ اور ارادت مندوں کی کثرت دکھا کر اس کے اثرات کی وسعت بتائی گئی ہے۔ غرض کلام غالب کو سمجھنے اور اس کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لئے شیدائیانِ غالب کے واسطے کافی و وافی سامان جمع کر دیا گیا ہے۔ جدید شرح دیوان غالب (سیماب اکبر آبادی) یقیناً ایک خاصے کی چیز ہے لیکن مضمون پڑھنے کے بعد قاری کی پوری طرح سیری نہیں ہوتی۔ مناسب تھا کہ اس پر کسی قدر سیر حاصل بحث کی جاتی (ثناء الحق)

ہلال کراچی

ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی کے شعبہ فارسی کا آرگن ہے اور فروری ۱۹۶۹ء کی اشاعت" غالب نمبر" ہے چنانچہ اس میں غالب کی یاد میں سات مضمون اور تین نظمیں ہیں۔ لکھنے والوں میں سید منصور علی سلیم، ڈاکٹر محمد ریاض حسین کاظمی، مجید یکتائی، علی حیدر ملک ڈاکٹر انعام الحق کوثر ہیں۔ تمام مضامین قابل مطالعہ ہیں۔

ہلال کا یہ نمبر پیش کر کے اہل ایران اور فارسی خواں طبقے میں غالب کے تعارف کی ایک نہایت کامیاب کوشش کی ہے۔ اس نمبر غالب سے متعلق بعض نادر تصاویر بھی شامل ہے۔ (ابو سلمان شاہ جہانپوری)

بزمِ کانفرنس (غالب نمبر)

ڈاکٹر سید محمود، ایم۔ پی، بھارت علی گڑھ

عزیز محترم۔ السلام علیکم۔ آپ کا عنایت نامہ کل ملا۔ بہت بہت شکریہ آپ کو مرزا غالب پر میرا "مقدمہ" مل گیا۔ نظامی صاحب کے خاندان کے ایک لڑکے نے اس کا ذکر کچھ روز قبل کیا تھا۔ خیر آپ کی کوشش کامیاب ہوئی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے آپ کو اپنی دو تالیفات بھیجی تھیں یا نہیں۔ یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ لیکن اگر نہ پہنچی ہوں تو بھیجدوں ان میں سے ایک اردو میں تھی اس کا ترجمہ حیدرآباد میں . . . . انگریزی اور ہندی میں ہوا ہے لیکن اردو کی کوئی کاپی کسی کے پاس نہیں ملتی۔ آپ کو اردو میں پڑھ کر لطف آئے گا۔ اس لئے کہ وہ Dealuge form میں ہے اور اس میں جن لوگوں کے کردار ہیں ان میں سے بہتوں کے نام سے آپ واقف ہوں گے۔ اردو کی ایک پھٹی پرانی کاپی میرے پاس ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں بھیج دوں۔ دونوں کتابیں ہندو مسلم کلچرل تعلقات کے متعلق ہیں۔ اسے پڑھ کر آپ لطف اٹھا سکتے ہیں۔

غالب کے مقدمہ میں جن دو ناموں کے متعلق آپ نے دریافت کیا ہے وہ دقتی طور پر لکھے گئے تھے۔ خواجہ عبدالمجید جن کو آپ جانتے ہیں اور ممتاز حسین دہلی کے ایک نوجوان تھے۔ زیادہ و السلام

مولانا غلام رسول مہر، لاہور

مکرمی۔ ذرا انتظار فرمائیں، میں ضرور کوئی نہ کوئی چیز بھجواؤں گا اور انشا اللہ جلد۔ آپ جو کچھ میری کتابوں سے لینا چاہیں بے تکلف لے لیں۔ اجازت کی ضرورت نہیں۔ صرف حوالے دیدیا کریں تاکہ بدخواہوں کے لئے اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔ باقی خیریت۔ والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

مالک رام، دہلی

دسمبر کے مکتوب گرامی کا شکریہ قبول فرمائیں — میں آپ کی تلاش و تحقیق کا قائل ہوں — آپ براہ کرم ہمارے لئے کوئی اور مضمون لکھئے — اس درخواست کو قبول فرمائیے۔

غالب پر میں نے صد سالہ جشن کے سلسلے میں کوئی مضمون نہیں لکھا۔ ہوا یہ کہ متعدد رسالوں نے اس موضوع پر غالب نمبر شائع کرنے کا اعلان کر دیا سب سے دوستانہ تعلقات اور سب کے پرچے بھی مجھے برسوں سے تبرکاً آرہے ہیں۔ چونکہ اتنے مضمون لکھنا ممکن نہیں تھا۔ عافیت اس میں دیکھی کہ کسی کے لئے نہ لکھوں، یوں کسی کو شکایت نہ ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ میری مجبوری کے مدنظر آپ درگزر فرمائیں گے۔ دیکھئے "تحریر" کا خاص شمارہ آپ کی خدمت میں پہنچے گا۔ انشاء اللہ۔ شیخ محمد اسمٰعیل صاحب مدظلہٗ سے عندالملاقات میرا سلام عرض کریں۔

اکبر علی خاں رامپور

مکرم بندہ تسلیم! العلم کے غالب نمبر کے لئے آپ کی فرمائش ملی تھی۔ آبا کا ایک مضمون میں نے صحیفے کے لئے وحید قریشی صاحب کو بھیجا تھا۔ اس کے بعد انھیں ایک اور مضمون بھیجدیا اور یہ لکھا کہ پہلے والا مضمون آپ کے پتہ پر بھیجدیا جائے۔ معلوم نہیں آپ کو ملا یا نہیں آپ اُن سے منگا لیجئے عنوان یہ ہے غالب کے ترجمہ دعاء الصباح کا نسخہ رامپور اطلاعاً آپ کو بھی لکھ رہا ہوں۔ اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ مضمون اُن سے مل جائے تو اطلاع دے دیجئے گا

نادم سیتاپوری (١)

ہفتہ ڈیڑھ ہفتے کے بعد سیتاپور پہنچا ہوں۔ ڈاک کافی جمع ہوگئی ہے سب سے پہلے آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ اکتوبر کا "العلم" بھی آگیا اور قادری صاحب کا لفافہ بھی۔ اُنھیں وہ مضمون نہیں ملا جو لاہور سے موصول ہونا چاہیئے تھا۔ اب وقت بہت کم ہے دس دن میں خط آتا ہے اور دس ہی دن میں پہنچتا ہے اس لئے عرض یہ ہے کہ اگر غالب نمبر میں میری شرکت آپ ضروری ہی سمجھتے ہیں تو بذریعہ ٹیلیگرام اطلاع دیجئے اور میرے مضمون کا انتظار فرمائیے ویسے میں مضمون لکھ رہا ہوں اور نہایت ہی "قبرستانی" قسم کا۔ یعنی مزار غالب کی تاریخ۔ اب اس میں اگر ان کا مذہب آجائے تو بُرا نہ مانئے۔ خیر تو آپ کے ٹیلیگرام کا منتظر ہوں "العلم" کے لئے خاص مضمون پیش کردوں گا۔ انشاء اللہ! مجھے ابھی تک پاسپورٹ نہیں مل سکا ورنہ شاید روانہ ہو چکا ہوتا۔ قادری صاحب سے تسلیم کہئے گا انھیں علیحدہ خط نہیں لکھ رہا ہوں اس وقت مصروفیت زیادہ ہے۔ بھابی سے تسلیم کہئے گا بچوں کو دُعائیں۔

(٢)

کارڈ ۲۴ر۲ار کا شکریہ! بالکل اتفاق ہے کہ ایک مضمون دوسرے غالب نمبر کے لئے تیار رکھا تھا وہ نقوش کے مضمون کے ساتھ ہی لاہور روانہ کر رہا ہوں تاکہ وہ آپ کو فوراً بھیجدیں ہو سکتا ہے کہ دو چار دن کی دیر ہو جائے۔ مضمون مل جائے تو ایڈیٹر نقوش کو بھی اور مجھے بھی وصولی کی اطلاع دیجئے اور تحریر فرمائیے کہ "العلم" کا غالب نمبر کب تک شائع ہوگا؟ "بصائر" برسوں سے نہیں آیا کیا بند ہو گیا؟ سر سید ثانی سے بصد تعظیم تسلیم عرض کیجئے گا اور کہئے گا تعمیل حکم کی جا رہی ہے اور۔۔ "اب حکم کیا ہے عاشق ناکام کے لئے" اگر کسی وجہ سے مضمون ملنے میں تاخیر ہو تو ایڈیٹر نقوش لاہور کو میرے حوالے سے خط لکھ دیجئے گا اور مضمون منگا لیجئے گا۔

آپ کے مفصل خط کا انتظار ہے۔ شدید سردی میں قلم کانپ رہا ہے۔

اُمید کہ مزاج گرامی ۔۔۔۔۔۔ اپنے بھتیجے کا خیال رکھئے گا!

(۳۱) برادرم! لیجئے۔ جب آپ نے "گورکن" بنا ہی دیا تو آپ بھی کیا کہیں گے!" غالب نمبر کے لئے غالب کی گرامی ہڈیاں لایا ہوں ...... زہے عزّ و شرف۔

اور آپ نے کیا بنادیا گورکن ـــــ حالات نے بنایا تھا۔ اب آپ ہی بتائیے اگر "گورکنی" کے جراثیم سرایت کر گئے تو اس میں میرا کیا قصور! مضمون لکھتے لکھتے تھک چکا ہوں۔ دماغ بالکل کھوکھلا ہو چکا ہے۔ رسید جلد عنایت ہو؟ اور اس مضمون کے "چار یاری نہیں" "پنجتنی" تراشے ضرور نکلوا دیجئے گا۔ آپ کا بھتیجہ اور اس کی ماں بیحد پریشان ہیں ان کو بلوا کر ذرا تسکین و تسلی دیجئے۔ میں ہنوز پاسپورٹ کے انتظار میں ہوں۔ جواب جلد عنایت ہو۔ بھابی سے تسلیم کہئے گا۔ خدا حافظ امید کہ مزاج گرامی ......!

مخمور اکبر آبادی، کراچی آپ کے عطیے سے کچھ نہ کچھ کام ضرور چل رہا ہے مگر وہ ترجمہ ناقص ہے اور تشنہ طباعت بھی جگہ جگہ غلط ہے۔

عابد حسین صاحب والے ترجمے کی سخت ضرورت ہے جو اُردو کالج یا انجمن کی لائبریری سے میسر آ سکتا ہے۔ ایوب قادری صاحب کو جلد توجہ کرنی چاہیئے۔ مقالہ تیار ہو رہا ہے اور بشرط حیات انشاء اللہ مکمل ہو جائے گا اور آپ جیسے فاضل پسند بھی کریں گے لیکن اس کتاب کے بغیر تشنہ رہے گا۔ موقعہ ہو تو کسی روز مل لیجئے اور قادری صاحب سے فوراً رجوع کیجئے میں بھی انشاء اللہ لکھوں گا۔ اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ والسّلام۔

علامہ اقبال احمد فاروقی لاہور آپ کے نام حیات مراتب کا ایک نسخہ رجسٹرڈ ڈاک میں بھیج چکا ہوں مگر اس وقت مجھے وحید آباد کے مکان کا پتہ معلوم تھا۔ اس پر ہی آپ کے نام روانہ کر دی۔ غالب نمبر پر غالباً کچھ نہیں لکھ سکوں گا۔ معذرت قبول فرمائیں۔ تذکرہ علمائے لاہور بھی انشاء اللہ جلدی آ جائے گا۔ آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے

مولوی وحید احمد مسعود، شیخوپور بدایوں مکرمی ـــــ السّلام علیکم۔ عید مبارک! معلوم نہیں میرے مضامین متعلق غالب اور متعلق تذکرہ جات مخدوم صابرؒ کا کیا حشر ہوا۔ جب وہ چھپ جائیں تو براہ کرم ایک کاپی ہر ایک کی مجھے بھیجدیں اور تذکروں کے مضمون کی کاپی حکیم محمد موسیٰ صاحب کو بھی بھیجدیجئے گا۔ بعض تذکرہ والوں کے متعلق میں نے سخت کلامی سے کام لیا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ نے اس سختی کو نرمی سے بدل دیا ہوگا۔ خداوند کریم آپ کو آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رکھے۔

مولوی محمد عبداللہ قریشی، مدیر ادبی دُنیا، لاہور محترمی، سلام مسنون۔ آپ کا یکم جنوری ۱۹۶۹ء کا تحریر کردہ خط جس میں آپ نے میرا مضمون کاتب کے حوالے کرنے کی اطلاع دی تھی، کوئی دو ہفتہ کے بعد ملا۔ پتہ نہیں اتنے دن کہاں بھٹکتا رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ مضمون آپ کو پسند آ گیا اور میں آپ کے ارشاد کی

تعمیل سے عہدہ برآ ہونے کی مسرت حاصل کرسکا۔

العلم کا تازہ شمارہ جو اکتوبر، نومبر، دسمبر کا مشترکہ پرچہ ہے مجھے مل گیا ہے مگر اس سے پہلا شمارہ مجھے نہیں مل سکا۔ اس کے دیکھے بغیر بعض مضمونوں کے لطف سے محروم ہوں۔ ہوسکے تو وہ بھی بھجوا دیجئے۔ ممنون ہوں گا۔ خدا کرے آپ بخیر ہوں۔ محترم سید الطاف علی صاحب کی خدمت میں میرا اسلام عرض کریں۔

حکیم محمد موسیٰ امرتسری، لاہور (۱) گرامی نامہ شرف صدور لایا۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ جواباً عرض ہے کہ غالب پر کچھ لکھنا میرا کام نہیں ہاں اتنا جانتا ہوں کہ خواجہ محمد حسن شعری کاشمیری ثم امرتسری کی غالب سے ملاقات ہوئی تھی جس کا ذکر شعری کے مجموعہ کلام مراۃ خیال کے دیباچہ مرتومہ ۔ ۔ ۔ ۔ میں موجود ہے۔ مولوی عبداللہ قریشی صاحب شعری اور غالب پر بہت اچھا لکھ سکتے ہیں۔ انھیں توجہ دلائیے۔

تذکرہ نوری مل گیا تھا بذریعہ فاروقی صاحب۔ آپ کی اس کرم فرمائی کا شکریہ ادا کرنا اور رسید بھیجنا لازمی تھا مگر بدحواسی اور پریشانی کے باعث معذور رہا۔ محترم محمد عالم مختار حق صاحب اور عزیز اقبال مجددی صاحب کے نام خطوط اور العلم ان کو دے دیئے گئے ہیں۔

(۲) عید مبارک! گرامی نامہ ملا۔ حالات سے آگاہی ہوئی۔ آپ کی دعا سے تقریباً میری پریشانی ختم ہوگئی ہے۔ مولوی عبداللہ قریشی صاحب اس موضوع پر بڑی آسانی سے لکھیں گے۔ شعری کے سلسلے میں ایک غلطی کیا کرتے ہیں۔ ان کو کشمیر میں مدفون بتاجاتے ہیں۔ حالانکہ وہ امرتسر میں مرے اور وہیں دفن ہوئے۔ اور ان کے مجموعہ کلام کے آخر میں قبر کا محل وقوع بھی بتایا ہے۔ بہرحال قریشی صاحب کو میں اشارۃً عرض کردوں گا۔ العلم کے غالب نمبر کے لئے پتہ ذیل پر لکھئے: عابد نظامی صاحب رضوی سٹریٹ نلیمنگ روڈ لاہور۔ تین کارڈ ارسال ہیں۔

قاضی افضل حق قریشی لاہور (۱) "شرح دیوان غالب" ارسال ہے۔ رسید سے مطلع کردیں مضمون اور تصویر دسمبر کے آخری ہفتہ تک بھجوا دوں گا۔ ان دنوں کیا مشاغل ہیں۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

(۲) غالب نمبر کے لئے بوجوہ کچھ حاضر کرنے سے معذور ہوں وعدہ خلافی کے لئے عفو خواہ ہوں۔ مفتی عبداللہ ٹونکی کی ایک کتاب نظر سے گزری تھی اس کا نام ٹائیٹل پہ یہ ہے۔

عجالۃ الراکب فی امتناع کذب الواجب

از تالیفات تحریر علام فقیہہ فہام زبدۃ مفسرین و متکلمین

عمدۃ فقہاء محدثین مولانا مولوی حافظ مفتی محمد عبداللہ ادام اللہ فیوضہ اعلیٰ مدرس عربی مدرسہ عالیہ لاہور ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۱ء در مطبع اسلامیہ باہتمام مولوی کریم بخش طبع شد۔ قیمت فی جلد ۳ ر آنہ تعداد جلد ۷۵۰۔ پینتالیس صفحہ کا یہ رسالہ محمد عزیز متعلم جماعت مولوی فاضل اورینٹل کالج لاہور نے چھپوایا تھا۔

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی لاہور (۱)

گرامی نامہ باعث اعزاز ہوا۔ العلم کا پرچہ بھی پہنچا۔ نہایت شکریہ میری معرفت خط اور العلم کا پیکٹ جو حاجی سید اشرف صبوحی صاحب دہلوی کے نام آیا تھا۔ وہ میں نے اُن کو دے دیا ہے۔ آج آئے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ میں حالی میں اس قدر منہمک اور مصروف رہا کہ غالب کے مطالعہ کا موقع اور وقت ہی نہ ملا۔ اب آپ کا گرامی نامہ پہنچا تو حیران ہوں کہ غالب کے متعلق کیا لکھوں؟ ایک عنوان! خیال میں آیا ہے کہ "غالب اور حالی کے تعلقات" اگر آپ کو پسند آئے تو مطلع فرمائیں تاکہ کچھ لکھنے کی کوشش کروں۔ اور اس امر سے بھی اطلاع دیں کہ مضمون کب تک درکار ہے اگر عنوان پسند نہ ہو تو دوسرا عنوان "غالب کے معاصرین" سمجھ میں آیا ہے۔ بہرحال اپنی مرضی سے مطلع فرمائیں تاکہ تعمیل ارشاد کر سکوں۔ میں آپریشن کے بعد بہت ہی زیادہ کمزور ہو گیا ہوں، اور دن رات لیٹا رہتا ہوں اللہ پاک رحم فرمائے۔

(۲) گرامی نامہ پہنچا تھا۔ میں نہایت ہی شرمندہ ہوں کہ موجودہ مضمون آپ کو نہیں بھیج سکا۔ اُسے لکھنا شروع کیا تھا مگر وہ نامکمل رہ گیا۔ چونکہ آپ سے وعدہ کر لیا تھا اور ۱۵ر جنوری سے پہلے پہلے اس کا ایفا ضروری تھا۔ تاکہ آپ کے کام آسکے۔ اس لئے ایک دوسرا مضمون مرتب کیا جس کا عنوان ہے "غالب کا اثر اردو ادب پر"

اور یہ آج ۱۴ر جنوری کو بذریعہ رجسٹری خدمت والا میں بھیج رہا ہوں۔ خدا کرے آپ کو پسند آئے اور درج رسالہ ہونے کے قابل ہو، اس مضمون میں میں نے غالب کے جو اشعار لکھے ہیں وہ دیوانِ غالب کے اُس نسخہ سے لئے گئے ہیں جو نہایت اہتمام اور نفاست کے ساتھ تاج کمپنی نے شائع کیا ہے۔ جلدی میں مضمون کو دوبارہ دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ آپ مہربانی فرما کر اسے ایک نظر سے دیکھ لیں۔ مضمون میں ترمیم و تنسیخ اور ردو بدل کا آپ کو پورا اختیار ہے۔ کیونکہ میرے دل و دماغ کی حالت آج کل بڑی خراب ہے نہ دماغ کام دیتا ہے۔ نہ قلم چلتا ہے نہ سمجھ میں آتا ہے کہ کیا لکھوں نہ اپنا لکھا ہوا آسانی سے پڑھ سکتا ہوں۔ کیونکہ بینائی بھی کمزور ہو چکی ہے۔ نہ معلوم کتنے گھنٹے یا کتنے دن کا مہمان ہوں عمر عزیز کے ۶۰ برس فضولیات میں غارت کر دیئے۔ اور دین کی کوئی بھی خدمت مجھ سے بن نہ آئی۔ اب افسوس کر رہا ہوں۔ لیکن اب آخری عمر میں افسوس بیکار ہے۔ اللہ پاک میری پردہ پوشی فرمائے۔ مضمون کی رسید سے ضرور مطلع فرمائیں اور اپنی رائے سے بھی۔ حضرت صبوحی صاحب سے میں نے بار بار کہا۔ مگر وہ اس قدر زیادہ عدیم الفرصت ہیں جس کی انتہا نہیں۔ اس لئے اُن سے اُمید نہیں۔ سید معین الدین احمد غالباً آپ کو ایک مضمون بھیجیں جس کا عنوان ہے "غالب کا ایک نثر نگار شاگرد"

(۳) میں اپنی خانگی پریشانیوں کا حال کیا بیان کروں

مصیبت کا اک اک سے احوال کہنا   مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ

خدا کا شکر ہے کہ مضمون پسند آیا۔ ماہ نو، صحیفہ اور نقوش نے بھی تقاضے کئے تھے۔ اُن کے لئے بھی غالب کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھنا پڑا۔ صحیفہ کا نمبر ۰۰ے صفحات پر شائع ہو گیا۔ نقوش ۸۰۰ صفحات پر وسط فروری میں انشاء اللہ شائع ہو گا۔ ماہ نو کا

پتہ نہیں۔ فروغ اُردو لکھنؤ کا نہایت ضخیم غالب نمبر بھی شائع ہوگیا۔ مالک رام صاحب بہت بُری طرح غالب کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہمدرد دواخانہ دہلی بھی بڑی شان سے یوم غالب منا رہا ہے۔ صبوحی صاحب اس سلسلہ میں دہلی جائیں گے۔

العلم کا میرا پرچہ پہنچ گیا نہایت نہایت شکریہ۔ صبوحی صاحب کے نام جو پرچہ میری معرفت آیا تھا وہ میں نے اُن کو دے دیا اور پیغام بھی پہنچا دیا۔ اُن کی عدیم الفرصتی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ اُن سے مضمون کی توقع مشکل ہے۔ خبر نہیں سید مبین الدین احمد نے سمندری سے آپ کو مضمون "غالب کا ایک نثر نویس شاگرد" بھیجا یا نہیں؟ آپ کا پرچہ کب تک شائع ہو جائے گا، آپ کے بھائی کے مقدمہ کا کیا بنا۔

محمد عالم مختار حق، لاہور (۱)

رسالہ "العلم" اور مکتوب گرامی بتوسط جناب حکیم محمد موسیٰ صاحب وصول پا چکا ہوں۔ رسیدگی سے اس لئے جلد مطلع نہ کرسکا کہ رمضان المبارک کے سبب بعض خاص مشاغل اس قسم کی رسمیات میں مانع رہتے ہیں معذور فرمائیں پیش ازیں فاروقی صاحب کے ذریعہ تذکرہ نوری بھی وصول پایا۔ میں مکتبہ نبویہ سے بھی ایک نسخہ سفید کاغذ والا خرید چکا تھا۔ آپ نے سفینہ کاغذ والے نسخے لئے ہوتے۔ غالب پر میں کیا تحریر کروں گا بہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ میں تو ویسے بھی نہ لکھنے کے برابر لکھتا ہوں اور پھر شعر و شاعری میرا موضوع بھی نہیں اگر آپ کا اصرار ہی ہے تو ایک صورت ذہن میں آتی ہے اور وہ ہے غالب کے اُردو دیوان کے مختلف النوع ایڈیشنوں کی داستان تعارف" ۹ نسخے میرے پاس ہیں عید پر مہر صاحب کے پاس جاؤں گا ان سے بھی معلومات حاصل کروں گا بعد ازاں کچھ اور لوگوں سے پوچھنا پڑے گا۔ جیسے عابدی صاحب، مالک رام وغیرہ۔ خیر اگر اس موضوع پر پہلے کسی کا مضمون موصول نہیں ہوا تو مطلع فرمائیں تاکہ یہ کام شروع کرا دوں

(۲)

گزارش ہے کہ آپ کے دونوں گرامی نامے وصول پائے۔ دونوں میں مضمون غالب پر اصرار کیا گیا ہے میرا موضوع اس قسم کا ہے کہ مجھے دیوان غالب کے مختلف ایڈیشن دیکھنے کے لئے کئی جگہوں جانا ہوگا اس لئے ۱۵ جنوری تک مضمون کا تیار ہونا مشکل ہے آپ میرے لئے خاص رعایت رکھیں دیگر مضامین کی کتابت شروع کرائیں میرے مضمون کے لئے گنجائش رکھ لیں اور دعا فرمائیں خدائے تعالیٰ اسباب مہیا فرمائیں کہ میرا مضمون تشنہ نہ رہے۔ مہر صاحب کے پاس زیادہ نسخے نہیں ہیں۔ وزیر الحسن عابدی صاحب کے پاس معلوم ہوا ہے کہ غالب پر متعدد کتابوں کا ذخیرہ ہے مگر ان دنوں وہ بھی آپ کے شہر گئے ہوئے ہیں واپس آئیں تو ان سے ملاقات کی کوشش کروں گا۔ کیا آپ کے پاس دیوان غالب کا کوئی خاص ایڈیشن نہیں ہے۔ اس کے کوائف کیا ہیں۔ مہر صاحب سے ابھی پچھلے دنوں ملاقات کر چکا ہوں۔ اب نہ معلوم کب جانا ہو۔ آپ کا پیغام ایک عریضہ کے ذریعہ ان کی خدمت میں بھیج رہا ہے۔

(۳) تعمیل ارشاد میں جو کچھ کرسکا پیش خدمت ہے۔ مجھے احساس ہے کہ اب بھی دو چار نسخے ایسے رہ گئے ہیں جن کا ذکر
کرنا ضروری تھا مگر افسوس ہے کہ اُن تک رسائی نہیں ہوسکی۔ اس دوران اگر کوئی نسخہ دیکھنے کو مل گیا تو اس کا تعارف
لکھ بھیجوں گا۔ مضمون کی ترسیل میں جو التواء ہوا اس کے لئے عذرخواہ ہوں۔

کراچی میں غالب پنسلوں کا بڑا شہرہ ہے۔ یہ پنسلیں کیا ہیں۔ کیا آپ نے بھی کوئی پنسل خریدفرمائی۔ نہیں خریدی
تو ایک میرے لئے ضرور لے لیں یا لاہور میں کہیں سے مل سکتی ہوں تو تحریر فرمائیں۔

آپ کے پاس "فتوح الحرمین" کا کوئی نسخہ ہو تو اس کے کوائف سے آگاہ فرمائیں۔ خاص طور پر مصنف کے حالات
سے۔ غالب نمبر کے سلسلے میں کراچی میں کوئی کتاب یا نمبر شائع ہو تو لطفاً مطلع فرمائیں۔

(۴) ۱۰ر ۲ر ۱۹۶۹ء کو ایک ملفوف عریضہ بصورت رجسٹری ارسال کیا تھا جس میں غالب کے مضمون کا تتمہ شامل
تھا اور بعض مسودات بھی مگر اس کا جواب تا حال موصول نہیں ہوا۔ یہ بڑا اہم خط تھا اس لحاظ سے کہ مضمون کے
متعلق اس میں بڑی مفید باتیں درج تھیں اور اس کا شامل اشاعت ہونا بہت اہم تھا۔ فرمایئے آپ نے کیا سوچا؟
کیا اس کے مطابق مضمون میں مناسب ردوبدل کر دیا گیا؟ پرچہ کب تک طبع ہوگا۔ تین پرچے بذریعہ وی پی میرے نام بھجوا دیں
جن میں سے دو پرچے ہندوستان بھیجنا ہیں ایک مالک رام صاحب کو دوسرا اکبرالدین صدیقی صاحب کو حیدرآباد میں۔

حبیب اللہ رشدی مرحوم، کراچی

بڑی کوشش کی تھی کہ کل یہ مضمون مکمل ہو جائے مگر آج صبح اس پر نظر ثانی کی تو
چند صفحوں کو نکال دینا مناسب معلوم ہوا۔ پھر اس کا جوڑ ملانے میں وقت صرف ہوا آج
بھی اتفاق سے طبیعت کام پر مائل ہے۔ مگر پھر دو چار صفحے ابھی باقی ہیں۔ سولہ صفحے بھیج رہا ہوں اگر جناب ایوب قادری صاحب
تشریف لائیں تو یہ دے دیجئے باقی صفحات کے لئے کوشش کر رہا ہوں کہ آج رات ہی کو مکمل ہو جائیں وہ کل اُنھیں دیئے
جا سکتے ہیں۔

محمد اقبال مجددی لاہور

گرامی نامے اور العلم کی ترسیل کا شکریہ، آپ نے اپنے آخری مکتوب میں جس خط کی ترسیل کا ذکر
فرمایا ہے مجھے نہیں ملا۔ سابقہ عریضہ کا حاصل یہ تھا معارج الولایت میں سے شیخ محمد صادق
بن فتح اللہ گنگوہی کا سال وفات درکار ہے۔ شیخ محمد صادق کے ضمن میں ان کے لڑکے شیخ داؤد کے حالات بھی مندرج ہوں گے
اگر ان کا سال وفات بھی درج ہو تو لکھ بھیجئے

انجمن حمایت اسلام کی رپورٹ میں سے مفتی عبداللہ ٹونکی کی تقریر نقل کر کے بھجوانے کے لئے دریافت بھی کیا تھا
مخدومی! میں ان دنوں حدائق داؤدی پر مضمون لکھ رہا ہوں اس کے مؤلف غلام عبدالقدوس ہیں اگر ان کے حالات
کسی تذکرے میں آپ کی نظر سے گزرے ہوں تو ضرور مطلع فرمائیں۔

غالب سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ان دنوں مذکورہ مضمون کے سلسلہ میں یونیورسٹی لائبریری کے مخطوطات

دیکھ رہا ہوں اگر اس دوران میں غالب کی کوئی غیر مطبوعہ چیز ملی تو ضرور مطلع کروں گا۔

مولانا ماہر القادری مدیر فاران کراچی (۱) مکرمی السلام علیکم. تین چار دن کے بعد مضمون ترتیب کر کے بھیجدوں گا عنوان اور اس کی تفصیلات سوچ لی ہیں، غالب کے دیوان کا مطالعہ کرنا باقی ہے۔ مطمئن رہیں۔

ہاں! مولانا محمد مصطفےٰ صاحب کراچی سے باہر چلے گئے، اُن کا بڑا دردناک خط آیا ہے۔ آپ کسی دن غریب خانہ پر تشریف لائیں گے، تو وہ خط آپ کو دکھاؤں گا۔ ان کے ساتھ عجیب ٹریجڈی ہوئی ہے۔ جناب سیّد صاحب کو سلام مسنون۔

(۲) مضمون حاضر ہے، کاپیاں اور پروف آپ خود پڑھیں تاکہ کتابت کی غلطیاں نہ رہیں۔ جہاں میں نے کسی لفظ کے نیچے لکیر (ـــ) کھینچی ہے، اُسے ضرور کتابت کیا جائے ـــ اور جن لفظوں (صنعتوں) کے نیچے دو لکیریں (═══) بنائی ہیں، اُن کو "جلی" کتابت کیا جائے تاکید ہے،

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے، رسید و خیریت سے مطلع فرمائیے۔ میرا خط جو آپ کے گرامی نامہ کے جواب میں بھیجا تھا مل گیا ہوگا۔ "غالب نمبر" کب تک شائع ہوگا۔ مگر سید الطاف علی بریلوی صاحب سے میرا سلام ضرور کہدیں اور میرا خط موصوف کو دیدیں۔

حضرت رئیس امروہوی کراچی اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ حسب قرارداد تازہ ترین نظم ارسال ہے، اگر اس عریضے کی رسید سے مطلع فرما دیا جائے تو شکر گزار ہوں گا۔

حکیم محمود احمد برکاتی، کراچی (۱) خبر میں پڑھ لیا ہوگا کہ رُشدی صاحب یہاں سے وہاں انتقال فرما گئے، انا للہ! ۔ ۲۷ جنوری کو پیر کے دن صبح کے ۶ بجے وہ اس عالم ناتوانی میں اتنے طویل سفر پر روانہ ہوئے وفات سے ایک روز پہلے آپ کا مطلوبہ مقالہ بھیجا تھا مقالہ کے ساتھ میرے نام ایک پرچہ میں آپ کے نام پیغام تھا مگر اسی دن سے کرفیو نافذ ہوگیا اس لئے مقالہ اور پیغام نہ پہنچا سکا۔ ایک دو روز میں پہنچاؤں گا، اب تو وہ العلم میں نہ آسکے گا، بہرحال مرحوم نے آپ کے لئے لکھا تھا اس لئے آپ ہی کو پیش کر دوں گا، آپ جہاں چاہیں شائع کرا دیں۔ جی چاہتا ہے کہ مقالہ جہاں بھی شائع ہو اس کے ساتھ یہ مختصر سا نوٹ بھی لکھ دوں مرحوم کا تاکہ لگے ہاتھوں کچھ حق تو ادا ہو ہی جائے۔

وہ صحیح معنی میں طالب علم تھے، حصول علم ہی ان کا مستقل شعار و مشغلہ تھا آخری رات بھی پڑھتے پڑھتے سوئے تھے، شب و روز کا بیشتر حصہ کتابوں کے درمیان گزرتا تھا، خدا مغفرت کرے آپ بعافیت ہوں یہاں تو کرفیو نافذ ہے، دیکھئے کب اُٹھتا ہے۔

(۲) جناب شاعر کی نظم اور اپنے مضمون کا "پس آوردہ" ارسال خدمت ہے پس آوردہ میں جیسی ترمیم و تنسیخ آپ چاہیں کر دیں، اتوار کو ایک بجے تک ہم لوگ آرہے ہیں۔

پروفیسر معین الرحمٰن الف ، سی کالج لاہور (۱) آپ کا گرامی نامہ صادر ہوا (ساتھ ہی "العلم" کا پچھلا شمارہ بھی) خیریت معلوم ہوئی۔ اطمینان ہوا۔ "العلم" کے لئے انشاء اللہ ضرور کچھ نہ کچھ جمع کروں گا۔ ایک زحمت آپ فرمائیے (جو میرے حق میں رحمت ہوگی) "العلم" شمارہ جنوری تا مارچ ۱۹۶۶ء) مجھے مطلوب ہے۔ اس میں غالباً سرسید کے داداسے متعلق کوئی چیز چھپی ہے۔ پرچہ نہ مل سکے تو اس مضمون کا تراشہ یا نقل۔ اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے اور توجہ فرمائیں گے۔

(۲) تعمیلِ ارشاد میں "العلم" کے لئے دو مضامین بھیج رہا ہوں:
(۱) غالب کی چار معدوم تحریریں (۲) اوراقِ گل

اِن دو مضامین کے علاوہ "اشاریۂ غالب" کے عنوان سے ایک مراسلہ بھی لف ہذا ہے۔ اِسے بھی ازرہِ کرم جگہ نکال کر شامل کرلیجئے تو ممنون ہوں گا۔ میں "اِشاریۂ غالب" میں اتنا اُلجھا ہوا ہوں کہ یقین کیجئے قریب بہ پاگل ہوں۔ ایسے میں آپ کا حکم ہر لمحے سر پر سوار اور پیشِ نظر رہا خدا جانتا ہے کہ کس طرح اس سے خوفزدہ رہا اور کیونکر اس سے سُرخرو ہو رہا ہوں۔ اب یہ چیزیں آپ کو وقت پر مل جائیں اور پسند آئیں تو اطمینان ہو۔ اُمید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ "اِشاریۂ غالب" کی پہلی جلد جلد بندی کے مرحلے سے نکلے تو آپ کی نذر کروں گا

دیویندر پرشاد سکسینہ ، بدایوں (۱) پانچ سال کے بعد آپ کا خط ملا بہت بہت شکریہ "العلم" کے غالب نمبر کے لئے مرزا غالب کے دو سکندرآبادی شاگردوں پر مقالہ لکھ دیا ہے کیونکہ غالبیات کے ماہروں کو تفتہ اور بے صبر کے سلسلے میں زیادہ معلومات نہیں ہے۔ غالب کا شمار دنیا کے صفِ اول کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ میں نے غالبیات کے سلسلے میں پندرہ مضامین لکھے جو شائع ہو چکے ہیں۔ میرا ایک طویل مقالہ چالیس صفحات کا غالب کے ہندو شاگردوں پر رسالہ شیرازہ میں شائع ہوا ہے جو غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے اس کا مطالعہ آپ ضرور کریں۔

محمد حسین آزاد پر انجمن ترقی اُردو ہند کراچی نے دو کتابیں شائع کی ہیں ہو سکے تو میرے مطالعہ کے لئے بھجوا دیجئے مقالہ کی رسید ضرور بھیجدیجئے گا۔

(۲) آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔ میں نے بدایوں کے قابلِ ذکر اُردو شاعروں پر کچھ لکھا ہے اگر کوئی تحقیقی رسالہ آپ کے یہاں یہ مضامین شائع کرنے کے لئے تیار ہو تو بانسات مضامین آپ کو بھیجدوں۔ بدایوں نے اُردو علم و ادب کی جو خدمت کی ہے وہ سب پر روشن ہے لیکن آج تک کسی نے بدایوں اسکول پر کچھ نہیں لکھا۔ دہلی اور لکھنؤ کے بعد بدایوں ہی ایسا ادبی مرکز ہے جس میں صفِ اول کے کم سے کم پچاس ادیب اور شاعر ہوئے ہیں لیکن اُردو ادب کی کسی ادبی تاریخ میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ ہمارے ادبی مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے

اُردو زبان کو بہت نقصان پہنچایا ہے اس کی داستان بہت طویل ہے۔ میں آج کل تحصیل لسوئی میں ہوں۔ آپ کی کون کونسی کتابیں شائع ہو گئی ہیں کیا آپ مجھے بھی مطالعہ کے لئے بھیجیں گے۔ العلم کا غالب نمبر کب تک شائع ہوگا

قاضی عبدالنبی کوکب لاہور

گرامی نامہ مل گیا" العلم" کا شمارہ بھی وصول ہوا۔ "غالب نمبر" میں شرکت میرے لئے باعث مسرت ہوتی، آپ کا تجویز کردہ موضوع بھی مرغوب ہی معلوم ہوا لیکن محرومی کا خطرۂ غالب محسوس ہو رہا ہے۔

مجھے کچھ دلچسپی تبلیغی زندگی میں بھی ہے، اور ادھر آج کل تعصّب کی راہ پر چل نکلا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا واضح نشانہ میں ہی ہوں۔ درخواست کروں گا کہ بزم غالب میں شمولیت کے لئے آخری تاریخ سے آگاہ فرما دیں۔ اگر یکسوئی میسر آگئی، تو کچھ سعی کروں گا۔ اگر موضوع مذکور پر بالیقین کچھ لکھوانا مقصود ہے، تو متبادل شخص کی طرف رجوع کر لیا جائے۔ میرا معاملہ معلق ہے۔

سید انیس شاہ جیلانی محمد آباد

"مضمون" مکمل بیچ لکھ تو لیا ہے اور پیش بھی کر رہا ہوں دیکھئے آپ کے معیار پر پورا بھی اترتا ہے یا نہیں، میں سمجھتا ہوں غالب کے جس پہلو کو میں نے لیا ہے آج تک کسی نے اسے چھوا تک نہیں، دوسرے میں نے اس میں ایک "نئی بات"، یہ بھی لکھی ہے کہ جیل میں مرزا کو شراب کون مہیا کرتا ہوگا شیفتہ پر شک ہے وہ بیچارہ استاد کو مرتا ہوا تو نہیں دیکھ سکتا تھا، آپ کے حکم اور اپنے ذوق کی تکمیل میں نے رات دن ایک کرکے کی ہے اس میں کاٹ چھانٹ ہرگز نہ ہو مجھے دُکھ ہوگا دوسرے یہ کہ بقیہ صفحہ فلاں کی پخ بھی نہ لگائی جائے، مضمون پڑھتے پڑھتے ایک دم سے بقیہ صفحہ فلاں پر پڑھ کر میرا تو کم از کم خون کھول جاتا ہے، یہ باتیں اس صورت میں قابل عمل ہیں جب آپ اسے اشاعت کے لئے منتخب کر لیں۔

پروفیسر طاہر حسین نقوی گورنمنٹ کالج، نوابشاہ[1]

گرامی نامہ نمبر ۶۹۔۶۸/۳/۸۴۳، مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۶۸ء کل مجھے اپنی میز پر ملا۔ میں ۲ جنوری تک کراچی میں تھا۔ اور یہاں آپ کا یہ خط پڑا رہا میں نے اس کے [illegible] لفافہ پر زیادہ غور نہ کیا۔ کل اُسے کھول کر دیکھا۔

انشاءاللہ تاریخ مقررہ تک آپ کے پاس مضمون پہنچ جائے گا۔ اور اگر بجائے ۱۵ جنوری کے ۱۶ جنوری تک پہنچ جائے تو خیال نہ کیجئے گا۔ کیونکہ آج کل کالج میں کام (انتظامی) زیادہ ہونے کی وجہ سے فرصت کم ملتی ہے اور سردی بھی شدید ہے مجھے اُمید ہے کہ کل سے مضمون شروع کرکے ۱۴ یا ۱۵ تک ختم کر دوں گا اور آپ کو زیادہ سے زیادہ ۱۶ تک مل جائے گا۔

یاد آوری کا شکریہ بریلوی صاحب سے اور حامی الدین خاں صاحب سے میرا اسلام کہہ دیں۔

(۲)

آپ کے خط کا جواب دینے کے بعد ملیریا کا شکار ہو گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ دو دن میں فرصت مل گئی کمزوری ابتک ہے مضمون لیٹے لیٹے ایک بی' اے کے خوش خط طالب علم کو لکھاتا رہا جب میں نے اُس پر نظر ڈالی تو سخت غصہ

آیا۔ خط تو بُرا نہ تھا۔ لیکن املا کے اغلاط بیشمار اور فارسی اشعار کا تو خون ہی کردیا تھا۔ کل یہ مضمون روانہ کردیا جاتا لیکن اُسے دوبارہ خود لکھا۔ اب روانہ کیا جارہا ہے۔

جناب عبدالمجید سندھی، اسلامیہ کالج سکھر (۱) بڑے عرصے کے بعد آپ کا نوازش نامہ موصول ہوا۔ العلم کا پرچہ بھی ملا۔ آپ کے حکم کے مطابق انشاء اللہ تعالیٰ مضمون لکھوں گا اور جلد بھیجدونگا۔ العلم کے اس پرچہ میں سندھ کی تعلیم کے متعلق جو تبصرہ ہے اس میں جو نتائج نکالے گئے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں سندھ کے محققین کے یہ خیالات کبھی نہیں رہے سندھی رسم الخط کی تاریخ کے متعلق بھی صحیح طور پر نہیں لکھا گیا ہے اصل کتاب میں نے نہیں دیکھی ہے۔ اس کے حاصل کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔ اس کے بعد اصل کتاب اور تبصرہ پر تفصیل سے لکھنے کی کوشش کروں گا

(۲) ڈیکیشن کی وجہ سے میں ردہرہ تھا آپ کے خطوط سکھر آئے تھے، لیکن مجھے نہیں ملے تھے۔ کل ملے ۔ کتاب ابھی تک نہیں پہنچی۔ میں کل سکھر جاؤں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ مضمون کے لئے مجھے موضوع ہی نہیں مل رہا تھا۔ آخر ایک مضمون لکھ دیا جس کا غالب سے تو واسطہ نہیں ہے غالب کے دور کے سندھ کی اُردو شاعری سے تعلق ہے اگر آپ کو پسند آئے اور مناسب سمجھیں تو شائع کریں۔

جناب سید قدرت نقوی ملتان گرامی نامہ باعث شرف ہوا مضمون ضرور ارسال خدمت کروں گا مگر یہ جنوری کے عشرہ ثانی تک ہو سکے گا۔ کام بہت زیادہ ہے اور آپ نے بڑی تاخیر سے تحریر فرمایا ہے۔ العلم کا شمارہ بھی ملا۔ بہت خوب رسالہ ہے۔ الطاف صاحب سے بڑا پُرانا تعارف مصنف علی گڑھ کی بدولت ہے۔ ملاقات وخط و کتابت نہیں ہے۔ میرا سلام عرض کردیجئے گا۔

پروفیسر نظیر حسنین زیدی حیدرآباد (۱) قادر مطلق گواہ ہے کہ اُردوئے معلیٰ اور مکاتیب غالب دونوں چھان ماریں لیکن عود ہندی میں سے جو مطالب علمی، علمی بحث نکال سکا تھا۔ ان دونوں کتابوں میں کہیں نظر نہیں آئی سخت مایوس ہوا ہوں۔ اور اپنی کوتاہ علمی پر نادم ہوں کہ میں نے اس قدر عجلت میں وعدہ کرلیا۔ لیکن بہرحال میں ایک ہفتہ کے اندر جو کچھ اخذ کرسکا ہوں وہ پیش خدمت کرسکوں گا۔ مطمئن رہیں۔ اس زحمت کے لئے معذرت خواہ ہوں: بچوں کو دعائیں۔ محترمی ثناء الحق صاحب کی خدمت میں تسلیم نیاز

(۲) تعمیل حکم میں ایک مختصر سا مضمون اُردوئے معلیٰ پر اک نظر) (بارہ صفحہ) پیش خدمت ہے اگر سامان بندوبست ہو چکا ہو۔ اور کوئی گنجائش ارباب علم کی نگاہ میں نہ ہو تو بغوائے عطائے تو بلقائے تو بہ بیرنگ واپس فرمادیں شکر گزار ہوں گا اور رہوں گا۔ ع بر کریماں کارہا دشوار نیست

محترم ثناء الحق صاحب کی خدمت میں سلام مسنون مع الاحترام، بچوں کو دیدہ بوسی جواب کا منتظر ہوں اور خیریت کا طالب ہوں خدا کرے آپ بخیریت ہوں۔

پروفیسر سردار احمد خاں اسلامیہ کالج سکھر (۱) نوازش نامہ ملا۔ یاد آوری کا شکریہ حسب الحکم ایک مقالہ ترتیب دے رہا ہوں۔ بدقسمتی سے آپ کا نامہ گرامی مجھے دیر سے ملا۔ اس لئے کوشش تو یہ کروں گا کہ ۱۵ جنوری تک وہ آپ کے پاس پہنچ جائے ورنہ دو چار دن کی ممکن ہے دیر ہو جائے بہرحال آپ خاکسار کا نام شامل اشاعت رکھیں۔

(۲) حسب الحکم العلم کے غالب نمبر کے لئے ایک حقیر سا مضمون "غالب اور علم نفسیات" کے عنوان سے ارسال کر رہا ہوں۔ توقع ہے کہ اس نئے موضوع پر یہ مضمون آپ پسند فرمائیں گے۔

حضرت درد کاکوروی کراچی میں نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ عبدالحق صاحب کے زمانے میں بمقام اورنگ آباد دکن دہلی کے تاریخی مشاعرہ ۱۲۶۱ھ کی باضابطہ نقل ہو گئی تھی ۱۹۳۵ء کے "اردو" رسالہ میں اس کی تصویر چھپی تھی میں نے آپ کو یہ سہواً لکھ دیا کہ عارف کا پارٹ میرے متعلق تھا۔ دراصل سالک کا پارٹ میرا تھا۔ میرے پاس ملکور الصدر تصویر کی کاپی موجود ہے آپ دیکھ سکتے ہیں یہ بھی تاریخی چیز ہے رسالہ العلم میں اس کا تذکرہ بھی ہونا چاہیئے۔

رسالہ ستارہ فروری ۱۹۶۹ء میں بھی غالب کا تذکرہ ہے اور ان سے متعلق اور بھی چیزیں ہیں یہ بھی میرے پاس ہے۔ اس کے علاوہ دہلی کے اخبار تیج ویکلی میں نجم الدولہ لقب سے دربار شاہی والی تصویر غالب ہے یہ درباری لباس میں ہیں ایک جگہ میں نے دہلی والا یہ اخبار دیکھا تھا یہ ۵ فروری ۱۹۶۹ء کا ہے اس میں اور بھی مفید چیزیں ہیں (انڈیا ہائی کمشنر ڈپارٹمنٹ میں آتا ہے) مشاعرہ ۱۲۶۱ھ میں سالک نے جو اشعار پڑھے تھے وہی میں نے پارٹ ادا کرتے وقت پڑھے یہ اشعار بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔

جناب محمد عثمان رخشاں ابدالی کراچی (۱) عید مبارک ہو۔ مقالہ غالب نمبر کے لئے لکھ رہا ہوں۔ ارادہ تھا کہ آج آپ تک پہنچا دوں گا لیکن مکمل نہیں ہو سکا ہے۔ تقریباً نصف ہو چکا ہے اور نصف باقی ہے۔ انشاءاللہ بدھ کے دن لیکر حاضر ہوں گا آپ کے عید کے بعد کا ملنا اسی لئے ملتوی ہوا کہ مضمون کے ساتھ ہی ملوں۔ فل اسکیپ سائز پر ۱۰۔ ۱۲ صفحہ میں آئے گا مضمون قدرے طویل ہو گا مگر پورے کا پورا ایک اشاعت میں آنا چاہیئے باقی آئندہ کا سلسلہ نہ ہونا چاہیئے اب حساب لگالیں کہ فل اسکیپ صفحہ العلم کے مطبوعہ صفحہ کے لحاظ سے جتنے صفحہ میں آئے اتنا صفحہ محفوظ رکھا جائے۔ یہ اس لئے لکھ دیا ہے کہ اگر قادری صاحب سے ملاقات ہو تو گوش گزار کر دیجئے گا اور یہ اس لئے بھی لکھا کہ لکھنے والے بہت ہوں گے اور وہ طول نگار بھی ہوں گے۔ ایسا نہ ہو کہ صفحات کی کمی پڑ جائے قادری صاحب سے ملاقات ہو تو سلام بھی فرما دیجئے۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ باقی عندالملاقات۔

(۲) آپ کے لئے جو مقالہ لکھا گیا، اس میں نمونۂ کلام صوفی میں ایک غزل دی گئی ہے" حرماں کہیں جسے" ہجراں کہیں جسے" اتفاق سے اس کے ایک شعر کے مصرعہ اول میں ایک لفظ غلط نقل ہو گیا ہے۔ پورا شعر یہ ہے ؎

خوش ہوں جنوں سے میں کہ وہ کرتے ہیں اختلاط　　ہے صبحِ عید، چاکِ گریباں کہیں جسے

اس کے پہلے مصرعہ میں اختلاط غلط ہے "التفات" چاہیئے۔ براہِ کرم اختلاط کی جگہ "التفات" کر دیجئے یعنی

ع "خوش ہوں جنوں سے میں کہ وہ کرتے ہیں التفات

اب اس پر اطلاع ہوئی اس لئے یہ سمجھتے ہوئے کہ ابھی درستی ممکن ہے آپ کو اس کی تکلیف دے رہا ہوں۔ زیادہ والسلام۔

محمد سجاد ساجد کراچی آپ کے ایک دوست کے اصرار پر ایک چھوٹا سا حقیر مضمون آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں موصوف نے بتایا کہ العلم کا غالب نمبر زیرِ طباعت ہے چونکہ یہ مضمون بھی غالب سے متعلق ہے اس لئے امید کہ آپ قبول فرمائیں گے

شیوا بریلوی، کراچی " الکریم اذا وَعَدَ وَفَا" کبھی پڑھا بھی تھا اور آپ جیسے پڑھے لکھوں سے اکثر سنا بھی مگر اب ہر شے انقلاب کی زد میں ہے ممکن ہے کہ یہ مقولہ بھی اس سے متاثر ہو گیا ہو۔ اگر صحت ساتھ نہ چھوڑتی تو میں خود بھی حاضری سے دریغ نہ کرتا۔ آپ کی مصروفیات اجازت دیں تو اس احقر کی درخواست پر بھی توجہ فرمائیں خدا کرے کہ آپ مع متعلقین بعافیت ہوں۔ العلم کا غالب نمبر کب تک آ رہا ہے۔

پروفیسر اطہر حسین رضوی، آدم جی کالج کراچی گرامی نامہ موصول ہوا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی ذہنی پراگندگی کے سبب غالب نمبر کے لئے کوئی مضمون پیش نہیں کر سکا۔ "کانفرنس" سے میرا تعلق اکیس سال سے زیادہ کی مدت پوری کر چکا ہے۔ میں روحانی حیثیت سے اس علمی ادارے سے ہمیشہ وابستہ رہا ہوں۔ "مصنف" میں میری زندگی کے اس دور کی جھلکیاں چھپ چکی ہیں، جب میرا قلم ٹوٹا نہ تھا اور میرے قلم پر دل کی حکمرانی تھی اور آج ـــ جب دل سے لے کر دماغ تک کی تمام منزلوں سے گزر چکا ہوں "العلم" کے غالب نمبر کے متعلق صرف یہ کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ آج بھی ذہن کی انتہائی گہرائیوں سے فکرِ غالب کے مطالعہ کا مطالبہ اپنی جگہ باقی ہے اور کل بھی غالب فکر و عمل کی قوتوں کو جگاتا رہے گا ؎

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

اللہ کرے "العلم" کا غالب نمبر خوب سے خوب تر ہو۔

جناب احمد الدین مارہروی ایم اے (علیگ) ایڈیٹر "تہذیب الاخلاق" لاہور میں چند روز کے واسطے کراچی آیا ہوں یہاں آ کر معلوم ہوا کہ آپ العلم کا خاص نمبر

عنقریب شائع کر رہے ہیں۔ اگر پہلے سے علم ہوتا تو آپ کی اس بزم میں ضرور شریک ہوتا لیکن اب غالباً زیادہ دیر ہوگئی ہے
غالب کے زمانہ میں علاوہ دہلی اور لکھنؤ کے شمالی ہندوستان کے بعض قصبات مثلاً بلگرام، کاکوری اور مارہرہ علمی اور ادبی سرگرمیوں کے مرکز تھے۔ میرے وطن مارہرہ میں کم از کم دو متعدد ہستیاں ایسی ضرور تھیں جن سے غالب کے دیرینہ تعلقات تھے، چودھری عبدالغفور خاں مارہروی کے نام تو وہ مسلسل خطوط لکھتے رہتے تھے جن کا مجموعہ اس زمانہ میں عود ہندی کے نام سے شائع ہوگیا تھا۔ سید صاحب عالم مارہروی اُن کے ہم عمر اور بچپن کے دوست تھے اُن کے نام بھی بعض خطوط اُردوئے معلیٰ اور دوسرے مجموعوں میں محفوظ ہیں، غالب نے کلکتہ جاتے ہوئے تین روز مارہرہ میں بھی قیام کیا تھا، میرے جد امجد اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) کے دادا حافظ معز الدین میرٹھی ان ایام میں وہیں موجود تھے، اُن کو بھی علم سے خاصہ شغف تھا، اور گو صاحب تصنیف نہ تھے لیکن اُس زمانہ کی علمی صحبتوں کا تذکرہ اپنے روزنامچہ میں لکھتے تھے جو خوش قسمتی سے محفوظ ہے۔ اس میں غالب کے چند ایسے لطیفے اور چٹکلے بھی ملتے ہیں جن سے حالی کے مرثیۂ غالب میں اس شعر کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے ؎

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹھول سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

اس وقت تو ممکن نہیں کیونکہ سفر میں ہوں اور عدیم الفرصت، آئندہ کسی موقع پر انشاء اللہ ان علمی صحبتوں کا تفصیل سے ذکر کر سکوں گا جو مارہرہ کے معاصرین غالب سے متعلق ہیں اور جن سے غالب کے اخلاق و کردار پر نئی روشنی پڑتی ہے
خدا تعالیٰ آپ کو اپنی مساعی میں کامیاب کرے اور آپ عرصہ تک اپنے علم و قلم سے قوم کی بے لوث خدمات انجام دیتے رہیں۔

بقیہ: غالب کے بارے میں چند "سخن ہائے ناگفتنی"

کو حقیقی زندگی اور تنومندی کا شعور حاصل ہوتا ہے۔ اس کے سوا جو کچھ بھی ہے اس میں تخریب و ہلاکت پنہاں ہے۔ ذات باری اور انسان دونوں کا قیام اور ثبات متواتر اور پیہم عمل تخلیق پر منحصر ہے"

اس سلسلہ کلام کو مزید طوالت دینے کا یہ موقع نہیں ہے حالانکہ ابھی بہت سخن ہائے گفتنی بھی باقی ہیں۔ صرف اتنا عرض کرنا کافی ہوگا کہ بقول ہمارے قومی فلسفی شاعر کے :-

"وہی شاعر قابل ستائش اور لائق تحسین ہے جو اپنے ولولہ انگیز کلام سے ہمارے جسم میں خون کی گردش کو تیز کر دے۔ تعمیری سرگرمیوں کے لئے ہم میں حوصلہ اور ہمت پیدا کرے اور ہمارے خیالات اور منصوبوں کو بلندی اور رفعت عطا کرے۔ بالفاظ دیگر اس شعر کا مصداق ہو ؎

پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند جہاں را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

اب وہ وقت نہیں ہے کہ فرصت سکون اور بے عملی کی تمنا میں ؏ : "بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے"

من آنچہ شرط بلاغ است با تو می گویم تو خواہ پند از گیر خواہ حزن و ملال

(١٩) مقدرِ انسانی:- لی کامت ڈونوائے کی تصنیف "ہیومن ڈسٹنی" کا اُردو ترجمہ از پروفیسر عبد المجید قریشی ایم اے 8/-

(٢٠) رُومن رسم الخط اور پاکستان:- مصنفہ مولانا سید عبد القدوس ہاشمی ندوی 0/50

(٢١) قدیم شہنشاہیاں:- مصنفہ مولینا سید طفیل احمد منگلوری 3/-

(٢٢) جان ڈوی کا فلسفۂ تعلیم:- ڈاکٹر نوتھ اینس آرنٹ کی تالیف جان ڈیویز فلاسفی آف ایجوکیشنل کا اُردو ترجمہ از سید عین الدین علوی ایم، اے 2/50

(٢٣) اصول و اساسِ تعلیم:- سر پرسی نن کی عالمانہ تصنیف "ایجوکیشن اٹس ڈیٹا اینڈ فرسٹ پرنسپلس" کا اُردو ترجمہ انعام عظیم برنی و اخلاص حسین ایم اے و محمد حسین خاں زبیری ایم اے و سید عبد الحسن اور سید اظہر حسین رضوی ایم اے 7/-

(٢٤) اصولِ تدریس:- رائبرن اور فوج کی کتاب "پرنسپلس آف ٹیچنگ" کا اُردو ترجمہ از اخلاص حسین ایم اے 5/-

(٢٥) حیاتِ مابعد:- مصنفہ سید ضامن حسین نقوی گویا جہاں آبادی 3/50

(٢٦) مکاشفاتِ کشفی:- مصنفہ خان بہادر مرزا ابوجعفر کشفی 3/-

(٢٧) تجددِ امثال:- مصنفہ سید ضامن حسین نقوی گویا جہاں آبادی [illegible]

(٢٨) طالب علم کی ڈائری:- مصنفہ سید الطاف علی بریلوی (علیگ) 3/-

(٢٩) مقاصدِ تعلیم:- اے این وہائٹ کی تصنیف "ایمز آف ایجوکیشن" کا اُردو ترجمہ از سید محمد تقی ایڈیٹر روزنامہ "جنگ" کراچی 6/-

(٣٠) ارتقائے انسانی:- (جدید سائنس کی روشنی میں) مؤلفہ سید طفیل احمد منگلوری (علیگ) 2/-

(٣١) جمہوریت اور تعلیم (حصہ اول):- جان ڈیوی کی تصنیف "ڈیماکریسی اینڈ ایجوکیشن" کا اُردو ترجمہ از سید محمد تقی ایڈیٹر روزنامہ "جنگ" کراچی 5/-

(٣٢) " " (حصہ دوم):- " " " " " " " " " " " 5/-

(٣٣) پُراسرار کائنات:- سر جیمس جینس کی کتاب "مسٹریس یونیورس" کا اُردو ترجمہ " " " " " 6/-

(٣٤) مشاہیر کے تعلیمی نظریئے:- مولوی محمد حسین خاں زبیری ایم اے (علیگ) 4/-

(۳د) مادری زبان کی تعلیم:- مصنفہ پروفیسر یونس حسن فروغ علوی ایم اے 3/-

(٣٦) ثقافت و انتشار:- میتھو آرنلڈ کی شہرۂ آفاق کتاب "کلچر اینڈ انارکی" کا اُردو ترجمہ از انعام عظیم برنی و اخلاص حسین ایم اے 6/-

(٣٧) نقد و ادب:- ل احمد اکبرآبادی مقدمہ مخمور اکبرآبادی 3/-

(٣٨) عظیم علمائے نفسیات:- اُردو ترجمہ "گریٹ سائیکالوجسٹس" مصنفہ ایس سارجنٹ بی ایچ ڈی مترجمہ پروفیسر عبد المجید قریشی 12/-

(٣٩) حیاتِ حافظ رحمت خاں:- مؤلفہ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) 10/-

(٤٠) رفقائے عظیم:- میکس ایسٹ مین کی تصنیف "گریٹ کمپینئنس" ترجمہ از پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم اے (علیگ) 10/-

(٤١) راہی اور راہ نما:- سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) 6/-

12062

(۴۲) تعلیماتِ حضرت شاہ مینا :۔ الحاج مولوی خصلت حسین صابری 3/-

(۴۳) سرسید کا علمی کارنامہ :۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی 2/-

(۴۴) مفکرینِ تعلیم :۔ پروفیسر ضیاء الدین احمد ایم اے۔ 7/-

(۴۵) عہدِ بنگش کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ :۔ تالیف مفتی ولی اللہ فرخ آبادی مترجم حکیم شریف الزماں اکبرآبادی
حواشی و تعلیقات مسٹر محمد ایوب قادری ایم اے 12/-

(۴۶) تعلیمی مسائل :۔ (پس منظر اور پیش منظر) مصنفہ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) 8/-

(۴۷) مشاہیر کے تعلیمی نظریے :۔ (انگریزی ترجمہ) عظیم الدین خاں ایم اے و اخلاص حسین زبیری ایم اے 8/-

(۴۸) اقبال کا نظریۂ تعلیم :۔ از محمد احمد صدیقی ایم اے (علیگ) 8/-

(۴۹) ہند کے اسلامی عہد میں تعلیمی ترقی :۔ تصنیف ڈاکٹر این۔ این لا ترجمہ اخلاص حسین زبیری ایم اے سیدہ سلطان فاطمہ بلخی ایم اے 8/-

(۵۰) نواب خان بہادر خاں شہید :۔ مؤلفہ سید مصطفیٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی 3/-

(۵۱) تجزیۂ کلامِ غالب :۔ مصنفہ مولوی سید رفیع الدین بلخی مرحوم ایڈوکیٹ پٹنہ 5/-

(۵۲) ادب منزل بمنزل :۔ تصنیف سیدہ انیس فاطمہ بریلوی 6/-

(۵۳) لائف آف حافظ رحمت خاں :۔ انگریزی از پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم اے (علیگ)
مؤلفہ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) 20/-

12062

(۵۴) تعلیم و تعلم :۔ مرتبہ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) 7/-

(۵۵) انشائیے :۔ از افضل احمد صدیقی ایم اے مقدمہ از جناب ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی 1/-

(۵۶) تاثرات و مشاہدات :۔ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی مقدمہ از انعام عظیم برنی ایم اے 3/-

(۵۷) حاصلِ مطالعہ :۔ سید الطاف علی بریلوی مقدمہ جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ایم اے پی ایچ ڈی 3/-

(۵۸) ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن :۔ (جلد اول) از پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم اے (علیگ) 2/-

(۵۹) مسلمانانِ کراچی و سندھ کی تعلیم :۔ (۱۸۴۳ء تا ۱۹۴۷ء) از سید مصطفیٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی 5/-

(۶۰) یادیں اور خاکے :۔ مصنفہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی 3/-

(۶۱) تعلیم کے ابتدائی اصول (جلد اول) :۔ مترجمہ مولوی سبطین احمد مذاق ایم اے 5/-

(۶۲) تعلیم و تربیت :۔ از ضیاء الدین احمد برنی 5/-

زیرِ طبع

(۶۳) ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن (جلد دوم) تعلیم کے ابتدائی اصول (جلد دوم) علم و عمل حصہ اول طبع ثانی) انگریزی کی لسانی پالیسی
بچہ کا ذہنی اور نفسیاتی ارتقاء